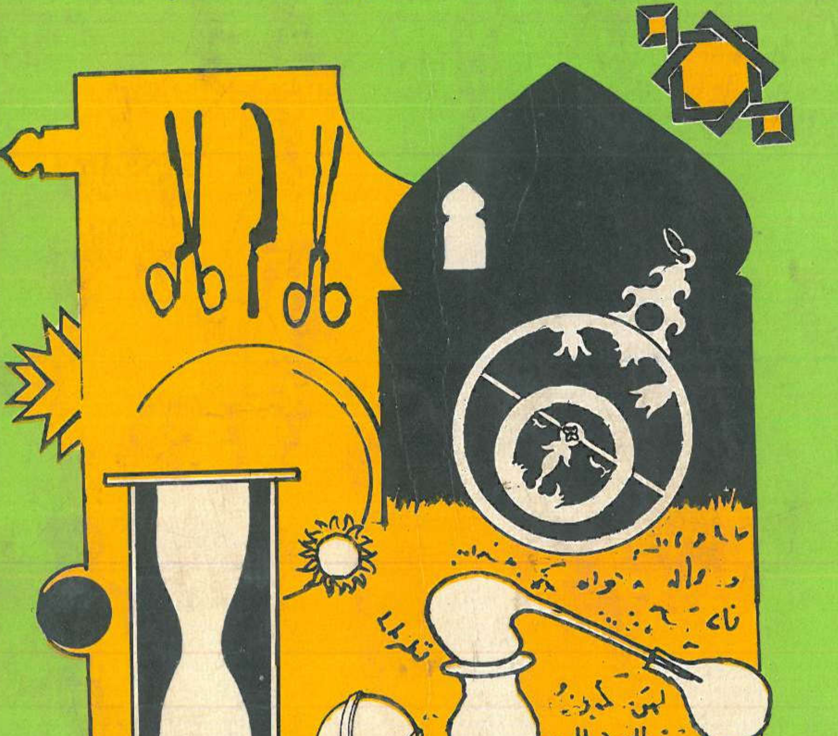
مسلمان اور سائنس کی تحقیق

حبیب احمد صدیقی





اردو سائنس بورڈ

299 - اپر مال ، لاہور

مُسلمان اور سائنس کی تحقیق

حبیب احمد صدّیقی

اردو سائنس بورڈ
299 - اپر مال، لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر 363

طبع اول : 1999ء

قیمت : -/200 روپے

ناشر

محمد اکرام چغتائی

ڈائریکٹر جنرل ، اردو سائنس بورڈ

299- اپر مال ، لاہور

ISBN - 969 - 477 - 045 - 9

مطبع : شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز ، فیروز پور روڈ ، لاہور

عرض ناشر

عصر حاضر میں ، مسلمان اور سائنس کی تحقیق کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ خدا جانے یہ ہماری بے عملی کا نتیجہ ہے یا ایسا تاثر پھیلا دیا گیا ہے۔ تاہم یہ مسلمہ امر ہے کہ یونانیوں کے بعد سائنس کی ترویج و ترقی میں مسلمانوں نے تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ اور ان کی سائنسی خدمات ، تحقیقات اور اکتشافات کا اعتراف بیشتر مغربی مورخین اور مفکرین نے بھی کیا ہے۔ ایسے غیر جانبدار ارباب علم و دانش میں جارج سارٹن کا نام لیا جا سکتا ہے ، جس کی "مقدمہ تاریخ سائنس" بنیادی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ روبرٹ بریفو کا تعلق بھی ایسے ہی مغربی علماء سے تھا۔ علامہ اقبال اس کی اہم ترین کتاب "تعمیر انسانیت" کے بڑے معترف تھے ، کیونکہ اس نے مغرب کی تمام تر سائنسی ترقیوں پر عربوں کے اثرات کا برملا اعتراف کیا ہے۔

روبرٹ بریفو کی یہی تصنیف زیر نظر کتاب کے مصنف کے لیے محرک ثابت ہوئی اور انہوں نے مسلمان سائنس دانوں کے احوال اور مختلف سائنسی علوم میں ان کی تحقیقات کو اپنا موضوع تحقیق بنایا۔ اس کتاب کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ ہمارے ماضی کے ان درخشندہ ستاروں کی روشنی سے اہل مغرب نے استفادہ کیا ، مگر ہم نے ان سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اندھیروں میں گم ہوتے چلے گئے۔

آئیے ، اپنے حال اور مستقبل میں روشنی پھیلانے کے لیے ماضی کے ان روشن چراغوں سے فیض حاصل کریں اور سوچیں کہ ہمارے آباء کیا تھے اور ہم کیا ہیں۔

اس کتاب کا مطالعہ ہمارے دل و دماغ کی حیات نو میں اہم کردار ادا کرے گا اور ہمیں اپنے نامور سائنس دانوں کے گرد آلود راستوں کو صاف کرنے اور ان پر گامزن ہونے کی ترغیب دے گا۔

محمد اکرام چغتائی

ڈائریکٹر جنرل

فہرست مضامین

انتساب

عزیز دوست مولانا ماھر القادری مرحوم کے نام جو جدہ (حجاز) کے ایک مشاعرہ میں دفعتاً فوت ھو گئیے اور اب "جنت المعلےٰ" کے قبرستان میں حضرت خدیجة الکبریٰ کے مزار مقدس کے پائینتی سیدالطائفہ صوفیاء حضرت حاجی امداد اللہ مھاجر مکی کے مزار مبارک سے متصل آرام کر رھے ھیں۔

حبیب احمد صدیقی

انتساب

عزیز دوست مولانا ماہر القادری مرحوم کے نام جو جدہ (حجاز) کے ایک مشاعرہ میں دفعتاً فوت ہو گئے اور اب "جنت المعلےٰ" کے قبرستان میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزار مقدس کے پائینتی سیدالطائفہ صوفیا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مزار مبارک سے متصل آرام کر رہے ہیں۔

حبیب احمد صدیقی

حالاتِ مصنف

حبیب احمد 1906ء میں قصبہ سیوہارہ (ضلع بجنور یو۔پی) میں پیدا ہوئے جو اب اتر پردیش کہلاتا ہے۔ قصبہ سیوہارہ ایک مردم خیز بستی ہے جس کو جنگ آزادی برصغیر ہند و پاکستان کے ایک مشہور و معروف بہادر و بے باک مجاہد مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی نسبت سے شہرت ملی۔

حبیب احمد صاحب نے مکتب اور اسکول کی ابتدائی تعلیم ضلع نینی تال میں پائی۔ ہائی اسکول کے بعد 1923ء میں ان کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ وہ 1929ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ ایم اے اور ایل ایل بی ساتھ ساتھ کیا۔ دونوں میں بدرجہ اعلیٰ کامیاب ہوئے۔ ایم اے میں مضمون انگریزی تھا۔ اس میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ اس وقت مسلمان شرفا اور ذہین طلبا میں سرکاری ملازمت کرنے کا رجحان زیادہ تھا۔ سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہونے پر ان کا ڈپٹی کلکٹری پر تقرر ہوگیا۔ اپنی کارگزاری اور نیک نامی کے باعث تقسیم ملک کے بعد بھی ان کو ترقی ملتی رہی اور وہ کمشنری کے رتبے تک پہنچے۔ پھر پبلک سروس کمیشن کے رکن ہوئے اور لیبر ٹریبونل کے ممبر رہے۔ 1968ء میں ملازمت سے فراغت کے بعد انہوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کرنے کی سعادت حاصل کی اور 1969ء میں پاکستان منتقل ہو گئے جہاں پر ان کی سب اولاد پہلے سے مقیم تھی۔

اسمٰعیل احمد مینائی

کچھ اس کتاب کے بارے میں

میں نے جب رابرٹ بریفو (Robert Briffault) کی مؤقر تصنیف " تعمیرِ انسانیت " (Making of Humanity) میں پڑھا کہ

"ہماری سائنس اس بات کے لیے عربوں کی مرہون منت ہی نہیں کہ انہوں نے چونکا دینے والے اکتشافات یا انقلابی نظریے پیش کیے بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ عربوں کی زیربار احسان ہے۔ یعنی اس کا وجود ہی ان کی بدولت ہے۔"

تو مجھے بہت مسرت اور اس سے زیادہ حیرت ہوئی۔

اہل مغرب اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کرتے رہے ہیں کہ مسلمانوں سے انہوں نے نورعلم پایا ہے۔ بریفو اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر عربوں کے علوم سے یورپ استفادہ نہ کرتا تو یورپ کی جدید تعمیر نہ ہوتی اور اس کی موجودہ تہذیب وجود میں نہ آتی۔ بریفو نے اس حقیقت کا یوں انکشاف کیا ہے کہ بغداد، شیراز اور قرطبہ کے درباروں کی حقیقی اور قابل فخر زیب و زینت، ذہنی ترقی اور ان کی مسرتوں کی لافانی دولت تھی۔ مسلمان فرمانروا تہذیب کو فروغ دینے کی دلی آرزو سے مغلوب ہو کر بڑی لگن سے اس کام میں منہمک رہتے تھے۔ نہ کبھی اس سے پہلے اور نہ کبھی اس کے بعد دنیا نے ایسا حیرت انگیز منظر دیکھا تھا جس میں ایک عظیم مملکت کے حکمرانوں کا پورا طبقہ والہانہ جذبہ کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر تحصیل و ترقی علم کے لیے مصروف نظر آئے۔

" تعمیرِ انسانیت " کو پڑھ کر میں نے تہیہ کیا کہ اس موضوع پر اور زیادہ معلومات حاصل کرکے قرون اولیٰ کے مسلمان اہل علم کے مختصر حالات اور کارنامے اردو میں لکھ کر اپنے ہم وطنوں تک پہنچاؤں گا۔ اسی جذبے کے تحت یہ کتاب وجود میں آئی۔

پہلے میں نے مشہور امریکی مورخ ول ڈیوراں (Will Durant) کی گرانقدر تصنیف تہذیب

و تمدن کی تاریخ (The History of Civilization) کا مطالعہ کیا۔ یہ کتاب سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی، چوتھی اور چھٹی جلدوں میں مسلمانوں سے متعلق حالات و واقعات مرقوم ہیں۔ ساتوں جلدوں کے الگ الگ نام لکھے گئے ہیں۔ پہلی جلد کا نام ہے ہمارا مشرقی ورثہ، (Our Oriental Heritage)۔ چوتھی کا نام ہے، مذہب کا عہد (The Age of Faith) اور چھٹی کا نام ہے مذہب کی اصلاح (The Reformation)۔ اس میں عثمانی ترکوں کے حالات بھی درج ہیں۔

ایک اور نامور مورخ جارج سارٹن (George Sarton) نے اپنی بلند پایہ تصنیف "مقدمہ تاریخ سائنس (Introduction to the History of Science) میں آٹھویں صدی کے دوسرے نصف سے چودھویں صدی کے آخر تک کے عظیم علماء و حکماء کا ذکر کیا ہے۔ اس نے ہر صدی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر نصف صدی ایک نہ ایک مسلمان عالم کے نام سے منسوب ہے۔ بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدیوں کی ہر نصف صدی میں ایک کے بجائے تین تین نام درج کیے ہیں۔ ان میں ایک مسلمان، ایک عیسائی اور ایک یہودی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ گیارھویں صدی کے آخر تک کوئی غیر مسلم اس امتیاز کا اہل نہ تھا۔ ان تیرہ نصف صدیوں میں مسلمانوں کے اہم ترین عالموں کے نام یہ ہیں:

1- ابو موسیٰ جابر ابن حیان
2- ابو عبداللہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی
3- ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی
4- ابوالحسن علی ابن الحسین المسعودی
5- ابوالوفا محمد ابن یحییٰ البزجانی
6- ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی
7- ابوالفتح عمر ابن ابراہیم (یہ عمر خیام کے نام سے زیادہ مشہور ہے)
8- ابو مروان بن زہر
9- ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد
10- ابو محمد عبداللہ ابن احمد البیطار
11- محمد ابن مسعود قطب الدین شیرازی
12- ابوالفدا اسمعیل ابن علی عماد الدین الایوبی
13- عبدالرحمن ابن خلدون

جب یہ کتاب قسطوں میں "فاران" میں شائع ہو رہی تھی تو "فاران" کے مدیر مولانا ماہر القادری نے لکھا تھا:

"مسلمانوں کی سائنسی ایجادات و ترقی پر گراں قدر مضامین لکھ کر جناب حبیب احمد صدیقی نے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں کو چونکا دیا۔ سائنس اور بعض دوسرے علوم و فنون کے کیسے کیسے نازک مسائل کو کس قدر سہل بنا کر پیش کیا ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ فولاد کو پانی کر دیا ہے۔"

میں نے اپنا دوسرا مجموعہ کلام "گل صد برگ" جب مرتب کیا تو مولانا مرحوم نے پیش لفظ لکھا اور اس میں مندرجہ بالا جملے بھی نقل کیے۔

اہل مغرب کہتے ہیں کہ ان کی علمی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) پندرہویں صدی میں رونما ہوئی۔ مگر بریفو "تعمیر انسانیت" میں اس نظریہ کی پرزور تردید کرتا ہے اور کہتا ہے:

"یہ صحیح نہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں ہوئی۔ دراصل وہ عرب اور بربر کے مسلمانوں (Moors) کے زیر اثر یورپ کی تہذیب کا احیاء تھا۔ اٹلی نہیں بلکہ اسپین (جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی) یورپ کی حیات نو کا گہوارہ تھا۔ مسلسل وحشت کی گہرائیوں میں گرتے گرتے جب یورپ جہل و پستی کی تاریک ترین گہرائی تک پہنچ چکا تھا، اس وقت اسلامی دنیا میں بغداد، قاہرہ، قرطبہ، طلیطلہ اور ٹولیڈو تہذیب اور ذہنی سرگرمیوں کے ترقی یافتہ مرکز تھے اور وہیں وہ زندگی رونما ہوئی جس نے انسانی ارتقا کو ایک نئی سمت بخشی۔ جوں ہی یہ تہذیب اثر انداز ہونے لگی (یورپ میں) ایک نئی زندگی کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔"

مسلمانوں کی علمی فوقیت کا اعتراف کرنے کے بعد بریفو لکھتا ہے:

"یہ امر صریحاً غیر فطری ہے کہ ایک تابناک اور فعال تہذیب جو تخلیقی عمل میں مصروف ہو، ہمسایہ آبادیوں کے نشوونما پر، جو جہالت میں ڈوبی ہوئی ہوں اور جن سے ان کا ربط ضبط ہو، ان پر گہرا اور حیات آفریں اثر نہ ڈالے۔ اسلام اور یورپ کے باہمی ربط و ضبط کی تاریخی شہادت کی ہر تفصیل کو دبانے اور مسخ و نابود کرنے کی سازش کے باوجود یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ فطری قانون معطل نہیں ہوا تھا۔ اگر ان تمام حالات اور شواہد کو مسخ کرنے اور ان کو مٹانے کی کوششوں اور پیہم تعصب و تحریف کے محرکات کو جن کی گرفت سے ایک واقعہ بھی نہیں بچا ہے، پیش نظر رکھا جائے تو اس قول میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ اثر کا جائزہ لینے میں مبالغہ کے بجائے کوتاہی کرنے ہی کا امکان ہے۔ یہ قریب قریب یقینی ہے کہ عربوں کے بغیر یورپ کی جدید تہذیب رونما نہیں ہو

سکتی تھی اور ان کے بغیر اس تہذیب کو وہ منصب حاصل نہیں ہوتا جس نے اسے ارتقا کے پچھلے تمام مدارج سے بلند کر دیا۔ یوں تو یورپی نشوونما کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کا سراغ نہ ملے مگر نیچرل سائنس اور سائنسی مزاج پیدا کرنے میں جو نئی دنیا کی سب سے بڑی امتیازی قوت ہے اور اس کی کامیابی کے سب سے بڑے مآخذ ہیں، اس تہذیب نے مہتم بالشان کردار ادا کیا ہے۔"

(بریفو: تہذیب انسانیت)

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں جارج سارٹن نے عیسائی اور یہودی حکماء کو مسلمان حکماء کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا ہے۔ اگر یورپ میں پندرھویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کا ظہور تسلیم کیا جائے تو ان تین صدیوں میں علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود یورپ میں ایسے عظیم اہل علم کہاں سے آ گئے تھے جو مسلمانوں کے عظیم ترین اہل علم کے ہم مرتبہ تصور کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ پندرھویں صدی میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا پرفریب دعوے بالکل ناقابل قبول ہے۔ صدیوں پہلے سے اہل یورپ مسلمانوں کے علوم سے استفادہ کر رہے تھے جس کے نتیجہ میں یورپ میں نور علم پھیلا۔ مسلمانوں کا احسان ماننے کے بجائے احسان فراموشی اس لیے اختیار کی گئی کہ مسلمانوں کو حقیر اور جاہل ٹھہرایا جائے۔ صدیوں بعد اب بریفو کی طرح کے کچھ اور یورپی اور امریکی اہل علم نے بھی حقیقت کا اعتراف کرنا مناسب سمجھا۔

آج کل کے مسلمان حقیقت سے ناواقف ہونے کے باعث یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمان اہل علم سائنس سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔

میں اپنے عزیز دوست اسمٰعیل احمد مینائی موجودہ مدیر "فاران" و سابق رکن مجلس شوریٰ (پاکستان) کا بہت شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب پر عالمانہ پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور اس رائے کا اظہار کیا کہ اسے زیادہ سے زیادہ پاکستانی مسلمانوں کو پڑھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے شاندار ماضی کی رفعتوں سے روشناس ہو کر ایک شاندار مستقبل کی تعمیر کا تہیہ کر سکیں۔

حبیب احمد صدیقی

پیش لفظ

زمانہ با امم ایشیا چہ کرد و کند — کسے نہ ماند کہ ایں داستاں فرو خواند
تو صاحب نظری آنچہ در ضمیر من است — دل تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من — کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

اقبال نے یہ قطعہ حمید اللہ خاں مرحوم سابق والئی بھوپال (موجودہ صدر مقام مدھیہ پردیش بھارت) کی نذر کیا تھا، جب اپنی تصنیف "زبورِ عجم" پیش کی تھی۔

حبیب احمد صدیقی صاحب کی یہ تصنیف "مسلمان اور سائنس کی تحقیق" کے مسودے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بے اختیار یہ اشعار میری زبان پر جاری ہو گئے۔ اللہ اکبر! ہمارے اسلاف کیا تھے، کتنے عظیم تھے، کیسے کیسے کارنامے انہوں نے انجام دیے۔ عالمی تاریخ کے ہر ورق پر، ہر صفحے پر کیا کیا نقوش انہوں نے چھوڑے ہیں۔ یہ مہتم بالشان اور ایمان افروز داستان دلنواز بھی ہے اور دلدوز بھی۔ اس داستان سے ان لاتعداد داستانوں کا سراغ ملتا ہے جو آج مغرب کی علمی، ثقافتی اور فنی تفوق و برتری کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں اور اسی داستان میں وہ عظمت پارینہ دمکتی اور چمکتی ہے جس کی آب و تاب سے کسب نور کر کے مغرب اس مرتبے اور منزل کو پہنچا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مغرب ہی کے اہل علم نے صدیوں حقیقت اور سچائی کو دبائے اور چھپائے رکھا کہ وہ آج سیادت عالم کے جس مقام ارفع و اعلیٰ پر فائز ہے وہ اس کو صرف اس لیے حاصل ہے کہ پہلے اس نے عالم اسلام کی تقریباً ایک ہزار سالہ علمی ترقیوں اور تحقیقی کاوشوں کا سہرا بڑی حکمت و دانائی سے یورپ اور عیسائیت کی نشاۃ ثانیہ کے سر باندھا اور پھر اس فریب کے بل بوتے پر مسلمانوں کو چار دانگ عالم میں اس قدر رسوا اور مطعون کیا کہ جہالت و تعصب، تنگ نظری اور دون فطری اور مسلمان مترادف اور ہم معنیٰ سمجھے جانے لگے۔ جب اپنی سازش میں وہ کامیاب ہو گیا تو اس نے ایشیا اور افریقہ کے وسیع و عریض براعظموں کے تمام ممالک کو جو افرادی قوت کی توانائیوں سے سرشار اور معدنی و زرعی دولتوں

سے مالا مال تھے، اپنا غلام بنا کر دو صدی میں ذہنی طور پر ایسا مغلوب و مقہور، معذور و مجبور کر دیا کہ وہ اپنی حقیقت و اصلیت سے بے خبر و بیگانہ ہو کر نہ صرف اپنے تابناک ماضی سے بالکل کٹ گئے بلکہ اپنے مستقبل کی طرف سے بھی یکسر مایوس و مضمحل ہو گئے کہ وہ اس دام غلامی و محتاجی، نکبت و نحوست کے ایک حلقے کو بھی ڈھیلا نہیں کر سکتے جس میں وہ اسیر ہیں اور بظاہر اس وقت تک اسیر رہیں گے جب تک مغرب اپنی اندرونی چپقلش کے ہاتھوں خود ہی کمزور نہ ہو جائے۔ شاید یہ حلقے اس وقت کچھ ڈھیلے ہوں اور ان اسیران خود فریبی میں اگر اس وقت تک کوئی رمق طاقت و توانائی کی باقی رہ گئی تو ممکن ہے، ان میں سے چند رہائی کی دولت سے سرفراز ہو جائیں۔

مغرب اپنی اس تمام سازشی جدوجہد میں رفتہ رفتہ خدا کو بالکل بھولتا اور بھلاتا گیا اور جب منزل مراد کو پہنچا تو حالت یہ ہے کہ وہ دو بڑے طاقت ور کیمپوں میں منقسم ہے جو متحد المقاصد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں اور کلام ربی و ربانی کی یہ ابدی سچائی ان کو مسلسل للکار رہی ہے۔ و مکرو و مکراللہ واللہ خیر الماکرین۔

یہ تو سیاسی اور سماجی صورت حال ہے لیکن علمی و تمدنی میدان میں یہی مغرب جس مرحلے سے دو چار ہے، وہ بھی کچھ کم ذلت خواری کا غماز نہیں۔ وہی مغرب اور اسی مغرب کے انہیں علماء و اہل علم کے جانشین اور ورثاء جنہوں نے اسلام کے اکابر اور اس کے پیروؤں کو جاہل و بدکار، متعصب و اشرار، فسادی اور عیار ثابت کرنے کے لیے مکر و فریب، اختفا و افترا، سازش اور کذب کے الفاظ کو نئے معنیٰ دیے تھے آج ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش کر رہے ہیں۔ نئی اور پرانی دنیا کو، مسلم اور غیر مسلم کو اس سے آگاہ و باخبر کرنے کی کہ محمد الرسول اللہ کی بعثت تک اور طلوع اسلام سے پہلے خاص کر عیسائی ایک مظلوم و مقہور قیدی کی حیثیت رکھتے تھے اور جمال حق کی ضیا کو صیہونی مکاری و مکر کے خوبصورت و خوشنما حجابات انسانیت کی بینش و بینائی سے عمداً دور اور مستور کر رکھا تھا۔ اسلام آیا تو اپنے ساتھ حریت آدم ہی نہیں حریت فکر کا پیغام بھی لایا اور دیکھتے ہی دیکھتے شود ہجری کی اولین تین صدیوں میں نصف سے زیادہ معلوم و معروف کرہ ارضی علم و تحقیق کے دو نوری خورشید کی کرنوں سے جگمگا اٹھا اور حیات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا جو علوم و فنون کی اس عالمگیر ترقی اور ترویج کے فوائد و ثمرات سے آسودہ نہ ہوا ہو۔

جوں جوں اسلام پھیلتا رہا مسلمان آگے بڑھتے رہے۔ جہل کی ظلمت اور اوہام پرستی کی تاریکی چھنٹتی چلی گئی اور مدینہ و کوفہ کے بعد دمشق و حلب، بصرہ و بغداد اور قرطبہ و غرناطہ کے علمی و تحقیقی مراکز یکے بعد دیگرے حریت فکر و نظر، تہذیب، اخلاق، تربیت عقائد اور انہدام، جبر و استحصال کی تمام تحریکوں کی امامت کرتے رہے۔

پھر کیا ہوا۔ یہ داستان بہت دلدوز اور جانکاہ ہے۔ اپنوں ہی کی سازش سے پہلے بصرہ و بغداد تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئے اور بیت الحکمت کے جمع کردہ بیش بہا علمی خزائن جلا کر خاک کر دیے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحقیق و تدقیق کا جو سیل رواں مشرق سے مغرب کو ملا رہا تھا بالکل خشک ہو گیا۔ ہر چند کہ جلد ہی افریقہ کے دور دراز ریگ زاروں اور وسطی ایشیاء کے سرسبز علاقوں میں عالم اسلام کے بچے کھچے علماء اور اہل علم نے اپنے فرائض منصبی کی تجدید کا سامان فراہم کیا اور خوارزم، فرغانہ، ہرات، غزنی، سمرقند، بخارا، خیوا، المراکش، طونس (جہاں اسلام اپنے قدم جما چکا تھا) میں نئے علمی مراکز نمودار ہوئے، لیکن جس پیمانے پر تیسری صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک کام آگے بڑھا تھا اس میں سستی اور پستی پیدا ہو گئی۔

اس وقت دنیائے یورپ ہنوز جہالت و تعصب کی تاریکی میں غرق تھی اور گو ہسپانیہ اور صقلیہ کے مسلم حکمرانوں کی معارف پروری اور علم دوستی کا ابر کرم یہودی اور عیسائی اہل علم پر بھی اسی طرح سایہ فگن تھا جس طرح مسلمانوں پر لیکن عیسوی دنیا کے مذہبی پیشوا اور ان کے زیر اثر برطانیہ، فرانس، اطالیہ اور المانیہ کے عیسائی حکمرانوں نے ٹھیک اس وقت جب مسلم دنیا مشرق میں ہلاکو اور چنگیز کے جانشینوں سے نبرد آزما تھی، انہوں نے مغرب میں محاربات صلیبی کا سلسلہ چھیڑ دیا جس سے مغرب کی علمی سرگرمیاں بھی اسی طرح متاثر و مفلوج ہو گئیں جیسے مشرق میں تاتاریوں کے یلغار سے رک گئی تھیں اور ارتقائے علوم عمرانی (سائنس، معاشرت و معیشت) کے اس زریں دور کا خاتمہ ہو گیا جب اقلیم علم و حکمت میں مسلمانوں اور صرف مسلمانوں ہی کا سکہ رائج تھا۔

ہسپانیہ میں ابھی تک چند مسلمان حکمرانوں کی عملداری تھی۔ اس لیے تیرھویں، چودھویں صدی عیسوی تک مسلمان علماء و فضلا تحقیق و تدقیق کے میدان سے بالکل باہر نہیں کیے جا سکے تھے۔ عیسائی اہل علم کے ساتھ مسلمان علماء کا تذکرہ بھی اس عہد کے تذکروں اور تواریخ میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں مسلمان علمی اور عملی رزم گاہ حیات سے تقریباً بالکل خارج ہو گئے اور نکبت و جہالت، پستی و پس ماندگی کا وہ دور شروع ہو گیا جس میں ظہور پاکستان کی بدولت اب کچھ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صیہونیت اور نصرانیت کا یہ طویل گٹھ جوڑ اپنے سیاسی عزائم میں کامیاب ہو گیا۔ مسلم امہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ خلافت ختم کرا دی، اسرائیل کا خنجر قلب اسلام میں گھونپ کر وہیں چھوڑ دیا لیکن اس شیر کو پھر بھی بالکل مردہ نہ بنا پایا۔ سترھویں اٹھارھویں صدی میں اخلاقی شعور کی جس بیداری کی سرزمین یورپ پر ابتداء ہو چکی تھی، اس نے بھی انیسویں

صدی کے خاتمے اور بیسویں صدی کے آغاز پر ایک منظم اور طاقت ور تحریک کی شکل اختیار کرلی جس کا مطمح نظر تلاش حقیقت اور جس کا نصب العین اعلان حق تھا۔ یورپی مستشرقین اس تحریک کا ہراول دستہ تھے اور مغرب کے نامور حکما و علما کا ایک مضبوط گروہ اس کا لشکر اور اس کی فوج، ان دونوں عناصر کی نیتیں بخیر نہ تھیں ۔ لیکن رائے عامہ کے عصری دباؤ کے تحت (جو بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے مغربی معاشرے کا ایک موثر جز بنتا گیا) یہ دونوں ٹولے (مستشرقین اور محققین) اس پر مجبور ہوئے کہ نتائج و عواقب کی تصویب و ترتیب میں واقعات و حوادث کو نہ مسخ کریں نہ مخفی رکھیں ۔ البتہ ان سے استخراج و استنباط اپنے حسب منشاء کریں تاکہ مسلم امہ اپنے شاندار ماضی کی تصویر دیکھ کر بھی اپنے مستقبل کی تشکیل اس طرح کرے جیسے یہ غیر مسلم مورخ و مستشرقین چاہتے ہیں ۔ اس منصوبے کا آغاز اس اعتراف کے ساتھ کیا گیا کہ "یورپ عربوں کے علمی و تحقیقی کارناموں کی بدولت ہی دور ظلمت سے نکلا۔"

پھر جو تصنیفی و تالیفی مہم (Campaign) شروع کی گئی تو تمام یورپی زبانوں اور ممالک میں اس کا زور اور اس کا بہاؤ روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے ۔ عہد حاضر میں اس تحریک کے سرغنہ آرنلڈ ٹوئبی اور منگری واٹ ہوئے ۔ ان کے پیشرو بھی کچھ کم معروف و مشہور نہ تھے ۔ رابرٹ بریفو (Robert Briffault) نے اپنی مشہور تصنیف تعمیر انسانیت (The Making of Humanity) میں عربوں کی علم دوستی، معارف پروری، تحقیق علمی، اظہار حقیقت اور تلاش حکمت میں قلم توڑ دیے۔ بریفو اسلام کے ثنا خوانوں میں سے نہیں ہے ۔ اس کا خیال تو یہ ہے کہ مسلمان فرمانرواؤں کی مذہبی بے راہ روی ہی سے انسان کو وہ آزادی میسر ہوئی جو اس کو اپنی جبلی صلاحیتیں پورے طور پر بروئے کار لانے میں مدد دیتی ہے ۔ ول ڈیوراں (Will Durant) اس گروہ کا دوسرا اہم رکن ہے اور جارج سارٹن تیسرا ۔ یہ دونوں بھی اسلام کے قدر دان یا مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں ہیں ۔ ان کو بھی اسلام کے بارے میں اسی قبیل کی غلط فہمیاں لاحق ہیں جن کا شکار بریفو ہے ۔ اس سے بہت پہلے گبن (Gibbon) اور دیگر یورپی مورخین اور تذکرہ نگار بھی تھے ۔ یہ داستان طویل ہے ۔ یہاں اس جانب اشارہ کرنے سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہی یورپ جس کی تہذیب جدید قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے مسلم اہل علم کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کی سراسر رہین منت ہے ۔ اسی یورپ نے صدیوں تک دنیا سے اس حقیقت و صداقت کو چھپانے کے لیے سارے جتن کیے تاکہ تہذیب جدید کی برکات کا سہرا اپنے سر باندھے رہے ۔ اب وہی یورپ اس پر مجبور ہے کہ اپنے ہم وطنوں ہی کو نہیں خود مسلم امہ کو اس حقیقت سے آگاہ کرے کہ دنیا تہذیب و ترقی کے جس مقام ارفع پر آج کھڑی ہے وہ مقام اس کو بڑی حد تک عربوں اور مسلمانوں ہی کی علمی اور سائنسی کاوشوں سے نصیب ہوا ہے۔

حبیب احمد صدیقی صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف حقائق اور معلومات کا ایک خزانہ ہے جس میں مسلم امہ کا ماضی اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ ضیا بار ہے ۔ جس تفصیل سے مسلمان اہل علم کا جائزہ لے کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ عہد جدید کی تقریباً جملہ سائنسی، فنی اور علمی ترقی قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے مسلمان علما، حکما اور دانش وروں کی ژرف نگاہی و عرق ریزی کی منت پذیر ہے، بلکہ دراصل انہیں کی تحقیق و تدقیق کے نتائج کی پیش رفت اور تکملہ ہے وہ شاید ہی اردو زبان کے کسی اور تاریخی تذکرے میں مل سکے ۔ اس نقطہ نظر سے یہ تصنیف اس قابل ہے کہ اس کو جامعات اور کالجوں کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ طلبا اور متعلم خاص کر مسلمان متعلمین نہ صرف اپنے ماضی کی صحیح تفصیلی تاریخ سے باخبر ہوں اور یہ جانیں کہ ان کے بزرگوں اور اکابر کا کارنامہ تبلیغ و تفہیم ہی نہیں، تعمیر و ترویج علم کے سلسلے میں بھی کتنا بیش مقدار اور جاندار ہے۔

یہ کتاب جن قسط وار مقالات کے مجموعے پر مشتمل ہے وہ فاران میں شائع ہوئے تھے اور میری نظر سے گزرے تھے لیکن مجھ کو اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ان کے اندر معلومات و تفصیلات و جزئیات کا جو خزانہ جمع کیا گیا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ مجھ کو اب ہوا ہے، جب ان اکیس بائیس مقالات کو یکجا کرکے تصنیف کی شکل دی گئی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ سائنس کے علاوہ بھی اور بہت سے فوائد یورپ کو اسلامی تہذیب و تمدن سے بہم پہنچے ہیں جن پر مزید صیقل کرکے یورپ اور اس کی مختلف اقوام نے وہ تمدنی اور ثقافتی یک رنگی اور ہم آہنگی حاصل کی جو فی زمانہ سارے عالم کے لیے مشعل راہ ہے۔

کتنے نئے علوم و فنون تھے جن سے مسلمان اہل علم نے پہلی مرتبہ اہل یورپ کو روشناس کیا۔ علم ہیئت کے ساتھ جغرافیہ، علم ریاضی کے ذیل میں علم ہندسہ اور علم جبر و مقابلہ، بحریہ کے تحت تجارتی جہاز رانی اور سیاحت، تاریخ طبیعی اور اس کے تحت علم الحیوان، علم النبات اور علم الجمادات۔ علم طبیعیات کے ذیل میں علم المناظر، بصریات، موسیقی، علم سکون سیالات و ناموتات علم الصاحہ۔ ان سب علوم سے اہل یورپ عربوں اور مسلمانوں ہی کے توسط سے روشناس ہوئے۔ علوم کے علاوہ بہت سے فنون بھی ایسے ہیں جو مسلمان امراء اور حکمرانوں کے ذوق و شوق، دلچسپی اور مشاغل کی بنا پر مشرق سے مغرب میں متعارف ہوئے، جیسے شہسواری، شکار، سفر ناموں کی تحریر و ترتیب وغیرہ۔

کیمیا سازی مسلمانوں کو یونانیوں سے پہنچی تھی ۔ مسلمانوں نے یونانیوں کے اخذ کردہ نتائج کو عارضی نظریات کے طور پر استعمال کرکے اس علم کو اس قدر ترقی دی کہ علم کیمیا کے بیشتر اعمال جیسے تقطیر (Distillation) اور ترديق (Filtration) وغیرہ انہوں نے ہی ایجاد کیے۔

پوری کتاب ایسے ہی چونکا دینے والے اور حیرت زدہ کرنے والے واقعات سے اور اعداد و شمار سے بھری پڑی ہے جن کے مطالعہ سے یورپ و امریکہ کی دانش و حکمت، صنعت و حرفت، تکنیکی اور فنی مہارت میں مشرق پر غیر معمولی غلبہ کا سارا راز اور فلسفہ سمجھ میں آجاتا ہے اور قرآن کے اس ازلی قانون کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی امامت کی حق دار صرف وہی اقوام ہیں اور ہوتی رہیں گی جو تحقیق و تدقیق، دانش و حکمت، علمی تجسس و جستجو کو شعار زندگی بنائیں اور ان مشاغل کے نتائج سے معاشرے کی تعمیر میں پورا پورا استفادہ کریں۔

اس کتاب (مسلمان اور سائنس کی تحقیق) کو نہ صرف جامعات و کالج کے نصاب میں شامل ہونا چاہیے بلکہ ہر مسلمان گھر کے مکینوں کو اس کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے شاندار ماضی کی رفعتوں سے روشناس ہو کر ایک شاندار مستقبل کی تعمیر کا تہیہ کر سکیں۔ فاضل مصنف پوری ملت کی طرف سے اور خاص کر پاکستانی قوم کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کیونکہ امت کے نوجوانوں کی صحیح علمی رہنمائی میں ان کی یہ تصنیف سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اس کتاب کا آغاز بریفو کے چند جملوں سے کیا ہے جن میں سے دو ایک یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ان سے ثابت ہوگا کہ سائنس کی مضبوط بنیاد مسلمانوں نے ہی رکھی تھی اور وہی یورپ کی جدید تہذیب کے بانی ہیں کیونکہ مسلمانوں کی عطا کردہ سائنس کی بدولت ہی یورپ نے ترقی کی ہے۔ چند جملے یہ ہیں:

"ہماری سائنس اس بات کے لیے عربوں کی مرہون منت نہیں کہ انہوں نے چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریے پیش کیے۔ ہماری سائنس اس سے کہیں زیادہ عربوں کی زیر بار احسان ہے۔ اس کا وجود ہی ان کی بدولت ہے۔"

"یہ قریب قریب یقینی ہے کہ یورپ کی سرزمین پر عربوں کی سیادت اور ان کے نفوذ و اثر کے بغیر یورپ کی جدید تہذیب رونما نہیں ہو سکتی تھی۔"

اللہ تبارک و تعالے ان کی اس سعی کو مشکور و مقبول کرے اور دین و دنیا میں صلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اسمٰعیل احمد مینائی

سی 35، بلاک نمبر 8 گلشن اقبال، کراچی نمبر 47

مسلمانوں کی علم دوستی

1- "یہ امر قریب قریب یقینی ہے کہ عربوں کے بغیر یورپ کی جدید تہذیب رونما نہیں ہو سکتی تھی۔"

2- "ہماری سائنس اس بات کے لیے عربوں کی مرہون منت نہیں کہ انہوں نے چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریے پیش کیے۔ سائنس اس سے کہیں زیادہ عربوں کی زیر بار احسان ہے۔ اس کا وجود ہی ان کی بدولت ہے۔"

3- "جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں تحقیقات کی نئی روح دریافت کرنے کے نئے انداز فکر، تجربہ، مشاہدہ اور پیمائش کے نئے طریق کار اور ریاضی کو درجہ تکمیل تک پہنچانے کا وہ ضابطہ اختیار کرنے سے نمودار ہوئی جس سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ اس روح اور ان طریقوں سے یورپ کو عربوں نے متعارف کرایا تھا۔"

4- "ارسطو نے طبیعیات، حیوانیات اور نباتیات پر کتابیں لکھیں مگر اسے کبھی کوئی تجربہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ جن امور کا صحیح یا غلط ہونا بہت آسانی سے معلوم کیا جا سکتا تھا ان کی تصدیق کی زحمت بھی اس نے نہیں اٹھائی۔ وہ بڑے اطمینان سے یہ غلط دعوٰی کرتا ہے کہ مرد کے دانتوں کی تعداد عورت کے دانتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جالینوس (Galen) جو علم التشریح کا مسلم الثبوت ماہر ہے، کہتا ہے کہ نیچے کے جبڑے میں دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ بات اس وقت تک مانی جاتی رہی جب تک کہ عبداللطیف نے انسانی کھوپڑی کے مشاہدے کے بعد اسے غلط نہ ثابت کر دیا۔"

مندرجہ بالا چاروں جملے رابرٹ بریفو (Robert Briffault) کی کتاب "تعمیر انسانیت" (The Making Of Humanity) سے لیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کو نصف صدی سے

زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ پہلی بار 1919ء میں چھپی تھی اور اس کے بعد بھی کئی بار چھپی ہے جس سے اس کتاب کے معیاری اور مقبول ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی تہذیب کو ترقی دینے اور علوم بالخصوص سائنس کے نشوونما میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ ہمارا انگریزی داں طبقہ تو اس سے کچھ نہ کچھ آشنا ہے مگر ہمارے اہل علم میں جو انگریزی نہیں جانتے اور جن کا عربی زبان کا مطالعہ صرف مذہبی کتابوں تک محدود ہے وہ بھی غالباً اپنے اسلاف کے ان زریں کارناموں سے ناواقف ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کرکے یہ بتایا جائے کہ کئی صدیوں تک مسلمانوں نے علم و حکمت اور تہذیب و تمدن میں ساری دنیا کی رہنمائی کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلی پانچ صدیوں میں مسلمان علمی حیثیت سے اپنا وقار کھو چکے ہیں لیکن ہم اگر اپنے اسلاف کی طرح پھر ہمت، حوصلہ اور عرق ریزی سے کام لیں تو بہت جلد مغربی قوموں کے دوش بدوش چل سکتے ہیں۔ جاپان اور چین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ علم و حکمت پر اہل مغرب کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ جو قوم بھی عزم جواں سے کام لینے پر آمادہ ہو جائے وہ اپنی پسماندگی کو مختصر سی مدت میں دور کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ چین نے صرف بائیس سال میں جو ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ یہ وہی چین ہے جو دنیا بھر میں افیمچی مشہور تھا۔ چینیوں نے اپنی آزادی کے بائیس سال کو ہماری طرح ضائع نہیں کیا۔ اب سے پچانوے (95) سال پہلے مولانا الطاف حسین حالی کا مسدس شائع ہوا تھا۔ جس میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے وجوہ نہایت وضاحت سے بیان کیے تھے اور غیرت دلائی تھی کہ وہ قوم جو اسلام کا پرچم لے کر نکلی تھی اور صدیوں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت پر حکمراں رہی تھی وہ "غریب الغربا" بن گئی ہے اور

جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ — خود آج وہ مہمان سرائے فقراء ہے
وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں — اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

انہوں نے توقع کی تھی کہ شاید قوم کو کچھ غیرت آئے اور وہ اپنا کھویا ہوا ورثہ حاصل کرنے کی سعی جمیل کرے۔ جب سے اب تک یعنی تقریباً ایک صدی میں ہم نے اتنا ضرور کیا کہ ہندوستان کے پانچویں حصے پر ایک سلطنت قائم کرلی اور اسی کو دوہنے میں لگ گئے لیکن مزید تنگ و دو غیرضروری سمجھی۔ جہاں تک علم و حکمت کے ورثے کی بازیافت کا سوال ہے وہ بدستور ایک ایسا خواب بنا ہوا ہے جو شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ ہم اہل علم کی حاشیہ برداری پر قانع ہو گئے ہیں اور اس قناعت میں مگن ہیں۔ کاش ہم حصول علم میں بھی وہ تندہی، وہ استقامت، وہ لگن پیدا کر سکتے جو ہمارے سرمایہ داروں نے دولت سمیٹنے میں کی ہے۔

جس راہ پر ہم گامزن ہیں وہ منزل تک نہیں جاتی۔ ہم ایک بھول بھلیاں میں پھنس گئے

ہیں۔ گھوم پھر کے وہیں آ جاتے ہیں جہاں سے آغاز سفر کرتے ہیں۔ راہ مستقیم چھٹے صدیاں ہو گئیں۔ اب ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ راہ تھی کہاں اور اس کا سراغ کیونکر مل سکتا ہے۔ یہ بھی ہم کو غیروں سے معلوم ہوا ہے کہ کبھی ہم نے بھی بزم جہاں کو نور علم سے جگمگایا تھا۔ اور جیسے آج انگریزی سیکھنا مہذب کہلانے جانے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے ویسے ہی عربی سیکھنا طرہ امتیاز تھا۔ تمام علوم اسی زبان میں تھے اور اس کی سینکڑوں ہزاروں کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں کیے جاتے تھے۔ بریفو کی کتاب کے اقتباسات پیش کرنے کی غایت یہ ہے کہ شاید اپنے اسلاف کے علمی کارنامے پڑھنے کے بعد ہم میں سے کچھ گم شدہ ورثے کی تلاش پر مائل ہو جائیں۔

اسلام کے بارے میں بریفو کی غلط فہمی

بریفو کے اقتباسات پیش کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ وہ اسلام کے ثناخوانوں میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا خیال ہے کہ مسلمان فرماں رواؤں کی مذہبی بے اعتنائی سے وہ آزادی میسر ہوئی جو انسان کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو روبکار لانے میں مدد دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خلافت راشدہ کا مختصر دور ختم ہوتے ہی زمام خلافت اسلام۔ کے بدترین دشمنوں یعنی بنی امیہ کے ہاتھ آ گئی اور ان سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ اسلام سے اپنی دشمنی نکالیں۔ سیاسی مصالح کی بنا پر وہ اسلام کا نام برائے نام لیتے رہے مگر اس سے جتنی بے اعتنائی برتی جا سکتی تھی، برتی گئی۔ ان کے بعد بنو عباس نے اقتدار سنبھالا، ان پر ایرانی تہذیب چھائی ہوئی تھی اور ان کا اسلام بھی نمائشی تھا ان کے زمانے میں آزاد خیالی اسلام پر حاوی ہو گئی۔ چنانچہ خلیفہ مامون جس نے علم و حکمت کو سب سے زیادہ ترقی دی، کہا کرتا تھا کہ خدا کے برگزیدہ بندے وہ ہیں جو اپنی زندگی عقلی صلاحیتوں کو نشوونما کے لیے وقف کر دیں۔ جب نیم وحشی قوموں نے خلافت عباسیہ کا تختہ الٹ کر اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں اور اسلام قبول کرلیا تو اسلام میں شدت اور تنگ نظری آ گئی۔ اسلام کے اس فروغ نے ساری ذہنی جد و جہد پر پانی پھیر دیا۔

بریفو کا یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں۔ بنو امیہ من حیث القوم اسلام کے دشمن نہیں تھے۔ ابوسفیان جس نے جنگ احد اور جنگ احزاب میں کفار کی قیادت کی تھی، بیشک بنو امیہ میں سے تھا، مگر اس کی نامور بیٹی ام حبیبہ اسلام کے ابتدائی دور ہی میں مسلمان ہو گئی تھیں اور کفار کی ایذا رسانی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں۔ وہاں ان کا شوہر عیسائی ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ایمان کی استواری اور ان کی بے چارگی کے پیش نظر انہیں ام المومنین بننے کا شرف بخشا۔ ابوسفیان کے بیٹے معاویہ نے بھی فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول

کرلیا تھا۔ اور خود ابوسفیان جب ایمان لایا تو خدا نے اس کو ایسا راسخ العقیدہ بنا دیا کہ وہ شوق شہادت میں اپنی کبیر سنی کے باوجود رومیوں سے لڑنے والی مسلمان فوج میں جا شامل ہوا اور جام شہادت نوش کیا۔ بنو امیہ کی نوے سال کی حکومت میں اسلام کو بہت فروغ ہوا اور اسلامی سلطنت اتنی وسیع ہو گئی کہ اس سے پہلے کبھی دنیا میں اتنی بڑی سلطنت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس خاندان میں اچھے اور برے دونوں طرح کے حکمران گزرے ہیں۔ اس خاندان کے خلیفہ الحکم ثانی کے بارے میں جو اسپین کا فرماں روا تھا اور جس نے 961ء سے 976ء تک حکومت کی جارج سارٹن (George Sarton) نے مقدمہ تاریخ سائنس (Introduction to the History of Science) میں لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ علم دوست اور سب سے زیادہ عالم و فاضل حکمران تھا۔ اور اس نے علم کو اتنا فروغ دیا تھا کہ جامع قرطبہ دنیا کے علوم کا مرکز بن گئی تھی۔ مختصر یہ کہ بنو امیہ کے بہت سے حکمراں پکے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ علم دوست بھی تھے۔

بنو عباس میں بھی اچھے اور برے دونوں طرح کے حکمراں ہوئے ہیں۔ ان سب کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ ان کا اسلام نمائشی تھا اور دل سے وہ اسلام کی عظمت کے قائل نہ تھے، تاریخی حقائق کو جھٹلانا ہے۔ یہاں ان کے مذہبی کارنامے بیان کرنے کا محل نہیں۔ صرف خلیفہ ہارون کی ملکہ زبیدہ کا ہی ایک کارنامہ ایسا ہے جو اس خاندان کے بادشاہوں کا نام ہمیشہ روشن رکھے گا۔ نہر زبیدہ آج بھی اسلامی مرکز مکہ مکرمہ کے باشندوں اور وہاں ہر سال جمع ہونے والے حاجیوں کی خدمت کر رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ یورپ کے لوگوں کو مذہب کا بڑا تلخ تجربہ ہے اور انہوں نے مذہب کے شکنجے سے نکل کر ہی آزادی فکر و عمل حاصل کی ہے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مذہب ظالمانہ بندشوں کا نام ہے وہ اسلام کو بھی عیسائیت کی طرح ایک شکنجہ ہی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ کوشش کرتے تو ذرا سے غور و فکر کے بعد اس فرق کو سمجھ لیتے جو عیسائیت اور اسلام میں ہے۔ اسلامی قوانین کا دار و مدار اللہ کے کلام (قرآن) اور اللہ کے رسول محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال پر ہے۔ اس کے برخلاف عیسائیت میں قانون سازی کا اختیار پوپ کو ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قانون انسانوں کے محدود علم، ناقص عقل اور خواہش نفس پر مبنی ہو وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے احکام کے مقابلہ میں کس قدر حقیر اور لغزشوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ پھر جب تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ کچھ پوپ نہایت خود غرض، نفس پرست اور زمانہ ساز تھے تو ان کے احکام نے یقیناً مفاد عامہ کے بجائے خود اپنے مفاد کو پیش نظر رکھا ہوگا۔ اس بات کو واضح کرنے کے لیے پوپ الگزینڈر ششم (Alexander Vi) کی بیسیوں بدعنوانیوں میں سے ایک پر غور فرمائیے۔ اس نے اپنے ناجائز بیٹے سیزر بورجیا (Caesar Borjia) کو اٹھارہ سال کی عمر میں کارڈینل (Cardinal) بنا دیا۔ پوپ کے بعد کارڈینل کا منصب سب سے اہم ہوتا ہے۔ قانوناً کوئی ایسا شخص کارڈینل نہیں بنایا جا سکتا تھا جو ازدواجی رشتے کے باہر پیدا ہوا ہو۔ پوپ نے اپنے ناجائز بیٹے کو ایک اور شخص کا بیٹا ٹھہرایا اور اس کی

تائید میں باقاعدہ ایک فرمان (Bull) جاری کیا۔ پوپ کا ہر فرمان ہر عیسائی کے لیے قابل قبول اور لائق پابندی ہوتا ہے۔ اور چوں و چرا کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ سیزر بورجیا کو کارڈینل مان لیا گیا۔ حالانکہ پوپ سکٹس چہارم (Sixtus Iv) جس کے خود کئی ناجائز بچے تھے سیزر بورجیا کو کئی برس پہلے ناجائز اولاد ٹھہرا چکا تھا۔ جب سیزر بورجیا کی عمر 23 سال کی ہوئی تو اس کو کلیسائی زندگی سے نجات حاصل کرکے فوجی زندگی بسر کرنے کی آرزو ہوئی۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ایک بار کلیسا سے وابستہ ہونے کے بعد اسے چھوڑنا قانوناً جائز نہ تھا۔ پوپ الگزینڈر نے فوراً دوسرا فرمان جاری کر دیا جس میں کہاں کہ چونکہ سیزر بورجیا میرا ناجائز بیٹا ہے اس لیے وہ کارڈینل کے مقدس منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اس فرمان کو بھی سب نے بے چوں و چرا مان لیا کیونکہ پوپ کا فرمان نہ ماننے والے مرتد ٹھہرائے جاتے تھے۔ پوپوں کی ایسی بے راہ روی کی ہزاروں مثالوں سے کلیسا کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ ان کے اختیارات لامحدود تھے۔ وہ لوگوں کا ہر گناہ معاف کر سکتے تھے۔ وہ لوگوں کو عیسائی برادری سے خارج (Excommunicate) کرکے ان کا زندہ رہنا محال کر دیتے تھے کیونکہ جو شخص برادری سے خارج کیا جاتا تھا اس کے ساتھ ساری برادری کو قطع تعلق کرنا پڑتا تھا اور ایسے شخص کو قتل کر دینا بھی جائز تھا۔ وہ بڑی بڑی رقمیں لے کر گناہوں سے برأت کی دستاویزیں (Indulgences) جاری کرتے تھے اور اس طرح جو روپیہ جمع ہوتا اسے اپنے عیش و آرام پر خرچ کرتے۔ بالآخر صدیوں پوپ اور ان کے حالی موالیوں کی چیرہ دستیوں کو برداشت کرتے کرتے جب عوام عاجز آ گئے تو چودھویں، پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں جان وکلف (John Wyclif) نے جو 1320ء سے 1384ء تک زندہ رہا، جان ہس (John Huss) نے جو 1369ء سے 1415ء تک زندہ رہا۔ مارٹن لوتھر (Mortin Luther) نے جو 1483ء سے 1546ء تک زندہ رہا اور جان کالون (John Calvin) نے جو 1507ء سے 1564ء تک زندہ رہا، کلیسائی نظام اور پوپ کے آمرانہ قوانین کی اپنی جان کی بازی لگا کر سخت مخالفت کی۔ ان سب کو پوپ نے Excommunicate کرکے ان کا خون ہدر کر دیا اور انہیں مروانے کی فکر کی اور تین تو بچ گئے مگر غریب ہس کو پکڑ کر زندہ جلا دیا۔ ان کی اور بہت سے مصلحین کی کوششوں سے رفتہ رفتہ کلیسا کا زور ٹوٹا۔

سائنسدانوں اور فلسفیوں کو بھی کلیسا کے ظلم و جبر کا شکار ہونا پڑا۔ جب کوپرنیکس (Copernicus) نے یہ نظریہ پیش کرنا چاہا کہ دنیا کے گرد سورج نہیں گھومتا بلکہ سورج کے گرد دنیا گھومتی ہے تو چونکہ یہ نظریہ کلیسا کے نظریہ کے خلاف تھا اس کی ہمت نہیں پڑی کہ اپنی زندگی میں اپنی کتاب چھپوائے۔ اس کے مرنے کے بعد کتاب چھپی تو کلیسا کی ناراضگی کا باعث بنی مگر بہت سے سائنسدانوں نے اس نظریہ کو قبول کیا جس کی سزا میں گی اور ڈینو برونو (Gior Dano Bruno) کو 1600ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ مشہور سائنس داں گلیلیو (Galilio) پر بھی مشق ستم کی گئی۔ فرانس کی ایک معصوم لڑکی جون آف آرک (Joan of Arc) کو جو عیسائی مذہب کے تمام عقائد پر پورا

ایمان رکھتی تھی، پادریوں نے 1431ء میں صرف اس وجہ سے زندہ جلا دیا کہ وہ مردوں کے کپڑے پہن کر انگریزوں کے خلاف لڑی تھی اور تائید غیبی سے اورلی اینس (Orleans) کے شہر کو انگریزوں کے قبضہ سے آزاد کرایا تھا۔ ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ کس بری طرح کلیسا کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ جب اس کے خلاف ردعمل ہوا تو لوگ مذہب سے متنفر ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ مذہب کا اتباع کرتے ہوئے انسان فطرت کا آزادانہ مطالعہ نہیں کر سکتا اور علم و حکمت کی تحصیل اس رکاوٹ کو ہٹائے بغیر ممکن نہیں۔ یہ خیال اہل مغرب میں ابھی تک جاگزیں ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت بریفو نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے جو علمی اور تمدنی ترقی کی ہے وہ اس زمانے میں کی ہے جب اسلام کی گرفت ڈھیلی تھی۔ وہ پیغمبر اسلام کا یہ قول بھول گیا کہ عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ بیش بہا ہے۔ تحصیل علم کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی ایک حدیث نہیں۔ آپ نے اپنی امت کو اس معاملہ میں بار بار تاکید فرمائی تھی۔ اسی کی تعمیل میں مسلمانوں نے جانیں کھپائیں اور مشعل علم لے کر صدیوں تک دنیا کی رہنمائی کی۔ اہل مغرب جنہوں نے اپنے مذہب سے روگردانی کر کے ہی علمی ترقی کی ہے یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا ہو گا۔ بریفو ایسے غیر متعصب کی یہ غلط فہمی قابل معافی ہے۔

اس انتباہ کے بعد بریفو کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"اس تصور کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں کہ اسلام کسی مہدی کی شورش یا وحشی درویشوں کے جوش جہاد کے باعث وجود میں آیا۔ اسلام کے بارے میں یہ تصور دراصل ان تجربوں پر مبنی ہے جو بعد کے دور میں ہوئے جب کہ اسلامی تہذیب ملیا میٹ ہو چکی تھی اور اس کے عقائد اشعری دینیات نے بالکل بدل کر رکھ دیئے تھے۔ اس کی ابتدا اور اس کا مبارک عہد اس سے بہت مختلف تھا۔"

"بغداد، شیراز اور قرطبہ کے درباروں کی حقیقی و قابل فخر زیب و زینت ذہنی ترقی اس کی مسرتوں کی لافانی دولت تھی۔ یہ خیال غلط ہو گا کہ اپنی شان و شوکت اور خود نمائی کے لیے مسلمان بادشاہ علوم کی پرستش کرتے تھے جس کے نتیجے میں اسلامی علوم اور سائنس کا حیرت انگیز نشوونما ہوا بلکہ مسلمان فرماں روا تہذیب کو فروغ دینے کی دلی آرزو سے مغلوب ہو کر بڑی لگن سے اس میں منہمک رہتے۔ نہ کبھی اس سے پہلے اور نہ کبھی اس کے بعد دنیا نے ایسا حیرت انگیز منظر دیکھا جس میں ایک عظیم مملکت کے حکمرانوں کا پورے کا پورا طبقہ والہانہ جذبے کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر تحصیل علم کے لیے مصروف نظر آئے۔ خلفاء اور امراء اپنے دیوان خانوں کو چھوڑ کر کتب خانوں اور رصد گاہوں میں پہونچنے کے لیے بیتاب رہتے۔ وہ ریاست کے امور کو نظر انداز کرتے۔ ان کی ریاستوں

میں عموماً بدنظمی ہی رہتی اور حکماء کے درس میں شریک ہوتے اور ریاضی کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے۔ کتابوں کے قلمی نسخوں اور نباتات کے نمونوں سے لدے ہوئے کارواں بخارا سے دجلہ اور مصر سے اندلس آتے جاتے رہتے۔ قسطنطنیہ اور ہندوستان سے کتابیں اور معلم حاصل کرنے کے لیے وفد بھیجے جاتے۔ خراج کے عوض یونانی مصنفوں کی تصنیفات اور کسی ممتاز ریاضی داں کو حاصل کرنے کو ترجیح دیتے۔ ہر مسجد سے ایک مدرسہ وابستہ ہوتا۔ درس گاہوں کے مصارف کے لیے دولت وقف کرنے اور نادار طلبہ کو وظیفے دینے میں وزراء اپنے فرماں رواؤں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ بلالحاظ نسل و مذہب ارباب علم کو سب پر فوقیت دی جاتی۔ ان پر خطابوں، اعزازوں اور دولت کی بارش ہوتی۔ جہاں کہیں خلیفہ جاتے، علماء اور فضلاء کی ٹولیاں اور کتابوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاریں ان کے ساتھ چلتیں۔"

"یہ کہنا صحیح نہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرہویں صدی میں رونما ہوئی۔ دراصل وہ عرب اور بربری مسلمانوں (Moors) کے زیر اثر یورپ کی تہذیب کا احیاء تھا۔ اٹلی نہیں بلکہ اسپین یورپ کی حیات کا گہوارہ تھا۔ مسلسل بربریت کی گہرائیوں میں گرتے گرتے جب یورپ جہل و پستی کی تاریک ترین گہرائی تک پہنچ چکا تھا اس وقت اسلامی دنیا میں بغداد، قاہرہ، قرطبہ اور طلیطلہ (Toledo) تہذیب اور ذہنی سرگرمیوں کے ترقی یافتہ مرکز تھے۔ یہاں وہ نئی زندگی رونما ہوئی جس نے انسانی ارتقاء کو ایک نئی سمت بخشی۔ جونہی یہ نئی تہذیب اثر انداز ہونے لگی (یورپ میں) ایک نئی زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔"

یہ حقیقت بار بار سامنے آتی ہے مگر پھر بھی اس کو نظر انداز کرنے یا گھٹانے کی پیہم کوشش کی جاتی رہی ہے۔ عیسائیوں کی تاریخ میں تو (جس نے مسلمانوں کو ملحد کتے کا نام دیا ہے) یورپ پر اس ملحد کتے کے احسان کے ذکر کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ اس پر فریب دروغ گوئی نے بعد کے تمام تصورات پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے حتیٰ کہ گبن (Gibbon) نے بھی اسلام کا تحقیر آمیز لہجے میں ذکر کیا ہے جو اس بات کی روشن مثال ہے کہ روایات کے دشمن کے لیے بھی روایت کی تقلید کس قدر ناگزیر ہو جاتی ہے۔ پچھلی صدی تک مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کے بارے میں کوئی ایسی چیز ملنا دشوار تھی جس میں صحیح علوم کا شائبہ بھی ہو۔ پروفیسر بیون (Professor Bevan) کیمبرج یونیورسٹی کی قرون وسطیٰ کی تاریخ (Cambridge Mediaeval History) میں لکھتے ہیں، کہ انیسویں صدی کی ابتدا تک محمد اور اسلام کے بارے میں جو کچھ یورپ میں شائع ہوا تھا وہ اب ادبی عجائبات کی حیثیت رکھتا ہے، اب بھی جب کہ زیادہ وسیع و صحیح معلومات دستیاب ہیں شاید ہی قرون وسطیٰ کی کوئی تاریخ ایسی ہو جس میں اسلامی تہذیب کا ذکر سرسری اور مربیانہ اعتراف کی حد سے آگے بڑھا ہو۔ دور جہالت سے نکل کر یورپ کے دوبارہ جنم لینے کی تاریخیں اب بھی عرب

تہذیب کے اثرات کو نظر انداز کر کے لکھی جا رہی ہیں ۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ڈنمارک کے شہزادے کی تاریخ ہملٹ (Hamlet) کا ذکر کیے بغیر لکھی جائے ۔ وہاں ان تاریخوں میں مسلمانوں کا ذکر اس وقت کیا جاتا ہے جب (اسلامی) ہلال پر (مسیحی) صلیب کی فتح یابیاں بیان کرنا مقصود ہوتی ہیں یا اسپین کی گردن سے مسلمانوں کی حکومت کا جوا اتار پھینکنے کی (خوش آئند) داستان سنائی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر اوس برن ٹیلر (Dr. Osborn Taylor) نے قرون وسطیٰ کی ذہنیت (The Mediaeval Mind) کے نشوونما پر دو ضخیم جلدیں لکھی ہیں ۔ انہوں نے کمال یہ کیا کہ ایسا اشارہ تک نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ مسلمانی تہذیب نام کی کسی چیز کا دنیا میں وجود تھا۔"

"یہ امر صریحاً غیر فطری ہے کہ ایک تابناک اور فعال تہذیب جو تخلیقی عمل میں مصروف ہو، ہمسایہ آبادیوں کے نشوونما پر جو جہالت میں ڈوبی ہوئی ہوں اور جن سے اس کا ربط ضبط ہو، نہایت گہرا اور حیات آفرین اثر نہ ڈالے ۔ اسلام اور یورپ کے باہمی ربط و ضبط کی تاریخی شہادت کی ہر تفصیل کو دبانے اور مسخ و نیست و نابود کرنے کی سازش کے باوجود یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا ہے کہ یہ فطری قانون معطل نہیں ہوا تھا ۔ یہ اثر اپنی وسعت اور اہمیت میں بلاشبہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو تفصیلی شہادت کے ساتھ اب ثابت کیا جا سکے ۔ جیسے علم طبقات الارض کے ذریعہ ناپید زندگی کی جو شہادت دستیاب ہوتی ہے، وہ بہت تھوڑی ہوتی ہے، ویسے ہی اس معاملہ میں ہمارا علم ان منتشر اور اتفاقیہ باقی رہ جانے والی جزوی شہادتوں پر مبنی ہے جو ان قوتوں کی دستبرد سے کسی طرح محفوظ رہیں جو انہیں معانے پر عالمگیر پیمانے پر کمربستہ رہی ہیں ۔ جب ان حالات کو، اور شہادت مسخ کرنے اور معانے کی کوشش کو، پیہم تعصب اور غلط بیانی کو جس کی گرفت سے کوئی ایک واقعہ بھی نہیں بچا، پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ اس اثر کا جائزہ لینے میں مبالغہ کی بجائے کوتاہی کرنے ہی کا امکان ہے ۔ یہ امر قریب قریب یقینی ہے کہ عربوں کے بغیر یورپ کی جدید تہذیب رونما نہیں ہوسکتی تھی اور یہ بات تو قطعی طور پر یقینی ہے کہ ان کے بغیر اس تہذیب کو وہ منصب حاصل نہ ہوتا جس نے اسے ارتقاء کے پچھلے تمام مدارج سے بلند کر دیا ۔ یوں تو یورپی نشوونما کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کا سراغ نہ ملے مگر نیچرل سائنس اور سائنسی مزاج پیدا کرنے میں جو نئی دنیا کی سب سے بڑی امتیازی قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا ماخذ ہے اس تہذیب نے مہتم بالشان کردار ادا کیا ہے۔"

ہماری سائنس اس بات کے لیے عربوں کی رہین منت نہیں کہ انہوں نے چونکا دینے والے اکتشافات یا انقلابی نظریے پیش کیے ۔ سائنس اس سے کہیں زیادہ عربوں کی زیر بار احسان ہے ۔ اس کا وجود ہی ان کی بدولت ہے ۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے دنیا کا قدیم دور سائنس سے پہلے کا دور تھا ۔ یونانیوں کے علم ہیئت اور علم ریاضی باہر سے آئے ہوئے علوم تھے جو یونان میں پوری طرح رس بس

نہ سکے ۔ یونانیوں نے ان علوم میں نظم و ترتیب پیدا کی، ان کی تعمیم کی، اور ان سے نظریے اخذ کیے ۔ لیکن چھان بین کے صبر آزما طریقے، مثبت معلومات کی فراہمی، سائنس کی دقیقہ سنجی، تفصیلی اور طویل مشاہدے اور تجرباتی تحقیقات یونانیوں کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی ۔ پرانی دنیا میں صرف اسکندریہ کی سائنس میں اس کی کچھ جھلک پائی جاتی ہے جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں ۔ یورپ میں وہ تحقیقات کی نئی روح، دریافت کے نئے انداز نکر، تجربہ، مشاہدہ، اور پیمائش کے نئے طریق کار اور ریاضی کو درجہ تکمیل تک پہونچانے کا ایسا ضابطہ اختیار کرنے سے نمودار ہوئی جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے ۔ اس روح اور ان طریقوں سے یورپ کو عربوں نے متعارف کرایا تھا۔"

"خیالی نظریوں اور تعمیمی کلیوں کی طرف ان کا (عربوں کا) میلان طبع نہ تھا ۔ وہ معلومات کے قدرداں اس لیے تھے کہ ان سے علم میں اضافہ ہوتا تھا، نہ کہ اس لیے کہ انہیں تعمیمی استقراء (Generalizing Induction) کا ذریعہ بنایا جائے ۔ انہوں نے یونانیوں کے اخذ کردہ نتائج کو سائنسی تحقیقات کے دوران عارضی نظریوں کے طور پر استعمال کیا اور جوں جوں ان کے علم میں اضافہ ہوا انہوں نے ان نتائج کو واقعات کی کسوٹی پر کسا اور ان میں ترمیم و تنسیخ کر کے مناسب تصرف کیا ۔ ان پر طعنہ زنی کی گئی ہے کہ انہوں نے سائنس کو ادعائی مزاج (Dogmatic Spirit) دے کر یورپ کے سر تھوپ دیا تھا ۔ مسیحی یورپ ادعائیت میں کس سے کم تھا کہ وہ یہ اوروں سے سیکھتا رہے ۔ اس قسم کے نظریے جیسے بطلیموسی نظام، آب و ہوا کا جغرافیائی نظریہ اور کیمیا گری کے ذریعہ قلب ماہیت کا نظریہ جو عربوں کے ذریعہ یورپ میں پہونچے تھے تو دراصل یہ نظریے عربوں کے نہ تھے بلکہ خود یونانیوں کے تھے ۔ جس انداز سے عرب اس مواد کو جو موجود ہوتا استعمال کرتے تھے وہ یونانیوں کے طریق کار کے بالکل برعکس تھا ۔ انہوں نے اس کمی اور خامی کو پورا کیا جو یونانیوں کی فطری ذہانت میں پائی جاتی تھی ۔ یونانیوں کو نظریات و تعمیم سے دلچسپی تھی ۔ وہ امر واقعہ سے غفلت اور بے اعتنائی برتتے تھے ۔ اس کے برخلاف عرب محققین نظریوں سے بے اعتناء رہتے اور ٹھوس حقائق کو سمیٹنے اور اپنے علم کو صحیح اور اوزانی (Quantitative) ترتیب دینے میں سرگرمی دکھاتے ۔ بار آور اور دیر پا سائنس اور سائنس کے غیر واضح شوق جستجو میں جو نمایاں فرق ہے وہ خاصیتی (Qualitative) توضیح کا ہے جس کی بدولت ناپ تول میں جتنی صحت ممکن الحصول ہو، اس کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ تحقیق کے اس معروضی (Objective) تخیل اور اوزانی صحت کے تحت عربوں نے وسیع پیمانے پر سائنسی تجربات کیے .... انہوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کے لیے نہایت دیدہ ریزی سے آلات بنائے ۔ جو یونانیوں کے آلات سے بہتر اور ان آلات سے جو نورمبرگ (Nuremberg) کے مشہور کارخانے میں پندرھویں صدی میں تیار کیے جاتے تھے، زیادہ صحیح اور درست تھے ۔ مشاہدہ کرنے والے اپنے اپنے کام کو علیحدہ علیحدہ انجام دیتے اور اپنے ذاتی رجحان کو دخل انداز نہ ہونے دیتے ۔ دمشق، بغداد اور قاہرہ کی رصدگاہوں میں مشاہدات میں تسلسل قائم رکھنے کے

قاعدے کی سختی سے پابندی کی جاتی چنانچہ کچھ مشاہدے بارہ بارہ سال تک جاری رہے ۔ اپنے مشاہدوں کے اندراجات کی صحت پر اس قدر زور دیتے کہ ان میں جو غیر معمولی اہمیت کے ہوتے' ان کی تصدیق حلف لے کر کرتے ۔"

"ان کی تمام سرگرمیوں میں یہی معروضی اور اوزانی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے ۔ جب المامون نے اپنے صاحب البرید (Postmaster) ابن حزداذبہ کو حکم دیا کہ اس کی سلطنت کے تمام ممالک کا جغرافیہ لکھے اور نقشہ تیار کرے جس میں تمام مستقل بحری و بری راستے بھی دکھائے جائیں تو اس کی تاکید کی تھی کہ طول البلد اور عرض البلد کو مدنظر رکھ کر ہر جگہ کا مقام بالکل صحیح متعین کیا جائے ۔ یہ جغرافیہ عربوں کی ان تمام جغرافی دستاویزات و تصانیف میں سب سے پہلا تھا جن کی بدولت دنیا کا صحیح روپ معلوم ہوا اور نیا جغرافیہ وجود میں آیا ۔ البیرونی معدنی نمونے جمع کرنے کی غرض سے چالیس سال تک سفر میں رہا ۔ اس نے جو مختلف اجزائے بسیط (Elements) کے ثقل نوعی (Specific Gravity) کی جدول تیار کی تھی وہ آج بھی صحیح مانی جاتی ہے ۔ ابن بیطار نے پوری اسلامی دنیا سے نباتی نمونے جمع کیے اور ہندوستان اور ایران کے نباتات کا یونان و مصر کی نباتات سے موازنہ کیا اور ان پر ایک مبسوط کتاب لکھی ۔ یہ کتاب جس میں ایک ہزار چار سو انواع کے پودوں کا حال درج ہے' میئر (Meyer) کے بقول محنت و تندہی کا عظیم کارنامہ ہے ۔ اسی ژرف نگاہی اور مشاہدوں میں دل و جان سے لگے رہنے کے جذبہ کے مقابلے میں قدیم حکماء کا طریق کار بالکل قیاسی تھا ۔ وہ تجرباتی طریق کار کو حقیر جانتے تھے ۔ ارسطو نے طبیعیات ' حیوانات اور نباتیات پر کتابیں لکھیں مگر اسے کبھی ایک تجربہ کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی ۔ جن امور کا صحیح یا غلط ہونا بآسانی معلوم کیا جا سکتا تھا' ان کی تصدیق کی بھی زحمت اس نے نہیں اٹھائی ۔ وہ بڑے اطمینان سے یہ غلط دعویٰ کرتا ہے کہ مرد کے دانتوں کی تعداد عورت کے دانتوں سے زیادہ ہوتی ہے ۔ جالینوس (Galen) جو علم تشریح کا مسلم الثبوت ماہر ہے کہتا ہے کہ نیچے کے جبڑے میں دو ہڈیاں ہوتی ہے ۔ یہ بات اس وقت تک مانی جاتی رہی جب تک کہ عبداللطیف نے انسانی کھوپڑی کے مشاہدہ کے بعد اسے غلط ثابت نہ کر دیا ۔"

عرب ان ماخذوں سے علم حاصل کرتے جو آسانی سے دستیاب ہوتے ۔ علم ہیئت کا بیشتر اور علم ریاضی کا کچھ مواد انہوں نے یونانی ماخذوں سے لیا ۔ یونانیوں نے ابتداً یہ علوم ان اہل بابل سے حاصل کیے تھے جو عرب سے عراق منتقل ہو گئے تھے ۔ اس طرح وہ علوم جو عربوں نے یونانیوں سے لیے اور پھر یورپ تک پہنچائے انہیں کے اسلاف کے حاصل کردہ تھے ان سے یونانیوں نے مستعار لیے تھے ۔ خوش قسمتی سے سائنسی علوم کا ایک اور ماخذ بھی عربوں کے ہاتھ آ گیا ۔ پانچویں صدی میں ہندوستان میں ایک قابل توجہ ذہنی تحریک رونما ہوئی جو عہد گپتا کا نشاۃ ثانیہ کہلاتی ہے ۔ دو مصنفین آریہ بھٹ (Arya Bhatta) اور برہم گپت (Brahma Gupta) نے ریاضی میں کچھ اہم

جدتیں کیں ۔ عربوں نے ان کو یونانی ریاضی دانوں کے گراں بار اور ناقابل عمل طریقوں کی اصلاح کے لیے استعمال کیا اور خود ان جدتوں میں اضافہ کیا ۔ عیسائیوں کی ریاضی کا علم قاعدہ اربعہ متناسبہ (Rule of Three) کے صبر آزما استعمال تک محدود تھا ۔ وہ علم حساب (Arithmatic) کے آسان ترین سوال تاروں میں پروئے ہوئے دانوں (Abacus) کے ذریعہ حل کرتے تھے ۔ جیسا کہ آج کل بہت کم سن بچوں کے مدرسوں میں کیا جاتا ہے ۔ اس کے بجائے عربوں نے قاعدہ ترسیم اعداد (Notation) جس میں اعشاریہ اور صفر سے کام لیا جاتا ہے' رائج کیا ۔ اور اس قاعدہ کو درجہ تکمیل تک پہنچایا ۔ انہوں نے ریاضی میں جبرو مقابلہ (Algebra) کا اضافہ کیا جس سے قریہ (Equation) چوتھی ڈگری تک حل کرنا ممکن ہوا ۔ انہوں نے علم مثلث (Trigonometry) کا اضافہ بھی کیا اور یونانیوں کے وتر (Chord) کی جگہ Sines اور مماس (Tangents) ایجاد کیے اس طرح انسانی تحقیق کی صلاحیت ہزار گنا بڑھ گئی ۔"

"عربوں نے نہ صرف ریاضی میں ان علوم کا اضافہ کیا جو سائنسی تحلیل و تجزیہ کا جزو لاینفک بن گئے بلکہ انہوں نے تجرباتی تحقیق کے ایسے طریقوں کی بنیاد ڈالی جو ریاضی کے اس تحلیل و تجزیہ سے فائدہ اٹھا کر جدید سائنس کی تخلیق کا باعث ہوئے .... عربوں نے ایک منظم و مسلسل ولولے کے ساتھ علم کیمیا کی تحقیق کا کارنامہ سرانجام دیا ۔ چنانچہ تقطیر (Distillation) ' تصعید (Sublimation) اور ترویق (Filtration) کے طریقے ان ہی کی ایجاد ہیں ۔ عربوں سے پہلے تیزابوں میں لوگ سرکہ سے واقف تھے ۔ عربوں نے الکحل (Alcohol)' شورے کا تیزاب (Nitric Acid) ' گندھک کا تیزاب (Sulphuric Acid) اور القلی (Alkalis) اور پارہ ' سرمہ اور کانسی کے نمک دریافت کیے ۔ اس طرح جدید علم کیمیا اور طبیعی تحقیق کی بنیاد ڈالی ۔"

"بطلیموس (Ptolemy) نے فلکیات سے متعلق معلومات کو جس تنگ نظری سے اپنی تالیف میں پیش کیا ہے وہ تنگ نظری اور اس کا وقیع نام فلکیات کی ترقی کے لئے جوتش کے تمام توہمات سے کہیں زیادہ مہلک ثابت ہوا ۔ مگر کیمیا گری (Alchemy) کے تصورات علم کی ترقی میں رکاوٹ بننے کے بجائے برکت ثابت ہوئے کیونکہ ان کے تحت جو تجرباتی تحقیق کی مشکل راہ اختیار کی گئی وہ ممکن ہے کبھی اختیار نہ کی جاتی ...... عربوں کے تمام بڑے بڑے ماہر فلکیات کے نزدیک اہمیت دراصل مشاہدہ اور نتائج کے تجزیہ کی تھی .... (رہی کیمیا گری) تو ابن سینا کا قول یہ تھا کہ جو لوگ کیمیائی فن سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ گو بظاہر ایسا معلوم ہو مگر حقیقتاً اجزائے اصلی (Substances) کی کسی نوع میں بھی قلب ماہیت نہیں کی جا سکتی ۔ یورپ جہاں 1215ء میں لیٹرن کونسل (Lateran Council) میں قلب جوہر (Transsubstantiation) کے عقیدے کا اعلان کیا گیا تھا (جس کی رو سے عیسائیوں کا ایمان ہے کہ عشائے ربانی میں روٹی اور شراب حضرت عیسیٰ

کے جسم اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہیں) دھاتوں کے قلب ماہیت (Transsubstantiation) کے نظریہ کو مانا جاتا رہا حالانکہ عرب اس نظریے کو ناقابل اعتبار ٹھیرا چکے تھے۔"

"عربوں کے علوم سے عیسائی یورپ بالکل ابتدا ہی میں روشناس ہونے لگا تھا .... اسپین میں خلافت کی کامل بے تعصبی کی وجہ سے عیسائیوں کو مکمل آزادی حاصل تھی - وہاں ان کے اپنے اسقف (Bishops) تھے اور قرطبہ کے نواح میں ان کی بہت ساری خانقاہیں تھیں جو عیسائی مسافروں کو ٹھیرانے کے کام بھی آتی تھیں - اکثر ان کے راہب شہر کی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آتے تھے - یورپ کے تمام حصوں سے بہت سے طلبہ آتے اور عربوں کی بڑی بڑی تعلیم گاہوں میں بصیرت کی تلاش میں، جو انہیں اور کہیں دستیاب نہیں تھی، داخل ہوتے - قرطبہ کا اسقف الوارو (Alvaro) نویں صدی میں لکھتا ہے کہ وہ تمام عیسائی نوجوان جو ممتاز صلاحیت رکھتے ہیں، عربوں کی زبان اور ادب سے واقف ہوتے ہیں - وہ ان کی کتابیں بے حد شوق سے پڑھتے ہیں - بہت دولت خرچ کرکے ان کی کتابیں مہیا کرتے اور بڑے بڑے کتب خانے قائم کرتے ہیں اور بانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ان کا ادب کس قدر لائق ستائش ہے۔"

"اگلی دو صدیوں میں عربی علوم کا نفوذ بڑے وسیع پیمانے پر ہوا - ایک افریقی راہب کونسٹنٹائن (Constantine)......... عربی کی درسی کتابوں کا ترجمہ کرنے اور نئی معلومات کو مونٹی کیسینو (Monte Cassino) تک، جہاں بینی ڈکٹائن (Benidictine) راہبوں کا مرکز تھا، پہنچانے میں بڑے جوش و خروش سے مصروف رہا - اس مرکز سے اور جہاں جہاں ان راہبوں کی خانقاہیں تھیں یہ پھیلتی گئیں - اس سلسلہ کا ایک اور راہب ایڈلی ہارڈ آف باتھ (Adle Hard of Bath) قرطبہ سے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اور بہت سے عقائد فرانس اور انگلستان لے گیا اور اس نے اور اس کے بھتیجے نے ان عقائد کی تبلیغ کی - اقلیدس کا جو نسخہ اس نے (قرطبہ میں) تیار کیا تھا اسی سے اقلیدس کی کتابیں 1533ء تک چھپتی رہیں - ڈینیل ڈی مورلے (Deniel de Morley) بھی ریاضی اور علم ہیئت سیکھنے قرطبہ گیا اور جو کچھ اس نے حاصل کیا، اسے شائع کرکے آکسفورڈ میں ان علوم پر لیکچر دیئے - ٹی وولی کے پلیٹو (Plato of Tivoli) نے البتانی (Al-Batani) کی علم ہیئت اور ریاضی کی تصانیف کا ترجمہ کیا - بارہویں صدی کے اواخر میں پیسا (Pisa) کا ایک سوداگر لیونارڈو فیبوناکچی (Leonardo Fibonacci) الجزائر اور اسپین کا سفر کرکے عربوں کے نئے علوم ریاضی کا ایسا شیدائی ہوگیا کہ وہ وہاں بار بار گیا اور الخوارزمی کے جبر و مقابلہ کی گراں قدر کتاب کا، جس میں اعشاریہ کی ترسیم اعداد کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے اور جس نے علم حساب کو نہایت آسان کر دیا ہے، ترجمہ کیا - اسے رائج کرنے اور مقبول بنانے کی اس نے انتھک کوشش کی - یہ الخوارزمی کے نام پر الگورزم (Algorism) کے نام سے (یورپ میں) مشہور ہوئی - اس ہمہ گیر اثر کے پیش نظر جو اس کی تصنیف

سے یورپ نے قبول کیا فیبوناکچی کو عیسائی یورپ میں جدید ریاضی کا بانی کہنا لازم آتا ہے - وہ اطالوی ریاضی دانوں کے طویل سلسلہ کی پہلی کڑی تھا - کریمونا کے جیرارڈ (Gerard of Cremona) نے عربی ادب کو مقبول بنانے والوں میں سب سے زیادہ تندہی سے کام لیا - اس نے خلافت قرطبہ میں پچاس سال گزارے اور کم از کم ساٹھ ترجمے کیے جن میں المجسطی (Almajest) اور ابن الہیثم کی فلکیات شامل ہیں - مائیکل اسکوٹ (Micheal Scot) اس غرض سے بار بار قرطبہ گیا کہ قلمی نسخے حاصل کرکے ترجمہ کرے - خلافت کے آخری ایام تک طلبہ کا بڑی تعداد میں اسپین جانے کا سلسلہ اور ترجمہ کا کام جاری رہا - آرنلڈ ول نوو (Arnold of Villeneuve) اور ریمنڈ لل (Reymond Lull) نے جو بیکن (Bacon) کا دوست تھا، اسپین میں علم حاصل کیا اور مونٹ پیلیر (Mont Pellier) میں پڑھایا - نووارا کے کیم پینس (Campans of Novara) نے قرطبہ میں ریاضی پڑھی اور ویانا (Vienna) میں پڑھائی - ٹولیڈو (Toledo) میں عربی کی درسی کتابوں کے ترجمے کے لیے الفونسو ئے عاقل (Alfonso the Sage) نے باقاعدہ اسکول قائم کیے۔"

"مسلمان حکومت یہودیوں کے ساتھ کامل مذہبی رواداری کا سلوک کرتی تھی چنانچہ خلافت کے تہذیبی ارتقاء میں حصہ لینے کی آزادی انہیں میسر تھی - جب وہ یورپ میں منتشر ہو گئے .... تو اس تہذیب کو اپنے ساتھ لے گئے اور نہایت دور افتادہ وحشی خطوں تک اسے پہونچایا - الگ تھلگ خانقاہوں کے مکینوں کو جن کا ذوق جستجو ان کے تعصبات پر غالب آجاتا، وہ ان تعجب خیز علوم کی تعلیم دیتے اور ان سے بحث و مباحثہ کرتے - فرانسیسی اور جرمن راہب ان نئے حکیمانہ علوم کی درسی کتابیں حاصل کرتے - زنانہ خانقاہوں (Convents) کی پڑھی لکھی ننس (Nuns) مثلاً نامور ہلڈیگارڈ (Hildgard) اور ہروسویتھا (Hroswitha) نے بھی ان علوم کی تحصیل کو اپنی کسر شان نہیں سمجھا - یہودیوں نے عربی سائنس کو مقبول بنانے اور عربی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے بہت سے اسکول نربون (Narbonne)، کم ہز (Kim His) اور بن عزرا (Ben Esra) میں قائم کیے - ولیم آف نورمنڈی (William of Normandy) کے ساتھ جس نے ان کے تحفظ کی ذمہ داری لی تھی یہودیوں کی ایک بڑی تعداد انگلستان گئی - وہاں انہوں نے پہلے پہل پتھر کے مکانات بنائے جو آج بھی لنکن (Lincoln) اور سینٹ ایڈمنڈسبری (St . Edmundsbury) میں موجود ہیں اور آکسفورڈ میں انہوں نے سائنس کا اسکول کھولا - ان کے جانشینوں کے زمانے میں اسی اسکول میں راجر بیکن (Roger Bacon) نے عربی اور عربوں کی سائنس پڑھی - تجرباتی طریقہ ایجاد کرنے کا سہرا نہ تو راجر بیکن کے سر ہے اور نہ ان کے ہم نام (Francis Bacon) کے سر - راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ مسلم سائنس اور مبلغین میں سے ایک تھا - وہ خود یہ اعلان کرتے نہیں تھکتا تھا کہ عربی اور عربوں کی سائنس کا علم ہی اس کے ہم عصروں کی حقیقی علم تک رہنمائی کرسکتا ہے - اس انتہائی غلط بیانی کا، جو یورپی تہذیب کے ماخذوں کے بارے میں کی گئی ہے، یہ بحث و مباحثہ بھی کہ

کے جسم اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہیں) دھاتوں کے قلب ماہیت (Transsubstantiation) کے نظریہ کو مانا جاتا رہا حالانکہ عرب اس نظریے کو ناقابل اعتبار ٹھیرا چکے تھے۔"

"عربوں کے علوم سے عیسائی یورپ بالکل ابتدا ہی میں روشناس ہونے لگا تھا .... اسپین میں خلافت کی کامل بے تعصبی کی وجہ سے عیسائیوں کو مکمل آزادی حاصل تھی - وہاں ان کے اپنے اسقف (Bishops) تھے اور قرطبہ کے نواح میں ان کی بہت ساری خانقاہیں تھیں جو عیسائی مسافروں کو ٹھیرانے کے کام بھی آتی تھیں - اکثر ان کے راہب شہر کی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آتے تھے - یورپ کے تمام حصوں سے بہت سے طلبہ آتے اور عربوں کی بڑی بڑی تعلیم گاہوں میں بصیرت کی تلاش میں ، جو انہیں اور کہیں دستیاب نہیں تھی ، داخل ہوتے - قرطبہ کا اسقف الوارو (Alvaro) نویں صدی میں لکھتا ہے کہ وہ تمام عیسائی نوجوان جو ممتاز صلاحیت رکھتے ہیں ، عربوں کی زبان اور ادب سے واقف ہوتے ہیں - وہ ان کی کتابیں بے حد شوق سے پڑھتے ہیں - بہت دولت خرچ کرکے ان کی کتابیں مہیا کرتے اور بڑے بڑے کتب خانے قائم کرتے ہیں اور ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ان کا ادب کس قدر لائق ستائش ہے -"

"اگلی دو صدیوں میں عربی علوم کا نفوذ بڑے وسیع پیمانے پر ہوا - ایک افریقی راہب کونسٹنٹائن (Constantine) .... عربی کی درسی کتابوں کا ترجمہ کرنے اور نئی معلومات کو مونٹی کیسینو (Monte Cassino) تک ، جہاں بینی ڈکٹائن (Benidictine) راہبوں کا مرکز تھا ، پہنچانے میں بڑے جوش و خروش سے مصروف رہا - اس مرکز سے اور جہاں جہاں ان راہبوں کی خانقاہیں تھیں یہ پھیلتی گئیں - اس سلسلہ کا ایک اور راہب ایڈلی ہارڈ آف باتھ (Adle Hard of Bath) قرطبہ سے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اور بہت سے عقائد فرانس اور انگلستان لے گیا اور اس نے اور اس کے بھتیجے نے ان عقائد کی تبلیغ کی - اقلیدس کا جو نسخہ اس نے (قرطبہ میں) تیار کیا تھا اسی سے اقلیدس کی کتابیں 1533ء تک چھپتی رہیں - ڈینیل ڈی مورلے (Deniel de Morley) بھی ریاضی اور علم ہیئت سیکھنے قرطبہ گیا اور جو کچھ اس نے حاصل کیا ، اسے شائع کرکے آکسفورڈ میں ان علوم پر لیکچر دیئے - ٹی وولی کے پلیٹو (Plato of Tivoli) نے البتانی (Al-Batani) کی علم ہیئت اور ریاضی کی تصانیف کا ترجمہ کیا - بارہویں صدی کے اواخر میں پیسا (Pisa) کا ایک سوداگر لیونارڈو فیبوناکچی (Leonardo Fibonacci) الجزائر اور اسپین کا سفر کرکے عربوں کے نئے علوم ریاضی کا ایسا شیدائی ہوگیا کہ وہ وہاں بار بار گیا اور الخوارزمی کے جبرو مقابلہ کی گراں قدر کتاب کا ، جس میں اعشاریہ کی ترسیم اعداد کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے اور جس نے علم حساب کو نہایت آسان کر دیا ہے ، ترجمہ کیا - اسے رائج کرنے اور مقبول بنانے کی اس نے انتھک کوشش کی - یہ الخوارزمی کے نام پر الگورزم (Algorism) کے نام سے (یورپ میں) مشہور ہوئی - اس ہمہ گیر اثر کے پیش نظر جو اس کی تصنیف

سے یورپ نے قبول کیا فیبوناکچی کو عیسائی یورپ میں جدید ریاضی کا بانی کہنا لازم آتا ہے - وہ اطالوی ریاضی دانوں کے طویل سلسلہ کی پہلی کڑی تھا - کریمونا کے جیرارڈ (Gerard of Cremona) نے عربی ادب کو مقبول بنانے والوں میں سب سے زیادہ تندہی سے کام لیا - اس نے خلافت قرطبہ میں پچاس سال گزارے اور کم از کم ساٹھ ترجمے کیے جن میں المجسطی (Almajest) اور ابن الہیثم کی فلکیات شامل ہیں - مائیکل اسکوٹ (Micheal Scot) اس غرض سے بار بار قرطبہ گیا کہ قلمی نسخے حاصل کرکے ترجمہ کرے - خلافت کے آخری ایام تک طلبہ کا بڑی تعداد میں اسپین جانے کا سلسلہ اور ترجمہ کا کام جاری رہا - آرنلڈ ول نوو (Arnold of Villeneuve) اور ریمنڈ لل (Reymond Lull) نے جو بیکن (Bacon) کا دوست تھا ، اسپین میں علم حاصل کیا اور مونٹ پیلیر (Mont Pellier) میں پڑھایا - نووارا کے کیم پینس (Campans of Novara) نے قرطبہ میں ریاضی پڑھی اور ویانا (Vienna) میں پڑھائی - ٹولیڈو (Toledo) میں عربی کی درسی کتابوں کے ترجمے کے لیے الفونسوئے عاقل (Alfonso the Sage) نے باقاعدہ اسکول قائم کیے۔"

"مسلمان حکومت یہودیوں کے ساتھ کامل مذہبی رواداری کا سلوک کرتی تھی چنانچہ خلافت کے تہذیبی ارتقا میں حصہ لینے کی آزادی انہیں میسر تھی - جب وہ یورپ میں منتشر ہو گئے .... تو اس تہذیب کو اپنے ساتھ لے گئے اور نہایت دور افتادہ وحشی خطوں تک اسے پہونچایا - الگ تھلگ خانقاہوں کے مکینوں کو جن کا ذوق جستجو ان کے تعصبات پر غالب آجاتا ، وہ ان تعجب خیز علوم کی تعلیم دیتے اور ان سے بحث و مباحثہ کرتے - فرانسیسی اور جرمن راہب ان نئے حکیمانہ علوم کی درسی کتابیں حاصل کرتے - زنانہ خانقاہوں (Convents) کی پڑھی لکھی ننس (Nuns) مثلاً نامور ہلڈیگارڈ (Hildgard) اور ہروسویتھا (Hroswitha) نے بھی ان علوم کی تحصیل کو اپنی کسر شان نہیں سمجھا - یہودیوں نے عربی سائنس کو مقبول بنانے اور عربی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے بہت سے اسکول زبون (Narbonne) ، کم ہز (Kim His) اور بن عزرا (Ben Esra) میں قائم کیے - ولیم آف نورمنڈی (William of Normandy) کے ساتھ جس نے ان کے تحفظ کی ذمہ داری لی تھی یہودیوں کی ایک بڑی تعداد انگلستان گئی - وہاں انہوں نے پہلے پہل پتھر کے مکانات بنائے جو آج بھی لنکن (Lincoln) اور سینٹ ایڈمنڈسبری (St . Edmundsbury) میں موجود ہیں اور آکسفورڈ میں انہوں نے سائنس کا اسکول کھولا - ان کے جانشینوں کے زمانے میں اسی اسکول میں راجر بیکن (Roger Bacon) نے عربی اور عربوں کی سائنس پڑھی - تجرباتی طریقہ ایجاد کرنے کا سہرا نہ تو راجر بیکن کے سر ہے اور نہ ان کے ہم نام (Francis Bacon) کے سر - راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ مسلم سائنس اور مبلغین میں سے ایک تھا - وہ خود یہ اعلان کرتے نہیں تھکتا تھا کہ عربی اور عربوں کی سائنس کا علم ہی اس کے ہم عصروں کی حقیقی علم تک رہنمائی کرسکتا ہے - اس انتہائی غلط بیانی کا ، جو یورپی تہذیب کے ماخذوں کے بارے میں کی گئی ہے ، یہ بحث و مباحثہ بھی کہ

تجرباتی طریق تحقیق کی ابتداء کس نے کی' ایک جزو ہے۔ عربوں کے ہر انکشاف اور ہر ایجاد کو اس شخص سے منسوب کر دیا گیا جس نے سب سے پہلے اس کا کچھ ذکر کیا۔ مثلاً قطب نما کی ایجاد ایک من گھڑت شخص فلیویو جیوجا آف املفی (Flavio Gioja of Amalfi) سے منسوب کی گئی' الکحل (Alcohol) کی ارنلڈ آف ول نوو (Arnold of Villeneuve) سے اور بارود کی بیکن (Bacon) یا شوارٹز (Schwartz) سے۔ یہ سب سلسلہ تو غلط بیانی کی کڑیاں ہیں۔ عربوں کا تجرباتی طریقہ بیکن کے زمانہ سے پہلے ہی یورپ میں عام ہو گیا تھا اور لوگ بڑے شوق سے تجربے کرتے تھے۔

اس کے وجود کا اعلان ایڈل ہارڈ آف باتھ (Adelhard of Bath)' الگزینڈر آف نیکم (Alexander of Naekam)' ونسنٹ آف بووے (Vincent of Beauais)' اڈیلارڈ آف ول نون (Adleard of Villeneun)' برنارڈ سلوسٹریس (Bernard Silvestris)' ٹومس کین ٹمپرے (Thomas Cantimpre) اور البرٹ میگنس Albert Magnus پہلے ہی کر چکے تھے — بلکہ برنارڈ سلویسٹریس نے تجربات کے متعلق ایک کتاب (Experimentarius) بھی تالیف کی۔

عربی النسل اہل علم و حکمت

مستشرقین کی غلط فہمی کی تردید

یہ بات عام طور پر مشہور ہوگئی ہے کہ مسلمانوں میں جو بڑے بڑے عالم و فاضل لوگ ہوئے ہیں وہ قریب قریب سب ہی غیر عرب تھے۔ یہ بات مستشرقین کی پھیلائی ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا وہ اس تعصب پر مبنی ہے جو عربوں کی عالمگیر فتوحات اور یورپ کے کئی ممالک پر مدتوں حکمرانی کرنے کے باعث اہل یورپ کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ عربوں کی حیرت انگیز فتوحات کا انکار تو اس لیے ممکن نہ تھا کہ دنیا کی تاریخیں ان سے بھری پڑی ہیں۔ اس لیے یہ سوچا کہ اگر ان کی شجاعت و بلند حوصلگی کی تکذیب ممکن نہیں تو نہ ہو' ان کی ذہنی صلاحیتوں اور علمی استعداد ہی کی تحقیر کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ وہ اعلیٰ انسانی قدروں سے محروم تھے اور ان کے پاس قوت بازو کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

ایم۔ رینان (M. Renan) ایک مشہور فرانسیسی مستشرق تھا۔ اس نے نہایت دلیری سے یہ غلط بیانی کی کہ مسلمان فلاسفہ و اہل علم میں جو عرب کہلاتے ہیں' صرف ایک الکندی عربی النسل تھا اور باقی سب دوسری نسلوں سے علاقہ رکھتے تھے۔ مصنفین کے حالات اور ان کی تصنیفات کے بارے میں قرون وسطیٰ میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں' جن میں سے مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:

* - ابو الفرج محمد ابن اسحاق بن ابی یعقوب الندتم (المتوفی 995ء) کی "فہرست العلوم"
* - ابوالحسن علی ابن اللعام ابی القاسم زید البیہقی (المتوفی 1174ء) اس کی "تاریخ حکماء الاسلام"
* - ابو بکر محمد ابن عمر ابن خلیفہ الاشبیلی (المتوفی 1179ء) کی "فہرست" جس میں اسپین کے مصنفین کا ذکر ہے۔
* - ابوالحسن علی ابن یوسف ابن القفطی (المتوفی 1284ء) کی کتاب "اخبار العلماء بہ اخبار الحکماء"۔

* - ابوالعباس احمد ابن محمد ابن ابراہیم ابن ابی بکرا بن خلکان (المتوفی 1282ء) کی کتاب "وفیات الاعیان و ابناء الزمان"۔

* - صلاح الدین محمد ابن شاکر الجلبی الدمشقی (المتوفی 1363ء) کی فوات الوفیات جو ابن خلکان کی وفیات الاعیان کا تتمہ ہے۔

یقیناً رینان ایسے بڑے عالم کی نظر سے یہ کتابیں مخفی نہ رہی ہوں گی۔ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ تاریخ الحکماء یا وفیات الاعیان، ایسی ہی کوئی اور کتاب پڑھ کر ہر کوئی معلوم کر سکتا ہے۔ یہ کہ عربی النسل اہل علم و اہل قلم بہت گزرے ہیں۔ رینان کا یہ کہنا کہ مسلمان فلاسفہ اور اہل علم میں، ایک الکندی کے علاوہ اور کوئی عربی النسل نہ تھا صریحاً ایسا افترا ہے جو اس کی لاعلمی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ سید امیر علی اور جارج سارٹن کی کتابوں کے ----- مطالعہ سے علماء دین کے علاوہ ایک کثیر تعداد سائنسدانوں، مورخوں، فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں وغیرہ کی ملتی ہے جو بلاشبہ عربی النسل تھے۔ مناسب ہو گا کہ ان کا نام بنام ذکر کیا جائے۔

عبدالملک ابن قریب الاصمعی 40-739ء میں بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں 831ء میں وفات پائی۔ اپنے عہد کے عظیم ترین اہل علم میں سے تھا۔ کئی علوم میں دستگاہ رکھتا تھا۔ تاریخ طبیعی پر کئی کتابیں لکھیں۔ اس کا عربی شاعری کا مطالعہ بہت گہرا اور دقیق تھا۔ ڈی۔ ایچ میولر (D.H. Mueller) نے اس کی تصنیف "کتاب الفرق" 1876ء میں ویانا (Vienna) سے شائع کی۔ آر گیر (R.Geyer) نے اس کی وہ کتاب جو جنگی جانوروں پر ہے ویانا سے 1887ء میں شائع کی۔ اس کی "کتاب الخیل" اے ہافنر (A. Haffner) 1895ء میں ویانا سے شائع ہوئی اس کی "کتاب الشاء" بھی اسی شخص نے 1896ء میں ویانا سے شائع کی۔

ابو عبداللہ محمد ابن اسحاق کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں۔ وہ اسلام کا سب سے پہلا مورخ ہے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھی جس کا نام "کتاب سیرۃ الرسول اللہ" ہے۔ بغداد میں 9-768 میں اس کا انتقال ہوا۔

ابوالمنذر ہشام ابن محمد ابن السائب الکلبی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ اس کا 820ء میں بغداد میں انتقال ہوا۔ وہ علم آثار قدیمہ (Archaeology) اور علم الانساب (Genealogy) کا ماہر تھا۔ اس نے "کتاب الانساب الکبیر" تصنیف کی۔

ابو عبداللہ محمد ابن عمر الواقدی 8-747ء میں مدینہ میں پیدا ہوا اور 823ء میں اس نے

بغداد میں وفات پائی۔ وہ مورخ تھا۔ اس نے "کتاب المغازی" لکھی۔ اس کتاب کا ایک حصہ اے۔ فان کریمر (A. von Kremer) نے 1856ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔ اس کا مختصر جرمن ترجمہ برلن سے 1882ء میں شائع ہوا۔

خلیل ابن احمد عمان میں پیدا ہوا اور چوہتر برس کی عمر میں بصرہ میں 2-791ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ قبیلہ ازد سے تھا۔ وہ سب سے پہلا شخص ہے، جس نے عربی زبان کے صرف و نحو کے قواعد مرتب کیے اور علم عروض ایجاد کیا۔ علم عروض پر اس نے "کتاب الایقاع" تصنیف کی۔ اس نے عربی زبان کا پہلا لغت "کتاب العین" مرتب کیا۔

النظام کی تاریخ ولادت معلوم نہیں 845ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ الجاحظ کا استاد تھا۔ اس نے نظریہ ارتقاء پیش کیا جو یہ ہے کہ آدم اور ان کی اولاد بیک وقت پیدا کیے گئے۔ لیکن وہ یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے ہیں۔ تخلیق کا صرف ایک حصہ نمایاں ہوتا ہے اور بقیہ پوشیدہ رہتا ہے۔ النظام فلسفی تھا اور فرقہ معتزلہ سے تعلق رکھتا تھا۔

ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق ابن الصباح الکندی (Alkindus) کندہ قبیلہ کا تھا۔ نویں صدی کے آغاز میں وہ بصرہ میں پیدا ہوا۔ 873ء میں اس نے وفات پائی، وہ ریاضی، ہیئت، طبیعیات، موسیقی، طب، عطاری اور جغرافیہ میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ اس کی بہت سی کتابیں یورپ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ یورپ میں وہ عربوں کا فلسفی کہلاتا ہے۔ اس کی بہت سی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ وہ دنیا کے بارہ عظیم ترین مفکرین میں سے سمجھا جاتا ہے۔

بنو موسیٰ یعنی موسیٰ ابن شاکر کے تین بیٹے محمد، احمد اور حسن جو نویں صدی میں ہوئے علم ہیئت، علم ہندسہ (Geometry) اور مکینکس کے بہت بڑے عالم تھے۔ محمد کا انتقال 3-872ء میں ہوا اور ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔ سورج اور کچھ سیاروں کی حرکت و رفتار کا تعین جو انہوں نے کیا تھا وہ بقول سید امیر علی آج بھی صحیح ہے۔ انہوں نے اور کئی اکتسابات کیے جن سے یونانی ناواقف تھے۔ انہوں نے زمین کا دور ناپا۔ علم ہندسہ میں گرانقدر اضافے کیے۔ ان کی کتابوں کے لاطینی میں ترجمے ہوئے، جو ترجمہ گیراڈو (Gherado) نے کیا تھا وہ ہالے (Halle) سے 1885ء میں شائع کیا گیا۔

ابو علی یحییٰ ابن ابی منصور کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ اس نے 831ء میں وفات پائی۔ وہ عباسی خلیفہ المامون کے دربار سے وابستہ تھا وہ بہت بڑا ہیئت دان تھا۔ اس نے 30-829ء میں بغداد

میں ہیتی مشاہدات کیے اور علم ہیئت پر کئی کتابیں تصنیف کیں ۔ اس نے وہ زیج بنائی جو زیج مصدقہ (Testedtables) کہلاتی ہے ۔ اس کے پوتے ہارون بن علی (المتوفی 1-1900ء) بھی ہیئت دان تھا۔ سارٹن اس کو ایرانی کہتا ہے مگر سید امیر علی نے لکھا ہے کہ وہ خالص عرب تھا۔

ابو محمد عبدالملک ابن ہشام ابن ایوب الحماری البصری کی تاریخ ولادت معلوم نہیں اس نے 833ء میں فسطاط میں وفات پائی ۔ وہ مورخ تھا ۔ اس کی کتاب "سیرۃ الرسول" گوٹنگن (Goettingen) سے 60-1858ء میں شائع ہوئی اور اس کا مختصر جرمن ترجمہ 1864ء میں شٹ گارٹ (Stuttgart) سے شائع ہوا۔

ابو عثمان عمر ابن بحر الجاحظ 69-868ء میں نوے سال کی عمر میں بصرہ میں فوت ہوا ۔ وہ قبیلہ کنانہ سے تھا اپنے زمانہ کا بہت بڑا عالم تھا ۔ اس نے نظریہ ارتقاء کو ، جو اس کے استاد النظام نے پیش کیا تھا ، زیادہ تفصیل سے بیان کیا ۔ اس کی بہت سی تصنیفات میں "کتاب الحیوان" خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ اس میں ارتقاء حیوانی نفسیات اور ماحول کے اثرات قبول کرنے (Adaptation) کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ "کتاب الحیوان" 24-1323ھ میں قاہرہ سے اور 1900ء میں لائیڈن سے شائع ہوئی۔

ابو زید الحسن السیرانی کی ولادت و وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ، مگر یہ معلوم ہے کہ 1920ء میں اس نے کتاب "اخبار السین والہند" تالیف کی جو چین ، ہندوستان ، خراسان ، عرب کے جنوبی ساحل اور زنجبار (Zanzibar) کے بارے میں نہایت مفید معلومات فراہم کرتی ہے ۔ بحیثیت جغرافیہ داں اس کا اہم مقام ہے ، وہ عربی النسل تھا۔

ابو محمد الحسن ابن احمد ابن یعقوب الہمدانی ابن الحائک کا تعلق ایک یمنی قبیلہ سے تھا ۔ 46-945ء میں صنعا میں اس کا انتقال ہوا اور جغرافیہ ، تاریخ ، علم ہیئت اور علم آثار قدیمہ پر جو کتاب تصنیف کی اس کا نام "الاکلیل" ہے ۔ اس میں علم کائنات (Cosmology) ، ہیئت اور طبیعیات کے مسائل سے بھی بحث کی ہے۔

اس کتاب کو ڈی ۔ ایچ ۔ میولر (D.H. Mueller) نے 1984ء میں لائیڈن سے شائع کیا ۔ "الاکلیل" کے ایک حصہ کا جرمن ترجمہ بھی شائع ہوا۔

ابو دلف ابن المہلہل الخزرجی مکہ کے قریب بمقام ینبوع پیدا ہوا ، اور سامانی بادشاہوں کے

دربار سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بخارا میں رہا وہ شاعر اور سیاح تھا ۔ 942ء میں اس نے تبت اور ہندوستان کا سفر کیا اور کشمیر ، افغانستان اور سجستان ہوتا ہوا بخارا پہنچا ۔ اپنے سفر کے حالات اس نے "عجائب البلدان" میں قلمبند کیے ہیں ۔ یاقوت ایسے بڑے جغرافیہ داں نے اس کتاب کے اقتباسات اپنی کتاب "معجم البلدان" میں نقل کیے ہیں ۔ ابو دلف پر برلن ، لیپ زگ اور پیرس سے رسالے شائع ہوئے ہیں۔

ابو الحسن علی ابن الحسین ابن علی المسعودی حضرت عبداللہ مسعود صحابی رسول کی اولاد میں سے تھا ۔ وہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں بغداد میں پیدا ہوا ، اور 957ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا ۔ وہ عالم متبحر اور جامع العلوم تھا ۔ اس کی تصنیف "مروج الذہب و معاون الجواہر" بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے اور مصنف کی وسیع النظری و حقیقت پسندی پر دلالت کرتی ہے ۔ اس میں تاریخ ، جغرافیہ ، علم طبقات الارض وغیرہ کا بیان بڑے حکیمانہ انداز میں کیا گیا ہے ۔ اس نے اپنی دوسری تصنیف "کتاب التنبیہ و الاشراف" میں فلسفیانہ نظریات اور مسئلہ ارتقاء پیش کیا ہے ۔ مروج الذہب نو جلدوں میں پیرس سے 1861ء سے 1888ء کے درمیان شائع ہوئی ۔ بون اور لندن سے بھی کچھ حصے ترجمے کے ساتھ 1838ء اور 1841ء کے درمیان شائع ہوئے ہیں ۔ کتاب التنبیہ لائیڈن سے 1894ء میں آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ، اس کا فرانسیسی ترجمہ 1896ء میں پیرس سے شائع ہوا۔

ابو الفرج علی ابن الحسین ابن محمد ابن احمد القریشی الاصفہانی 68-867ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ وہ شاعر اور مورخ تھا ۔ اس کی مشہور تصنیف "کتاب الاغانی" عربی شاعری ، موسیقی اور علم آثار قدیمہ پر نہایت اہم کتاب ہے ، اس میں عرب کے عہد قدیم کے متعلق بہت بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ملتا ہے ۔ ابن خلدون نے اس کی بہت تعریف کی ہے اور اسے عربوں کا رجسٹر کہا ہے یعنی اس سے عربوں کے مفصل حالات معلوم ہو جاتے ہیں ۔ "کتاب الاغانی" بولاق میں 1868ء میں چھاپی گئی ۔ اس کی بیس جلدیں ہیں ۔ ایک حصہ لائیڈن سے 1888ء میں شائع ہوا پھر کچھ اور حصے لائیڈن سے 1900ء میں شائع ہوئے۔

ابو الفرج کی دوسری اہم تصنیف "کتاب الدیارات" ہے جس میں عیسائیوں کی خانقاہوں کا ذکر ہے ۔ ان دو کتابوں کے علاوہ بھی اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

ابو بکر محمد ابن الحسن ابن درید الازدی بصرہ میں 38-837ء میں پیدا ہوا اور 933ء میں بغداد میں اس نے وفات پائی ۔ وہ جنوبی عرب کے قبیلہ ازد کا فرد تھا ۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ علم الانساب اور لسانیات کا ماہر تھا ۔ اس نے عربی کا ایک ضخیم لغت "الجمہرہ فی اللغۃ" مرتب کیا ، عرب قبیلوں کے انساب

پر اس نے "کتاب الاشتقاق" تصنیف کی۔ اس نے ایک غنائی نظم کہی جو "المقصورہ" کے نام سے مشہور ہے۔

"اشتقاق" 1854ء میں گیوٹنگن سے شائع ہوئی۔ المقصورہ کے لاطینی ترجمہ کے ساتھ بہت سے ایڈیشن یورپ میں نکلے۔

ابو القاسم علی ابن الحسین العلوی الشریف الحسینی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ اس کا انتقال بغداد میں 985ء میں ہوا۔ وہ حضرت حسین کی اولاد میں تھا۔ وہ بویہ سلطان عضد الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے ہیئتی مشاہدات قلمبند کیے ہیں۔

آل بویہ کا سب سے بڑا بادشاہ سلطان عبدالمومن تھا جس نے 1130ء سے 1163ء تک حکومت کی۔ اس نے ابن زہر کو اپنا وزیر اور طبیب مقرر کیا۔ ابن زہر کا انتقال 62-1161ء میں اشبیلہ میں ہوا۔ اس نے علم طب میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بناء پر بہت سے اضافے کیے۔ اس کی تصانیف میں "کتاب التیسیر فی المداوات و التدبیر" سب سے اہم ہے۔ ابن زہر کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے، اس لیے یہاں اس کی طبی صلاحیتوں اور کارناموں کا اعادہ کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

ابن زہر کا بیٹا الحفید بھی طبیب تھا۔ اس نے امراض چشم پر ایک کتاب لکھی۔ الحفید کا بیٹا ابو محمد اور ابو محمد کا بیٹا ابو العلاء بھی طبیب تھے۔

ابو محمد القاسم ابن علی ابن محمد الحریری 55-1054ء میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان عربی تھا۔ اس نے صرف و نحو پر ایک نظم لکھی جس کا عنوان "ملحۃ الاعرب" ہے۔ اس نے اپنی تصنیف "کتاب دراۃ الغواص" میں زبان کی ان غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو پڑھے لکھے عموماً کرتے ہیں۔ دسویں صدی کے آخر میں مقفیٰ عبارت لکھنے کا رواج ہو گیا تھا۔ الحریری نے اس طرز پر کہانیوں کی ایک کتاب لکھی جس کا نام "مقامات" ہے۔ یہ بہت مقبول ہوئی اور اس زمانے کے ادب کا بہترین نمونہ سمجھی گئی۔ مقامات مقدمہ اور حاشیے کے ساتھ 1822ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ پھر اس کے اور ایڈیشن 53-1847ء میں نکلے۔ اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے 1867ء اور 1898ء میں شائع ہوا۔ فرانسیسی ترجمہ 89-1885ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ الحریری کا انتقال 1122ء میں ہوا۔

ابو منصور موہوب ابن ابو طاہر ابن احمد ابن محمد ابن الخضر الجوالیقی 74-1073ء میں بغداد

میں پیدا ہوا اور وہیں اس کا انتقال 1134ء میں ہوا، اس کی وفات کی تاریخ میں اختلاف ہے وہ عربی النسل ماہر صرف و نحو تھا۔ اس نے ابن قتیبہ کی کتاب "ادب الکاتب" کی شرح لکھی جس کا نام "کتاب المعرب من الکلام الاعجمی" ہے۔ الحریری کی "کتاب دراۃ الغواص" کا تتمہ لکھ کر اس کا نام "کتاب التکملہ فی مایلحن فیہ العامہ" رکھا۔ علم نحو پر اس نے "کتاب المختصر فی النحو" تصنیف کی۔ تکملہ لیپ زگ سے 1825ء میں اور معرب اسی مقام سے 1867ء میں شائع ہوئی۔

ابو عبداللہ محمد ابن محمد عبداللہ ابن ادریس الحمودی الحسنی حضرت حسن کی اولاد میں سے تھا اور الشریف الادریسی کہلاتا تھا۔ وہ سبتہ (Ceuta) میں 1100-1099ء میں پیدا ہوا، قرطبہ میں تعلیم پائی اور صقلیہ کے دارالحکومت پلرمو (Palermo) میں سکونت اختیار کی۔ 1166ء میں اس نے وفات پائی۔ وہ جغرافیہ کا بہت بڑا عالم تھا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں وہ قرون وسطیٰ کا سب سے عظیم جغرافیہ دان تھا۔ کچھ اور لوگ یاقوت اور ابوالفدا کو بھی اس کا ہمسر سمجھتے ہیں۔ اس کی تصنیف "نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق" جغرافیائی معلومات کا خزانہ ہے۔ نباتات اور حیوانات کا ذکر بھی بہت صحت کے ساتھ کیا ہے۔ 1952ء میں نزہت کا خلاصہ روم سے شائع کیا گیا۔

ابوالحسین محمد ابن احمد الکنانی۔ ابن جبیر 1145ء میں ویلنشیا (Valencia) میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے 1217ء میں اسکندریہ میں وفات پائی وہ عرب کے قبیلہ کنانہ سے تھا۔ وہ بہت بڑا سیاح اور جغرافیہ دان تھا۔ دو بار مشرقی ممالک کا سفر کیا۔ صقلیہ بھی گیا۔ وہاں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور جو مسلمان وہاں رہ گئے تھے ان پر بہت سختیاں کی جاتی تھیں۔ اس کو ان کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے پہلے سفر کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "رحلۃ الکنانی" ہے۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ یہ عربی کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔

ابو سعد عبدالکریم ابن محمد ابن منصور التمیمی السمعانی 1113ء میں مرو میں پیدا ہوا اور 1166ء میں اس نے وفات پائی۔ وہ قبیلہ تمیم سے تھا اور علم الانساب کا ماہر تھا۔ عربوں کے نسب کی تحقیق میں اس نے آٹھ جلدوں میں "کتاب الانساب" تصنیف کی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابن الاثیر اور سیوطی ایسے بلند پایہ عالموں نے اس کی تلخیصیں کیں۔ السمعانی نے الخطیب کی تاریخ بغداد کا تتمہ بھی لکھا۔

ابو المظفر اسامہ ابن مرشد جس کی تاریخ ولادت اور وفات معلوم نہیں۔ مگر یہ معلوم ہے کہ 53-1150ء میں اس نے صلیبی حملہ آوروں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا۔ وہ قبیلہ کنانہ سے تھا۔ اس کی عمر نوے برس سے زیادہ کی ہوئی۔ اس کی "کتاب الاعتبار" خود نوشتہ سوانح عمری ہونے کے علاوہ

تاریخ طبیعی پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ 1895ء میں، جرمن ترجمہ 1905ء میں اور انگریزی ترجمہ 1929ء میں شائع ہوا۔ اس کا متن 93-1889ء میں پیرس سے اور پھر 1930ء میں پرنس ٹن (Princeton) سے شائع ہوا۔

قاسم ابن عبدالملک ابن بشکوال القرطبی 1101ء میں پیدا ہوا اور 1183ء میں اس نے وفات پائی۔ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ وہ مدینہ کے ایک انصاری کی اولاد میں سے تھا۔ وہ فلسفی اور مورخ کی حیثیت سے مشہور ہے۔

ابو الفضل جعفر ابن علی الدمشقی عربی النسل ماہر اقتصادیات تھا۔ اس کی ولادت و وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ اس نے 1175ء میں یا اس سے پہلے تجارت اور دیگر اقتصادی مسائل پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب الاشارہ الی الحاسن التجارہ" ہے۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ یہ ایک بہت اہم تصنیف ہے۔ اس میں حقیقت المال سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جس پر 1175ء درج ہے قاہرہ کی خدیو لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے بہت سے اقتباسات کا جرمن میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابو القاسم عمر ابن علی ابن الفارض 81-1180ء میں قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے 35-1934ء میں وفات پائی وہ خالص عرب تھا۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ عرب شاعروں میں ابن الفارض کا بہت بلند مقام ہے۔ وہ صوفی تھا۔

نور الدین محمد العوفی حضرت عبدالرحمن بن عوف صحابی رسول کی اولاد میں سے تھا۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں وہ سندھ کے والی ناصرالدین قباچہ کے دربار میں 1204ء کے بعد پہنچا تھا۔ جب سلطان شمس الدین التمش نے 1228ء میں سندھ فتح کیا تو العوفی اس کے دربار سے وابستہ ہو گیا وہ بڑے پایہ کا ادیب تھا۔ اس نے "لباب الالباب" اور "جوامع الحکایات والد امیع الروایات" فارسی میں تصنیف کیں۔ لب الالباب میں اس نے فارسی ادب کی تاریخ بیان کی ہے اور دوسری میں ہر طرح کی مفید معلومات جمع کر دی ہیں۔

ابو الحسن علی ابن محمد عزالدین ابن الاثیر الشیبانی الجزیری قبیلہ شبال سے تھا۔ وہ 1160ء میں جزیرہ ابن عمر میں پیدا ہوا اور 1233ء میں اس نے وفات پائی۔ وہ قرون وسطیٰ کے عظیم ترین مورخوں میں سے ہے۔ اس کی تصنیف "کتاب الکامل فی التاریخ" کا شمار نہایت مستند تواریخ میں ہوتا ہے۔

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر "کتاب اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" لکھی اور السمعانی کی "کتاب الانساب" کی تلخیص کی۔ جس کا نام "کتاب اللباب مختصر اللنساب للسمعانی" ہے۔

پیرس سے 1876ء میں کتاب الکامل کی جلد دوم مع فرانسیسی ترجمہ کے شائع ہوئی۔ 76-1851ء میں لائیڈن (Leiden) سے چودہ جلدیں شائع ہوئیں۔ بولاق سے 86-1873ء میں کتاب الکامل بارہ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی یورپ میں کئی مقام سے شائع کی گئی۔ 4-1883 میں قاہرہ سے اسد الغابہ پانچ جلدوں میں شائع ہوئی۔

کمال الدین ابوالقاسم عمر ابن احمد ابن جراوہ ابن العدیم، العقیلی قبیلہ عقیل کے بنو جرادہ سے تھا۔ 1192ء میں حلب میں پیدا ہوا۔ یروشلم اور دمشق میں تعلیم پائی۔ مدرس اور قاضی کے عہدوں سے ترقی کر کے حلب کے سلاطین العزیز اور الناصر کا وزیر بن گیا۔

1260ء میں تاتاریوں نے حملہ کیا تو ابن العدیم مصر چلا گیا۔ 1262ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے مشاہیر حلب کی نہایت ہی ضخیم تاریخ لکھی تھی۔ جس کا نام "بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب" پھر خود ہی اس کی تلخیص مرتب کی۔ اس کی ایک اور تصنیف بھی ہے، یہ عطریات پر ہے اور اس کا نام "کتاب وصلت الی الحبیب فی وصف الطیبات والطیب" ہے۔

ابوالحسن علی ابن یوسف الشیبانی ابن القفطی قبیلہ شیبان سے تھا۔ وہ بالائی مصر میں بمقام قفط 73-1172ء میں پیدا ہوا اور اس نے قاہرہ میں سکونت اختیار کی۔ وہاں سے یروشلم منتقل ہو گیا، پھر 1202ء میں حلب چلا گیا جہاں 1248ء میں اس کا انتقال ہوا۔ کئی بار وہ حلب کے ایوبی فرمانرواؤں کا وزیر رہا۔ آخر بار وہ 1236ء میں وزیر مقرر کیا گیا اور اس منصب جلیلہ پر مرتے دم تک رہا۔ وہ بہت ذی علم اور سوانح نگاروں میں سب سے فائق تھا۔ اس کے کتب خانہ میں اس قدر کتابیں تھیں کہ اس کے مرنے کے بعد جب ان کی قیمت کا تخمینہ کیا گیا تو ساٹھ ہزار دینار نکلا۔ وہ اہل علم کی دستگیری اور مدد کرتا رہتا۔ چنانچہ مشہور جغرافیہ داں یاقوت بھی اس کی فیاضی سے مستفید ہوا۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "کتاب اخبار العلماء بہ اخبار الحکماء" ہے جس کی تلخیص محمد ابن علی الزوزانی نے کی۔ اصل کتاب دستیاب نہیں۔ تلخیص میں چار سو چودہ اہل علم کے سوانح پائے جاتے ہیں۔ ان اہل علم میں اکثر اطباء، فلاسفہ اور حکماء تھے جن کے حالات سے مسلمانوں کے عہد کی سائنس اور اس کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب تاریخ الحکماء کے نام سے مشہور ہے۔ 1903ء میں برلن سے شائع کی گئی۔

قاضی فتح الدین ابو العباس ، محمد ابن عثمان القیسی قبیلہ قیس سے تھا۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ وہ ایوبی سلطان الصالح کے عہد میں تھا جس نے 1240ء سے 1249ء تک حکومت کی۔ وہ عالم طب تھا اور "رئیس الاطبا ، بدیار المصریہ" کہلاتا تھا۔ وہ بالخصوص امراض چشم کا معالج تھا اس نے علم العین پر "نتیجہ الفکر فی علاج امراض البصر" تصنیف کی۔ یہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علم العین اس کے زمانہ تک بہت ترقی کر چکا تھا۔

محمد ابن ابراہیم ابن یحییٰ الواط جمال الدین الانصاری الوراق کے نام میں الانصاری سے ظاہر ہے کہ مدینہ کے کسی انصاری کی اولاد میں سے ہے۔ وہ 1235ء میں پیدا ہوا اور 1318ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے جغرافیہ اور علم طبیعی پر ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی جس کا نام "مباہج الفکرہ مناہج العبر" ہے۔

ابو محمد ابن محمد علی العبدری قبیلہ قریش سے تھا۔ عبد الدار ابن قصی ابن کلب ابن مرہ اس کا مورث اعلیٰ تھا وہ ویلنشیا میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں۔ 1289ء میں حج کے لیے مکہ جاتے ہوئے اور واپسی میں اس نے خشکی کی راہ سے سفر کیا۔ اس طرح وہ پورے شمالی افریقہ سے دوبار گزرا۔ چنانچہ اس نے ان ممالک کے حالات پر "الرحلۃ المغربیہ" تصنیف کی جس میں ان ممالک کی جغرافیہ اور معاشرت پر بیش بہا معلومات فراہم کیں۔

حمد اللہ ابن ابی بکر متوفی القزوینی مشہور مجاہد حر الریاحی کی اولاد میں سے تھا۔ حر یزید کی فوج کا ایک افسر تھا اور حضرت حسین کی مزاحمت کے لیے آیا تھا۔ مگر وہ یزیدی فوج کو چھوڑ کر حسین سے آملا تھا اور ان کے ساتھ شہید ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔ متوفی کی دو تصانیف "تاریخ گزیدہ" اور "نزہتہ القلوب" بہت مشہور ہیں۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ متوفی کی تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں مگر اس کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ 1281ء میں پیدا ہوا تھا۔ 1340ء میں اس نے نزہتہ القلوب لکھی یہ معلوم نہیں کہ اس کے بعد اس کا انتقال کب ہوا۔

متوفی نے فردوسی کے شاہنامہ کو پیش نظر رکھ کر پچھتر ہزار اشعار کی ایک منظوم کتاب لکھی جس کا نام "ظفر نامہ" ہے۔

تاریخ گزیدہ کے مختلف حصے یورپ سے شائع کیے گئے۔ نزہتہ القوب 94-1893ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس کے کچھ حصوں کا انگریزی اور فارسی میں ترجمہ بھی شائع ہوا۔

ابو عبد اللہ محمد ابن ابراہیم ابن الرقام الاوسی المرسی مدینہ کے قبیلہ اوس سے تھا۔ اس کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں وہ مرسیہ (Murcia) کا رہنے والا تھا۔ اس کا انتقال 27 مئی 1315ء کو غرناطہ میں ہوا جہاں وہ طبابت کرتا تھا۔ طبیب ہونے کے علاوہ ریاضی و ہئیت داں بھی تھا۔ اس نے ان علوم پر کتابیں لکھیں جن میں سے صرف ایک دستیاب ہے جو علم الظلال پر ہے۔

شمس الدین محمد ابن عیسیٰ ابن کرا الحنبلی آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کی اولاد میں سے تھا۔ وہ قاہرہ میں 1282ء میں پیدا ہوا اور 1358ء میں اس نے وفات پائی۔ اس نے موسیقی پر "غایۃ المطلوب فی فن الانغام و الضروب" لکھی۔

شہاب الدین ابو العباس احمد ابن یحییٰ ابن فضل اللہ العمری القریشی حضرت عمر خلیفہ دوم کی اولاد میں سے تھا۔ وہ 11- جون 1301ء میں دمشق میں پیدا ہوا۔ دمشق ، قاہرہ ، اسکندریہ اور حجاز میں تعلیم پائی۔ قاہرہ کا قاضی مقرر ہوا اور پھر اپنے والد کی جگہ مملوک سلطان کا وزیر بنا۔ فروری 1349ء میں اس کا دمشق میں انتقال ہوا۔ اس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" ہے جس میں جغرافیہ۔ تاریخ طبیعی۔ سیاست ، سوانح حیات اور عربی شاعری کی تاریخ سے بحث کی گئی ہے۔

دوسری تصنیف "التعریف بی المصللاح الشریف" ہے جس میں سرکاری آداب و دستاویزات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں انیسویں و بیسویں صدی میں کئی مقامات سے شائع کی گئی ہیں۔

الملک المجاہد بن علی ابن داؤد الرسولی یمن کے رسولی خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا۔ اس نے 1321ء سے 1362ء تک حکومت کی۔ اس نے گھوڑوں اور کچھ اور جانوروں پر ایک نہایت مفید کتاب لکھی جو تاریخ طبیعی کی اہم کتابوں میں سے ہے۔ اس کتاب کا نام "الاقوال اتفاقیہ الفصول الشافیہ فی علم البیطرہ" ہے۔ 1837ء میں فخر الدین احمد نے خراسان کے گورنر کے لیے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

ابو الفضائل صفی الدین عبد المومن ابن الخطیب عبد الحق البغدادی الحنبلی عربی النسل جغرافیہ دان تھا۔ 60-1259ء میں پیدا ہوا اور وہیں وہ 39-1338ء میں فوت ہوا۔ اس نے ایک جغرافیائی لغت مرتب کیا ، جس کا نام "مراصد الاطلاع علیٰ اسماء الامکنہ والبقاع" ہے۔ یہ یاقوت کی معجم البلدان پر مبنی ہے اس میں کچھ اضافے بھی پائے جاتے ہیں۔

مراصد لائیڈن سے چھ جلدوں میں 1850-64ء میں شائع ہوئی۔ پہلی تین جلدوں میں متن ہے باقی تین میں مقدمہ اور حواشی ہیں۔

ابو عثمان سعد ابن احمد ابن لیون التجیبی عرب کے قبیلہ بنو تجیب سے تھا۔ اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ 30 اگست 1349ء کو طاعون سے المیریا (Almeria) میں اس کی وفات ہوئی۔ ایک عرصہ وہ غرناطہ میں رہا اور وہاں کے مشہور مورخ و طبیب ابن الخطیب نے اس سے تعلیم پائی۔

ابن لیون نے زراعت اور باغبانی پر ایک نظم "ابداء الملاحہ و انہاء الرجاحہ فی اصول صناعات الفلاحہ" کہی۔ لسانی اعتبار سے بھی یہ نظم قابل توجہ ہے۔ اس میں زراعت کے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

ابو یحییٰ محمد ابن رضوان ابن ارقام کے بزرگ عرب سے اسپین منتقل ہو گئے تھے۔ اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ اس کی وفات 1356ء میں ہوئی وہ ریاضی ہیئت دان تھا۔ اس نے ہیئتی مسائل پر ایک نظم "منظوم فی علوم النجوم" کہی۔ اصطرلاب پر اس نے "رسالہ فی الاصطرلاب" تصنیف کیا۔ وہ علم الانساب کا بھی ماہر تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس نے "شجرہ فی انساب العرب" اور سلطان کے لیے گھوڑوں پر "کتاب الاحتفال فی استیفاء تصنیف ما لخیل" کہی۔

ابو جعفر احمد ابن علی ابن خاتمہ الانصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار میں سے کسی کی اولاد میں سے ہے۔ جیسا کہ "الانصاری" سے عیاں ہے۔ وہ المیریا میں 1323-24ء میں پیدا ہوا۔ اس کی وفات کی تاریخ نہیں معلوم، مگر 1408ء میں اس کا زندہ ہونا ثابت ہے۔ وہ شاعر، طبیب اور مورخ تھا۔ اس نے المیریا کی تاریخ لکھی جس کا نام "المزیت علی المیریا غیرہا من بلاد الاندلسیا" ہے۔ اس میں اسپین کے دوسرے شہروں پر المیریا کو فوقیت دی ہے۔ اس کی دوسری کتاب کا نام ہے "تحصیل الغرض القاصد فی تفصیل المرض الوافد"۔ یہ کتاب طاعون کی وبا پر ہے جو المیریا میں خوب پھیلی تھی۔ اس کا ایک حصہ 1863ء میں میونخ (Munich) سے شائع کیا گیا تھا۔

ابو عبداللہ شمس الدین محمد ابن ابراہیم الانصاری السنجاری جس نام سے مشہور ہے وہ ابن الاکفانی ہے۔ یہ بھی انصاری یعنی مدینہ کے انصار میں سے کسی کی اولاد ہے۔ اس کی ولادت کی تاریخ نہیں معلوم۔ اس کا انتقال 1348-49ء میں ہوا۔ اس کی پیدائش موصل کے مغرب میں جزیرہ میں ہوئی تھی مگر اس نے طبابت کے لیے قاہرہ میں رہنا پسند کیا۔ طب پر اس کی تین کتابیں ہیں (1) "کشف الرین فی احوال العین" (یعنی آنکھ کی حالت میں نقص) (2) "کتاب غنیۃ البیت فی غنیۃ

الطبیب" (طبیب کی غیر موجودگی میں گھریلو دوائیں) (3) "نہایۃ القصد فی صناعۃ الفصد" (فصد کھولنے کے بارے میں)۔

ان کے علاوہ تین کتابیں اور لکھیں۔ ایک غلاموں کے بارے میں ہے، دوسری جواہرات کے بارے میں اور تیسری ساٹھ علوم پر معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ چونکہ الاکفانی کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس لیے یہاں تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت نہیں۔

ابو عبداللہ محمد ابن یعقوب بہاؤالدین الجندی عربی النسل مورخ تھا۔ اس کی ولادت معلوم نہیں اس کا انتقال 1331-32ء میں ہوا۔ اس نے یمن کی سیاسی اور ادبی تاریخ لکھی جس کا نام "کتاب السلوک فی طبقات العلماء و الملوک" ہے اس میں 1323-24ء تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ الحسین ابن عبد الرحمٰن الاہدل نے جس کا انتقال 1451ء میں ہوا اس کا تتمہ لکھا۔

"کتاب السلوک" کا وہ حصہ جو قرامطہ کے متعلق تھا، انگریزی ترجمہ کے ساتھ لندن سے 1892ء میں شائع ہوا تھا اور اقتباسات پیرس سے 1902ء میں شائع کیے گئے۔

ابو جعفر جلال الدین محمد ابن علی طبا طبائی ابن الطقطقا حضرت حسن کی اولاد میں سے تھا وہ 1262ء میں پیدا ہوا۔ اس کی وفات کی تاریخ نہیں معلوم۔ اس کی "کتاب الفخری" تاریخ اور سیاست پر ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کا فارسی میں ہندو شاہ ابن سنجر الکیرانی نے ترجمہ کیا۔ یورپی زبانوں میں اس کے اقتباسات شائع ہو چکے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

کمال الدین ابو الفضائل عبد الرزاق الشیبانی ابن احمد ابن محمد البغدادی قبیلہ شیبان سے تھا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ 26 جون 1242ء کو وہ بغداد میں پیدا ہوا۔ 1258ء میں جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تو عبد الرزاق کو قید کر کے اس نے آذربائیجان بھیج دیا۔ ہلاکو کے وزیر ناصر الدین طوسی نے اسے رہا کرایا اور مراغہ کے کتب خانے کا مہتمم مقرر کیا۔ مراغہ میں اس نے تیرہ سال گزارے۔ وہاں سے بغداد واپس آیا اور 13 جنوری 1323ء کو بغداد ہی میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے تاریخ اور علم اللسان پر کتابیں لکھیں۔ ان میں سے تین کتابیں یہ ہیں۔ (1) "الحوادث الجامعہ و التجارب النافعہ من المئۃ السابعہ" اس میں چند آخری عباسی خلفاء اور تاتاری حملہ آور ان کی حکومت کا بیان ہے (2) "مجمع الآداب فی معجم الاسماء و الالقاب" یہ سوانح عمریوں کا مجموعہ ہے جو پچاس جلدوں پر مشتمل تھا۔ اب صرف ایک جلد (ع سے ق تک) دستیاب ہے (3) "مختصر الاخبار الخلفاء العباسین" اس میں عباسی خلافت سے متعلق کہانیاں ہیں۔

عبدالرزاق کی تصانیف اس لحاظ سے بہت بیش بہا ہیں کہ علاوہ اس نے جن چند عرب مورخین کے ہلاکو کی تاخت و تاراج اور تاتاریوں کی حکومت کے حالات قلمبند کیے تھے وہ قریب قریب نایاب ہیں۔ عبدالرزاق کو تاتاری عمائد سے ملنے جلنے اور بعدمیں ان کے زیادہ مہذب حکمرانوں یعنی ارغون اور اس کے جانشینوں کا دور دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ جو کچھ دیکھا تھا وہی اس نے اپنی کتابوں میں بیان کر دیا ہے۔ یہ عینی شہادت تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ الحوادث 1932ء میں بغداد سے شائع کی گئی۔

ابو بکر محمد ابن محمد ابن عاصم القیسی الغرناطی عرب کے قبیلہ قیس عیلان سے تھا وہ اپریل 1391ء میں پیدا ہوا۔ اس نے غرناطہ میں سکونت اختیار کی اور اگست 1427ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے قصوں کی ایک کتاب لکھی جس کا نام "حدائق الاظاہر" ہے اور اسے غرناطہ کے ناصری سلطان یوسف ثانی کے نام معنون کیا۔ ابن عاصم اس کا وزیر تھا۔ اس نے اصول قانون پر ایک نظم "تحفۃ الحکام فی نکث العقود والاحکام" کہی جو بہت مقبول ہوئی۔

تحفۃ الحکام 93-1882ء میں الجر (Alger) سے فرانسیسی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ شائع ہوئی۔ الجیریا اور مراکش میں اس کے کئی ایڈیشن نکلے اور اس پر شرحیں لکھ کر شائع کی گئیں۔

سید شاہ نعمت اللہ ابن عبداللہ حضرت امام باقر کی اولاد میں سے تھا۔ وہ حلب میں 31-1330ء میں پیدا ہوا۔ تیرہ برس مکہ میں گزارے، پھر سمرقند، ہرات، یزد میں رہا۔ آخر میں کرمان میں بمقام ماہان سکونت اختیار کی جہاں 5 اپریل 1431ء کو انتقال ہوا وہ صوفی شاعر تھا۔ اس نے اپنا دیوان مرتب کیا اور کچھ کتابیں تصوف پر لکھیں۔ اس کا تصوف ابن عربی کا تصوف ہے۔

علی ابن محمد الجرجانی السید الشریف حضرت فاطمہ کی اولاد میں سے تھا۔ جرجان کے صوبے میں استر آباد کے قریب ایک مقام پر اس کی ولادت فروری 1340ء میں ہوئی۔ ہرات، کرمان اور مصر میں اس نے تعلیم پائی۔ 1377ء میں التفتازانی نے اسے فارس کے مظفری سلطان شاہ شجاع سے متعارف کیا۔ شاہ نے اسے شیراز کے دارالشفا کا مہتمم بنا دیا۔ 1387ء میں تیمور نے شیراز فتح کیا اور الجرجانی کو سمرقند لے گیا۔ 1405ء میں تیمور کے انتقال کے بعد وہ شیراز واپس آگیا۔ اس نے عربی اور فارسی میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ وہ فلسفی، ہیئت دان اور عالم صرف ونحو تھا۔ "مقالد العلوم فی الحدود والرسوم" میں اس نے سائنس کی اکیس شاخوں کی اصطلاحات لکھی ہیں۔ "رسالہ فی تقسیم العلوم" اور "کتاب التعریفات" بھی اس کی تصنیفات میں سے ہیں۔ اس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

کتاب التعریفات لیپ زگ سے 1845ء میں، قاہرہ سے 1866ء میں اور قسطنطنیہ سے 1883ء میں شائع ہوئی۔ علی ابن الحسین الانصاری کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ مدینہ کے کسی انصاری کی اولاد میں سے تھا۔ وہ حاجی زین العطار کے نام سے مشہور ہے۔ 30-1229ء میں وہ شیراز میں پیدا ہوا۔ وہ مظفری سلطانی جلال الدین شاہ شجاع کے دربار سے سولہ سال تک وابستہ رہا۔ اس نے 4-1403ء میں وفات پائی۔ اس نے ادویات پر "مفتاح الخزائن" تصنیف کی۔ شہزادی بدیع الجمال کے لیے اس نے مفتاح میں کچھ تبدیلی اور کچھ اضافے کرکے اسے پھر مرتب کیا اور اس کا نام "اختیارات بدیعی" رکھا۔

مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا مفتاح الخزائن کا نسخہ Bodleian میں موجود ہے۔ "اختیارات" کے بہت سے قلمی نسخے دستیاب ہیں ان میں سے ایک پیرس میں ہے۔

لسان الدین ابو عبداللہ السلمانی ابن الخطیب کا جد امجد سلمان یمن کا باشندہ تھا۔ 15 نومبر 1313ء کو غرناطہ کے قریب لوجہ (Loja) میں ابن الخطیب کی ولادت ہوئی۔ 1349ء سے 1359ء تک وہ ناصری سلطان محمد پنجم کا وزیر رہا۔ 1359ء میں سلطان محمد تخت سے اتار دیا گیا مگر پھر 1362ء میں وہ تخت نشین ہوا تو ابن الخطیب کو پھر منصب وزارت عطا ہوا۔ کچھ وجوہ سے 1371ء میں اسے غرناطہ سے بھاگنا پڑا۔ 1374ء میں جبکہ وہ قید خانہ میں تھا، کسی نے اسے قتل کر دیا۔

ابن الخطیب اسپین کے نہایت ممتاز مورخوں اور طبیبوں میں سے تھا اور جغرافیہ کا علم بھی رکھتا تھا۔ جغرافیہ دانوں کے ساتھ اس کا مختصر ذکر کیا گیا ہے مگر افسوس کہ طب کے تحت اس کی طبی معلومات بیان ہونے سے رہ گئیں۔ اس نے طب پر بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے چند یہ ہیں:

(1) "منافعۃ السائل عن المرض الحائل" اس میں طاعون کی اس وبا کا بیان ہے جو غرناطہ میں 1348ء میں پھیلی تھی۔ اس زمانہ میں یہ خیال عام تھا اور اسے کسی حدیث پر مبنی سمجھتے تھے کہ کوئی بیماری ایک دوسرے کو نہیں لگتی۔ ابن الخطیب نے اس کتاب میں پرزور الفاظ میں لکھا ہے کہ طاعون متعدی مرض ہے جو کپڑوں، برتنوں، کان کی بالیوں اور دوسرے ذرائع سے ایک مریض سے تندرست آدمیوں کو لگ جاتا ہے۔ دوسرے مقامات سے آنے والے لوگ جو اس مرض میں مبتلا ہوں، مرض کے پھیلنے کا باعث ہوتے ہیں۔ جس گھر میں یہ بیماری ہو وہاں کے لوگ دوسرے گھروں میں جا کر اس کے پھیلنے کا سبب بنتے ہیں۔

(2) "عمل من طبہ لمن حبہ" کے دو حصے ہیں پہلے میں ہر مرض کی علامتیں، وجوہ، تشخیص،

علاج، دواؤں اور غذا کا ذکر ہے، آنکھ کی بیماریوں کا بیان بہت مفصل طور پر کیا ہے۔ دوسرے حصے میں بخاروں، جراحی، تیل، ابٹن، جنسی ترغیب دلانے والی چیزوں، جنسی زندگی اور بچوں کے علاج سے بحث کی ہے۔

(3) منظومہ فی الطب

(4) "الاصول لی حفظ الصحۃ فی الفصول" مختلف موسموں میں غذا اور دوسری چیزوں کی پابندیاں بیان کی ہیں۔

(5) "الیوسفی فی صنعۃ الطب" یہ علم طب پر ایک ضخیم تصنیف ہے۔

علم الجنین (Embryology) اور بیطاریات (Veterinary Science) پر بھی اس کی کتابیں ہیں۔ تاریخ پر ابن الخطیب نے بارہ کتابیں لکھیں، جن میں سب سے زیادہ اہم "الاحاطہ بتاریخ غرناطہ" ہے۔ اس میں اسپین کے تمام مشاہیر کے حالات بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کو مختصر کر کے 1319ھ میں قاہرہ سے شائع کیا گیا اس کے کئی قلمی نسخے موجود ہیں۔ لاطینی میں اس کے کئی حصوں کا ترجمہ شائع ہوا۔ ابن الخطیب کی اور کتابیں بھی یورپ میں چھپی ہیں۔

"منفعۃ" یعنی طاعون پر رسالے کا ترجمہ جرمن میں ہوا اور میونخ سے 1863ء میں شائع کیا گیا۔

ابوالحسن علی ابن الحسن ابن وہاس الخزرجی انساب مدینہ کے قبیلہ خزرج سے تھا۔ اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ اس کا انتقال 1409ء میں ہوا۔ اس نے یمن کی ایک مفصل تاریخ "تواریخ الیمن" تصنیف کی۔ اس میں بادشاہوں کے رسولی خاندان کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ اس خاندان کی قدامت ثابت کرنے کے لیے اس نے یمن کی قدیم تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ وہاں کے اس پشتے کا ذکر کیا ہے جو سبا کی ملکہ بلقیس کے عہد سے پہلے تعمیر کیا گیا تھا اور جس پر یمن کی زرخیزی کا انحصار تھا اور جس کے چھٹی صدی عیسوی میں ٹوٹ جانے سے یمن کی خوشحالی جاتی رہی۔

ابن وہاس یمن کے رسولی بادشاہ الاشرف اسمٰعیل کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس بادشاہ نے 1376ء سے 1400ء تک حکومت کی۔

الملک الافضل العباس الرسول ابن علی یمن کے باشاہوں کے رسولی خاندان کا چھٹا سلطان تھا۔ اس کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں اس نے 64-1263ء سے 1376ء تک حکومت کی اور اس کے بعد الاشرف اسمٰیل سلطان ہوا۔ اس نے زراعت پر ایک نہایت مفید اور اہم کتاب تصنیف کی جس کا نام "بغیۃ الفلاحین فی الاشجار المثمرہ و الریاحین" ہے۔ اس کتاب کا مفصل ذکر تاریخ طبیعی کے تحت کیا جا چکا ہے۔

جیسا کہ ابن وہاس نے ثابت کیا ہے، رسولی خاندان یمن کا ایک بہت پرانا، خاندان تھا۔ اس لیے العباس کا عربی النسل ہونا ظاہر ہے۔

ابو زید ولی الدین عبدالرحمٰن ابن محمد ابن خلدون التونسی، الحضرمی، الاشبیلی المالکی کے نام میں الحضرمی ہونے کا سبب بقول سید امیر علی یہ ہے کہ حضرموت سے اس کے اجداد منتقل ہو کر اسپین پہنچے تھے۔ جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ وہ جنوبی عرب کے قبیلہ کندہ سے تھا۔ ابن خلدون تونس میں 27 مئی 1332ء کو پیدا ہوا اور مارچ 1406ء میں اس نے قاہرہ میں وفات پائی۔ اس نے اپنی تصنیف "کتاب العبرو الجزو دیوان المبتداء و الجزنی ایام العرب و العجم والبر بر ومن عاصر ہم من ذوئی السلطان الا بر" کا جو مقدمہ لکھا ہے وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ وہ علم العمران کا موجد تھا۔ اس نے سیاست کے نشوونما اور معاشرے کے بنیادی اصولوں کا جس گہری نگاہ سے مطالعہ کیا ہے اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کا مفصل ذکر قانون و عمرانیات کے تحت کیا جا چکا ہے۔ وہ ایک بہت بڑا مفکر اور فلسفہ تاریخ کا ماہر تھا۔ اس کے خیالات عہد حاضر کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔

ابو زکریا یحییٰ ابن محمد ابن خلدون کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ 1333ء میں تونس میں پیدا ہوا۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی کئی درباروں سے وابستہ رہا اور دنیا کے نشیب و فراز دیکھے۔ اسے بھی گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالا گیا اور بالآخر دسمبر 1378ء یا جنوری 1379ء میں کسی نے اسے قتل کر دیا۔

اس نے زیانی خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھی جس کا نام "بغیۃ الروادفی ذکر الملوک من بنی عبدالواد" ہے۔ چونکہ ابو زکریا خود ادیب و شاعر تھا، اس نے اس تاریخ میں تلمسان کے ادبی ماحول کو اچھی طرح بیان کیا ہے۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ اس کی تاریخ میں وہ گہرائی نہیں جو عبدالرحمٰن کی تاریخ میں ہے مگر اسلوب بیان زیادہ دلچسپ ہے۔

یہ کتاب فرانسیسی ترجمے اور حواشی کے ساتھ الجیرس (Algiers) سے دو جلدوں میں 1904-13ء میں شائع کی گئی۔

ابو الفداء اسماعیل ابن عمر ابن کثیر البصروی القریشی الشافعی کے نام میں القریشی سے ظاہر ہے کہ وہ عربی النسل تھا۔ وہ دمشق میں 1301ء میں پیدا ہوا وہ ابن تیمیہ حنبلی کا شاگرد تھا اور جو سختیاں ابن تیمیہ پر کی گئیں اس نے بھی ان کے ساتھ بھگتیں ۔ اس کا انتقال فروری 1373ء میں ہوا ۔ اس نے دس جلدوں میں ایک تاریخ لکھی جس کا نام " کتاب البدایہ و النہایہ " ہے ۔ یہ 1365ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے ۔ اس کا تتمہ پہلے احمد ابن علاؤ الدین الدمشقی (المتوفی 1413ء) نے ' پھر احمد ابن ابی بکر الطبرانی المالکی (المتوفی 1431ء) نے اور اس کے بعد تقی الدین ابن قاضی شہبہ (المتوفی 1448ء) نے لکھا۔ البدایہ کے کچھ اقتباسات برلن سے 1833ء میں شائع ہوئے ہیں۔

ابن کثیر حدیث کا بہت بڑا عالم تھا۔ دمشق میں ام الصالح اور اشرافیہ میں حدیث کا درس دیتا تھا۔

ابو العباس شہاب الدین احمد بن علی القلقشندی المصری خالص عرب تھا۔ وہ القلقشندہ میں 1355-56ء میں پیدا ہوا اور 15 جولائی 1418ء کو اس نے وفات پائی ۔ اس نے تاریخ ' جغرافیہ اور سیاسی و دفتری امور پر ایک انسائیکلوپیڈیا تصنیف کیا جس کا نام "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء " ہے ۔ القلقشندی کا ذکر قانون و عمرانیات کے تحت کیا جا چکا ہے ۔ یہ کتاب پچیس سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ یہ کتاب سیاسی و معاشرتی امور پر معلومات کا گنجینہ ہے۔

مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے جو مقالہ 1917ء میں سوربون یونیورسٹی کو پیش کیا تھا ' اس میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ القلقشندی کی " صبح الاعشیٰ " نے ابن خلدون کو وسعت فکر و نظر بخشی ۔ دوسری جگہ لکھا کہ "صبح الاعشیٰ " پڑھنے کے بعد ابن خلدون کی جدت طرازی کا مرتبہ بالکل کم ہو جاتا ہے ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے مقالہ میں ابن خلدون کے نقائص بیان کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن اس گمان میں کہ ابن خلدون کی وسعت فکر و نظر اور جدت طرازی القلقشندی کی کتاب پر مبنی ہے وہ حد سے گزر گیا ہے ۔ جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ "صبح الاعشیٰ " کی تصنیف فروری 1412ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی تھی ۔ ابن خلدون اس سے چھ سال پہلے مارچ 1406ء میں راہی ملک عدم ہو چکا تھا ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کتاب اس کی وفات کے چھ سال بعد مکمل ہوئی اس سے ابن خلدون کیا استفادہ کر سکتا تھا ۔ مزید برآں ابن خلدون کو جس تصنیف نے زندہ جاوید بنایا ہے وہ " کتاب العبر " کا مقدمہ ہے اور یہ مقدمہ اس نے 1374ء سے 1378ء تک چار سال کی مدت

میں لکھا تھا ۔ اس وقت تک القلقشندی نے "صبح الاعشیٰ " لکھنی بھی شروع نہیں کی تھی ۔ اس نے اس کا آغاز 1387ء میں کیا اور پچیس سال کی محنت کے بعد 1412ء میں اسے مکمل کیا ۔ ان حقائق کے پیش نظر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یہ نرالی تحقیق بے سر و پا معلوم ہوتی ہے۔

عربی النسل اہل علم کے مذکرہ بالا نام جارج سارٹن کی تصنیف "مقدمہ تاریخ سائنس " سے لئے گئے ہیں جس میں چودھویں صدی کے بعد پیدا ہونے والے علماء و حکماء سے بحث نہیں کی گئی ۔ اس کے بعد کی تین صدیوں میں بھی مسلمان اہل علم گزرے ہیں اور ان میں بھی یقیناً کافی تعداد عربی النسل لوگوں کی ہوگی ۔ مزید برآں یہ بھی ممکن ہے کہ چودھویں صدی تک کے لوگوں میں بھی کچھ ایسے اکابر ہوں جن کی قومیت کا صحیح علم جارج سارٹن کو نہ ہو ۔ مثلاً جارج سارٹن نے ابو علی یحییٰ ابن ابی منصور (المتوفی 831ء) کو جو مشہور ہیئت دان تھا ایرانی بتایا تھا مگر سید امیر علی نے کہا ہے کہ وہ خالص عرب تھا ۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے ہیئت دان ابن یونس کے نام کے ساتھ جارج سارٹن نے الصدفی المصری لکھا ہے اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ عربی النسل ہے ۔ سید امیر علی نے ابن خلکان کے حوالے سے بتایا کہ الصدف عرب قبیلہ حمیار کی ایک شاخ ہے ۔ تب پتہ چلا کہ ابن یونس عربی النسل تھا۔

الماوردی ' ابن بشکوال ' ابن باجہ اور ابن منقذ کے بارے میں جارج سارٹن نے یہ نہیں بتایا کہ وہ عربی النسل تھے بلکہ امیر علی نے جہاں رینان کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ عربوں میں صرف الکندی کا نام بڑے فلسفیوں اور اہل علم میں لیا جا سکتا ہے وہاں ان چاروں کو عربی النسل کہا ہے ۔ ایسے کچھ اور اہل علم بھی ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں جارج سارٹن کو عربی النسل ہونے کا علم نہ ہوا ہو ۔ بہر حال جتنے لوگوں کے بارے میں عربی النسل ہونا معلوم ہوا ہے ان میں بہت سے ایسے ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے ۔ جس قوم میں اصمعیٰ ' خلیل ابن احمد ' الکندی ' شاکر ابن عیسیٰ کے تین بیٹے محمد ' احمد اور حسن جو بنو موسیٰ کے نام سے مشہور ہیں ' ابو علی یحییٰ ' ابن منصور الجاحظ ' المسعودی ' الفرج الاصفہانی ' ابن یونس ' الماوردی ابن باجہ ' ابن طفیل ' ابن زہر ' الادریسی ' جعفر ابن علی ' ابن الاثیر ' ابن القفطی ' حمد اللہ ابن ابو بکر مستوفی ' فضل اللہ العمری ' ابن الاکفانی ' علی ابن صدالجرجانی ' ابن الخطیب السلمانی ' ابن خلدون ' اور احمد ابن القلقشندی پیدا ہوئے ہوں وہ یقیناً اہل علم و حکمت کی قوم ہونے پر فخر کر سکتی ہے ۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں الکندی کے علاوہ کوئی قابل ذکر عالم و حکیم نہیں ہوا صریح افترا پردازی ہے۔

علم طب اور دیگر متعلقہ علوم کا فروغ

عربوں نے علم طب کو متقدمین کے مقابلے میں بہت ترقی دی۔ یہودی ڈاکٹر جنھوں نے عربی درسگاہوں میں تربیت پائی تھی ازمنہ وسطیٰ میں طب پڑھانے اور علاج کرنے کے فرائض ادا کرتے رہے جو ذخیرہ ادویہ (Pharmaeopacia) عربوں نے فراہم کیا تھا۔ فی الواقع آج بھی وہی ہے۔ البتہ اب دوائیں مرکبات کی شکل میں بننے لگی ہیں اور کچھ دواؤں میں جانوروں کے اعضاء کے عرق بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ مونٹ پیلیر (Mont Pellier) کا طبی دارالعلوم قرطبہ کے نمونے پر یہودی ڈاکٹروں نے قائم کیا تھا۔ اس کی تقلید پڈنا (Padna) میں اور پھر پیسا (Pisa) میں کی گئی۔ وہاں اور تمام یورپ میں ابن سینا کی تصنیف موسومہ "قانون" اور ابو القاسم کی تصنیف جس کا نام "فن جراحی" تھا سترہویں صدی تک درسی کتابوں کی حیثیت سے پڑھائی گئیں اور ان کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے علم ریاضی اور علمی ہیئت بھی پڑھائے جاتے تھے۔ یہ وہ گہوارے تھے جن میں فلوپیس (Fallopuis)، ویسلیس (Vesalius)، کارڈن (Cardan)، ہاروے (Harvey) اور گلیلیو (Galileo) پلے اور بڑھے۔ "وہ قوت جس نے مادی اور ذہنی دنیا کی شکل بدل کر رکھ دی نجومیوں، کیمیاگروں اور قرون وسطیٰ کے پچھلے عہد کی طبی درسگاہوں کی بالواسطہ تخلیق ہے اور ان کا وجود براہ راست اور قطعی طور پر عربی تہذیب کا رہین منت ہے۔ پندرہویں صدی تک یورپ میں سائنس کی جو سرگرمی بھی تھی وہ بغیر کسی قابل ذکر اضافے کے عربی علوم کو جذب کرنے پر مشتمل تھی۔ پرتگال کے شہزادے ہنری (Prince Henry) نے کیپ سینٹ ونسنٹ (Cape St. Vincent) میں جو عظیم بحری درسگاہ (Nautical Academy) قائم کی تھی وہ عرب اور یہودی معلموں کے زیر نگرانی وجود میں آئی تھی۔ یہ وہی درسگاہ ہے جس نے واسکوڈا گاما (Vasco Da Gama) کے لیے یورپ کو دنیا کی انتہائی حدود تک پھیلنے کے لیے راہ ہموار کی۔ 1494ء میں جو ریاضی کی سب سے پہلی کتاب چھپی وہ لیونارڈو فیبوناچی کی کتاب (خود الخوارزمی کی گرانقدر تصنیف کا ترجمہ تھی) کے اس ترجمے کی جو لوکا پیکی اولی (Luca Pacioli) نے کیا تھا تشریح و توضیح اور کہیں کہیں عبارت کی نقل پر مشتمل تھی۔ یہ مترجم ایک دوسرے لیونارڈو یعنی لیونارڈو ڈونچی (Leonardo Da Vinci) کا دوست تھا

ریجیو مونٹینس (Regiomontanus) نے جو ہیئتی زیچ بنائی تھی جس کی بدولت کولمبس (Columbus) کے لیے (امریکہ کا) بحری سفر ممکن ہوا وہ البتانی (Al-Ba-Ttani) کی ہیئتی زیچ پر مبنی تھی۔ کیپلر (Kepler) ابن یونس (Ibn Yunas) کی زیچ سے جو (مصر کے خلیفہ کے نام پر) حاکمی زیچ (Hakemi-Te Tables) کہلاتی ہیں استفادہ کرتا تھا۔ ویسلیس نے الرازی (Al-Razi) کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ یہ جدید دنیا کو عرب تہذیب کا سب سے مہتم بالشان عطیہ سائنس ہے لیکن اس کے پھل آہستہ آہستہ پکے۔ مسلمانوں کی تہذیب پر تاریکی چھا جانے کے ایک مدت بعد کہیں وہ دیو پیکر جس کو اس نے جنم دیا تھا اپنی پوری طاقت سے اٹھنے کے قابل ہوا، یہ صرف سائنس ہی نہیں تھی جس نے یورپ کو نئی زندگی بخشی، اس کے علاوہ اسلامی تہذیب کے اور بہت سے اثرات تھے جن سے یورپی زندگی میں پہلے پہل دمک آئی۔

پیرس یونیورسٹی کے شعبہ طب میں دو مسلمان طبیبوں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ ایک ابوبکر محمد زکریا الرازی (Rhazes) کی ہے اور دوسری ابوالعلی الحسین ابن سینا (Avicenna) کی۔ الرازی رے میں 842ء میں پیدا ہوا۔ اس نے بغداد میں تعلیم پائی اور ایک سو اکتیس کتابیں تصنیف کیں۔ "کتاب الحاوی" بیس جلدوں پر مشتمل تھی اور علم طب کی ہر صنف پر حاوی تھی۔ اس کے لاطینی ترجمہ کا نام Liber Continens ہے یہ یورپ میں صدیوں پڑھائی گئی اور نہایت احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی مگر اس کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف "کتاب المنصوری" تھی۔ یہ نام اس نے خراسان کے بادشاہ المنصور کے نام پر رکھا تھا۔ یہ بھی طب پر تھی اور اس کی دس جلدیں تھیں۔ اس کی نویں جلد کے لاطینی ترجمہ کا نام Nonus Almansori تھا۔ یہ سولہویں صدی تک یورپ میں رائج رہی۔ الرازی نے ایک رسالہ چیچک پر بھی لکھا تھا جو انیسویں صدی کے آخر تک یورپ میں رائج تھا۔ ان بیماریوں پر یہ ایسی مستند کتاب تھی کہ 1498ء سے 1866ء تک صرف انگریزی زبان میں اس کے چالیس ایڈیشن نکلے۔ اگر تمام یورپ کی زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو نہ معلوم یہ کتنی بار چھپی ہوگی۔ کیلوگ (J. H. Kellogg) کی رائے میں الرازی کے تجویز کردہ علاج پر آج بھی اضافہ کرنا مشکل ہے۔ الرازی مسلمانوں کا اور قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا طبیب تھا۔ اس نے طب کے علم میں گراں قدر اضافے کیے۔ جراحی میں جسم کے شگاف اور زخم سینے کے لیے تانت کے استعمال کو اس نے رواج دیا۔

کئی دوائیں مثلاً پارہ کا مرہم دریافت کیا۔ افسوس کہ ایسا یکتائے روزگار اور متبحر عالم 926ء میں بیاسی برس کی عمر میں بعالم مفلسی مرا۔

(2) ابوالعلی الحسین ابن سینا 980ء میں پیدا ہوا۔ وہ طبیب سے زیادہ فلسفی کی حیثیت سے

مشہور ہے۔ ابن رشد (Averros) جو عالم اسلام کے سب سے بڑے فلسفی سمجھے جاتے ہیں ان دونوں میں بعض اہل الرائے فلسفی تو ابن سینا کو ابن رشد پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

ابن سینا نے ابتدا میں طب پر زیادہ توجہ دی۔ جب سترہ سال کی عمر میں اس نے بخارا کے فرمانروا نوح بن منصور کو اچھا کر دیا تو اس کی شہرت ہوگئی۔ نوح نے اسے اپنے درباریوں میں شامل کرلیا۔ نوح کا نادر کتب خانہ ابن سینا کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت وہیں گزارتا۔ بعد میں وہ خوارزم کے فرماں روا المامون کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ 1018ء میں محمود غزنوی نے جس کے تابع فرمان سارا ایران اور پنجاب تھا، چاہا کہ ابن سینا اور البیرونی کو المامون کے دربار سے اپنے یہاں بلائے۔ البیرونی تو آگیا مگر ابن سینا نے انکار کر دیا۔ یہ انکار محمود کے عتاب کا باعث ہوا۔ ابن سینا بھاگا بھاگا پھرتا رہا آخر گرگان کے فرماں روا شمس المعالی قابوس نے اسے پناہ دی۔ قابوس جب قتل کر دیا گیا تو ہمدان کے فرماں روا نے اسے اپنا وزیر بنا لیا مگر فوج اس سے اتنی ناراض ہوگئی کہ اس کا گھر جلا دیا۔ ابن سینا جان بچا کر بھاگا۔ ایک عطار نے اسے پناہ دی، اس نے اس گوشہ نشینی کو تصنیف و تالیف میں گزارا۔ وہ عطار کے یہاں سے نقل مکان کرنے کی کوشش میں گرفتار کر لیا گیا لیکن کسی صورت سے قید سے نکل بھاگا اور بہت سی مصیبتیں جھیل کر اصفہان کے فرماں روا کے دربار میں پہنچا اور اسی سے وابستہ ہوگیا۔ ستاون سال کی عمر میں بمقام ہمدان اس کا انتقال ہوگیا۔ طب پر اس کی مشہور کتاب (القانون) "قانون فی الطب" ہے، جس کا بارہویں صدی میں لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ یورپ نے اس کتاب کو بہت اہمیت دی اور سترہویں صدی تک وہاں کی یونیورسٹیوں میں یہ بحیثیت ٹیکسٹ بک داخل نصاب رہی۔ "القانون" بہت جامع کتاب ہے۔ اس میں تشخیص و علاج کے علاوہ علم طب پر بہت کچھ معلومات فراہم کی گئی ہیں، اس میں ضبط تولید کے بیس طریقے اور دوائیں بھی بتائی گئی ہیں۔ اس سے پہلے الرازی نے ضبط تولید کے چوبیس طریقے بتائے تھے۔

ان دو بڑے حکیموں کا ذکر ان کی تصویروں کے سلسلے میں آگیا۔ ان سے پہلے اور بہت سے طبیب ہوئے ہیں۔ جابر بن حیان (Geber) جس نے کیمیا داں کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، اس کا پیشہ بھی طبابت تھا۔ وہ 702ء میں پیدا ہوا تھا اور 765ء میں اس کا انتقال ہوا۔ علم کیمیا پر اس کی کتابیں لاطینی میں ترجمہ کی گئیں اور یورپ میں علم کیمیا کی ترویج میں ان کا بڑا دخل ہے، جابر بن حیان مسلمانوں کا ہی نہیں اپنے دور کا اور بعد میں بھی صدیوں تک دنیا کا سب سے بڑا کیمیا داں شمار کیا جاتا رہا۔

(3) جیریل ابن بختیشوع (Jibiril Ibn Bakhtishu) خلیفہ ہارون رشید اور اس کے بعد خلیفہ مامون الرشید کا طبیب تھا۔ اس کو خلیفہ کی فصد سال میں دو بار کھولنے کے لیے ایک لاکھ درہم ملتے

تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں نو دس کروڑ درہم جمع کیے۔ اس نے ایک لڑکی کا بھی بڑے انوکھے طریقے سے معرکۃ الآرا علاج کیا۔ یہ لڑکی اختناق الرحم (Hysteria) کی مریض تھی۔ جیریل نے اس کے لیے یہ نفسیاتی علاج تجویز کیا کہ اسے جتایا جائے کہ اس کو سب کے سامنے ننگا کیا جائے گا اور اس طرح کے اقدام بھی کیے۔ وہ سمجھی کہ واقعی اس کو ننگا کر دیا جائے گا۔ اس بے حرمتی کی دہشت اور خوف نے اس کا مرض اچھا کر دیا۔

یوحنا بن ماسوئی (Yuhanna Bin Masaway) بھی جو 777ء میں پیدا ہوا اور 857ء میں اسی برس کی عمر میں فوت ہوا، اس نے علم تشریح سیکھنے کی غرض سے بوزنہ کی چیر پھاڑ (Dissection) کا طریقہ نکالا۔

حنین بن اسحاق نے علم العین (Ophthalmology) پر دس کتابیں لکھیں یہ سب سے پہلی کتابیں ہیں جن میں اس علم کو مربوط طریقہ پر پیش کیا گیا۔

علی ابن عیسیٰ مسلمانوں کا سب سے بڑا معالج چشم (Oculist) تھا۔ اس کی کتاب اٹھارہویں صدی تک یورپ میں پڑھائی جاتی تھی۔

ابو القاسم (Abul Casim) اسپین کے خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کا طبیب تھا، اس کی تصنیف "التصریف" دراصل علم طب کی قاموس (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ ابوالقاسم نے علم جراحی کو بہت فروغ دیا۔ "التصریف" کا وہ حصہ جو جراحی پر ہے اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا اور اس ترجمہ نے جراحی میں یورپ کی صدیوں رہنمائی کی۔ قرطبہ جراحی کے لیے یورپ میں مشہور تھا جو مشکل اپریشن ہوتے وہ قرطبہ ہی میں مریض کو لا کر کرائے جاتے۔ ابوالقاسم 936ء میں پیدا ہوا اور ستر برس کی عمر میں 1006ء میں اس کا انتقال ہوا۔

خلیفہ ابن ابی المحاسن آنکھ کے آپریشن کا ماہر تھا۔ وہ حلب (Aleppo) میں 1256ء میں پیدا ہوا تھا۔

ابو مروان ابن زہر (Abu Marwan Ibn Zuhr) جسے بگاڑ کر یورپ والوں نے Avenzoar کر دیا۔ الرازی اور ابن سینا کے بعد سب سے بڑا طبیب تھا۔ وہ اشبیلیہ (Seville) میں 1091ء میں پیدا ہوا اور اکہتر (71) سال کی عمر میں 1162ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ ابن رشد کا دوست تھا اور ابن رشد اسے جالینوس کے بعد سب سے بڑا طبیب سمجھتا تھا۔ اس کی تصنیف "کتاب التشہیر"

معالجات (Therapeutics) اور غذا سے بحث کرتی ہے' اس کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی زبانوں میں ہوا اور اس کتاب نے یورپ کے علم معالجہ کو بہت متاثر و مربوط کیا۔

ابو بکر ابن باجہ (Avempace) کی شہرت فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے ہے' وہ علم طب میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ وہ 1106ء میں پیدا ہوا۔ سارا گوسا (Saragossa) کا گورنر اس کی شاعری سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے اپنا وزیر بنالیا اور اپنی قدر دانی کا اظہار اس طرح کیا کہ جب ابن باجہ اس کے سامنے آتا تو اس کے جوتوں کے نیچے سونا بچھواتا اور قسم کھائی کہ کبھی ایسا نہ ہوگا کہ وہ سونے پر چلے بغیر اس کے پاس آجائے۔ ابن باجہ نے اس خیال سے کہ کہیں گورنر کی قسم کبھی کسی ناگزیر دشواری کے سبب ٹوٹ جائے اپنے دونوں جوتوں میں ایک ایک اشرفی لگالی۔ ابھی ابن باجہ کی عمر صرف تیس سال ہی کی تھی کہ کسی نے اسے زہر دے دیا۔

ابو بکر ابن طفیل (Abubacer) بھی فلسفی شاعر اور طبیب تھا۔ المغرب کے خلیفہ ابو یعقوب یوسف نے اسے اپنا معالج اور وزیر مقرر کیا۔ مراکش کے کتب خانہ میں اس کا بیش از بیش وقت صرف ہوتا۔ اس نے فلسفیانہ انداز میں ایک نہایت غیر معمولی قصہ لکھا جس کا 1708ء میں اوکلے (Ockley) نے انگریزی کا ترجمہ کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈیفو (Defoe) نے اپنی مشہور کتاب رابنسن کروسو (Robinson Crusoe) ابو بکر کے اسی قصے کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے۔ ابو بکر 1107ء سے 1185ء تک زندہ رہا۔

ابو الولید محمد ابن رشد (Averroes) کی شہرت بحیثیت فلسفی ہوئی اور اس کو ابن سینا کا ہم پلہ سمجھا گیا' وہ بہت بڑا ماہر طب بھی تھا۔ اس کی کتاب "الکلیات فی الطب" علم طب پر ہمہ گیر تصنیف ہے' اس کا لاطینی ترجمہ یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں مدتوں شامل رہا۔ اس نے علم طب میں گراں قدر اضافے کیے۔ آنکھ کے پردے (Retina) کے صحیح فعل کی تشریح پہلے پہل اسی نے کی۔ چیچک کے بارے میں اس نے یہ کلیہ پیش کیا کہ جس کے ایک بار چیچک نکل آتی ہے وہ آئندہ کے لیے چیچک سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ابن رشد کے دادا اور والد قرطبہ کے قاضی القضاۃ رہ چکے تھے۔ المغرب کے فرماں روا ابو یعقوب یوسف نے 1153ء میں اس کی سرپرستی کی۔ 1169ء میں وہ اشبیلیہ کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا اور 1172ء میں قرطبہ کا' 1182ء میں ابو یعقوب یوسف نے ابن رشد کو پھر بلایا اور اپنا طبیب مقرر کیا۔ 1184ء میں ابو یعقوب کا انتقال ہوگیا۔ ابن رشد کے فلسفیانہ عقائد کی وجہ سے لوگ اس کے خلاف ہو گئے تو بادشاہ کو اسے 1194ء میں جلاوطن کرنا پڑا۔ چار سال بعد اسے پھر بلایا گیا مگر اسی سال اس کا انتقال ہوگیا۔ ابن رشد 1126ء میں پیدا ہوا تھا اور 1198ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے انتقال کے وقت ابن عربی کی عمر بہتر (72) سال تھی۔ ابن رشد تصوف کے خلاف

تھا۔ اس کے نزدیک خدا تک رسائی کا ذریعہ صرف عقل ہے۔

علاؤالدین ابن نفیس تیرہویں صدی میں دمشق کا مشہور عالم طبیب تھا۔ 1260ء میں اس نے شش دوران خون (Pulmonary Circulation of Blood) کا نظریہ پیش کیا۔ دو سو ستر سال بعد سرویٹس (Servetus) نے یورپ میں یہ نظریہ پیش کیا تو علاؤالدین کے بجائے کریڈٹ اسے ملا حالانکہ اس نے یہ نظریہ علاؤالدین ابن نفیس کی تصانیف سے مستعار لیا تھا۔

غرناطہ کے ابن خاطب نے طاعون پر ایک مستقل کتاب لکھی اور بتایا کہ یہ مرض ایک دوسرے کو لگ کر وبائی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

ہزاروں بڑے بڑے طبیبوں میں سے یہ چند نام موجودہ یورپ کی تصانیف میں باقی رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دور کی کتب اب ایک فی ہزار بھی نہیں ملتیں۔ 987ء میں محمد الندیم نے "فہرست العلوم" مرتب کی تھی جس میں عربی کی سب کتابیں درج کی گئی تھیں۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ اس فہرست کو سامنے رکھ کر جب کتابوں کی جستجو کرتے ہیں تو ہزار میں ایک بھی نہیں ملتی۔ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ سائنس' ادب اور فلسفہ کی ہزاروں کتابیں بھی اسلامی ممالک میں ایسی دبی پڑی ہیں کہ ہم ان سے بالکل بے خبر ہیں' اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ (Madrid) کے قریب Escorial میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے جس کی ابھی فہرست تک مرتب نہیں ہوئی۔ مسلمانوں نے دنیا کے علوم میں جتنا اضافہ کیا تھا' اس کا صحیح اندازہ کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ زمانہ کی دستبرد سے جو کچھ بچ رہا ہے وہ اس کا ایک نہایت ہی قلیل حصہ ہے۔ جو وجود میں آیا تھا اور جو کچھ ہمیں ابھی تک دستیاب ہوا ہے وہ اس قلیل حصے کا بھی بہت قلیل حصہ ہے۔ جب اس نیم گمشدہ ورثہ کا بہتر جائزہ لینا ممکن ہوگا یقین ہے کہ مشرقی اسلام کی دسویں صدی عیسوی ذہنی تاریخ کی زریں صدیوں میں شمار ہوگی۔

چونکہ صفائی' حفظان صحت (Hygiene) شفاخانے وغیرہ بھی طب سے متعلق ہیں اس لیے یہاں ان کا سرسری جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے تفصیل متعاقب دی جاسکتی ہے۔ انگریزی کا مقولہ ہے کہ صفائی کا مرتبہ تقوے کے فوراً بعد ہے۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ اسلام نے ہر نماز سے پہلے طہارت کو لازم کرکے اس مقولے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ مسلمان نہانے دھونے کے اس قدر شوقین تھے کہ گھروں کے علاوہ ہر شہر میں سینکڑوں ہزاروں حمام بناتے۔ جب کہ عیسائیوں کے علماء اور اولیاء برسوں نہ نہاتے۔ ان میں کچھ ایسے بھی گزرے ہیں جو عمر بھر نہیں نہائے۔ دسویں صدی میں صرف ایک بغداد کے شہر میں ستائیس ہزار حمام تھے یہی حال اور شہروں کا تھا۔ حالانکہ قرآن کی رو سے

ختنہ کرانا لازم نہیں مگر صفائی اور پاکیزگی کے باعث اس کو ضروری قرار دیا گیا (اب تو مغربی ملکوں میں بھی ختنہ کی اہمیت محسوس کی جا رہی ہے) عورت ایام سے فارغ ہو تو اسلام اس کے لیے غسل ضروری ٹھہراتا ہے۔ مباشرت کے بعد بھی نہانا ضروری ہے۔ ان پابندیوں پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ بغیر نہائے نماز پڑھنے کی اجازت بھی نہیں۔ صفائی کی اس سے زیادہ تاکید اور کیا ہو گی۔

یہ خیال پھیل گیا ہے کہ بنو امیہ کی نوے سال کی حکومت میں علوم کی طرف سے غفلت برتی گئی اور جب بنو عباس نے یونانی کتابیں منگا منگا کر ان کا ترجمہ کرایا تو علم کی قدر ہوئی۔ بنو عباس کی حکومت 750ء میں شروع ہوئی تھی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ 706ء ہی میں ایک بہت بڑا شفاخانہ موسومہ "بیمارستان" دمشق میں قائم ہو چکا تھا۔ بنو عباس نے جب بغداد بسایا اور اسے پایہ تخت بنایا تو یہاں اس سے بڑا شفاخانہ قائم کیا۔ یہ شفاخانہ علاج کے علاوہ طب کی تعلیم کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ صرف وہی لوگ طبابت کر سکتے تھے جن کو یہاں سے سند ملی ہو۔ 931ء میں بغداد میں آٹھ سو ساٹھ (860) طبیب تھے۔ بغیر لائسنس حاصل کیے کوئی شخص طبابت یا جراحی نہیں کر سکتا تھا۔

931ء میں وزیر علی بن عیسیٰ نے جو خود بھی ماہر طب تھا طبیبوں کی ایک جماعت منظم کی اور ان کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ گشت کرتے رہیں اور مختلف مقامات پر جا کر مریضوں کا علاج کریں۔ قیدیوں کے علاج کے لیے ہر روز طبیب قید خانوں میں جاتے اور ان کی دیکھ بھال کرتے۔ جب ابن جبیر 1182ء میں بغداد آیا اور یہاں کا شفاخانہ دیکھا تو وہ انگشت بدنداں رہ گیا کیونکہ یہ شفاخانہ محلوں کی طرح شاندار تھا۔ سلطان نور الدین نے 1160ء میں ایک شفاخانہ کھولا جس میں بغداد کے شفاخانہ کی طرح دوا اور کھانا مفت دیا جاتا تھا۔ تین سو سال تک نور الدین کا شفاخانہ اسی شان سے چلتا رہا۔ قاہرہ میں 1285ء میں قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا شفاخانہ قائم ہوا جو چار بڑی بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ اس میں فوارے اور نہریں جاری تھیں۔ ہر شعبہ علیحدہ تھا۔ کتب خانہ، مسجد اور کئی حمام مریضوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ طلبہ کے لیے لیکچر ہال تھے۔ مریضوں کو دوا اور کھانا دینے کے علاوہ شفاخانے سے جاتے وقت ایک معقول رقم دی جاتی تھی تاکہ وہ کچھ عرصہ اپنے گھر آرام کر سکیں اور شفاخانہ سے نکلتے ہی کام میں نہ لگ جائیں۔ دنیا میں اور کہیں اتنے اور اس قدر اچھے شفاخانے نہیں تھے جتنے دنیائے اسلام میں تھے۔

پاگلوں کے علاج پر خاص توجہ دی جاتی۔ ہر بڑے شہر میں پاگلوں کے شفاخانے الگ ہوتے تھے جہاں مریضوں کے ساتھ شفیقانہ برتاؤ کیا جاتا۔ آپریشن سے پہلے بے ہوش کرنے کی دوا (Anesthesia) سنگھائی جاتی۔ بے خوابی کا علاج خواب آور دواؤں سے کیا جاتا، دلکش نغمے سنائے جاتے اور داستان گو کہانیاں سنانے کے لیے مقرر کیے جاتے۔ بد گوشت کو جلانے (Cauterization) کا طریقہ رائج تھا۔ قرطبہ کا فرمانروا المنصور دربار کر رہا تھا کہ اسے اپنے پیر میں تکلیف محسوس ہوئی۔ دربار

میں فوراً طبیب طلب کیا۔ اس نے کہا کہ گوشت جلانا پڑے گا۔ گوشت جلانے کے دوران بھی المنصور دربار کرتا رہا۔ جب گوشت جلنے کی بو پھیلی تو درباریوں نے حیرت سے اپنے بادشاہ کو دیکھا جس نے اپنے فعل و عمل سے تکلیف کے آثار ذرا بھی نمودار نہ ہونے دیئے تھے۔ عطاروں کی دکانیں اور دواسازی کے کارخانے سب سے پہلے مسلمانوں نے قائم کیے۔ انہوں نے ہی جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں دریافت کرنے کی غرض سے باقاعدہ اسکول کھولے اور دواسازی (Pharmacy) کو بحیثیت علم سیکھا۔ قرطبہ کے ابن فرناس (Ibn Firnas) نے عینک ایجاد کی۔ مسلمانوں نے امراض چشم پر سیر حاصل تحقیق کی اور آنکھوں کے آپریشن کرنے میں قابل تعریف مہارت حاصل کی۔

ول ڈیوراں (Will Durant) نے ابن النفیس اور خلیفہ ابن ابی الحاسن کا ذکر بہت اختصار سے کیا ہے۔ یہ دونوں بہت بڑے عالم طب تھے اس لیے ضروری ہے کہ جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے اس پر اضافہ کیا جائے۔

ابن النفیس کا پورا نام علاؤالدین ابوالحسن علی ابن الحزم ابن النفیس القرشی المصری الشافعی تھا۔ اس نے دمشق میں تعلیم پائی اور وہیں اس کا انتقال 1288ء یا 1289ء میں ہوا۔ وہ بہت بڑا عالم طب ہونے کے علاوہ علم حدیث کا بھی ماہر تھا۔ اس نے آنکھ کے امراض پر اور انسانی غذا پر محققانہ کتابیں لکھیں۔ چنانچہ اس کی "کتاب المختار من الاغذیہ" اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں اہم مقام رکھتی ہے۔ ابن سینا کی مشہور کتاب "قانون فی الطب" پر شرح لکھتے ہوئے ابن النفیس نے ابن سینا کے اس نظریئے سے اختلاف کیا کہ جو گندہ خون ورید (Vein) کے ذریعہ دل کے داہنے جوف (Ventricle) میں آتا ہے وہ بائیں جوف میں نظر نہ آنے والے مساموں کے ذریعہ منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ داہنے جوف سے گندہ خون پھیپھڑوں میں جاتا ہے وہاں ہوا اس کی گندگی کو دور کرتی ہے، تب وہ دل کے بائیں جوف میں آتا ہے۔ اس نظریہ پر ابن النفیس کو اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ابن سینا کے نظریہ کی پانچ بار نہایت واضح الفاظ میں تردید کی۔ ابن سینا کا نظریہ دراصل وہ نظریہ تھا جو جالینوس کے زمانے سے چلا آیا تھا اور تمام بڑے بڑے ماہرین طب اسے صحیح سمجھتے تھے۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ اس اہم انکشاف کی بنا پر ابن النفیس کو قرون وسطیٰ کا بڑا ماہر عضویات (Physiologist) سمجھنا چاہیے۔ ابن النفیس کی شرح نے وہ قبول عام حاصل کیا کہ اس شرح پر متعدد شرحیں لکھی گئیں اور کئی زبانوں میں جن میں عبرانی اور ترکی بھی شامل ہیں اس کا ترجمہ ہوا۔

یورپ والے اس اہم انکشاف کو اسپین کے سرویٹ (Miguel Servet) سے منسوب کرتے ہیں۔ یہی نام لاطینی میں سرویٹس (Servetus) ہو گیا ہے۔ ابن النفیس کا انتقال 1288ء

میں ہوا اور سرویٹ 1553ء میں جلا کر ہلاک کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سرویٹ نے اپنے اکتشاف کو شائع کرنے کے بجائے دینیات کی ایک کتاب میں چھپا دیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد جب اس کا پتہ چلا تو اس اکتشاف نے اس کے نام سے شہرت پائی۔ جو نظریہ ڈھائی سو سال سے بھی زیادہ پہلے کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا، اس کو اپنا دریافت کردہ کہنا یورپ والوں کو زیب دے تو دے کوئی مشرق کا رہنے والا تو ایسی دیدہ دلیری نہیں کر سکتا۔ ابن النفیس کا نظریہ سرویٹ کا نظریہ مشہور ہو جانے کے بعد ولیم ہاروے (William Harvey) تک پہونچا اور اس نے اسے مزید ترقی دی، چنانچہ اب یہی نظریہ مستند مانا جاتا ہے۔

ابن النفیس کی شرح "کتاب موجز القانون" کا ایک قلمی نسخہ برلن میں موجود ہے۔ اس صدی کے ربع اول میں مصر کے ایک طبیب نے جن کا نام محی الدین الطاری تھا، اس قلمی نسخے کا مطالعہ کیا تو ان پر یہ عقدہ کھلا کہ جس نظریہ کو یورپ والوں کا نظریہ بتایا جاتا ہے وہ دراصل ابن النفیس کا دریافت کردہ نظریہ تھا۔ انہوں نے عربی عبارت کا جرمن زبان میں ترجمہ کرکے فریبرگ (Freiburg) کے شعبہ طب میں پیش کیا۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ اہل مغرب کے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کہ مسلمانوں کی لاکھوں تصانیف ضائع ہوگئیں ورنہ نہ معلوم اور کتنے نظریے جن پر اہل مغرب نے اپنے ناموں کی مہریں لگادی ہیں، جعلی ثابت ہوتے۔

خلیفہ ابن ابی المحاسن الحلبی اور ابن النفیس ہم عصر تھے اور دونوں نے امراض چشم پر کتابیں لکھی ہیں مگر بحیثیت معالج امراض چشم (Oculist)، خلیفہ زیادہ مشہور ہوا۔ اس نے امراض چشم پر سیر حاصل کتاب لکھی جس کا نام "کتاب الکافی فی الکحل" ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ آنکھ کی ساخت سے متعلق ہے اور دوسرا امراض چشم کے علاج سے۔ ہر حصے کو چھ چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر موضوع کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپریشن کرنے میں مہارت تامہ حاصل کی تھی اور مشکل سے مشکل آپریشن کی ذمہ داری نہایت اعتماد کے ساتھ لے لیتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں بہت سے آپریشنوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں آنکھ کے مختلف حصوں، جھلیوں اور رگوں وغیرہ کی تصویریں شامل کی ہیں تاکہ آنکھ کی ساخت اور اور مختلف حصوں کا عمل اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ وہ آپریشن کے لیے چھتیس آلات استعمال میں لاتا تھا جن کی تصاویر بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ہر آلے کی ساخت اور استعمال کا طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ مختصر یہ کہ "کتاب الکافی فی الکحل" ایک اہم اور جامع کتاب ہے۔

ابن النفیس کے ذکر میں شرحیں لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرون وسطیٰ میں مشہور کتابوں کی شرحیں لکھنے کا بہت رواج تھا۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ شرح لکھنے کا مقصد تشریح و توضیح ہوتا

ہے۔ دیوان غالب پر اس صدی میں بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں، جن کی غرض یہ تھی کہ مشکل اشعار کو عام فہم بنایا جائے۔ مگر قرون وسطیٰ میں شرح لکھنے کا صرف یہی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ ابن رشد نے ارسطو کی تصانیف پر متعدد شرحیں لکھی ہیں۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ابن رشد کا اپنا کوئی فلسفہ نہیں تھا اور وہ عمر بھر ارسطو کے فلسفہ کی ترجمانی اور تبلیغ کرتا رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو ابن رشد قرون وسطیٰ کا نہایت عظیم فلسفی کیوں تسلیم کیا جاتا۔ دراصل شارح کا مقصد کسی خاص موضوع پر اپنے خیالات و نظریات پیش کرنا ہوتا تھا۔ شارح اپنی قوت تخلیق کو پوری طرح استعمال کرتا، تائید اور تردید دونوں میں اپنی جودت طبع دکھاتا اور اپنے نقطہ نظر کے تحت ہر بات پر بحث کرتا۔ چونکہ ابن رشد خود بہت بڑا فلسفی تھا اس لیے اس کی شرحیں اس کی بلند تخئیل اور ندرت فکر کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ وہ جس طور سے ارسطو اور دوسرے بڑے فلسفیوں کی ترجمانی کرتا ہے وہ خود اس کی نکتہ سنجی اور اپج پر دلالت کرتا ہے اور پڑھنے والوں کو نیا مواد اور سوچنے کا نیا انداز دستیاب ہوتا ہے۔ ابن النفیس کی شرح کی مقبولیت کا راز بھی اس کی ندرت فکر میں مضمر تھا۔

یہ بات کہ مسلمانوں کے علم طب کو اہل مغرب نے کیسے حاصل کیا اور اس کی پیروی سے کیونکر فائدہ اٹھایا، جارج سارٹن نے اچھی طرح واضح کیا ہے کہ اسپین کے ذریعے جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی مسلمانوں کے علوم یورپ میں پھیلے۔ علاوہ ازیں یورپ میں عیسائیوں کے علاوہ یہودی بھی قریب قریب ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ یہودیوں میں اکثر عربی جانتے تھے۔ بہت سے عیسائیوں نے بھی عربی سیکھی اور یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں کی کتابوں کے ترجمے کرنے شروع کیے۔

علم طب کی مشہور عربی کتابوں کے لاطینی و عبرانی ترجمے

ابو یوسف یعقوب ابن اسحق الصباح الکندی (Alkindus) کی ایک طب کی کتاب کا De Medicinarum Compositarum Cardibus کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔

ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی (Rhazes) کی دونوں مشہور تصانیف "کتاب الحاوی" اور "کتاب المنصوری" کا ترجمہ کیا گیا۔ اول الذکر کا نام Liber Dictus Elhavi رکھا اور دوسرے کا نام Liber Almansoris ہے۔

ابوالقاسم خلف ابن عباس الزہراوی (Albucacis) کی گراں قدر تصنیف "التصریف" کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی دونوں میں ہوا۔ پچھلی قسط میں ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کتاب کا نام

میں ہوا اور سرویٹ 1553ء میں جلا کر ہلاک کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سرویٹ نے اپنے اکتشاف کو شائع کرنے کے بجائے دینیات کی ایک کتاب میں چھپا دیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد جب اس کا پتہ چلا تو اس اکتشاف نے اس کے نام سے شہرت پائی۔ جو نظریہ ڈھائی سو سال سے بھی زیادہ پہلے کتابی شکل میں شائع ہو چکا تھا، اس کو اپنا دریافت کردہ کہنا یورپ والوں کو زیب دے تو دے کوئی مشرق کا رہنے والا تو ایسی دیدہ دلیری نہیں کرسکتا۔ ابن النفیس کا نظریہ سرویٹ کا نظریہ مشہور ہو جانے کے بعد ولیم ہاروے (William Harvey) تک پہونچا اور اس نے اسے مزید ترقی دی، چنانچہ اب یہی نظریہ مستند مانا جاتا ہے۔

ابن النفیس کی شرح "کتاب موجز القانون" کا ایک قلمی نسخہ برلن میں موجود ہے۔ اس صدی کے ربع اول میں مصر کے ایک طبیب نے جن کا نام محی الدین الطاری تھا، اس قلمی نسخے کا مطالعہ کیا تو ان پر یہ عقدہ کھلا کہ جس نظریہ کو یورپ والوں کا نظریہ بتایا جاتا ہے وہ دراصل ابن النفیس کا دریافت کردہ نظریہ تھا۔ انہوں نے عربی عبارت کا جرمن زبان میں ترجمہ کرکے فریبرگ (Freiburg) کے شعبہ طب میں پیش کیا۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ اہل مغرب کے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کہ مسلمانوں کی لاکھوں تصانیف ضائع ہوگئیں ورنہ نہ معلوم اور کتنے نظریے جن پر اہل مغرب نے اپنے ناموں کی مہریں لگادی ہیں، جعلی ثابت ہوتے۔

خلیفہ ابن ابی المحاسن الجلبی اور ابن النفیس ہم عصر تھے اور دونوں نے امراض چشم پر کتابیں لکھی ہیں مگر بحیثیت معالج امراض چشم (Oculist)، خلیفہ زیادہ مشہور ہوا۔ اس نے امراض چشم پر سیر حاصل کتاب لکھی جس کا نام "کتاب الکافی فی الکحل" ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ آنکھ کی ساخت سے متعلق ہے اور دوسرا امراض چشم کے علاج سے۔ ہر حصے کو چھ چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر موضوع کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپریشن کرنے میں مہارت تامہ حاصل کی تھی اور مشکل سے مشکل آپریشن کی ذمہ داری نہایت اعتماد کے ساتھ لے لیتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں بہت سے آپریشنوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں آنکھ کے مختلف حصوں، جھلیوں اور رگوں وغیرہ کی تصویریں شامل کی ہیں تاکہ آنکھ کی ساخت اور اور مختلف حصوں کا عمل اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ وہ آپریشن کے لیے چھتیس آلات استعمال میں لاتا تھا جن کی تصاویر بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ہر آلے کی ساخت اور استعمال کا طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ مختصر یہ کہ "کتاب الکافی فی الکحل" ایک اہم اور جامع کتاب ہے۔

ابن النفیس کے ذکر میں شرحیں لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرون وسطیٰ میں مشہور کتابوں کی شرحیں لکھنے کا بہت رواج تھا۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ شرح لکھنے کا مقصد تشریح و توضیح ہوتا

ہے۔ دیوان غالب پر اس صدی میں بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں، جن کی غرض یہ تھی کہ مشکل اشعار کو عام فہم بنایا جائے۔ مگر قرون وسطیٰ میں شرح لکھنے کا صرف یہی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ ابن رشد نے ارسطو کی تصانیف پر متعدد شرحیں لکھی ہیں۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ابن رشد کا اپنا کوئی فلسفہ نہیں تھا اور وہ عمر بھر ارسطو کے فلسفہ کی ترجمانی اور تبلیغ کرتا رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو ابن رشد قرون وسطیٰ کا نہایت عظیم فلسفی کیوں تسلیم کیا جاتا۔ دراصل شارح کا مقصد کسی خاص موضوع پر اپنے خیالات و نظریات پیش کرنا ہوتا تھا۔ شارح اپنی قوت تخلیق کو پوری طرح استعمال کرتا، تائید اور تردید دونوں میں اپنی جودت طبع دکھاتا اور اپنے نقطہ نظر کے تحت ہر بات پر بحث کرتا۔ چونکہ ابن رشد خود بہت بڑا فلسفی تھا اس لیے اس کی شرحیں اس کی بلند تخئیل اور ندرت فکر کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ وہ جس طور سے ارسطو اور دوسرے بڑے فلسفیوں کی ترجمانی کرتا ہے وہ خود اس کی نکتہ سنجی اور اپج پر دلالت کرتا ہے اور پڑھنے والوں کو نیا مواد اور سوچنے کا نیا انداز دستیاب ہوتا ہے۔ ابن النفیس کی شرح کی مقبولیت کا راز بھی اس کی ندرت فکر میں مضمر تھا۔

یہ بات کہ مسلمانوں کے علم طب کو اہل مغرب نے کیسے حاصل کیا اور اس کی پیروی سے کیونکر فائدہ اٹھایا، جارج سارٹن نے اچھی طرح واضح کیا ہے کہ اسپین کے ذریعے جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی مسلمانوں کے علوم یورپ میں پھیلے۔ علاوہ ازیں یورپ میں عیسائیوں کے علاوہ یہودی بھی قریب قریب ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ یہودیوں میں اکثر عربی جانتے تھے۔ بہت سے عیسائیوں نے بھی عربی سیکھی اور یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں کی کتابوں کے ترجمے کرنے شروع کیے۔

علم طب کی مشہور عربی کتابوں کے لاطینی و عبرانی ترجمے

ابو یوسف یعقوب ابن اسحق الصباح الکندی (Alkindus) کی ایک طب کی کتاب کا De Medicinarum Compositarum Cardibus کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔

ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی (Rhazes) کی دونوں مشہور تصانیف "کتاب الحاوی" اور "کتاب المنصوری" کا ترجمہ کیا گیا۔ اول الذکر کا نام Liber Dictus Elhavi رکھا اور دوسرے کا نام Liber Almansoris ہے۔

ابوالقاسم خلف ابن عباس الزہراوی (Albucacis) کی گراں قدر تصنیف "التصریف" کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی دونوں میں ہوا۔ پچھلی قسط میں ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کتاب کا نام

"الطریف" لکھا گیا۔ صحیح نام "التصریف" ہی ہے۔ ابوالقاسم مسلمانوں کا سب سے بڑا سرجن تھا۔

ابوجعفر ابن ابراہیم ابن خالد ابن الجزاء (Algazirah) کی مشہور طبی تصنیف "زادالمسافر" کا ترجمہ لاطینی، یونانی اور عبرانی میں ہوا۔

ابوعلی الحسین عبداللہ ابن سینا (Avicenna) کی بے مثل تصنیف "قانون فی الطب" کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں ہوا اور لاطینی میں اس کا نام Canon ہوگیا۔ اس کتاب کو یورپ والوں کے لیے جارج سارٹن طبی بائیبل کی حیثیت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کتاب اور ابن سینا کی دوسری منظوم تصنیف "ارجوزہ" جو لاطینی میں Antica کہلائی یورپ میں مدتوں پڑھائی گئیں۔

علی ابن عباس (Haly Abbas) کی طبی قاموس "کتاب الملک" جس کا دوسرا نام "کامل الصناع الطبیہ" ہے اس کا بڑا حصہ لاطینی اور عبرانی میں منتقل کیا گیا۔ لاطینی میں اس کا نام Pantagni رکھا گیا۔

علی ابن عیسیٰ کی کتاب "تذکرۃ الکحالین" کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں کیا گیا۔ علی ابن عیسیٰ مسلمانوں کا سب سے عظیم معالج امراض چشم (Oculist) تھا۔ بعد کے اطبا نے بیشتر اسی سے کسب فیض کیا ہے۔

ابوالصلت (امیہ ابن عبدالعزیز ابن ابی الصلت الاندلسی) کی تصنیف "کتاب الادویہ المفردہ" کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں ہوا۔

ابن زہر (ابو مروان عبدالملک ابن تعلازہر) (Avenzoar) کی تصانیف "کتاب تیسیر فی المواداات والتدبیر" (Taisir) اور "کتاب الاغذیہ" کا عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ اول الذکر کا عبرانی سے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ یورپ میں ابن زہر کا اثر سترہویں صدی کے آخر تک رہا۔

عمارا ابن علی ابوالقاسم عمار بن علی موصلی کی "کتاب المنتخب فی علاج العین" کا جو آنکھ کی جراحی پر بے مثل کتاب ہے، عبرانی میں ترجمہ ہوا۔

ابن الوافد نے جو مفرد دواؤں پر کتاب لکھی تھی اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔

اسماعیل الجرجانی (زین الدین ابوالفضائل اسمٰعیل ابن الحسین الجرجانی) کی ضخیم تصنیف جس کا نام اس نے شاہ خوارزم قطب الدین محمد شاہ کے نام پر "ذخیرۃ الخوارزم شاہی" رکھا تھا، عبرانی میں منتقل کی گئی۔

ابو لید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد (Averroes) کی نہایت جامع تصنیف "کتاب الکلیات فی الطب" کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا، لفظ کلیات کو بگاڑ کر ترجمہ کا نام Colliget رکھا۔

یہ علم طب پر مسلمانوں کی بہترین تصانیف تھیں جنہیں اہل یورپ نے لاطینی اور عبرانی میں منتقل کر لیا۔ ان کو بار بار چھاپا اور اپنی طبی درس گاہوں میں صدیوں پڑھایا، ان میں سے کچھ سترہویں اور اٹھارہویں صدی تک درسی کتابوں میں شامل رہیں۔ بلکہ الرازی کا رسالہ جو اس نے چیچک اور کھسرا پر لکھا تھا، انیسویں صدی کے آخر تک پڑھایا گیا۔ رابرٹ بریفو (Robert Briffault) نے "تعمیر انسانیت" میں لکھا ہے کہ آکسفورڈ میں سائنس کا اسکول ان یہودیوں نے کھولا تھا جو مسلمانوں کے علوم سے فیضیاب ہو کر ولیم آف نورمنڈی کے ساتھ انگلستان گئے تھے۔ انگلستان کے علاوہ یورپ کے اور ممالک میں بھی مسلمانوں سے علم حاصل کرنے والے عیسائیوں اور یہودیوں نے سائنس کی درسگاہیں قائم کیں جن سے کئی صدیوں میں رفتہ رفتہ سارے یورپ میں سائنس پھیل گئی۔

بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدی میں مسلمانوں کا علم طب

جارج سارٹن کی رائے میں گیارہویں صدی میں مسلمانوں کی علمی ترقی نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد تنزل کی طرف گامزن ہوئی۔ یہ درست ہے کہ الرازی، ابن سینا، ابوالقاسم، اور علی ابن عیسیٰ ایسا عظیم طبیب ابن زہر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوا لیکن ان تین صدیوں میں بھی علم طب کی بہت سی شاخوں میں مسلمانوں ہی نے پیشوائی کی۔ جارج سارٹن لکھتا ہے کہ تیرہویں صدی کے آخر تک فن جراحی کے علاوہ مسلمان علم طب کی اور تمام شاخوں میں اہل یورپ پر برتری رکھتے تھے۔ ابن سینا کی "قانون فی الطب" کے علاوہ ابن زہر کی "تیسیر" اور ابن رشد کی "کلیات" کا شہرہ عام تھا۔ جہاں تک علم العین (Ophthalmology) کا تعلق ہے، تو اس میں یورپ کو سولہویں صدی سے پہلے بالادستی نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ جارج سارٹن کہتا ہے کہ عربوں کے علم العین کا نویں صدی میں نہایت شاندار طریقے سے آغاز ہوا۔ گیارہویں صدی کو اس کا دوسرا اور تیرہویں صدی کو تیسرا عہد زریں کہنا چاہیے۔ چودہویں صدی کے آخر میں بھی مسلمان اس فن میں اہل یورپ سے آگے تھے۔ پانچ سو سال سے زیادہ اس علم میں مسلمانوں کو عیسائیوں پر برتری حاصل رہی۔ اس طویل مدت میں

عیسائیوں نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی مشہور کتابوں کو یورپ میں وسیع پیمانے پر پھیلاتے رہے۔ ان صدیوں میں بھی مسلمانوں نے علم العین پر اپنی تخلیقی قوتیں صرف کیں جس کے ثبوت میں صدقہ ابن ابراہیم الشاذلی کی بیش بہا تصنیف "کتاب العمدۃ الکحلیہ فی الامراض البصریہ" پیش کی جا سکتی ہے۔ شاذلی چودھویں صدی کے آخر میں ہوا ہے' اس کی یہ کتاب تین ہزار پانچ سو سطروں پر مشتمل ہے اور اس میں بہت کچھ اس نے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر لکھا ہے۔ حبشیوں' ترکوں' بدوؤں وغیرہ کی آنکھوں کی ساخت اور رنگ سے علم الانسان (Anthropology) کے مسائل پر بھی اس نے روشنی ڈالی ہے۔

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ بقراط اور جالینوس کے مقابلے میں ابن سینا یورپ میں زیادہ مقبول تھا اور الرازی کی بھی قریب قریب وہی قدر و منزلت تھی جو ابن سینا کی تھی۔ یورپ والے ان پر بمشکل کوئی اضافہ کر سکے۔ باوجودیکہ علم جراحی میں عیسائی مسلمانوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے مگر وہ ابوالقاسم کی "التصریف" ایسی وقیع کتاب نہ لکھ سکے اور اس علم پر قرون وسطیٰ میں یہی کتاب سب سے زیادہ مستند سمجھی جاتی رہی اور سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی۔ اسی طرح علم تشریح پر بھی سب سے زیادہ اہم کتاب منصور بن محمد کی تھی جو اس نے تیمور لنگ کے ایک پوتے کی تحریر پر 1396ء میں لکھی تھی۔ علم تشریح کا علم جراحی سے بہت قریبی تعلق ہے اس لیے توقع کی جا سکتی تھی کہ علم جراحی سے زیادہ دلچسپی لینے والے عیسائی مسلمانوں سے بہتر کتاب لکھیں گے۔ مگر منصور بن محمد کی کتاب کے مقابلہ کی کوئی کتاب عیسائی نہ تصنیف کر سکے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جیسا کہ سارٹن کا خیال ہے کہ مسلمان انسانی جسم کی چیر پھاڑ کو مذہبی نقطہ نگاہ سے اچھا نہ سمجھتے تھے اس لیے وہ سرجری میں عیسائیوں سے پیچھے رہ گئے تھے' صحیح ہے۔ تو آخر مسلمان جسم کے اندرونی اعضا کی صحیح معلومات کیسے فراہم کرتے تھے اور انہوں نے ہر عضو کے آپریشن کے متعلق مہارت کیونکر حاصل کی تھی اور مختلف آپریشنوں کے لیے مناسب آلات علم کس بنا پر ایجاد کر لیے تھے اور ان کے مقابلے میں عیسائی باوجود علم تشریح اور علم جراحی میں زیادہ دلچسپی لینے کے ان دونوں علوم پر ماہرانہ کتابیں کیوں نہ لکھ سکے۔ اس سوال کا جواب خود سارٹن کے اس بیان میں موجود ہے کہ باوجود مواقع دستیاب ہونے کے یورپ کے سرجنوں نے اپنی علم تشریح کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان سرجنوں نے اپنا دائرہ عمل بہت محدود کر لیا تھا۔ ان کی سرجری بس یہ تھی کہ ٹوٹی ہڈیوں (Fractures) کو جوڑنے کی کوشش کریں' اتری ہوئی ہڈیوں (Luxation) کو پھر سے چڑھا دیں' کسی عضو کو کاٹ دیں (Amputation)' مثانہ کی پتھری کو کاٹ دیں (Lithotomics) یا دانت نکال دیں اور پھنسی پھوڑوں اور زخموں کا علاج کر دیں یا جلد کی کسی اور بیماری پر مرہم لگا دیں۔ سارٹن اس محدود سرجری کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ ان چھوٹی موٹی بیماریوں کے علاج میں ساری زندگی صرف کرنے کے بعد بھی ایک سرجن علم تشریح سے بے بہرہ رہ سکتا ہے۔ جب یورپ والوں کی

سرجری اتنی محدود اور اتنی حقیر تھی تو ان سے یہ شکوہ کرنا کہ انہوں نے علم جراحی اور علم تشریح پر مستند و موقر کتابیں کیوں نہیں لکھیں' بے جا ہے۔ البتہ حیرت اس پر ہے کہ جن کی سرجری اتنی حقیر تھی ان کو جارج سارٹن مسلمانوں سے اس فن میں بازی لے جانے والا کہتا ہے گو ساتھ یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ مسلمان ماہرین جراحی مشکل سے مشکل آپریشن کرتے' یہاں تک کہ حلق کی نالی میں شگاف دینے (Tracheotomy) میں بھی تامل نہ کرتے۔ اگر اہل یورپ جراحی میں مسلمانوں سے واقعی بازی لے گئے ہوتے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ علم جراحی اور علم تشریح میں ان کی مستند کتابیں کیوں مفقود ہیں' اس کے خلاف چودھویں صدی کے بالکل آخر میں منصور بن محمد نے 1396ء میں علم تشریح پر نہایت مبسوط اور محکم کتاب لکھی جس سے ظاہر ہے کہ مسلمان پندرھویں صدی کے آغاز تک اہل یورپ پر علم تشریح اور جراحی میں بھی ایسی ہی برتری رکھتے تھے جیسی علم العین میں۔

علم الجنین (Embryology) اور قابلہ گری (Obstetrics) میں بھی اہل یورپ غلط نظریوں کے قائل تھے۔ ارسطو نے یہ غلط نظریہ پیش کیا تھا کہ تولیدی مواد عورت فراہم کرتی ہے جس میں مرد روح پھونک دیتا ہے حالانکہ صحیح نظریہ وہ ہے جو لکریٹیس (Lucretius) نے پیش کیا تھا اور جسے الرازی' علی ابن عباس اور ابن سینا وغیرہ نے قبول کیا تھا یعنی یہ کہ عورت اور مرد دونوں کے تخم سے حمل قرار پاتا ہے۔ اس صحیح نظریہ کے بجائے چودھویں صدی کے آخر تک اہل یورپ ارسطو ہی کے غلط تصور پر قانع رہے۔ استقرار حمل کے بارے میں رائے قائم کرنے کی غرض سے مسلمان اطبا' عورت کے پیشاب کا معائنہ کیا کرتے تھے یہ ایک مسلم قاعدہ تھا جو عہد قدیم سے چلا آرہا تھا۔ مگر یورپ کے طبیبوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ آخر 1930ء میں یہ بات دریافت ہوئی کہ حاملہ عورت کے پیشاب میں ایسے ہارمون (Hormones) ہوتے ہیں جن سے استقرار حمل کا پتہ چل جاتا ہے' چنانچہ اب اس غرض کے لیے پیشاب کا معائنہ ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔

کوڑھ کی علامات کی نشاندہی ابوالقاسم نے سب سے پہلے کی تھی اور یہ مسلمان اطبا ہی تھے جنہوں نے اس مرض کا تفصیلی جائزہ لیا تھا' چنانچہ قطب الدین الشیرازی نے جو 1236ء سے 1311ء تک زندہ رہا کوڑھ پر ایک مستند کتاب (رسالہ فی البرص) لکھی۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مسلمانوں نے بہت سے شفاخانے قائم کیے۔ ترک اس معاملہ میں تو سب سے بڑھ گئے۔ جب حکومت ترکوں کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے شفاخانے قائم کرنے پر بہت توجہ دی۔ حکومت کے علاوہ متمول ترک شفاخانے قائم کرنے کو بہت بڑا کار خیر سمجھتے تھے چنانچہ شفاخانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ بغداد میں بارہ' قاہرہ میں نو' دمشق میں سات اور قونیہ میں پانچ بڑے بڑے شفاخانے تھے۔

سید امیر علی "اسپرٹ آف اسلام" میں لکھتے ہیں کہ گو یونانیوں نے علم طب میں بڑی ترقی کی تھی لیکن مسلمانوں نے اس پر گرانقدر اضافے کیے اور اسے قریب قریب اسی مقام پر پہونچا دیا جہاں دور حاضر کا علم طب ہے ۔ مسلمانوں نے ہر چیز کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کا طریقہ ایجاد کیا ۔ انہوں نے کیمیاوی طرز پر دوا سازی کی بنیاد رکھی اور وہ ادارے قائم کیے جو ڈسپنسریز (Dispensaries) کہلائے ۔ یہ دیکھنے کے لیے نگراں مقرر کیے کہ ناقص دوائیں فروخت نہ ہوں اور مناسب قیمتوں پر (جو سرکار مقرر کرتی تھی) بکیں ۔ اطبا اور دواسازوں کے لیے بغیر سرٹیفکیٹ حاصل کیے کام کرنا ممنوع ٹھہرایا ۔ سرٹیفکیٹ دینے سے پہلے اطبا اور دواسازوں کی استعداد کا امتحان لیا جاتا ۔ شفاخانوں کے انتظام اور نگراں کے لیے ڈیر[1] (Director) مقرر کیے جاتے ۔ عورتوں کے اپریشن کی غرض سے لیڈی سرجن ہوتیں جو بڑے سرجنوں کے زیر ہدایت کام کرتیں ۔ ہر شہر میں شفاخانہ ہونا ضروری تھا ۔

طب کا پیشہ بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا ۔ طبیبوں کے حالات قلمبند کرنے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ۔ ابن ابی اصیبعہ نے چار سو سے زیادہ طبیبوں کے حالات اپنی اہم تصنیف "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں درج کیے ہیں ۔ ابن القفطی نے "اخبار الحکماء" میں اور ابن خلکان نے "وفیات الاعیان" میں بہت سے طبیبوں کے علاوہ دیگر علماء اور حکماء کے حالات بھی لکھے ہیں ۔ ابن ایبک الصفدی نے جو چودھویں صدی کا مشہور مورخ ہے ، ایک حیرت انگیز کتاب "وافی بی الوفیات" مرتب کی جس میں چودہ ہزار مشاہیر اسلام کے حالات زندگی جمع کیے ہیں ۔ اس کتاب میں اطبا کے علاوہ ، زندگی کے اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کی سوانح عمریاں بھی درج کرنے کی سعی بلیغ کی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب بہت ضخیم اور کئی جلدوں میں ہو گی ۔ اس کے تمام نسخے ابھی تک فراہم نہیں ہو سکے مگر استنبول میں اس کا بڑا حصہ دستیاب ہو گیا ہے ۔ یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے شروع کی گئی ہے اور مصنف نے اس پر ایک جامع اور پر مغز مقدمہ لکھا ہے ۔

ول ڈیوراں نے صرف بارہ تیرہ طبیبوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے دو تین غیر مسلم بھی ہیں ۔ جارج سارٹن کی کتاب کے تفصیلی مطالعہ سے پتہ چلا کہ مشہور مسلمان اطبا کی تعداد بہت بڑی ہے ۔ ان میں سے بیسیوں وہ ہیں جنھوں نے علم طب پر متعدد کتابیں لکھیں ۔ ان کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو ہم اپنے دور حاضر کے نامور طبیبوں اور سرجنوں پر نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ ان میں سے کسی نے اپنے فن پر کوئی محققانہ کتاب بھی لکھی ہے یا نہیں ۔ ملک گیر شہرتوں اور بڑی بڑی فیسوں کے باوجود ان میں شاید ہی کوئی نکلے جس نے کوئی قابل اعتنا کتاب لکھی ہو یا کوئی نیا طریقہ علاج یا کوئی نئی دوا ایجاد کی ہو ۔ ہمارے پرانے طبیبوں کا مطمح نظر علم کی ترقی اور انسانوں کی خدمت ہوتا تھا ، ہمارے موجودہ معالج (ڈاکٹر عبدالصمد اور ان ایسے چند اور خدا ترس معالجوں کا استثنیٰ کرتے ہوئے)

1- حیدر آباد دکن میں ڈائرکٹر کو ناظم کہتے تھے اور سیکریٹری کو معتمد ۔ (م-ق)

زراندوزی کو اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں ۔ حرص زر اور تحصیل علم کا صحیح جذبہ ایک سینے میں مشکل ہی سے جمع ہوتے ہیں ۔

نامور مسلمان اطبا میں سے چند زیادہ نامور کے حالات پہلے درج کیے جا چکے ہیں اور کچھ اور اب تحریر کیے جاتے ہیں :

ابوالحسن سعید ابن ہبیت اللہ ۔ یہ گیارہویں صدی کا مشہور طبیب ہے ۔ اس کا انتقال 1101ء یا 1102ء میں ہوا ۔ وہ خلیفہ المقتدر کے زمانہ میں بغداد میں تھا ۔ اس نے علم الاعمال اعضاء (Physiology) اور علم النفس (Psychology) پر ایک کتاب "مقالہ فی خلق الانسان" لکھی جس میں اس نے استقرار حمل ، زمانہ حمل اور وضع حمل کے مسائل پر بحث کی ہے ۔ اس نے بقائے روح کا بھی اسی سلسلہ میں ذکر کیا ہے ۔ اس کی دوسری تصنیف "المغنی فی تدبیر الامراض و معرفت العلیل والواض" میں مرضوں اور دواؤں کا خلاصہ درج ہے ۔ ابن ہبیت اللہ ایک بڑا طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا فلسفی بھی تھا ۔

زریں دست (ابو روح محمد ابن منصور ابن ابی عبداللہ ابن منصور الجمالی) اپنی نہایت گراں قدر تصنیف "نور العین" کی وجہ سے مشہور ہے ۔ یہ کتاب اس نے 88-1087ء میں تصنیف کی ۔ یہ علم العین کی مستند کتابوں میں سے ہے ۔ وہ معالج امراض چشم کی حیثیت سے بلند مقام رکھتا ہے ۔

ابو الصلت ، تیونس میں 68-1067ء میں پیدا ہوا ۔ اشبیلیہ ، قاہرہ اور مہدیہ میں اس کی زندگی گزری اور 1132ء میں مہدیہ میں اس کا انتقال ہوا ۔ وہ ہمہ گیر شخصیت رکھتا تھا ۔ اس کو طب کے علاوہ علم ریاضی ، علم ہیئت ، موسیقی اور منطق میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا ۔ اس نے طب پر "کتاب الادویہ المفردہ" لکھی جس کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا ۔ علم ہیئت سے متعلق اس نے "رسالہ فی عمل بالاصطرلاب" لکھا ۔ موسیقی پر "رسالہ فی الموسیقی" لکھا جس کا عبرانی میں ترجمہ ہوا اور منطق پر "تقویم الذہن" تصنیف کی ۔

اسمٰعیل الجرجانی ، سید اسمٰعیل کے نام سے بھی موسوم ہے ۔ سب سے پہلا طبی انسائیکلوپیڈیا (قاموس) جو فارسی میں لکھا گیا وہ سید اسمٰعیل کی "ذخیرة الخوارزم شاہی" ہے ۔ اس میں ایک ہزار ایک سو سات ابواب ہیں اور الفاظ کی تعداد کم و بیش چار لاکھ پچاس ہزار ہے ۔ اس کا مختصر ترجمہ عبرانی میں کیا گیا ۔ یہ کتاب خوارزم کے سلطان قطب الدین محمد شاہ کے لیے لکھی گئی تھی ۔ اس کے وزیر کے لیے سید اسمٰعیل نے "اغراض الطب" تصنیف کی ۔ ابتداءً ذخیرہ میں نو کتابیں تھیں ۔ بعد میں

دسویں کتاب "کتاب قرابادین" کا اضافہ کیا۔ اس میں مختلف زہروں کے تریاقوں کا ذکر ہے۔

مسلمانوں کے دو بڑے دینی عالم (1) ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن علی ابن محمد جمال الدین، ابن جوزی اور (2) ابو عبداللہ محمد ابن عمر ابن الحسین ابن الخطیب فخرالدین الرازی ہمہ گیر استعداد کے حامل تھے۔ اول الذکر نے تاریخ، علم اللسان، سیرت نگاری، حدیث، فقہ، قرآن، اخلاقیات، جغرافیہ اور طب وغیرہ پر کتابیں لکھیں۔ طب پر ابن جوزی کی کتاب کا نام "لقاط المنافع فی الطب" ہے۔ وہ 1115ء میں پیدا ہوئے اور 1201ء میں وفات پائی۔ فخرالدین رازی، امام رازی کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے علم ہیئت، علم ریاضی، علم نجوم، علم طبیعیات، الٰہیات، فقہ، تفسیر، طب، تاریخ، فلسفہ وغیرہ پر بہت کچھ لکھا ہے۔ مذہبی دنیا میں وہ مفسر قرآن کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں۔ ان کی تفسیر کا نام "مفتاح الغیب" ہے مگر عموماً "تفسیر الکبیر" کے نام سے مشہور ہے۔ "حدائق الانوار فی حقائق الاسرار" میں انہوں نے ریاضی اور طب پر بھی لکھا ہے۔ امام رازی 1129ء بمقام رے پیدا ہوئے تھے۔

ابوجعفر محمد الغافقی۔ اس کا وطن غافق تھا جو قرطبہ کے قریب ہے۔ 1165ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نباتیات (Botanist) بھی تھا۔ اس نے اسپین اور افریقہ میں گھوم پھر کر جڑی بوٹیاں فراہم کیں اور ان کی پہچان میں بڑی نظر پیدا کی، وہ مفرد دواؤں پر اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ جس صحت کے ساتھ الغافقی نے جڑی بوٹیوں کی کیفیت بیان کی ہے، کسی اور نے نہیں کی۔ اس نے ہر پودے کا نام عربی، لاطینی اور بربری زبان میں لکھا ہے۔ اس کی "کتاب الادویہ المفردہ" اتنی اہم سمجھی گئی کہ احمد ابن علی الجمہوری اور ابو الفرج (Barhebracus) نے اس کو مختصر کر کے تلخیص مرتب کیں۔ ابو الفرج نے اس کو سریانی زبان میں منتقل کر لیا۔ ابن بیطار نے جو مسلمانوں کا سب سے بڑا ماہر عقاقیر (Herbalist) ہے ابو الفرج کی تلخیص کو پورے کا پورا اپنی کتاب میں نقل کر لیا۔ یہ اس فن میں اعلیٰ درجہ کی استعداد کا بین ثبوت ہے۔ "کتاب الادویہ المفردہ" میں الغافقی نے زرد کہر (Yellow Amber) اور سال امونیک (Salammonaic) کی کیفیت بھی بیان کی ہے۔

ابومحمد عبداللطیف ابن محمد ابن علی البغدادی 1162ء میں بغداد میں پیدا ہوا اور 1331ء میں اس کا انتقال ہوا۔ عبداللطیف اپنے زمانے کا نہایت روشن خیال اور کثیر المطالعہ عالم تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم کو 1887ء میں عیسائیوں کے قبضہ سے واپس لیا تو عبداللطیف یروشلم گیا۔ صلاح الدین نے اسے دمشق کی مسجد میں معلم مقرر کر دیا۔ صلاح الدین کے انتقال کے بعد وہ قاہرہ چلا گیا اور جامعہ الازہر میں پڑھانے لگا۔ پھر دمشق واپس آیا اور عزیزیہ میں درس دینے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ

اس نے ایک سو ساٹھ کتابیں لکھیں۔ اس کو ہر علم میں دخل تھا۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے عالم طبیعیات الہیثم کے فضائے بسیط کے نظریہ سے عبداللطیف نے اختلاف کیا اور اس پر تنقید کی۔ وہ علم طب میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ مصر میں اس نے انسانی ڈھانچوں اور ان کی ہڈیوں کا علیحدہ علیحدہ اور بغور مشاہدہ کیا۔ جالینوس نے، جو بقراط کے بعد یونانیوں کا سب سے بڑا طبیب تھا لکھا تھا کہ نیچے کے جبڑے میں دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔ عبداللطیف نے بتایا کہ جالینوس نے صحیح مشاہدہ کے بغیر یہ بات کہہ دی ہے ورنہ جو بھی مشاہدہ کرے گا وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ نیچے کے جبڑے میں صرف ایک ہڈی ہوتی ہے۔

عبداللطیف نے اپنے مصر کے قیام الازہر میں پڑھانے اور انسانی ڈھانچوں کا مشاہدہ کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا۔ اس نے مصر کے حالات پر ایک محققانہ کتاب "الافادات والاعتبار فی الامور المشاہدات و الحوادث المعانیت بہ ارض مصر" لکھی۔ اس میں مصر کے حیوانات و نباتات، آثار قدیمہ، دریائے نیل، جہازوں، عمارتوں، طباخی، طاعون اور قحط سالی وغیرہ کو بالتفصیل قلمبند کیا۔ یہ کتاب مصر کے حالات پر ایک مستند دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ عبداللطیف کیمیا گری کو توہم پرستی سمجھتا تھا کیونکہ سائنس کے اصول اس پر منطبق نہیں ہوتے تھے۔

نجیب الدین السمرقندی نے علم طب پر بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور "کتاب الاسباب والعلامات" ہے۔ اس میں ہر مرض کے متعلق بتایا ہے کہ وہ کیوں لگ جاتا ہے اور اس کو تشخیص کرنے کی کیا علامتیں ہیں۔ یہ اتنی مقبول ہوئی کہ تیمور لنگ کے پوتے شہزادہ الغ بیگ کے معالج نفیس ابن عوض الکرمانی نے 24-1423ء میں اس پر شرح لکھی جس کا نام "شرح الاسباب والعلامات" تھا۔ اس شرح پر محمد ارزانی ابن میر حاجی محمد مقیم نے 1-1700ء میں شرح موسومہ "طب اکبریٰ" لکھی اور اس میں دوسرے مصنفین کی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی درج کیے۔ جب 3-1222ء میں ہرات کو تاتاریوں نے تباہ کیا تو اسی ہنگامے میں نجیب الدین السمرقندی بھی ہلاک ہو گیا۔

ابن طرخان ابواسحٰق ابراہیم ابن محمد ابن طرخان ابن السویدی الانصاری الدمشقی 4-1203ء میں پیدا ہوا، دمشق میں رہا اور 2-1291ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ عالم طب ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھا۔ اس نے ایک نہایت ہی مفید کتاب "کتاب الباھر فی الجواہر" "ہدایت نامہ" مرتب کی۔ یہ کتاب "تذکرہ ابن طرخانی" اور "تذکرۃ السویدی" کے نام سے بھی موسوم ہے۔ یہ کتاب علم طب کے چار سو ماہرین کی کتابوں سے استفادہ کر کے لکھی گئی ہے۔ ہر دوا کے بارے میں مختلف اطبا کے اقوال جمع کر دیئے ہیں اور اپنے تجربے سے جو رائے مصنف نے قائم کی تھی وہ بھی درج کر دی گئی ہے۔ یہ کتاب کئی صدیوں تک رائج رہی۔ سولہویں صدی میں قاہرہ کے عبدالوہاب ابن احمد الشعرانی نے اسے مختصر کر کے

شائع کیا اور اسی صدی میں ترکی طبیب بدرالدین محمد ابن محمد القوصالی نے بھی اس کی تلخیص لکھی طرخان کی ایک تصنیف "کتاب الباہر فی الجواہر" بھی ہے۔ طرخان اپنے زمانے کا نامور عالم طب تھا۔

ابن ابی اصیبعہ (ابوالعباس احمد ابن القاسم ابن ابی اصیبعہ الخزرجی) دمشق میں 1203-4ء میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم پائی۔ اس کے والد امراض چشم کے معالج تھے۔ اس نے بھی "علم العین" پڑھا اور قاہرہ کے الناصری شفاخانہ کے شعبہ علم العین میں معلم مقرر ہو گیا۔ پھر امیر صرخد کے دربار میں ملازم ہو گیا، صرخد ہی میں جو دمشق سے تھوڑے فاصلے پر ہے، اس کا انتقال ہوا۔ اس کے، عبداللطیف اور دوسرے بڑے طبیبوں سے مراسم تھے۔ ابن بیطار کے ساتھ اس نے جنگلی پودے اور دوائیں جمع کی تھیں۔ اس نے اپنے پیشہ کے نامور لوگوں کے حالات پر کتاب لکھنے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ 1242ء میں اس کی مشہور تصنیف "کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء" مکمل ہوئی۔ اس میں چار سو سے زیادہ مشہور طبیبوں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کے پندرہ باب ہیں۔ پہلے باب میں بتایا ہے کہ علم طب کیونکر وجود میں آیا۔ پھر پانچ ابواب میں قدیم اطبا کے، جن میں بقراط اور جالینوس بھی شامل ہیں، حالات درج کیے ہیں۔ ساتویں باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے اطبا کا حال ہے۔ پھر تمام اسلامی ممالک کے طبیبوں کا ذکر ہے۔ بہت سے طبیبوں کے اور علوم مثلاً علم ریاضی، علم ہیئت، علم طبیعیات، فلسفہ وغیرہ کا حال بھی لکھا ہے۔ اس طرح اس کتاب کی اسلامی سائنس کی تاریخ کی حیثیت ہو گئی ہے اور یہ مسلمان سائنسدانوں کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔

قاضی فتح الدین ابو العباس احمد ابن عثمان القیسی قاہرہ میں ایوبی سلطان الصالح (جس نے 1240ء سے 1249ء تک حکومت کی) کے عہد میں طبابت کرتا تھا۔ اس کے والد قاضی جمال الدین ابو عمر عثمان بھی ممتاز طبیب تھے۔ القیسی نے بحیثیت معالج امراض چشم شہرت پائی اور اتنی شہرت پائی کہ لوگ اسے رئیس الاطبا بدیار المصریہ کہنے لگے۔ اس نے ایک کتاب موسوم بہ "نتیجۃ الفکر فی علاج امراض البصر" لکھی جو پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں آنکھ کے کسی ایک حصہ کو لے کر اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ پندرہویں باب میں نظر کی کمزوری اور آنکھ کی صفائی اور احتیاط پر لکھا ہے۔ بابوں کے عنوان پڑھنے ہی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علم العین کو مسلمانوں نے کس قدر فروغ دیا تھا۔

ناصر الدین الطوسی کا ذکر ریاضی دانوں کے ساتھ کیا جائے گا۔ وہ بڑا طبیب تھا مگر اس سے کہیں بڑا ریاضی داں تھا۔

قطب الدین الشیرازی کا ذکر ہیئت دانوں کے ساتھ کیا جائے گا کیونکہ وہ اس حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔

محمد الشفرہ (ابو عبداللہ محمد ابن علی القربلیانی الشفرہ) چودہویں صدی کے ربع اول میں ہوا ہے۔ وہ ماہر نباتات تھا۔ خود پہاڑوں میں گھوم پھر کر جڑی بوٹی جمع کرتا۔ شفرہ کے معنی ہیں چاقو! چونکہ اسے جڑیں کاٹنے کی غرض سے شفرہ اکثر استعمال کرنا پڑتا تھا، یہ لفظ اس کے نام کا جزو بن گیا۔ جب غرناطہ کے بادشاہ نصر نے 1314ء میں معزول ہو کر کادز (Cadiz) میں جو شفرہ کا وطن تھا، سکونت اختیار کی تو شفرہ نے ایک نباتاتی باغ لگایا۔ شفرہ ایک اچھا طبیب اور سرجن بھی تھا، وہ نصر کا معالج بھی بن گیا۔ شفرہ نے فن جراحی پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب الاستقصاء والابرام فی علاج الجراحات والاورام" رکھا۔ ہر چند اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف زخموں اور ورموں سے متعلق ہوگی لیکن جارج سارٹن لکھتا ہے کہ یہ اس عہد کے علم جراحی پر ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے۔ ابوالقاسم نے جو ازمنہ وسطیٰ کا سب سے بڑا سرجن تھا، ورموں کی، جن میں رسولی وغیرہ بھی شامل ہیں تیس قسمیں بتائی تھیں۔ شفرہ نے چھتیس دریافت کیں۔

ابن خاتمہ (ابوجعفر احمد ابن علی ابن خاتمہ الانصاری) 1323-4ء میں المیریہ اسپین میں پیدا ہوا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار میں سے کسی کی اولاد میں سے تھا۔ اس کی تصنیف "تحصیل الغرض القاصد فی تفصیل المرض الوافد" طاعون پر سب سے پہلی کتابوں میں سے ہے۔ اس نے مرض طاعون پر اپنے ذاتی مشاہدے سے کام لے کر بہت سی مفید کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے مختلف جغرافیائی حالات میں اس وبا کے مختلف اثرات کا جائزہ لیا اور یہ بتایا کہ کیوں کچھ لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہیں اور کیوں کچھ بچ جاتے ہیں۔ اس سے پہلے لوگ نہیں جانتے تھے کہ یہ مرض ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔ ابن خاتمہ نے اس کے متعدی ہونے پر دلائل دیئے اور بچنے کی تدابیر بتائیں۔

نجم الدین محمود ابن ضیاء الدین الیاس الشیرازی کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ وہ 1330ء میں فوت ہوا۔ اس نے طب پر ایک جامع کتاب لکھی جو "الحاوی الصغیر" کے نام سے مشہور ہوئی گو اصل نام "کتاب الحاوی فی علم التداوی" تھا۔ چونکہ ابو بکر الرازی کی مشہور کتاب کا نام "الحاوی الکبیر" تھا لہٰذا اس سے ممیز کرنے کے لیے اس حاوی کو الحاوی الصغیر کہنے لگے۔ اس میں چھ سو پچاس (650) سے زیادہ نسخے بھی درج کیے گئے ہیں۔ مصنف نے یہ کتاب اس غرض سے لکھی تھی کہ یہ ہر گھر میں رہے اور بہت سے مریضوں کا علاج لوگ خود کر سکیں۔ دواؤں کو ان کے خواص کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے اور مفرد اور مرکب دونوں طرح کی دواؤں کو شامل کیا ہے۔

ابن الاکفانی ابو عبداللہ شمس الدین محمد ابن ابراہیم الانصاری السنجاری المصری السخاوی نے طب پر تین کتابیں لکھیں جن میں "کشف الرین فی احوال العین" زیادہ اہم ہے۔ عمار ابن علی نے آنکھ کے پپوٹوں کی بیماریوں کی تعداد تیرہ بتائی تھی۔ علی ابن عیسیٰ نے اکتیس بتائیں اور ابن الاکفانی

نے تینتالیس بیماریاں دریافت کیں۔ شاذلی کے نزدیک ان بیماریوں کی صحیح تعداد چھتیس ہے۔ ابن الاکفانی نے دریافت کیا کہ پلکیں اگر آنکھوں کے اندر چلی جائیں تو آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ (Cornea) اندر کی طرف مڑ جاتا ہے اور اس کا علاج صرف آپریشن کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ اس نے کچھ ایسے امراض کی تشخیص کی جو اس وقت تک تشخیص نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً پپوٹوں کے ورم میں پیپ پڑ جانا (Phlegmon)، آتش فارس (Persian Fire)، پپوٹوں کا پھڑکنا اور اینٹھن۔ اگلی صدی میں نور الدین علی المنادی نے کشف الرین کا خلاصہ مرتب کیا۔ ابن الاکفانی معالج چشم ہونے کے علاوہ ماہر نباتات (Herbalist) بھی تھا اور اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

ابن قیم الجوزی (شمس الدین ابو عبد اللہ محمد ابن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ الحنبلی) مشہور فقیہہ اور امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید تھے۔ ان کے ساتھ قید خانے میں بھی رہے۔ یہ اچھے طبیب بھی تھے اور طب پر انہوں نے "کتاب الداء والدوا" لکھی ہے۔ انہوں نے گھوڑوں اور علم الحرب پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "کتاب الفروسیہ المحمدیہ بفنون القتال" ہے۔ وہ 1292ء میں پیدا ہوئے اور ستمبر 1350ء میں ان کا انتقال ہوا۔

الشاذلی (صدقہ ابن ابراہیم المصری الحنفی الشاذلی) اس طریقہ کا رکن تھا جسے علی ابن عبد اللہ الشریف الزویلی الشاذلی نے قائم کیا تھا، اس لیے وہ الشاذلی کہلایا۔ وہ ماہر علم العین تھا۔ اس علم پر اس کی ایک عالمانہ تصنیف "کتاب العمدہ الکحلیہ فی الامراض البصریہ" ہے جس میں بہت کچھ اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر لکھا ہے۔ اس نے پرانے حکماء ارسطو، بقراط، جالینوس، الرازی وغیرہ کے آنکھ کے متعلق مختلف نظریوں سے بحث کی ہے اور اس مسئلہ کو بھی اٹھایا ہے کہ آیا کچھ جانور دیکھنے کی استعداد سے محروم ہوتے ہیں۔ اس نے آنکھوں کی ساخت اور رنگوں کی بنا پر علم الانسان (Anthrapology) (Anthropology) پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آنکھ کی بیشتر بیماریاں دماغ میں جنم لیتی ہیں۔ اس نے سرطان اور پپوٹوں کے پھڑکنے پر بحث کی۔ اس کے خیال میں قبض، بدہضمی، درد سر اور حیض بند ہو جانے سے آنکھیں متاثر ہوتی ہیں۔ اس نے شلال (Cataract) یعنی موتیہ بند پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اتنی اچھی بحث متقدمین میں سے (خواہ یونانی ہوں یا عرب) کسی نے نہیں کی تھی۔ یہ کتاب الشاذلی کی تخلیق اور جودت طبع پر دلالت کرتی ہے، علم العین پر مسلمانوں کے آخری دور کی بہترین کتاب ہے۔

اسحٰق ابن مراد، ترک طبیب تھا جس نے ترکی میں علم طب پر کتابیں لکھیں، وہ اناطولیہ کا باشندہ تھا۔ اس نے (1) "خلاصۃ الطب" اور (2) "خواص الادویہ" 1388-9ء میں لکھیں۔ اسحٰق کو پہاڑوں میں گھومنے پھرنے کا اتفاق اکثر ہوا تھا۔ اس کی بدولت اس نے دوائیں جمع کیں۔ ان کے

خواص سے واقفیت حاصل کرکے اس نے "خواص الادویہ" لکھی جو مخزن الادویہ (Materia Medica) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے ایسی دواؤں کا بھی ذکر کیا ہے، جو حیوانی اور معدنی ہوتی ہیں۔ "خلاصۃ الطب" میں ہر مرض کی علامت اور اس کا علاج درج کر دیا ہے۔

حاجی پاشا (خضر ابن علی الایدینی) ترک طبیب اور فقیہ تھا۔ اس کی پیدائش قونیہ میں ہوئی اور 1417ء میں وہ فوت ہوا۔ اس نے قاہرہ میں قانون اور دینیات کی تعلیم پائی۔ ایک بار سخت بیمار پڑا تو اس نے طب پڑھنے کا تہیہ کیا۔ طبیب بن کر اس نے وہ شہرت حاصل کی کہ قاہرہ کے اس عظیم شفاخانے کا جسے سلطان قلاؤن نے قائم کیا تھا طبیب اعلیٰ بن گیا۔ اس نے بیضاوی کی "انوار التنزیل" الامردی کی "مطالع الانوار فی المنطق" اور امام فخرالدین رازی کی کچھ کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ طب پر اس کی قاموس "شفاء الاسقام و دواء الآلام" ہے جو 1380ء میں ایدین کے سلطان عیسیٰ ابن احمد کے لیے عربی میں لکھی گئی تھی۔ شفاء میں نمونیہ کا بیان حیرت انگیز حد تک قابل تعریف ہے۔ جو علامات اس نے بتائی تھیں وہی آج بھی بتائی جاتی ہیں۔ اس سے حاجی پاشا کی قوت مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اور باتیں بھی جو اس کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں، اس کتاب میں پائی جاتی ہیں۔

زین العطار (علی ابن الحسین الانصاری) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار کی اولاد میں سے تھا۔ اس کے والد جمال الدین حسین اصفہانی شیراز میں طبابت کرتے تھے۔ وہیں 1329-30ء میں زین العطار پیدا ہوا۔ وہ مظفری سلطان جلال الدین شاہ شجاع کے دربار سے سولہ سال تک وابستہ رہا۔ اس نے 1366ء میں "مفتاح الخزائن" فارسی میں لکھی یہ دراصل مخزن الادویہ ہے۔ تین سال بعد اس نے شہزادی بدیع الجمال کے لیے مفتاح کا نیا ایڈیشن مرتب کیا اور اس کا نام "اختیارات بدیعی" (اختیارات بمعنی اقتباسات) رکھا بعد میں مفتاح میں کچھ اضافہ کیا۔ اس کتاب میں دانتوں کے منجنوں، آنکھوں کے سرموں اور زہروں کے تریاق کا بیان بھی ہے۔

منصور ابن محمد ابن احمد نے 1392ء میں تیمور لنگ کے پوتے پیر محمد ابن جہانگیر ابن تیمور کے لیے "رسالہ تشریح بدن انسان و کیفیت و اعیان" فارسی میں لکھا۔ اس رسالہ میں جسم کے مختلف حصے، ہڈیاں، رگیں، شریانیں، وریدیں، عورت کے رحم میں جنین وغیرہ رنگین تصویروں کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ ستائیس سال بعد منصور نے ایک اور کتاب "سلطان کشمیر زین العابدین" کے نام سے معنون کی، یہ دوسری کتاب علم طب پر ہے۔ پہلی کتاب جو علم تشریح بدن پر ہے۔ نہایت قابل قدر رہے۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

مسلمانوں کی علوم میں پیشوائی

مسلمانوں کے دور میں علم ریاضی اور منطق، علم ہیئت کی تکمیل کے لیے تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ ریاضی حکیمانہ علوم کے لیے ناگزیر ہے اور بغیر منطق جانے قوت استدلال نہیں آتی جو ہر چیز کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔

قاہرہ کی جامعہ الازہر میں دینیات، شاعری، ادب وغیرہ کے ساتھ ساتھ ریاضی اور منطق بھی پڑھائی جاتی۔ یہ یونیورسٹی 970ء میں فاطمی خلیفہ کے وزیر نے قائم کی تھی۔ 988ء میں طلبہ کی تعداد پینتیس ہزار ہوگئی جن کو تعلیم اور کھانا مفت دیا جاتا اور درسگاہوں میں بھی یہ دونوں علوم بالالتزام پڑھائے جاتے۔

رومی ہندسے (Numerals) علم ہندسہ اور ریاضی کی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اگر انیس سو اٹھارہ لکھنا ہوتا تو یوں لکھتے MDCCCC X VIII۔ رومیوں نے ہندسوں کے لیے حروف تہجی مقرر کر رکھے تھے۔ ایک = I، پانچ = V، دس = X، سو = C، پانچ سو = D، ہزار = M۔ غور کیجئے کہ جب 1918 لکھنے میں اتنی زحمت اٹھانی پڑے تو چاند، سورج اور دوسرے سیاروں اور ستاروں کا فاصلہ رومی ہندسوں میں لکھنا کیا قیامت ہوگا۔ ریاضی اور فلکیات کی یونانی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان کے علوم کا جائزہ بھی لیا جائے۔ چنانچہ خلیفہ المنصور عباسی کے حکم سے ہندوستان کے علم ہیئت کی کتابوں (Sidhantas) کا 773ء میں ترجمہ کیا گیا اور وہاں کے ہندسے (Numerals) جن میں صفر بھی پایا جاتا تھا مسلمانوں نے اپنا لیے۔ الخوارزمی نے ان ہندسوں پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا ترجمہ بعد میں لاطینی میں ہوا۔

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی (Algoritmi) 780ء میں خوارزم میں پیدا ہوا۔ وہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ریاضی دان تھا اور علم ہیئت (فلکیات) میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس نے علم مثلث

(Trigonometry) کی تقویمیں بھی بنائیں۔ اس نے دو درجی مساواتوں (Quadratic Equation) کو حل کرنے کے لیے مختلف طریقوں پر جو کتاب لکھی تھی اس کا لاطینی ترجمہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں سولہویں صدی تک پڑھایا گیا۔ الخوارزمی نے خلیفہ مامون کے ایما اور کچھ معاونوں کی مدد سے ایک جغرافیائی قاموس (Geogaraphical Encyclopaedia) تیار کی۔ اس کا انتقال ستر سال کی عمر میں 850ء میں ہوا۔

ابو الفرغانی ماوراء النہر (Tronsoxiana) کا رہنے والا تھا۔ خلیفہ مامون نے ہیئت دانوں کی ایک جماعت کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ ٹولمی (Ptolemy) کی دریافتوں کا جائزہ لیں۔ اس جماعت میں ابو الفرغانی بھی تھا۔ مسلمان سائنسدان شروع ہی سے دنیا کو گول مان کر اپنے تجربات کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ سے چار سو سال پہلے پونٹیکس (Heracleid Esponticus) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ دنیا اپنے محور پر گھومتی ہے جس کی وجہ سے دن رات پید ہوتے ہیں۔ مگر عیسائیت نے ٹولمی کا نظام شمسی قبول کیا جس کے غلط تصور کی وجہ سے علم ہیئت بالکل جامد ہوگیا۔ اس نظام کے غلط سمجھنے کے جرم میں یورپ نے برونو (Bruno) کو زندہ جلا دیا۔ مسلمانوں نے اس غلط نظریہ کی کہ ہماری چھوٹی سی دنیا کائنات کا مرکز ہے اور چاند سورج وغیرہ اس کے گرد گھومتے ہیں تنقیص کی مگر یورپ 1521ء تک دنیا کو کائنات کا مرکز مانتا رہا۔ اس جماعت نے جس میں ابو الفرغالی بھی شامل تھا دنیا کی ہر ڈگری (یعنی دنیا کے محیط کا تین سو ساٹھواں حصہ) کی پیائش 2/3 56 میل ٹھہرائی جو موجودہ پیائش کے لحاظ سے صرف نصف میل زیادہ ہے۔ ابو الفرغانی نے علم ہیئت پر ایک کتاب لکھی جو یورپ اور مغربی ایشیا میں سات سو سال تک پڑھائی گئی۔ اس نے[1] Astronomical Coefficients کا تعین کیا جو آج بھی صحیح یا قریب قریب صحیح مانا جاتا ہے۔

ابو عبداللہ البتانی (Albategnius) نے علم مثلث کو انتہائی ترقی دی۔ وہ رقہ (Raqqa) کا رہنے والا تھا۔ 850ء میں پیدا ہوا اور 929ء میں اناسی برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے ٹولمی کے ذوار بعۃ الاضلاع (Quadrilateral) کے بجائے مثلث سے کام لیا اور ہپارکس (Hipparchus) کے وتر (Chord) کے بجائے عمودی خطوط (Sine) کا استعمال کیا۔ یہ دونوں تبدیلیاں علم کی ترقی میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ اس نے جس طریقہ کو مثلثی تناسب معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا تھا، وہی طریقہ آج بھی رائج ہے۔

ثابت ابن قرہ (Thabit Ibn Qurra) ریاضی، ہیئت اور طب میں بڑی دست گاہ رکھتا تھا۔ وہ جدید علم ہندسہ (Geometry) کے ماہرین میں سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔

1- ہیئت کا ایک عمل ہے جس میں پہلے سے متعین کر کے معلوم یا نامعلوم مقدار سے ضرب دیتے ہیں۔

ابوالوفا نے جو بغداد کے بویہ فرمانروا کی سرپرستی میں تحقیقاتی کام کرتا رہا، چاند کی رفتار میں ناہمواری دریافت کی۔ Tychobrahe نے یہ بات چھ سو سال بعد معلوم کی۔

ابو الریحان محمد ابن احمد البیرونی بہت سے علوم میں دستگاہ رکھتا تھا۔ وہ سب سے بڑا جغرافیہ داں سمجھا جاتا ہے۔ مگر ریاضی، ہیئت، طبیعیات، تاریخ، فلسفہ اور ادب میں بھی اس کا مقام صف اول میں ہے۔ البیرونی اور ابن سینا دونوں خوارزم کے دربار سے وابستہ تھے۔ محمود غزنوی نے دونوں کو طلب کیا۔ البیرونی غزنی آگیا مگر ابن سینا نے آنا پسند نہ کیا اور بھاگ کر محمود کے ڈر سے چھپتا پھرا۔ محمود نے البیرونی کی بہت قدر کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے مسعود نے بھی اسے عزت و احترام کے ساتھ رکھا۔ اس نے علم ہیئت پر ایک جامع کتاب لکھی۔ اس نے علم ہندسہ میں اضافہ کیا اور کئی Theorems کا حل تلاش کیا جو اب اس کے نام سے منسوب ہیں۔ شطرنج کے چونسٹھ خانوں میں اگر یہ اہتمام کیا جائے کہ کوئی چیز ہر خانے میں پچھلے خانے کی مقدار سے دوگنی کر دی جائے تو چونسٹھویں خانے تک پہونچتے پہونچتے اس کی مقدار اتنی بڑھ جائے گی جس کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس مقدار کے حساب لگانے میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ البیرونی نے اس مقدار کو معلوم کرنے کا ایک نہایت آسان طریقہ ایجاد کیا۔ اس نے ہیئت، ریاضی اور نجوم کی تلخیص کرکے ایک کتاب تالیف کی۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف "تاریخ ہند" میں ہندوؤں کے علم ہیئت کو بیالیس ابواب میں بیان کیا۔ اس کی رائے میں ہندوؤں کی سائنس میں منطق کو کم اور واہمہ کو زیادہ دخل تھا۔ ہندوستانی ہندسوں کی تشریح جس خوبی سے اس نے کی ہے کسی اور نے نہیں کی۔ اس نے سلطان مسعود کے لیے فلکی تقویمیں بنائیں۔ اس نے بہت سے پتھروں اور دھاتوں کی خاصیتیں بیان کیں۔ اس نے اٹھارہ قیمتی پتھروں کا ثقل نوعی (Specific Gravity) دریافت کیا۔ اس کی جغرافیہ دانی کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جائے گا۔ وہ 973ء میں خوارزم کے قریب پیدا ہوا تھا اور پچھتر برس کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔

ابو محمد نصر الفارابی بحیثیت فلسفی زیادہ مشہور ہے مگر وہ ریاضی، طبیعیات اور علم کیمیا وغیرہ کا بھی عالم تھا۔ اس کی ہمہ گیر تصنیف "احصاء العلوم" علم اللسان، منطق، ریاضی، طبیعیات، کیمیا، معاشیات اور سیاسیات سے متعلق ہے۔ وہ درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ سیف الدولہ نے اسے حلب میں ایک مکان دیدیا اور جب پوچھا کہ مصارف کے لیے کتنی رقم دی جائے تو فارابی نے کہا چار درہم یومیہ کافی ہوں گے۔ وہ ترکستان کے قصبہ فاراب میں پیدا ہوا اور اس کا 950ء میں دمشق میں انتقال ہوا۔ فارابی نے اپنی کتاب "مدینۃ الفاضلہ" میں انسانی معاشرے کا جائزہ لیا ہے اور کئی نظریوں سے بحث کرکے اس نے ایسا معاشرہ بنانے کی تلقین کی ہے جو حسد، قوت اور جنگ و جدال کے بجائے معقولیت، عقیدت اور محبت پر مبنی ہو۔

ابوالفتح عمر خیام ابن ابراہیم 1039ء میں نیشاپور میں پیدا ہوا۔ علم جبر و مقابلہ میں اس نے خوارزمی کی تحقیق کو آگے بڑھایا۔ اس علم پر اس کی تصنیف کا 1857ء میں فرانس میں ترجمہ کیا گیا۔ مساوات مکعب (Cubic Equation) کو جس طرح خیام نے حل کیا ہے وہ قرون وسطیٰ کی ریاضی کو نقطہ عروج پر پہنچا دیتا ہے۔ الجبرا پر اس کی ایک تصنیف بھی ہے جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ لائیڈن (Leiden Library) میں محفوظ ہے۔ اس میں خیام نے اقلیدس (Euclid) کے اصول موضوعہ (Postulates) اور تعریفوں (Definations) کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ 1074ء میں سلطان ملک شاہ سلجوقی نے اسے اور چند اور ماہرین فلکیات کو ایرانی کیلنڈر کی تصحیح کا کام سونپا۔ یہ کیلنڈر گریگورین (Gregorian) کیلنڈر سے جو یورپ والوں نے 1582ء میں مرتب کیا ہے اور اب دنیا میں رائج ہے زیادہ صحیح ہے۔ مروجہ کیلنڈر میں تین ہزار تین سو تیس سال میں ایک دن کا فرق پڑ جائے گا۔ جب کہ عمر خیام کے مرتب کیے ہوئے کیلنڈر میں تین ہزار سات سو ستر سال میں ایک دن کا فرق پڑے گا۔

عمر خیام کا انتقال چوراسی سال کی عمر میں 1122ء میں ہوا۔ 1128ء میں محمد عرفی نے تین سو فارسی شعراء کے تذکرہ پر مشتمل ایک کتاب تالیف کی۔ اس میں عمر خیام کا نام نہیں ملتا جس کے معنی ہیں کہ وہ اپنے معاصرین کی نظر میں شاعر نہ تھا۔ عمر خیام کی رباعیوں کا سب سے پرانا قلمی نسخہ آکسفورڈ کے کتب خانہ بوڈلین (Bodlein Library Oxford) میں محفوظ ہے۔ اس میں 158 رباعیاں ہیں۔ ان میں سے بہت سی تحقیق کے بعد دوسروں کی ثابت ہوئی ہیں۔ کچھ ابو سعید کی ہیں۔ ایک ابن سینا کی ہے۔ اس لیے چند کے علاوہ ان رباعیوں کو عمر خیام کی رباعیاں نہیں کہا جا سکتا۔ 1859ء میں فٹز جیرالڈ (Fitzgerald) نے پچھتر رباعیوں کا ترجمہ کیا جن کی بدولت یہ ایرانی ریاضی داں بہت بڑا شاعر مشہور ہوگیا۔ اب بہت کم لوگ اسے بڑے سائنس داں کی حیثیت سے جانتے ہیں یہ زمانہ کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔

عمر خیام کے بارے میں ایک افسانہ بھی گھڑا گیا ہے یعنی یہ کہ وہ اور حسن بن صباح اور نظام الملک ہم سبق تھے اور انہوں نے عہد کیا تھا کہ بڑے ہوکر ایک دوسرے کے بھلے برے حال میں شریک رہیں گے۔ نظام الملک 1017ء میں پیدا ہوا تھا اور عمر خیام 1038ء میں۔ حسن بھی نظام الملک کے بہت بعد پیدا ہوا تھا یوں ان کا ہم سبق ہونا قرین قیاس نہیں۔ عمر خیام اور حسن بن صباح کی وفات کا سنہ بالترتیب 1122ء اور 1124ء ہے۔ نظام الملک 1092ء میں چوہتر برس کی عمر میں قتل ہوا تھا۔

جو کچھ ول ڈیوراں (Will Durant) نے مسلمان سائنس دانوں کے بارے میں لکھا ہے وہ کہیں بہت مختصر اور ناکافی ہے اور کہیں بے جا تفصیلات سے بوجھل ہے۔ دوسرے ول ڈیوراں نے

بہت سے حکما کا ذکر دوبارہ بلکہ تین بار کیا ہے اور کچھ صف اول کے حکما مثلاً جابر بن حیان ' ابوالوفا ' ابومعشر ' ابوکامل ' ابراہیم ابن سنان ' ابن یونس ' علی ابن عیسیٰ الکرخی ' ابوالقاسم اور ابوالفدا کا ذکر نہایت اختصار سے کیا ہے ۔ نیز کچھ بڑے سائنس دانوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے ۔ یہ عظیم سائنس داں اس کے مستحق ہیں کہ ان کے کارناموں کی وضاحت بہ تفصیل کی جائے اور اس وضاحت کا صحیح مقام وہی ہوگا جہاں ان کا ذکر پہلی بار آئے ۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ول ڈیوراں کے ساتھ ساتھ سارٹن اور امیر علی کی رائے بھی درج کر دی جائے ۔ اطبا اور وہ ماہرین ہیئت و ریاضی جن کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے چند حکما پر سارٹن اور امیر علی کی رائے کا اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ اس کے ساتھ ان اطبا اور ماہرین ہیئت و ریاضی کا ذکر بھی کیا جائے گا جن کو ول ڈیوراں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

جارج سارٹن نے اپنی گراں قدر تصنیف "مقدمہ تاریخ و سائنس" (Introduction to the History of Science) میں چودھویں صدی عیسوی کے آخر تک کے تمام دنیا کے علوم و فنون کا ذکر بھی کیا ہے ۔ چنانچہ اس کتاب میں اسلام اور دیگر مذاہب کی اہم شخصیتوں کا ذکر بھی درج ہے ۔ سارٹن نے ہر صدی کو دو نصف صدیوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر نصف صدی کو اس عہد کے اہم ترین عالم سے منسوب کیا ہے ۔ سات نصف صدیاں مسلمان اہل علم سے منسوب ہیں اور ان کے ساتھ کسی اور کو منسلک نہیں کیا ۔ آخری چھ نصف صدیوں کو تین تین عالموں سے منسوب کیا ہے جن میں سے ایک مسلمان ' ایک عیسائی اور ایک یہودی ہے ۔ اس طرح مسلمان اہل علم تیرہ نصف صدیوں میں امتیازی حیثیت کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔ ان تیرہ نصف صدیوں کی اہم شخصیتیں یہ ہیں:

1- آٹھویں صدی کی دوسری نصف صدی کو ابوموسیٰ جابر ابن حیان (Geber) سے منسوب کیا ہے۔

2- نویں صدی کی پہلی نصف صدی کو ابو عبداللہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی (Algoritmi) سے منسوب کیا ہے۔

3- نویں صدی کی دوسری نصف صدی کو ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی (Rhazes) سے منسوب کیا۔

4- دسویں صدی کی پہلی نصف صدی کو ابوالحسن ابن الحسین ابن علی المسعودی سے منسوب کیا۔

5- دسویں صدی کی دوسری نصف صدی کو ابوالوفا محمد ابن محمد ابن یحییٰ ابن اسمعیل ابن عباس الجرجانی سے منسوب کیا۔

6- گیارہویں صدی کی پہلی نصف صدی کو ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی سے منسوب کیا۔

7- گیارہویں صدی کی دوسری نصف صدی کو ابوالفتح عمر ابن ابراہیم الخیامی غیاث الدین (عمر خیام

سے منسوب کیا۔

8- بارہویں صدی کی پہلی نصف صدی کو ابومروان ابن زہر اور ولیم (William of Conchesi) اور ابراہام ابن عزرا (Abraham Ibn Ezra) سے منسوب کیا۔

9- بارہویں صدی کی دوسری نصف صدی کو ابوالولید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد (Averroes) اور جیرارڈ (Gerard of Conchesi) اور میمونیڈیز (Maimonides) سے منسوب کیا۔

10- تیرہویں صدی کی پہلی نصف صدی کو ابو محمد عبداللہ ابن احمد ابن علی البیطار (Aben Bethar) اور رابرٹ (Robert Grosseteste) اور Jacobanatoli سے منسوب کیا۔

11- تیرہویں صدی کی دوسری نصف صدی کو محمود ابن مسعود ابن مصلح قطب الدین الشیرازی اور راجر بیکن (Roger Bacon) اور جیکب بن محرر (Jacob Ben Mahrir) سے منسوب کیا۔

12- چودہویں صدی کی پہلی نصف صدی کو ابوالفدا اسمٰعیل ابن علی عمادالدین الایوبی اور لیوی بن گرسن (Levi Ben Gerson) اور ولیم (William of Occam) سے منسوب کیا۔

13- چودہویں صدی کی دوسری نصف صدی کو عبدالرحمٰن ابن خلدون اور جیفری چوسر (Geoffery Chaucer) اور حسدی کرسکس (Hasdai Crescas) سے منسوب کیا ہے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ بارہویں صدی ختم ہوتے ہی علم و حکمت میں مسلمانوں کی پیشوائی ختم ہوگئی ۔ مسلمانوں کے ساتھ دوسروں کے نام شامل کرنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ بارہویں صدی کے بعد کچھ غیر مسلم بھی اس قابل ہو گئے تھے کہ ان کا نام مسلمان حکما کے ساتھ لیا جائے ۔ سارٹن لکھتا ہے کہ بارہویں صدی کے شروع میں عربی میں اچھی استعداد حاصل کیے بغیر ماہر ریاضی بن جانا ممکن نہ تھا ۔ بارہویں صدی میں ریاضی اور ہیئت کی عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ تیرہویں صدی میں عبرانی اور اسپینی زبان میں ترجمے کیے گئے اور اس کے بعد یونانی ماخذ کے لاطینی میں ترجمے ہوئے ۔ مغرب نے مشرق کے علوم کو اپنا کر رفتہ رفتہ ترقی کی ۔ تیرہویں صدی میں صرف چار قابل ذکر ریاضی داں یورپ نے پیدا کیے مگر تیرہویں صدی میں علم ہندسہ کی ترقی تمام تر مسلمانوں کی بدولت ہوئی ۔ حسن المراکشی اور نصیرالدین الطوسی اور اس کے شاگرد محی الدین المغربی نے علم ہندسہ کو جو فروغ دیا اس کے آگے لاطینی علم ہندسہ بے جان نظر آتا ہے ۔ سارٹن اعتراف کرتا ہے کہ تیرہویں ' چودہویں ' پندرہویں اور سولہویں صدی میں بھی مسلمانوں میں بڑے بڑے سائنس داں پیدا ہوئے البتہ ان کی غیر متنازعہ پیشوائی ہر صدی میں کم ہوتی گئی ۔ بالآخر سترہویں صدی سے یورپ کی پیشوائی کا دور شروع ہوا۔

ابتدائی سات نصف صدیوں میں دنیا بھر کی سائنس اور ترقی یافتہ علوم کی واحد زبان عربی تھی ۔ قرآن کی زبان کا علم و حکمت کی زبان بن کر تین چار سو سال تک معلّمی کے فرائض ادا کرنا اس

زبان کی ہمہ گیری کا بین ثبوت ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ "اس عرصے میں اختراعی و تخلیقی اہلیت رکھنے والے علما و حکما کی تعداد دور حاضر کے علما و حکما سے کم نہ تھی۔ مسلمانوں میں ایسے عظیم و جلیل القدر اہل علم پیدا ہوئے۔ جن کے اسمائے گرامی سے علمی تاریخ ہمیشہ درخشاں رہے گی۔ یورپ کے ماہرین قرون وسطیٰ کا یہ خیال کہ قرون وسطیٰ میں علم و حکمت کا چراغ گل تھا اور علمی دنیا میں ظلمتیں طاری تھیں ان کی جہالت کی دلیل ہے۔ دراصل قرون وسطیٰ تاریک نہ تھے بلکہ یہ ان حضرات کی جہالت کی تاریکی ہے جو قرون وسطیٰ کے نور علم کو نہیں دیکھ سکتی۔ یہ مشرق کا نور علم ہی تھا جس نے مغرب کو منور کیا۔ ہم انہیں کے چھوڑے ہوئے ورثہ کے وارث ہیں۔ اگر ہمارے مورث اہل ہوتے تو ہم دفعتاً کیونکر رموز فطرت کے راز داں بن جاتے"۔

سید امیر علی نے اپنی مشہور عالم تصنیف "Spirit of Islam" میں جس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اور مسلمانوں کی مختصر تاریخ (A Short History of the Saracens) میں جو انیسویں صدی کے اواخر میں شائع ہونے کے بعد بارہا چھپ چکی ہے، مسلمانوں کے شاندار علمی کارناموں کے سلسلہ میں جو کچھ عیسائیوں کی علم دشمنی اور جہالت کے بارے میں لکھا ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تاریکی کے کیسے مہیب قعر مذلت میں تھے۔ امیر علی اپنی کتاب (اسپرٹ آف اسلام) میں لکھتے ہیں:

بحر ظلمات کے سواحل سے بحر ہند تک بلکہ بحر الکاہل تک مسلمانوں کی تخلیقی تحریک اور قیادت کے تحت وجود میں آنے والے علم و فلسفہ کا ہر جگہ آوازہ بلند ہوا جو تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تاراجی تک قائم رہا۔ اس طویل مدت میں عیسائیت کی دنیا میں علم کو جادو ٹھیرا کر لائق تعزیر قرار دیا گیا تھا۔ شہنشاہ قسطنطین (جو سب سے پہلا عیسائی حکمران تھا) کے اور اس کے متعصب جانشینوں کے عہد میں وہ کتب خانے جو پچھلے شہنشاہوں نے صرف کثیر سے بنائے تھے یا تو منہدم کر دیئے گئے یا ان کی کتابیں تتر بتر کر دی گئیں۔ تحصیل علم کو محض جادو گری ہی نہیں بلکہ بغاوت کے مترادف ٹھیرایا۔ علم سے متنفر کرنے کے لیے کلیسا کے علمبرداروں نے یہ مقولہ رائج کیا کہ "جہالت زہد کی ماں ہے" پوپ گریگری اعظم (Gregory the Great) نے جس نے بادشاہوں سے کلیسائی برتری منوائی، روم میں سائنس کی تعلیم ممنوع کر دی اور جو عظیم کتب خانہ آگسٹس سیزر (Augustus Caesar) نے قائم کیا تھا اسے جلوا دیا اور ولیوں کی ہڈیوں اور تبرکات کی پرستش ضروری ٹھیری۔ یہ اساطیری عیسائیت یورپ پر صدیوں مسلط رہی۔

یورپ کے سب سے بڑے مورخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) نے اپنی تصنیف "رومی شہنشاہیت کا زوال اور خاتمہ" (The Decline and Fall of the Roman Empire) میں

ان وحشیانہ مظالم کی طویل داستان بیان کی ہے جو قسطنطین کے عیسائی ہو جانے اور عیسائیت کے برسر اقتدار آ جانے کے بعد کلیسا اور اس کے علما نے غیر عیسائی باشندوں پر توڑے۔ ان کی عبادت گاہوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے علمی خزانے بھی بے دریغ تباہ کر دیئے۔ اس طویل داستان کے صرف دو مندرجہ ذیل واقعات یہ جاننے کے لیے کافی ہیں کہ غیر عیسائی باشندوں کے ساتھ کیا برتاؤ روا رکھا گیا۔

اسکندریہ کے اسقف اعظم تھیوفیلس (Theophilus) کا یہ دیکھ کر کہ مصر میں بسے ہوئے یونانی اپنے دیوتا سیراپس (Serapis) کا نہایت احترام کرتے ہیں، خون کھولتا ہے۔ وہ پہلے ہی بیکس (Bacchus) کے مندر کی بے حرمتی کر چکا تھا۔ اس لیے سیراپس کے پوجنے والوں کو یقین ہوگیا کہ اسقف ان کے دیوتا کی بڑی گت بنائے گا .... ان کے فلسفی المپیس (Olympius) نے تلقین کی کہ اپنے دیوتاؤں کے مندر کی حفاظت میں اگر انہیں جان دینی پڑے تو بے دریغ دے دو۔ یہ لوگ سیراپس کے مندر میں قلعہ بند ہو گئے اور حملہ آوروں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مجسٹریٹ نے دونوں فریقوں میں یہ کہہ کر عارضی صلح کرا دی کہ اس معاملہ میں شہنشاہ تھیوڈوسیس (Theodosius) سے رجوع کیا جائے گا۔ وہاں کے حکم کا انتظار کیا جائے۔ جب حکم آیا تو فریقین ایک چوک میں جمع ہوئے شہنشاہ کا حکم تھا کہ بت پرستوں کے بت منہدم کر دیئے جائیں۔ اسقف نے خود سیراپس کے مندر کا انہدام اپنی نگرانی میں شروع کیا۔ مندر کی بنیادیں بہت مضبوط تھیں جو کھودی نہ جاسکیں۔ عمارت منہدم کر کے وہاں گرجا تعمیر کیا گیا۔ اسکندریہ کا گراں بہا کتب خانہ (جس کا ایک حصہ جولیس سیزر کے زمانے میں جل گیا تھا) بالکل برباد کر دیا۔ صرف خالی الماریاں رہ گئیں۔ سونے چاندی کی مورتیاں پگھلا کر اسقف نے رکھ لیں اور جو مورتیاں کم قیمت دھاتوں کی تھیں وہ توڑ پھوڑ کر سڑکوں پر بکھیر دی گئیں۔ سیراپس کا بت بہت بڑا تھا۔ سیڑھیاں لگا کر اسے کلہاڑیوں سے توڑا گیا اور بت کے مختلف حصوں کو گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرے اور پھر ان کو جلا دیا۔

دوسرے واقعہ کا ہیرو تھیوفیلس کا بھتیجا سیرل (Cyril) اپنے چچا کی وفات پر اسکندریہ کا اسقف اعظم بنا۔ اسے یہودیوں سے سخت دشمنی تھی۔ یہودی اسکندریہ میں جب سے یہ شہر وجود میں آیا تھا رہتے اور ان کی تعداد سات سو سال کی مدت میں چالیس ہزار ہوگئی تھی۔ ایک دن سورج نکلنے سے پہلے سیرل ایک بڑا ہجوم لے کر یہودیوں کی عبادت گاہ پر ٹوٹ پڑا۔ نہتے اور بے خبر یہودی اس اچانک حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بہت سے مارے گئے۔ ان کی عبادت گاہیں منہدم کر دیں اور ان کا سامان لوٹ لیا گیا۔ پریفکٹ اورسٹیز (Prefect Orestes) نے شہنشاہ کو اطلاع دی مگر سیرل کو کوئی سزا نہیں ملی۔ سیرل کے غنڈوں نے اورسٹیز کو ہلاک کر دیا۔ ایک نہایت تعلیم یافتہ اور حسین یونانی لڑکی جس کا نام ہیپیشیا (Hypatia) تھا، ریاضی اور فلسفہ پر اسکندریہ میں لکچر دیا کرتی تھی۔ اس کے علم اور حسن کی

شہرت ہوئی اور بڑے بڑے امیروں نے شادی کے پیام دیئے مگر اس نے ازدواجی زندگی اس ڈر سے پسند نہیں کی کہ شادی کے بعد وہ تعلیم دینے کا مفید کام جاری نہ رکھ سکے گی۔ اس کے لیکچر سننے کے لیے بہت لوگ آتے اور اس کی اکیڈمی کے دروازے پر گھوڑوں اور گاڑیوں کا ہجوم رہتا۔ وہ افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ پڑھاتی۔ کلیسا کو فلسفہ سے بیر تھا۔ ہیپشیا کی بڑھتی ہوئی ہردلعزیزی اسقف سیرل نہ برداشت کر سکا۔ چنانچہ اس نے اپنا فرض منصبی سمجھا کہ بے دین فلسفیوں کے خیالات کو ترویج دینے والی اس لڑکی کو ایسی سزا دے جو دوسروں کے لیے عبرت ہو۔ ایک دن جب ہیپشیا اپنی گاڑی میں جا رہی تھی اسے گھسیٹ کر زمین پر گرا دیا۔ اس کے کپڑے اتار کر ننگا کر دیا۔ اسے گھسیٹتے ہوئے گرجا لے گئے جہاں اسے نہایت سفاکی سے قتل کیا اور سیپیوں سے کھرچ کر گوشت کو ہڈیوں سے جدا کر کے اس کے اعضا کو نذر آتش کر دیا۔

کوئی تعجب نہیں کہ جب تک یورپ میں کلیسا کا اقتدار رہا وہاں بربریت اور جہالت کا دور دورہ رہا۔ ایسی علم دشمنی اور شقاوت کا نتیجہ ظلمت اور تنگ دلی کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ چونکہ یورپ والوں کو مذہب سے منحرف ہونے کے بعد ہی علم حاصل کرنے کی آزادی میسر ہوئی اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اہل علم نے بھی اسلام سے منحرف ہو کر ہی علم و حکمت کے زریں کارنامے انجام دیئے ہوں گے۔ امیر علی نے "اسپرٹ آف اسلام" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دس بارہ حدیثیں نقل کی ہیں جن میں حصول علم کی تلقین کی گئی ہے۔ امیر علی کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے میدان علم میں جو کچھ تگ و دو کی وہ اسلام سے برگشتہ ہو کر نہیں بلکہ اپنے رسول کے احکام کی تعمیل میں کی۔

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے یونانیوں کی جو سائنس تھی وہ ایک ملغوبہ تھی جس میں کھرا اور کھوٹا دونوں گڈمڈ تھے۔ سائنس کو کثافتوں سے مسلمانوں نے پاک کیا۔ یونانیوں نے جوتش جیسے بے بنیاد علم کی ترقی و ترویج پر اپنی ذہنی قوتیں صرف کر کے اس جعلی علم کی اس قدر ساکھ بڑھا دی تھی کہ وہ حقیقی سائنس سمجھا جانے لگا تھا جس سے سائنس کو کافی نقصان پہونچا۔ مسلمانوں میں بھی یونانیوں کی تقلید میں جوتش نے رواج پایا مگر انہوں نے علم ہیئت کو فروغ دے کر اس کی اہمیت کو بڑی حد تک کم کر دیا۔ مسلمانوں نے ریاضی، فلکیات، کیمیا، طبیعیات، صنعت و حرفت، جغرافیہ اور طب میں غیر معمولی اکتشافات کیے۔ یونانی فلسفہ کا انحصار واقعات کی عقلی توجیہ پر تھا۔ مگر جو نتائج وہ اخذ کرتے تھے وہ بسا اوقات غلط ہوتے۔ مسلمانوں نے سائنس کے صحیح طریق کار پر عمل کر کے قیاس آرائی سے گریز کیا جس کی بدولت انہیں علم و حکمت میں دنیا کی پیشوائی میسر ہوئی۔ ساڑھے تین سو سال تک اس پیشوائی میں کوئی اور ان کا شریک نہ تھا۔ ان کی زبان سیکھنا سائنس سیکھنے کے لیے ضروری ہوگیا۔ عیسائیوں اور یہودیوں نے عربی پڑھی اور مسلمانوں کے علوم بارہویں اور تیرہویں صدی میں اپنی زبانوں میں منتقل کیے جس نے انہیں اس قابل بنایا کہ سائنس دانوں کی

صف میں کھڑے ہو سکیں۔

اسلامی علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت نے جس گہوارہ میں پرورش پائی وہ عراق العرب یعنی عراقی زیریں (Emirljwrroo Mesopot) بغداد، بصرہ اور کوفہ میں جو مسلمانوں کے بسائے ہوئے شہر تھے علمی سرگرمی بڑی تیز رفتاری سے پھیلتی گئی۔ باوجودیکہ عربی زبان اس سے پہلے علم و حکمت (یعنی فلسفہ) کی زبان نہ تھی۔ علم کے شیدائیوں نے علم کے پرانے خزانے اس زبان میں بہت جلد منتقل کر لیے۔ اس غرض کے لیے خود مسلمانوں نے یونانی زبان سیکھی اور ایسے عیسائیوں اور یہودیوں سے مدد لی جو یونانی زبان سے واقف تھے۔ عیسائیوں میں حنین ابن اسحاق خاص طور پر اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔ ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ اس نے جالینوس (Galen) اور اس کے متبعین کی سو کتابوں کا ترجمہ سریانی اور تیس کا ترجمہ عربی میں کیا۔ اس کے علاوہ افلاطون، ارسطو اور دیگر یونانی حکماء کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس صلہ میں خلیفہ المامون نے کتابوں کے وزن کے برابر سونا دیا اور خلیفہ المتوکل نے اسے اپنا طبیب مقرر کیا مگر اس خطا پر کہ کل کے ایک دشمن کے لیے زہر تیار کر کے نہیں دیا، اسے سات سال تک قید میں رکھا۔ سارٹن نے حنین کے قید میں رہنے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ لکھا ہے کہ المتوکل نے جو دارالترجمہ قائم کیا تھا حنین کو اس کا دبیر (Director) مقرر کیا۔ حنین نے جالینوس کی کتاب "ارس پروا" (Ars Parva) پر مقدمہ لکھا جو ازمنہ وسطیٰ میں بہت مقبول ہوا۔ ابن اسحاق حیرہ میں 809ء میں پیدا ہوا تھا اور 877ء میں اس کا انتقال ہوا۔ حنین ابن اسحاق، سیبویہ (Sibaihi) (جس نے سب سے پہلے عربی زبان کی قواعد لکھی) کا شاگرد تھا۔

مترجموں کے علاوہ ابتدا میں کچھ غیر مسلم مہندس، ریاضی و ہیئت داں اور طبیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ماشااللہ نے (جسے سارٹن یہودی بتاتا ہے مگر جس کا ذکر امیر علی نے عرب ماہرین ہیئت کے ساتھ کیا ہے) النوبخت کے ساتھ مل کر بغداد کی تعمیر کے سلسلہ میں زمین کی پیمائش کی۔ ثابت بن قرہ جو عالم فلکیات تھا، عیسائی تھا۔ اس کا بیٹا سنان مسلمان ہوگیا اور اس کا پوتا ابراہیم ابن سنان ابن ثابت دسویں صدی میں بہت بڑا ریاضی داں ہوا۔ ہارون اور مامون کا طبیب بختیشوع عیسائی تھا۔ یہ وہ ابتدائی دور تھا جس میں مسلمان تحصیل علم کر رہے تھے اور ہر اہل علم کی فراخ دلی سے قدر کرتے تھے۔ بہت جلد انہوں نے سائنس کی ہر صنف میں اپنا مقام بنا لیا اور ان میں بڑے نامور حکما پیدا ہوئے

ایک ایرانی یہودی ابوعبیدہ نے عربوں کے خلاف شعوبی تحریک اٹھائی۔ عبدالملک ابن قریب الاصمعی نے اس کی مذمت کی۔ الاصمعی 739ء میں پیدا ہوا اور 832ء میں اس کا انتقال ہوا۔ سارٹن کی رائے میں الاصمعی اپنے عہد کا سب سے زیادہ ذی علم شخص تھا۔ وہ علم حیوانات اور تشریح

میں یدطولیٰ رکھتا تھا اور عربی النسل تھا ۔ مشہور مفسر قرآن ابو القاسم محمد ابن عمر الزمخشری نے بھی شعوبیہ تحریک کی مذمت کی۔

عربوں کے متعلق اکثر مصنفین نے یہ غلط نظریہ پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ ان میں الکندی کے علاوہ کوئی بڑا فلسفی ، سائنسداں یا صاحب علم نہیں ہوا ۔ رینان (Renan) مشہور فرانسیسی مصنف نے اپنے لکچر میں کہا کہ "یہ بات قابل غور ہے کہ فلسفیوں اور اہل علم میں جو عربی کہلاتے ہیں ، ان میں صرف ایک الکندی عربی النسل تھا ، باقی سب ایرانی ، ماوراء النہری ، اسپینی یا بخارا ، سمرقند ، قرطبہ اور اشبیلیہ کے باشندے تھے ، وہ نہ نسلی اعتبار سے عرب تھے اور نہ ذہنی اعتبار سے ۔ اس دعویٰ کو امیر علی نے بے بنیاد کہہ کر اپنی کتاب میں پرزور تردید کی ہے ۔ اس نے کہا ہے کہ "تاریخ الحکماء" یا ایسی کسی اور کتاب پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ واضح ہو جائے گا کہ عظیم اور متبحر ارباب علم میں عربوں کی ایک بڑی تعداد ہے ۔ امیر علی نے چند نام ایسے جلیل القدر ہستیوں کے درج کیے ہیں وہ یہ ہیں:

جابر ابن حیان جو علم کیمیا کا سب سے پہلا ماہر و عالم ہے ۔ وہ امام جعفر صادق کا شاگرد تھا ۔ امام مذکور خود اس علم کے عالم تھے ۔ انہیں کے جمع کردہ مواد کو جابر نے استعمال کیا۔

الکندی عظیم فلسفی ہونے کے علاوہ ریاضی ، ہیئت ، طبیعیات ، طب ، دواسازی ، جغرافیہ اور موسیقی میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔

یحییٰ بن علی منصور فلکیات کا عالم تھا ۔ اس نے اور چند اور ہیئت دانوں نے خلیفہ مامون کے لیے زیچ تیار کی جو مصدقہ زیچ کہلاتی ہے۔

علی ابن یونس بہت بڑا ماہر فلکیات تھا اس نے جو زیچ بنائی وہ زیچ الاکبر الحاکمی کے نام سے مشہور ہے۔

الجاحظ فلسفی اور ماہر علم حیوانات تھا اس نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔

ابن باجہ (Avenpace) بہت بڑا فلسفی ، طبیب ، ریاضی و ہیئت کا عالم اور موسیقی کا ماہر تھا۔

ابن زہر (Avenzoar) بہت بڑا طبیب تھا ۔ اس کے والد اور دادا بھی نامور طبیب تھے۔

الخلیل ابن احمد عربی زبان کی قواعد کا ماہر تھا۔

ابن بش کوال (Bush - Kuwal) مورخ اور فلسفی تھا۔

المسعودی حضرت عبداللہ بن مسعود کی اولاد میں سے تھا ۔ وہ بہت بڑا مورخ ، سیاح اور جغرافیہ داں تھا۔

ابن الاثیر کی تاریخ "الکامل" دور حاضر کی بہترین تاریخوں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔

الماوردی ماہر اقتصادیات و ماہر قانون تھا ۔ اس کی تصنیف "کتاب الاحکام السلطانیہ" سیاست پر اہم تصنیف ہے۔

شریف المرتضیٰ حضرت امام علی الرضا کی اولاد میں سے تھا ۔ اپنے عہد کا عالم متبحر تھا۔

اسامہ سیاستدان ، فلسفی اور شاعر تھا۔

ابن طفیل اندلوسیہ کا بہت مشہور طبیب ، ریاضی داں ، فلسفی اور شاعر تھا اور ابن خلدون جلیل القدر مورخ۔

یہ پندرہ سولہ نام امیر علی نے اپنے حافظہ سے سرسری طور پر لکھ دیئے ہیں ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ لاتعداد عربی النسل عالم و فاضل گزرے ہیں۔

پچھلے چند صفحوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان سائنس دانوں اور اہل علم کا مجموعی خاکہ ذہن نشین ہو جائے ۔ اس کے بعد ان اطبا اور ریاضی و ہیئت دانوں کا ذکر کیا جائے گا جن پر ول ڈیوراں نے ان کے مرتبہ کے مطابق بحث نہیں کی یا جنہیں اس نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے ۔ سارٹن کی رائے پہلے درج کی جائے گی اور اگر ضروری ہوا تو امیر علی کے بھی کچھ جملے اضافہ کر دیئے جائیں گے۔

ابو القاسم جسے یورپ والوں نے Abulcasis اور Albucaeis کے نام دیئے ہیں ، زہرا

کا رہنے والا تھا جو قرطبہ کے قریب واقع ہے۔ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا ماہر جراحی تھا۔ اس کی کتاب "التصریف" تیس حصوں پر مشتمل تھی۔ اس نے تقطیر (Distillation) اور تصعید (Sublimation) کے ذریعہ دوائیں تیار کرنے کے بہت دلچسپ طریقے بیان کیے ہیں۔ وضع حمل اور آنکھوں اور دانتوں کے علاج میں جو جراحی عمل کئے جاتے تھے ان کی تفصیل دی ہے اور علم طب کی ہر صنف پر محققانہ بحث کی ہے۔ اس نے ان تمام آلات کی تصویریں اپنی کتاب میں شامل کی ہیں جو جراحی میں استعمال ہوتے تھے۔ امیر علی کہتا ہے کہ ان آلات کو دیکھ کر اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے جراحی میں کس قدر ترقی کی تھی۔

علی ابن عیسیٰ کی تصنیف "تذکرۃ الکحالین" (Manual for Oculist) علم العین (Ophthalmology) پر عربی میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کی تین جلدیں تھیں۔ حسن اتفاق سے تینوں زمانہ کی دستبرد سے بچ رہیں۔ علم العین پر یہ ایک نہایت جامع اور مبسوط کتاب ہے۔ اس کی پہلی جلد آنکھوں کی ساخت (Anatomy) اور عمل اعضاء (Physiology) پر ہے۔ دوسری جلد ان امراض سے بحث کرتی ہے جو نمایاں ہوتے ہیں۔ تیسری جلد میں آنکھ کے مخفی امراض اور ان کے علاجوں کا بیان ہے۔ اس کتاب میں آنکھ کے ایک سو تیس امراض کی کیفیات بیان کی ہیں اور ایک سو تینتالیس دواؤں کی خاصیتیں بتلائی ہیں۔ یورپ میں یہ کتاب لاطینی اور عبرانی ترجموں کے توسط سے بہت مقبول ہوئی۔ علی ابن عیسیٰ مسلمانوں کا سب سے نامور معالج امراض چشم (Oculist) تھا۔

ابو مروان ابن زہر (Avenzoar) طبیبوں کے خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان میں چھ پشتوں سے متواتر اطبا ہوئے۔ یہ قبیلہ عدنان کا عربی خاندان تھا جو اندلس میں آبسا تھا۔ ابو مروان کا دادا عبدالملک نامور طبیب تھا وہ تشخیص امراض کے لیے مشہور تھا۔ اس نے قیروان اور قاہرہ میں طبابت کی۔ ابو مروان کے والد ابوالعلاء نے طبابت میں عبدالملک سے زیادہ شہرت حاصل کی اور وہ اشبیلیہ (Seville) کے عبادی بادشاہ المعتمد کا طبیب مقرر ہوا۔ جب بربر بادشاہ یوسف ابن تاشفین نے جو مرابطینی (Almoravide) خاندان سے تعلق رکھتا تھا، المعتمد کو 1091ء میں شکست دے کر اشبیلیہ کی سلطنت حاصل کی تو ابن تاشفین نے اسے اپنا وزیر بنا لیا۔ یورپ والوں نے اس کے نام الوزیر ابوالعلاء زہر کو بگاڑ کر Alguazir Albubizor کر دیا۔ اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ "کتاب الخواص"، "کتاب الادویہ مفردہ"، "کتاب الایضاح الجربات"، "کتاب النکات الطبیہ"۔ اس کی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔

ابو مروان ابن زہر اپنے عہد کا سب سے نامور طبیب تھا۔ اس نے اپنے باپ اور دادا کو شہرت کے میدان میں بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ مرابطین دربار سے وابستہ رہا۔ جب موحدین نے مرابطین

کو شکست دے کر سلطنت حاصل کی تو وہ ان کے بادشاہ عبدالمومن کا طبیب اور وزیر مقرر ہوا۔ سارٹن کے خیال میں ابن زہر الرازی کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا معالج تھا۔ وہ عام اطبا کی طرح نظریہ پرست نہ تھا بلکہ تجربیت (Epmiricism) کا قائل تھا۔ اس نے چھ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے تین اب بھی موجود ہیں۔ ان تینوں میں سب سے اہم "کتاب التیسیر فی المواداۃ و التدبیر" ہے۔ اس نے تیسیر (Taisir) اپنے دوست ابن رشد کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ علم الامراض (Pathology) اور معالجات (Therapeutics) پر سیر حاصل بحث کرتی ہے۔ اس میں انتڑیوں کی دق Intestinal) (Pthisis، حلق کے فالج (Pharyngeal Paralysis)، دل کی جھلی کی بیماری (Pericarditis) پھیپھڑوں کی جھلی اور تھوں کی رسولی (Mediastinal Tumour) درمیانی کان میں سوزش اور آماس، اور خارش (Scabies) وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور آخر میں ایک قرابادین (Antidotary) بھی شامل کی ہے۔ ایسے مریض کے لیے جسے غذا پہونچانا دشوار ہو وہ حلق کی نالی میں شگاف دینے (Tracheotomy) کا عمل کرتا تھا۔ وہ اکثر امراض میں فصد کھولنے (Venesection) کو مفید سمجھتا اور اس علاج پر زور دیتا۔ اس کی دو اور کتابیں "کتاب الاقتصاد فی اصلاح النفس و الاجساد" اور "کتاب الاغذیہ" ہیں۔ کتاب الاقتصاد میں منجملہ اور موضوعات کے علم النفس (Psychology) سے بحث کی گئی ہے اور کتاب الاغذیہ غذاؤں کے متعلق ہے۔ ابن زہر کی کتابیں لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ کی گئیں، اور سترہویں صدی کے آخر تک یورپ ان سے مستفید ہوتا رہا۔ ابن زہر کا بیٹا ابو بکر محمد بھی جو الحفید کے نام سے مشہور ہوا ایک اچھا طبیب اور شاعر تھا۔ اس نے امراض العین پر کتاب لکھی تھی۔ ابن زہر کا پوتا ابو محمد عبداللہ ابن الحفید بھی قابل تھا اور دربار موحدین سے وابستہ تھا۔

ابن زہر کا پرپوتا ابوالعلاء ابن ابو محمد عبداللہ بھی اچھا طبیب تھا۔

ابن زہر کی بیٹی اور پوتی نے قابلہ گری (Obstetrics) یعنی وضع حمل کرانے کی تعلیم حاصل کی۔

امیر علی کا خیال ہے کہ ابن زہر پہلا شخص ہے جس نے حلق کی نالی میں شگاف دینے کا مشکل عمل جراحی اختیار کیا۔ اس سے قبل ابن رشد (Averroes) کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ اس کی کتاب "کلیات" (جس کے لاطینی ترجمہ کا نام کلیات کو بگاڑ کر Colliget رکھا گیا ہے) ابن سینا کی تصنیف "قانون" کے مقابلے کی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ "قانون" کے آگے علم طب کی تمام کتابیں کم مایہ نظر آتی ہیں۔ ابن سینا کے ذکر میں سارٹن لکھتا ہے کہ "قانون" کے آگے الرازی، علی ابن عباس اور خود جالینوس کی تصانیف ماند پڑ گئیں۔ ول ڈیوراں، الرازی کو معالج کی حیثیت سے ابن سینا سے بڑا مانتا ہے۔ مگر الرازی کی "الحاوی" پر ابن سینا کی تصنیف "قانون" کو ترجیح دیتا ہے۔

ابن رشد نے علم ہیئت پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "کتاب فی حرکات الفلک" ہے اور المجسطی کی تلخیص (Summary) بھی شائع کی تھی۔ تلخیص کا ترجمہ 1231ء میں عبرانی میں کیا گیا۔

ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات کی بنا پر مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں نے اسے قابل ملامت سمجھا۔ پچھلی بحث میں بتایا جا چکا ہے، خلیفہ یعقوب المنصور کو لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ابن رشد کو جلاوطن کرنا پڑا تھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد واپس بلا لیا تھا۔ لیکن واپس آنے کے تھوڑے دن بعد 1198ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یورپ میں اس کی مخالفت مدتوں جاری رہی۔ 1210ء میں پیرس میں ایک صوبائی کونسل نے ابن رشد اور ارسطو کے پڑھنے پڑھانے کو جرم قرار دے دیا۔ 1231ء میں ایک حکم نافذ کیا کہ ان کتابوں سے وہ تمام حصے نکال دیئے جائیں جو غیر مذہبی نقطہ نظر کے حامل ہوں۔ سینٹ ٹومس اکیونس (St. Thomas Aquinas) نے جو 1225ء میں پیدا ہوا اور 1274ء میں مرا، ابن رشد کے فلسفہ کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش میں اپنی زندگی کھپائی۔ عیسائیوں میں ٹومس کا وہی مقام ہے جو امام غزالی (1058ء — 1111ء) کا مسلمانوں میں ہے۔ ٹومس، غزالی کے علم الکلام سے بہت متاثر تھا اور اس نے قریب قریب وہی طریقہ اختیار کیا جو غزالی نے یونانی فلسفہ کے خلاف اختیار کیا تھا۔ یہودی علما نے بھی ابن رشد کی مخالفت میں اپنا زور قلم دکھایا۔ مختصر یہ کہ یورپ کے مذہبی حلقوں میں ابن رشد ملحد اعظم اور اہل ایمان کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف آزاد خیال لوگ اسے انسانیت کے لیے رحمت خیال کرتے تھے۔ برابانت کے سیجر (Siger of Brabant) نے پیرس یونیورسٹی میں ابن رشد کے فلسفہ کی حمایت میں ایک تحریک چلائی۔ جس کی تردید میں 1200ء میں سینٹ ٹومس نے ایک رسالہ جس میں ابن رشدیوں کے خلاف اہل فہم و فراست کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیا تھا، لکھا۔ علمائے دین کی سخت مخالفت کے باوجود ابن رشد کا فلسفہ یورپ میں روز بروز مقبول ہوتا گیا۔

نامور اطبا میں سے بہت سوں کا ذکر ول ڈیوراں نے نہیں کیا۔ ایسے اطبا کے بارے میں جارج سارٹن کی رائے درج کی جاتی ہے:

ابوالحسن علی ابن سہل ابن ربان الطبری جو علی الطبری کے نام سے مشہور ہے نویں صدی عیسوی کا مشہور طبیب ہے۔ اس کا باپ سہل ابن ربان یہودی تھا۔ علی الطبری مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف کا نام "فردوس الحکمہ" ہے جس میں علم طب کے علاوہ علم حیوانات (Zoology)، علم الجنین (Embryology)، علم النفس (Psychology)، فلکیات (Astronomy)، موسیمیات (Meterology) اور فلسفہ (Philosophy) سے بھی بحث کی گئی ہے۔ علی الطبری ہی کے زیر تربیت رہ کر اسلام کے سب سے بڑے طبیب ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی نے تحصیل علم طب کی۔ علی الطبری کی تصانیف میں ایک کتاب اسلام اور مسلمانوں کی حکومت کی فضیلت میں بھی ہے۔

سنان ابن ثابت مشہور و معروف طبیب ابوالحسن ثابت ابن قرہ ابن مروان القرانی کا بیٹا تھا۔ سنان نے اپنے والد کا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ وہ طبیب ہونے کے علاوہ اپنے باپ کی طرح ریاضی داں اور ماہر ہیئت بھی تھا۔ وہ بحیثیت طبیب اتنا مشہور ہوا کہ بغداد کے شفاخانوں کا دبیر (Director) مقرر کیا گیا۔ اس نے پیشہ طبابت کا معیار بلند کیا اور اپنے فرائض منصبی بڑی خوبی سے انجام دیئے۔

ابوالحسن احمد ابن محمد الطبری بویہ سلطان رکن الدین کا طبیب تھا۔ اس نے حکیم بقراط (Hippocrates) کے معالجات کا خلاصہ دس جلدوں میں لکھا اور اپنی کتاب کا نام "کتاب المعالجہ البقراطیہ" رکھا۔ اس نے ایسے کیڑے، مثلاً Litch Mite دریافت کیے جو انسان کے جسم سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ پہلا Parasitologist تھا۔ بعد میں ابن زہر نے Litch Mite کا تفصیل سے ذکر کیا۔

علی ابن عباس المجوسی، مجوسی نسل سے ہونے کے باعث مجوسی کہلایا۔ وہ اہواز میں پیدا ہوا اور 994ء میں اس کا انتقال ہوا۔ یہ اپنے عہد کا سب سے بڑا طبیب تھا اور اس کا مسلمان طبیبوں میں بہت اونچا مقام ہے وہ سلطان عضد الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے علم طب میں ایک قاموس لکھی جس کا نام "کتاب الملک" یا "کامل الصناعۃ الطبیہ" تھا۔ اس کا بہترین حصہ وہ ہے جو غذائیات (Dietetics) اور مخزن الادویہ (Materia Medica) سے متعلق ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ المجوسی خون کے نظام شعری (Capillary System) سے واقف تھا۔ اس نے اس امر کا ثبوت فراہم کیا کہ بچے کی ولادت کے وقت رحم میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے جو بچے کو باہر پھینک دیتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ ولادت بچے کی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ابو منصور موفق ابن علی الہری ماہر دواسازی (Pharmacologist) تھا۔ اس نے مخزن الادویہ مرتب کرنے کی غرض سے ایران اور ہندوستان کی مدتوں سیاحت کی۔ کئی سال تک معلومات فراہم کرنے کے بعد اس نے "کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ" بزبان فارسی تحریر کی۔ یہ جدید فارسی نثر کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ اس میں پانچ سو پچاسی دوائیوں کا ذکر ہے جن میں سے چار سو چھیالیس نباتی، پچھتر معدنی اور چوالیس حیوانی ماخذوں سے بنائی جاتی ہیں۔ منصور نے دواسازی کے اصول اور نظریات سے بحث کی ہے اور سوڈیم کاربونیٹ (Sodium Carbonate) اور پوٹاشیم

کاربونیٹ (Potassium Carbonate) کی تفریق کی ہے۔ وہ تانبے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات کو واضح کرتا ہے اور کئی دھاتوں سے بنی ہوئی دواؤں کی خاصیتیں بیان کرتا ہے۔

ابو عبداللہ محمد ابن احمد سعید التمیمی المقدسی چونکہ یروشلم میں پیدا ہوا تھا، اس لیے اس کا لقب المقدسی ہوگیا۔ وہ نقل مکان کرکے مصر میں جابسا۔ اس نے دواسازی میں بہت سے تجربات کیے اور علم طب پر منجملہ "مخزن الادویہ" کے کئی کتابیں لکھیں۔ اس نے مخزن ادویہ نباتات اور دھاتوں پر مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کی تصنیف کا نام "کتاب المرشد الجواہر الاغذیہ و قوالمفردات" تھا۔

غریب ابن سعد الکاتب القرطبی سپین کے اموی خلفا عبدالرحمٰن ثالث اور الحکم ثانی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے علم امراض نسوانی (Gynaecology) پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی اور اس میں حاملہ عورتوں اور نوزائیدہ بچوں کے حفظان صحت کے اصول اور ان کی غذا سے بھی بحث کی اور وضع حمل کے بارے میں ہدایات بتائیں۔

ابو جعفر ابن ابراہیم ابن خالد ابن الجزار الجزیرہ کا رہنے والا تھا اور قیروان میں طبابت کرتا تھا۔ اس کی تصانیف میں "زادالمسافر" سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کا لاطینی، یونانی اور عبرانی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس میں چیچک اور کھسرا کا بیان بڑی وضاحت سے دیا ہے، اس نے مصر میں طاعون پھیلنے کے وجوہ بھی بیان کئے۔

ابو علی احمد ابن محمد ابن یعقوب ابن مسکویہ، بویہ سلاطین معزالدولہ، رکن الدولہ اور عضدالدولہ کے دربار میں طبیب تھا۔ وہ طبیب ہونے کے علاوہ مورخ اور فلسفی بھی تھا۔ اس کی کتابیں عربی میں ہیں گو وہ خود ایرانی تھا۔ اس کی سب سے اہم تصنیف دنیا کی تاریخ موسومہ "کتاب تجارب الامم" ہے۔ اس کی دوسری تصنیف کا نام "کتاب العب والفرس" ہے جس میں حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اخلاقیات پر اس کی کتاب "تہذیب الاخلاق" مشہور ہے۔

ابوالقاسم عمار ابن علی موصلی مصر میں الحاکم (996ء سے 1020ء تک) کے عہد میں تھا۔ وہ بہت بڑا ماہر طبیب العیون (Oculist) تھا۔ اس نے "کتاب المنتخب فی علاج العین" تصنیف کی جس میں بہت سے علاج درج ہیں۔ اس کا وہ حصہ بالخصوص اہم ہے جس میں آنکھ کے علاج کے جراحی طریقے بیان کیے ہیں مثلاً شلال (Cataract) کا آپریشن۔ اس آپریشن کا ایک طریقہ آنکھ کا پانی کھینچنا (Suetion) بھی تھا۔

ریاضی و ہیئت

اس مقالے کے دوسرے ابواب میں علم ریاضی اور علم ہیئت کے سات آٹھ عالموں کا ذکر مختصراً کیا گیا تھا۔ جارج سارٹن کے "مقدمہ تاریخ و سائنس" کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو جن علوم سے انتہائی شغف تھا ان میں ریاضی اور ہیئت سب سے اہم مقام رکھتے ہیں اور ان کے مسلمان ماہرین کی تعداد سینکڑوں پر مشتمل ہے۔ ان سینکڑوں ریاضی و ہیئت دانوں کا ذکر اگر اس مقالے میں کیا جائے تو یقیناً پڑھنے والے اکتا جائیں گے۔ اس لیے ان میں سے بہت سوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ واضح کرنے کے لیے کہ مسلمانوں نے ان علوم میں کیا کیا اضافے کیے اور انہیں کتنی ترقی دی، یہ ضروری ہوگا کہ اس عالم کا جس نے کوئی اضافہ کیا یا کوئی مستند کتاب یا شرح لکھی ہے، ذکر کیا جائے۔ پڑھنے والوں میں سے جو ان علوم کی غیر مانوس اصطلاحات سے گھبرائیں وہ ان سے صرف نظر کرکے صرف اتنا معلوم کرنے پر اکتفا کرلیں کہ فلاں شخص الجبرا کا، فلاں شخص علم مثلث کا، فلاں شخص علم ہندسہ کا اور فلاں شخص علم حساب (Arithmetic) کا ماہر تھا یا فلاں فلاں اشخاص نے فلاں فلاں مشہور کتابیں یا شرحیں لکھیں۔

جن سات آٹھ ریاضی و ہیئت دانوں کا ذکر گزر چکا ہے ان کے بارے میں جہاں ضرورت ہوگی چند جملے اور بڑھا دیئے جائیں گے۔

سب سے پہلا مسلمان ہیئت دان جس نے اصطرلاب بنایا ابراہیم الفرازی تھا۔ اس کا انتقال 777ء میں ہوا۔

محمد بن ابراہیم الفرازی نے اپنے والد (ابراہیم) سے علم ہیئت ورثہ میں پایا۔ عباسی خلیفہ المنصور نے اسے ہندوؤں کی مشہور کتاب "سدھانت" کے ترجمے پر مامور کیا۔ اس ترجمے نے مسلمانوں کو ہندی اعداد (Hindu Numerals) سے روشناس کیا۔ رومی اعداد کے مقابلہ میں مسلمانوں نے انہیں

بہت مفید مطلب پایا اور جیسے جیسے مسلمانوں کی سائنس دنیا میں پھیلتی گئی یہ اعداد بھی دنیا میں رائج ہوتے گئے اور یورپ میں یہ عربی اعداد کہلائے جانے لگے۔

یعقوب ابن طارق بھی کم و بیش اسی زمانہ میں تھا جس میں ابراہیم الفرازی موجود تھا۔ اس نے دائرہ، قوس، اور عمودی خطوط (Sines) پر ایک مستند کتاب لکھی۔ بحیثیت ہیئت داں اس نے اپنے زمانہ میں بہت شہرت حاصل کی۔

ریاضی اور ہیئت میں مسلمانوں نے بہت تھوڑی مدت میں اتنی ترقی کرلی کہ ان کا سب سے بڑا ریاضی داں ابوعبداللہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی (Algoritimi) نویں صدی کے شروع ہی میں منصہ شہود پر آگیا۔ الخوارزمی کا ذکر دوسری قسط میں کیا جاچکا ہے یہاں اتنا اضافہ کرنا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی زیچوں کو دسویں صدی میں مجریت (Madrid) کے ابوالقاسم مسلمہ ابن احمد نے تدوین کرکے شائع کیا تو ان کا 1126ء میں لاطینی میں ترجمہ کیا گیا اور مدت تک یہ زیچیں یورپ میں مقبول رہیں۔ الخوارزمی بہت بڑا ریاضی داں ہونے کے علاوہ ہیئت اور جغرافیہ کا بھی عالم تھا۔ اس نے بطلیموس کے جغرافیہ اور نقشے (صورت الارض) کی تصحیح کی۔

الکندی کا عالم طب کی حیثیت سے ذکر کیا جاچکا ہے۔ وہ علم طب، علم طبیعیات، علم موسیقی اور جغرافیہ میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس کی تصانیف کی تعداد دو سو ستر بتلائی جاتی ہے۔ صرف ہندی اعداد پر اس نے چار کتابیں لکھیں۔ اس نے منطقۃ البروج (Zodiac) کی مناسبت سے موسیقی کے راگ بنانے کا علم ایجاد کیا۔ وہ عربی النسل سائنس دانوں میں سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی تصنیفوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔

احمد ابن عبداللہ المروزی حبش الحاسب مرو کا باشندہ تھا۔ عباسی خلیفہ المامون اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس نے تین طرح کی زیچیں بنائیں جن میں زیچ مصدقہ (Tested Tables) خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ سورج کے ارتفاع سے وقت معلوم کرنے کا طریقہ سب سے پہلے حبش نے دریافت کیا۔ اس کا بیٹا ابوجعفر بھی نامی عالم ہیئت اور آلات ہیئہ کا صناع تھا۔ حبش کا انتقال 874ء کے لگ بھگ ہوا۔

الفرغانی کا ذکر دوسری فصل میں کیا جاچکا ہے۔ یہاں اتنا اضافہ کیا جاتا ہے کہ اس کی موقر تصنیف "کتاب فی حرکات السماویہ وجوامع النجوم" کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی میں کیا گیا جو یورپ میں صدیوں پڑھائی گئی۔ الفرغانی نے زمین کا اور کئی اور سیاروں کے قطر اور ان کے فاصلے

معلوم کیے۔

ابوالطیب سند ابن علی کو خلیفہ المامون نے اپنے ماہرین علم ہیئت کا پیشوا مقرر کیا تھا۔ وہ بہت بڑا ہیئت دان تھا۔ اس نے ثقل نوعی (Specific Gravity) پر بھی تحقیق کی۔ سید امیر علی "اسپرٹ آف اسلام" میں لکھتے ہیں کہ خلیفہ مامون نے زیچ بنانے کا کام سند ابن علی، یحییٰ ابن ابی منصور اور خالد ابن مالک کے سپرد کیا جو اس زمانہ کے نہایت نامور ہیئت داں تھے۔ انہوں نے اپنے مشاہدات کی بنا پر زیچ مصدقہ (Verified Tables) بنائی، ان کے مشاہدات سے جو انہوں نے اعتدالین (Equinoxes) خسوف (Eclipses)، دمدار ستاروں کے نمودار ہونے (Appartions of Comets) اور دیگر فلکی مظاہر کے بارے میں کیے، انسانی معلومات میں گرانقدر اضافہ ہوا۔

ابوعلی یحییٰ ابن ابی منصور کا انتقال 821ء میں ہوا۔ اس نے سند ابن علی اور خالد کی معیت میں زیچ مصدقہ بنائی۔ اس کے پوتے ہارون ابن علی (متوفی 900-1ء) نے بھی زیچ بنائی جو مدتوں استعمال کی گئی۔ ہارون نے کئی ہیئتی آلے بھی ایجاد کیے۔

ابومعشر جعفر ابن محمد ابن عمر البلخی کی پیدائش بلخ میں ہوئی اور وہ سو سال کی عمر میں واسط میں مرا۔ ہیئت دانوں میں وہ یورپ میں سب سے زیادہ مقبول ہوا اور وہاں البومسر (Albumasar) کہلایا۔ اس کی تصنیف "کتاب المدخل الاعلم احکم النجوم" میں علم ہیئت کے علاوہ علم نجوم (Astrology) سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس نے بحری مدوجزر کی علم نجوم کے تحت تشریح کی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس کا یہ نظریہ خاص طور سے یورپ میں بہت مقبول ہوا جو ہیئت داں ابن سیرین کے نام سے مشہور ہے، غالباً ابومعشر ہی تھا۔ ابن سیرین نے علم تعبیر خواب (Oneirology) پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابوعبداللہ محمد ابن جابر ابن سنان البتانی کا دوسری جگہ پر ذکر کیا جاچکا ہے مگر اس میں اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس نے یہ اہم انکشاف کیا کہ بطلیموس کے زمانہ سے اوج آفتاب (Apogee of the Sun) کا طول سولہ درجہ، سینتالیس دقیقہ بڑھ گیا ہے۔ اس انکشاف سے یہ پتہ چلا کہ نقطۃ الراس (مدار کا آفتاب سے قریب ترین نقطہ) اور نقطۃ الذنب (مدار کا آفتاب سے بعید ترین نقطہ) جنہیں انگریزی میں Apsides کہتے ہیں، ساکت نہیں بلکہ متحرک ہیں اور ان کی حرکت سے اوج آفتاب تبدیل ہو جاتا ہے۔ مولانا سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ "اسلامی رصد خانے" میں جو مقالات سلیمان کی جلد دوم میں چھپا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ بتانی کا شمار دنیا کے ان بیس علمائے ہیئت میں ہے جن کی نسبت یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انہوں نے علم ہیئت کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ وہ

فرماتے ہیں کہ رقہ اور انطاکیہ کے دو بڑے رصد خانوں میں بتانی نے بیالیس سال تک ستاروں کا مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدات کی بنا پر ایک کتاب لکھی جس کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ استقبال اعتدالین (Precession of Equinoxes) معلوم کرنے کے علاوہ اس نے کئی اور اہم انکشافات کیے اور شمسی سال کی مدت 365 دن، 5 گھنٹے اور 46 منٹ قرار دی۔

البتانی کے والد جابر ابن سنان بھی ہیئت داں تھے۔ انہوں نے کروی اصطرلاب (Spherical Astrolabe) ایجاد کیا جو آلات رصد میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

عبداللہ محمد ابن عیسیٰ الماہانی ماہان کا رہنے والا تھا جو کرمان میں ایک قصبہ ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ سال رحلت بھی یقینی طور پر متعین نہیں کیا جا سکا۔ گمان ہے کہ 874ء اور 884 کے درمیان اس کا انتقال ہوا۔ وہ ہیئت داں، ریاضی داں اور ماہر علم ہندسہ (Geometry) تھا۔ اس نے اسکندریہ کے مشہور ماہر علم ہندسہ اقلیدس (Euclid) اور آرکیمیڈیز (Archimedes) کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ یہ دونوں تیسری صدی قبل مسیح کے نہایت نامور ریاضی دان ہیں۔ آرکیمیڈیز سائراکیوز (Syracuse) کا رہنے والا تھا۔ الماہانی نے سورج گرہن، چاند گرہن اور سیاروں کے قران کے چودہ سال تک مشاہدے کیے جن سے سو سال بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے عالم ہیئت ابن یونس نے استفادہ کیا۔ ایک علمی مسئلہ کے حل کرنے کے سلسلہ میں الماہانی کے ہاتھ ایک مساوات مکعب (Cubic Equation) لگا جو بعد میں مساوات الماہانی کہلائی اور جس کو ابوجعفر الخازن، البیرونی وغیرہ نے حل کرنے کا فخر حاصل کیا۔ یہ مساوات یوں لکھی جاتی ہے $-X^3+C^2 6=CX^2$

ابوجعفر احمد ابن ابراہیم الدایہ المصری کا انتقال 912ء میں ہوا۔ اس نے دو ایسی کتابیں تصنیف کیں جن کا لاطینی میں ترجمہ ہوا اور علم ریاضی کی بہت اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ایک مشابہ قوسین (De Similiaus Arcubus) پر ہے، اور دوسری ریاضی کے تناسبات سے متعلق (De Proportionet Proporionalitate) ہے بالخصوص دوسری کتاب یورپ پر بہت اثر انداز ہوئی۔

ابو العباس الفضل ابن حاتم النیریزی کا انتقال 922ء میں ہوا۔ اس نے خلیفہ المعتضد کے لیے ایک زیچ بنائی اور بطلیموس اور اقلیدس پر شرحیں لکھیں۔ اقلیدس پر جو شرح لکھی تھی اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ اس نے کروی اصطرلاب پر ایک بسیط کتاب لکھی جو اس موضوع پر عربی میں سب سے اچھی تصنیف ہے۔

ابو بکر الحسن ابن الخصیب (Albubather) ایرانی ہیئت داں اور علم نجوم کا ماہر تھا۔ اس کی کتاب کا لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ قرون وسطیٰ میں اس کی تصنیف کو بہت اہمیت دی گئی، بالخصوص یورپ میں وہ بہت مقبول ہوئی۔

ابوالقاسم عبداللہ ابن اماجور الترکی فرغنہ کا ترک تھا۔ اس نے اس قدر اہم مشاہدات کیے کہ بعد میں ابن یونس نے ان سے استفادہ کیا۔ اس کا بیٹا ابوالحسن علی اور اس کا غلام مفلح بھی مشاہدات میں شریک رہے ان تینوں کو بنی ماجور کہا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی زیچیں بنائیں، جن کا نام الخاص (The Pure) الزنر (The Girdled) البارع (The Wonderful) رکھا۔ انہوں نے یہ زیچ مریخ بھی بنائی۔ یہ دسویں صدی کے آخر میں بغداد میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے غلام مفلح کو ایسی تربیت دی کہ وہ بھی ہیئت داں بن گیا جس کی بدولت اسے غلامی سے آزادی بھی نصیب ہوئی۔

ابوالکامل شجاع ابن اسلم ابن محمد ابن شجاع الحاسب المصری نویں صدی کا بہت بڑا ریاضی داں تھا۔ اس نے الخوارزمی کے علم جبر و قدر (Algebra) پر اضافے کیے، اس نے دوم درجہ کی مساوات (Quadratic Equation) پر بہت مفید کام کیا۔ الجبرائی مقادیر (Algebric Quantities) کے ضرب اور تقسیم اور جذر (Radicals) کی جمع و تفریق کے قاعدے بنائے اور شکل مخمس (Pentagon) اور شکل معشر (Decagon) پر بہت کام کیا۔ ابوالکامل کی تحقیق سے الکرخی نے جو گیارہویں صدی کا مشہور ریاضی داں تھا بہت استفادہ کیا۔ پیسا (Pisa) کے لیونارڈو کو بھی اس سے فیض پہنچا۔

ابو اسحٰق ابراہیم ابن سنان ابن ثابت ابن قرہ دسویں صدی کا بہت بڑا ریاضی داں تھا، ابراہیم اپنے والد اور دادا دونوں سے زیادہ مشہور ہوا۔ حیرت اس پر ہے کہ صرف 37 سال کی عمر میں اس نے ریاضی دانوں کی صف اول میں اپنی جگہ بنالی۔ ابراہیم 9-908ء میں پیدا ہوا اور 946ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ جس طرح اس نے قطعہ مکافی کی تربیع (Quadrature of the Parabola) کی وہ آرکیمیڈیز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ آسان ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انٹگرل کیلکولس (Integral Calculus) کی ایجاد سے پہلے کسی ریاضی داں نے بھی اس آسانی سے تربیع نہیں کی تھی۔ اس نے علم ہندسہ اور علم ہیئت سے متعلق بہت سے موضوعات پر مقالے لکھے، ان میں سے ایک دھوپ گھڑی پر بھی تھا۔

ابوسہل ریحان ابن رستم الکوہی اس رصد خانہ کا 988ء میں صدر تھا جسے شرف الدولہ نے قائم کیا تھا۔ اس نے اپنی تحقیق کو ان دقیق مسائل پر مرکوز کیا جو آرکیمیڈیز کے زمانہ سے چلے آرہے

تھے اور اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوم درجہ کی تعدیل (Qudratic Equation) سے آگے کی تعدیل دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی تحقیق علم ہندسہ کے مسلمان عالموں کی بہترین تحقیقات میں شمار کی جاتی ہے۔

ابوالحسین عبدالرحمٰن ابن عمر الصوفی الرازی رے میں 903ء میں پیدا ہوا اور تراسی برس کی عمر میں 986ء میں فوت ہوا۔ وہ صف اول کا ہیئت داں تھا۔ اس نے ثوابت پر "کتاب الکواکب الثابۃ المصور" تصنیف کی اور اسے تصویروں سے بھی مزین کیا۔ یہ کتاب ہیئتی مشاہدات کا شاہکار ہے اور مشاہدہ کے معاملہ میں عبدالرحمٰن کو ابن یونس اور الغ بیگ کے برابر لا کھڑا کرتی ہے۔ عبدالرحمٰن عضدالدولہ کا استاد اور معلم تھا۔

ابوالوفا محمد ابن محمد ابن یحییٰ ابن اسمٰعیل ابن عباس البزجانی 940ء میں بزجان میں پیدا ہوا۔ بزجان کوہستان کا ایک قصبہ تھا۔ وہ مسلمانوں کے عظیم ترین ریاضی دانوں میں سے تھا۔ جارج سارٹن نے دسویں صدی کی دوسری نصف صدی کو اس کے نام سے معنون کیا ہے۔ ابوالوفا نے علم مثلث میں گرانقدر اضافے کیے ہیں۔ ابوالوفا غالباً پہلا ریاضی داں تھا جس نے کروی مثلثوں (Spherical Triangles) کے بارے میں Sine Theorem کی عمومیت آشکار کی اور اس کے ذریعہ زیچ بنانے کا نیا طریقہ بتایا۔ اس نے جو زیچ بنائی اس کا نام زیج الواضح رکھا مماس (Tangent) اور قاطع التمام (Secant and Cosecant) پر تحقیقی کام کیا۔ اس نے علم الحساب (Arith metic) پر "المعلومات" لکھی اور المجسطی کو آسان کرکے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "کتاب الکامل" ہے۔ علم کیمیا پر اس کی کتابوں کے نام "رقبتہ الحکیم" اور "غایت الحکیم" ہیں۔ علم ہیئت میں بھی وہ ید طولیٰ رکھتا تھا۔

ابومحمد حامد ابن خضرالخجندی نے 994ء میں رے کے مقام پر ہیئتی مشاہدات کیے، جن میں اعوجاج منطقۃ البروج سورج کے دور کے ترچھے پن (Obliquity of the Ecleptic) پر بھی مشاہدات شامل تھے۔ اس نے ثابت کیا کہ دو مکعب عددوں کا جوڑ مکعب نہیں ہو سکتا۔ اغلب خیال یہ ہے کہ کروی مثلثوں سے تعلق رکھنے والے (Sine Theorem) کو (جس کا ذکر ابوالوفا کے حالات میں کیا گیا ہے) دریافت کرنے کا سہرہ الخجندی کے سر ہے۔

ابوالقاسم مسلمہ ابن احمد المجریتی مجریت (Madrid) کا رہنے والا تھا۔ اس نے الخوارزمی کی زیج کی تدوین کی جس کے بعد یہ زیچ لاطینی میں ترجمہ کی گئی اور یورپ، افریقہ اور ایشیا میں مدتوں رائج رہی۔ مسلمہ نے ایک کتاب اصطرلاب پر لکھی اور بطلیموس کی شرح کی۔ ان دونوں کتابوں کا بھی

لاطینی میں ترجمہ ہوا اور یورپ میں بہت مقبول ہوئیں۔

ابوالحسن علی ابن سعید عبدالرحمٰن ابن احمد ابن یونس المصدفی المصری کا 1009ء میں قاہرہ میں انتقال ہوا۔ وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ریاضی داں اور ماہر علم مثلث تھا۔ جارج سارٹن کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں ابن یونس سب سے عظیم ہیئت داں تھا۔ اس نے فلکی مسائل (Spherical Problems) کے نئے حل دریافت کیے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ وہ زیچ تیار کرنا ہے جو مصر کے خلیفہ الحاکم کے نام پر الزیج الکبیر الحاکمی کہلائی۔ اس زیچ کی تیاری میں سترہ سال لگے اور ابن یونس کے انتقال سے صرف دو سال پہلے 1007ء میں مکمل ہوئی۔ یہ خسوفوں (Eclipses) نئے اور پرانے قرانوں (Cojunctions) اور ہیئتی مقادیر (Astronomical Constants) پر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اس میں اس ارضی پیمائش کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو عباسی خلیفہ المامون کے حکم سے کی گئی تھی۔ جہاں تک علم مثلث کا تعلق ہے، اس نے اس علم میں بھی گرانقدر اضافے کیے۔

سید امیر علی نے "اسپرٹ آف اسلام" میں لکھا ہے کہ ابن یونس کی زیچ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایران میں عمر خیام نے 1079ء میں اس کی نقلیں کرائیں۔ نصیر الدین طوسی نے اسے اپنی زیچ میں جو زیچ ایل خانی کے نام سے موسوم ہے، نقل کیا اور چین میں کوچوکنگ نے 1280ء میں چینی علم ہیئت کا جز بنایا۔ اسی طرح یونانی علم ہیئت بھی اس سے مستفید ہوا۔ سید امیر علی نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ابن یونس نے دیواری گھڑیوں کا پینڈولم ایجاد کیا جس کی جنبش سے وقت پیمائی ممکن ہوئی۔

البیرونی کا ذکر بھی پہلے کیا گیا تھا۔ جارج سارٹن کی رائے کے اظہار کے لیے کچھ اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ سائنس میں البیرونی کے کارنامے اس قدر گراں قدر ہیں کہ وہ ہر زمانہ کے عظیم ترین سائنس دانوں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اس کا تنقیدی مزاج، اس کی رواداری، اس کی حق پسندی اور اس کی ذہنی جرأت کی مثال قرون وسطیٰ میں نہیں ملتی۔ اس کی اہم تصانیف کے نام یہ ہیں: (1) کتاب الآثار الباقیہ عن القرآن الخالیہ (2) تاریخ الہند (3) القانون المسعودی فی ہئی و النجوم (4) التفہیم لاوائل صناعت التنجیم۔ القانون المسعودی دراصل فلکیات کی قاموس ہے۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ البیرونی نے شطرنج کی بساط کے چونسٹھ خانوں میں اس طرح رکھی جانے والی چیز کی جو ہر خانے میں پچھلے خانے سے دوگنی ہوتی جائے، مقدار معلوم کرنے کا آسان طریقہ دریافت کیا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک نہایت مختصر فارمولا بنایا جو یہ تھا:

1 16^{16}ـ لیکن جب اس کو حل کریں تو اس کی یہ شکل سامنے آئے گی:

18,646,744,673,709,551,619 یہ بات آج سب کو معلوم ہے کہ روشنی آواز سے بہت زیادہ تیز رفتار ہے۔ یہ بات قرون وسطیٰ میں پہلے پہل البیرونی نے ہی دریافت کی تھی۔ اس نے مقامات کے عرض البلد اور طول البلد ٹھیک ٹھیک مقرر کیے۔ زمین سے چشمے نکلنے اور پانی ابلنے کی توجیہہ جو اس نے کی تھی وہ آج بھی مانی جاتی ہے' اس نے اس رائے کا اظہار کیا کہ دریائے سندھ کی وادی پر ازمنہ قدیمہ میں سمندر رہا ہوگا۔ اب یہ رائے بھی درست سمجھی جاتی ہے حالانکہ جب اس نے اس کا اظہار کیا ہوگا تو ناقابل یقین سمجھی جاتی ہوگی۔

ابوالحسن کوشیار ابن لبان باشری الجیلی کا وطن جیلان تھا جہاں کے باشندے جیلانی یا جیلی کہلاتے ہیں۔ وہ نامور ریاضی داں تھا۔ اس کی توجیہہ بالخصوص علم مثلث پر تھی جس کے فروغ میں اس نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ ابوالوفا کے تحقیقی کام کو جو اس نے مماس (Tangent) پر کیا تھا آگے بڑھایا۔ اس کا اصل کارنامہ اس کی "زیج الجامع و البالغ" ہے جو گیارہویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے عربی سے فارسی میں منتقل کر لی گئی۔ اپنی زیج میں اس نے مماس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے علم الحساب پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جو اب عبرانی ترجمے کی شکل میں پائی جاتی ہے' اصل کتاب ناپید ہے۔ الجیلی 971ء سے 1029ء تک زندہ رہا ہے۔

ابوبکر محمد ابن الحسن الحاسب الکرخی کرخ کا رہنے والا تھا۔ کرخ بغداد کا نواحی قصبہ تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں وفات کا سال بھی صحیح طور پر متعین نہیں کیا جاسکا۔ اس کا انتقال یا تو 1019ء میں ہوا یا 1029ء میں۔ الکرخی کا شمار بہت بڑے ریاضی دانوں میں ہوتا ہے۔ اس نے جبرو مقابلہ اور علم الحساب پر خاص طور سے توجہ دی۔ اپنے علم الحساب کی بنیاد اس نے زیادہ تر علم الحساب پر رکھی۔ ہندی اعداد جن کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے کی مسلمان ریاضی دانوں نے سعی بلیغ کی تھی الکرخی نے قابل توجہ نہ سمجھے بلکہ اعداد کو ہندسوں میں لکھنے کے بجائے الفاظ میں لکھا۔ چنانچہ اس کی کتاب "الکافی فی الحساب" میں کہیں ہندسے نہیں پائے جاتے۔ اس نے اپنی جبرو قدر کی کتاب میں بھی اسکندریہ کے ریاضی داں ذیوفینٹس (Diophantos) کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کو بادشاہ کے وزیر ابو غالب محمد ابن خلف فخر الملک کے نام سے منسوب کیا اور اس کا نام "الفخری" رکھا۔

الکرخی نے دو درجی مساوات (Quadratic Equation) پر خاص طور پر توجہ مبذول کی اور اس نے کوشش کی کہ چند اور قسم کی مساواتوں کو بھی دو درجی مساوات کے قالب میں ڈھال

لے۔

ابوالحسن ابن احمد النسوی خراسان کے قصبہ نسا کا رہنے والا تھا۔ اس نے علم الحساب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور فارسی میں "المقنع فی الحساب الہندی" 1030ء کے لگ بھگ تصنیف کی۔ بعد میں اس نے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کی کسر اعشاریہ (Decimal Fractions) کی واضح تشریح کی اور جذر المکعب نکالنے کا طریقہ معین کیا۔ آج بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس آسانی سے ساٹھویں حصہ والی کسر (Sexagesimal) کو کسر اعشاریہ (Decimal Fractions) میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ابو حامد محمد بن محمد الطوسی الشافعی الغزالی (Algazel) کے بارے میں یہ پڑھ کر کہ وہ عالم فلکیات تھے' اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا کیونکہ ان کا میدان مذہب' تصوف اور فلسفہ ہے اور وہ اپنے مذہبی عقائد کی پختگی اور فلسفہ یونان کو اسلامی نظریات کے مقابلے میں حقیر سمجھنے کی وجہ سے امام غزالی کہلاتے ہیں۔ انہوں نے جس طرح فلسفہ یونان کا غائر مطالعہ کیا ویسے ہی انہوں نے علم ہیئت پر بھی اپنا قیمتی وقت صرف کر کے وہ مرتبہ حاصل کیا کہ اس پر کتاب لکھ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اجرام فلکی کی حرکت و ماہیت پر ایک کتاب تصنیف کی اور ایک اور کتاب میں مختصر مگر جامع طور پر علم ہیئت کی وضاحت کی۔

سارٹن لکھتا ہے کہ الغزالی قرون وسطیٰ میں سب سے زیادہ شریف النفس انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی فکر میں بڑی جدت تھی' انہوں نے حیرت انگیز طریقے پر غیر استدلالی نظریوں کا اسلام کے ٹھیٹ عقائد سے ہم آہنگ ہونا ثابت کر دیا اور یہ علم الکلام پر پوری قدرت رکھنے کی بدولت ممکن ہوسکا۔ ان کے علم الکلام نے یہودی اور عیسائی فقہا کو بھی بہت متاثر کیا اور انہوں نے اپنے علم الکلام کو الغزالی کے علم الکلام کی مدد سے استوار کیا۔ وہ 1058ء میں طوس میں پیدا ہوئے اور 53 برس کی عمر میں 1111ء میں انتقال کیا۔

عمر خیام کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ جو خراج سارٹن نے اسے دیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ عمر خیام کے بارے میں ابھی کچھ اور لکھا جائے۔ سارٹن کہتا ہے کہ الجبرا میں جو ترقیاں مسلمانوں نے کی تھیں ان کا نقطہ عروج عمر خیام میں ملتا ہے۔ اس نے مساواتوں کو اختلاف نوعیت کے اعتبار سے تقسیم کرنے کا قابل قدر طریقہ ایجاد کیا' صرف ایک مساوات مکعب کی اس نے تیرہ قسمیں تلاش کیں۔ اس نے مختلف اقسام کی مساواتوں کو حل کرنے میں مثلث کو بھی ایک حد تک استعمال کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ عمر خیام کے الجبرا کے مقابلہ میں قرون وسطیٰ کے یورپ' ایشیا اور

افریقہ کی کوئی چیز نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عمر خیام کا الجبرا دورِ حاضر کی چیز ہے۔

ابو اسحٰق ابن یحییٰ النقاش ابن الزرقالی (Arzachel) قرطبہ کا باشندہ تھا۔ وہ 1029ء سے 1087ء تک زندہ رہا، اس کے مشاہدات اس کے زمانہ کے بہترین مشاہدات تھے۔ اس نے مروجہ اصطرلابوں سے بہتر اصطرلاب ایجاد کیا جس کا نام صفیحہ (Saphea Arzachelis) ہے۔ اس نے اس اصطرلاب کی جو تفصیلات تحریر میں بیان کی تھیں ان کا لاطینی عبرانی اور کئی اور زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ سب سے پہلے اس نے اوج آفتاب (Solar Apogee) اور ثوابت کے درمیان کا فاصلہ ناپا جو اس کے حساب سے یہ 1204 نکلا (موجودہ پیمائش کے مطابق یہ فاصلہ 1108 ہے۔)

ابن الزرقالی نے اور اس کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے جو مشاہدات کیے تھے ان کی بنا پر ایک زیج بنائی گئی جس کی تدوین ابن الزرقالی نے کی۔ اس زیج کا نام زیج طلیطلہ (Toledan Tables) ہے، اس میں علم مثلث پر جو مقدمہ ہے وہ ابن الزرقالی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا یہ زیج یورپ میں بہت مقبول ہوئی۔

مولانا سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ "اسلامی رصد خانے" میں جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے، لکھا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی میں زرقالی اندلسی ایک مشہور آلات ہیئت بنانے والا تھا جس نے مامون شاہ طلیطلہ کے لیے ایک اصطرلاب بنایا۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ابن زرقالی اندلس کا مشہور مہندس تھا۔ اس کا زمانہ تحقیق 498ھ مطابق 1080ء ہے۔ طلیطلہ سے یہ معتمدین عباد شاہ اشبیلیہ کے دربار میں چلا آیا اور یہاں "العبادیہ" کے نام سے ایک جدید آلہ اس نے بنایا۔ ابن زرقالی نے علم رصد کی بے انتہا خدمت کی۔ صرف آفتاب کے نقطہ اوج دریافت کرنے کے لیے چار سو دو مشاہدات کیے۔ زرقالی ہمیشہ اپنے بنائے ہوئے آلات رصد استعمال کرتا تھا۔ معدل النہار کے سالانہ استقبال کا پچاس ثانیہ ہونا پہلے اس نے دریافت کیا تھا جو تحقیقات حال کے بالکل مطابق ہے۔ ابن زرقالی کا رصد خانہ غالباً طلیطلہ میں واقع تھا۔

ابوالقاسم صاعد ابن احمد ابن عبدالرحمٰن ابن محمد صاعد القرطبی الاندلسی قرطبہ کا باشندہ تھا۔ مگر طلیطلہ میں رہا۔ اسے ابوقاسم صاعد کے بجائے ابن صاعد یا قاضی صاعد کہتے ہیں۔ وہ ہیئت داں اور مورخ تھا۔ ابن الزرقالی کے ساتھ مشاہدوں اور زیج تیار کرنے میں یہ بھی تھا۔ اس نے علم ہیئت پر ایک کتاب تصنیف کی۔ اس نے ارباب علم کے حالات پر جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں ایک کتاب لکھی اور سائنس کی تاریخ پر خاص توجہ دی۔ ابن القفطی اور ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تواریخ میں ابن صاعد کے رقم کردہ حالات سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ارباب علم کی تاریخ مرتب کرنے کے علاوہ ابن صاعد نے

"کتاب التعریف بہ طبقات الامم" تصنیف کی جس میں مختلف قوموں کے حالات بیان کیے ہیں۔ 1070ء میں اس کا انتقال ہوا۔

پہلے بھی یہ بتایا جا چکا ہے کہ سارٹن نے آٹھویں صدی کے نصف سے لے کر گیارہویں صدی کے آخر تک یعنی ساڑھے تین سو سال کا زمانہ ایسا بتایا ہے جس میں مسلمان بلاشرکت غیر سائنس کی دنیا کے امام تھے۔ اس کے بعد بارہویں، تیرہویں اور چودھویں صدیوں میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی ان کا شریک قرار دیا ہے۔ جتنے علمائے ہیئت و ریاضی کا اب تک ذکر ہوا ہے ان کا تعلق پہلے ساڑھے تین سو سال سے تھا۔ اب یہاں سے اگلے تین سو سال کے مسلمان ریاضی و ہیئت کے علما کا بیان آتا ہے۔

ابوقاسم ہبۃ اللہ ابن الحسین ابن احمد (بایوسف) بدیع الزماں الاصطرلابی البغدادی۔ یہ البدیع کے نام سے مشہور تھا۔ ابتدا میں اصفہان میں سکونت اختیار کی پھر بغداد میں 40-1139ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے ایک زیج مرتب کی جو مغیث الدین محمود کے نام پر جو عراق کا سلجوقی سلطان تھا، زیج محمودیہ کہلائی۔ جن مشاہدات کی بنا پر یہ زیج بنی ان کے لیے سلطان نے اپنے محل میں رصد خانہ قائم کرکے البدیع کو ہیئت دانوں کا سربراہ مقرر کر دیا تھا۔

اصطرلاب سازی میں البدیع نے بہت شہرت حاصل کی۔ مولانا سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ "اسلامی رصد خانے" میں لکھا ہے کہ خلیفہ مسترشد کے زمانہ میں بدیع اصطرلابی مشہور آلات ساز تھا جس نے آلات کی بدولت بے شمار دولت جمع کی تھی۔ 534ء میں اس نے وفات پائی۔

ابوبکر محمد ابن احمد الخرقی کا انتقال 39-1138ء میں مرو میں ہوا۔ وہ ایرانی ریاضی داں، ہیئت داں اور جغرافیہ داں تھا۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف ہے جن میں سب سے زیادہ اہم "منتہاء الادراک فی تقسیم الافلاک" ہے۔ یہ تین مقالوں پر مشتمل ہے:

(1) ترکیب الافلاک (Arrangemet of Spheres) ان کی حرکات وغیرہ کے بارے میں۔

(2) دنیا کی شکل، اس کی آباد وغیر آباد حصوں میں تقسیم، جغرافیائی جائے وقوع کے باعث آباد و غیر آباد حصوں کے طالع (Ascendents) اور مطالع (Ascensions) میں فرق کے بارے میں۔

(3) تاریخ (Chronology) قرانات (Conjuctions) بالخصوص زحل (Saturn) اور

مشتری (Jupiter) کے قران ادوار (Periods of Revolutions) کے بارے میں۔

سیاروں کے بارے میں الخرقی کا نظریہ یہ تھا کہ انہیں خیالی دائرے نہیں سنبھالے ہوئے ہیں بلکہ چکر کھانے والے بھاری افلاک انہیں سہارا دیتے ہیں۔ مشہور عالم طبیعیات ابن الہیثم کا بھی یہی نظریہ تھا۔ ابن الہیثم کی تصنیف "فی ہیئت العالم" لاطینی اور عبرانی ترجموں کے ذریعہ یہ نظریہ یورپ پہنچا اور پھیل گیا۔

ابو محمد جابر ابن الافلح (Geber) غالباً اشبیلیہ (Seville) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم نہیں، خیال ہے کہ تیرہویں صدی کے وسط میں اس کا انتقال ہوا۔ علم کیمیا کے بانی ابو موسیٰ جابر ابن حیان کو بھی یورپ والے (Geber) کہتے ہیں۔ جابر ابن الافلح کو اس سے ممیز کرنے کے لیے اسے عموماً Geber the Astronomer کہتے ہیں۔

بطلیموس اس نظریہ کا قائل تھا کہ اجرام فلکی زمین کے گرد گھومتے ہیں۔ ابن الافلح نے اس کی شدت سے تردید کی۔ ابن باجہ (Avenpace) اور ابن طفیل بھی بطلیموس کے نظریے کو غلط سمجھتے تھے۔ ابن طفیل کے شاگرد البطروجی نے نظریہ بطلیموس کو رد کر کے ایک اور نظریہ پیش کیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ابن باجہ، ابن طفیل، ابن الافلح اور البطروجی اسپین یا مغرب کے رہنے والے تھے۔ جہاں ان کے خیالات عیسائیوں اور یہودیوں میں پھیلنے شروع ہوئے۔

ابن افلح نے علم ہیئت پر جو کتاب لکھی اس کا نام "کتاب الہند" تھا۔ یہ "اصلاح المجسطی" بھی کہلاتی ہے۔ یہ کتاب یورپ میں بہت مقبول ہوئی، لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ کی گئی۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ علم مثلث پر مقدمہ ہے۔ اس سے پہلے فلکی علم ہیئت کی بنیاد چھ مقادیر (Quantities) پر رکھی جاتی تھی۔ ابن افلح نے چھ کے بجائے چار پر رکھی۔

ابن افلح سے ایک آلہ رصد کی ایجاد منسوب ہے جس کا نام Tuquet ہے۔

نورالدین ابو اسحٰق البطروجی الاشبیلی (Alpetragius) اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔ ابن طفیل جو ابو یعقوب یوسف اول کا طبیب تھا، البطروجی کا استاد تھا۔ ابن طفیل کا انتقال 86-1185ء میں ہوا۔ البطروجی کا بیان ہے کہ ابن طفیل نے اس نظریہ افلاک متحد المرکز (Homo-Centric Spheres) کو اپنانے کی ہدایت کی تھی۔ ابن افلح بھی اس نظریہ کا بڑی حد تک قائل تھا۔ البطروجی نے اپنے خیالات کی آمیزش کر کے جو نظریہ پیش کیا اس کا نام "نظریہ حرکت لولابی" (The Theory of

the Spherical Motions) رکھا۔ اس نظریہ کا مرکزی خیال ہے کہ ہر سیارہ ایک فلک سے وابستہ ہے۔ نو افلاک میں سے نواں فلک سب افلاک کو حرکت میں لاتا ہے۔ افلاک مشرق سے مغرب کی سمت حرکت کرتے ہیں۔ آٹھویں میں جو نویں فلک سے زیادہ قریب ہے حرکت کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہے۔ نویں فلک سے دوری میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے رفتار اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے۔ اس نظریہ کی تفصیلات میں بہت سے اصطلاحی الفاظ آتے ہیں جنہیں چھوڑ کر سارٹن کی اس رائے پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا کہ جہاں تک نظریہ بطلیموس کا تعلق تھا، البطروجی کی تنقید بالکل صحیح تھی اور نظریہ بطلیموس کو غلط ثابت کرنے کی تحسین کا وہ مستحق ہے۔ لیکن جو نظریہ خود اس نے پیش کیا وہ بھی قابل قبول نہ تھا۔ البطروجی نے نظریہ حرکت لولابی اپنی تصنیف "کتاب الہیئۃ" میں پیش کیا تھا۔ اس کتاب نے دنیا کے علمی حلقوں میں کھلبلی ڈال دی اور فوراً اس کا لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ نظریہ بطلیموس کو مانتے ہوئے دنیا کو ہزار سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ البطروجی کا یہ کارنامہ ہی کیا کم ہے کہ اس نے غلط نظریہ کی بنیاد ہلادی۔

بالآخر 1328ء میں یہودی عالم ہیئت لیوی گرشن (Levi Gershon) نے نظریہ حرکت لولابی غلط ثابت کیا۔ ابو زکریہ (یا ابو بکر) محمد ابن عبداللہ الحصار کے حالات سے صرف اس قدر واقفیت ہے کہ اس کی کتاب کا جو اس نے علم الحساب اور الجبرا پر لکھی تھی عبرانی میں ترجمہ ہوا اور ابن بناء نے اس کی تلخیص لکھی۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کا دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے اور ابن بناء ایسا عالم اس کی تلخیص کرے تو وہ کتاب یقیناً موقر اور قابل قدر ہوگی۔

ابوالحسن عبدالملک ابن محمد الشیرازی بارہویں صدی کے دوسرے نصف میں گزرا ہے۔ اس نے المجسطی کی تلخیص کی۔ اس کو قطب الدین شیرازی ایسے بڑے عالم نے عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔

ابو الفتح (یا ابو عمران) موسیٰ یونس ابن محمد ابن منعہ کمال الدین ابن یونس بہت بڑا عالم تھا۔ وہ موصل میں 1156ء میں پیدا ہوا اور مدرسہ نظامیہ میں اس نے تعلیم پائی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن موصل کے ایک مدرسہ میں پڑھانے لگا جو بعد میں اس کا نام پر کمالا کہلایا۔ کمال الدین نے قرآن کی تفسیر لکھی ابن سینا پر شرح مرتب کی۔ منطق، قواعد، علم نجوم، علم الحساب، علم جبرو قدر وغیرہ پر رسالہ اور کتابیں لکھیں۔ عبداللطیف اور نامور ارباب علم اس کے شاگرد تھے۔

اس نے ریاضی کا ایک مشکل مسئلہ حل کیا یعنی ایسا مربع بنایا جو دائرے کے ایک ٹکڑے کے برابر ہو۔

ابو علی الحسن ابن عمر المراکشی ۔ وہ الحسن المراکشی اور ابوالحسن علی کے ناموں سے مشہور ہے ۔ وہ ریاضی ' ہیئت اور جغرافیہ کا عالم تھا اس نے ہیئت پر کئی کتابیں لکھیں ان میں "جامع المبادی و الغایات " کی اہمیت سب سے زیادہ ہے ۔ یہ 30-1229ء میں مکمل ہوئی ۔ اس میں مختلف موضوعات ہیئت کو یکجا کیا ہے ۔ آلات رصد اور اس کے استعمال کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ۔ علم مثلث اور نومونکس (Gnomonics) وغیرہ پر لکھا ہے ۔ نومونکس وہ علم ہے جس سے سورج کا چڑھاؤ و اتار دیکھ کر وقت کا تعین کرتے ہیں ۔ اس نے جیب تمام (Complemetary Sine) اور جیب کی دیگر اقسام سے بحث کی ہے اور ہر آدھے درجہ کے جیب کی جدول (Tables) مرتب کیں ۔ "جامع " کے دوسرے حصہ میں ہیئتی مسائل کے حل دیئے ہیں اور ترسیم (Graph) کے مختلف طریقے بیان کیے ہیں ۔ اس میں 26-1225ء سے متعلق دو سو چالیس ثوابت کی فہرست بھی دی گئی ہے اور ایک سو تیس مقامات کے طول اور عرض البلد دکھائے ہیں جن میں بیشتر خود اس کے متعین کیے ہوئے ہیں ۔ "جامع "بحیثیت مجموعی نہایت مفید اور معلومات میں اضافہ کرنے والی کتاب ہے ۔

تیرہویں صدی کے وسط یعنی 1258ء میں اسلامی تاریخ کا وہ مہیب اور جانکا واقعہ ہلا کو خان کی حشر خیز تاراجی و قتل و غارت گری کی شکل میں پیش آیا جس نے دنیائے اسلام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ۔ اس سے اسلامی معاشرت کا ہر پہلو بدرجہ غایت متاثر ہوا ۔ سینکڑوں کتب خانے اور لاکھوں کتابیں نذر آتش کر دی گئیں ۔ ہزاروں اہل علم صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے ۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتی ۔ چنانچہ اس کا ذکر ضروری ہے ۔ ابھی تیرہویں صدی کے نصف اول کے چند مسلمان ریاضی دانوں اور ماہرین فلکیات کا ذکر باقی ہے ان کا حال لکھنے کے بعد یہ خونچکاں داستان بیان کی جائے گی ۔

ابن بدر کا پورا نام ابو عبداللہ ابن عمر ابن محمد تھا ۔ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم نہیں ۔ بارہویں صدی کے آخر یا تیرہویں صدی کے شروع میں وہ اشبیلیہ (Seville) میں معروف ہوا ۔ اس نے ریاضی میں علم و جبر و مقابلہ پر خاص توجہ دی ۔ اس نے جبر و مقابلہ پر ایک کتاب لکھی جس میں اس نے دوم درجہ کی مساوات (Quadratic Equation) ' اصم (Surds) (Multiplication of Polynomials) نظریہ اربعہ متناسبہ (Arithmetical Theory of Proportions) وغیرہ سے بحث کی ہے اور بہت سے ریاضی کے حل طلب مسائل پیش کئے ہیں ۔

المظفر ابن محمد ابن مظفر شرف الدین الطوسی کمال الدین موسیٰ ابن یونس موصلی کا استاد تھا ۔ اس نے اصطرلاب پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "المسطہ" تھا اور خود ایک خطی اصطرلاب ایجاد کیا جو "اصطرلاب الخطی " کے نام سے موسوم ہے ۔ اس نے جبر و مقابلہ پر بھی ایک کتاب لکھی جس پر ایک اور

مصنف نے شرح لکھی ۔ اصل کتاب ناپید ہے مگر اس شرح نے اسے زندہ رکھا ۔ اس نے مربع کی تقسیم پر بھی ایک رسالہ تصنیف کیا تھا ۔

قیصر ابن ابی قاسم عبدالغنی ابن مظفر ۔ علیم الدین الحنفی ۔ اصفون میں جو بالائی مصر میں واقع ہے ' پیدا ہوا تھا ۔ اس کی تاریخ پیدائش غالباً 1178ء ہے ۔ اس کا انتقال 1251ء میں دمشق میں ہوا ۔ اس نے کمال الدین ابن یونس سے موسیقی اور دوسرے علوم پڑھے ۔ وہ ریاضی داں اور عالم فلکیات ہونے کے علاوہ مہندس (Engineer) بھی تھا ۔ حماد کے امیر مظفر ثانی تقی الدین کے یہاں وہ 1229ء سے 1244ء تک ملازم رہا اور دریائے اورنتیز (Orantes) پر اس نے امیر کے کہنے سے کئی فاعورے (Water Mills) تعمیر کیے ۔ ان کے علاوہ ایک قلعہ بھی تعمیر کیا ۔ ہیئت دانی میں یدطولیٰ رکھنے کا ثبوت اس فلکی کرہ (Celstial Globe) سے ملتا ہے جو اس نے بنایا تھا اور آج بھی نیپلز کے Museonazionale میں محفوظ ہے ۔ یہ پیتل کے دو کروں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے ۔ اس میں چار پائے لگے ہوئے ہیں ۔ خط کوفی میں قیصر کا نام اور 622ھ لکھا ہوا ہے ۔ جتنے فلکی کرے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ایک کو چھوڑ کر یہ سب سے پرانا ہے اس میں افق (Horizon) نصف النہاری دائرے (Meridian Circles) دکھائے گئے ہیں ۔ پانی سے گردش کرنے والے پہیوں اور پن چکیوں پر اس نے ایک کتاب لکھی ۔ کہا جاتا ہے کہ مسیحی مجاہدین جو فلسطینی جنگیں لڑنے شام اور فلسطین آئے تھے اپنے ساتھ حماہ سے کچھ پانی سے گردش کرنے والے پہیئے لے گئے تھے اور ان کی یورپ میں ترویج کی تھی ۔

ابوز کریا یحییٰ (یا احمد) ابن محمد ابن عبدان الصاحب نجم الدین ابن اللبودی 11-1210ء میں حلب میں پیدا ہوا اور 1267ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ وہ ریاضی داں ' عالم ' فلکیات ' طبیب اور فلسفی تھا ۔ دمشق میں تعلیم پائی ۔ اس نے اور ابن ابی اصیبعیہ نے عبدالرحمٰن ابن علی مہذب الدین ابن الاخوار سے تحصیل علم کی ۔ ابن اللبودی حمص کے امیر المنصور ابراہیم کا وزیر ہوگیا ۔ اس وجہ سے الصاحب کہلایا ۔ جب المنصور کا انتقال ہوگیا تو اس نے مصر کے سلطان الصالح نجم الدین ایوب کی ملازمت بحیثیت محتسب (Inspector) کرلی اور اس کا تقرر اسکندریہ میں ہوا ۔ پھر اسی عہدے پر وہ شام میں مقرر کیا گیا ۔ اس نے ریاضی اور طب پر کئی کتابیں لکھیں ۔ اس نے اقلیدس کے اصول موضوعہ (Postulates) کی تشریح کی ۔ اس نے علم الحساب اور علم جبر و مقالہ پر بھی کتابیں تصنیف کیں اور دو طرح کی زیچیں بنائیں جن کا نام "الظاہر "اور "المقرب "رکھا ۔

اس کی طبی کتابوں میں مرض وجع مفاصل یعنی گٹھیا اور امثال بقراط پر جو تصانیف ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان کے علاوہ اس نے ابن سینا کی مشہور تصنیف قانون کے کلیات کی

شرح بھی لکھی۔

ابو طاہر اسمٰعیل ابن ابراہیم ابن غازی النمیری الحنفی شمس الدین الماردینی 1194ء میں عراق میں پیدا ہوا۔ اس کے انتقال کا سن 1252ء کہا جاتا ہے مگر یقینی نہیں۔ الماردینی فلوس کے نام نام سے بھی مشہور ہے۔ اس نے ایک کتاب اسرار الاعداد پر لکھی جس کا نام "کتاب الاعداد والاسرار فی اسرار الاعداد" ہے۔ دوسری کتاب اس نے علم الحساب پر تصنیف کی اور اس کا نام "کتاب الحساب فی المفتوح من علم الحساب" رکھا۔ اس کی تیسری تصنیف جو علم جبرو قدر پر ہے اس کا نام ہے "نصاب الجبرفی حساب الجبر" 640ھ میں بنو عباس کا آخری خلیفہ مستعصم باللہ تخت نشین ہوا۔ 655ھ میں ہلاکو خاں نے بغداد پر فوج کشی کی اور 656ھ میں بغداد پر قبضہ پانے کے بعد مستعصم باللہ کو اس نے نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی "تاریخ اسلام" کے حصہ چہارم میں یہ سرگزشت یوں بیان کرتے ہیں:

"مستعصم کی نااہلی اور اس کے شیعہ وزیر (موید الدین) ابن علقمیٰ کی وجہ سے بغداد کی حالت اس زمانہ میں بہت ابتر ہو رہی تھی۔ شیعہ سنیوں اور سنیوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات و جنگ و جدل اور شہر کے فتنہ پرست بدمعاشوں کی فتنہ گری سے حکومت کا سارا نظام بگڑ گیا تھا۔ عباسی حکومت کی آمدنی اتنی گھٹ گئی کہ اس کے مصارف پورے ہونا مشکل ہو گئے، مستعصم نے ابن علقمیٰ کے مشورے سے فوج کا ایک بڑا حصہ سبکدوش کر دیا۔ شیعہ سنیوں کے اختلافات میں شیعوں نے ابن علقمیٰ کے بل پر سنیوں پر زیادتی شروع کر دی۔ گو ابن علقمیٰ مستعصم پر حاوی تھا۔ لیکن مستعصم کو شیعوں کی زیادتی ناگوار ہوئی۔ اس نے اپنے لڑکے ابوبکر اور معتمد امیر رکن الدین کو بھیج کر کرخ کا محلہ جس میں شیعہ آباد تھے لٹوا لیا۔ اس واقعہ کے بعد ابن علقمیٰ نے عباسی خلافت کو ختم کر کے علوی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کر لیا اور عباسی فوج کے باقی حصہ کو بھی مستعصم کو یہ اطمینان دلا کر الگ کرا دیا کہ اس سے جو روپیہ بچے گا وہ تاتاریوں کی مدافعت کے دوسرے انتظامات میں کام آئے گا (ابن خلدون)۔"

ابن خلدون لکھتا ہے کہ فوج کو الگ کرنے کے بعد اس (ابن علقمیٰ) نے ابن صلایا والی اربل کے ذریعہ تاتاریوں کو بغداد پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس نے عباسی حکومت کو مٹا کر علوی حکومت قائم کرنے کے لیے تاتاریوں سے خط و کتابت کی۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ ابن علقمیٰ نے تاتاریوں کو بغداد پر حملہ کے لیے لکھا اور اپنے بھائی کو زبانی پیغام دے کر اس کے پاس بھیجا۔ سیوطی لکھتے ہیں کہ مستعصم کو اپنے وزیر موید الدین علقمیٰ پر بڑا اعتماد تھا۔ اس نے ملک کو تباہ کر ڈالا۔ پوشیدہ تاتاریوں سے ملا ہوا اور ان کا ہوا خواہ تھا، اس نے عباسی خلافت کو مٹا کر (۱)

(۱) اس بارے میں شاہ معین الدین صاحب اور سید امیر علی کے بیانات قلم بند کیے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب نے خلیفہ کے وزیر ابن علقمیٰ کو جو شیعہ تھا قابل الزام ٹھہرایا ہے۔ سید امیر علی نے اسے رشید الدین کے حوالے سے وفادار وزیر کہا ہے۔

علوی حکومت قائم کرنے کے لیے تاتاریوں کو عراق پر فوج کشی اور بغداد پر قبضہ کرنے کی طمع دلائی اور ان کی خبریں خلیفہ سے بالکل پوشیدہ رکھتا تھا۔

خلافت بغداد کو مسلمانوں کی دینی حکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ ہلاکو کو خطرہ تھا کہ اس کو چھیڑنے سے مبادہ کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔ لیکن ابن علقمیٰ کی خوش قسمتی سے مشہور شیعی فلسفی اور عالم ریاضی خواجہ نصیر الدین طوسی کو ہلاکو کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ہلاکو کے دل میں اس کی اتنی منزلت تھی کہ وہ اس کے ہر مشورہ پر عمل کرتا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر ہلاکو کی ہمت بڑھائی کہ ... مستعصم باللہ شرف میں نہ تو حضرت یحییٰ بن زکریا کے برابر ہے، نہ حضرت حسین بن علی کے مثل ہے۔ ان دونوں کے سر تن سے جدا کیے گئے اور دنیا بھی اپنی جگہ پر بدستور برقرار رہی۔

"ذی الحجہ 650ھ میں ہلاکو نے بغداد پر فوج کشی کی۔ جتنی فوج باقی رہ گئی تھی اس کو لے کر امیر دیودار نے بڑی پرزور مدافعت کی اور پہلے حملہ میں تاتاریوں کو پسپا کر دیا۔ لیکن پھر انہوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ عباسی فوجیں اس کی تاب نہ لا سکیں۔ امیر دیودار قتل ہوا اور اس کے تمام ساتھی گرفتار ہو گئے اور تاتاریوں نے بڑھ کر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ ابن علقمیٰ نے ہلاکو سے جان بخشی کرا لی اور مستعصم اور اس کے ساتھ بغداد کے تمام علماء و فقہا و مدرسین و اکابر و اعیان کو یہ یقین دلا کر ہلاکو کے پاس لے گیا کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ہلاکو مستعصم کو منصب خلافت پر برقرار رکھے گا اور اپنی لڑکی کی شادی اس کے لڑکے ابوبکر کے ساتھ کر دے گا۔ یہ سب ایک ساتھ قتل کر دیئے گئے۔ مستعصم کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر ختم کیا اور اس کی لاش کو پیروں سے روندا۔ ان میں سے کسی کو گور و کفن تک میسر نہ ہوا۔ یہ واقعہ محرم 656ھ میں پیش آیا"۔ (ابن خلدون)

"اس کے بعد وحشی تاتاری بغداد میں گھس پڑے اور کئی کئی دن تک قتل عام کرتے رہے۔ عورتوں اور بچوں نے نکل جانا چاہا لیکن تاتاریوں نے ان کو بھی زندہ نہ چھوڑا"۔ (ابوالفدا) آبادی کو ختم کر کے چالیس دن تک نہایت بے دردی سے بغداد کو لوٹتے رہے۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ صرف شاہی محلات سے انہوں نے جتنی دولت اور جس قدر ساز و سامان لوٹا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ عباسی کتب خانہ کی تمام کتابوں کو جو صدیوں کا سرمایہ تھیں دجلہ میں ڈبو دیا۔ مقتولین کی تعداد کا اندازہ سولہ لاکھ ہے۔

عباسی خلافت کے خاتمہ کے بعد ابن علقمیٰ نے تاتاریوں کو علوی خلافت قائم کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور اس کو نمک حرامی کے صلہ میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اور چند دنوں بعد وہ بھی مر گیا۔

جو کچھ شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا اس کی تصدیق بڑی حد تک سید امیر علی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی مختصر تاریخ (A short History of Saracens) میں سید امیر علی لکھتے ہیں:

"حنفیوں اور حنبلیوں کے تنازعات، سنیوں اور شیعوں کے جھگڑے جو بغداد کے مغربی حصہ کرخ میں رہتے تھے اور سب سے زیادہ بدمعاشوں کے اہل ثروت سے ہنگامے مستعصم کے لیے عذاب جان بن گئے تھے۔ جب اس نے اپنے والد کی تیار کردہ فوج کو سبکدوش کر دیا اور فوجیوں سے زراعت و تجارت کرنے کو کہا تو ہنگامہ آرائی اور بھی بڑھ گئی۔ شیعوں اور سنیوں کے درمیان بلوہ ہونے پر مستعصم نے اپنے بیٹے ابوبکر اور اپنے معتمد کو حکم دیا کہ کرخ کو منہدم کر کے شیعوں کو غلام بنالو۔ موئد الدین محمد بن علقمی کو جو مذہباً شیعہ اور خلیفہ کا وزیر تھا اس سے دکھ پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے تاتاریوں کو بغداد آنے کی دعوت دی۔ عرب مورخین، ابن خلدون، ابوالفدا، المقریزی اور سیوطی وزیر کو غدار کہتے ہیں اور مرخوند اور وصاف جس نے تاتاریوں کے ایک بادشاہ کے عہد حکومت میں اپنی تاریخ لکھی، ابن خلدون وغیرہ کی تائید کرتے ہیں۔ صرف رشید الدین کی نظر میں ابن علقمی وفادار وزیر تھا جس کی کوشش تھی کہ بنو عباس کو کسی صورت سے بچائے مگر بزدل خلیفہ کی تلون مزاجی کے آگے اس کی کوشش رائیگاں گئی۔

بالآخر مستعصم کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنی اور اپنی رعایا کی زندگیاں بچانے کے خیال سے ہتھیار ڈال دے اور ہلاکو سے ملنے جائے۔ چنانچہ وہ اپنے بھائی، دو بیٹوں اور تقریباً تین ہزار اعیان سلطنت کے ساتھ جن میں قاضی، شیخ، امام اور دوسرے ممتاز لوگ شامل تھے ہلاکو کے لشکر میں گیا۔

مگر صرف خلیفہ، اس کے بھائی، بیٹوں اور تین اور شخصوں کو باریابی کی اجازت ملی۔ اس نے خلیفہ سے کہا کہ آپ اپنی رعایا کو پیغام بھیجئے کہ اپنے اپنے ہتھیار پھینک کر وہ شہر کے دروازوں کے باہر جمع ہو جائیں تاکہ مردم شماری کی جائے۔ شہریوں نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی اور نہتے شہر سے باہر نکل آئے تاتاریوں نے ان سب کو پکڑ لیا۔ اگلے دن طلوع آفتاب کے وقت ہلاکو نے شہر کو لوٹنے اور شہریوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ عورتیں اور بچے، قرآن لیے ہوئے گھروں سے باہر نکلے انہیں رہائی دینے کی بجائے روند کر ہلاک کر دیا۔ اعلیٰ خاندان خواتین جنہیں کبھی ہنگاموں سے سابقہ نہیں پڑا تھا سڑکوں پر گھسیٹی گئیں اور ہر طرح کی درندگی ان کے ساتھ کی گئی۔ آرٹ اور ادب کے خزانے جو نہایت اہتمام اور محنت سے بادشاہوں نے جمع کیے تھے چند گھنٹوں میں تباہ کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ پرانی ایرانی تہذیب کے آثار باقیہ بھی مٹ گئے۔ تین دن تک شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر خون بہتا رہا اور دجلہ کے پانی کا رنگ میلوں تک سرخ ہو گیا۔ چھ ہفتے تک قتل و غارت گری جاری

رہی۔ محلات، مسجدیں اور مقبرے اس لیے منہدم کیے گئے کہ ان کے طلائی قبوں کا سونا ہاتھ لگے۔ شفاخانوں میں مریضوں کو اور کالجوں میں طلبہ اور مدرسین کو تہ تیغ کر دیا۔ کتابیں آگ میں جلا دیں یا جہاں دریائے دجلہ نزدیک تھا وہاں اس میں پھینک دیں۔ اس طرح پانچ سو سال کی جمع کی ہوئی علمی دولت سے انسانیت ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی اور قوم کے افضل ترین لوگ نیست و نابود کر دیئے گئے۔ مستعصم اور اس کے بیٹوں اور خاندان کے اہم ارکان کو پیٹ پیٹ کر ہلاک کیا۔ بغداد جو علم کا مسکن، تہذیب کا گہوارہ اور مسلمانوں کی دنیا کا مرکز بلکہ اس کی آنکھ کی پتلی تھا وہ ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا۔ اس کی آبادی بیس لاکھ تھی جس میں سے بقول ابن خلدون سولہ لاکھ ہلاک ہو گئے۔ بغداد کی تباہی سے مغربی ایشیا پر تیرگی چھا گئی۔

"بغداد کو تباہ کرنے کے بعد درندوں کا لشکر دریائے فرات عبور کر کے عراق (Mesopotamia) میں داخل ہوا اور جہاں جہاں سے گزرا تباہی اور قتل عام کا بازار گرم کیا۔ اڈیسہ، حران اور نصیبین کے لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ حلب میں پچاس ہزار آدمی قتل کیے اور دس ہزار عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر بیچا۔ حران نے اس وعدہ پر کہ شہر محفوظ رہے گا، ہتھیار ڈال دیئے تھے مگر اپنے عہد کو توڑ کر وحشیوں نے سارے شہریوں کو ہلاک کر دیا۔ دودھ پیتے بچے بھی نہ چھوڑے۔ تاتاری مغرب کی طرف بڑھتے اور تاخت و تاراج کرتے گئے۔ حتیٰ کہ عین جالوت کے مقام پر پہنچے یہ فلسطین میں Nazareth کے قریب ایک قصبہ تھا۔ یہاں سلطان بیبرس نے جو بعد میں مصر کا بادشاہ بنا، تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور انہیں سخت شکست دی جس میں تاتاریوں کی بڑی تعداد کام آئی۔ بیبرس نے میدان سے بھاگتے ہوئے تاتاریوں کا حلب سے آگے تک تعاقب کیا اور شام اور عراق سے ان قابل نفرت درندوں کو نکال دیا"۔

بغداد کی تباہی سے چالیس سال پہلے 1218ء سے 1221ء تک کے تین سال کے عرصے میں ہلاکو کا دادا چنگیز ماورالنہر (Transuxiana) کو تباہ کر چکا تھا۔ محمد شاہ خوارزمی نے جو ماوراء النہر کا بادشاہ تھا، اپنی ناعاقبت اندیشی سے چنگیز کو حملہ آور ہونے کا موقع دیا۔ سید امیر علی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب 1218ء میں چنگیز نے لاکھوں آدمیوں کے لشکر سے حملہ کیا تو اس وقت ماوراء النہر، خراسان اور ایران کے لوگ خوشحال تھے۔ ادب، آرٹ اور ہر طرح کی صنعت و حرفت فروغ پا رہی تھی۔ ہرات اور بلخ کی دس لاکھ کی آبادی تھی، بخارا اور سمرقند کی اس سے بھی زیادہ تھی۔ چنگیز نے خوارزم شاہ کو شکست دے کر تباہی اور غارت گری کا بازار گرم کیا۔ خوجند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس کے باشندوں کو قتل کر دیا، بخارا کو جلا کر راکھ کر دیا، سغد کی خوبصورت وادی سے گزرتا ہوا چنگیز سمرقند پہنچا جو ماوراء النہر کا دارالسلطنت ہونے کے علاوہ دنیا کی تجارت کا مرکز تھا۔ اعیان سلطنت نے شہر کو بچانے کی غرض سے ہتھیار ڈال دیئے اور شہر چنگیز کے حوالے کر دیا۔ اس کے باوجود شہر لوٹا

گیا اور اس کے باشندوں کی بھاری تعداد قتل کی گئی۔ دس لاکھ سے زائد آدمیوں میں سے صرف پچاس ہزار بچے۔ بلخ کے باشندوں نے چنگیز کی خدمت میں تحائف بھیجے تاکہ ان کا شہر کسی طرح محفوظ رہے۔ مردم شماری کے بہانے لوگوں کو شہر سے باہر نکال کر چنگیز نے سب کو مروا ڈالا اور شہر کو آگ لگا دی۔ خیوا میں قتل عام ہوا اور اس کے بعد دریا کے بند کھول دیئے جس سے شہر تباہ ہوگیا۔ نیسا (Nessa) میں ستر ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کو برابر برابر لٹا کر رسیوں سے جکڑ دیا اور پھر تیر مار مار کے ہلاک کیا۔ نیشا پور کا پورا شہر منہدم کر کے ہل چلوا دیا اور جو بوا دیئے۔ میرخوند کے بیان کے مطابق نیشا پور اور ملحق اضلاع میں سترہ لاکھ سینتالیس ہزار آدمی مارے گئے۔ ہرات اور اس کے مضافات میں ہفتہ بھر تک قتل، غارت گری اور آتش زدگی جاری رہی جن میں سولہ لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ چنگیز خان کی فوج کے چلے جانے کے بعد کل چالیس آدمی باقی تھے جو جلی ہوئی جامع مسجد میں جمع ہوئے۔ نیشا پور کے ارد گرد کا علاقہ ریگستان بن گیا۔ رے، دناور اور ہمدان لوٹے گئے اور باشندوں کی بڑی تعداد کو مار ڈالا اور اس کے بعد تاتاری عراق کی طرف بڑھے مگر خلیفہ مستنصر کی فوج نے انہیں مار بھگایا۔

امیر علی اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جس تہذیب نے ماوراء النہر اور خراسان میں صدیوں میں نشوونما پائی تھی اسے چنگیز نے ملیامیٹ کر دیا۔ مہذب لوگ قعر مذلت میں دھکیل دیئے گئے جہاں ان کی پرانی عظمت خواب و خیال ہوگئی اور مستقبل بھی اسی کی نذر ہوگیا۔ ایشیائے وسطیٰ کی وہ شاہراہیں جن کے ذریعہ چین اور ہندوستان کے مصنوعات مغربی ایشیا اور یورپ جاتے تھے ویران ہو گئیں۔ زرخیز زمینیں افتادہ پڑی رہنے کے باعث بنجر بن گئیں۔ فنون اور مصنوعات پر جن کے لیے اسلامی ممالک دور دور مشہور تھے، ہمیشہ کے لیے زوال آگیا۔ ہزاروں کاریگر غلام بنا کر تاتاریوں نے مشرقی ممالک کو اس غرض سے بھیجے تھے کہ وہاں ان کی مصنوعات زینت و آرائش کا باعث بنیں۔ ایشیائے وسطیٰ کی علمی اور ذہنی زندگی مٹ کر رہ گئی۔ گو ایران اور مغربی ایشیا نے بعد میں کچھ سنبھالا لیا مگر بخارا اور سمرقند میں وہ ذہنی توانائی پھر کبھی نہیں آئی اور ان کی تمام دماغی مساعی تصوف اور سوفسطائیت کی نذر ہوگئیں۔

سید امیر علی نے اس المناک انقلاب پر کئی بڑے مورخین کی آراء نقل کی ہیں۔ ہم جہاں کشا کے مصنف جوینی کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جب چنگیز نے ایشیائے وسطی میں قتل و غارت اور تاخت و تاراج کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس وقت جوینی اس کی ملازمت میں تھا اور بعد میں وہ 1256ء سے 1265ء تک ہلاکو کا معتمد رہا۔ جوینی کہتا ہے:

"اس انقلاب نے دنیا کو تہ و بالا اور علم اور علماء کو نیست و نابود کر دیا۔ خراسان جو نور علم کا مرکز اور اہل علم کا مرجع تھا بالخصوص اس کا نشانہ بنا، اہل علم تہ تیغ کر دیئے گئے۔ اب سائنس اور خیر کے قحط کا دور دورہ ہے"۔

ہلاکت اور تباہی کی مندرجہ بالا تفصیلات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کے علمی زوال کے اسباب سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ایسی قیامت کسی قوم پر کبھی نہ ٹوٹی تھی۔ اس صدی کا مشہور مورخ ول ڈیوراں "مذہب کا عہد" میں کہتا ہے کہ:

"ہزاروں عالم، فاضل، سائنس داں، مشاہیر اندھا دھند قتل کر دیئے گئے۔ جو کتب خانے اور علم کے خزانے صدیوں میں جمع کیے گئے تھے وہ چند دنوں میں تباہ ہو گئے۔ لاکھوں کتابیں صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں ... تاریخ گواہ ہے کہ اس سے پہلے ایسی کاری ضرب کسی تہذیب کو نہیں لگی تھی۔ جب یہ خونی طوفان ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ معاشی نظام بالکل مفلوج ہو چکا ہے۔ نہریں ٹوٹ یا اٹ کر بے کار ہو گئی ہیں، مدرسے اور کتب خانے راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور آدھی آبادی جو باقی رہ گئی ہے اس کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے ہیں"۔

ناصرالدین طوسی کو جو نصیرالدین طوسی بھی کہلاتا ہے ہلاکو خان نے اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ ناصرالدین علم نجوم میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا اور ہلاکو کو پیش آنے والے امور کے بارے میں پیشین گوئیاں کرتا رہتا تھا اس لیے اس کا ہلاکو پر بہت اثر تھا۔ جب اس کے مشورے سے خلافت عباسیہ کا ہلاکو نے خاتمہ کرایا تو ناصرالدین نے ہلاکو کو سمجھایا کہ جو عظیم نقصانات اس کے ہاتھوں علم اور اہل علم کو پہنچے ہیں ان کی تھوڑی بہت تلافی کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہلاکو نے ناصرالدین کی یہ تجویز مان لی کہ مراغہ میں جہاں ہلاکو کا اپنا بیشتر وقت گزرتا تھا ایک بڑی رصدگاہ اور ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا جائے۔ ہلاکو نے ناصرالدین کو ناظم اوقاف بنا دیا اور اسے اختیار دیا کہ اوقاف کی آمدنی میں سے بقدر ضرورت رصدگاہ اور کتب خانے کی تعمیر پر روپیہ خرچ کیا جائے۔ ناصرالدین کی کوشش سے بچے کھچے ہیئت دانوں میں سے کچھ مراغہ پہنچ کر تحقیقاتی کام میں مشغول ہوگئے۔ ان کی بدولت مراغہ کی رصدگاہ کا نام ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ لیکن یہ رصدگاہ زیادہ دن نہ چلی۔ ہلاکو 1265ء میں مر گیا اور ناصرالدین کا انتقال 1274ء میں ہوا۔ ناصرالدین کے دو بیٹوں نے اس رصدگاہ کا انتظام سنبھالا۔ مگر ہلاکو کے جانشینوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی جس کی وجہ سے یہ بند ہوگئی۔ پھر 1420ء میں تیمور لنگ کے پوتے الغ خاں نے جو بعد میں اپنے والد شاہ رخ کی وفات پر بادشاہ ہوا، سمرقند میں ایک رصدگاہ قائم کی۔ یہ اس سے بھی بڑی تھی جو مراغہ میں ناصرالدین نے قائم کرائی تھی۔ مراغہ اور سمرقند کی رصدگاہوں کی بدولت علوم ریاضی و ہیئت مسلمانوں میں کافی عرصے تک زندہ رہے۔ جب واسکوڈا گاما نے

گیا اور اس کے باشندوں کی بھاری تعداد قتل کی گئی۔ دس لاکھ سے زائد آدمیوں میں سے صرف پچاس ہزار بچے۔ بلخ کے باشندوں نے چنگیز کی خدمت میں تحائف بھیجے تاکہ ان کا شہر کسی طرح محفوظ رہے۔ مردم شماری کے بہانے لوگوں کو شہر سے باہر نکال کر چنگیز نے سب کو مروا ڈالا اور شہر کو آگ لگا دی۔ خیوا میں قتل عام ہوا اور اس کے بعد دریا کے بند کھول دیئے جس سے شہر تباہ ہوگیا۔ نیسا (Nessa) میں ستر ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کو برابر برابر لٹا کر رسیوں سے جکڑ دیا اور پھر تیر مار مار کے ہلاک کیا۔ نیشا پور کا پورا شہر منہدم کر کے ہل چلوا دیا اور جو بوا دیئے۔ میر خوند کے بیان کے مطابق نیشا پور اور ملحق اضلاع میں سترہ لاکھ سینتالیس ہزار آدمی مارے گئے۔ ہرات اور اس کے مضافات میں ہفتہ بھر تک قتل، غارت گری اور آتش زدگی جاری رہی جن میں سولہ لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ چنگیز خان کی فوج کے چلے جانے کے بعد کل چالیس آدمی باقی تھے جو جلی ہوئی جامع مسجد میں جمع ہوئے۔ نیشا پور کے ارد گرد کا علاقہ ریگستان بن گیا۔ رے، دناور اور ہمدان لوٹے گئے اور باشندوں کی بڑی تعداد کو مار ڈالا اور اس کے بعد تاتاری عراق کی طرف بڑھے مگر خلیفہ متنصر کی فوج نے انہیں مار بھگایا۔

امیر علی اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جس تہذیب نے ماوراء النہر اور خراسان میں صدیوں میں نشوونما پائی تھی اسے چنگیز نے ملیا میٹ کر دیا۔ مہذب لوگ قعر مذلت میں دھکیل دیئے گئے جہاں ان کی پرانی عظمت خواب و خیال ہو گئی اور مستقبل بھی اسی کی نذر ہوگیا۔ ایشیائے وسطیٰ کی وہ شاہراہیں جن کے ذریعہ چین اور ہندوستان کے مصنوعات مغربی ایشیا اور یورپ جاتے تھے ویران ہو گئیں۔ زرخیز زمینیں افتادہ پڑی رہنے کے باعث بنجر بن گئیں۔ فنون اور مصنوعات پر جن کے لیے اسلامی ممالک دور دور مشہور تھے، ہمیشہ کے لیے زوال آگیا۔ ہزاروں کاریگر غلام بنا کر تاتاریوں نے مشرقی ممالک کو اس غرض سے بھیجے تھے کہ وہاں ان کی مصنوعات زینت و آرائش کا باعث بنیں۔ ایشیائے وسطیٰ کی علمی اور ذہنی زندگی مٹ کر رہ گئی۔ گو ایران اور مغربی ایشیا نے بعد میں کچھ سنبھالا لیا مگر بخارا اور سمرقند میں وہ ذہنی توانائی پھر کبھی نہیں آئی اور ان کی تمام دماغی مساعی تصوف اور سوفسطائیت کی نذر ہوگئیں۔

سید امیر علی نے اس المناک انقلاب پر کئی بڑے مورخین کی آراء نقل کی ہیں۔ ہم جہاں کشا کے مصنف جوینی کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جب چنگیز نے ایشیائے وسطی میں قتل و غارت اور تاخت و تاراج کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس وقت جوینی اس کی ملازمت میں تھا اور بعد میں وہ 1256ء سے 1265ء تک ہلاکو کا معتمد رہا۔ جوینی کہتا ہے:

"اس انقلاب نے دنیا کو تہ و بالا اور علم اور علماء کو نیست و نابود کر دیا۔ خراسان جو نور علم کا مرکز اور اہل علم کا مرجع تھا بالخصوص اس کا نشانہ بنا، اہل علم تہ تیغ کر دیئے گئے۔ اب سائنس اور خیر کے قحط کا دور دورہ ہے"۔

ہلاکت اور تباہی کی مندرجہ بالا تفصیلات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کے علمی زوال کے اسباب سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ایسی قیامت کسی قوم پر کبھی نہ ٹوٹی تھی۔ اس صدی کا مشہور مورخ ول ڈیوراں "مذہب کا عہد" میں کہتا ہے کہ:

"ہزاروں عالم، فاضل، سائنس داں، مشاہیر اندھا دھند قتل کر دیئے گئے۔ جو کتب خانے اور علم کے خزانے صدیوں میں جمع کیے گئے تھے وہ چند دنوں میں تباہ ہو گئے۔ لاکھوں کتابیں صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں ... تاریخ گواہ ہے کہ اس سے پہلے ایسی کاری ضرب کسی تہذیب کو نہیں لگی تھی۔ جب یہ خونی طوفان ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ معاشی نظام بالکل مفلوج ہو چکا ہے۔ نہریں ٹوٹ یا اٹ کر بے کار ہو گئی ہیں، مدرسے اور کتب خانے راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور آدھی آبادی جو باقی رہ گئی ہے اس کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے ہیں"۔

ناصر الدین طوسی کو جو نصیر الدین طوسی بھی کہلاتا ہے ہلاکو خان نے اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ ناصر الدین علم نجوم میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا اور ہلاکو کو پیش آنے والے امور کے بارے میں پیشین گوئیاں کرتا رہتا تھا اس لیے اس کا ہلاکو پر بہت اثر تھا۔ جب اس کے مشورے سے خلافت عباسیہ کا ہلاکو نے خاتمہ کرایا تو ناصر الدین نے ہلاکو کو سمجھایا کہ جو عظیم نقصانات اس کے ہاتھوں علم اور اہل علم کو پہنچے ہیں ان کی تھوڑی بہت تلافی کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہلاکو نے ناصر الدین کی یہ تجویز مان لی کہ مراغہ میں جہاں ہلاکو کا اپنا بیشتر وقت گزرتا تھا ایک بڑی رصدگاہ اور ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا جائے۔ ہلاکو نے ناصر الدین کو ناظم اوقاف بنا دیا اور اسے اختیار دیا کہ اوقاف کی آمدنی میں سے بقدر ضرورت رصدگاہ اور کتب خانے کی تعمیر پر روپیہ خرچ کیا جائے۔ ناصر الدین کی کوشش سے بچے کھچے ہیئت دانوں میں سے کچھ مراغہ پہنچ کر تحقیقاتی کام میں مشغول ہو گئے۔ ان کی بدولت مراغہ کی رصدگاہ کا نام ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ لیکن یہ رصدگاہ زیادہ دن نہ چلی۔ ہلاکو 1265ء میں مر گیا اور ناصر الدین کا انتقال 1274ء میں ہوا۔ ناصر الدین کے دو بیٹوں نے اس رصدگاہ کا انتظام سنبھالا۔ مگر ہلاکو کے جانشینوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی جس کی وجہ سے یہ بند ہوگئی۔ پھر 1420ء میں تیمور لنگ کے پوتے الغ خاں نے جو بعد میں اپنے والد شاہ رخ کی وفات پر بادشاہ ہوا، سمرقند میں ایک رصدگاہ قائم کی۔ یہ اس سے بھی بڑی تھی جو مراغہ میں ناصر الدین نے قائم کرائی تھی۔ مراغہ اور سمرقند کی رصدگاہوں کی بدولت علوم ریاضی و ہیئت مسلمانوں میں کافی عرصے تک زندہ رہے۔ جب واسکوڈا گاما نے

1492ء میں ہندوستان کا بحری سفر کیا تو اس کے جہاز کی رہنمائی سمرقند کی رصد گاہ کی تیار کردہ زیچوں نے کی تھی۔ اس کے جہاز کے ناخدا بھی مسلمان تھے۔

مسلمانوں کے علمی زوال کے کچھ اسباب بیان کرنے کے بعد اب پھر ریاضی و ہیئت کے مسلمان عالموں کا ذکر کرنا مناسب ہو گا۔

المفضل ابن عمر الابہری۔ ابہری میں پیدا ہوا۔ یہ ایران کے ایک قصبہ کا نام ہے۔ وہ ریاضی ہیئت دان ہونے کے علاوہ منطقی اور فلسفی بھی تھا اس کی پیدائش کی تاریخ نہیں معلوم۔ اس کا انتقال 1263ء میں ہوا۔ اس نے کمال الدین ابن یونس سے تحصیل علم کی۔ وہ 1228ء میں موصل سے اربیل جا کر سکونت پذیر ہوا، اس کی کئی تصنیفات ہیں۔ علم ہیئت پر اس نے "مختصر فی العلم الہیہ" لکھی جو بائیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہیئت پر اس کی تصنیف "الزیج الشامل" ہے ان کے علاوہ اس کی دو اور کتابیں بھی علم ہیئت پر ہیں یعنی "کشف الحقائق فی التحریر الاقائق" اور "رسالہ فی الاصطرلاب"۔ فلسفہ پر اس کی کتاب کا نام "زبدۃ الاسرار" ہے جس کا ابوالفرح نے سریانی میں ترجمہ کیا۔ ابہری کی کتاب "ہدایت الحکمہ" نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ منطق، طبیعیات اور الٰہیات پر ہے۔ اس پر متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ یہ سب کتابیں عربی زبان میں تصنیف کی گئیں۔

نجم الدین علی ابن عمر القزوینی الکاتبی کی پیدائش کی تاریخ نہیں معلوم۔ اس کا انتقال 1227ء میں ہوا۔ مراغہ میں جو رصد گاہ ناصرالدین طوسی نے قائم کی تھی، اس کے ہیئت دانوں میں سے الکاتبی بھی تھا۔ وہ ہیئت داں ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھا۔ اس نے عربی زبان میں کتاب "عین القواعد فی المنطق و الحکمہ" لکھی۔ اس میں منطق اور فلسفہ کے علاوہ ریاضی اور طبیعی علوم (Natural Sciences) سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں اس نظریہ پر بھی رائے زنی کی ہے کہ دنیا اپنے محور پر گھومتی ہے۔ اس نے اس نظریہ کو رد کرنے کے لیے یہ استدلال کیا ہے کہ ارضی حرکت دائرہ کی شکل میں نہیں ہو سکتی۔

ابوالعباس احمد ابن محمد ابن عثمان الازدی ابن البناء بناء معمار کو کہتے ہیں۔ اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والدین عمارت کے ماہر ہوں گے۔ ابن البناء 1256ء میں مراکش میں پیدا ہوا اور وہیں اس کا انتقال 1321ء میں یا اس کے کچھ عرصے بعد ہوا۔ وہ ریاضی و ہیئت داں تھا اس نے علم ہندسہ، علم جبر و مقابلہ، علم حساب اور علم ہیئت پر کتابیں تصنیف کیں۔ "تلخیص فی اعمال الحساب" جو محمد ابن عبداللہ الحصار کی کتاب پر مبنی ہے بہت مقبول ہوئی۔ الحصار کی کتاب کا عبرانی میں ترجمہ بھی ہوا تھا۔ "تلخیص" پر بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ علم ہندسہ پر ابن البناء نے "رسالہ فی

العلم المساحتہ" تصنیف کیا۔ اس میں سطح کی پیمائش کے اصول اور طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ علم جبر و مقابلہ پر اس کی کتاب کا نام "کتاب الاصول و المقدمات فی الجبر و المقابلہ" ہے، ہیئت پر اس نے "کتاب منہاج الطالب فی عدیل الکواکب" لکھی۔ اس میں قبلہ کا صحیح رخ متعین کرنے پر بھی بحث کی ہے۔ الرزمال کے اصطرلاب "صفیحہ" پر بھی اس نے ایک رسالہ لکھا۔ تقویمیں تیار کرنے کے طریقے اس نے "کتاب المناخ" میں بتائے۔ لاطینی لفظ Almanac المناخ ہی سے بنا ہے۔ علم الحساب پر "تلخیص" کے علاوہ کئی کتابیں اور بھی ہیں جن کے نام "رفع الحجاب"، "المقالات فی الحساب"، "تنبیہہ الالباب" "وفات الاسماء" (On Binomials) اور منفصلات" (On Apotomes) اس کی دو اور کتابوں کے نام ہیں۔

ابن البناء عالم متبحر تھا۔ ابن خلدون نے اس کا بہت تعریف اور احترام سے ذکر کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ابن خلدون کے استاد ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم الابلی کا استاد تھا۔ ابن البناء اس لیے بھی تعریف کا مستحق ہے کہ "تلخیص فی اعمال الحساب" دو سو سال تک پڑھائی گئی۔ آخر عمر میں وہ صوفی ہو گیا۔

ابوجعفر محمد ابن محمد ابن الحسن ناصر الدین الطوسی المحقق کو نصیر الدین طوسی بھی کہتے ہیں۔ وہ 1201ء میں پیدا ہوا اور 1274ء میں فوت ہوا۔ اس کی جائے پیدائش کے بارے میں کچھ لوگ ساوہ بتاتے ہیں اور کچھ طوس۔ اس نے کمال الدین ابن یونس سے تعلیم پائی وہ بہت بڑا ریاضی و ہیئت داں ہونے کے علاوہ حاذق طبیب اور عظیم فلسفی بھی تھا۔ اس کا شمار بہت بڑے ریاضی دانوں میں ہوتا ہے۔ فرقہ اسمٰعیلیہ کے گورنر نے اسے اغوا کر کے قلعہ میں نظر بند کر رکھا تھا۔ 1256ء میں ہلاکو نے یہ قلعہ فتح کیا تو ناصرالدین کو آزادی ملی۔ ناصرالدین نے اسمٰعیلیوں کے مرشد اعلیٰ رکن الدین خود شاہ کو جو کوہستان کے علاقہ پر قابض تھا مشورہ دیا کہ ہلاکو سے برسر پیکار رہنے کے بجائے خود کو اس کے حوالے کر دے اس نے اس مشورہ پر عمل کیا۔ ہلاکو نے ناصرالدین کو اپنا وزیر بنا لیا اور جب فروری 1258ء میں ہلاکو بغداد پر حملہ آور ہوا تو ناصر الدین بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہلاکو ناصرالدین کے مشوروں کی بڑی قدر کرتا تھا اور علوم نجوم کی بناء پر وہ جو پیشین گوئیاں کرتا ان پر یقین رکھتا۔ اسی کے مشورہ سے ہلاکوں نے مراغہ میں ایک بہت بڑی رصد گاہ قائم کی۔

ناصرالدین نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اس نے علم ہندسہ (Geometry) پر خاص توجہ دی اور اس کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس سے پہلے علم ہندسہ علم ہیئت کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ناصر الدین نے ترقی دے کر اسے ایک مستقل علم کی حیثیت دی اور اس پر علیحدہ کتاب تصنیف کی جس کا نام "کتاب شکل القطاع" ہے۔ اس کتاب کے تیسرے اور چوتھے حصوں میں علم ہندسہ کی

مسطح اور کروی حیثیتوں سے بحث کی ہے ۔ یہ کتاب اس علم پر قرون وسطیٰ کی سب سے اہم کتاب ہے۔

علم ہیئت پر اس نے کئی کتابیں لکھیں جن میں "تذکرہ فی علم الہیئۃ" جس کو التذکرۃ الناصریہ بھی کہتے ہیں سب سے زیادہ اہم ہے ۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ان بے شمار شرحوں سے کیا جا سکتا ہے جو اس پر لکھی گئیں ۔ البطروجی کی طرح وہ بھی بطلیموسی نظریہ سے مطمئن نہیں تھا ۔ اس نے اس نظریہ کی تنقیص کی مگر خود اس کا نعم البدل نہ پیش کرسکا ۔ مختلف علوم پر اس کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

علم العین پر "تحریر کتاب المناظر" موسیقی پر "کتاب فی علم الموسیقی" علم معدنیات پر "تنسوق نامہ اہل خانہ" (یہ کتاب فارسی میں لکھی ۔ تنسوق کے معنی عجائب یا کم اشیاء کے ہیں) جغرافیہ پر "کتاب صورت الاقالیم" مابعد الطبیعات پر "کتاب الفصول" فلسفہ پر "رسالہ فی اثبات الجواہر المفارق" الٰہیات پر "جواہر الفرائض الناصریہ" علم الکلام پر "تجرید العقائد" اخلاق پر "اخلاق ناصری" اور اوصاف الاشراف فی السیر والسلوک" ۔ "تجرید العقائد" پر بہت سی شرحیں لکھی گئیں اور یہ اپنی نوعیت کی بڑی اہم کتاب ہے ۔ "اخلاق ناصری" بہت مقبول ہوئی اور آج تک اس کا اثر قبول کیا جاتا ہے ۔ اوصاف الاشراف پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔

ناصر الدین شاعر بھی تھا ۔ اس کی کچھ رباعیاں آج عمر خیام کی رباعیوں میں شامل کی گئی ہیں۔

ناصر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس ناقابل تلافی نقصان کی جو علم و حکمت کو ہزاروں درسگاہیں اور لاکھوں کتابیں ضائع ہونے سے پہنچا تھا، تھوڑی بہت تلافی مراغہ میں رصد گاہ اور کتب خانہ قائم کرکے کی ۔ اس نے کئی ممتاز ہیئت دانوں مثلاً علی بن عمر القزوینی الکاتبی (متوفی 1277ء) موئد الدین القرضی الدمشقی ، فخر الدین الخلاطی التفلسی ، محی الدین المغربی اور فخر الدین المراغی الموصلی کو بلا کر رصد گاہ میں تحقیقی کام کو زندہ رکھا ۔ بارہ سال متواتر محنت کرکے ایک مستند زیج تیار کی جو "زیج الایل خانی" کہلائی ۔ اس کے مرتب کرنے میں قدیم یونانی ہیئت دانوں سے بھی استفادہ کیا اور البتانی ، ابن الاعلم اور کمال الدین ابن یونس ایسے ممتاز ماہرین فلکیات کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود اس رصد گاہ کے مشاہدات کو اہمیت دی گئی ۔ اس زمانے میں چین میں بھی تاتاریوں کی حکومت تھی ۔ وہاں کے کچھ سائنسدانوں نے مراغہ آکر تحصیل علم کی ۔ اس رصد گاہ کے کتب خانہ میں شام ، عراق اور ایران سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں جمع کی گئیں جن کی تعداد چار

لاکھ تک پہنچ گئی ۔ محی الدین المغربی نے چینی تقویم پر ایک کتاب لکھی تھی ۔ مسلمان سائنس داں خان بلق (Pei - Ping) بلائے گئے ، اغلب یہ ہے کہ علم ہندسہ کو ان سائنسدانوں نے چین میں رائج کیا۔

چین میں مسلمان سائنسدانوں کے جانے کا ذکر آگیا تو مناسب ہوگا کہ مختصر طور پر چین کے مسلمانوں کا بھی کچھ حال لکھ دیا جائے ۔ چین کے مسلمانوں کو ہوئی ہوئی (Hui - Hui) کہتے ہیں ۔ اس کی وجہ تسمیہ چین کے اٹھارہویں صدی کے مسلمان ادیب لیو چیہ (Liu Chih) نے یہ بتائی ہے کہ لفظ ہوئی کے معنی واپس آنے کے ہیں ۔ شروع وسط ایشیا سے جو مسلمان آئے وہ ایغور (Uighur) ترک تھے ۔ چینی رسم الخط میں یوالغورلو "ہوئی ہو" لکھا گیا ۔ بعد میں جب اور مسلمان ہوئے جو یوایغور میں تھے تو ان کو "ہوئی ہوئی" کہنے لگے ۔ غیر مسلم چینی کہتے ہیں کہ جب مسلمان یہاں آئے تھے تو انہوں نے واپس چلے جانے کا وعدہ کیا تھا اس سبب سے ان کو "ہوئی ہوئی" کہتے ہیں۔

مسلمان ترکوں کے چین جانے سے پہلے عرب کے مسلمان پانی کے راستے تجارت کی غرض سے جاتے تھے ۔ نویں صدی میں عربوں کی بحری طاقت بہت بڑھ گئی تھی اور ایشیا کی بحری تجارت پر وہ مکمل طور پر قابض ہو گئے تھے ۔ ابن وہب کے "اخبار السین و الہند" سے یہ ثابت ہے کہ 870ء میں وہ ہندوستان اور چین گیا تھا اور ان ممالک کے حالات اس نے قلمبند کیے تھے ۔ "اخبار السین و الہند" تو اب ناپید ہے لیکن ابوزید نے ان ملکوں کے حالات محفوظ کر لیے تھے جو موجود ہیں ۔ مسلمان تاجروں میں سے کچھ چین کی بندرگاہ کینٹن ، ہانگ چاؤ وغیرہ میں بس گئے ۔ کینٹن میں ایک مقبرہ ہے جسے سعد بن ابی وقاص کا مقبرہ سمجھا جاتا ہے ۔ وسط ایشیا سے جو مسلمان آئے ان کی تعداد زیادہ تھی ۔ 801ء میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمان فوجی چین کی فوج میں داخل ہو چکے تھے ۔ 1070ء میں بخارا سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آئی ۔ انہیں میں سے ایک کی اولاد میں السید الاجل شمس الدین عمر ہوا جس نے چنگیز خاں کی ملازمت اختیار کی ۔ اس کے بیٹے ناصر الدین نے بڑا نام پیدا کیا اور صوبہ یونان (Yunan) کا گورنر مقرر کیا گیا ۔ 1292ء میں اس کا بھائی حسین گورنر ہوا ۔ 1280ء سے 1368ء تک چین میں تاتاریوں کی حکومت رہی ۔ انہوں نے شمس الدین عمر کے خاندان کو بہت نوازا اور اس دور میں مسلمانوں کا نفوذ و وقار بہت بڑھ گیا ۔ 1335ء میں اس خاندان کے ایک نامور فرد (Ching Chen Chiao) نے جس کا نام بھی سید اجل تھا ، شہنشاہ چین سے ایک فرمان حاصل کیا جس کی رو سے اسلام کو سرکاری حیثیت سے سچا اور پاک مذہب تسلیم کیا گیا ۔ جب منگ خاندان کی حکومت آئی تو 1420ء میں مسلمانوں کو سیان فو ، اور نانکنگ میں مسجد بنانے کی اجازت ملی ۔ چینی مسلمانوں میں چینی نسل والوں کی بہت بڑی اکثریت ہے ۔ ان کو اسلامی ممالک میں آنے اور عربی سیکھنے کے بہت ہی کم مواقع حاصل ہوئے اور جو عربی داں مسلمان باہر سے آئے تھے ، وہ چینی رسم الخط سے عموماً ناواقف رہے ۔

مسطح اور کروی حیثیتوں سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب اس علم پر قرون وسطیٰ کی سب سے اہم کتاب ہے۔

علم ہیئت پر اس نے کئی کتابیں لکھیں جن میں "تذکرہ فی علم الہیئۃ" جس کو التذکرۃ الناصریہ بھی کہتے ہیں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ان بے شمار شرحوں سے کیا جا سکتا ہے جو اس پر لکھی گئیں۔ البطروجی کی طرح وہ بھی بطلیموسی نظریہ سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے اس نظریہ کی تنقیص کی مگر خود اس کا نعم البدل نہ پیش کرسکا۔ مختلف علوم پر اس کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

علم العین پر "تحریر کتاب المناظر" موسیقی پر "کتاب فی علم الموسیقی" علم معدنیات پر "تنسوق نامہ اہل خانہ" (یہ کتاب فارسی میں لکھی۔ تنسوق کے معنی عجائب یا کم اشیاء کے ہیں) جغرافیہ پر "کتاب صورت الاقالیم" مابعد الطبیعات پر "کتاب الفصول" فلسفہ پر "رسالہ فی اثبات الجواہر المفارق" الہٰیات پر "جواہر الفرائض الناصریہ" علم الکلام پر "تجرید العقائد" اخلاق پر "اخلاق ناصری" اور اوصاف الاشراف فی السیر والسلوک"۔ "تجرید العقائد" پر بہت سی شرحیں لکھی گئیں اور یہ اپنی نوعیت کی بڑی اہم کتاب ہے۔ "اخلاق ناصری" بہت مقبول ہوئی اور آج تک اس کا اثر قبول کیا جاتا ہے۔ اوصاف الاشراف پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔

ناصر الدین شاعر بھی تھا۔ اس کی کچھ رباعیاں آج عمر خیام کی رباعیوں میں شامل کی گئی ہیں۔

ناصر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس ناقابل تلافی نقصان کی جو علم و حکمت کو ہزاروں درسگاہیں اور لاکھوں کتابیں ضائع ہونے سے پہنچا تھا، تھوڑی بہت تلافی مراغہ میں رصد گاہ اور کتب خانہ قائم کرکے کی۔ اس نے کئی ممتاز ہیئت دانوں مثلاً علی بن عمر القزوینی الکاتبی (متوفی 1277ء) موید الدین القرضی الدمشقی، فخر الدین الخلاطی التفلسی، محی الدین المغربی اور فخر الدین المراغی الموصلی کو بلا کر رصد گاہ میں تحقیقی کام کو زندہ رکھا۔ بارہ سال متواتر محنت کرکے ایک مستند زیچ تیار کی جو "زیج الایل خانی" کہلائی۔ اس کے مرتب کرنے میں قدیم یونانی ہیئت دانوں سے بھی استفادہ کیا اور البتانی، ابن الاعلم اور کمال الدین ابن یونس ایسے ممتاز ماہرین فلکیات کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود اس رصد گاہ کے مشاہدات کو اہمیت دی گئی۔ اس زمانے میں چین میں بھی تاتاریوں کی حکومت تھی۔ وہاں کے کچھ سائنسدانوں نے مراغہ آکر تحصیل علم کی۔ اس رصد گاہ کے کتب خانہ میں شام، عراق اور ایران سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں جمع کی گئیں جن کی تعداد چار

لاکھ تک پہنچ گئی۔ محی الدین المغربی نے چینی تقویم پر ایک کتاب لکھی تھی۔ مسلمان سائنس داں خان بلق (Pei - Ping) بلائے گئے، اغلب یہ ہے کہ علم ہندسہ کو ان سائنسدانوں نے چین میں رائج کیا۔

چین میں مسلمان سائنسدانوں کے جانے کا ذکر آگیا تو مناسب ہوگا کہ مختصر طور پر چین کے مسلمانوں کا بھی کچھ حال لکھ دیا جائے۔ چین کے مسلمانوں کو ہوئی ہوئی (Hui - Hui) کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ چین کے اٹھارہویں صدی کے مسلمان ادیب لیوچیہ (Liu Chih) نے یہ بتائی ہے کہ لفظ ہوئی کے معنی واپس آنے کے ہیں۔ شروع وسط ایشیا سے جو مسلمان آئے وہ ایغور (Uighur) ترک تھے۔ چینی رسم الخط میں یوالغورلو "ہوئی ہو" لکھا گیا۔ بعد میں جب اور مسلمان ہوئے جو یوایغور میں تھے تو ان کو "ہوئی ہوئی" کہنے لگے۔ غیر مسلم چینی کہتے ہیں کہ جب مسلمان یہاں آئے تھے تو انہوں نے واپس چلے جانے کا وعدہ کیا تھا اس سبب سے ان کو "ہوئی ہوئی" کہتے ہیں۔

مسلمان ترکوں کے چین جانے سے پہلے عرب کے مسلمان پانی کے راستے تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔ نویں صدی میں عربوں کی بحری طاقت بہت بڑھ گئی تھی اور ایشیا کی بحری تجارت پر وہ مکمل طور پر قابض ہو گئے تھے۔ ابن وہب کے "اخبار السین و الہند" سے یہ ثابت ہے کہ 870ء میں وہ ہندوستان اور چین گیا تھا اور ان ممالک کے حالات اس نے قلمبند کیے تھے۔ "اخبار السین و الہند" تو اب ناپید ہے لیکن ابوزید نے ان ملکوں کے حالات محفوظ کر لیے تھے جو موجود ہیں۔ مسلمان تاجروں میں سے کچھ چین کی بندرگاہ کینٹن، ہانگ چاؤ وغیرہ میں بس گئے۔ کینٹن میں ایک مقبرہ ہے جسے سعد بن ابی وقاص کا مقبرہ سمجھا جاتا ہے۔ وسط ایشیا سے جو مسلمان آئے ان کی تعداد زیادہ تھی۔ 801ء میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمان فوجی چین کی فوج میں داخل ہو چکے تھے۔ 1070ء میں بخارا سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آئی۔ انہیں میں سے ایک کی اولاد میں السید الاجل شمس الدین عمر ہوا جس نے چنگیز خاں کی ملازمت اختیار کی۔ اس کے بیٹے ناصر الدین نے بڑا نام پیدا کیا اور صوبہ یونان (Yunan) کا گورنر مقرر کیا گیا۔ 1292ء میں اس کا بھائی حسین گورنر ہوا۔ 1280ء سے 1368ء تک چین میں تاتاریوں کی حکومت رہی۔ انہوں نے شمس الدین عمر کے خاندان کو بہت نوازا اور اس دور میں مسلمانوں کا نفوذ و وقار بہت بڑھ گیا۔ 1335ء میں اس خاندان کے ایک نامور فرد (Ching Chen Chiao) نے جس کا نام بھی سید اجل تھا، شہنشاہ چین سے ایک فرمان حاصل کیا جس کی رو سے اسلام کو سرکاری حیثیت سے سچا اور پاک مذہب تسلیم کیا گیا۔ جب منگ خاندان کی حکومت آئی تو 1420ء میں مسلمانوں کو سیان فو، اور نانکنگ میں مسجد بنانے کی اجازت ملی۔ چینی مسلمانوں میں چینی نسل والوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ ان کو اسلامی ممالک میں آنے اور عربی سیکھنے کے بہت ہی کم مواقع حاصل ہوئے اور جو عربی داں مسلمان باہر سے آئے تھے، وہ چینی رسم الخط سے عموماً ناواقف رہے۔

اس لیے مدتوں تک اسلام کی مذہبی کتابیں مسلمانوں کی دسترس سے باہر رہیں ۔ چینی زبان میں سب سے پہلے 1642ء میں رانگ تائی یو نے مذہبی کتاب لکھی جس میں اپنے سچے مذہب (اسلام) کے اصولوں کی تشریح کی ہے ۔ اب تک چین میں صرف تین درجن مذہبی کتابوں سے زیادہ نہیں لکھی گئیں ۔ لیو چیہ نے (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) 1710ء میں عربی حروف تہجی پر ایک کتاب لکھی ۔ اس سے پہلے شاید کوئی اور کتاب عربی علم اللسان پر چین میں نہیں لکھی گئی تھی ۔ چینی مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں کنفوشیس کی تعلیم کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے مگر ایسے عقائد شامل نہیں کیے گئے جو اسلامی عقائد کی تنقیص کرتے ہوں۔

1941ء میں اس وقت کی چینی حکومت نے اسلامی تہذیب و تمدن کی حوصلہ افزائی کے لیے تین بڑی یونیورسٹیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ عربی زبان اور ادب کی تعلیم دینے کی غرض سے شعبہ عربی کھول کر اس میں اور شعبوں کی طرح پروفیسر مقرر کریں ۔ اس وقت چین میں چار کروڑ اسی لاکھ مسلمان تھے جن میں احناف بہت زیادہ اور تھوڑے سے شافعی تھے۔

چنگیز خاں کے ایک اور پوتے کبلائی خان (متوفی 1294ء) نے چین کو فتح کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو اس نے ایران سے مسلمان انجینئر اور ٹیکنیشین بلا کر چینیوں کے خلاف جنگ میں استعمال کیے ۔ ان کے مسلمانی ناموں نے جب چینی روپ اختیار کیا تو ایک کا نام A-Lao-Wa-Ting ، دوسرے کا I -Ssu -Manyin ، تیسرے کا Ma-Ho-Sha اور چوتھے کا Ya-Ku ہوگیا ۔ اسی پر اوروں کو قیاس کر لیجئے۔

موید الدین العروضی الدمشقی دمشق کا رہنے والا تھا ۔ وہ ہیئت داں کے علاوہ مہندس (Engineer) اور مہندس بنا (Architect) بھی تھا ۔ اس کی پیدائش اور اس کے مرنے کی تاریخ نہیں معلوم ۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ 1259ء میں جو رصد گاہ مراغہ میں بنی تھی اس کے ہیئت دانوں میں سے العروضی بھی تھا ۔ مراغہ جانے سے پہلے اس نے دمشق میں آب رسانی کی اسکیم چلائی اور حمص کے بادشاہ کے لیے ایک آلہ رصد ایجاد کیا تھا ۔ مراغہ میں بھی جو آلات بنائے گئے ، ان کی نگرانی العروضی نے کی جس کے نتیجے میں ہر آلہ نہایت احتیاط اور صحت کے ساتھ تیار ہوا ۔ چونکہ وہ فن تعمیر کا ماہر تھا اس کے سپرد ایک مسجد تعمیر کرانے کا کام بھی کیا گیا جو اس نے بحسن و خوبی انجام دیا۔

"رسالہ کیفیۃ الارصاد میں جو غالباً العروضی کی تصنیف ہے ، بہت سے آلات کے نام آئے ہیں جن کے انگریزی نام سارٹن نے یہ لکھے ہیں:

(1) Mural Qaudrant (2) Armillary Sphere (3) Solstial Armmil (4) Equinoctial Armil (5) Hipparch's Diopter(Alibade) (6) Instrument with two Quadrants (7) Instrument with two Limbs (8) Instrument toto Determine Sines and Azimuths, (9) Instruments to Determine Sines and Versed sines (10) The Perfect Instrument, and (11) Parallactic Ruler after Ptolemy

یہ نام اس لیے لکھ دیئے گئے ہیں کہ اگر کوئی عالم ہیئت پڑھے تو ان کی اہمیت کا تعین کر سکے ۔ اس کا ترجمہ کرنے کی اس لیے کوشش نہیں کی گئی کہ جو عربی الفاظ ترجمے میں لکھے جاتے ان کو موجودہ علماء ہیئت جو علم ہیئت انگریزی میں پڑھتے ہیں شاید نہ سمجھ پاتے ۔ دوم یہ کہ صحیح ترجمہ کرنے کے لیے انگریزی اردو کی کوئی ایسی ڈکشنری بھی شاید ہی دستیاب ہوسکتی جن میں ان الفاظ کے مترادف الفاظ پائے جاتے ۔ اسی رسالہ میں ان آلات کے بنانے اور استعمال کرنے کے طریقوں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

العروضی نے کرہ کاملہ (Perfect sphere) کے بنانے اور استعمال پر ایک علیحدہ رسالہ لکھا جس کا نام "رسالہ فی عمل الکرۃ الکاملہ" ہے ۔ اس نے ایک اور کتاب تصنیف کی جس میں سورج کے مرکز سے اس کے اوج (Apogee) کا فاصلہ ناپنے کا طریقہ استعمال کیا ہے۔

فلکی کرے (Celestial Globes) جو چودھویں صدی سے قبل بنے اور آج بھی موجود ہیں ان فلکی کروں کی تعداد پانچ ہے۔

(1) کرہ ویلنشیا (Valencia) ابراہیم ابن سعید السہلی نے اپنے بیٹے محمد کی مدد سے 180-81ء میں بنایا تھا ۔ اس کا قطر دو سو نو ملی میٹر ہے ۔ یہ پیتل کے دو نصف کروں کو جو اندر سے خالی ہیں جوڑ کر بنایا گیا ہے ۔ اس پر ایک ہزار پندرہ ستارے جو سینتالیس مجموعوں (Constellations) سے تعلق رکھتے ہیں ، کندہ کیے گئے ہیں ۔ جس جسامت کا جو ستارہ ہے اسی تناسب سے اس کی جسامت کرہ پر دکھائی گئی ہے یہ کرہ آجکل فلورنس یونیورسٹی میں ہے۔

(2) دوسرا کرہ قیصر ابن ابی القاسم نے 1225ء میں مشرق قریب کے کسی مقام میں بنایا تھا ۔ یہ بھی پیتل کے دو نصف کروں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے اور چار پاؤں پر ٹکا ہوا ہے ۔ اس میں افق (Horizon) اور نصف النہار کے دائرے (Meridian circles) دکھائے گئے ہیں ۔ یہ نیپلز کے

قومی عجائب خانہ میں رکھا ہوا ہے۔

(3) تیسرا فلکی کرہ موصل کے ہیئت داں محمد ابن ہلال نے 76-1275ء میں بنایا تھا۔ یہ بھی پیتل کا ہے اور اس سے ایرانی دستکاری جھلکتی ہے۔ اس کا قطر دو سو چالیس ملی میٹر ہے۔ جسامت میں یہ پانچوں کروں میں بڑا ہے۔ اس میں بھی ستاروں کے سینتالیس مجموعے بروج (Signs of the Zodiac) کے ساتھ دکھا رہے ہیں اور افق کے محیط (Circumference) پر مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کندہ ہے۔ یہ کرہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں محفوظ ہے۔

(4) یہ مشہور ہیئت داں العروضی کے بیٹے محمد نے 1279ء یا 1289ء میں بنایا تھا۔ یہ بھی پیتل کے دو نصف کروں سے بنا ہے۔ اس کا قطر ایک سو چالیس ملی میٹر ہے۔ افق کا دائرہ اور دو حرکت پذیر (Movable) نصف دائرے اس میں سمت الراس (Zenith) پر لگے ہوئے ہیں۔ ان پر درجے کندہ ہیں اس لیے ان سے ہر ستارہ کا انحراف (Declination) اور صعود (Ascension) بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کرہ پر خط استوا (Equator)، مدار الشمس (Ecliptic) اور ستاروں کے اڑتالیس مجموعے چاندی اور سونے سے کندہ کیے گئے ہیں۔ یہ کرہ Mathematical Salon of Dresden میں محفوظ ہے۔

(5) پانچویں کرہ میں کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس کا قطر ایک سو نوے ملی میٹر ہے اور انچاس مجموعے کم و بیش اسی طرح کندہ ہیں جیسے کرہ نمبر 4 پر۔ یہ کرہ Bibliotheque Nationale of Paris میں محفوظ ہے۔

ان کروں کی فہرست میں دو اور کروں کا جو بعد کے ہیں اضافہ کیا جا سکتا ہے:

(6) وہ کرہ جو 74-1573ء میں بنایا گیا اس کا قطر ایک سو پچاس ملی میٹر ہے، یہ بھی Bibliotheque Nationale of Paris میں محفوظ ہے۔

(7) یہ کرہ فلکی جو 2-1701ء میں بنایا گیا اور Library of Leningrad میں محفوظ ہے اس کا قطر ایک سو نوے ملی میٹر ہے۔

یہ اغلب ہے کہ ساتویں کرہ کے بعد کے اور بھی کرے بنائے گئے ہوں اور وہ کبھی نہ کبھی دستیاب ہو جائیں۔

محی الملۃ والدین یحییٰ ابن محمد ابن الشکر المغربی الاندلسی کی پیدائش اور انتقال کا صحیح سن نہیں معلوم۔ غالباً وہ ناصرالدین طوسی کے انتقال کے بعد یعنی 1274ء کے بعد فوت ہوا۔ کچھ عرصہ وہ شام میں رہا۔ پھر مراغہ کی رصدگاہ کے ہیئت دانوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے جو کتاب علم ہندسہ اور علم مثلث (Trigonometry) پر لکھی اس کا وہی نام رکھا جو ناصرالدین طوسی کی کتاب کا نام ہے یعنی "کتاب شکل القطاع"۔ اس نے بہت کچھ ناصر الدین سے لیا ہے مگر اس نے جو کچھ اپنی تحقیق کی بنا پر لکھا ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔ اس نے چینی اور ایغور ترکوں کی تقویمات پر ایک رسالہ لکھا جس کا نام "رسالۃ الخطاء والایغور" ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراغہ کی رصدگاہ قائم ہونے سے چینیوں سے میل جول کے مواقع نکلے یہاں ہلاکو کی حکومت تھی تو چین میں چنگیز خاں کا ایک اور پوتا کبلائی خاں برسراقتدار تھا اور دونوں سلطنتوں کے درمیاں آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں نے چین کے علوم پر کتابیں لکھیں اور چینی سائنس دانوں نے مراغہ میں آ کر تحقیقی کام کیا۔

محمود ابن مسعود ابن مصلح - قطب الدین الشیرازی 1236ء میں پیدا ہوا اور تبریز میں 1311ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ ناصرالدین الطوسی کے بعد تیرہویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا سائنسداں تھا۔ اس نے ناصر الدین سے تحصیل علم کی اور اس کے شاگردوں میں سب سے زیادہ نام پیدا کیا۔ مدتوں وہ خراسان، عراق العجم، عراق العرب، ایران اور روم (ایشیائے کوچک) میں سیروسیاحت کرتا رہا۔ اس سیروسیاحت نے اسے بصیرت عطا کی۔ ہلاکو کی قائم کردہ حکومت، ایل خانی حکومت کہلاتی تھی۔ قطب الدین نے ایل خانی حکمران احمد اور پھر ارغون کی ملازمت کی۔ احمد صرف تین سال 1281ء سے 1284ء تک تخت نشین رہا۔ ارغون کی حکومت کا زمانہ 1284ء سے 1293ء تک یعنی نو سال ہے۔ 84-1283ء میں قطب الدین سیواس اور ملیتیہ (Malatiyah) کا قاضی رہا۔ پھر اسے مصر بھیجا گیا جہاں سے واپسی پر اس نے تبریز میں سکونت اختیار کرلی۔ وہیں اس کا انتقال ہوا۔ وہ کئی علوم یعنی علم ہندسہ، ہیئت، جغرافیہ، علم المناظر، میکینکس (Mechanics) طب اور فلسفہ کا عالم تھا۔ ہیئت پر اس کی سب سے اہم کتاب "نہایت الادراک فی درایت الافلاک" ہے، جو ہیئت کے علاوہ جغرافیہ، علم پیمائش الارض (Geodesy) موسمیات (Meteorology)، میکینکس اور علم المناظر پر بھی محیط ہے۔ یہ ناصرالدین طوسی کی کتاب "تذکرہ فی علم الہیئۃ" پر مبنی ہے۔ مگر اس سے زیادہ مفصل ہے اور کچھ نیا مواد بھی ملتا ہے۔ اس میں ابن الہیثم اور محمد ابن الخرقی کے کائناتی نظریوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ بڑی حیرت ہے کہ اس نے بطلیموسی نظریہ کا اتباع کرتے ہوئے زمین کو محرک کی بجائے ساکن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ البطروجی، ابن باجہ، ابن افلح اور ناصرالدین طوسی وغیرہ بطلیموسی نظام کو غلط ٹھہرا چکے تھے اور قطب الدین ان کے نظریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

علم المناظر پر اس کے نظریات نہایت اہم ہیں ۔ یہ نظریات اور کتابوں کے علاوہ "نہایت الادراک" میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ اس نے علم ہندسہ کے نقطۂ نظر سے بھی علم المناظر پر بحث کی ہے ۔ سب سے پہلے جس نے قوس قزح کی صحیح تشریح کی وہ قطب الدین کی تشریح ہے ۔ اس کی تشریح ذیٹ رش (Dietrich) کی تشریح سے ملتی جلتی ہے ۔ مگر موخرالذکر کی تشریح قطب الدین کی تشریح کے بعد کی ہے ۔ اس لیے قطب الدین کو اولیت کا شرف حاصل ہے ۔ قوس قزح کے رنگوں کی تشریح بعد میں نیوٹن نے کی ۔ "نہایت الادراک" میں جغرافیائی امور پر بھی گفتگو کی ہے ۔ مثلاً سمندروں اور مختلف خطوں کی آب و ہوا کا ذکر کیا ہے ۔ اس نے آب و ہوا پر جو کچھ لکھا ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو البیرونی نے لکھا تھا۔

علم طب پر اس کی اہم ترین تصنیف "کتاب نزہت الحکماء و روضۃ الاطباء" ہے ۔ یہ ابن سینا کی کتاب "قانون فی الطب" کی کلیات پر شرح ہے ۔ جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے اس زمانے میں شرح لکھتے وقت شارح اپنے نظریات بھی پیش کرتا تھا ۔ اس کا دائرہ تصنیف صرف اس کتاب تک محدود نہیں ہوتا تھا جس کی وہ شرح لکھتا تھا ۔ چنانچہ "نزہت الحکماء" میں قطب الدین نے اپنے اور امام فخرالدین رازی اور عبداللطیف کے نظریات بھی پیش کیے ہیں ۔ اس نے سائنس پر بہت سی کتابیں لکھیں ۔ آخر عمر میں اس پر تصوف غالب آگیا اور وہ صوفی بن گیا ۔ اس نے کتب حدیث اور قرآن پر شرحیں لکھیں ۔ ان میں سے ایک کا نام "فتح المنان فی تفسیر القرآن" ہے ۔ اس نے یحییٰ السہروردی کی مشہور کتاب "حکمت الاشراق" پر شرح لکھی ۔ یحییٰ سہروردی(۱) 1154ء میں سہرورد میں پیدا ہوا تھا ۔ اس نے ارسطو کے فلسفہ کی تردید میں ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا تھا جسے وہ حکمت الاشراق یعنی نوری فلسفہ کہتا ہے ۔ یہ دراصل پرانے ایرانی فلسفہ کی نو افلاطونیت، باطنیت، یونانی نظریہ مذہب، اسلامی الٰہیات اور شیعی علوم مخفیہ کی آمیزش سے بنایا گیا تھا، جسے اسلامی حلقوں میں بے دینی سے تعبیر کیا گیا ۔ چنانچہ سہروردی سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے سلطان الظاہر کے حکم سے 1191ء میں حلب میں قتل ہوا ۔ چونکہ اس پر بے دینی کا الزام تھا، اس لیے اسے شیخ المقتول کہتے ہیں، نہ کہ شیخ الشہید ۔ جس سہروردی کو مسلمان بڑا صوفی مانتے ہیں وہ ابوحفص عمر ابن عبداللہ السہروردی ہیں ۔ وہ یحییٰ سہروردی سے دس سال پہلے 45-1144ء میں پیدا ہوئے تھے اور نوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ۔ اس نے بھی یونانی فلسفہ کی تنقیص میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "کشف الفضائح الیونانیہ" ہے ۔ اس کی دوسری تصنیف "کتاب عوارف" اہل تصوف میں بہت ہی مقبول کتاب ہے ۔ شیخ مصلح الدین سعدی بھی اس کے شاگردوں میں سے تھے۔

محمد ابن ابی بکر الفارسی کا سن پیدائش اور سن وفات معلوم نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ وہ تیرہویں صدی کے نصف ثانی میں ہوا ہے ۔ اس نے علم ہیئت پر دو کتابیں لکھیں ایک "نہایت

(۱) ان دونوں "سہروردیوں" کے نام میں "شہاب الدین" شامل ہے (م ۔ ق)

الادراک فی اسرار علوم الافلاک" اور دوسری "معارج الفکر الوہیج" یعنی روشن خیالات تک پہنچنے کی سیڑھی ۔ "معارج" میں اس نے زیچ تیار کرنے کی دشواریاں بیان کی ہیں ۔ "معارج" کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اسے یہودیوں نے عبرانی رسم الخط میں منتقل کیا جس کے دو نسخے آج بھی موجود ہیں۔

محمد ابن اشرف السمرقندی ریاضی و ہیئت داں ہونے کے علاوہ منطق میں بھی اسے ید طولیٰ تھا ۔ چنانچہ وہ بحیثیت منطقی زیادہ مشہور ہے اور اس کی شہرت کا باعث اس کی تصنیف "رسالہ فی آداب البحث" منطقی بحث (Dialecties) کے متعلق ہے ۔ اس نے علم ریاضی پر بھی کئی کتابیں لکھیں جن میں "کتاب اشکال تاسیس" قابل ذکر ہے۔

ای ۔ سو ۔ ما ۔ این (I - Ssu - Ma -Yin) ترکستان میں پیدا ہوا ۔ وہ انجینئر تھا ۔ 1271ء میں تاتاریوں کی ملازمت اختیار کی اور فوج کا انجینئر بنا کر چین بھیج دیا گیا ۔ اس نے ہس آنگ ۔ یانگ (Hsiang - Yang) کی لڑائی میں 1273ء میں حصہ لیا ۔ غالباً اس کا اصل نام اسماعیل تھا جو چینی میں ای ۔ سو ۔ ما ۔ این ہوگیا ۔ اس نے تاتاریوں کے لیے ایک بہت بڑی منجنیق (Mangonel) بنائی جو اسباب حرب بنی، اس کے بعد اس کی جگہ اس کے بیٹے یا کو کو ملی ۔ یا کو کا نام یعقوب ہوگا۔

اسماعیل کے علاوہ اور سینکڑوں مسلمان انجینئر کبلائی خان کی فوج کے لیے ایران اور ترکستان سے بھیجے گئے تھے ۔ چین میں تاتاریوں کی حکومت 1280ء سے 1368ء تک رہی ۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کو چین میں بہت عروج حاصل ہوا ۔ اسی زمانہ میں مسلمانوں نے علم ہندسہ کو چین میں متعارف کرایا اور فروغ دیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدیوں کے ریاضی و ہیئت دانوں کا ذکر ختم ہوا ۔ جارج سارٹن نے ان صدیوں کے علم و ریاضی و علم ہیئت پر تبصرہ کیا ۔ اس کا وہ خلاصہ جو مسلمانوں سے متعلق ہے درج کرنا مناسب ہوگا ۔ ان اقتباسات میں سے کچھ کہیں کہیں پہلے بھی درج کیے جا چکے ہیں ۔ اب یہاں مجموعی طور پر سارٹن کا تبصرہ پیش کیا جائے گا۔

علم ریاضی

گیارہویں صدی کے آخر تک عربی بولنے والے لوگ ہندی اعداد (Hindu Numerals) سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے ۔ الخوارزمی نے سب سے پہلے انہیں رائج کیا ۔ دو سو سال بعد البیرونی

نے ہندی اعداد کی مزید و مفصل توضیح کر کے ان کو زیادہ مقبول بنایا۔ مشرقی و مغربی ممالک میں اسلام سے لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے۔ اسلام کے مغربی ممالک میں ان اعداد نے ذرا مختلف شکل اختیار کی اور ان کا نام حروف الغبار رکھا۔ گو دسویں صدی کے وسط میں ہندی اعداد اسلامی ممالک کے باہر بھی پہنچ چکے تھے مگر ان کا استعمال بارہویں صدی تک یورپ میں نہ ہوا۔ ایڈیلارڈ آف باتھ (Adelard of Bath) اور ابراہم بن عزرا (Abraham Ben Ezra) کی کوششوں کے باوجود اسلامی اسپین کے علاوہ یورپ میں ہندی اعداد کا نفوذ بہت ہی سست رفتار رہا۔ بارہویں بلکہ تیرہویں صدی میں بھی وہ یورپ میں پوری طرح رائج نہ ہو سکا۔ اس کی شہادت ملتی ہے کہ شمالی اٹلی میں تیرہویں صدی کے آخر میں کچھ لوگ ہندی اعداد استعمال کرتے تھے مگر صحیح معنوں میں ان کا رواج تین سو سال بعد ہوا۔ پرانے یونانی، عبرانی اور رومی اعداد کے استعمال نے علم الحساب کی ترقی کو قریب قریب ناممکن بنا دیا تھا وہ اس علم کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ ہندی اعداد نے (جو یورپ میں ابتدا میں عربی اعداد کہلاتے تھے) یہ رکاوٹ دور کی۔

عربی بولنے والے بحر متوسط (Mediterranean Sea) پر چھا گئے تھے اور ایشیا کی پوری تجارت ان کے ہاتھ میں تھی اس لیے یورپ والے جب تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے تو یورپ نے یونانی ماخذوں کے بجائے عربی ماخذوں سے استفادہ کیا۔ بارہویں صدی میں زیادہ تر اور تیرہویں صدی میں بھی ایک حد تک اہل یورپ نے عربی کتابوں کے ترجمے کر کے عربی علوم کو لاطینی اور عبرانی میں منتقل کیا۔ بارہویں صدی میں ریاضی اور ہیئت کی عربی کتابوں کا ترجمہ صرف لاطینی میں کیا گیا۔ تیرہویں صدی میں عبرانی اور ہسپانوی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد یونانی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ بارہویں صدی کے آغاز میں ریاضی و ہیئت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے عربی جاننا ناگزیر تھا، جب مسلمان بام عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اس وقت عیسائی صرف پرواز کی تیاری کر رہے تھے۔

اقلیدس (Euclid) کا لاطینی میں پہلا ترجمہ عربی سے 1142ء میں ہوا تھا۔ اس سے سو برس پہلے سے مسلمان ریاضی داں اقلیدس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس ترجمہ پر سو سال بعد کیمپانو (Campano) نے نظر ثانی کی اور ایک دوسرے عربی ماخذ کی مدد سے اس کی تصحیح بھی کی۔ یہ ترجمہ 1482ء میں یعنی پندرہویں صدی کے آخر میں چھپا۔ اس سے یورپ میں ریاضی کے نفوذ کی سست رفتاری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تیرہویں صدی کے اختتام پر عربی دنیا رومی دنیا سے بدستور آگے تھی۔ یورپ کی ترقی ایسی تھی جیسے ایک جاہل نوجوان کی جس کے ذہن میں علم کی روشنی سست رفتاری سے پھیلتی ہے۔

علم مثلث کی ترقی میں اشبیلیہ کے جابر ابن افلح کی تصنیف "اصلاح المجسطی" کا مقدمہ ایک اہم قدم تھا۔ اس کا انتقال بارہویں صدی کے وسط میں ہوا۔ تیرہویں صدی میں علم مثلث کی ترقی تمام تر مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔ اس صدی کے نصف اول میں اس ترقی کا سہرا مراکش کے سر رہا اور نصف ثانی میں آذربائیجان کے، جہاں ناصر الدین طوسی کی مراغہ میں قائم کردہ رصد گاہ نے اہم کردار ادا کیا۔ 1229ء میں حسن المراکشی نے علم ہیئت پر ایک مبسوط کتاب لکھی جس میں علم مثلث کے لیے بہت سے اوراق وقف کیے اور اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ ناصر الدین نے علم ہندسہ اور علم مثلث پر نہایت معرکہ آرا کتاب تصنیف کی جس کا نام "کتاب شکل القطاع" ہے۔ دو سال تک یہ کتاب ان علوم پر حرف آخر سمجھی گئی۔ اس کے مقابلہ میں لاطینی ممالک میں جو علم مثلث تھا وہ عربی ممالک کے علم مثلث کا دھندلا سا عکس تھا۔ یہ امر قریب قریب یقینی ہے کہ تیرہویں صدی کے نصف ثانی اور چودہویں صدی کے اوائل میں جو علم مثلث چین میں پایا جاتا تھا وہ بھی مسلمانوں سے ماخوذ تھا۔ کیونکہ چنگیزی خاندان کی حکومت چین میں بھی تھی اور ایران و عراق میں بھی، اس لیے مسلم ممالک کے علوم وہاں آسانی سے منتقل ہو گئے۔

بارہویں صدی میں یورپ میں (اسپین کے مسلمانوں کے علاوہ) صرف ایک ریاضی داں تھا اور وہ بھی یہودی تھا۔ تیرہویں صدی میں یہ تعداد ایک سے چار ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی ممالک میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں ریاضی داں تھے۔ عمر خیام کا ذکر گیارہویں صدی کے ریاضی دانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ وہ 1124ء تک زندہ رہا اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس نے بارہویں صدی میں الجبرا پر بہت کچھ تحقیقی کام کیا ہو۔ عمر خیام نے الجبرا کو جس بام عروج پر پہنچایا اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دور حاضر کی چیز ہے۔ 1145ء میں پلیٹو اور رابرٹ نے خوارزمی کے الجبرا کا ترجمہ کیا ان ترجموں نے یورپ میں الجبرا کی بنیاد ڈالی۔

علم ہیئت

اس موضوع میں الزرقالی کے ایجاد کردہ اصطرلاب صفیحہ (Saphea Arzachlis) کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ آلات رصد میں اس اصطرلاب کی ایجاد ایک نہایت ہی اہم ایجاد تھی۔ گیارہویں اور بارہویں صدی کے مسلمان ہیئت دانوں نے اس اصطرلاب کو اپنے تحقیقی کام میں بہت مفید پایا اور خوب استعمال کیا۔ لیکن یورپ اس سے نا آشنا رہا جب 1263ء میں اس کی ساخت کا طریقہ کچھ یورپی ہیئت دانوں نے لاطینی میں ترجمہ کر کے بتایا تو اہل یورپ نے اس کی اہمیت محسوس کی۔ ایک اہم آلہ ابو جابر ابن الافلح نے (جس کا انتقال تیرہویں صدی کے وسط میں ہوا) ایجاد کیا۔ افلح کے یورپی معاصر ہیئت دانی میں اس سے بہت پیچھے تھے۔ چنانچہ وہ اس آلہ کو مدتوں استعمال کرنے کے قابل نہ ہوئے۔

یورپ کے ہیئت داں مسلمانوں کے تازہ ترین انکشافات سے بے خبر رہے کیونکہ وہ پرانی کتابوں کے ترجموں پر قناعت کر لیتے تھے۔ مسلمانوں کی جو کتابیں لاطینی میں منتقل ہوئیں وہ کافی پرانی کتابیں تھیں۔ مثلاً ابن احمد المجریطی کی دسویں صدی کی تصنیف 1147ء میں یعنی بارہویں صدی کے وسط میں لاطینی میں منتقل کی گئی۔

مظفر الطوسی نے اصطرلابوں پر ایک کتاب موسومہ "المسطہ" لکھی اور خود ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام "الاصطرلاب الخطی" رکھا۔ اس کو لاطینی میں Al - Tusis Staff کہا گیا۔ مراغہ کی رصد گاہ میں ناصرالدین طوسی کی نگہداشت میں ہیئت پر بہت مفید کام کیا گیا۔ وہاں قریب قریب سب اسلامی ممالک کے مشہور ہیئت داں جمع ہو گئے تھے جن میں مویدالدین العرضی الدمشقی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس رصدگاہ کی اتنی شہرت ہوئی کہ چینی ہیئت داں بھی تحصیل علم کے شوق میں وہاں آنے لگے اور وہاں سے بہت کچھ حاصل کر کے لوٹے تو اپنے وطن میں اسلامی علوم کو رائج کیا۔ یورپ میں بارہویں صدی میں علم ہیئت پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا البتہ تیرہویں صدی میں مسلمانوں کی دیکھا دیکھی مشاہدہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ تیرہویں صدی کے آخر تک جو مشاہدے یورپ میں کیے گئے ان کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ آئندہ کے لیے پیش خیمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہیئت داں جو مشاہدات کرتے ہیں ان کو بالآخر زیچ کی شکل دی جاتی ہے۔ بارہویں اور تیرہویں صدی کی زیچوں کی ابتدا اور اصل الزرقالی کی اس زیچ سے ہوتی ہے جو اس نے 1080ء میں مرتب کی تھی اور جو زیچ طلیطلہ (Toledan Tables) کہلاتی ہے۔ اس کے پچاس سال بعد تک یورپ میں مسلمانوں کی پرانی زیچیں ہی رائج رہیں۔ 1272ء میں مراغہ کی رصد گاہ نے ایک نہایت مکمل زیچ تیار کی اور شاہی خاندان کے نام پر اس کا نام ایل خانی زیچ رکھا۔ اس وقت تک الزرقالی کی زیچ یورپ میں رائج ہو چکی تھی۔ اس کو سامنے رکھ کر عیسائی اسپین میں ایک زیچ مرتب کی گئی جو بادشاہ الفانسو کے نام سے منسوب ہوئی۔ یہ زیچ بھی 1227ء میں بنی۔ ایل خانی زیچ سے پہلے الخازنی نے 1115ء میں ایک زیچ مرتب کی تھی جس کا نام الزیج المعتبر السنجری تھا مگر وہ زیچ مرو (Tables of Marw) کے نام سے مشہور ہوئی۔

بطلیموسی نظام فلکی کے نظریہ کو جس نے سب سے پہلے ناقابل اعتماد ٹھہرایا وہ مسلمان فلسفی ابن باجہ (Avempace) تھا۔ ابن طفیل اور اس کے شاگرد البطروجی اور جابر ابن افلح نے ابن باجہ کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا اور اس مسئلہ پر اپنے اپنے نظریئے پیش کیے۔ ابن افلح نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام "اصلاح المجسطی" رکھا۔ اس کتاب کا لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ ہوا اور یورپ اس سے بہت متاثر ہوا۔ یہودیوں کے سب سے بڑے فلسفی ابن میمون (Maimonides)

نے ابن افلح کے نظریہ کی بھرپور تائید اور ترویج کی حتی الامکان کوشش کی۔ البطروجی نے نظریہ حرکت لولابی پیش کیا مگر وہ بھی قابل اعتماد نہ سمجھا گیا۔ سارٹن لکھتا ہے کہ گو مسلمان ہیئت داں صحیح نظریہ پیش نہ کر سکے مگر ان کا یہ کارنامہ بھی لائق ستائش ہے کہ بطلیموس کے غلط نظریہ کی بنیاد ہلا دی اور غلطی کی تصحیح پر اصرار کیا (جس کی بدولت کوپرنیکس اور کیپلر کی راہ ہموار ہوئی)۔

قرون وسطیٰ کی ہیئت اور ریاضی کی درسی کتابوں (Text Books) میں سب سے اہم الحسن المراکشی کی "جامع المبادی و الغایات فی العلم المیقات" تھی۔ اس میں ہیئت کے عملی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے اور آلات رصد بنانے اور علم مثلث وغیرہ کے مسئلے حل کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ ناصرالدین الطوسی نے "تذکرہ فی علم الہیئۃ" تصنیف کی جو نہایت مقبول ہوئی اور جس کی شرح ناصرالدین کے نامور شاگرد قطب الدین نے اہتمام سے لکھی۔ ایل خانی دور گو مختصر تھا مگر اپنے اثرات کے لحاظ سے بہت اہم تھا۔ اس کی وسیع المشربی کے باعث مسلمانوں کے علاوہ فرنگی، یہودی، تاتاری، ہندو اور چینی بھی اس سے فیض یاب ہوئے اور باہمی اختلاط کے باعث ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے مواقع ملے۔ چنانچہ زیچ ایل خانی کی پہلی کتاب میں چینیوں، یونانیوں، عربی اور ایرانیوں کے نظام تقویم (Calender) کا جائزہ لیا گیا۔ محی الدین المغربی نے جو مراغہ کے ہیئت دانوں میں سے تھا۔ ایک مستقل کتاب لکھی جس میں چینی اور یوائیغور ترکوں کی تقویموں کی تشریح کی۔ اس طرح ایک دوسرے کے علوم سے دلچسپی لینے سے باہمی معلومات میں اضافہ ہوا۔

قرون وسطیٰ میں تقریباً ہر ہیئت داں کسی قدر نجومی بھی ہوتا تھا۔ بحیثیت ہیئت داں فلکی مشاہدے نہایت احتیاط و صحت کے ساتھ کرتا۔ مگر بحیثیت نجومی جو نتائج انسانوں کی زندگیوں کے بارے میں سیاروں کی حرکات سے مرتب کرتا ان کا سائنس سے کوئی واسطہ نہ ہوتا۔ پھر بھی اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سینکڑوں لوگ نجومی بننے کے شوق میں فلکی مشاہدے کرتے جو علم ہیئت کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوتے۔ عدنان العینزنی تو یہاں تک بڑھا کہ اس نے علم طب کو بھی علم ہیئت سے وابستہ کر دیا اور اس پر ایک کتاب لکھ ماری۔ امام فخرالدین رازی نے جہاں اقلیدس وغیرہ پر عربی و فارسی میں قلم اٹھایا وہیں علم نجوم پر بھی عربی و فارسی میں خامہ فرسائی کی۔ علم نجوم پر مسلمانوں کی تصانیف کے ترجمے یورپ میں بہت مقبول ہوئے اور خود وہاں بھی اس علم پر کتابیں لکھی گئیں۔

تراجم

ریاضی اور ہیئت کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں ہوا۔ ان ترجموں کی بدولت ہی ان علوم سے یورپ والے صحیح معنوں میں روشناس ہوئے۔ جن مسلمان مصنفوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ان کے نام یہ ہیں:

الخوارزمی، الفرغانی، مسلمہ ابن احمد الجریتی، البتانی، البیرونی، ابن رشد، ابن الصفار الرزقالی، محمد ابن عبد الباقی، جابر ابن الافلح، البطروجی، ماشاء اللہ، ابو علی الخیاط، ابومعشر، الکندی، عمر ابن الفرخان۔ احمد ابن یوسف ابن الدایہ۔ القبیصی، ابن ابی الرجال، سہل ابن بشر، العمرانی، ابو بکر الحسن، ابن الخصیب، ابو جعفر المصری، ابو العباس النیر نیری، ابوالحسن الجیلی اور محمد الحصار۔

جارج سارٹن کہتا ہے کہ اب یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ سائنس ابتداً مصر، عراق، اور ایران سے یونان اور دوسرے مغربی ممالک میں پہنچی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں یونانی سائنس کو عربوں نے اپنایا اور اسے بہت ترقی دی۔ یورپ والوں نے عربی کتابوں کے ترجمے کیے اور کئی صدیوں میں مسلمانوں کی سائنس کی بدولت ان میں سائنس کا صحیح شعور پیدا ہوا۔ قرونِ وسطیٰ میں سائنس کو ترقی دینے اور پھیلانے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ انہوں نے جو علوم یونان سے لیے تھے انہیں بغیر کسی ترقی کے یورپ کو واپس کر دیا۔ جو کچھ ریاضی اور ہیئت کے بارے میں اوپر درج کیا گیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں بھی مسلمان ان علوم میں یورپ والوں سے بہت آگے تھے۔ سارٹن کہتا ہے کہ سولہویں صدی سے یورپ کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ علمی ترقی کے بام عروج پر پہنچ گیا اور اس سے مسلمان کا کوئی مقابلہ نہیں رہا۔ آٹھویں صدی کے وسط سے پندرہویں صدی کے آخر تک یعنی سات سو سال سے زیادہ مسلمان سائنس سے خود بھی بہرہ مند ہوئے اور دوسروں کو بھی بہرہ مند کیا۔

اب چودہویں صدی کے مسلمان ریاضی دانوں اور علم ہیئت کے عالموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مؤذنوں اور مؤقتوں کی ہیئت دانی

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس صدی کے ہیئت دانوں میں کم و بیش پچاس فی صد مسجدوں کے موذن یا موقت (Time Keeper) ہیں جو نماز کے صحیح اوقات بتانے کی غرض سے مقرر

کیے گئے تھے۔ پچھلی صدی کے ہیئت دانوں میں کسی موقت کا نام نہیں آیا مگر چودہویں صدی میں ایک دو نہیں متعدد ہیئت دان موقت کے فرائض انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ بات اسی صدی سے مخصوص کیوں ہے۔ کیا مسجدوں میں موقت مقرر کرنے کا دستور پہلے نہ تھا۔ اگر تھا تو ان کے لیے ہیئت دانی کو شاید ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ اس صدی کے ہیئت دانوں میں ابن الشاطر کا جو موقت بھی تھا، بہت بلند مقام ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی کا ذکر کیا جائے اور اس کے بعد بقیہ موقتوں کا ذکر کر کے پھر بقیہ ریاضی و ہیئت دانوں سے بحث کی جائے۔

علاؤالدین علی ابراہیم ابن الشاطر الموقت، شام کا باشندہ تھا۔ وہ مارچ 1306ء میں پیدا ہوا اور 1375ء میں اس نے وفات پائی۔ دمشق کی جامع الاموی میں جو اس شہر کی سب سے بڑی مسجد تھی، وہ موقت تھا۔ وہ آلات رصد بنانے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ خود اس نے دو آلات ایجاد کیے، ایک کا نام "الربع العلائی" اور دوسرے کا نام الربع التام (Perfect Quadrant) رکھا۔ اس نے آلات رصد پر کئی کتابیں لکھیں جن میں ان کی ساخت اور استعمال کا حال بیان کیا۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں: (1) "ترہیت السامع فی العمل بالربع السجامع" اس میں ربع العلائی کا بیان ہے۔ یہ کتاب 1332-33 میں تصنیف کی گئی جب کہ ابن شاطر کی عمر صرف چھبیس سال کی تھی۔ چونکہ ابن شاطر کا نام علاؤالدین تھا اس نے اپنے ایجاد کردہ ربع کا نام علائی رکھا وہ اسے الربع الجامع بھی کہتا تھا۔ (2) "النفع الام فی العمل بالربع التام" اس میں اپنے ایجاد کردہ ربع التام کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں (3) "رسالۃ الاصطرلاب" (4) "مختصر فی العمل بالاصطرلاب" (5) "ایضاع المغیب فی العمل بالربع الجیب"۔ ربع الجیب اس ربع کو کہتے ہیں جس سے جیب (Sine) کا عمل بھی ممکن ہو۔ ابن شاطر محض آلات رصد بنانے یا ایجاد کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ صحیح معنوں میں ہیئت داں تھا۔ اس نے بہت سے اہم فلکی مشاہدات کیے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ فلکیات کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے پیہم مشاہدات نہایت ضروری ہیں تاکہ اجرام فلکی کی حرکات کا صحیح اندازہ ہوتا رہے۔ اس نے مشاہدات کی اہمیت پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "رصد ابن شاطر" ہے۔ اس نے اپنے مشاہدے کی بناء پر مدار الشمس کا اعوجاج (Obliquity of the Ecliptic) 23 درجہ 31 دقیقہ (23° 31) بتایا جو آج کل کے حساب سے (23° 31 198″) ہے یعنی قریب قریب وہی جو آج کل صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔

ابن شاطر بھی بطلیموسی نظام شمسی کو غلط سمجھتا تھا۔ اس کی تنقیص میں اس نے بھی ابن باجہ۔ ابن افلح اور البطروجی کی طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عثمانی سلطان مراد اول کے ایما پر اس نے ہیئتی مسائل و نظریات پر ایک زیچ مرتب کی جو "زیج الشاطر" اور "زیج الجدید" کے نام سے موسوم ہوئی، اس زیچ کی دو شرحیں لکھی گئیں۔ ایک ابن زویق نے اور دوسری احمد ابن غلام اللہ نے لکھی۔ ابن زویق اور احمد ابن غلام اللہ بھی ابن شاطر کی طرح مسجدوں کے موقت اور ہیئت داں تھے۔

ترجمے

ریاضی اور ہیئت کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں ہوا۔ ان ترجموں کی بدولت ہی ان علوم سے یورپ والے صحیح معنوں میں روشناس ہوئے۔ جن مسلمان مصنفوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ان کے نام یہ ہیں:

الخوارزمی، الفرغانی، مسلمہ ابن احمد المجریطی، البتانی، البیرونی، ابن رشد، ابن الصفار الزرقالی، محمد ابن عبد الباقی، جابر ابن الافلح، البطروجی، ماشاء اللہ، ابو علی الخیاط، ابو معشر، الکندی، عمر ابن الفرخان۔ احمد ابن یوسف ابن الدایہ۔ القبیصی، ابن ابی الرجال، سہل ابن بشر، العمرانی، ابو بکر الحسن، ابن الخصیب، ابو جعفر المصری، ابو العباس النیریزی، ابوالحسن الجیلی اور محمد الحصار۔

جارج سارٹن کہتا ہے کہ اب یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ سائنس ابتداً مصر، عراق، اور ایران سے یونان اور دوسرے مغربی ممالک میں پہنچی تھی۔ قرون وسطیٰ میں یونانی سائنس کو عربوں نے اپنایا اور اسے بہت ترقی دی۔ یورپ والوں نے عربی کتابوں کے ترجمے کیے اور کئی صدیوں میں مسلمانوں کی سائنس کی بدولت ان میں سائنس کا صحیح شعور پیدا ہوا۔ قرون وسطیٰ میں سائنس کو ترقی دینے اور پھیلانے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ انہوں نے جو علوم یونان سے لیے تھے انہیں بغیر کسی ترقی کے یورپ کو واپس کر دیا۔ جو کچھ ریاضی اور ہیئت کے بارے میں اوپر درج کیا گیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں بھی مسلمان ان علوم میں یورپ والوں سے بہت آگے تھے۔ سارٹن کہتا ہے کہ سولہویں صدی سے یورپ کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ علمی ترقی کے بام عروج پر پہنچ گیا اور اس سے مسلمان کا کوئی مقابلہ نہیں رہا۔ آٹھویں صدی کے وسط سے پندرہویں صدی کے آخر تک یعنی سات سو سال سے زیادہ مسلمان سائنس سے خود بھی بہرہ مند ہوئے اور دوسروں کو بھی بہرہ مند کیا۔

اب چودہویں صدی کے مسلمان ریاضی دانوں اور علم ہیئت کے عالموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مؤذّنوں اور مؤقّتوں کی ہیئت دانی

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس صدی کے ہیئت دانوں میں کم و بیش پچاس فی صد مسجدوں کے موذن یا موقت (Time Keeper) ہیں جو نماز کے صحیح اوقات بتانے کی غرض سے مقرر

کیے گئے تھے۔ پچھلی صدی کے ہیئت دانوں میں کسی موقت کا نام نہیں آیا مگر چودہویں صدی میں ایک دو نہیں متعدد ہیئت دان موقت کے فرائض انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ بات اسی صدی سے مخصوص کیوں ہے۔ کیا مسجدوں میں موقت مقرر کرنے کا دستور پہلے نہ تھا۔ اگر تھا تو ان کے لیے ہیئت دانی کو شاید ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ اس صدی کے ہیئت دانوں میں ابن الشاطر کا جو موقت بھی تھا، بہت بلند مقام ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی کا ذکر کیا جائے اور اس کے بعد بقیہ موقتوں کا ذکر کر کے پھر بقیہ ریاضی و ہیئت دانوں سے بحث کی جائے۔

علاؤالدین علی ابراہیم ابن الشاطر الموقت، شام کا باشندہ تھا۔ وہ مارچ 1306ء میں پیدا ہوا اور 1375ء میں اس نے وفات پائی۔ دمشق کی جامع الاموی میں جو اس شہر کی سب سے بڑی مسجد تھی، وہ موقت تھا۔ وہ آلات رصد بنانے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ خود اس نے دو آلات ایجاد کیے، ایک کا نام "الربع العلائی" اور دوسرے کا نام الربع التام (Perfect Quadrant) رکھا۔ اس نے آلات رصد پر کئی کتابیں لکھیں جن میں ان کی ساخت اور استعمال کا حال بیان کیا۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں: (1) "نزہیت السامع فی العمل بالربع السجامع" اس میں ربع العلائی کا بیان ہے۔ یہ کتاب 1332-33 میں تصنیف کی گئی جب کہ ابن شاطر کی عمر صرف چھبیس سال کی تھی۔ چونکہ ابن شاطر کا نام علاؤالدین تھا اس نے اپنے ایجاد کردہ ربع کا نام علائی رکھا وہ اسے الربع الجامع بھی کہتا تھا۔ (2) "النفع الام فی العمل بالربع التام" اس میں اپنے ایجاد کردہ ربع التام کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں (3) "رسالۃ الاصطرلاب" (4) "مختصر فی العمل بالاصطرلاب" (5) "ایضاع المغیب فی العمل بالربع الجیب"۔ ربع الجیب اس ربع کو کہتے ہیں جس سے جیب (Sine) کا عمل بھی ممکن ہو۔ ابن شاطر محض آلات رصد بنانے یا ایجاد کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ صحیح معنوں میں ہیئت داں تھا۔ اس نے بہت سے اہم فلکی مشاہدات کیے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ فلکیات کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے پیہم مشاہدات نہایت ضروری ہیں تاکہ اجرام فلکی کی حرکات کا صحیح اندازہ ہوتا رہے۔ اس نے مشاہدات کی اہمیت پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "رصد ابن شاطر" ہے۔ اس نے اپنے مشاہدے کی بناء پر مدار الشمس کا اعوجاج (Obliquity of the Ecliptic) 23 درجہ 31 دقیقہ (23° 31) بتایا جو آج کل کے حساب سے (23° 31 198″) ہے یعنی قریب قریب وہی جو آج کل صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔

ابن شاطر بھی بطلیموسی نظام شمسی کو غلط سمجھتا تھا۔ اس کی تنقیص میں اس نے بھی ابن باجہ۔ ابن افلح اور البطروجی کی طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عثمانی سلطان مراد اول کے ایما پر اس نے ہیئتی مسائل و نظریات پر ایک زیج مرتب کی جو "زیج الشاطر" اور "زیج الجدید" کے نام سے موسوم ہوئی، اس زیج کی دو شرحیں لکھی گئیں۔ ایک ابن زویق نے اور دوسری احمد ابن غلام اللہ نے لکھی۔ ابن زویق اور احمد ابن غلام اللہ بھی ابن شاطر کی طرح مسجدوں کے موقت اور ہیئت داں تھے۔

ابن شاطر کی سب سے آخری تصنیف "بالنسبۃ الستینیہ " (On Sexagesimal Ratio) ہے جو ساٹھ یا ساٹھویں حصہ پر مبنی اعداد تناسب سے متعلق ہے۔

ابن شاطر کے ایجاد کردہ الربع العلائی کا نمونہ (Model) پیرس کے Bibliotheque Nationale میں محفوظ ہے۔ یہ ربع ابن شاطر نے شیخ علی ابن محمد الدربندی کے لیے خاص طور سے بنایا تھا۔ جو اصطرلاب ابن شاطر نے بنائے تھے ان کی تعداد بہت بڑی تھی۔ مختصر یہ کہ اس نے اپنی ساری عمر علم ہیئت کی خدمت اور ترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔ چنانچہ اس کا شمار اپنے عہد کے نہایت ممتاز ہیئت دانوں میں ہوتا ہے۔

ابو علی الحسن ابن محمد ابن باصہ کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ غرناطہ میں اس کا انتقال 17-1316ء عیسوی میں ہوا وہ مشرقی اندلوسیا کا رہنے والا تھا۔ وہ عالم دین، عالم ریاضی اور عالم ہیئت تھا اور غرناطہ کی جامع مسجد میں موقت اعلیٰ (معدل) تھا۔ وہ اصطرلاب اور دھوپ گھڑیاں بنانے میں مشاق تھا۔ اس خاندان کا ایک فرد احمد ابن باصو بارہویں صدی کے نصف ثانی میں بحیثیت مہندس و ماہر تعمیرات بہت مشہور ہوا تھا۔ 1160ء میں بحیثیت مہندس اعلیٰ اشبیلیہ کی جامع مسجد تعمیر کرائی تھی۔

ناصر الدین محمد ابن سمعون کی ولادت کا سن معلوم نہیں۔ اس کا انتقال 37-1336ء میں ہوا۔ وہ مسجد کا موقت تھا۔ اس نے ایک کتاب آلات رصد پر لکھی جس کا نام " کنز الطلاب " ہے۔ اس کی دوسری تصنیف "التحفۃ الملکیۃ فی الاسئلہ والاجوبۃ الفلکیہ " ہے جس میں علم ہیئت کے مختلف مسائل پر بحث کی ہے۔ کنز الطلاب ہیئت کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔

ابو عبداللہ محمد ابن احمد المزی مصر کا باشندہ تھا اس نے قاہرہ میں تعلیم پائی۔ وہ 1291ء میں پیدا ہوا تھا۔ تعلیم پا کر وہ دمشق منتقل ہو گیا جہاں وہ جامع مسجد میں موذن مقرر ہوا۔ اس نے علم ہیئت پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن کے نام یہ ہیں:

(1) الرسالۃ الاصطرلابیۃ (2) کشف الترتیب فی العمل بالتجیب (3) الروضۃ المزہرات فی العمل بربع المقنطرات (4) الرسالۃ فی العمل بالمجنحہ (5) نظم اللولوء المہذب فی العمل باربع الجیب (6) رسالۃ فی العمل بالربع المستر (7) مختصر فی العمل بالربع الدائرہ (8) الرسالہ فی العمل بالربع المقنطرات المطویۃ (9) جد اول الحصص۔

تصنیف نمبر 2 لغات نمبر 9 میں جن آلات رصد کے نام آئے ہیں ان کے انگریزی نام بھی اگر لکھ

دیئے جائیں تو شاید سمجھنے میں آسانی ہو۔

تصانیف نمبر 2- جیب (Sine) کے استعمال کے بارے میں شک رفع کرنے کی غرض سے لکھی گئی۔

تصنیف نمبر 3- ربع المقنطراب (Quadrant with Parallel Circles) اس ربع کے استعمال کے بارے میں جس میں متوازی دائرے ہوں۔

تصنیف نمبر 4- مجنحہ یعنی بازو دار اصطرلاب (Winged Astrolobe) کے بارے میں ہے۔

تصنیف نمبر 5- ربع الجیب۔ (Sine Quadrant) کے استعمال کے بارے میں ہے۔

تصنیف نمبر 6- ربع المستر (Mysterious Quadrant) کے استعمال کے بارے میں ہے۔

تصنیف نمبر 7- ربع الدائرہ۔ (Qudrant of the Circle) کے استعمال کے بارے میں ہے۔

تصنیف نمبر 8- ربع المقنطرات الموطیۃ (Folded Quadrants) کے استعمال کے بارے میں ہے۔

تصنیف نمبر 9- جد اول الحصص (Table for Latitude of Damascu) دمشق کے عرض البلد کی جدول ہے۔

المزی کو اصطرلاب اور ربع بنانے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس کا 34-1333ء کا بنایا ہوا ایک ربع لینن گراڈ کے قومی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ المزی کا انتقال 1349ء میں ہوا۔

ابوزید عبدالرحمٰن ابن ابی غالب الجادری عربی النسل تھا۔ وہ 1375ء میں پیدا ہوا اور فاس کی مسجد القروی این میں موقت مقرر ہوا۔ فاس میں اس کا انتقال 1415ء اور 1435ء کے درمیان ہوا۔ ہیئت پر اس کی تین تصانیف ہیں:

(1) روضۃ الازہار فی علم وقت اللیل والنہار۔ یہ رات اور دن کے اوقات متعین کرنے کے بارے میں ہیں۔

(2) تنبیہ الانام (On Calender) یہ تقویم یا جنتری بنانے کے متعلق ہے۔

(3) یہ ابو مقریلع کی ایک کتاب کی شرح ہے۔

ابو بکر ابن محمد ابن ایوب التمیمی الکرکی (Al-Karaki) چودھویں صدی کے نصف اول میں ہوا ہے۔ غالباً وہ المزی کا شاگرد تھا۔ یروشلم کی ایک مسجد میں موقت کی حیثیت سے اس نے کام کیا اور ایک زیچ مرتب کی۔

محمد ابن علی ابن زریق شام کا ہیئت داں اور دمشق کی مسجد اموی کا موقت تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش و وفات معلوم نہیں۔ خیال ہے کہ چودھویں صدی کے اواخر یا پندرہویں کے اوائل

میں وہ زندہ تھا۔ اس نے تین تصانیف چھوڑیں:

(1) الروض العاصر (عطربیز باغ)۔ یہ ابن الشاطر کی زیج کی تلخیص ہے۔

(2) رسالہ النشر المطیباب فی العمل بالربع الجیب۔ یہ Sine Quadrant کے استعمال کے بارے میں ہے۔

(3) تلخیص العبارات و ایضاح الاشارات۔ یہ دو عددی تعداد (Binomial) وغیرہ کی توضیح کے متعلق ہے۔

شمس الدین ابوعبداللہ محمد ابن محمد الخلیلی کی پیدائش و وفات کی تاریخیں نہیں معلوم۔ غالباً وہ 1378ء سے 1408 تک بقید حیات تھا۔ اس کا وطن شام ہے۔ دمشق کی مسجد اموی میں چودہویں صدی کے اختتام کے قریب وہ موذن تھا۔ اس نے 1378ء میں الحسن المراکشی کی زیج کے نمونے پر ایک جامع زیج مرتب کی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ نماز کے اوقات اور قبلہ کا رخ ٹھیک ٹھیک متعین کرنے کے اصول بیان کیے جائیں۔ اس زیج کا نام الجدول الآفاقی تھا۔ 1408ء میں اس نے ایک زیج مرتب کی جس کا نام جدول فضل الدائر وعمل اللیل و النہار تھا۔ سارٹن نے فضل الدائر کا انگریزی ترجمہ Hour Angle کیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ زیج ایسے مقام کے سورج اور ستاروں کے فضل الدائر بتاتی ہے جس کا عرض البلد 33 درجہ 31 دقیقہ (31-33°) ہو۔ اس کا استعمال دن میں بھی ہو سکتا ہے اور رات میں بھی۔

الخلیلی نے مختلف قسم کے ربع پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(1) رسالہ فی العمل بالتجیب الغیب (Hidden Sine)

(2) رسالہ فی العلم بالمربع

(3) النجوم الظاہرہ۔ یہ ربع الجیب (Sine Quadrant) کے استعمال کے بارے میں ہے۔ "النجوم الظاہرہ" کے نام سے بعد میں کچھ اور ہیئت دانوں نے بھی کتابیں لکھیں مثلاً عبداللہ ابن محمد الوفائی نے بھی جو بعد میں مسجد اموی کا موقت مقرر ہوا تھا اور جس کا انتقال 1469ء میں ہوا۔ اپنی کتاب کا یہی نام رکھا۔

شرف الدین ابوعمران موسیٰ ابن محمد الخلیلی بھی ایک مسجد کا موذن یا موقت تھا۔ اس نے 1402 میں "تلخیص فی معرفت اوقات الصلوٰۃ و جہۃ القبلۃ عندہ عدم الآلات" لکھی۔ یہ بھی نماز کے اوقات اور قبلہ کا رخ معلوم کرنے کے بارے میں ہے۔ اس کی دوسری تصنیف کا نام "رسالہ فی الاصطرلاب و معرفت الاوقات" ہے۔

عبداللہ ابن خلیل الماردینی عراق کے شہر ماروین کا رہنے والا تھا۔ اس کی پیدائش کی تاریخ نہیں معلوم۔ اس کا انتقال 7-1406ء میں ہوا۔ وہ دمشق کی مسجد اموی میں موذن تھا۔ اس نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

(1) الدُّرالمنشور فی العمل بربع الدستور۔ اس ربع کو السیتینیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ ساٹھ حصوں پر منقسم ہے۔ اس کتاب پر ابن الجدی نے شرح لکھی۔

(2) الورقات (یا) رسالہ فی عمل بربع الدائرہ الموضوع فیہ المقنطرات (Quadrant bearing circles of equal altitude) اس کتاب پر الحسن ابن خلیل الکراویسی الطبنی نے شرح لکھی۔

(3) رسالہ فی العمل بالربع الجیب

(4) الشبکہ (The Network) یہ ایک زیج کا نام ہے۔

(5) غایت الانتفاع۔ یہ بھی ربع الجیب کے بارے میں ہے۔

یہاں موقتوں اور موذنوں کا ذکر ختم ہوا۔ کیا زمانہ تھا جب موذن بھی ہیئت داں ہوتے تھے۔

ابوعبداللہ محمد ابن ابراہیم الابلی کی پیدائش کی تاریخ نہیں معلوم۔ اس کا انتقال 1347ء کے بعد ہوا۔ وہ الجبرا کا ریاضی داں اور فلسفی تھا اور اسے ابن البنا کے شاگرد اور ابن خلدون کے استاد ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ ابن خلدون نے اس کا بہت احترام سے ذکر کیا ہے اور اسے شیخ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ ابن خلدون کے مشہور عالم "مقدمہ" اور خود نوشتہ سوانح عمری میں الابلی کا ذکر جس تعریف و توصیف کے ساتھ کیا گیا ہے وہ اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

شمس الدین محمد ابن الجزدلی کی پیدائش و وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ 1344ء میں بقید حیات تھا۔ وہ بربری قبیلہ جزولہ سے علاقہ رکھتا تھا۔ اس نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

(1) رسالہ فی العمل بالاصطرلاب۔

(2) رسالہ فی العمل بالجیب الغیب (Quadrant with Hidden Sine)

(3) رسالہ فی ثمن الدائرہ (Octant)

نظام الاعرج الحسن ابن القمی النیسابوری ایرانی ریاضی و ہیئت داں تھا۔ وہ تیرہویں صدی کے آخر یا چودہویں صدی کے شروع میں مشہور ہوا تھا۔ وہ ناصرالدین الطوسی کا شاگرد تھا۔ اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(1) الرسالہ الشمسیہ فی الحساب

(2) شرح تحریر المجسطی۔ یہ ناصر الدین کی المجسطی کی شرح ہے جو 1305ء میں لکھی گئی۔

(3) توضیح التذکرہ۔ یہ ناصر الدین کی مشہور تصنیف تذکرہ فی علم الہیئۃ کی شرح ہے جو 1311-12ء میں مکمل ہوئی۔ ان کے علاوہ زیچ ایل خانی وغیرہ پر بھی شرحیں لکھی ہیں۔

نظام، عالم دین بھی تھا۔ اس نے قرآن مجید کی مفصل و طویل تفسیر لکھی جو الزامخشری کی کشاف اور امام فخرالدین السرازی کی مفتاح الغیب پر مبنی ہے۔ اس تفسیر کا نام "غرائب القرآن ورغائب الفرقان" ہے۔

ابن الحاجب کی عربی قواعد الشافیہ کی شرح بھی لکھی۔

محمد ابن مبارک شمس الدین میرک البخاری الحراوی کی پیدائش کی تاریخ نہیں معلوم۔ اس کا انتقال 1339ء میں ہوا۔ اس نے مندرجہ ذیل کتابوں پر شرحیں لکھیں:

(1) محمد ابن احمد الغرمی کی کتاب "تبصرہ فی علم الہیئتہ" پر

(2) المفضل ابن عمر الابہری کی "ہدایت الحکمۃ" پر

(3) علی ابن عمر الکاتبی کی "حکمت العین" پر

(4) عبداللہ ابن احمد النسفی کی "منار الانوار فی اصول الفقہ" پر، یہ کتاب دینیات سے متعلق ہے۔

یہ اغلب ہے کہ صفی الدین کی "کتاب الادوار" پر جو شرح ہے وہ شمس الدین میرک ہی کی تصنیف ہے۔

محمود ابن محمد ابن عمر الجغمینی ایرانی ہیئت داں اور طبیب تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ اس کا انتقال غالباً 1344-45ء میں ہوا۔ چغمین، خوارزم میں ایک قصبہ ہے اس کی نسبت سے الجغمینی نام رکھا۔ مندرجہ ذیل تصانیف اس سے منسوب ہیں:

(1) الملخص فی الہیئۃ۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس پر موسیٰ محمد قاضی زادہ الرومی

(متوفی 1436ء یا 1446ء) نے اور علی ابن محمد الجرجانی نے شرحیں لکھیں۔

(2) قوا الکواکب وضعفہا (ستاروں کے قوی اور ضعیف اثرات) یہ کتاب علم نجوم پر ہے۔

(3) ابن سینا کی "قانون" کی تلخیص کی جس کا تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے عہد حکومت میں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ دو اور کتابیں بھی الجغمینی سے منسوب کی جاتی ہیں جن کا نام "رسالہ فی حساب التسعہ" اور "شرح طرق الحساب فی مسائل الوصایہ" ہیں۔

شہاب الدین ابو العباس احمد ابن محمد ابن الہمام الفرضی قاہرہ میں 1352ء میں پیدا ہوا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے قائم کردہ مدرسہ صلاحیہ (یروشلم) میں مدتوں مدرسی کی اور یروشلم ہی میں 1412ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے علم الحساب، قانون وراثت جبر و مقابلہ وغیرہ پر بہت سی کتابیں لکھیں جن کی تعداد اٹھارہ بتائی جاتی ہے۔ اس کی کتابیں دراصل درسی کتابیں تھیں جو بار بار شائع ہوئیں۔ چند کے نمونے یہ ہیں:

(1) مرشد الطالب الاہ اسناء المطالب۔ یہ علم الحساب پر ہے اس کی بار بار شرحیں لکھی گئیں۔

(2) کتاب اللمع فی علم الحساب۔ اس میں وراثت کے مسائل سے بحث کی ہے، اس پر تین شرحیں لکھی گئیں۔

(3) المقنع۔ یہ علم جبر و مقابلہ پر ایک نظم ہے۔ سبط المار دینی نے شرحیں لکھیں۔

(4) ترغیب الرائض فی علم الفرائض۔

(5) المعونہ فی علم الہوائی۔ کاغذ و قلم استعمال کیے بغیر ذہن میں حساب و شمار کے بارے میں ہے۔

(6) غایت السؤال فی الاقرار بالمجہول۔

(7) شرح الارجوزہ الیاسمینی۔ یہ ابن الیاسمینی المراکشی کی نظم کی، جو اس نے جبر و مقابلہ پر لکھی تھی شرح ہے۔

شہاب الدین ابوالعباس احمد ابن رجب ابن طیبغہ 1358ء یا 1365ء میں پیدا ہوا اور جنوری 1447ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ ابن المجدی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اپنی عمر مصر میں گزاری۔ اس نے ربع کے استعمال، ہیئتی مشاہدات اور زیجوں پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد چھبیس بتائی جاتی ہے۔ بروکلمین (Brockelmann) نے سب کتابوں کے نام لکھے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

(1) رسالہ فی العمل بالربع المقنطرات المقطوع

(2) التحصیل و التقریب فی بیان طرق الحل و الترکیب۔ یہ زیچ بنانے کے طریقوں کے بارے میں ہے۔

(3) جداول السمٰوٰت (Tables of Azimuths) انگریزی الفاظ Azimuths اور Zenith دونوں عربی لفظ سمت (جمع سموات) سے ماخوذ ہیں۔

(4) دستور النیّرین۔ سورج اور چاند کی زیچیں۔

(5) کشف الحقائق فی حساب الدرج والد قائق - یہ کسر الستینہ (Sexagesimal Fractions) کے متعلق ہے۔

(6) ابراز لطائف الغوامض و احراز صنعف الفرائض - یہ وراثت کے مسائل کے بارے میں ہے۔

جن ریاضی و ہیئت کے عالموں کا ذکر جارج سارٹن نے کیا ہے ان میں سے بہت سے طوالت کے خیال سے چھوڑنے پڑے - ان علوم سے قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کو بے انتہا دلچسپی تھی - افسوس! اب قحط الرجال ہے - اب ایسا مسلمان ریاضی داں یا ہیئت داں جس نے شہرت پائی ہو شاید ایک بھی نہیں۔

جغرافیہ

جغرافیہ (رسم الارض) (نوٹ : اس مقالہ کا بیشتر حصہ جارج سارٹن سے لیا گیا ہے - وہاں اس کے نام کی تصریح کر دی ہے۔)

ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے علم ہیئت کے ساتھ ساتھ جغرافیہ پر بھی توجہ کی - کیوں کہ آسمان کے علم سے زیادہ اہم دنیا کا علم حاصل کرنا تھا - مسلمان بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے - وہ اپنا مال بیچنے کے لیے چین تک جاتے تھے - ان کو بحری و بری راستوں اور ان ملکوں کا حال جہاں وہ جاتے تھے معلوم کرنا ضروری ہوا - ایک گمنام مصنف کا 840ء کا لکھا ہوا چین کا سفر نامہ موجود ہے جس میں سلیمان التاجر کے چین کے سفر کے حالات درج ہیں - یورپ کے مشہور سیاح مارکو پولو نے چین کے جو حالات لکھے ہیں وہ اس کے چار سو پچیس سال بعد لکھے گئے تھے - جارج سارٹن کہتا ہے کہ سلیمان التاجر کے سفر کے حالات 751ء میں قلمبند کیے گئے - اس زمانے میں مسلمانوں نے چین سے وسیع تجارتی تعلقات قائم کر لیے تھے - ایک دوسرے مسلمان تاجر ابن وہب کے چین کے سفر کا حال (جو اس نے 870ء میں کیا تھا) ابوزید نے قلمبند کر کے شائع کیا - مسلمان ممالک اور چین کے درمیان ایسے بحری سفروں کی بنا پر سندباد ملاح کی کہانیاں وجود میں آئیں - جنہیں مشہور عالم تصنیف الف لیلہ میں بعد میں بیان کیا گیا ہے۔

عباسی خلیفہ مامون نے 813ء سے 833ء تک بیس سال حکومت کی - اس نے 830ء میں بیت الحکمۃ قائم کیا اور اپنے عہد کے حکماء و علماء کو نوازا - اس بیت الحکمۃ پر اس نے دو لاکھ دینار صرف کیے جو کم و بیش نو لاکھ پچاس ہزار ڈالر کے برابر ہوں گے - ان اہل حکمۃ میں سب سے ممتاز اور نامور ابو عبد اللہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی تھا جو ریاضی، ہیئت اور جغرافیہ کا بہت بڑا عالم تھا - اس کی سرکردگی میں انہتر سائنسدانوں نے جغرافیہ پر ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا - بطلیموس کے جغرافیہ کی تصحیح کر کے اس میں اضافے کئے اور صورت الارض (Maps) میں بھی ترمیم کی۔

ابوالقاسم عبداللہ ابن عبداللہ جو ابن خردازبہ کے نام سے مشہور ہے، عباسی عہد کا مشہور جغرافیہ داں تھا۔ وہ 825ء میں پیدا ہوا اور 912ء تک زندہ رہا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ الجبال (Media) اور سامرا میں گزرا۔ وہ صاحب البرید (Director of posts) تھا۔ 846ء میں اس نے "کتاب المسالک الممالک" تصنیف کی جس میں عباسی مملکت کے صوبوں اور سڑکوں کے بیان کے علاوہ تاریخی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں مزید برآں دوسرے ممالک کے حالات جو دوران سفر معلوم ہوئے مختصراً درج کیے گئے ہیں۔ ابن خردازبہ نے ہندوستان 'لنکا' مشرق اقصیٰ اور چین کے حالات بھی لکھے ہیں جو اس کے اپنے مشاہدے پر مبنی ہیں۔

ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ مسلمان سائنس داں شروع سے ہی دنیا کو گول تصور کرتے تھے۔ اور اپنے تجربات دنیا کو گول جان کر ہی کرتے تھے۔ اسی تصور کے تحت انہوں نے دنیا کا قطر اور محیط وغیرہ معلوم کئے۔

مولانا سلیمان ندوی "مقالات سلیمان" حصہ دو میں لکھتے ہیں:

"ابن خردازبہ المتوفی 300ھ کہتا ہے کہ زمین کی شکل گول ہے جیسے گیند، جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہوا ہو۔ جیسے انڈے کی زردی اور ہلکی ہوا (نسیم) زمین کے چاروں طرف ہے اور وہ چاروں طرف سے کشش کر رہی ہے آسمان تک۔ اسی طرح مخلوقات کے اجسام زمین پر ہیں کہ وہی نسیم ان کے بدنوں پر جو ہلکا پن ہے اس کو کشش کرتی ہے اور زمین اس کے ثقل کو کھینچتی ہے کیوں کہ زمین مثل اس پتھر کے ہے جس کو لوہا کھینچتا ہے (یعنی مقناطیس)"۔

مولانا کہتے ہیں کہ اس عبارت میں جس حقیقت کو نسیم جیسی ہلکی پھلکی ہوا سے تعبیر کیا گیا ہے اسی کو آج کل ایتھر کہتے ہیں۔ اس عبارت سے زمین کی گولائی اور کشش کا عمل بھی ثابت ہوتا ہے۔

احمد ابن ابی یعقوب ابن جعفر ابن وہب ابن واضح العباسی نے اپنی زندگی آرمینیا اور خراسان میں گزاری۔ وہ 891ء میں زندہ تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات معلوم نہیں۔ وہ الیعقوبی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے 2-891ء میں جغرافیہ اور تاریخ کی ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "کتاب البلدان" ہے۔ اس میں جغرافیائی اور تاریخی حالات کے علاوہ اقتصادی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ تاریخی حالات دو حصوں میں تقسیم کئے ہیں۔ پہلے حصہ میں ابتدائے آفرینش سے طلوع اسلام تک کے حالات ہیں۔ دوسرا حصہ اسلامی تاریخ پر مشتمل ہے اور ضخامت میں پہلے حصہ سے

کم ہے۔ تاریخ اسلام شیعی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی ہے۔ ممالک کے طبعی حالات بیان کرنے پر کافی توجہ دی ہے۔ بغداد سے مختلف اطراف میں جانے والی سڑکوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

ابن سرابیون۔ دسویں صدی کے اوائل میں عراق میں سکونت پذیر تھا۔ اس نے دنیا کے سمندروں، جزیروں، جھیلوں، پہاڑوں اور ندیوں پر ایک کتاب تصنیف کی۔ دجلہ، فرات اور نیل کے بارے میں جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ بالخصوص دلچسپ ہے۔ اس نے بغداد کی نہروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان نہروں اور ان سڑکوں کے ذریعہ جن کی تفصیل الیعقوبی نے دی ہے، آج بھی اس زمانے کے بغداد کا صحیح خاکہ تیار کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ گائی لی اسٹرینج (Guy Le Strange) نے خاکہ 1900ء میں مرتب کیا۔

ابو علی احمد ابن عمر ابن رُستہ۔ اصفہان میں رہتا تھا۔ اس نے 903ء میں "الاعلاق النفیسہ" تصنیف کی جو دراصل جغرافیہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں ابن رستہ نے سماوی و ارضی کروں سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد ممالک کے حالات بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کا جو حصہ جغرافیائی امور سے متعلق ہے، وہ دست برد زمانہ سے بچ گیا۔ 1892ء میں لائیڈن (Leiden) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات کا روسی زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

ابو بکر احمد ابن محمد ابن اسحٰق ابن الفقیہ الہمدانی نے اپنی "کتاب البلدان" 903ء میں مکمل کی۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یاقوت المقدسی ایسے عظیم جغرافیہ دانوں نے اس سے استفادہ کیا ہے اور اس کے اقتباسات اپنی تصنیفوں میں درج کئے ہیں۔ یہ کتاب نایاب ہے، لیکن اس کا خلاصہ علی ابن جعفر ابن احمد الشیرازی کی کتاب میں پایا جاتا ہے۔

الجیہانی۔ ماوراء النہر کی سامانی حکومت میں وزیر تھا۔ اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ 893ء سے 907ء کے عرصہ میں بقید حیات تھا۔ اس نے مملکت کی شاہراہوں پر ایک مفصل کتاب لکھی جو اب نایاب ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نامور جغرافیہ داں الادریسی نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔ اس کے زمانے میں مشہور سیاح ابودلف سامانی بادشاہ نصر ابن احمد ابن اسماعیل کے دربار سے متعلق تھا۔ الجیہانی نے ابودلف کو ہندوستان کی سیاحت پر آمادہ کیا۔

ابو زید الحسن السیرافی سیراف کا رہنے والا تھا جو خلیج فارس پر واقع ہے۔ وہ عظیم عالم المسعودی کا ہمعصر تھا۔ اس نے 920ء میں کئی مسلمان سیاحوں کے سفر کے حالات اپنی کتاب "اخبار الصین و الہند" میں درج کئے۔ اس نے ابن وہب کے سفر کا حال بھی جو 870ء میں چین (صین) گیا تھا،

مجملہ اور سیاحوں کے حالات قلمبند کئے ہیں ۔ یہ تالیف اپنی قسم کی نہایت اہم تالیف ہے ۔ یہ چین ، ہندوستان ، خراسان ، عرب کے جنوبی ساحل اور ساحل زنجبار کے متعلق قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے ۔ چین کا شہر خانفو (Hangchow) نویں صدی میں مسلمانوں اور دیگر بیرونی ممالک کے لوگوں کی تجارت کا مرکز تھا ۔ 878ء میں اس کی غارت گری کا سانحہ پیش آیا ۔ ابوزید نے اس سانحہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

احمد ابن فضلان ابن عباس ابن راشد ابن حماد کو عباسی خلیفہ المقتدر نے 921ء میں بلغاریہ کے بادشاہ کے پاس بھیجا جس کا دارالحکومت دریائے والگا کے کنارے تھا۔ ابن فضلان نے اپنے سفر اور روس کے حالات لکھے ہیں ۔ روس کے بارے میں یہ سب سے پہلا تحریری بیان ہے اور نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے۔ یاقوت نے کل کا کل اپنی کتاب میں شامل کرلیا۔

ابن فضلان کے روس جانے کے بارے میں "مقالات سلیمان" میں مولانا سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> "عرب چوتھی صدی کے شروع میں خلیفہ مقتدر باللہ کی خلافت میں انتہائی شمالی روس تک پہونچ چکے تھے جہاں رات صرف چار گھنٹے کی ہوتی ہے ۔ وہاں کا بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا اور خلیفہ سے خواہش کی تھی کہ اس کی اور اس کی قوم کی تعلیم کے لیے کچھ لوگ بھیجے جائیں ۔ خلیفہ نے ابن فضلان کی سرکردگی میں ایک وفد روانہ کیا وہ آذربائیجان ہوکر نہر اتل یعنی والگا طے کرکے انتہائی شمالی روس کے قدیم شہر بلغار میں پہونچا اور کچھ روز رہ کر وہاں سے واپس آیا ۔ اس پورے سفر کی روداد اس وقت بھی مختصر طور سے "معجم البلدان" (مصنفہ یاقوت) کے بیان بلغار اور روس میں درج ہے"۔

ابوالفرج قدامہ ابن جعفر الکاتب البغدادی خلیفہ المکتفی کے محکمہ مال میں محاسب تھا ۔ مذہباً وہ عیسائی تھا مگر مشرف بہ اسلام ہوا ۔ اس نے اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں " کتاب الخراج " لکھی ۔ اس میں اس نے محکمہ برید کے انتظامات (Postal Service) سے بھی بحث کی ہے اور مملکت کی جغرافیائی کیفیت بھی درج کی ہے ۔ سڑکوں کے بارے میں ابن خرداذبہ کی طرح اس نے بھی تفصیلات بہم پہونچائی ہیں ۔ اس کتاب کے اقتباسات کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا ہے ۔ اس کا انتقال 918-9ء میں ہوا تھا۔

ابو محمد الحسن ابن احمد یعقوب الہمدانی ابن الحائک یمنی خاندان کا فرد تھا ۔ اس کی تاریخ

پیدائش معلوم نہیں ۔ وہ صنعا کے قید خانے میں 945-6ء میں مرا ۔ وہ ہیئت ، آثار قدیمہ اور جغرافیہ کا عالم تھا ۔ جغرافیہ پر اس نے "صفات جزیرۃ العرب" اور یمن کے آثار قدیمہ پر "الاکلیل" لکھی ۔ الاکلیل کے معنی تاج کے ہیں ۔ الاکلیل میں علم ہیئت اور طبیعیات کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے جو اس زمانے میں رائج تھے ۔ الاکلیل کے ایک حصہ کا جرمن میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابودلف مسعر ابن المہلہل الخزرجی اینبوعی کی پیدائش ینبوع میں ہوئی جو مکہ کے قریب واقع ہے ۔ سامانی بادشاہ نصر ابن احمد ابن اسمٰعیل کے دربار سے وابستہ ہونے کے باعث بخارا میں رہتا تھا۔ ہندوستان کے ایک راجہ کے سفارتی وفد کے ساتھ وہ تبت ہوتے ہوئے جنوبی ہند گیا ۔ واپسی میں وہ کشمیر ، افغانستان اور سجستان ہوتا ہوا بخارا آیا ۔ اس نے اپنے اس طویل سفر کے حالات پر "عجائب البلدان" تصنیف کی ۔ یاقوت اور قزوینی نے اس کے اقتباسات اپنی تصانیف میں درج کئے ہیں ۔ اس کا فرانسیسی میں 1913ء میں ترجمہ کیا گیا۔

ابوالحسن علی ابن الحسین ابن علی المسعودی بغداد میں تیسری ہجری کے اواخر میں یعنی 912ء سے پہلے پیدا ہوا وہ عالم متبحر تھا اور معتزلی عقائد رکھتا تھا ۔ (سید امیر علی کے بیان کے مطابق وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود کی اولاد میں سے تھا) اس نے اپنی زندگی کے آخری دس سال شام اور مصر میں گزارے ۔ 957ء میں اس کا انتقال قاہرہ میں ہوا ۔ وہ بہت بڑا سیاح ، جغرافیہ داں اور مورخ تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چین تک گیا مگر اس کی صحت مشکوک ہے ۔ اس کی تصانیف میں سب سے اہم "مروج الذہب و معادن الجواہر" ہے جس کے لفظی معنی سونے کے مرغزار اور جواہر کی کانیں ہیں ۔ یہ کتاب 947ء میں مکمل ہوئی اور 956-57ء میں المسعودی نے اس پر نظرثانی کی ۔ یہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے ۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کا انداز فکر کلیتاً سائنس کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جو وسیع النظری سے ہر چیز کا جائزہ لیتا ہے اور کسی ماخذ معلومات کو کسی تعصب کی بنا پر ترک نہیں کرتا ۔ اس کتاب میں مجملہ اور باتوں کے 955ء کے زلزلے کا بیان ، بحیرہ مردار کے پانی کی ماہیت پر اظہار خیال اور علم طبقات الارض کی بحثیں شامل ہیں ۔ اس کتاب میں سب سے پہلے سجستان کی پن چکیوں کا ذکر ملتا ہے ۔ اپنی زندگی کے آخری سال میں المسعودی نے " کتاب التنبیہ والاشراف " لکھی جس میں اس نے فلسفہ فطرت اور ارتقائے حیات پر بحث کی ۔ ارتقا کے بارے میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ جمادات سے نباتات ، نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان تک حیات منزل بہ منزل ترقی کرتی ہے ۔ مروج الذہب پیرس میں 1861-77ء میں نو جلدوں میں چھاپی گئی ۔ اس کتاب کے باب چہارم کا جو ہندوستان سے متعلق ہے ، 1838ء میں لاطینی میں ترجمہ ہوا ۔ 1841ء میں انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ۔ " کتاب التنبیہ " لائیڈن میں 1894ء میں آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ۔ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ پیرس سے 1896ء میں

شائع ہوا۔

ابن خلدون نے المسعودی کی بہت مدح سرائی کی ہے اور اسے دنیا کے بہت بڑے عالموں میں شمار کیا ہے۔ ابواسحٰق ابراہیم ابن محمد الفارسی الاصطخری کی پیدائش اور وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ وہ 950ء میں بقید حیات تھا۔ اس سال اس نے البلخی کی "صور الاقالیم" کی تنقیح کی۔ اس کی اپنی تصنیف کا نام "مسالک الممالک" ہے۔ اس میں ہر ملک کا رنگین نقشہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی بعد میں ابن حوقل نے تنقیح و تصحیح کی۔ الاصطخری نے بھی سجستان کی پن چکیوں کا ذکر کیا ہے۔ اصطخر کا یونانی نام پرسپولس ہے یہ پرانے زمانے میں ایرانیوں کا دارالحکومت تھا۔

بزرگ ابن شہریار الرام ہرمزی۔ چوتھی صدی ہجری یعنی 912ء اور 1009ء کے درمیانی زمانے میں بقید حیات تھا۔ رام ہرمز خوزستان میں ایک مقام ہے۔ بزرگ کا پیشہ کشتی بانی تھا۔ اس نے ملاحوں کی کہانیاں جمع کرکے ایک کتاب "کتاب عجائب الہند" کے نام سے شائع کی۔

ابوالقاسم محمد ابن حوقل کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ 943ء اور 977ء کے درمیان بقید حیات تھا۔ وہ 943ء میں بغداد سے سیاحت کے لیے نکلا۔ اس کی غالباً 952ء میں الاصطخری سے ملاقات ہوئی جس کی درخواست پر اس نے "مسالک الممالک" میں مناسب ترمیم و تنسیخ کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ ابن حوقل نے بعد میں اس کتاب کو ازسرنو لکھا اور اس کا نام "کتاب المسالک و ممالک" رکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔ یہ اس نے 977ء میں کیا۔ اس میں ہر ملک کا ایک نقشہ شامل ہے۔

ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ ابن حوقل نے ہندوستان اور افریقہ کے حالات لکھے ہیں۔

ابوعبداللہ محمد ابن احمد ابن ابوبکر البنا البشاری المقدسی 48-947ء میں بیت المقدس (یروشلم) میں پیدا ہوا۔ اس نے اسپین، سجستان اور سندھ کے علاوہ تمام اسلامی ممالک کی سیاحت کی وہ جہاں گیا وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ 86-985ء میں اس نے فارس میں اپنی کتاب "احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم" تصنیف کی اور تین سال بعد اس پر نظرثانی کی۔

1877ء میں یہ کتاب لائیڈن (Leiden) میں چھپی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کا انگریزی ترجمہ 1897ء میں شائع کیا۔ شام و فلسطین پر جو باب ہے اس کا 1884ء میں جرمن میں ترجمہ ہوا۔

ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی کا ذکر اس مقالہ کے ابتدائی ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ اس وقت بحیثیت جغرافیہ داں اس کے بارے میں چند کلمات اور لکھے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس کی دو کتابوں کا ذکر مناسب ہوگا۔ 1000ء میں اس نے "کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" اور 1030ء میں "تاریخ الہند" لکھی۔ ہندوستان پر جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ ذاتی مشاہدے اور گہرے مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس نے بھگوت گیتا کو بہت سراہا ہے۔ اس کا مذہبی رجحان اسلام کے ٹھیٹ عقائد کے مطابق نہ تھا۔ بلکہ وہ "لاادری" (Agnostic) نظریہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ایران پر اسلامی تہذیب و تمدن چھا جانے سے بھی خوش نہ تھا۔ یہ جذبہ اس کے دل سے مرتے دم تک نہ گیا۔

ول ڈیوراں، البیرونی کو مسلمانوں کا سب سے بڑا جغرافیہ داں تصور کرتا ہے۔ البیرونی زمین کی کشش (Gravitation) کے نظریہ سے واقف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ زمین اپنے محور پر روزانہ ایک چکر لگاتی ہے اور سال بھر میں ایک بار سورج کے گرد طواف کرتی ہے۔ تب ہی ہیئتی معلومات کی ٹھیک ٹھیک توضیح کی جا سکتی ہے۔ البیرونی اس بات کا بھی قائل تھا کہ ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب وادی سندھ سمندر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے علوم کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے یہ رائے قائم کی تھی کہ ہندوستانی سائنس میں منطق سے کم کام لیتے ہیں اور توہم سے زیادہ۔

"کتاب الہند" (مترجمہ سید اصغر علی) باب 58 سے مدوجزر اور ماہتاب کے داغ کے متعلق ایک اقتباس درج کرتا ہوں جس سے البیرونی کے اس خیال کی تصدیق ہوگی کہ ہندوؤں کی سائنس میں غیرمعقول باتوں کا کس قدر دخل تھا۔

سمندر کے پانی کا ایک حال پر ٹھہرے رہنے کا سبب مچھ پُران میں یہ بتلایا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں سولہ پر دار پہاڑ تھے جو ان پروں سے اڑتے اور اوپر چڑھ جاتے تھے۔ راجہ اندر کی شعاع نے ان پروں کو جلا دیا، اور وہ پر کٹے ہو کر سمندر کی چاروں سمت میں جا گرے .... پورب طرف کے تیسرے اور چوتھے پہاڑ کے درمیان سمرتک آگ ہے جو سمندر کا پانی پیتی رہتی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو دریاؤں کے ہمیشہ اس میں گرتے رہنے سے سمندر بھر جاتا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آگ ان کے راجہ کی ہے۔ جس کا نام اوُرب تھا .... وہ ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ اس کا باپ مارا گیا۔ جب وہ پیدا ہو کر جوانی کی عمر کو پہنچا اور اپنے باپ کا حال سنا تو اس کو فرشتوں پر غصہ آیا، اور اس وجہ سے کہ فرشتوں نے باوجود اس کے کہ انسان ان کی پرستش کرتے ہیں اور ان کے واسطے قربانی بھی کرتے ہیں، دنیا کی حفاظت میں غفلت کی۔ اس نے فرشتوں کو قتل کر دینے کے لیے تلوار نکالی۔ فرشتوں نے ایسی عاجزی کے ساتھ اس سے مہربانی و رحم کی درخواست کی کہ وہ ان کے قتل سے باز آگیا اور ان سے کہا کہ ہم اپنے غصہ کی آگ کو کیا کریں۔ فرشتوں نے مشورہ دیا کہ وہ اس کو سمندر میں ڈال دیں۔ یہ وہی

آگ ہے جو سمندر کا پانی پیتی رہتی ہے ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ باوجود دریاؤں کا پانی سمندر میں ملتے رہنے کے وہ اس وجہ سے نہیں بڑھتا کہ راجہ اندر بدلی کے ذریعہ پانی کو لے لیتا ہے ۔ اور بارش بنا کر برساتا ہے ۔ مچ پران میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ماہتاب کا داغ جس کا نام ششنکش (یعنی خرگوش کی شکل) ہے مذکورہ بالا سومہ پہاڑوں کی صورت ہے جس کا عکس ماہتاب کی روشنی سے اس کے جسم میں پڑتا ہے ۔

" کتاب الہند " کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قریب قریب ہر معاملے میں تو ہم پرستی کو بڑا دخل تھا بالخصوص مذہب میں بعض ایسی باتیں شامل کرلی تھیں جن کی عقلی توجیہ کرنا دشوار ہی نہیں محال ہے ۔ لنگ کی پرستش کی بنیاد پڑنے کی وجہ یہ بتائی ہے:

> لنگ مہادیو (جو تین بڑے خداؤں میں سے ایک خدا ہے) کے عضو تناسل کی صورت ہے ۔ اس کا سبب ہم نے یہ سنا ہے کہ ایک رشی نے مہادیو کو اپنی عورت کے پاس دیکھا ۔ وہ مہادیو سے بدگمان ہوگیا اور بد دعا کی کہ اس کا عضو تناسل نیست ہو جائے ۔ وہ اسی وقت اس سے جدا ہو کر چکنا چور ہوگیا ۔ پھر مہادیو نے اس رشی کے سامنے اپنے بے قصور ہونے کی نشانیاں پیش کیں اور دلیلوں سے ان کا صحیح ہونا ثابت کیا ۔ رشی کے دل میں جو شبہ پیدا ہو گیا تھا اور اس نے کہا کہ ہم تیرے لیے اس کی تلافی یہ کر دیتے ہیں کہ اس عضو کی صورت کو جو تجھ سے جدا ہوگیا ہے انسانوں کے اندر ایسا باعظمت بنا دیتے ہیں کہ لوگ اس کو وسیلہ اور تقرب الٰہی کا ذریعہ بنائیں " ۔

آثار الباقیہ کا انگریزی ترجمہ 1879ء میں اور تاریخ الہند کا انگریزی ترجمہ 1888ء میں ہوا ۔ البیرونی کی کتابوں کے ترجمے بھی یورپی زبانوں میں ہوئے ہیں ۔

ابو عبید عبداللہ ابن عبدالعزیز ابن محمد ابن ایوب ابن عمر اسپین میں پیدا ہوا ۔ وہ البکری کے نام سے مشہور ہے ۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں ۔ اس کا انتقال بہت زیادہ عمر میں 1094ء میں ہوا ۔ اس نے اپنی بیشتر زندگی قرطبہ میں گزاری ۔ وہ اسپین کے مسلمان جغرافیہ دانوں میں جن کی تصانیف تلف نہیں ہوئیں سب سے پرانا ہے ۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف تھا ۔ " کتاب المسالک و الممالک " کے نام سے اس نے بھی ایک کتاب لکھی ۔ اس نام کی کتاب اس سے پہلے ابن حوقل لکھ چکا تھا ۔ البکری کی یہ کتاب سفرنامے کی شکل میں لکھی گئی ہے ۔ اس میں تاریخی واقعات اور نسلی معلومات بھی پائی جاتی ہیں ۔ اس کی دوسری تصنیف کا نام " کتاب معجم ما استعجم " ہے ۔ اس میں زیادہ تر عرب کے قدیم جغرافیہ کا بیان ہے ۔ اندلوسیہ کی نباتات اور درختوں پر بھی اس کی ایک کتاب بتائی جاتی ہے ۔

ابو معین الدین القبازیانی المروزی ناصر خسرو 4-1003ء میں پیدا ہوا اور 89-1088ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ قبازیان سے نسبت کے معنی ہیں کہ وہ ماوراء النہر کا رہنے والا تھا ۔ وہ اسمٰعیلی مذہب کا مبلغ تھا اور اس کا لقب حجۃ الخراسان پڑ گیا تھا ۔ سات سال (1045ء سے 1052ء تک) اس نے شام، فلسطین، مصر، عرب اور ایران کی سیاحت میں گزارے ۔ وہ اپنے سفر کے حالات اپنی ڈائری میں درج کرتا جاتا تھا ۔ اس کے " سفر نامہ " میں فاطمی خلیفہ المستنصر کے عہد کے مصر کے جو حالات ملتے ہیں ان سے جغرافیائی اور مختلف نسلوں اور آثار قدیمہ کے بارے میں بہت مفید معلومات دستیاب ہوتی ہیں ۔ یہ سفر نامہ 1881ء میں پیرس میں چھپا اور اس کے کچھ حصوں کو گائی لی اسٹرینج نے 1898ء میں انگریزی میں بھی منتقل کیا ۔

باقی جغرافیہ دانوں کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ علامہ سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ " عرب اور امریکہ " میں مسلمانوں کے جغرافیائی نظریات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے کچھ اقتباسات پیش کر دیئے جائیں:

> " ربع مسکون ۔ بطلیموس (Ptolemy) نے دو خطوں کے تقاطع سے روئے زمین کے چار برابر حصے کئے تھے ۔ ایک خط قطب جنوبی سے قطب شمالی تک فرض کیا تھا اور دوسرا زمین کے بیچ سے آفتاب کے بالمقابل پہلے خط کو کاٹتا ہوا (اس کو خط استوا کہتے ہیں) وسط افریقہ سے گزرتا ہے ۔ اسی طرح دو خطوں کے تقاطع سے زمین کے چار فرضی حصے ہوئے ۔ دو شمالی اور دو جنوبی اور خط استوا ان دونوں جنوبی حصوں کے بیچ سے گزرتا ہے ۔ بطلیموس کی رائے یہ ہے کہ انسانی آبادی روئے زمین کے ان چار حصوں میں سے صرف ایک شمالی حصہ میں ہے ۔ اسی کو اصطلاح میں ربع مسکون کہتے ہیں ۔ یعنی چوتھائی حصہ (ربع) جو آباد ہے (مسکون) ہے باقی تین چوتھائی حصے زیادہ تر سمندروں میں غرق ہیں اور کچھ گرمی اور کچھ سردی کی غیر معتدل شدت کے سبب سے سکونت کے قابل نہیں ۔ مسلمانوں نے شروع میں بطلیموس کے اس نظریہ کو بعینہٖ تسلیم کر لیا ۔ لیکن بہت جلد وہ اس پر شکوک و اعتراضات وارد کرنے لگے ۔ بطلیموس کے حامیوں نے اس کی رائے کی بحث پر فلسفیانہ اور طبعی دلائل گھڑ گھڑ کر کھڑے کئے ۔ مگر دوسروں نے ان کو توڑ دیا ۔ ایک مدت تک یہ مناظرہ گرم رہا ۔ البیرونی، ابن رشد، (نصیر الدین) طوسی، قطب شیرازی، شریف جرجانی، برجندی، قوشجی اور چغمینی کی تصنیفات میں زمین کی ہیئت کے باب میں یہ بحثیں مذکور ہیں ۔ یہاں مقال کے لیے نصیر طوسی ۔

المتوفی 637ھ کے تذکرہ اور اس کی شرح توضیح التذکرہ مؤلفہ نظام عرج (تالیف 711ھ) اور اس کے حاشیہ سے کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں:

یہ تقسیم صحیح نہیں ، غلط ہے۔ اس لیے کہ ان کے دعوئی کے ثبوت میں کوئی شبہ بھی میں نے نہیں پایا ، چہ جائیکہ کوئی دلیل ان کے پاس ہو۔ اس بنا پر یہ بالکل ممکن ہے کہ زمین کی باقی چوتھائیوں میں بہت سی آبادیاں ہوں جن کی خبر ہم تک اس لیے نہیں پہونچی کہ ہمارے اور ان کے درمیان جدا کرنے والے سمندر اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں ، اسی طرح جنوبی حصہ میں آفتاب کی شدت گرمی کے سبب سے عدم آبادی کا جو پرانا نظریہ تھا ، اس پر بھی ضرب کاری لگائی .... آخر میں اس نظریہ کی کہ صرف ربع سکون ہی کیوں کھلا ہوا ہے ، اعتراض اور جواب کے بعد بظاہر کوئی سنجیدہ دلیل نہ پا کر کہا:

"حاصل یہ کہ زمین کے شمالی چوتھائی حصے کے صرف کھلے ہونے کا سوائے عنایت الہیٰ کے کوئی سبب معلوم نہیں اور نہ کوئی دلیل اس پر ہے کہ کیوں ایک ہی شمالی چوتھائی حصہ آبادی اور رہنے کے لائق ہو اور دوسرا نہ ہو۔ حالانکہ اس کے سب حصوں کی وضع (پوزیشن) فلکیات کی نسبت سے برابر ہے۔"

.... اس بحث سے اندازہ ہو گا کہ اس پرانی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کا نظریہ مسلمانوں نے علمی استدلال کے طریقے سے سمجھا تھا اور یونانی نظریہ ربع مسکون کی کوئی طبیعی اور فلسفیانہ توجیہہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ابن خلدون مغربی المتوفی 808ھ نے مقدمہ میں ربع مسکون کے نظریہ کی تشریح کے بعد لکھا ہے:

"اور یہیں سے حکما نے یہ اخذ کیا ہے کہ خط استوا اور جو اس کے پیچھے ہے آبادی سے خالی ہے اور ان حکما پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ مقام تو مشاہدہ اور سیاحوں کے متواتر بیانات سے ثابت ہے کہ آباد ہے ، تو پھر اس دعوئی پر دلیل کیسے قائم ہو گی (یعنی دعوئی ہی غلط ہے)"۔

"......... اس مسئلہ کو اس سے بہت پہلے ابن رشد المتوفی 595ھ نے پیش کیا اور کہا کہ خط استواء کے دونوں طرف جب یکسانی صورت ہے تو خط

استواء کے جنوب میں کیوں آبادی نہ ہو .... جو بات ابن رشد نے کہی وہی حسن بن احمد ہمدانی المتوفی 334ھ بمطابق 945ء نے جزیرۃ العرب میں کہی ہے .... ربع مسکون کا نظریہ ٹوٹ جانے کے بعد کرہ ارض کی دوسری جانب آبادی کا تخیل بہت قریب ہوگیا۔ یہ تخیل قدیم سے قدیم تیسری ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں میں ملا ہے"۔

علامہ سلیمان ندوی نے بطلیموس کے نظریہ کی تردید میں اور کئی جغرافیہ دانوں کے اقوال نقل کیے ہیں۔ مگر چوں کہ جتنا اوپر نقل کیا جا چکا ہے وہ مسلمان حکما کے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے ، اس لیے بقیہ سے قطع نظر کر کے علامہ موصوف نے جو کچھ مسلمان سیاحوں کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے کچھ حصے نقل کئے جاتے ہیں:

"ادھر علما تو اس مناظرہ میں مصروف رہے کہ وہاں آبادی ہے یا نہیں ، یا عقلاً ہو سکتی ہے یا نہیں اور ادھر کم لکھے پڑھے سیاح اور جہاز راں خط استوا کو پار کر کے افریقہ کی ہر سمت میں تیر گئے۔ جنوبی حصہ میں افریقہ کا جہاں تک تعلق ہے ، عرب تاجر اور سیاح اس کے گوشہ گوشہ سے واقف ہو چکے تھے۔ جہاں جہاں موجودہ زمانہ میں اہل یورپ پہونچے ، مسافران عرب کے نشان قدم برابر پائے گئے۔ عملی عرب سیاح اور جہاز راں خط استوا پار کر کے افریقہ کے ایک ایک کونے اور گوشے میں پہونچے اور خط استوا سے نیچے راس الرجال الصالح (Cape of Good Hope) تک سب چھان مارا۔ چنانچہ ابو عبداللہ البکری کی صفۃ الافریقہ و المغرب ، ابن بطوطہ کے سفر نامہ کے آخری ابواب اور ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ میں ان کے حالات موجود ہیں .... ابن خلدون جنوبی افریقہ کے بعض مقامات سلا ، تکرور ، غانہ اور سلطنت مالی کا نام لے کر کہتا ہے:

"اور آج کے زمانے میں یہ پوری سرزمین سوڈانی قوم کی مملکت میں شامل ہے اور ان کے ملک تک مراکش کے سوداگر جاتے ہیں............."

"مشرقی افریقہ تو عربوں کا وطن ہو گیا تھا۔ زنجبار پر وہ قابض تھے اور سواحل میں مڈگاسکر (قنبلو) کے مقابل تک ان کا بحری گزرگاہ تھا۔ مغربی افریقہ گاننا (غانہ) میں ان کی نو آبادی تھی۔ شمالی افریقہ تو ان کی عظیم الشان

سلطنتوں کا مرکز تھا اور آج تک وہ اس پر قابض ہیں .... اہل عرب غانہ کب پہونچے اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن قیاس ہے کہ دوسری صدی میں مصر اور نوبہ اور بجہ وغیرہ افریقی قبیلے یہاں کے سونے کا خراج مصر میں ادا کرتے تھے اور وہاں مسلمان عمال اور مزدور آباد ہو چکے تھے۔ (طبری واقعات 235ھ) پانچویں صدی ہجری کے اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبید عبد اللہ البکری المتوفی 487ھ بمطابق 1094ء نے کتاب المسالک و الممالک کے حصہ کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقہ والمغرب میں غانا کا، وہاں کے قبائل کا، ان کے بادشاہ کا، اور ان کی سلطنت کا پورا حال لکھا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کی سکونت اور آمد و رفت کی اطلاع دی ہے۔ یہ حالات مصنف نے 460ھ میں لکھے ہیں۔ شہر غانہ کے دو حصے تھے ایک میں مسلمان رہتے تھے جس میں بارہ مسجدیں تھیں اور ایک جامع مسجد بھی۔ ان مسجدوں میں امام و موذن اور علماء و فقہاء سکونت پذیر تھے۔ دوسرے میں بادشاہ اور اس کے ارباب حکومت رہتے تھے۔ بادشاہی عمارت کے پاس بھی ایک مسجد بنی ہوئی تھی جس میں وہ لوگ فریضہ نماز ادا کرتے تھے جو بادشاہ کے پاس آتے تھے۔ ملک کے دوسرے حصہ میں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں۔ بادشاہ اور اس کے قبیلے کے لوگ اس وقت تک بت پرست تھے، لیکن مسلمانوں کی پوری عزت کرتے تھے۔ اسی زمانے میں بادشاہ نے ایک بادشاہ کی تبلیغ سے اسلام قبول کر لیا۔ وہاں ایک ایسی عرب قوم آباد تھی جو بنو امیہ کے زمانہ میں فوج کی حیثیت سے آئی تھی اور یہیں رہ پڑی تھی۔ بعد کو وہ اپنا مذہب بھول گئی تھی۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ عرب یہاں بنو امیہ ہی کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری ہجری کے شروع میں پہنچ چکے تھے .... ادریسی مراکشی المتوفی 560ھ نے سسلی میں بیٹھ کر شاہ سسلی کے حکم سے جغرافیہ کی مشہور کتاب نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی۔ اس میں غانہ کے حال میں، جیسا کہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے۔ لکھا ہے کہ غانہ میں علوی سادات کی سلطنت اور حکومت ہے .... ابن خلدون المتوفی 808ھ کے زمانہ میں غانہ کا ملک سلطان مالی کے زیر حکومت تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوط جو اسی زمانے میں تھا وہ اسی سلطان کے زمانہ میں غانہ پہونچا تھا۔ اس سلطان اور اس کی مملکت اور قوم کے حالات اس نے اپنے سفر نامہ کے خاتمہ میں بیان کیے ہیں۔ یہ لوگ دیندار مسلمان تھے اور عربی زبان افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی سرکاری و مذہبی دونوں حیثیتوں سے رواج پذیر تھی"۔

علامہ سلیمان ندوی نے زمین کی گولائی پر مسلمان جغرافیہ دانوں کے کچھ اقوال نقل کیے ہیں۔ ابن خرداذبہ کی رائے اس کے ذکر کے ساتھ درج کر دی گئی ہے کچھ اور اقوال یہاں اختصار کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:

"زمین کو گول تو تمام حکمائے اسلام نے تسلیم کیا ہے۔ مگر مجھے اس دعویٰ پر وہ استدلال پیش کرنا ہے جو اہل جغرافیہ کے قلم سے نکلا ہے۔ ابن رستہ (277ھ) تیسری صدی ہجری میں تھا۔ وہ زمین کے گول ہونے پر اور ستاروں کے طلوع و غروب اور ظہور و خفا سے اس طرح محققانہ بحث کرتا ہے:

"تمام اہل علم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ زمین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ خشکی و تری کی گیند کی طرح ہے اور دلیل یہ ہے کہ سورج، چاند اور کل ستاروں کا طلوع و غروب زمین کے تمام کناروں میں ایک وقت نہیں ہوتا بلکہ مشرقی مقامات میں ان کا طلوع مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے اور یہ حوادث فلکی سے ظاہر ہے کہ ایک ہی حادثہ زمین کے تمام اطراف میں مختلف اوقات میں ہوتا ہے ...."

زمین کی گولائی پر آج کل جہازوں کے اولاً مستول، پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پورا جہاز نظر آنے سے جو استدلال کیا جاتا ہے اس سے بھی وہ واقف تھے۔ مسعودی لکھتا ہے:

"اور جہاز جب سمندر کے بیچ میں ہوگا تو دماوند کے پہاڑ غائب ہو جائیں گے اور نظر نہیں آئیں گے اور جب دریا میں سو فرسخ کے قریب رہ جائے گا تو ذرا سا پہاڑ کا سرا نظر آئے گا۔ اور جیسے جیسے ساحل کے نزدیک ہوتے جائیں گے پہاڑ بڑا ہوتا جائے گا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سمندر کا پانی گول شکل پر ہے ...."

مسعودی سے پہلے ابو بکر ابن الفقیہ ہمدانی گزرا ہے جس کی "کتاب البلدان" 903ء میں یعنی مسعودی کی پیدائش سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔

علامہ سلیمان ندوی نے اس کا یہ قول نقل کیا ہے:

"کہتے ہیں کہ سمندر بھی گول ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم ساحل سے بیچ سمندر میں چلے جاؤ تو ساحل کے پہاڑ اور درخت آہستہ آہستہ تمھاری نظر سے غائب ہونے لگیں گے۔ پھر جب تم بیچ سمندر سے ساحل کی طرف آؤ تو وہ آہستہ آہستہ پھر دکھائی دینے لگیں گے"۔

سید امیر علی نے "اسپرٹ آف اسلام" میں لکھا ہے کہ دنیائے اسلام میں ایک امر مسلمہ تھا کہ دنیا گول ہے۔ یورپ والے دنیا کے چپٹے ہونے پر یقین کامل رکھتے تھے اور ہر ایسے شخص کو جلا کر خاک کر دینے پر آمادہ تھے جو دنیا کو گول کہنے کی حماقت کرے۔ چنانچہ (Giordano Bruno) نے ابن خردازبہ اور ابن رستہ کے تقریباً سات سو سال بعد کوپرنیکس کا یہ نظریہ کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گھومتی ہے قبول کرنے کا اعلان کیا تو کلیسا نے اسے 1600ء میں جان سے مار ڈالا۔ خود کوپرنیکس اس سزا سے اس لیے بچ گیا کہ اس کا یہ نظریہ منظر عام پر آنے سے پہلے ہی اس کا 1543ء میں انتقال ہو گیا۔

دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک جس طرح مسلمانوں نے اور علوم مثلاً ریاضی، ہیئت، طب، طبیعیات وغیرہ کو انتہائی ترقی دی تھی۔ ویسے مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے اپنے دائرہ عمل کو انتہائی وسعت دی۔ پورے ایشیا اور افریقہ کو انہوں نے چھان مارا۔ یورپ میں بھی دور دراز مقامات تک پہونچے اور جہاں جہاں گئے وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کر کے انہیں قلمبند کیا۔ مولانا سلیمان ندوی نے قابل قبول دلائل سے اپنے مقالہ "عرب اور امریکہ" میں یہ ثابت کیا ہے کہ کولمبس کے امریکہ پہونچنے سے بہت پہلے عرب وہاں پہونچ چکے تھے اور جب کولمبس وہاں پہونچا ہے تو غانہ کا سکہ اور عربی بولنے والے موجود تھے۔ اس مقالہ کی ابتدائی سطور میں مولانا ندوی کے دلائل پیش کیے جا چکے ہیں۔

شمالی ہند پر سلطان محمود غزنوی کے حملے تو گیارہویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئے ہیں مگر اس سے بہت پہلے عرب سیاح اور تاجر جنوبی ہندوستان کے سواحل پر اتر چکے تھے۔ ہندوستان کا بیسویں صدی کا مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند اپنی مستند تصنیف "اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر" (Influence of Islam on Indian Culture) میں لکھتا ہے:

"مسلمان جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر آٹھویں صدی میں یا اس سے بھی پہلے آئے اور مشرقی ساحل پر دسویں صدی میں وہ تیزی کے ساتھ پورے ساحلی علاقے میں پھیل گئے اور نسبتاً بہت ہی تھوڑی مدت میں ان

علاقوں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں رسوخ پیدا کر لیا۔ ایک طرف تو ان کے سر برآوردہ لوگ وزیر، امیر البحر، سفیر اور زمیندار بن گئے اور دوسری طرف انہوں نے بہت لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔ اپنے مذہبی خیالات کی تبلیغ کی، مسجدیں اور مزارات تعمیر کیے جو ان کے درویشوں اور مبلغوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے .... اسلام ایمان کے ایک سادہ سے اصول معین، مرتب عقائد و رسوم اور سماجی نظام کے جمہوری نظریات کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس سے مقامی فضا پورے طور پر متاثر ہوئی اور نویں صدی کا ربع اول ابھی نہیں گزرا تھا کہ ملیبار کا آخری چیرامن پیرومال راجہ (جو کرینگنور میں حکومت کرتا تھا) نئے مذہب میں داخل ہو گیا"۔

جنوبی ہند میں پھیل کر انہوں نے ہندوستان کے طبعی، سیاسی، معاشرتی حالات سے واقفیت حاصل کی اور یہ معلومات اسلامی ممالک میں پہونچنا شروع ہوئیں۔ بزرگ ابن شہریار کے ذکر میں بتایا جا چکا ہے کہ اس نے ملاحوں کی کہانیاں جمع کر کے ایک کتاب "کتاب الہند" کے نام سے چوتھی صدی ہجری میں شائع کی۔ البیرونی نے کئی سال تک ہندوستان میں قیام کیا۔ یہاں کی زبان اور علوم سیکھے، یہاں کے حالات پر ایک نہایت مستند کتاب لکھی اور سنسکرت کی کچھ کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔

آج کل کے علم جغرافیہ کی صحیح بنیادیں اس وقت پڑیں جب مسلمانوں نے بطلیموس کے ربع مسکون کے نظریہ کو باطل ٹھہرا کر اپنے مشاہدات کی بنا پر دنیا کو صحیح حالات سے روشناس کیا۔ دنیا کی گولائی ناپی۔ مختلف مقامات کے طول البلد اور عرض البلد ٹھیک ٹھیک متعین کئے۔ بہت سے طبعی مسائل حل کئے اور سمندروں، پہاڑوں، ندیوں، جھیلوں وغیرہ کے بارے میں معلومات کے انبار لگا دیئے۔ بارہویں، تیرہویں، چودہویں صدیوں میں اس علم کو اور زیادہ فروغ دیا۔ ادریسی، یاقوت، قزوینی ایسے عظیم جغرافیہ داں اور ابن بطوطہ ایسے باہمت سیاح پیدا ہوئے۔ ابن بطوطہ 14 جون 1325ء کو سیاحت کی غرض سے گھر سے نکلا اور چوبیس سال بعد جولائی 1349ء میں گھر واپس آیا۔ چوبیس سال کی سفری زندگی کے بعد توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی بقیہ زندگی گھر پر گزارے گا۔ مگر دنیا کے زیادہ سے زیادہ حالات معلوم کرنے کے باوجود اس جذبہ کی تشنگی ابھی بجھی نہ تھی۔ چنانچہ مختصر سے قیام کے بعد وہ افریقہ کے جنوبی مغربی ممالک کی سیاحت کو نکل کھڑا ہوا اور 1354ء میں واپس آیا۔

ابن بطوطہ جہاں گرد تھا، اس کی عمر کا بہت کچھ حصہ سیاحت اور دوسرے ملکوں کی اقامت

میں گزرا۔ اس سفر سے دنیا کے علوم میں کیا کیا اضافے ہوئے اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

پچھلی سطروں میں جن انیس بیس جغرافیہ دانوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں ان کا تعلق نویں، دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی سے تھا۔ جارج سارٹن کی رائے میں گیارہویں صدی کے بعد سائنس کی دنیا میں مسلمانوں کی تنہا رہنمائی ختم ہوگئی۔ عیسائی اور یہودی بھی ان کے دوش بدوش آ کھڑے ہوئے۔ اس نے اسی لیے بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدیوں کی چھ نصف صدیوں کو صرف مسلمان حکما کے نام سے منسوب نہیں کیا، بلکہ ہر نصف صدی کو تین نام دیئے یعنی ایک عیسائی ایک یہودی اور ایک مسلمان عالم کا۔ ان چھ نصف صدیوں میں دو میں مسلمان عالموں کے نام سب سے آخر میں لکھے ہیں۔ تین میں درمیان میں اور صرف ایک میں پہلے۔ حیرت ہے کہ ابن رشد اور ابن خلدون ایسے شہرہ آفاق علما بھی اس کے نزدیک پہلے مقام کے اہل نہ ٹھہرے۔ طب، ریاضی اور ہیئت سے بحث کرتے ہوئے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان تینوں علوم میں چودہویں صدی کے آخر تک بھی عیسائیوں اور یہودیوں پر مسلمانوں کو فوقیت حاصل رہی۔ علم جغرافیہ میں بھی (جیسا کہ مندرجہ ذیل سطور سے واضح ہو گا) ان کی فوقیت قائم رہی۔

سب سے پہلے خود جارج سارٹن کی شہادت سے مسلمانوں کی فوقیت نمایاں کی جائے گی۔ بارہویں اور تیرہویں صدی کے علم جغرافیہ کا جائزہ لیتے ہوئے سارٹن کہتا ہے کہ مسلمان زائرین نے جو اپنے لمبے سفر کے حالات بیان کئے ہیں وہ عیسائی زائرین کے سفرناموں کے مقابلہ میں بدرجہا برتر ہیں اور سائنس کے نقطہ نظر سے ان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ مثلاً ابن جبیر نے 1183ء میں اپنے وطن ویلنشیا (Valencia) سے مشرق قریب کا پہلا سفر کیا اور اس دو سال کے سفر کے جو حالات قلمبند کئے ان کے مقابلے میں جب لاطینی سفرناموں کو دیکھتے ہیں تو موخرالذکر بالکل بچگانہ تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی زمانے میں ایران کے علی الہروی نے سیاحوں کی رہنمائی کے لیے ایک مبسوط کتاب تصنیف کی۔ اس کے ایک صدی بعد ویلنشیا کے ایک دوسرے سیاح محمد العبدری اور مراکش کے محمد ابن رشید نے رہنما کتابیں (Guide Books) لکھیں۔ یہ مسلمان سیاح ہمہ گیر سرشت کے انسان تھے۔ وہ متنوع اقسام کی معلومات فراہم کرنے کی زحمت اٹھاتے اور نامور عالموں سے ملتے۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سفر کرنے کے معاملے میں بھی مسلمان ساری دنیا کی رہنمائی کرتے تھے۔ ابوالعباس اور ابن البیطار نباتات کی دھن میں سفر کرنے والوں کی جلیل القدر جماعت کے ہادی تھے۔ وہ اسپین کے رہنے والے تھے جبکہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں انہوں نے شمالی افریقہ کے ایک سرے سے دوسرے تک خاک چھانی۔

مختلف علاقوں کے جغرافیائی حالات قلمبند کرنے میں تین شخص بالخصوص نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ابن البلخی نے فارس کے حالات 1100ء میں فارسی زبان میں لکھے۔ یہ اپنی نوعیت کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ ابن جمیع نے اسکندریہ کے جغرافیائی حالات بیان کئے اور وہاں کی آب و ہوا پر بحث کی۔ عبداللطیف نے مصر کے حالات لکھے۔ قرون وسطیٰ کی جغرافیہ کی تصانیف میں عبداللطیف کی کتاب ایک نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ ابن جمیع اور عبداللطیف کی کتابیں عربی میں ہیں۔

جہاز رانوں کے چارٹ اور برّی نقشے

مسلمان پورے بحرِ ہند کو عبور کرکے ایسٹ انڈیز پہونچتے تھے۔ وہاں آنے جانے کا سلسلہ بارہویں صدی ہی سے جاری ہوچکا تھا۔ پیشہ ور جہازران معلم اور مستجل مرکب کہلاتے تھے۔ ان کے پاس بحری راستوں کے چارٹ ہوتے جن میں زیر آب چٹانوں کی نشاندہی کی جاتی اور سواحل دکھائے جاتے۔ معلموں کے علاوہ جہازرانی کی ہدایات کو تحریری شکل میں منضبط کرنے والے ہوتے، ان میں سہل ابن ابان، محمد ابن شاواں اور لیث ابن کہلاں اتنے نامور تھے کہ وہ سمندر کے شیر کہلانے لگے تھے۔

الادریسی، نقشہ سازی میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ وہ مراکش کا رہنے والا تھا مگر صقلیہ (Sicily) میں رہتا تھا۔ اس کی نقشہ سازی عیسائی روایتوں سے مختلف تھی۔ صرف چند بطلیموسی مبادیات میں اشتراک تھا۔ بقیہ سب اس کی اپنی تحقیق و جستجو کا نتیجہ تھا۔

جغرافیائی قاموس مرتب کرنا ایسی روایت ہے جو خالصتاً عربی یا اسلامی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے عربی بولنے والے لوگوں کو جغرافیہ اور فرہنگ نگاری سے گہری دلچسپی تھی جس کے نتیجہ میں متعدد جغرافیائی قاموسیں وجود میں آئیں۔ ان میں سے دو سائنس کے نقطہ نگاہ سے بہت اہم ہیں اور قرون وسطیٰ کی اہم ترین تصانیف میں سے ہیں۔ یہ دونوں عربی زبان میں تیرہوں صدی میں مرتب کی گئیں۔ ایک یاقوت نے 1228ء میں تصنیف کی۔ اس کا نام "معجم البلدان" ہے۔ یہ ایک نہایت ضخیم قاموس ہے جس میں جغرافیائی معلومات حروف تہجی کی بنا پر جمع کی گئی ہیں۔ جغرافیہ کے علاوہ ہیئتی، طبیعی، تاریخی اور علم الآثار قدیمہ سے متعلق حقائق بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ دوسری ابویحییٰ القزوینی کی "عجائب البلدان" ہے جو اس نے 1262ء میں تصنیف کی۔ یہ معجم البلدان کے مقابلہ میں مختصر ہے۔ یہ سات حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ مختلف آب و ہوا (Climate) کے بارے میں ہے۔ ہر حصے کی حروف تہجی کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ترتیب دی ہے۔ اس کتاب کا نفوذ عربی داں طبقہ ہی تک محفوظ نہیں رہا بلکہ فارسی اور ترکی بولنے والوں پر بھی یہ بڑی حد تک اثرانداز ہوئی۔

ان دو اہم قاموسوں سے پہلے بارہویں صدی میں ایرانی جلیل القدر عالم الزمخشری المتوفی 1144ء نے بھی ایک قاموس تصنیف کی تھی جس کا نام کتاب "الامکنہ والجبال والمیا" تھا۔

اصولی جغرافیہ (Scientific Geography): یہ نظریوں اور اصولوں سے بحث کرتا ہے۔ اس میں بھی بارہویں اور تیرہویں صدی میں اسلام کو عیسائیت پر فوقیت حاصل رہی۔ چونکہ ان دونوں صدیوں میں مسلمان اس علم کے منصب رہنمائی پر فائز رہے، اس لیے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اور ممالک کے جغرافیہ دانوں سے پہلے ان کے جغرافیہ دانوں کا ذکر کیا جائے۔

جارج سارٹن کی عبارت کا مندرجہ بالا ترجمہ علم جغرافیہ میں مسلمانوں کی برتری اور تفوق کا بین ثبوت ہے۔

اس تمہید کے بعد مسلمان جغرافیہ دانوں کے حالات بیان کیے جاتے ہیں:

ابو بکر محمد ابن احمد ابن بشر بہاؤالدین الخرقی کا انتقال 1138-39ء میں مرو میں ہوا۔ اس کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں۔ وہ جغرافیہ داں ہونے کے علاوہ ریاضی اور ہیئت کا بڑا عالم تھا۔ بحیثیت ریاضی و ہیئت داں اس کا ذکر اس مقالہ کی پانچویں فصل میں کیا جا چکا ہے۔ وہ کئی کتابوں کا مصنف تھا جن کے نام یہ ہیں (1) منتہاء الادراک فی تقسیم الافلاک (2) کتاب التبصرہ فی علم الھیئۃ (3) الرسالۃ الشاملہ (4) الرسالۃ المغربیہ۔ ان میں سے آخری دو اب دستیاب نہیں۔ خوش قسمتی سے ان کی سب سے اہم کتاب "منتہاء الادراک فی تقسیم الافلاک" دست برد زمانہ سے بچ گئی۔ یہ تین مقالوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے مقالے کا تعلق جغرافیہ سے ہے۔ اس میں زمین کی ہیئت کرائی اور اس کے ان دو حصوں سے، جن میں سے ایک آباد اور دوسرا غیر آباد ہے، بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان دونوں کی جائے وقوع مختلف ہونے کے باعث ان کے طالع (Ascendents) اور مطالع (Ascensions) بھی مختلف ہیں۔

ابوالقاسم محمد ابن عمر الزمخشری 1075ء میں زمخشر (خراسان) میں پیدا ہوا۔ 1144ء میں بمقام جرجانیہ (خوارزم) اس کا انتقال ہوا۔ وہ دینی اور دنیوی علم میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ وہ مکہ معظمہ میں اتنی مدت قیام پذیر رہا کہ اس کو خدا کا پڑوسی (جار اللہ) کہنے لگے۔ عقیدہ کے لحاظ سے وہ معتزلی تھا۔ باوجود یہ کہ اس کی مادری زبان فارسی تھی وہ عربی کی برتری کا قائل تھا۔ عربی کے خلاف جو شعوبیہ تحریک اٹھی تھی، اس کی الزمخشری نے سخت مخالفت کی۔ اس کی تفسیر کا نام "کتاب الکشاف عن حقائق التنزیل" ہے۔ 1119ء اور 1121ء کے درمیان اس نے عربی

قواعد پر "کتاب المفصل" لکھی۔ اس نے کئی فرہنگیں تصنیف کیں جن میں عربی فارسی لغت بھی شامل ہے۔ حدیث پر اس کی کتاب کا نام "کتاب الفائق" ہے۔ جغرافیہ پر اس نے جو قاموس تالیف کی اس کا نام "کتاب الامکنہ والجبال والمیاہ" ہے جس میں مقامات، پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کا بیان قلمبند کیا ہے۔

ابوعبداللہ محمد ابن محمد ابن عبداللہ ابن ادریس الحمودی الحسینی القرطبی الصقلی کا زیادہ مشہور نام الشریف الادریسی ہے۔ الشریف اس لیے کہلایا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے تھا۔ وہ سبتہ (Ceuta) میں 1099-1100ء میں پیدا ہوا، قرطبہ میں تعلیم پائی اور صقلیہ (Sicily) کے دارالسلطنت پالرمو میں سکونت اختیار کی۔ اسی لیے اس کے نام کے ساتھ الصقلی بھی لگایا جاتا ہے۔ صقلیہ 827ء میں مسلمانوں کے زیرنگیں آ گیا تھا۔ اس پر مسلمانوں نے ڈھائی سو سال حکومت کی۔ بالآخر نرماندیہ (Normandy) کے جان راجر (John Roger) نے گیارہویں صدی کے اواخر میں اسے مسلمانوں کے قبضہ سے فتح کیا۔ الادریسی راجر ثانی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے اس عیسائی بادشاہ کے نام پر "الکتاب الرجاری" 1154ء میں لکھی۔ اس کتاب کا زیادہ مشہور نام "نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق" ہے۔ یہ علم جغرافیہ پر قرون وسطیٰ کی سب سے زیادہ جامع تصنیف ہے۔ اسلامی ممالک کے علاوہ عیسائیوں کے بہت سے ملکوں کے حالات بھی اس میں درج کئے گئے ہیں۔ مختلف ممالک کے حیوانات و نباتات کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔ 1161ء میں راجر کے جانشین ولیم اول کے لیے اس نے نزہت سے بھی زیادہ ضخیم جغرافیائی قاموس تصنیف کی جس کا نام "روض الانس و نزہت النفس" رکھا۔ اس میں بھی نباتات کے ذکر کا اہتمام کیا ہے اور تین سو ساٹھ مفردات کے نام درج کئے ہیں۔ عربی ناموں کے ساتھ یونانی مترادفات بھی دیئے ہیں جن میں سے بہت سے آج بھی رائج ہیں۔ مسلمانوں کے چار عظیم سائنس دانوں یعنی البیرونی، الادریسی، یاقوت اور ابوالفدا میں سے کسی ایک کو دوسرے سے سبقت دینا مشکل کام ہے۔ ول ڈیوراں کے ہم خیال کچھ لوگ البیرونی کو سب سے بڑا کہتے ہیں کچھ الادریسی کو، کچھ یاقوت کو اور کچھ ابوالفدا کو۔ جارج سارٹن ابوالفدا کا بہت مداح ہے۔ اس نے بارہویں، تیرہویں، چودہویں صدیوں کو چھ نصف صدیوں میں تقسیم کرکے ہر نصف صدی کو دنیا کے تین سب سے نامور عالموں سے منسوب کیا ہے۔ اس کی نظر میں صرف ابوالفدا ہی مسلمانوں میں ایسا عالم تھا جس کے نام کو عیسائی اور یہودی عالموں کے ناموں پر سبقت دی جا سکے۔ چنانچہ اس نے چودہویں صدی کے اول نصف میں ابوالفدا کے نام کو پہلا مقام دیا ہے۔ الادریسی نقشہ سازی کے لیے بھی بہت مشہور ہے۔

ابو عبداللہ (یا ابوالحامد) محمد ابن عبدالرحیم (یا عبدالرحمٰن) ابن سلیمان القیسی المازنی الاندلسی الغرناطی 1080-81ء میں غرناطہ (Granada) میں پیدا ہوا اور 1169-70ء میں دمشق میں اس کا

انتقال ہوا۔ وہ 1117ء میں سیاحت کے لیے اپنے وطن سے نکلا۔ سارڈینیا اور سسلی ہوتا ہوا مصر پہونچا۔ 1122-26ء میں وہ بغداد پہونچا' 1130ء میں وہ ابہرو جبال (Media) میں تھا۔ 1131ء میں نہر اتیل (The Volga) کے کنارے بسے ہونے شہر تسخین یا سقین میں پہونچا اور اس علاقے میں کئی سال گزارے۔ 1135-36ء میں بلغار میں تھا جو نہر اتیل کے ایک اور شہر کزن کے قریب واقع تھا۔ 1150-51ء میں وہ انگوریہ (Hungary) کے شہر بشگرد (Bashgird) میں تھا اور 1160ء میں پھر اس کا بغداد میں ہونا پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ خراسان اور شام کے مختلف شہروں میں رہا۔ 1162ء میں وہ موصل میں تھا۔ اس کے وطن واپس ہونے کی شہادت نہیں ملتی' 1160ء میں اس نے بغداد میں بیٹھ کر "المغرب عن بعض عجائب المغرب" تصنیف کی۔ مغرب کے معنی مجموعہ کے ہیں۔ 1162ء میں جب کہ وہ موصل میں تھا' المازنی نے "تحفۃ الالباب و نخبت الاعجائب" لکھی۔ اس کی دو اور کتابیں بھی بتائی جاتی ہیں۔ پھر نخبت الاذان فی عبائب البلدان اور "عجائب المخلوقات۔ "نخبت کے معنی منتخب کے ہیں۔ شاید "نخبت الاذان" اور "عبائب المخلوقات" اس کی پہلی دو تصنیفوں کے دوسرے نام ہیں۔

اس نے جو مختلف ملکوں کے حالات لکھے ہیں وہ قصے کہانیوں کے انداز میں لکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ محض افسانے ہوں۔ المازنی نے "تحفۃ الالباب" کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (1) دنیا اور اس کے باشندوں (آدمیوں اور جنوں) کے عام حالات (2) مختلف ممالک کے عجائب (3) سمندر' جزیرے اور غیر معمولی حیوانات جو وہاں پائے جاتے ہیں (4) غار اور پرانی ہڈیاں جو افتاد زمانہ سے پتھر بن گئی ہوں۔

جب وہ 1136ء میں بلغار میں تھا تو اس نے دیکھا کہ ایسی ہڈیاں کنگھیاں بنانے کے لیے خوارزم تک برآمد کی جاتی ہیں۔ جارج سارٹن گمان کرتا ہے کہ وہ ہڈیاں دراصل ہاتھی کے دانت کی ہوں گی۔

پچھلی فصل میں احمد ابن فضلان کے حالات کے سلسلے میں بتایا تھا کہ وہ نہر اتیل یعنی والگا طے کر کے انتہائی شمالی روس کے قدیم شہر بلغار تک پہونچا تھا۔ المازنی نے بلغار کے علاوہ اس کے علاقے کے کچھ اور شہروں کی بھی سیاحت کی اور پھر وہاں سے مغرب کی طرف چل کر ہنگری جا پہونچا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان دوسرے ممالک کے حالات معلوم کرنے کے لیے کتنے دور دراز اور سخت سرد ملکوں کے سفر کیا کرتے تھے۔ یہی ذوق جستجو تھا جس کے باعث وہ علم جغرافیہ کو ایک موقر علم بنا سکے۔

ابوالحسین محمد ابن محمد الکنانی ابن جبیر 1145ء میں ویلنشیا میں پیدا ہوا۔ وہ کنانہ قبیلہ کا فرد

تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے حج کیا اور 1183ء سے 1185ء تک مشرق قریب گھومتا پھرتا رہا اس کے بعد وطن واپس آ گیا۔ مگر دوبارہ پھر سفر کیا۔ پہلی بار کا سفر 1189ء میں شروع ہو کر 1191ء میں ختم ہوا۔ دوبارہ وہ 1217ء میں وطن سے نکلا اور ابھی اسکندریہ ہی پہونچا تھا کہ وفات پائی۔ اس نے اپنے 1183ء سے 1185ء کے سفر کے حالات قلمبند کیے ہیں جو "رحلت الکنانی" کے نام سے موسوم ہونے۔ یہ عربی ادب میں اپنی قسم کی نہایت اہم کتاب ہے۔ یہ جغرافیائی حالات کے علاوہ مختلف فنون اور حرفتوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتی ہے۔ مثلاً اس میں جہازوں پر' شفاخانوں پر' تہ زمین ذخیروں پر معلومات ملتی ہے۔ ابن بطوطہ کے کاتب ابن جزئی نے اس کتاب میں جمع کی ہوئی معلومات سے بڑی حد تک استفادہ کیا۔ اس کتاب کے بارے میں سارٹن نے کہا ہے کہ اس کے مقابلہ میں لاطینی سفر نامے بالکل بچگانہ نظر آتے ہیں۔

محمد ابن محمود ابن احمد الطوسی السلمانی طغرل ثانی کے زمانے میں تھا۔ طغرل کا زمانہ 1177ء سے 1194ء تک رہا۔ 1160ء میں الطوسی نے "عجائب المخلوقات" تصنیف کی۔ یہ جغرافیہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس کی ابتدا میں بحر الخزر (Caspian sea)' بحر روم (Mediterranean sea) جبال (Media) سندھ۔ بحر عرب اور عرب کے کچھ نقشے منسلک کئے ہیں جو زیادہ احتیاط سے نہیں تیار کیے گئے۔

علی ابن ابی بکر ابن علی الہروی کے آباء و اجداد ہرات کے رہنے والے تھے' اسی لیے وہ ہروی کہلایا گو وہ موصل میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک صوفی سیاح تھا۔ وہ 1173-74ء میں یروشلم گیا جو اس وقت عیسائیوں کے قبضہ میں تھا۔ (1187ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم کو عیسائیوں کے قبضہ سے واپس لیا اور اس مقدس شہر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کی تاریخ یعنی 27 رجب کو داخل ہوا)۔ بازنطینی شہنشاہ سے روابط رکھتا تھا۔ جب 1191ء میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ شیر دل تیسری صلیبی جنگ میں شرکت کرنے کی غرض سے بحری راستہ فلسطین آ رہا تھا تاکہ سلطان صلاح الدین کے قبضہ سے یروشلم کو نکالے تو الہروی بھی بحری سفر کر رہا تھا۔ شاہ رچرڈ کے بیڑے نے اسے گرفتار کر لیا اور ان یادداشتوں میں سے کچھ جو اس نے اپنے مختلف سفروں میں لکھی تھیں' ضائع ہوگئیں تاہم اس نے زائرین کی رہنمائی کے لیے ایک مفصل کتاب جس کا نام "کتاب الاشارات فی معرفت الزیارات" ہے' تصنیف کی جس میں اس نے شام' فلسطین' مصر' بازنطینی سلطنت' عراق' ہندوستان' عرب' حبش اور المغرب کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ حبش اور المغرب کے علاوہ اور ممالک کے جو حالات اس نے قلمبند کئے وہ سب اس کے چشم دید تھے۔ اس کتاب میں وہ اپنی ایک اور تصنیف "کتاب العجائب" کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس کے اقتباسات دیتا ہے۔

ابو محمد عبداللطیف ابن یوسف ابن محمد ابن علی البغدادی 1162ء میں بغداد میں پیدا ہوا اور 1231ء میں اس نے وفات پائی۔ وہ بہت بڑا عالم اور مختلف علوم کا ماہر تھا۔ اس کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ اس کا ذکر اطبا کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ جس زمانے میں وہ جامع الازہر میں معلم تھا، اسے مصر کے حالات کو ایک سائنس داں کی نگاہ سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس نے ان حالات کو اپنی مشہور تصنیف "الافادت والاعتبار فی الامور المشاہدات و الحوادث المعانیت بہ ارض مصر" میں پیش کیا۔ یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ نباتات، حیوانات، آثار قدیمہ، عمارات، دریائے نیل، جہاز رانی حتیٰ کہ طباخی (Cookery) کے بارے میں بھی اس کتاب میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ جغرافیہ پر قرون وسطیٰ کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔

ابو علی الحسن ابن علی ابن عمر المراکشی کا ذکر ہیئت دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک علم جغرافیہ کی اس صنف کا تعلق ہے جو ریاضی پر مبنی ہے، الحسن المراکشی کی تحقیق بہت گراں قدر ہے۔ اس میں قرون وسطیٰ کا کوئی مسلم یا غیر مسلم جغرافیہ داں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ 1229-30ء میں اس نے "جامع المبادی و الغایات" تصنیف کی۔ یہ تصنیف جغرافیائی نقطہ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ اس نے کھمبے کے عکس کے ذریعہ سورج کی بلندی اور دن کے اوقات معلوم کرنے کے طریقہ پر تحقیق کی۔ اس علم کو نومونکس (Gnomonics) کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ اس نے ہر عرض البلد کے اوقات متعین کیے۔ اس نے ایک سو پینتیس مقامات کے طول البلد اور عرض البلد کی فہرست "جامع" میں شامل کی ہے۔ ان ایک سو پینتیس مقامات سے چونتیس کے طول البلد اور عرض البلد اس نے خود اپنے مشاہدات و تجربات کی بنا پر متعین کئے۔ جغرافیہ کی اس صنف میں جیسی الحسن المراکشی نے دقیقہ سنجی سے کام لیا کسی اور نے نہیں لیا۔

ابو عبداللہ یاقوت ابن عبداللہ الحماوی 1179ء میں ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین یونانی تھے۔ وہ کم عمری میں ہی غلام بنا کر بیچا گیا تھا۔ جس مسلمان سوداگر نے اسے خریدا تھا، گو وہ بغداد میں رہتا تھا مگر حما کا رہنے والا تھا۔ اس لیے اس کے نام کے ساتھ "الحماوی" کی نسبت کی گئی۔ یاقوت ایک بیش بہا پتھر ہوتا ہے۔ اس کے آقا نے اس کی قدر و منزلت بڑھانے کے لیے یاقوت نام رکھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ خود اس نام سے خوش نہ تھا۔ چنانچہ بدل کر یعقوب رکھا۔ لیکن وہ یاقوت کے نام سے مشہور ہو چکا تھا اس لیے یعقوب مقبول نہ ہوا۔ یاقوت کے آقا نے اسے اچھی تعلیم دلائی اور آزاد کر دیا۔ اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور اس سلسلہ میں مصر، شام، ایران، خراسان وغیرہ کے سفر کیے، مختلف مقامات کو دیکھ کر اس کے دل میں ان کے حالات معلوم کرنے اور لکھنے کی آرزو ہوئی۔ جب مرو پہونچا اور وہاں کے دس بڑے بڑے کتب خانے دیکھے تو وہ سب کچھ بھول کر کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔ کتب خانوں کے منتظمین نے اس کے ذوق و شوق کی قدر کی اور اسے

اجازت دے دی کہ بیک وقت وہ جتنی کتابیں چاہے گھر لے جائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ بقول ول ڈیوراں دو سو کتابیں اپنے گھر لے گیا۔ مرو میں اپنے ذہنی تشنگی کو بجھا کر وہ خیوا اور بلخ گیا۔ جاہل تاتاریوں نے اسے گرفتار کرنا چاہا وہ سوائے اپنی یادداشتوں کے سب کچھ چھوڑ کر بھاگا۔ موصل پہونچ کر اس نے حقیر اجرت پر کاتب کا کام کرنا شروع کیا۔ اسی تنگ دستی کے عالم میں اس نے اپنی مشہور عالم کتاب "معجم البلدان" تصنیف کی۔ اس نے اس کتاب کا خاکہ اسی وقت جبکہ وہ 1218-19ء میں مرو میں تھا تیار کر لیا تھا۔ 1228ء میں حلب میں بیٹھ کر اس نے معجم البلدان پر نظرثانی کی اور ایک سال بعد 1229ء میں اپنی زندگی کا مقصد پورا کرکے صرف پچاس سال کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔

"معجم البلدان" عربی زبان کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس میں بیش بہا جغرافیائی معلومات کے علاوہ اور کئی علوم مثلاً ہیئت، طبیعیات، آثار قدیمہ، علم الاقوام اور تاریخ کی مفید معلومات بھی جمع کی گئی ہیں۔ نامور لوگوں کے سوانح حیات بھی درج کئے ہیں اور شہروں کے طول البلد اور عرض البلد کی فہرست شامل کی ہے۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ یاقوت کی طرح زمین سے شاید ہی کسی نے محبت کی ہو اور اس کو اتنے مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہو۔ یاقوت الادریسی سے برتر نہیں تو اس کے ہم پلہ ضرور نظر آتا ہے۔

سارٹن نے معجم البلدان کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کے مقدمہ میں یاقوت نے جغرافیہ پر ریاضیاتی، طبیعی اور سیاسی نقطہ نظر سے بحث کی ہے اور دنیا کی جسامت اور اس کی سات آب و ہواؤں کا حال بیان کیا ہے۔ معجم البلدان جو دراصل ایک قاموس ہے، حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہے۔ بہت سے مقامات کا ہیئتی محدد (Astronomical Coordinate) بتلایا ہے۔ اسمائے مفرد کے ہجوں اور تلفظ کا خاص خیال رکھا ہے۔ قواعد زبان پر بحث کی ہے۔ مشہور و معروف لوگوں کے حالات لکھے ہیں اور بہت سے تاریخی واقعات قلمبند کئے ہیں۔

یاقوت کی اور دو کتابوں کے نام یہ ہیں: "کتاب ارشاد الاریب الامعرفت الاریب" (اریب کے معنی ہیں دانشمند)، "کتاب المشترک وضعاد المختلف (یا مفترق)"۔

ابو یحییٰ زکریا ابن محمد ابن محمود القزوینی 1203-4ء میں قزوین میں پیدا ہوا جو عراق عجم میں ہے۔ اس کا انتقال اسّی سال کی عمر میں 1283ء میں ہوا۔ عراق کے دو شہر واسط اور حلہ کا وہ قاضی تھا۔ دمشق میں اس کی ابن عربی (ہمہ اوستی صوفی) سے ملاقات ہوئی۔ گو القزوینی عجمی تھا اور اس زمانہ میں فارسی تصانیف بھی رائج ہو چکی تھیں مگر اس نے اپنی مشہور کتابیں "عجائب المخلوقات و غرائب

الموجودات" اور " آثار البلاد و اخبار العباد "عربی میں تصنیف کیں ۔ بعد میں اس کتاب کا فارسی میں اور کچھ حصوں کا ترکی میں ترجمہ ہوا ۔ القزوینی المفضل ابن عمر البہری کا شاگرد تھا ۔ البہری کا ذکر اس مقالے کی شروع میں ہیئت دانوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔

" عجائب المخلوقات " دو حصوں میں منقسم ہے ۔ پہلے حصہ میں فلکیات سے بحث کی گئی ہے اور دوسرا ارضی چیزوں سے متعلق ہے اور دوسرے حصہ میں زیادہ تر جغرافیائی معلومات ہیں جو " آثار البلاد " میں اکثر مقامات پر لفظ بلفظ نقل کر دی گئی ہیں ۔ یہ حصہ بہت مقبول ہوا ۔ اس کے کم از کم دو ترجمے فارسی میں ، تین ترکی میں اور ایک چغتائی زبان میں ہوا ۔ الدمیری نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ۔ اس کے تین مختلف اوقات کے نسخے پائے جاتے ہیں ۔ 63-1262ء اور 76-1275ء کے نسخے ضخامت میں کم ہیں ۔ تیسرا نسخہ بعد کا ہے اور زیادہ ضخیم ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس میں بعد میں الحاق کیا گیا ہے۔

" آثار البلاد و اخبار العباد " میں سات آب و ہواؤں میں سے ہر ایک آب و ہوا کے ملکوں ، شہروں ، پہاڑوں ، جزیروں ، جھیلوں ، ندیوں وغیرہ کا حروف تہجی کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ذکر کیا ہے ۔ علم الاقوام ، تاریخ اور سوانح نگاری سے متعلق معلومات بھی جمع کی ہیں ۔ 4-1403ء میں باکو کے عبدالرشید ابن صالح ابن نوری نے اس کی تلخیص کی اور جن شہروں کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا تھا ان کے طول و عرض البد کا اضافہ کیا ۔ آب و ہوا کی بنا پر دنیا کو سات جن منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ، ان کی حدود کے خطوط خط استوا کے متوازی قائم کئے گئے ہیں ۔ پہلا منطقہ خط استوا سے سب سے زیادہ قریب ہے اور اس میں دن کی مدت پونے تیرہ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ جب کہ ساتویں منطقہ میں سب سے لمبا دن پونے سولہ گھنٹے کا ہوتا ہے۔

محمد ابراہیم ابن یحییٰ الوطواط 1335ء میں پیدا ہوا اور اس نے 1418ء میں وفات پائی ۔ اس کے نام کے ساتھ الکتبی اور الورّاق بھی لکھا جاتا ہے ۔ کتبی کتب فروش کو اور وراق کاغذ فروش کو کہتے ہیں (پاکستان میں کاغذ فروش کو کاغذی کہتے ہیں) عموماً کتابیں اور کاغذ ایک ہی دکان پر فروخت ہوتی ہیں ۔ الوطواط بھی یہ دونوں چیزیں فروخت کرتا ہوگا اس لیے یہ دونوں لفظ اس کے نام کا جز ہو گئے ۔ القزوینی کی طرح الوطواط نے بھی جغرافیائی معلومات کی ایک قاموس تالیف کی مگر یہ اتنی ضخیم نہیں ہے ۔ اس کا نام " قبابج الفکاد قتابج العباد " ہے ۔ الوطواط نے اس قاموس میں علوم طبیعی (Natural Sciences) سے بھی بحث کی ہے ۔ اس نے اخلاقیات پر بھی ایک کتاب لکھی۔

ناصر الدین الطوسی کا ذکر ریاضی دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ وہ قریب قریب سائنس

کے جملہ علوم کا عالم تھا ۔ جغرافیہ پر اس نے " کتاب صورت الاقالیم " لکھی ۔ ناصر الدین طوس میں 1201ء میں پیدا ہوا تھا اور 1274ء میں فوت ہوا۔

محمد ابن مسعود ابن مصلح قطب الدین شیرازی 1236ء میں پیدا ہوا اور 1311ء میں تبریز میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس کا ذکر اس مقالے کے شروع میں ریاضی و ہیئت دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ اس کی سب سے اہم کتاب کا نام "نہایت الادراک فی درایت الافلاک " ہے جو ہیئت کے علاوہ جغرافیہ ، علم پیمائش الارض ، موسمیات ، علم مناظر اور میکینکس سے بھی بحث کرتی ہے ۔ جغرافیہ کے سلسلے میں اس نے سمندروں ، مختلف خطوں کی آب و ہوا اور زمین کے متحرک یا ساکن ہونے کے مسائل پر اظہار رائے کیا ہے ۔ اسے معلوم تھا کہ کئی مسلمان ہیئت دانوں یعنی البطروجی ، ابن باجہ ، ابن افلح ، ناصر الدین طوسی وغیرہ نے بطلیموسی نظام کو غلط ٹھہرا دیا تھا ۔ پھر بھی اس نے بطلیموس کی تقلید میں زمین کو ساکن ہی قرار دیا ۔ اس نے مختلف خطوں کی آب و ہوا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو البیرونی لکھ چکا ہے۔

"نہایت الادراک " ناصر الدین طوسی کے " تذکرہ فی علم الہیہ " پر مبنی ہے ۔ مگر اس سے زیادہ جامع ہے اور اس نے کچھ نیا مواد شامل کر کے خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

ابوالحسن علی ابن موسیٰ بن محمد ابن سعید المغربی غرناطہ کے قریب ایک مقام میں پیدا ہوا ، اس کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے ۔ وہ 9-1208ء میں یا 1214ء میں پیدا ہوا تھا ۔ اشبیلیہ (Seville) میں تعلیم پائی ۔ پھر مدتوں اسلامی ممالک کی سیاحت کی ۔ اسے ہلاکو خان نے 1256ء میں اپنے مہمان کی حیثیت سے آرمینہ بلایا اور 1265ء تک وہ اس کا مہمان رہا ۔ اس اثنا میں ہلاکو خاں نے 1258ء میں بغداد کو تباہ کر کے خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا ۔ ابن سعید المغربی کے مقام و تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے ۔ وہ یا تو دمشق میں 5-1274ء میں فوت ہوا یا تیونس میں 87-1286ء میں ۔ جب 1251ء میں المغربی بغداد میں تھا تو وہاں کے چھتیس کتب خانوں کو اسے دیکھنے کا موقع ملا تھا غالباً ان سے مستفید بھی ہوا ہو گا۔

ابن سعید المغربی کی سب سے اہم تصنیف " کتاب بسط الارض طولہا و العرض " ہے جو جغرافیہ پر لکھی گئی ہے ۔ یہ بطلیموس اور الادریسی کی کتابوں پر مبنی ہے مگر ابن سعید نے ان پر اضافہ کیا ہے ۔ مثلاً یہ کہ الادریسی کی کتابوں میں بہت سے بڑے شہروں کے طول البلد اور عرض البلد نہیں تھے ۔ ابن سعید نے اس کمی کو پورا کیا ۔ کچھ ایسے واقعات اور حقیقتیں جن کا انکشاف الادریسی کے عہد کے بعد ہوا وہ بھی اس نے اپنی کتاب میں درج کیں ۔ ابوالفدا نے اس کتاب سے استفادہ کیا اور اس

کی مدد سے کچھ غلطیوں کی تصحیح کی جو اس کی مشہور تصنیف "تقویم البلدان" کے پہلے ایڈیشن میں پائی جاتی تھیں اور جو بعد کے ایڈیشن میں نہیں ملتیں۔

ابن سعید نے یورپ کے کچھ شمالی ممالک کے حالات بھی لکھے ہیں جہاں سفید ریچھ پائے جاتے ہیں۔ وہ ہسلاندہ (Iceland) کو سفید شاہینوں کا جزیرہ بتلاتا ہے۔

ابو محمد ابن محمد ابن علی العبدری ویلنشیا میں پیدا ہوا۔ وہ قریش قبیلے کے عبد الدر ابن قصیٰ ابن مرّا کی اولاد میں سے تھا۔ 1289ء میں وہ حج کرنے مکہ خشکی کے راستے سے گیا اور اسی راستے سے واپس آیا۔ اس طرح شمالی افریقہ سے وہ دوبار گزرا۔ الجیریا کے شہر تلمسین (Tlemcen) میں رہ کر العبدری نے افریقہ کے شمالی ممالک کے حالات قلمبند کئے اور اپنی کتاب کا نام "الرحلۃ المغربیہ" رکھا۔ اس کتاب میں اس نے ان ممالک کی طبعی کیفیت اور باشندوں کی بود و باش کی بڑی اچھی اور سچی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے انتقال کا سال معلوم نہیں۔

ابو عبداللہ محمد ابن عمر محب الدین السبتی مراکش کے شہر سبتہ (Ceuta) میں 1259ء میں پیدا ہوا جہاں ایک سو ساٹھ سال پہلے الادریسی بھی پیدا ہوا تھا۔ وہ محمد بن رُشید کے نام سے مشہور ہے اس نے فاس (Fez) میں تعلیم پائی۔ 85-1284ء میں اس نے اپنے دوست محمد ابن عبد الرحمٰن الاشبیلی کے ساتھ جو مورخ اور مبلغ تھا، حج کیا۔ حج سے واپسی پر دونوں نے غرناطہ میں سکونت اختیار کی۔ 1309ء میں کسی نے ابن عبد الرحمٰن کو قتل کر دیا۔ تب ابن رشید اپنے وطن مراکش چلا آیا۔ فاس میں اس کا 1321ء میں انتقال ہوگیا۔ اس نے دو سفرنامے لکھے اور ان کو "رحلتانی" کا نام دیا۔ ان میں سے ایک میں اسپین کے حالات درج کئے ہیں اور دوسرے میں افریقہ کے۔ ان دونوں میں تاریخ طبیعی یعنی حیوانات و نباتات کی ابتدائی معلومات درج کی ہیں۔ اس کے علاوہ متعلقہ ممالک کی ادبی تاریخ بھی کتاب میں شامل کی ہے۔

ابن رشید محدث بھی تھا۔ اس نے حدیث پر کئی کتابیں لکھیں اور بحیثیت مورخ اس نے کچھ لوگوں کی سوانح عمریاں بھی قلمبند کیں۔

بارہویں اور تیرہویں صدی کے جغرافیہ دانوں کے حالات ختم ہوئے۔

اسلامی حکومتوں کی وسعت

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں مسلمان دنیا کے بہت بڑے حصے پر حکمراں تھے اور ان کی تہذیب اور ان کا تمدن ان کی حکومت کی حدود کے باہر بھی نفوذ کر گیا تھا۔ براعظم افریقہ، جتنا اس وقت تک دریافت کیا جا چکا تھا، سب کا سب مسلمانوں کے زیر اقتدار تھا۔ مشرق قریب، مشرق وسطیٰ، وسط ایشیا کا ایک بڑا حصہ اور ہندوستان کا بیشتر اور بہترین حصہ انہیں کے زیرنگیں تھا۔ بحر ظلمات سے خلیج بنگال تک اور المغرب سے ہندوستان تک ان کی تہذیب و تمدن پر گواہی دینے والی شاندار عمارتیں جگہ جگہ نظر آتی تھیں۔ یہی نہیں کہ مسلمان دنیا کے بڑے حصے پر حکمراں تھے، بلکہ جن ممالک میں ان کی حکومت نہ تھی ان میں سے بھی اکثر میں وہ آباد ہو گئے تھے اور جب کوئی مسلمان ایسے ملک میں پہنچتا تھا تو وہاں کے مسلمان اپنے اس بھائی کا خیرمقدم کرتے تھے۔ ہر سال حج کے موقع پر مختلف ممالک کے مسلمان ملتے جس سے ان کا جذبہ اخوت مستحکم ہوتا۔ ان میں مذہب اور زبان کا رشتہ ایسا تھا کہ دور دراز ملکوں میں بھی جا کر اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ابن بطوطہ جہاں جہاں گیا وہیں اس کو اپنے ہم زبان ملے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی زبان سیکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری تھا) ابن بطوطہ کی اسکندریہ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس نے ابن بطوطہ سے درخواست کی کہ جب سندھ جاؤ تو میرے فلاں دوست سے، ہندوستان جاؤ تو فلاں سے اور چین جاؤ تو فلاں سے ملنا۔ "خلاصہ تحفۃ النظار" یعنی سفر نامہ شیخ ابن بطوطہ میں مولوی عبد الرحمٰن خان (سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ و صدر حیدر آباد اکاڈیمی) نے لکھا ہے کہ یہ شخص جس نے ابن بطوطہ سے کہا تھا کہ میرے دوستوں سے سندھ، ہندوستان اور چین میں ملنا ایک تارک الدنیا، عالم دین برہان الدین تھا۔ اس وقت تک ابن بطوطہ کا ہندوستان اور چین جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ برہان الدین نے پیشین گوئی کی کہ تم ان ممالک کی سیاحت کرو گے اور جب کرو تو میرے دینی بھائی فریدالدین سے ہندوستان میں ملاقات کرنا، رکن الدین سے سندھ میں اور برہان الدین سے چین میں اور انہیں میرا اسلام کہنا۔

جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ مسلمان سیاح لمبے لمبے سفر کرتے، چنانچہ ٹمبکٹو میں ابن بطوطہ کی ایک مصری سے ملاقات ہوئی اور ترکی، ہندوستان اور چین میں اسے المغرب اور مصر کے لوگ ملے۔ مسلمانوں میں باہمی اتحاد اور محبت تھی۔ ایشیا اور افریقہ کی ساری تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ تمام تجارتی رہگزروں پر ان کے قافلے یا ان کے جہاز چلتے تھے۔ مسلمان سیاح کو ہر سفر میں دل پسند ماحول ملتا اور اس کو ہر طرح کی آسانیاں فراہم کی جاتیں۔ "خلاصہ تحفۃ النظار" میں لکھا ہے کہ ابن بطوطہ اپنے گھر سے جب نکلا تھا تو اس کے پاس زاد راہ بہت کم تھا۔ قسطنطین پہونچا تو اس کے ایک دوست نے اپنا سامان بیچ کر ابن بطوطہ کے لیے زاد سفر فراہم کیا۔ (قسطنطین اور قسطنطنیہ دو مختلف شہر ہیں۔)

قسطنطین شمالی افریقہ میں ہے اور قسطنطنیہ یورپ میں) جب قسطنطین کے حاکم نے ابن بطوطہ کو خستہ حال دیکھا تو اس نے بھی اسے عمدہ پوشاک عطا کی تھی اور کئی مقامات پر بھی مقامی حکام نے ابن بطوطہ کی مالی مدد کی ۔ اگر اسے وقتاً فوقتاً عطیات نہ ملتے تو ظاہر ہے کہ وہ متواتر چوبیس سال تک سفر کے اخراجات برداشت نہ کرسکتا ۔ کئی جگہ وہ قاضی مقرر کیا گیا ۔ یہ بھی مسافر کی مدد کرنے کا ایک طریقہ تھا کہ اس کے سپرد کوئی خدمت کر دی جائے اور خوش اسلوبی سے اسے کچھ دے دیا جائے ۔ قرآن مجید میں ابن السبیل کی امداد پر بار بار زور دیا گیا ہے چنانچہ اس زمانے کے لوگ مسافر کی مدد کرنا اپنا دینی فرض سمجھتے تھے ۔

اسپین سے مسلمانوں کی بے دخلی

تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی اسپین کی وہ مایہ ناز سلطنت جس کی بنیاد طارق بن زیاد نے 8 رجب 92ھ مطابق 30 اپریل 711ء کو جبل الطارق فتح کر کے رکھی تھی بہت کمزور ہوگئی تھی ۔ 1236ء میں قرطبہ پر اور 1248ء میں اشبیلیہ (Seville) پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تھا ۔ صرف غرناطہ کی چھوٹی سی ریاست مسلمانوں کے پاس رہ گئی تھی ۔ مگر یہ چھوٹی سی ریاست بھی بڑی سخت جان نکلی ۔ چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہونے کے باوجود کم و بیش ڈھائی سو سال تک اور چلی ۔ بالآخر 2 ربیع الاول 897ھ مطابق 1492ء کو اس کا بھی خاتمہ ہوگیا اور آٹھ سو سال کی اسلامی حکومت کے بعد مسلمانوں سے ایسا ظالمانہ سلوک کیا گیا کہ وہ ترک سکونت پر مجبور ہو کر افریقہ میں جا بسے ۔ 1610ء تک ایک ایک کر کے تمام مسلمان اسپین سے ملک بدر کر دیئے گئے ۔

یورپ میں عثمانی حکومت کا قیام

یورپ کے مغربی حصہ (اسپین) میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونی شروع ہوئی تو انہوں نے مشرقی حصے کو مطیع کرنا شروع کر دیا ۔ تیرہویں صدی کے آخر میں روم (ایشیائے کوچک) میں عثمانی ترک ابھرنے شروع ہوئے ۔ انہوں نے اناطولیہ میں ایک مستحکم ریاست قائم کرلی ۔ ان کی قوت اتنی بڑھی کہ باز نطینی شہنشاہ ان سے آڑے وقت میں مدد کا طالب ہونے لگا ۔ 1341ء میں سلونیکا میں بغاوت ہوئی ' امرا کو ملک سے نکال کر لوگوں نے حکومت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ شہنشاہ نے عثمانی سلطان اُرخاں سے (جس نے 1326ء سے 1360ء تک حکومت کی) مدد مانگی اور جب 1342ء میں سلطان کی مدد سے سلونیکا پر شہنشاہ جان ششم کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تو اظہار تشکر میں اس نے اپنی بیٹی تھیوڈورا کی سلطان سے شادی کر دی ۔ باز نطینی شہنشاہ کے خلاف آئے دن سازشیں ہوتی رہتی

تھیں اور ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی ۔ اس کی مدد کو سلطان ترک فوج بھیجتا رہتا ۔ اس طرح بیس ہزار فوج یورپ پہنچ گئی ۔ سلطان کے بیٹے نے جو فوج کی سربراہی پر مقرر کیا گیا تھا ' مناسب سمجھا کہ ایک خطہ کو اپنے قبضہ میں لے کر اسے ترکی فوج کا مرکز بنائے چنانچہ 1353ء میں اس کی درخواست پر شہنشاہ نے زچلے (Tzympe) کا قلعہ جو درہ دانیال (Dar-Danelles) کے پار یورپ کی سرزمین پر واقع تھا ' شہزادے کے سپرد کر دیا ۔ 1355ء میں جان پیلیو لوگس (John Palaeologus) شہنشاہ جان ششم کو تخت سے اتارنے میں کامیاب ہوگیا ۔ معزول شہنشاہ سلطان ارخاں کا خسر تھا ۔ اس کے معزول ہونے پر سلطان کو نئے باز نطینی شہنشاہ سے نبرد آزما ہونا پڑا ' جس کے نتیجہ میں گیلی پولی پر 1355ء میں اور ایڈریانوپل اور ارد گرد کے علاقے پر 1361ء میں سلطان مراد اول کا قبضہ ہوگیا ۔ باز نطینوں اور ترکوں کی جنگ کا سلسلہ بڑھتا گیا ۔ سلطان نے اپنے یورپی مقبوضہ جات کا دارالحکومت ایڈریانوپل کو بنایا اور یورپ میں اپنی حکومت کو مستحکم کرنا شروع کیا ۔ ترکوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو دیکھ کر پوپ اربن پنجم نے مسیحی جنگ کا اعلان کر دیا ۔ کئی عیسائی ملکوں کی فوجیں ایڈریانوپل کی طرف بڑھیں اور حسب دستور خوب رنگ رلیاں اور مے نوشی کرتی ہوئی ایڈریانوپل کے قریب پہونچ گئیں ۔ جب ایک پڑاؤ پر عیسائی فوج اپنے مشاغل عیش میں مصروف تھی ترکوں نے آ کر ان کا قلع قمع کر دیا ۔ مدہوشی کے عالم میں فوجی بھاگے تو بہت سے دریائے مارسا میں ڈوب گئے اور ہزاروں مارے گئے ۔ یہ واقعہ 1371ء کا ہے ۔ عیسائیوں کی اس شکست کے بعد بلغاریہ ' سلونیکا ' سربیا ' یونان وغیرہ پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا ۔ عیسائی حکومتوں نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے ۔ چنانچہ ہنگری ' فرانس ' جرمنی ' بویریہ اور کئی عیسائی حکومتوں نے سلطان بایزید یلدرم پر حملہ کر دیا ۔ نیکوپولس کے مقام پر مقابلہ ہوا ۔ یہ بڑا سخت معرکہ تھا ۔ مگر ترکوں نے عیسائیوں کو شکست فاش دی ۔ 1402ء میں سلطان یلدرم نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ۔ قسطنطنیہ کے اردگرد کا علاقہ ترکوں کے قبضے میں پہلے ہی آچکا تھا ۔ قسطنطنیہ والوں کو کسی قسم کی کمک پہونچنے کا کوئی امکان نہ تھا ۔ شہر میں غذا کے جو ذخیرے تھے وہ ختم ہو چکے تھے ۔ قسطنطنیہ والے ہتھیار ڈالنے ہی والے تھے کہ ان کی کمک تیمور لنگ کی شکل میں نمودار ہوئی ۔ سلطان کو معلوم ہوا کہ تیمور اس کی سلطنت کا تختہ الٹنے کے لیے انقرہ کے قریب پہونچ گیا ہے ۔ وہ قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر انقرہ پہونچا ۔ تیمور لنگ ٹڈی دل سے مقابل ہوا ۔ سلطان کو شکست ہوئی اور گرفتار کر لیا گیا ۔ یورپ کے عیسائی بادشاہوں نے تیمور لنگ کو تہنیت کے خطوط بھیجے اور یورپ میں جو پچھلے پچاس ساٹھ سال میں مسلمانوں کے قبضے میں ممالک آئے تھے ان میں سے بیشتر ان کے ہاتھ سے نکل گئے ۔ سلطان بایزید یلدرم کا دور حکومت 1389ء سے 1402ء تک رہا ۔ وہ تیمور کی قید میں مرا ۔

قسطنطین شمالی افریقہ میں ہے اور قسطنطنیہ یورپ میں) جب قسطنطین کے حاکم نے ابن بطوطہ کو خستہ حال دیکھا تو اس نے بھی اسے عمدہ پوشاک عطا کی تھی اور کئی مقامات پر بھی مقامی حکام نے ابن بطوطہ کی مالی مدد کی ۔ اگر اسے وقتاً فوقتاً عطیات نہ ملتے تو ظاہر ہے کہ وہ متواتر چوبیس سال تک سفر کے اخراجات برداشت نہ کرسکتا ۔ کئی جگہ وہ قاضی مقرر کیا گیا ۔ یہ بھی مسافر کی مدد کرنے کا ایک طریقہ تھا کہ اس کے سپرد کوئی خدمت کر دی جائے اور خوش اسلوبی سے اسے کچھ دے دیا جائے ۔ قرآن مجید میں ابن السبیل کی امداد پر بار بار زور دیا گیا ہے چنانچہ اس زمانے کے لوگ مسافر کی مدد کرنا اپنا دینی فرض سمجھتے تھے ۔

اسپین سے مسلمانوں کی بے دخلی

تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی اسپین کی وہ مایہ ناز سلطنت جس کی بنیاد طارق بن زیاد نے 8 رجب 92ھ مطابق 30 اپریل 711ء کو جبل الطارق فتح کر کے رکھی تھی بہت کمزور ہوگئی تھی ۔ 1236ء میں قرطبہ پر اور 1248ء میں اشبیلیہ (Seville) پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تھا ۔ صرف غرناطہ کی چھوٹی سی ریاست مسلمانوں کے پاس رہ گئی تھی ۔ مگر یہ چھوٹی سی ریاست بھی بڑی سخت جان نکلی ۔ چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہونے کے باوجود کم و بیش ڈھائی سو سال تک اور چلی ۔ بالآخر 2 ربیع الاول 897ھ مطابق 1492ء کو اس کا بھی خاتمہ ہوگیا اور آٹھ سو سال کی اسلامی حکومت کے بعد مسلمانوں سے ایسا ظالمانہ سلوک کیا گیا کہ وہ ترک سکونت پر مجبور ہو کر افریقہ میں جا بسے ۔ 1610ء تک ایک ایک کرکے تمام مسلمان اسپین سے ملک بدر کر دیئے گئے ۔

یورپ میں عثمانی حکومت کا قیام

یورپ کے مغربی حصہ (اسپین) میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونی شروع ہوئی تو انہوں نے مشرقی حصے کو مطیع کرنا شروع کر دیا ۔ تیرہویں صدی کے آخر میں روم (ایشیائے کوچک) میں عثمانی ترک ابھرنے شروع ہوئے ۔ انہوں نے اناطولیہ میں ایک مستحکم ریاست قائم کرلی ۔ ان کی قوت اتنی بڑھی کہ باز نطینی شہنشاہ ان سے آڑے وقت میں مدد کا طالب ہونے لگا ۔ 1341ء میں سلونیکا میں بغاوت ہوئی ، امرا کو ملک سے نکال کر لوگوں نے حکومت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ شہنشاہ نے عثمانی سلطان اُرخاں سے (جس نے 1326ء سے 1360ء تک حکومت کی) مدد مانگی اور جب 1342ء میں سلطان کی مدد سے سلونیکا پر شہنشاہ جان ششم کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تو اظہار تشکر میں اس نے اپنی بیٹی تھیوڈورا کی سلطان سے شادی کر دی ۔ باز نطینی شہنشاہ کے خلاف آئے دن سازشیں ہوتی رہتی

تھیں اور ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی ۔ اس کی مدد کو سلطان ترک فوج بھیجتا رہتا ۔ اس طرح بیس ہزار فوج یورپ پہنچ گئی ۔ سلطان کے بیٹے نے جو فوج کی سربراہی پر مقرر کیا گیا تھا ، مناسب سمجھا کہ ایک خطہ کو اپنے قبضہ میں لے کر اسے ترکی فوج کا مرکز بنائے چنانچہ 1353ء میں اس کی درخواست پر شہنشاہ نے زچلپے (Tzympe) کا قلعہ جو درہ دانیال (Dar-Danelles) کے پار یورپ کی سرزمین پر واقع تھا ، شہزادے کے سپرد کر دیا ۔ 1355ء میں جان پیلیو لوگس (John Palaeologus) شہنشاہ جان ششم کو تخت سے اتارنے میں کامیاب ہوگیا ۔ معزول شہنشاہ سلطان ارخاں کا خسر تھا ۔ اس کے معزول ہونے پر سلطان کو نئے باز نطینی شہنشاہ سے نبرد آزما ہونا پڑا ، جس کے نتیجہ میں گیلی پولی پر 1355ء میں اور ایڈریانوپل اور ارد گرد کے علاقے پر 1361ء میں سلطان مراد اول کا قبضہ ہوگیا ۔ باز نطینیوں اور ترکوں کی جنگ کا سلسلہ بڑھتا گیا ۔ سلطان نے اپنے یورپی مقبوضہ جات کا دارالحکومت ایڈریانوپل کو بنایا اور یورپ میں اپنی حکومت کو مستحکم کرنا شروع کیا ۔ ترکوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو دیکھ کر پوپ اربن پنجم نے مسیحی جنگ کا اعلان کر دیا ۔ کئی عیسائی ملکوں کی فوجیں ایڈریانوپل کی طرف بڑھیں اور حسب دستور خوب رنگ رلیاں اور مے نوشی کرتی ہوئی ایڈریانوپل کے قریب پہونچ گئیں ۔ جب ایک پڑاؤ پر عیسائی فوج اپنے مشاغل عیش میں مصروف تھی ترکوں نے آ کر ان کا قلع قمع کر دیا ۔ مدہوشی کے عالم میں فوجی بھاگے تو بہت سے دریائے مارسا میں ڈوب گئے اور ہزاروں مارے گئے ۔ یہ واقعہ 1371ء کا ہے ۔ عیسائیوں کی اس شکست کے بعد بلغاریہ ، سلونیکا ، سربیا ، یونان وغیرہ پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا ۔ عیسائی حکومتوں نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے ۔ چنانچہ ہنگری ، فرانس ، جرمنی ، بویریہ اور کئی عیسائی حکومتوں نے سلطان بایزید یلدرم پر حملہ کر دیا ۔ نیکو پولس کے مقام پر مقابلہ ہوا ۔ یہ بڑا سخت معرکہ تھا ۔ مگر ترکوں نے عیسائیوں کو شکست فاش دی ۔ 1402ء میں سلطان یلدرم نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ۔ قسطنطنیہ کے اردگرد کا علاقہ ترکوں کے قبضے میں پہلے ہی آچکا تھا ۔ قسطنطنیہ والوں کو کسی قسم کی کمک پہونچنے کا کوئی امکان نہ تھا ۔ شہر میں غذا کے جو ذخیرے تھے وہ ختم ہو چکے تھے ۔ قسطنطنیہ والے ہتھیار ڈالنے ہی والے تھے کہ ان کی کمک تیمور لنگ کی شکل میں نمودار ہوئی ۔ سلطان کو معلوم ہوا کہ تیمور اس کی سلطنت کا تختہ الٹنے کے لیے انقرہ کے قریب پہونچ گیا ہے ۔ وہ قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر انقرہ پہونچا ۔ تیمور لنگ ٹڈی دل سے مقابل ہوا ۔ سلطان کو شکست ہوئی اور گرفتار کر لیا گیا ۔ یورپ کے عیسائی بادشاہوں نے تیمور لنگ کو تہنیت کے خطوط بھیجے اور یورپ میں جو پچھلے پچاس ساٹھ سال میں مسلمانوں کے قبضے میں ممالک آئے تھے ان میں سے بیشتر ان کے ہاتھ سے نکل گئے ۔ سلطان بایزید یلدرم کا دور حکومت 1389ء سے 1402ء تک رہا ۔ وہ تیمور کی قید میں مرا ۔

تیمور لنگ کی تباہ کاری

جارج سارٹن کہتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کبھی کبھی عذاب الہیٰ (Scourge of God) بڑے بڑے فاتحین کی شکل میں نازل ہوتا ہے ۔ ایسے فاتحین میں سکندر اعظم ' اٹیلا ' چنگیز خاں ' ہلا کو خاں اور تیمور لنگ سرفہرست ہیں ۔ تیمور ان پانچوں میں سب سے بازی لے گیا ۔ چنگیز ' ہلا کو اور تیمور تینوں منگول تھے ۔ تیمور ' چنگیز کے بیٹے چغتائی کی اولاد میں سے ہے ۔ ان تینوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو ایسا غارت کیا کہ پھر کبھی اس کی تلافی نہ ہوسکی ۔ بقول سارٹن تیمور نے مسلمان ہوتے ہوئے اپنے پیغمبر کا تتبع کرنے کے بجائے چنگیز کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دی ۔ اس نے اسلام کے بیشتر شہروں کو تباہ کر دیا ۔ ہرات ' اصفہان ' رُہا (Edessa) ' تکریت ' ماردین ' دہلی ' سواس ' حلب ' ' بغداد ' بروسا ' ازمیر (Smyrna) سب کے سب اس کی غارتگری کے فریادی ہیں ۔ 1383-84ء میں چار ہزار آرمینیوں کو زندہ دفن کر دیا ' اسی سال اس نے حلب اور دمشق میں انسانی کھوپڑیوں سے بیس مینار بنوائے ۔ نومبر 1387ء میں ستر ہزار نہتے باشندوں کو ہلاک کیا ۔ جیسے وہ سپہ سالاری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا ' ویسے ہی سفاکی میں کوئی اس کا ثانی پیدا نہیں ہوا ۔ مشرقی اسلام کی جو تباہی چنگیز نے تیرہویں صدی کے آغاز میں شروع کی تھی اسے تیمور نے ڈیڑھ سو سال بعد تکمیل کو پہنچایا ۔ ہلا کو خان نے 1258ء میں بغداد میں بہت قتل و خون کیا تھا لیکن اس نے اس شہر کی ایسی بربادی نہیں کی تھی ' جیسی 1401ء میں تیمور نے کی ۔ آبپاشی کے جس نظام کی بدولت عراق جنت نشان بنا ہوا تھا ' اسے ہلا کو نے اور اس سے زیادہ تیمور نے تباہ کیا اور عراق ریگستان بن کر رہ گیا ۔ اگر چنگیز ' ہلا کو اور تیمور کی تباہ کاریوں کا موازنہ کیا جائے تو بلاشبہ کہا جائے گا کہ تیمور ان تینوں میں سب سے زیادہ تباہ کار تھا ۔

یلدرم کو شکست دینے کے بعد اگر عثمانی حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر اس کی جگہ تیمور خود حکومت کرتا اور قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیتا تو اس پر چنداں اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی ۔ کیوں کہ بادشاہوں میں ایک دوسرے کی سلطنت چھین لینے کی روایت بہت پرانی ہے مگر تیمور کا مقصد تو صرف دمشق ' حلب ' رہا ' ازمیر وغیرہ سے مال غنیمت بٹورنا تھا ۔ جیسا کہ وہ ترکستان ' ایران اور عراق میں کرچکا تھا ۔ مسلمانوں کے سینکڑوں شہر اجاڑ کر اور ان کی دولت سمیٹ کر تیمور نے اپنے پایہ تخت سمرقند کی تزئین کی ۔ یہ دریائے سغدا کے کنارے بہت پرانا شہر تھا ۔ سکندر اعظم نے بھی اسے فتح کیا تھا ۔ چنگیز کی اولاد کی جب یہاں اور چین میں حکومت ہوئی تو یہ مختلف قوموں کا مرجع بن گیا ۔ ابن بطوطہ نے اسے تیموری دور سے پہلے دیکھا تھا اور اس کی بہت تعریف کی تھی ۔ مگر اس وقت بھی چنگیز کی دست برد سے وہ شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ 1369 سے تیمور نے اسے سنوارنے اور دنیا کا سب سے شاندار شہر بنانے کا سلسلہ شروع کیا ۔ ایک سڑک شیشے کی بنوائی کچھ مسجدیں اور کتب

خانے بھی بنائے اور بہت سے عالموں ' شاعروں اور مورخوں کو جمع کیا جنہوں نے حق نمک ادا کیا اور تیمور کو صاحب قرآن ' ناصر دین ' دشمن کفار اور اسی طرح کے اور خطابوں سے نوازا ۔ سلطان بایزید یلدرم کو شکست دینے اور شام و روم کو تباہ کرنے کے تین سال بعد یعنی 1405ء میں تیمور مر گیا اور اس کی عظیم سلطنت تھوڑے عرصے میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ۔ تاریخ میں اس کے پوتے الغ بیگ کا نام جس نے ایک بڑی رصد گاہ بنائی اور سائنس کے مردہ جسم میں پھر سے روح پھونکنے کی کوشش کی ' تیمور کے نام سے کہیں زیادہ قابل احترام ہے ۔

قسطنطنیہ کی فتح

سلطان مراد ثانی نے یورپ کے ان علاقوں کو جو سلطان بایزید یلدرم کی گرفتاری کی وجہ سے نکل گئے تھے ' پھر سے فتح کیا اور 1422ء میں قسطنطنیہ کا پھر محاصرہ کیا ۔ بازنطینی شہنشاہ نے خراج دینا قبول کیا تو اس نے محاصرہ اٹھا لیا ۔ بالآخر 29 مئی 1453ء کو سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا ۔ لاکھوں عیسائی جو جزیرہ نمائے بلقان میں شہنشاہوں اور امرا کے مظالم سے دل برداشتہ تھے ' مسلمان ہوگئے اور انہیں سکون کی زندگی میسر آئی ۔ سلطان محمد ثانی نے 1458ء میں یونان کے دارالحکومت ایتھنز کو فتح کیا ۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ ترکوں نے یونانیوں سے اس شکست کا بدلہ لیا جو 491ء ق ۔ م میں یونانیوں نے ایرانیوں کو مارتھن (Marathon) کے مقام پر دی تھی ۔ یورپی مورخین ایرانیوں کی اس شکست کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مارتھن میں یونانی ہار جاتے تو ایشیائی باشندے یورپ کے حکمران بن جاتے ۔ اب دو ہزار سال بعد یعنی 1458ء میں سلطان محمد ثانی نے ایتھنز کو فتح کیا تو گویا اس نے ایشیا والوں کی طرف سے یورپ والوں سے بدلہ لیا ۔

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ تیزی سے بڑھا ۔ 1477ء میں ترک شمال مشرقی اٹلی میں داخل ہوئے جہاں سے وینس کا شہر صرف بائیس میل رہ گیا تھا ۔ 1479ء میں البانیہ فتح کیا جہاں آج بھی مسلمانوں کی آبادی کا تناسب زیادہ ہے ۔ کریمیا اور کئی اور صوبے بھی محمد ثانی نے فتح کئے اور پورے بحر اسود پر اس کا قبضہ ہوگیا ۔ 1481ء میں جب اٹلی کو فتح کرنے کے امکانات بہت زیادہ تھے ' محمد ثانی کا اکیاون سال کی عمر میں انتقال ہوگیا ۔ سلیم اول نے عراق اور مصر کو فتح کیا ۔ مصر میں مملوک بادشاہوں کی حکومت تھی جو عثمانی خلیفہ کو برائے نام اپنا آقا اور خلیفہ کہتے تھے ۔ جب 1517ء میں سلیم نے مصر فتح کیا تو خلافت عثمانی بادشاہوں کی طرف منتقل ہوگئی ۔ آخری عثمانی خلیفہ کو مصطفےٰ کمال اتا ترک نے پہلی جنگ عظیم کے بعد معزول کر دیا اور خلافت کا سلسلہ جو حضرت ابو بکر صدیق سے چلا تھا ' منقطع ہوگیا ۔

تیمور لنگ کی تباہ کاری

جارج سارٹن کہتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کبھی کبھی عذاب الہیٰ (Scourge of God) بڑے بڑے فاتحین کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ ایسے فاتحین میں سکندر اعظم، اٹیلا، چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور تیمور لنگ سرفہرست ہیں۔ تیمور ان پانچوں میں سب سے بازی لے گیا۔ چنگیز، ہلاکو اور تیمور تینوں منگول تھے۔ تیمور، چنگیز کے بیٹے چغتائی کی اولاد میں سے ہے۔ ان تینوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو ایسا غارت کیا کہ پھر کبھی اس کی تلافی نہ ہوسکی۔ بقول سارٹن تیمور نے مسلمان ہوتے ہوئے اپنے پیغمبر کا تتبع کرنے کے بجائے چنگیز کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دی۔ اس نے اسلام کے بیشتر شہروں کو تباہ کر دیا۔ ہرات، اصفہان، رُہا (Edessa)، تکریت، ماردین، دہلی، سواس، حلب، بغداد، بروسا، ازمیر (Smyrna) سب کے سب اس کی غارتگری کے فریادی ہیں۔ 1383-84ء میں چار ہزار آرمینیوں کو زندہ دفن کر دیا، اسی سال اس نے حلب اور دمشق میں انسانی کھوپڑیوں سے بیس مینار بنوائے۔ نومبر 1387ء میں ستر ہزار نہتے باشندوں کو ہلاک کیا۔ جیسے وہ سپہ سالاری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، ویسے ہی سفاکی میں کوئی اس کا ثانی پیدا نہیں ہوا۔ مشرقی اسلام کی جو تباہی چنگیز نے تیرہویں صدی کے آغاز میں شروع کی تھی اسے تیمور نے ڈیڑھ سو سال بعد تکمیل کو پہونچایا۔ ہلاکو خان نے 1258ء میں بغداد میں بہت قتل و خون کیا تھا لیکن اس نے اس شہر کی ایسی بربادی نہیں کی تھی، جیسی 1401ء میں تیمور نے کی۔ آبپاشی کے جس نظام کی بدولت عراق جنت نشان بنا ہوا تھا، اسے ہلاکو نے اور اس سے زیادہ تیمور نے تباہ کیا اور عراق ریگستان بن کر رہ گیا۔ اگر چنگیز، ہلاکو اور تیمور کی تباہ کاریوں کا موازنہ کیا جائے تو بلاشبہ کہا جائے گا کہ تیمور ان تینوں میں سب سے زیادہ تباہ کار تھا۔

یلدرم کو شکست دینے کے بعد اگر عثمانی حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر اس کی جگہ تیمور خود حکومت کرتا اور قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیتا تو اس پر چنداں اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی۔ کیوں کہ بادشاہوں میں ایک دوسرے کی سلطنت چھین لینے کی روایت بہت پرانی ہے مگر تیمور کا مقصد تو صرف دمشق، حلب، رہا، ازمیر وغیرہ سے مال غنیمت بٹورنا تھا۔ جیسا کہ وہ ترکستان، ایران اور عراق میں کرچکا تھا۔ مسلمانوں کے سینکڑوں شہر اجاڑ کر اور ان کی دولت سمیٹ کر تیمور نے اپنے پایہ تخت سمرقند کی تزئین کی۔ یہ دریائے سغدا کے کنارے بہت پرانا شہر تھا۔ سکندر اعظم نے بھی اسے فتح کیا تھا۔ چنگیز کی اولاد کی جب یہاں اور چین میں حکومت ہوئی تو یہ مختلف قوموں کا مرجع بن گیا۔ ابن بطوطہ نے اسے تیموری دور سے پہلے دیکھا تھا اور اس کی بہت تعریف کی تھی۔ مگر اس وقت بھی چنگیز کی دست برد سے وہ شہر کھنڈروں میں تبدیل ہوچکا تھا۔ 1369 سے تیمور نے اسے سنوارنے اور دنیا کا سب سے شاندار شہر بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک سڑک شیشے کی بنوائی کچھ مسجدیں اور کتب

خانے بھی بنائے اور بہت سے عالموں، شاعروں اور مورخوں کو جمع کیا جنھوں نے حق نمک ادا کیا اور تیمور کو صاحب قرآن، ناصر دین، دشمن کفار اور اسی طرح کے اور خطابوں سے نوازا۔ سلطان بایزید یلدرم کو شکست دینے اور شام و روم کو تباہ کرنے کے تین سال بعد یعنی 1405ء میں تیمور مر گیا اور اس کی عظیم سلطنت تھوڑے عرصے میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ تاریخ میں اس کے پوتے الغ بیگ کا نام جس نے ایک بڑی رصد گاہ بنائی اور سائنس کے مردہ جسم میں پھر سے روح پھونکنے کی کوشش کی، تیمور کے نام سے کہیں زیادہ قابل احترام ہے۔

قسطنطنیہ کی فتح

سلطان مراد ثانی نے یورپ کے ان علاقوں کو جو سلطان بایزید یلدرم کی گرفتاری کی وجہ سے نکل گئے تھے، پھر سے فتح کیا اور 1422ء میں قسطنطنیہ کا پھر محاصرہ کیا۔ بازنطینی شہنشاہ نے خراج دینا قبول کیا تو اس نے محاصرہ اٹھا لیا۔ بالآخر 29، مئی 1453ء کو سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ لاکھوں عیسائی جو جزیرہ نمائے بلقان میں شہنشاہوں اور امرا کے مظالم سے دل برداشتہ تھے، مسلمان ہوگئے اور انہیں سکون کی زندگی میسر آئی۔ سلطان محمد ثانی نے 1458ء میں یونان کے دارالحکومت ایتھنز کو فتح کیا۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ ترکوں نے یونانیوں سے اس شکست کا بدلہ لے لیا جو 491ء ق۔م میں یونانیوں نے ایرانیوں کو مارتھن (Marathon) کے مقام پر دی تھی۔ یورپی مورخین ایرانیوں کی اس شکست کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مارتھن میں یونانی ہار جاتے تو ایشیائی باشندے یورپ کے حکمران بن جاتے۔ اب دو ہزار سال بعد یعنی 1458ء میں سلطان محمد ثانی نے ایتھنز کو فتح کیا تو گویا اس نے ایشیا والوں کی طرف سے یورپ والوں سے بدلہ لیا۔

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ تیزی سے بڑھا۔ 1477ء میں ترک شمال مشرقی اٹلی میں داخل ہوئے جہاں سے وینس کا شہر صرف بائیس میل رہ گیا تھا۔ 1479ء میں البانیہ فتح کیا جہاں آج بھی مسلمانوں کی آبادی کا تناسب زیادہ ہے۔ کریمیا اور کئی اور صوبے بھی محمد ثانی نے فتح کئے اور پورے بحر اسود پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ 1481ء میں جب اٹلی کو فتح کرنے کے امکانات بہت زیادہ تھے، محمد ثانی کا اکیاون سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ سلیم اول نے عراق اور مصر کو فتح کیا۔ مصر میں مملوک بادشاہوں کی حکومت تھی جو عثمانی خلیفہ کو برائے نام اپنا آقا اور خلیفہ کہتے تھے۔ جب 1517ء میں سلیم نے مصر فتح کیا تو خلافت عثمانی بادشاہوں کی طرف منتقل ہوگئی۔ آخری عثمانی خلیفہ کو مصطفے کمال اتا ترک نے پہلی جنگ عظیم کے بعد معزول کر دیا اور خلافت کا سلسلہ جو حضرت ابو بکر صدیق سے چلا تھا، منقطع ہوگیا۔

سلطان سلیمان عظیم الشان

سلیم اول کے بعد 1520ء میں اس کا بیٹا سلیمان تخت نشین ہوا۔ وہ عثمانی خاندان کا گل سرسبد تھا۔ اس کی فوج دنیا کی بہترین فوج تھی اور اس کا نظام سلطنت بہترین نظام تھا۔ لوتھر (جس نے پوپ سے بغاوت کر کے پروٹسنٹ فرقہ قائم کیا) کہا کرتا تھا کہ ترکوں کی حکومت سے بہتر دنیا میں کوئی حکومت نہیں۔ ترک سلیمان کو قانونی کہتے تھے، کیونکہ اس نے منصفانہ قوانین نافذ کیے تھے۔ عیسائیوں نے اسے عظیم الشان (Magnificent) کا خطاب دیا۔ اسی کے زمانے میں ہنگری فتح ہوا۔ بحر متوسط پر اس کا پورے طور پر قبضہ تھا۔ بازنطینی شہنشاہ اس کا باجگزار تھا۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ عیسائیوں کے جو علاقے فتح ہو کر ترکوں کے اقتدار میں آجاتے، وہاں کے عیسائی اس تبدیلی سے خوش ہوتے۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ معمولی سے معمولی آدمی قابلیت کی بنا پر بڑے سے بڑے عہدے تک پہونچ سکتا تھا۔ سلیمان کا وزیر ابراہیم پاشا یونانی تھا۔ اس کی تنخواہ ساٹھ ہزار ڈیوکٹ (Ducats) سالانہ تھی۔ جو پندرہ لاکھ ڈالر کے برابر ہے۔ سلیمان نے 5 ستمبر 1566ء کو وفات پائی۔

چونکہ مقالے کی اس فصل کا آغاز جارج سارٹن کے اس بیان سے شروع ہوا تھا کہ چودھویں صدی میں دنیا کے بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی حکومت تھی، مگر اسپین میں ان کی سلطنت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ یورپ کے مشرقی علاقوں پر مسلمانوں کی نئی عثمانی سلطنت کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ چودھویں صدی میں مسلمانوں کی سب سے شاندار سلطنت بحری مملوک بادشاہوں کی تھی جو مصر، فلسطین اور شام پر حکمران تھے۔ بغداد کی تباہی کے بعد 1258ء سے دو سو سال تک قاہرہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا، سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ مالدار شہر رہا۔ مملوک سلاطین علم دوست تھے۔ چنانچہ ان کی سرپرستی میں بہت بڑے بڑے عالم و فاضل پروان چڑھے۔ اس صدی کے سب سے عظیم مورخ و جغرافیہ داں ابوالفدا کی مملوک سلطان الناصر محمد نے بڑی قدر دانی کی۔ اسے وہاں کا گورنر مقرر کر دیا اور ملک کا خطاب دیا۔ اس صدی میں جو بڑے بڑے مسلمان جغرافیہ داں ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر سلطنت مملوکیہ کی حدود میں پیدا ہوئے، بڑھے اور پلے۔

مسلمان جغرافیہ داں

چودھویں صدی میں مسلمانوں نے جو کتابیں علم جغرافیہ پر تصنیف کیں ان کے بارے میں جارج سارٹن لکھتا ہے کہ وہ اس دور کی نہایت اہم اور قیمتی تصانیف ہیں اور غیر مسلم ممالک میں جو

اس صدی میں جغرافیہ پر کتابیں لکھی گئیں ان سے بہت بہتر ہیں۔ اس تمہید کے بعد اس صدی کے جغرافیہ دانوں کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔

ابوالفدا اسماعیل ابن علی ایوبی

نومبر 1273ء میں دمشق میں پیدا ہوا۔ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے خاندان کی ایک شاخ کا فرد تھا۔ اس کے بزرگوں نے حما میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ منگولوں کی دسترس سے محفوظ رہنے کی غرض سے اس کے والدین حما سے دمشق منتقل ہو گئے تھے۔ ابوالفدا ابھی بارہ سال کا تھا کہ وہ صلیبی عیسائیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوا جس میں المقرب کا قلعہ مسلمانوں نے فتح کیا۔ کم عمری ہی میں اسے اور کئی جنگوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ اس کے باوجود اسے جو تعلیم دی گئی وہ بہت تھی۔ اس تعلیم نے اسے علم کا ایسا دلدادہ بنا دیا کہ سفر میں بھی اس کا مطالعہ جاری رہتا۔ انیس سال کی عمر میں ابوالفدا نے مملوک سلطان الناصر محمد ابن قلاؤن کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی نسبت سے سلطان ابوالفدا کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتا اور ابوالفدا بھی بڑے خلوص اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیتا۔ دس گیارہ سال کی مختصر مدت ہی میں سلطان نے اسے حماہ کی گورنری کے جلیل القدر منصب پر فائز کر دیا۔ اس طرح وہ اپنی خاندانی ریاست پر حکمرانی کرنے لگا۔ دو سال بعد سلطان نے ابوالفدا کو ملک الصالح کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور 1320ء میں اسے سلطان کا رتبہ اور الملک المؤید کا خطاب دیا۔ اٹھاون سال کی عمر میں اکتوبر 1331ء میں ابوالفدا کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں بنوا لیا تھا۔ اسی میں دفن کیا گیا۔ امتداد زمانہ سے یہ مقبرہ خستہ حال ہوتا چلا گیا۔ چھ سو سال بعد 1925ء میں ڈاکٹر توفیق شیشکلی کی کوشش اور توجہ سے پھر سے تعمیر کیا گیا۔ جارج سارٹن نے 21 اپریل 1932ء کو حماہ جا کر مقبرہ دیکھا۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اتنے بڑے مورخ اور جغرافیہ داں کی یادگار کو اس نے اپنے دوست ڈاکٹر توفیق شیشکلی کی سعی جمیل سے اچھی حالت میں دیکھنے کی سعادت حاصل کی۔

ابوالفدا نے کم از کم تین بار فریضہ حج ادا کیا۔ گورنری کے فرائض بھی اسے کافی مصروف رکھتے اور اکثر اسے صلاح و مشورہ کے لیے قاہرہ بھی بلایا جاتا تھا۔ بایں ہمہ وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال لیتا۔ اس کی تصانیف میں "مختصر تاریخ البشر" اور "تقویم البلدان" سب سے زیادہ اہم ہیں۔ مختصر تاریخ البشر ابوالفدا نے 1315ء میں تصنیف کی تھی۔ بعد میں 1329ء تک کے حالات اس میں شامل کئے۔ بارہویں صدی تک کے واقعات کے لیے اس کا ماخذ زیادہ تر ابن الاثیر کی "کامل فی التاریخ" ہے۔ اس کی تاریخ کا سب سے قیمتی حصہ وہ ہے جو اس کے زمانے کے واقعات سے متعلق ہے۔ یہ مواد اس نے اپنے عسکری اور سیاسی زندگی کے تجربات سے فراہم کیا۔ اس میں اس کے وہ

تجربات ' مشاہدات اور معلومات بھی شامل ہیں جو متعدد سفروں میں وہ جمع کر سکا۔ اس کتاب کی افادیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کے مرنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ابن الوردی نے اس پر شرح لکھی اور 1329ء تک کے واقعات کا اضافہ بھی کیا۔ ابن حبیب الدمشقی اور ابن الشحنۃ الحلبی نے بھی شرحیں لکھیں۔ موخرالذکر نے 1203ء تک کے واقعات شامل کر دیئے۔ یورپ کے مستشرقین نے بھی اس کتاب کو بہت سراہا۔ "تقویم البلدان" کی تصنیف غالباً 1316ء میں شروع کی گئی اور 1321ء میں پایہ تکمیل کو پہونچی۔ یہ جغرافیہ کی بہت مفصل کتاب ہے۔ اس میں اٹھائیس ابواب کے علاوہ شروع میں دنیا کی ہیئت ' آب و ہواؤں ' سمندروں ' جھیلوں ' ندیوں ' پہاڑوں وغیرہ پر ایک مقدمہ میں تمام بحث کی گئی ہے۔ اٹھائیس ابواب میں سے وہ باب جو عرب ' مغرب ' مصر ' افریقہ ' اسپین ' ماوراء النہر ' عراق عربی ' جزیرہ اور مغربی جزیروں سے متعلق ہیں طویل اور مفصل ہیں۔ بقیہ ابواب مختصر ہیں۔ ہر باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں ہر ملک کی حدود ' طبیعی خصوصیات ' ملک کی سیاسی اور نسلی تقسیم ' رسم و رواج ' آثار صنادید ' بڑی سڑکوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور دوسرے حصہ میں مندرجہ ذیل فارم میں شہروں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں:

سطر العدود الاسماء الاقلیم العرفی ضبط الاسماء	اسماء المنقول عنہم درج	سادس الاقالیم العرفیہ وھو بلاد الشام		الاقلیم الحقیقی وقائق
		الطول وقائق	العرض درج	

آخری خانہ "ضبط الاسماء" میں ہر شہر کے صحیح ہجے بتائے ہیں۔ مثلاً عمان کے بارے میں اس خانہ میں لکھا ہے "بفتح العین و المیم المشددۃ و الف ونون فی الآخر" معلومات فراہم کرنے کا یہ طریقہ زیادہ اچھا ہے۔ ہر خانے کو بھرنے کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر شہر کے بارے میں جملہ معلومات حاصل کی جائیں اور ان کے حتی المقدور صحیح ہونے کا التزام کیا جائے۔

مقدمہ میں کچھ بہت دلچسپ و مفید معلومات بھی ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر دنیا کے کسی مقام سے چل کر پوری دنیا کا سفر کر کے اس مقام پر واپس آئیں تو اگر مغرب کی جانب سفر کیا ہے تو سفر کی مدت ایک دن کم ہوگی۔ لیکن اگر مشرق کی جانب سفر کیا ہے تو سفر کی مدت ایک دن زیادہ ہوگی اور یہ کہ دنیا کی تین چوتھائی سطح سمندروں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ہر طرح کی مفید معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ کہاں کہاں سونا ' چاندی ' سیماب ' نفط ' نمک پایا جاتا ہے۔

سولھویں صدی میں محمد ابن علی سپاہ زادہ نے ترکی زبان میں تقویم البلدان کی تلخیص کی اور

اس کا نام "اوضاح المسالک الامعرفت البلدان و الممالک" رکھا۔ 1650ء میں یورپ میں تقویم کا ایک حصہ شائع ہوا۔ مختصر تاریخ البشر پوری کتاب کی شکل میں 70-1869ء میں قسطنطنیہ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے یورپ میں اس کے مختلف حصے سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں چھپ چکے تھے۔ تقویم کے مختلف حصے 1650ء سے 1820ء تک یورپ میں چھپتے رہے۔ 1840ء میں دو فرانسیسی علما نے تقویم کا ترجمہ کر کے مکمل شکل میں شائع کیا۔

تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ ابوالفدا کئی اور علوم کا بھی عالم تھا۔ نباتات اور ادویات سے اسے بالخصوص دلچسپی تھی۔ مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ علم جغرافیہ ہے۔ سارٹن لکھتا ہے کہ ابوالفدا اپنے زمانے کا سب سے بڑا مسلمان جغرافیہ داں ہی نہ تھا بلکہ اس عہد کے تمام دنیا کے جغرافیہ دانوں میں سب سے بڑا تھا۔

احمد الطینی کا ذکر بحثیت عرب جغرافیہ داں کے الدمشقی نے اپنی کتاب "نخبت الدہر" میں کئی جگہ کیا ہے اور اس کے حوالے ہیں۔ الدمشقی احمد الطینی کی کتابوں کے نام "المناہج" اور "المباہج" بتاتا ہے۔ "مناہج الفکر و مباہج العبر" یا "مباہج الفکر و مناہج العبر" محمد ابن ابراہیم الوطواط الانصاری الوراق سے جو 1318ء میں فوت ہوا ' منسوب ہے۔ سارٹن کا گمان ہے کہ جس کتاب کو الدمشقی نے احمد الطینی سے منسوب کیا ہے وہ الوطواط کی یہی کتاب ہے۔ احمد الطینی کے بارے میں سارٹن کوئی معلومات حاصل نہ کر سکا۔ الطین نہر سویز پر واقع ہے۔ غالباً احمد وہیں کا رہنے والا ہوگا۔

شمس الدین ابو عبداللہ محمد ابن ابراہیم ابن ابی طالب الانصاری الصوفی الدمشقی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی انصاری کی اولاد میں سے تھا اور غالباً اس کی پیدائش دمشق میں 57-1256ء میں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دمشق میں گزارا۔ دمشق سے ملحق پہاڑی پر الربوا نام کا ایک گاؤں تھا۔ الدمشقی وہاں کی مسجد کا امام تھا۔ جب وہ بہت بوڑھا ہوگیا تو صفد ' جو بالائی گلیلی میں ہے ' چلا گیا۔ وہیں اس کا 27-1326ء میں انتقال ہوا۔ اس کی تصانیف میں سب سے اہم اور جس پر اس کی شہرت کا دارومدار ہے ' "کتاب نخبت الدہر فی عجائب البر والبحر" ہے۔ یہ اس نے الربوا میں لکھی تھی۔ اس میں 20-1319ء اور 1323ء کے زلزلوں کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اس کی عمر کے آخری زمانہ میں مکمل ہوئی ہوگی۔ یہ ابوالفدا کی ریاضیاتی جغرافیہ کے مقابلے میں تو کم حیثیت ہے مگر اس میں "تقویم البلدان" سے بہت زیادہ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ نخبت کے نو حصے اور پچھتر ابواب ہیں۔ آخری باب سبائیوں پر ہے۔ گیارہ ابواب میں معدنیات ' جواہرات اور پہاڑوں کی ساخت کا ذکر کیا ہے۔ چھ ابواب ندیوں ' چشموں ' کنوؤں اور سوتوں پر لکھے ہیں۔ چھ ابواب میں سمندروں کی حرکت وغیرہ سے بحث کی ہے۔ بحر روم پر جسے بحر متوسط بھی کہتے ہیں اور بحر اسود ' بحر خضر ' بحیرخوارزم

(Aral Sea) اور جوار بھاٹا پر چھ باب ہیں جن میں سے چار میں بحر شام کا حال بیان کیا ہے ۔ آٹھ ابواب میں بحر الہند ' مغربی بحر الکاہل اور ان بحروں کے جزائر کا ذکر کیا ہے ۔ دار الاسلام کے مشرقی ممالک کا تیرہ ابواب میں اور مصر اور دیگر مغربی ممالک کا چھ ابواب میں حال لکھا ہے ۔ مختلف انسانی نسلوں کے جو سام ' حام اور جیپتھ (Japeth) سے چلی ہیں ' تفصیلی حالات ان کے ارتقا کے نشیب و فراز ' خصوصیات ' ہر نسل کے نظام تقویم اور تیوہار اور ہر ایک کی اچھائیوں ' برائیوں کو نو ابواب میں بیان کیا ہے ۔ الدمشقی علم طبقات الارض اور معدنیات سے گہری دلچسپی رکھتا تھا ۔ اس نے دھاتوں کا ذکر کرنے کے علاوہ نباتات ' حیوانات ' تاریخی واقعات اور مصنوعات پر بہت کچھ لکھا ہے ۔ اس کا خیال تھا کہ پہاڑوں اور سوتوں کی تشکیل زلزلوں کا باعث ہوتی ہے ۔ ہم آج الدمشقی کے کچھ نظریوں سے اتفاق نہیں کرتے مگر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس میں غیر معمولی ادراک اور آزاد خیالی پائی جاتی ہے۔

اس نے نخبت میں رنگین نقشہ بھی شامل کیا تھا ۔ وہ عربی جغرافیہ دانوں کی تصانیف کے علاوہ بطلیموس اور ارسطو کے نظریوں سے بھی واقف تھا ۔ اس نے سب سے زیادہ المسعودی کی کتاب سے حوالے دیئے ہیں۔

نخبت کے علاوہ اس کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں:

(1) کتاب السیاسۃ فی علم الفراسۃ (2) بقراط کے بتائے ہوئے موت کے آثار پر رسالہ (3) المقامات الفلسفیہ و الترجمات الصوفیہ (4) جواب رسالہ اہل جزیرۃ قبرس (یا قبروص) اس میں اسلام پر عیسائیوں کے اعتراضات کو رد کیا گیا ہے ۔ ان متنوع موضوعات پر اس کی تصانیف پائے جانے سے ظاہر ہے کہ وہ جغرافیہ کے علاوہ اور کئی علوم سے بھی اچھی طرح واقف تھا ۔ 1866ء میں سینٹ پیٹرس برگ میں "نخبت الدہر" چھاپی گئی ۔ 1874ء میں کوپ ہیگن (ڈنمارک) سے فرانسیسی میں ترجمہ شائع ہوا ۔ کتاب السیاسۃ 1882ء میں قاہرہ میں چھپی۔

شہاب الدین ابو العباس احمد ابن یحیٰ ابن فضل اللہ العمری القریشی الشافعی دمشق میں گیارہ جون 1301ء کو پیدا ہوا ۔ وہ حضرت عمر خلیفہ دوم کی اولاد میں سے تھا اور دمشق میں اس کا خاندان بہت ممتاز تھا ۔ اس نے دمشق ' قاہرہ ' اسکندریہ اور حجاز میں تعلیم پائی اور قاہرہ میں قاضی مقرر ہوا ۔ اس کے والد مملوک حکومت کے وزیر (Chancellor) تھے ۔ ان کی وفات پر یہ منصب شہاب الدین کو عطا ہوا ۔ مرتے وقت تک وہ اس عہدے پر فائز رہا ۔ 28 فروری 1349ء کو جبکہ اس کی عمر اڑتالیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اس نے وفات پائی۔

العمری کی تصانیف میں "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" (یعنی ممالک اور شہروں میں آنکھوں کے سفر) اور "التعریف بالمصطلح الشریف" زیادہ اہمیت رکھتی ہیں ۔ مسالک الابصار نہایت ضخیم کتاب ہے ۔ اس کی تیئیس یا ستائیس جلدیں ہیں ۔ العمری نے اسے 1342ء میں لکھنا شروع کیا اور اس کی تصنیف کا سلسلہ اس کے سال وفات تک جاری رہا ۔ یہ کتاب صرف علم جغرافیہ تک محدود نہیں ۔ اس میں جغرافیہ کے علاوہ تاریخ طبیعی (یعنی علم نباتات ،، علم حیوانات اور معدنیات) تاریخ سیاسی ' تاریخ شعر العرب اور سوانح حیات مشاہیر بھی شامل ہیں ۔ مثلاً پہلی جلد جغرافیہ اور تاریخ طبیعی پر ہے ۔ چودھویں جلد میں قبل اسلام کی عربی شاعری کا بیان ہے ' پندرھویں جلد میں اسلام کی پہلی تین صدیوں کے شاعروں کے حالات ہیں ۔ سولھویں جلد اسلام کی چوتھی لغایت ساتویں صدی کے شاعروں سے بحث کرتی ہے ۔ تیئیسویں جلد میں بارھویں صدی کے وسط سے چودھویں صدی کے وسط تک یعنی 1146ء سے 1343ء تک کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے ۔ "مسالک ابصار" میں ہندوستان کی ریاست اور اداروں کے حالات اور رسم و رواج بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں اور اسی قسم کی تفصیلات اور اسلامی ممالک کے بارے میں بھی دی ہیں ۔ بحیثیت وزیر سلطنت اس کو دوسرے ملکوں کے سفیروں ' سیاحوں اور تاجروں سے ملنے جلنے اور ان کے ملکوں کے صحیح حالات معلوم کرنے کے مواقع حاصل تھے جن سے اس نے فائدہ اٹھایا ۔ العمری کے جغرافیہ کا نہایت قیمتی حصہ وہ ہے جس میں اس نے حبشہ ' فاس ' تلمسان اور تونس کی ریاستوں اور مالی کی وسیع سلطنت کے حالات قلمبند کیے ہیں ۔ 1324ء میں حج کو جاتے ہوئے مالی کا شہنشاہ کنکن موسیٰ قاہرہ پہونچا ۔ اس کا قافلہ شان و شوکت اور حشم و خدم کے لحاظ سے بہت پرشکوہ تھا ۔ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں نے اپنے مصارف پر اس قدر سونا لٹایا کہ قاہرہ میں سونے کی قیمت گر گئی ۔ موسیٰ کے پیشرو محمد گاؤ (Gao) نے بحر ظلمات کی تفتیش حال کے لیے دو بار مہم پر لوگوں کو بھیجا تھا ۔ دوسری مہم میں وہ خود بھی تھا اور اسی میں ان کی جان (1307ء) گئی ۔ ان دونوں مہموں کا ذکر العمری نے کیا ہے ۔ بادشاہ محمد گاؤ کے ہلاک ہو جانے سے مالی والے خوفزدہ یا مایوس ہو کر نہیں بیٹھ رہے ۔ بلکہ انہوں نے ایک تیسری مہم اور بھیجی جس کا حال بھی العمری نے لکھا ہے ۔ سارٹن لکھتا ہے کہ بحر ظلمات کی تفتیش حال کا آغاز عربوں نے کیا تھا ۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ خشخاص قرطبی اور اس کے ساتھی اس مہم پر نکلے تھے ۔ الادریسی نے مغرورین کی مہموں کا ذکر کیا ہے ۔ جو سلسلہ عربوں نے جاری کیا تھا وہ مالی کی مسلمان سلطنت نے بھی جاری رکھا۔

العمری کی دوسری تصنیف "التعریف" کو دراصل پہلی تصنیف کہنا چاہیے ۔ کیونکہ یہ 1340-41ء میں لکھی گئی تھی اور اس کی تکمیل کے بعد 1342ء میں اس نے مسالک الابصار شروع کی تھی ۔ یہ آداب سیاست سے متعلق ہے۔

اس کی ایک اور مختصر کتاب بھی ہے جس کا نام "الشتوی یات" ہے۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جن میں العمری نے 1342ء کی سخت برف باری اور سردی کی شدت کا حال دوسرے اہل علم کو لکھا تھا۔ اس برف باری کا تعلق دمشق سے ہے۔ جو جوابات موصول ہوئے وہ بھی اس کتاب میں شامل کر لیے گئے۔

"التعریف" قاہرہ میں 95-1894ء میں چھپی۔ اس کے ایک حصے کا جرمن ترجمہ 1916ء میں شائع ہوا۔

"مسالک الابصار" کے ان حصوں کا جو ایشیا سے متعلق ہیں، فرانسیسی میں 1838ء میں ترجمہ ہوا اور ان حصوں کا جو افریقہ سے متعلق ہیں، فرانسیسی ترجمہ 1927ء میں شائع ہوا۔ اس میں مصر سے متعلق حصہ چھوڑ دیا گیا۔ 1936ء میں اس حصے کے انگریزی ترجمہ کا اعلان ہوا تھا جو ہندوستان سے متعلق ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ ہوا یا نہیں۔ احمد زکی پاشا نے جو 1934ء تک زندہ رہے پوری کتاب شائع کرانے کا بیڑا اٹھایا تھا مگر صرف ایک جلد منظر عام پر آئی۔

برہان الدین ابواسحٰق ابراہیم ابن عبدالرحمن ابن الفرکاح الشافعی البدری الفزاری 1262ء میں پیدا ہوا۔ وہ فزاری قبیلہ کا تھا۔ اس کے والد تاج الدین عبدالرحمن ابن ابراہیم الفرکاح دمشق کے بادرائیہ (Badaraiya) مدرسہ میں شافعی فقہ کے پروفیسر تھے۔ وہ اپنے والد کا نائب مدرس مقرر ہوا اور بعد میں والد کی جگہ پروفیسر ہو گیا اور مسجد امیہ میں وعظ دینے لگا۔ اس کا انتقال 1329ء میں ہوا۔ ابن بطوطہ نے جامع بنی امیہ کے حالات لکھتے ہوئے ابن الفرکاح کا ذکر کیا ہے۔

ابن فرکاح نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:

1- "باعث النفوس الازیارہ القدس المحروس" یہ یروشلم - بیت اللحم اور خلیل (Hebron) کے زائرین کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی ہے۔ خلیل میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے خاندان کے کچھ لوگ مدفون ہیں۔ یہ کتاب پرانی کتابوں بالخصوص القاسم ابن عساکر کی کتاب سے ماخوذ ہے۔

2- "الاعلم بفضائل الشام" - اس میں دمشق کی خوبصورتی اور شان و شوکت بیان کی گئی ہے۔ اس کا ماخذ علی ابن محمد ربعی ہے۔

3- "المنائح لطالب الصید والذبائح" - اس میں قربانی کے شعائر بیان کیے ہیں۔

4- "حل القناع عن حل السماع" (یعنی سماع کی نقاب کشائی) اس میں سماع کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

پہلی اور دوسری تصانیف کا تعلق جغرافیہ سے ہے۔ پہلی کتاب چارلس ڈی میتھوز کی تدوین کے بعد یروشلم سے 35-1934ء میں شائع ہوئی۔ نجم الدین احمد ابن حمدان ابن شبیب الحرانی الحنبلی جزیرہ کے شہر حران کا رہنے والا تھا۔ 1332ء میں اس کا مصر میں ہونا ثابت ہے۔ اس نے جغرافیہ، تاریخ طبیعی اور عوامل میں متداول روایات پر ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام "جامع الفنون (یا جامع العلوم) وسلوۃ المحزون" ہے۔ اس میں منجملہ اور باتوں کے مصر کے عجائبات کا ذکر بھی ہے۔ جس کا ماخذ ابراہیم ابن وصیف شاہ کی تصنیف "جواہر البحور وقائع الامور وعجائب الدہور و اخبار الدیار المصریہ" ہے۔ جب سراج الدین عمر ابن محمد ابن الوردی نے "خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب" لکھی تو جامع الفنون کے بہت سے اقتباسات لفظ بلفظ نقل کر لیے (یہ ابن الوردی زیادہ مشہور زین الدین ابن الوردی سے مختلف ہے)۔ خریدۃ العجائب کا فارسی اور ترکی میں ترجمہ کیا گیا۔ الوردی نے خریدۃ العجائب کے مقدمہ میں اپنے ماخذوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر ستم ظریفی یہ کی ہے کہ ابن شبیب کی جامع الفنون کا جس میں سے اس نے بہت کچھ لفظ بلفظ نقل کیا تھا، کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ چونکہ خریدۃ العجائب دراصل جامع الفنون کا چربہ ہے، اس لیے جارج سارٹن نے ابن شبیب کے حالات کے ساتھ خریدۃ العجائب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ چودہ ابواب پر منقسم ہے۔ (1) بڑے ممالک (2) سمندر اور آبنائیں (Straits) (3) جزیرے (4) جزیروں کے عجائبات (5) بڑی ندیاں (6) چشمے اور کنوئیں (7) بلند پہاڑ (8) پتھر اور ان کے خواص (9) معدن اور بیش بہا پتھر (10 سے 13 تک) نباتات (14) حیوانات۔

جامع الفنون شائع نہیں ہوئی مگر قاہرہ سے خریدۃ العجائب کے جس میں جامع الفنون کا مسروقہ ذخیرہ شامل ہے، بہت سے ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یورپ میں بھی خریدۃ العجائب کے جزوی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

ابوالفضائل صفی الدین عبدالمومن ابن الخطیب عبدالحق البغدادی الحنبلی بغداد میں 60-1259ء میں پیدا ہوا۔ وہ عربی النسل تھا۔ اس کے والد مبلغ تھے۔ عبدالمومن نے دینیات، حدیث، حساب، جبر و مقابلہ، ہندسہ اور کچھ اور علوم کی تعلیم بغداد، دمشق، مکہ اور مصر میں پائی۔ اس کا انتقال 39-1338ء میں بغداد میں ہوا۔ امام احمد حنبل کے قبرستان میں دفن ہوا۔

عبدالمومن نے جغرافیہ کی قاموس تصنیف کی جس کا نام ہے "مراصد الاطلاع علی اسماء

الامکینہ والبقاع " ۔ یہ دراصل یاقوت کی "معجم البلدان " کی تلخیص ہے ۔ مگر پھر بھی یہ چودہ سو صفحوں پر مشتمل ہے ۔ معجم میں جغرافیائی معلومات کے علاوہ تاریخی ، ہئیتی ، ادبی موضوعات پر بھی بحث کی گئی ہے اور جابجا اشعار لکھے ہیں ۔ مراصد کو عبدالمومن نے جغرافیہ تک محدود رکھا ہے ۔ معجم پر کچھ اضافے بھی کئے ہیں ۔ کچھ لوگ مراصد کو السیوطی کی تصنیف بتاتے ہیں اور کچھ یاقوت کی ۔ مگر یہ صحیح نہیں ۔ ہے تو یہ عبدالمومن ہی کی تصنیف مگر اس کا مواد زیادہ تر یاقوت سے لیا گیا ہے ۔ لائیڈن میں مراصد چھ جلدوں میں 64-1850ء میں شائع ہوئی۔

ابو محمد عبداللہ ابن احمد التجانی تونس کا رہنے والا تھا ۔ اس کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش معلوم نہیں ۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ دسمبر 1306ء میں وہ حفصی خاندان کے ایک شہزادے کے پاس تھا ۔ یہ شہزادہ پانچ سال بعد تخت نشین ہو کر ابو یحییٰ زکریا کہلایا اور اس نے 1317ء تک حکومت کی ۔ التجانی شہزادے کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوا مگر بیمار پڑ گیا اور جون 1309ء میں طرابلس واپس آگیا اور نو سو ستر دن تونس سے باہر رہ کر وہاں واپس آگیا ۔ جب شہزادہ بادشاہ ہوا تو اس نے التجانی کو ایک بڑا منصب عطا کیا ۔ اس نے اپنے سفر کے حالات پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "رحلہ " ہے یہ معلومات کا خزانہ ہے ۔ جس علاقہ کا اس نے سفر کیا تھا ، وہاں کی تاریخ اور آثار قدیمہ کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کی ہیں اور کچھ کتابوں کے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں ۔ اس وقت تک اس علاقہ کے ایسے حالات کسی اور نے نہیں لکھے تھے ۔ اس جغرافیہ تاریخ اور علم الآثار قدیمہ کے عالم نے محبت اور اس کے متعلقات پر پچیس ابواب پر مشتمل " تحفۃ العروس و نزہۃ النفوس " لکھی جس میں بیوی کے انتخاب پر مشورہ ہے ۔ عورتوں کے جسم پر جو خوبصورت خال وغیرہ ہوتے ہیں ، ان کی نشاندہی کی ہے اور ایسے نسخہ بتائے ہیں جو محبت میں اضافہ کا سبب بنیں ۔ اس کتاب میں فقیہوں اور علمائے دین کے (شاید جائز و ناجائز افعال کے بارے میں) اقوال اور شعرا کے اشعار درج کئے ہیں۔

رحلہ کا کوئی مکمل نسخہ یا اس کا مکمل ترجمہ دستیاب نہیں ۔ اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ لائپزگ (Leipzig) سے 1857ء میں شائع ہوا تھا اور پھر الفرڈبل نے 1903ء میں کچھ حصہ شائع کیا ۔ فرانسیسی میں 1853ء میں کچھ اقتباسات شائع ہوئے ۔ تحفۃ العروس قاہرہ میں 1884ء میں اور فاس (Fez) میں 1900ء میں شائع ہوئی ۔ 1848ء میں اس کے تین ابواب کا ترجمہ فرانسیسی میں چھپا ۔ لائیڈن سے ڈوزی نے کچھ اقتباسات عربی اور لاطینی میں 1852ء میں شائع کئے۔

ابو البقاء خالد ابن عیسیٰ البلوی غرناطہ کے قریب قطوریہ میں پیدا ہوا ۔ وہ حج بیت اللہ کے لیے اکتوبر 1335ء میں گھر سے نکلا ۔ تونس تک وہ خشکی کے راستے آیا اور وہاں سے یروشلم ، مدینہ اور مکہ گیا اور اسی راستے سے اسکندریہ واپس آیا ۔ کچھ عرصہ تونس میں گزارا اور مئی 1340ء میں اپنے وطن

پہنچا جہاں وہ قاضی مقرر کیا گیا اور وہیں ساری زندگی گزار دی ۔ اس نے اپنا سفر نامہ "تاج المفرق فی تحلیت علماء المشرق " کے نام سے لکھا ۔ اس میں ان علما کے حالات بیان کئے ہیں جن سے دوران سفر اس کی ملاقات ہوئی ، کافی حالات ابن جبیر کی کتاب سے بھی نقل کئے ہیں۔

ابن بطوطہ

ابن بطوطہ ابو عبداللہ محمد ابن عبداللہ ابن محمد اللواتی التنجی : ابن بطوطہ 24 فروری 1304ء میں تنجہ میں پیدا ہوا ۔ (سارٹن نے تنجہ 'ت' سے لکھا ہے مگر عبدالرحمن خان نے "خلاصہ تحفۃ النظار " میں 'ط' سے لکھا ہے) وہ بربری قبیلہ لواتہ کا فرد تھا ۔ ابن بطوطہ کے خاندان میں بہت سے قاضی ہوئے ہیں ۔ مذہبی اور ادبی علم کی تحصیل مکمل کر کے 14 جون 1325ء کو یعنی اکیس سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے گھر سے نکلا ۔ مگر کچھ ایسی گھڑی نکلا تھا کہ چوبیس سال کے بعد جولائی 1349ء میں واپس آیا اور وطن آنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مغرب اور نالی وغیرہ کے سفر پر چل کھڑا ہوا اور وہاں سے 1354ء میں واپس ہوا ۔ واپس ہونے کے تیئیس چوبیس برس بعد تک زندہ رہا ۔ اس کا انتقال 78-1377ء میں فاس میں ہوا جہاں کا وہ قاضی بنا دیا گیا تھا۔

جارج سارٹن کا خیال ہے کہ ابن بطوطہ اپنے سفروں کے دوران مختلف ممالک و مقامات کے بارے میں یاداشتیں رکھتا جاتا تھا ۔ کچھ سفر میں تلف ہوگئیں مگر بہت کچھ بچیں جن کی بنا پر اس کا سفر نامہ " تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار " لکھا گیا ۔ جب ابن بطوطہ نے بالآخر اپنے سفروں کا سلسلہ ختم کر کے 1354ء میں مرینی سلطان ابو عنان فارس کے دارالحکومت فاس میں اقامت اختیار کی اور وہاں کا قاضی مقرر ہوگیا تو سلطان نے اپنے کاتب ابو عبداللہ محمد ابن جُزی کو حکم دیا کہ جو حالات سفر ابن بطوطہ بتاتا جائے ، انہیں ضبط تحریر میں لائے ۔ ابن جزی نے تحفۃ النظار 13 دسمبر 1351ء کو مکمل کی اور اس کی ایک اور نقل فروری 1356ء میں مرتب کی ۔ اسی سال ابن جزی کا انتقال ہوگیا ۔ عموماً تحفۃ النظار "رحلہ" کے نام سے مشہور ہے ۔ مندرجہ ذیل واقعات اسی سے لیے گئے ہیں۔

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ ابن بطوطہ نے اس قدر مقامات کے سفر کئے کہ اگر ہر ایک کا ذکر کیا جائے تو ذکر بہت طویل ہو جائے گا ۔ اس لیے ایک مجموعی خاکہ دینے پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا ۔ ابن بطوطہ تنجہ سے شمالی افریقہ سے گزر کر اسکندریہ پہونچا ۔ وہاں سے قاہرہ گیا ۔ وہاں سے جنوب کی جانب دریائے نیل کے بالائی حصے کی جانب ایدفو کے مقام تک گیا ۔ وہاں سے ریگستانی علاقہ سے گزر کر بحر قلزم کی بندرگاہ عیذاب (جسے " خلاصۃ النظار " میں ایذاب لکھا ہے) پہونچا ۔ ہندوستان اور یمن کے تجارتی جہازوں کا مال عیذاب میں اترتا تھا ۔ یہ بندرگاہ چودہویں صدی کے اواخر میں غیر اہم

ہوگئی۔ عیذاب سے ابن بطوطہ قاہرہ واپس پہونچا۔ وہاں سے یروشلم، حماہ اور حلب ہوتا ہوا 1326ء میں دمشق سے جو کارواں مدینہ اور مکہ جا رہا تھا، اس میں شامل ہوگیا۔ حج بیت اللہ کرکے ابن بطوطہ مدینہ گیا اور وہاں سے مشہد علی الرضا پہونچا جو خراسان میں ہے (یہاں رحلہ کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے)۔

مناسب ہوگا کہ آگے بڑھنے سے پہلے کچھ دلچسپ واقعات جو خلاصہ تحفۃ النظار میں بیان کئے گئے ہیں، درج کر دیئے جائیں۔

ابن بطوطہ کی سفر میں شادی

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قسطنطین میں ابن بطوطہ کے ایک دوست نے اپنا کچھ سامان بیچ کر اس کے لیے زاد راہ فراہم کیا اور قسطنطین کے حاکم نے اسے اچھی پوشاک پہنائی تھی۔ وہاں سے جب ابن بطوطہ سفکس پہونچا تو اس نے وہاں کے ایک عہدہ دار کی لڑکی سے شادی کرلی اور ترپولی کے مقام پر دلہن اس کے حوالے کی گئی۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت لڑکی کے باپ سے تعلقات کشیدہ ہوگئے، اس لیے بیوی کو چھوڑنا اور نکاح منسوخ کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب ابن بطوطہ فاس پہونچا تو وہاں کے ایک عالم کی لڑکی سے شادی ہوگئی۔ فاس سے 5 اپریل 1326ء کو ابن بطوطہ کا قافلہ اسکندریہ پہونچا۔ معلوم نہیں کہ اس کی دلہن بھی ساتھ آئی یا اپنے والد ہی کے یہاں رہ گئی۔ اسکندریہ سے ابن بطوطہ شیخ المرشدی کی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے فوّا گیا۔ شیخ نے بڑی عزت افزائی کی اور نماز میں ابن بطوطہ ہی کو امام بنایا۔ رات کو ابن بطوطہ نے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر شیخ سے پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ تم مکہ، مدینہ، یمن، عراق اور ترکوں کے ملک سے ہوتے ہوتے ہندوستان جاؤ گے۔ وہاں ایک بڑی مدت تک رہو گے اور میرے دینی بھائی دلشاد سے ملو گے۔ شیخ نے کچھ روپیاں اور دینار دے کر رخصت کیا۔

کئی مقامات سے گزر کر ابن بطوطہ قاہرہ پہونچا۔ اس کا بیان ہے کہ اسکندریہ سے لے کر قاہرہ تک اور قاہرہ سے بالائی مصر میں اسوان تک دریائے نیل کے دونوں طرف بازاروں کا سلسلہ قائم تھا۔ قاہرہ کی خوبصورتی کی بہت تعریف کرتا ہے۔ قاہرہ میں مدرسوں کی تعداد شمار سے زیادہ بتاتا ہے۔ وہاں بہت سی خانقاہیں تھیں جن کے اکثر درویش ایرانی تھے۔ ان کے قیام و طعام کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ حضرت امام حسین کا سر مبارک قاہرہ میں مدفون ہے، ابن بطوطہ نے وہاں حاضری دی۔ حضرت امام حسین کی مسجد سے ملحق ایک بڑی خانقاہ جس کے دروازے پر چاندی کے حلقے اور پتیاں جڑی ہوئی تھیں قاہرہ سے روانہ ہوکر ابن بطوطہ دیر الیتخا کی خانقاہ میں ٹھہرا۔ جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکڑی کا کونڈا، جوتے، سینے کی سوئی، سرمہ کی سلائی وغیرہ اور حضرت علی کے ہاتھ کا لکھا

ہوا قرآن مجید محفوظ ہے۔ پندرہ دن سفر کرکے ابن بطوطہ ایذاب (عیذاب) پہونچا۔ وہاں کے لوگ سیاہ فام تھے، وہ لڑکیوں کو ترکہ نہ دیتے تھے۔ وسط جولائی 1326ء کو ابن بطوطہ قاہرہ واپس آگیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور کچھ نبیوں کی قبریں

قاہرہ سے غازہ اور وہاں سے خلیل (Hebron) گیا۔ یہاں کی مسجد نہایت عالی شان ہے، اس مسجد کے اندر حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کی قبریں بتائی جاتی ہیں اور ان کے مقابل ان کی بیویاں مدفون ہیں۔ اس مسجد میں حضرت لوط اور حضرت یوسف کے مزار بھی ہیں۔ خلیل سے ابن بطوطہ بیت اللحم (جو حضرت عیسیٰ کا مقام ولادت ہے) گیا اور وہاں سے یروشلم۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ مصر سے شام کے راستے میں جابجا مسافر خانے بنے ہوئے ہیں اور عراق کے جاسوسوں کے داخلے کو روکنے کی غرض سے یہ حکم نافذ کیا گیا ہے کہ بغیر حاکم کی اجازت کے کوئی شخص مصر سے شام یا شام سے مصر نہیں جاسکتا۔

یروشلم سے ابن بطوطہ عقلان اور الرملہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ الرملہ کی مسجد کے قبلہ میں تین رسول مدفون ہیں۔ کئی شہروں سے گزرتا ہوا ابن بطوطہ طبریہ پہونچا۔ طبریہ میں ابن بطوطہ کے بموجب حضرت شعیب، ان کی دختر یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اہلیہ اور حضرت سلیمان کی قبریں ہیں اور وہاں وہ چاہ کنعاں بھی ہے جس میں حضرت یوسف کے بھائیوں نے انہیں ڈال دیا تھا۔ (محققین کی رائے میں حضرت شعیب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر نہیں تھے۔ وہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کی طرف بھیجے گئے تھے جو جزیرہ نمائے سینا اور شمالی حجاز میں بسے ہوئے تھے۔ طبریہ یہاں سے کافی دور شمال میں واقع ہے۔ طبریہ سے ابن بطوطہ بیروت، حمص، حلب، انطاکیہ وغیرہ ہوتا ہوا جبلہ پہونچا۔ جہاں حضرت ابراہیم ادہم کا مزار ہے۔ اس علاقہ میں اکثر نصری آباد تھے جن کے اعتقادات مسلمانوں سے مختلف تھے۔ 19 اگست 1326ء کو ابن بطوطہ دمشق میں داخل ہوا جسے وہ تمام شہروں سے زیادہ خوبصورت بتاتا ہے۔ امیر معاویہ کے قصر الخضرا کو منہدم کرکے بنی عباس نے بازار بنا دیا۔ مگر مسجد اموی جسے ولید بن عبدالملک نے تعمیر کرایا تھا، (بنی عباس کے دست انتقام سے مسجد ہونے کے باعث محفوظ رہی) ابن بطوطہ کے زمانے میں تمام دنیا کی مساجد میں سب سے زیادہ شاندار سمجھی جاتی تھی۔ ابن بطوطہ نے دمشق میں پانی سے چلنے والی گھڑیاں دیکھیں اور انہیں دیکھ کر بہت متحیر ہوا۔ اس زمانے میں حضرت تقی الدین ابن تیمیہ قید میں تھے۔ قید ہی میں ان کا انتقال 1328ء میں ہوا۔

ابن بطوطہ کا پہلا حج

یکم ستمبر 1326ء کو ابن بطوطہ کاروان حجاز کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوا۔ چار دن مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ پہونچا وہاں کے لوگوں کی بہت تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ نیک، فیاض اور نفاست پسند ہیں۔ صاف شفاف لباس پہنتے اور عطر اور کحل بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ 17 نومبر 1326ء کو ابن بطوطہ مکہ معظمہ سے عراق کے کاروان کے ساتھ روانہ ہوا۔ سلطان عراق ابو سعید حاجیوں کے کارواں پر صرف کثیر کرتا تھا۔ کارواں سالار سب کے آرام کا بہت خیال رکھتا۔ ضروری دوائیں کارواں کے ساتھ رہتیں۔ کھانے پینے کا معقول انتظام کیا جاتا۔ غریبوں کے لیے پانی بھر کر اونٹوں پر لادا جاتا۔ کارواں رات کو چلتا۔ آگے آگے مشعل بردار چلتے۔ مدینہ پہونچ کر چھ دن کارواں وہاں ٹھہرا۔ وہاں سے روانہ ہو کر جب وادی العروس پہونچے تو زیر زمین طبقات کا جمع شدہ پانی نکالا جو بہت میٹھا تھا۔ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ کے بنوائے ہوئے حوض 'تالاب' کنویں کئی جگہ ملے۔ ملکہ کے نام پر یہ راستہ داب زبیدہ کہلاتا ہے۔ قافلہ سمیرا سے آگے بڑھا تو ایک ٹیلا ملا جس کی چوٹی پر ایک سوراخ تھا۔ اس میں سے ہوا نکلتی تو سیٹی بجنے کی آواز سنائی دیتی۔ واقصہ اور کوفہ کے درمیان کہیں پانی نہیں ملتا۔ واقصہ میں کوفہ سے آ کر لوگ حاجیوں کا استقبال کرتے تھے اور تحفے دیتے تھے۔ القادسیہ میں جہاں حضرت سعد ابن ابی وقاص نے ایرانیوں کو فیصلہ کن شکست جون 637ء میں دی تھی وہاں کارواں ٹھہرا۔ وہاں سے نجف (مشہد حضرت علی) پہونچا۔ اس شہر کی ابن بطوطہ نے بہت تعریف کی ہے۔ حضرت علی کے مزار کی دہلیز چاندی کی تھی جسے زائرین چومتے۔ مزار میں سونے چاندی کی قندیلیں لگی ہوئی تھیں۔ مزار کے گرد قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ شہر کا حاکم نقیب الاشرف کہلاتا تھا۔ یہاں سے کارواں بغداد کی طرف چلا مگر ابن بطوطہ اور کچھ اور لوگ بصرہ روانہ ہوئے۔ وہ کہتا ہے کہ واسطہ کے لوگوں کا اخلاق عراق میں سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی قرات سیکھنے لوگ واسطہ میں آتے تھے۔ ابن بطوطہ ام عبیدہ کے قریہ میں سید احمد الرفاعی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ وہاں ہزاروں درویش خانقاہوں میں رہتے تھے، نماز عصر کے بعد طبل دکوس کی آواز پر درویش رقص کرتے۔ عشاء کی نماز کے بعد آگ جلائی جاتی، درویش اس کے گرد ناچتے۔ بعض اس پر لوٹتے اور کچھ منہ میں جلتے انگارے رکھ لیتے اس طرح آگ کو ٹھنڈا کیا جاتا۔ مزار کے کچھ فقیر بڑے بڑے سانپوں کے سر اپنے منہ میں لے کر کتر ڈالتے۔ ام عبیدہ سے ابن بطوطہ بصرہ گیا۔ بصرہ کے لوگوں کو بہت نیک اور مہمان نواز پایا۔ بصرہ کی آبادی بہت کم ہو گئی تھی۔ حضرت علی کی مسجد میں صرف جمعہ کی نماز ہوتی۔ پیش امام نے جو خطبہ دیا، اس میں زبان کی غلطیاں تھیں۔ ابن بطوطہ نے قاضی شہر سے شکایت کی۔ قاضی نے جواب دیا کہ اس شہر میں اب ایک شخص بھی ایسا نہیں جو قواعد زبان سے واقف ہو۔ اسی بصرہ میں خلیل ابن احمد نے جو عربی قواعد زبان اور عربی علم عروض کا باوا آدم کہا جاتا ہے، آٹھویں صدی عیسوی میں اپنی ساری زندگی گزاری تھی۔ وہ عمان کا رہنے والا تھا مگر بصرہ میں سکونت اختیار کر لی

تھی۔ اسی کے ایرانی شاگرد سیبویہ (Sibawaihi) نے عربی کی سب سے پہلی مکمل قواعد لکھی تھی، جس پر آج تک مشکل سے کوئی اضافہ ہو سکا۔

ابلہ، عبادان، ماجول ہوتا ہوا ابن بطوطہ رام ہرمز پہونچا، خانقاہوں میں قیام کیا جہاں روٹی، گوشت اور مٹھائیوں سے مسافروں کی تواضع کی جاتی تھی۔ تستر پہونچ کر شیخ شرف الدین موسیٰ کے مدرسے میں سولہ دن ٹھہرا اور ان کے وعظ سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی اگلی منزل ایذاج تھی، وہاں کے سلطان اتابک کو شراب پیتے دیکھا تو اسے نصیحت کی۔ سلطان نے کچھ دینار عطیہ میں دیئے، دس دن اسی سلطان کے علاقہ میں سفر کرتے گزرے۔ جہاں کہیں ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی ٹھہرے سرکاری طور پر ان کی مہمان نوازی کی گئی۔ سلطان نے ملک کی تہائی آمدنی مدرسوں اور مسافروں پر خرچ کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اشترکان، فیروزاں اور اصفہان ہوتے ہوئے یہ لوگ شیراز پہونچے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ شیراز کے لوگ خوش رو اور خوش پوشاک ہوتے ہیں۔ دمشق کے بعد مشرق میں شیراز سے زیادہ خوبصورت شہر اور کوئی نہیں۔ شیراز کے لوگ بڑے متدیّن اور عبادت گزار تھے۔ ہفتہ میں تین دن مرد اور عورتیں سب سے بڑی مسجد میں وعظ سننے جمع ہوتے۔ عورتوں کا اتنا بڑا اجتماع اس نے اور کہیں نہیں دیکھا۔ شیراز میں ابن بطوطہ مشہور بزرگ مجد الدین کی خدمت میں حاضر ہوا اور شیخ سعدی کے مزار پر بھی حاضری دی۔ شیخ سعدی کے مزار کی زیارت کرنے والوں کے لیے ایک خانقاہ تھی جہاں قیام و طعام کا معقول انتظام تھا۔ شیراز سے گاذراں جا کر شیخ ابو اسحٰق کے مقبرے پر حاضر ہوا۔ کوفہ گیا تو اسے ڈاکوؤں اور لٹیروں کی دست برد سے قریب قریب ویران پایا۔

امام منتظر

دریائے فرات کے مغربی ساحل پر حلہ کا شہر ہے۔ وہاں کے لوگ امام حسن العسکری کے فرزند امام محمد کو امام المنتظر کہتے ہیں۔ روز سو آدمی باجا بجاتے ہوئے نکلتے اور پکارتے تھے کہ قائم الزماں اپنے گوشہ تنہائی سے باہر آئیے، دنیا میں بدکاری اور ناانصافی پھیل گئی ہے۔ اسے دور کیجئے۔ وہاں سے ابن بطوطہ کربلا پہونچا اور حضرت امام حسین کے مزار کی زیارت کی۔ کوفہ کے شیعوں میں دو جماعتیں ہو گئی تھیں جن میں اکثر جھگڑا فساد ہوتا جس کے باعث شہر ویران ہوتا جا رہا تھا۔ کوفہ سے بغداد پہونچ کر ابن بطوطہ نے دیکھا کہ سب مسجدیں اور مدرسے ویران پڑے ہیں۔ واضح رہے کہ 1258ء میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے بغداد کو جو اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ پر رونق شہر تھا، بڑی سفاکی سے تباہ برباد کیا تھا۔ وہاں کے باشندوں کے خون سے کئی دن تک دجلہ کا پانی سرخ رنگ رہا۔

ابن بطوطہ کا پہلا حج

یکم ستمبر 1326ء کو ابن بطوطہ کاروان حجاز کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوا۔ چار دن مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ پہونچا وہاں کے لوگوں کی بہت تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ نیک، فیاض اور نفاست پسند ہیں۔ صاف شفاف لباس پہنتے اور عطر اور کُحل بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ 17 نومبر 1326ء کو ابن بطوطہ مکہ معظمہ سے عراق کے کاروان کے ساتھ روانہ ہوا۔ سلطان عراق ابوسعید حاجیوں کے کارواں پر صرف کثیر کرتا تھا۔ کارواں سالار سب کے آرام کا بہت خیال رکھتا۔ ضروری دوائیں کارواں کے ساتھ رہتیں۔ کھانے پینے کا معقول انتظام کیا جاتا۔ غریبوں کے لیے پانی بھر کر اونٹوں پر لادا جاتا۔ کارواں رات کو چلتا۔ آگے آگے مشعل بردار چلتے۔ مدینہ پہونچ کر چھ دن کارواں وہاں ٹھہرا۔ وہاں سے روانہ ہو کر جب وادی العروس پہونچے تو زیر زمین طبقات کا جمع شدہ پانی نکالا جو بہت میٹھا تھا۔ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ کے بنوائے ہوئے حوض، تالاب، کنویں کئی جگہ ملے۔ ملکہ کے نام پر یہ راستہ داب زبیدہ کہلاتا ہے۔ قافلہ سمیرا سے آگے بڑھا تو ایک ٹیلا ملا جس کی چوٹی پر ایک سوراخ تھا۔ اس میں سے ہوا نکلتی تو سیٹی بجنے کی آواز سنائی دیتی۔ واقصہ اور کوفہ کے درمیان کہیں پانی نہیں ملتا۔ واقصہ میں کوفہ سے آ کر لوگ حاجیوں کا استقبال کرتے تھے اور تحفے دیتے تھے۔ القادسیہ میں جہاں حضرت سعد ابن ابی وقاص نے ایرانیوں کو فیصلہ کن شکست جون 637ء میں دی تھی وہاں کارواں ٹھہرا۔ وہاں سے نجف (مشہد حضرت علی) پہونچا۔ اس شہر کی ابن بطوطہ نے بہت تعریف کی ہے۔ حضرت علی کے مزار کی دہلیز چاندی کی تھی جسے زائرین چومتے۔ مزار میں سونے چاندی کی قندیلیں لگی ہوئی تھیں۔ مزار کے گرد قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ شہر کا حاکم نقیب الاشرف کہلاتا تھا۔ یہاں سے کارواں بغداد کی طرف چلا مگر ابن بطوطہ اور کچھ اور لوگ بصرہ روانہ ہوئے۔ وہ کہتا ہے کہ واسطہ کے لوگوں کا اخلاق عراق میں سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی قرات سیکھنے لوگ واسطہ میں آتے تھے۔ ابن بطوطہ ام عبیدہ کے قریہ میں سید احمد الرفاعی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ وہاں ہزاروں درویش خانقاہوں میں رہتے تھے، نماز عصر کے بعد طبل دکوس کی آواز پر درویش رقص کرتے۔ عشاء کی نماز کے بعد آگ جلائی جاتی، درویش اس کے گرد ناچتے۔ بعض اس پر لوٹتے اور کچھ منہ میں جلتے انگارے رکھ لیتے اس طرح آگ کو ٹھنڈا کیا جاتا۔ مزار کے کچھ فقیر بڑے بڑے سانپوں کے سر اپنے منہ میں لے کر کتر ڈالتے۔ ام عبیدہ سے ابن بطوطہ بصرہ گیا۔ بصرہ کے لوگوں کو بہت نیک اور مہمان نواز پایا۔ بصرہ کی آبادی بہت کم ہو گئی تھی۔ حضرت علی کی مسجد میں صرف جمعہ کی نماز ہوتی۔ پیش امام نے جو خطبہ دیا، اس میں زبان کی غلطیاں تھیں۔ ابن بطوطہ نے قاضی شہر سے شکایت کی۔ قاضی نے جواب دیا کہ اس شہر میں اب ایک شخص بھی ایسا نہیں جو قواعد زبان سے واقف ہو۔ اسی بصرہ میں خلیل ابن احمد نے جو عربی قواعد زبان اور عربی علم عروض کا باوا آدم کہا جاتا ہے، آٹھویں صدی عیسوی میں اپنی ساری زندگی گزاری تھی۔ وہ عمان کا رہنے والا تھا مگر بصرہ میں سکونت اختیار کرلی

تھی۔ اسی کے ایرانی شاگرد سیبویہ (Sibawaihi) نے عربی کی سب سے پہلی مکمل قواعد لکھی تھی، جس پر آج تک مشکل سے کوئی اضافہ ہو سکا۔

ابلہ، عبادان، ماجول ہوتا ہوا ابن بطوطہ رام ہرمز پہونچا، خانقاہوں میں قیام کیا جہاں روٹی، گوشت اور مٹھائیوں سے مسافروں کی تواضع کی جاتی تھی۔ تستر پہونچ کر شیخ شرف الدین موسیٰ کے مدرسے میں سولہ دن ٹھہرا اور ان کے وعظ سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی اگلی منزل ایذاج تھی، وہاں کے سلطان اتابک کو شراب پیتے دیکھا تو اسے نصیحت کی۔ سلطان نے کچھ دینار عطیہ میں دیئے، دس دن اسی سلطان کے علاقہ میں سفر کرتے گزرے۔ جہاں کہیں ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی ٹھہرے سرکاری طور پر ان کی مہمان نوازی کی گئی۔ سلطان نے ملک کی تہائی آمدنی مدرسوں اور مسافروں پر خرچ کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اشترکان، فیروزاں اور اصفہان ہوتے ہوئے یہ لوگ شیراز پہونچے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ شیراز کے لوگ خوش رو اور خوش پوشاک ہوتے ہیں۔ دمشق کے بعد مشرق میں شیراز سے زیادہ خوبصورت شہر اور کوئی نہیں۔ شیراز کے لوگ بڑے متدیّن اور عبادت گزار تھے۔ ہفتہ میں تین دن مرد اور عورتیں سب سے بڑی مسجد میں وعظ سننے جمع ہوتے۔ عورتوں کا اتنا بڑا اجتماع اس نے اور کہیں نہیں دیکھا۔ شیراز میں ابن بطوطہ مشہور بزرگ مجد الدین کی خدمت میں حاضر ہوا اور شیخ سعدی کے مزار پر بھی حاضری دی۔ شیخ سعدی کے مزار کی زیارت کرنے والوں کے لیے ایک خانقاہ تھی جہاں قیام و طعام کا معقول انتظام تھا۔ شیراز سے گاذراں جا کر شیخ ابواسحٰق کے مقبرے پر حاضر ہوا۔ کوفہ گیا تو اسے ڈاکوؤں اور لٹیروں کی دست برد سے قریب قریب ویران پایا۔

امام منتظر

دریائے فرات کے مغربی ساحل پر حلہ کا شہر ہے۔ وہاں کے لوگ امام حسن العسکری کے فرزند امام محمد کو امام المنتظر کہتے ہیں۔ روز سو آدمی باجا بجاتے ہوئے نکلتے اور پکارتے تھے کہ قائم الزماں اپنے گوشہ تنہائی سے باہر آئیے، دنیا میں بدکاری اور ناانصافی پھیل گئی ہے۔ اسے دور کیجئے۔ وہاں سے ابن بطوطہ کربلا پہونچا اور حضرت امام حسین کے مزار کی زیارت کی۔ کوفہ کے شیعوں میں دو جماعتیں ہو گئی تھیں جن میں اکثر جھگڑا فساد ہوتا جس کے باعث شہر ویران ہوتا جا رہا تھا۔ کوفہ سے بغداد پہونچ کر ابن بطوطہ نے دیکھا کہ سب مسجدیں اور مدرسے ویران پڑے ہیں۔ واضح رہے کہ 1258ء میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے بغداد کو جو اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ پر رونق شہر تھا، بڑی سفاکی سے تباہ برباد کیا تھا۔ وہاں کے باشندوں کے خون سے کئی دن تک دجلہ کا پانی سرخ رنگ رہا۔

سلطان ابوسعید کے کارواں کے ساتھ ابن بطوطہ تبریز گیا۔ وہاں کے بازار کی اس نے بہت تعریف کی ہے۔ حسین غلام قیمتی ریشمی لباس پہنے خریداروں کو مال دکھانے پر مقرر تھے۔

ابن بطوطہ کا دوسرا حج

ابن بطوطہ نے دوبارہ حج کرنے کا خیال ظاہر کیا تو سلطان ابوسعید نے بغداد کے گورنر کو حکم دیا کہ ابن بطوطہ کو سفرخرچ دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ کارواں کی روانگی میں ابھی دو مہینے باقی تھے۔ یہ مدت اس نے مختلف مقامات کی سیاحت میں صرف کی، تکریت بھی جہاں سلطان صلاح الدین ایوبی پیدا ہوا تھا گیا۔ اس کی مسجدوں اور بازاروں کو بارونق پایا۔ موصل اس وقت ایک خوشحال شہر تھا۔ مار دین سے جو خوبصورت شہر تھا، ابن بطوطہ بغداد واپس آیا اور حجاز کے کارواں میں شامل ہوگیا۔ مکہ پہونچا، اور دوسرا حج کیا۔ بیماری کی وجہ سے صفا و مروہ کے درمیان گھوڑے پر سعی کی۔

سارٹن کے بموجب ابن بطوطہ پہلے حج کے بعد مدینہ سے مشہد علی الرضا گیا تھا۔ "خلاصہ تحفۃ النظار" کے بموجب پہلے حج کے بعد ابن بطوطہ کا مشہد علی الرضا جانا نہیں پایا جاتا۔ بلکہ اس میں مشہد جانے کا ذکر اس وقت کیا ہے جب ابن بطوطہ سلطان محمد اوزبک کی تیسری ملکہ بیالون جو باز نطینی شہنشاہ کی بیٹی تھی، قسطنطنیہ پہونچا کر سرا واپس آیا اور سرا سے خوارزم، بخارا، بلخ، ہرات، جام ہوتا ہوا مشہد پہونچا۔ البتہ پہلے حج کے بعد ابن بطوطہ مشہد حضرت علی یعنی نجف گیا تھا۔ ممکن ہے سارٹن نے اسے ہی مشہد علی الرضا سمجھ لیا ہو۔ اس خیال کو تقویت اس بات سے ملتی ہے کہ نجف سے جہاں جہاں یعنی بصرہ، کوفہ، بغداد موصل وغیرہ جانا "خلاصہ تحفۃ النظار" میں بتایا ہے اس کا ذکر سارٹن نے بھی کیا ہے۔ سارٹن لکھتا ہے کہ:

"مشہد علی الرضا کے بعد ابن بطوطہ بصرہ گیا۔ پھر ایران کے کچھ مقامات کی سیاحت کے بعد کوفہ آیا۔ وہاں سے بغداد پھر موصل اور دیار بکر کے ضلع میں گھوم پھر کر آیا۔ ان مقامات کی سیاحت اس نے وقت گزارنے کے لیے کی تھی کیوں کہ مکہ جانے میں ابھی دیر تھی۔ یہی بات "خلاصہ تحفۃ النظار" میں بھی کہی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مشہد علی الرضا کے بجائے موخر الذکر میں نجف لکھا ہے اور یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مشہد عراق سے بہت دور خراسان میں ہے۔ بغداد سے ابن بطوطہ مکہ مکرمہ گیا اور دوسرا حج کیا اور تین سال 30-1328ء وہاں قیام کیا۔ ان تین سالوں میں اس نے تین حج ادا کئے ہوں گے"۔

تین سال مکہ مکرمہ میں گزار کر ابن بطوطہ یمن گیا۔ وہاں سے مشرقی افریقہ کے ساحل کے کئی مقامات کا سفر کیا اور یمن واپس آیا۔ وہاں سے عمان، ہرمز، لار اور بحرین کے جزائر کا سفر کیا اور پھر حج کے لیے 1332ء میں مکہ مکرمہ پہونچ گیا۔ حج کے بعد مصر اور شام ہوتا ہوا لہاذقیہ (Lhadhiqiya) پہونچا۔ "خلاصہ تحفۃ النظار" میں لہاذقیہ کو لاذقیہ لکھا ہے۔ یہاں سے جہاز کے ذریعے علایا گیا جو ترکوں کی حکمرانی میں تھا۔ اناطولیہ کی سیاحت کرتا ہوا ابن بطوطہ صنوب (خلاصہ تحفۃ النظار میں صنوب لکھا ہے) پہونچا۔ صنوب بحر اسود پر واقع تھا۔ یہاں سے ابن بطوطہ ایک یونانی جہاز کے ذریعہ کفّا گیا اور بحیرہ اوزاق (Sea of Azov) کو پار کر کے جنوبی روس میں پہنچا۔ جہاں سے قپچاق کے مراعی (Steppes of the Qipchaq) شروع ہو جاتے ہیں۔ اس ملک میں زرین اردو کے خان (Khan of the Golden Horde) کی حکومت تھی۔ خان کا نام ازبک تھا۔ جارج سارٹن کی رائے میں ابن بطوطہ کا بلغار تک جانا جو والگا (نہر نیل) اور کاما ندیوں کے سنگم پر واقع ہے، مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے حالات جو تحفۃ النظار میں پائے جاتے ہیں وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ ابن بطوطہ استرا خان واپس آیا تو اسے یہ خدمت سپرد کی گئی کہ وہ یونانی شہزادی کے ساتھ جس کے بچہ ہونے والا تھا قسطنطنیہ تک جائے۔ چنانچہ ابن بطوطہ قسطنطنیہ پہونچا، اس وقت اینڈرو نیکوس سوم کی وہاں حکمرانی تھی۔ اس کے والد اینڈرو نیکوس دوم نے تخت چھوڑ کر رہبان بننا پسند کیا تھا۔ ابن بطوطہ باز نطینی بادشاہ کو تکفور کہتا ہے۔ آرمینیہ کی زبان میں تکووز بادشاہ کو کہتے ہیں۔ اس سے تکفور بنا لیا۔ قسطنطنیہ سے ابن بطوطہ سرا گیا جہاں اوزبک خان رہتا تھا (یہاں دوسری جلد ختم ہوتی ہے)۔

یہاں تک کے حالات کے متعلق "خلاصہ تحفۃ النظار" سے کچھ عبارت نیچے درج کی جاتی ہے:

ترکی کی مسافرنوازی

حج سے فارغ ہو کر ابن بطوطہ جدہ گیا جہاں سے وہ جہاز کے ذریعہ یمن اور ہندوستان جانا چاہتا تھا۔ چالیس دن تک جدہ میں ٹھہرا رہا۔ ایک جہاز ملا جو خستہ حالت میں تھا۔ ابن بطوطہ نے اس پر سفر کرنا پسند نہیں کیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ جہاز اور اس کے مسافر ڈوب گئے۔ ابن بطوطہ ہندوستان جانے کے بجائے دریائے نیل کے راستہ قاہرہ چلا گیا۔ وہاں سے شام کے شہروں میں گھوما پھرا اور بالآخر ترکی شہر علائیہ جا پہونچا۔ یہ ملک بہت خوش منظر تھا اور یہاں کے لوگ خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے۔ ان کی عورتیں بے نقاب پھرتی تھیں۔ علائیہ کی بندرگاہ روم کے سلجوق سلطان علاؤالدین کیقباد اول نے (جس نے 1219ء سے 1237ء تک حکومت کی تھی) بنوائی تھی۔ یہاں کے جنگلوں سے اسکندریہ اور قاہرہ کو لکڑی برآمد کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں یوسف بک ابن قرمان وہاں کا

فرماں روا تھا۔ وہ ابن بطوطہ سے بڑی مہربانی سے پیش آیا اور اسے سفر خرچ دیا۔ علائیہ سے ابن بطوطہ انطاکیہ گیا جو بہت وسیع اور خوبصورت شہر تھا۔ یہاں آلو بخارا کی قسم کا پھل جو قمرالدین کہلاتا تھا، بہت پیدا ہوتا تھا اور مصر کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اناطولیہ کے شہر میں "اخوان" پائے جاتے تھے۔ یہ ایک بڑی اور نہایت منظم جماعت کے ارکان تھے جن کے سپرد مسافروں کی خدمت تھی۔ اس جماعت کا ہر فرد اپنی کمائی جماعت کے قیم کو دے دیتا تھا تاکہ وہ ضروری قومی کاموں پر صرف کی جائے۔ انطاکیہ کا مہمان خانہ ترکی شالوں اور عراقی قندیلوں سے مزین کیا گیا تھا۔ اس میں ابن بطوطہ کو پر تکلف دعوت دی گئی جس میں موسیقی کا بطور خاص انتظام کیا گیا تھا۔ قونیہ میں اور بھی زیادہ مہمان نوازی کی گئی۔ قاضی شہر نے اپنے لڑکوں کو مہمانوں کی خدمت پر مامور کیا۔ مولانا جلال الدین رومی کے متبعین کا جو جلالیہ یا مولویہ کہلاتے ہیں پورے اناطولیہ میں بہت احترام کیا جاتا ہے۔ مولانا روم کی وفات 1273ء میں یعنی ابن بطوطہ کے قونیہ جانے سے تقریباً پچاس سال پہلے ہوئی تھی۔ قونیہ سے وہ لارندہ گیا۔ راستے میں سلطان سے جو شکار سے واپس آیا تھا، ملاقات ہوئی۔ ابن بطوطہ کو اپنے ساتھ لے گیا اور بہت خاطر مدارات کی۔ برجی کے سلطان نے اور بھی زیادہ مہمان نوازی کی اور ایک بار خود ابن بطوطہ سے اس کی قیام گاہ پر ملنے بھی آیا۔ سلطان نے ابن بطوطہ کو ایک شہاب دکھایا جس کا وزن ایک سو بارہ پونڈ تھا۔ اس پر بہت ہتھوڑے مارے مگر وہ نہ ٹوٹا (جارج سارٹن نے بھی اس شہاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کی رائے میں یہ Siderite یعنی آہنی شہاب تھا اس لیے ہتھوڑوں سے نہ توڑا جا سکا) ابن بطوطہ کو سخت حیرت ہوئی کہ یہ کیسا پتھر ہے جو لوہے کے ہتھوڑوں سے بھی نہیں ٹوٹتا۔ سلطان نے چودہ دن تک ابن بطوطہ کو محل شاہی میں رکھا اور رخصت کرتے وقت ایک سو اشرفیاں خلعت اور مائیکل نامی ایک غلام عطا کیا اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔

ابن بطوطہ نے کنیزیں خریدیں اور اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی

ابن بطوطہ نے شہر ایاسلوق میں چالیس دینار میں ایک یونانی کنیز خریدی۔ جب بل کسری پہونچا تو ایک یونانی کنیز جس کا نام مارگریٹ تھا، خریدی۔ کچھ عرصے بعد تخت میں ابن بطوطہ کے حرم میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ معلوم نہیں یہ لڑکی ان کنیزوں میں سے کس کے بطن سے ہوئی تھی جس سے ابن بطوطہ نے فاس میں شادی کی تھی۔ یہ لڑکی ہندوستان پہونچنے کے دو مہینے بعد فوت ہوگئی۔ ایاسلوق سے ابن بطوطہ ازمیر گیا جو صلیبیوں کی تاخت و تاراج سے ویران ہو چکا تھا۔ ازمیر کے حاکم نے بہت خاطر تواضع کی اور ایک غلام نکولس نامی عطا کیا۔ بروسہ میں جو عثمانی حکومت کا ابتدا میں پایہ تخت تھا گرم پانی کے چشمے تھے۔ بیمار ان میں نہاتے تھے، مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ حمام بنا دیئے گئے تھے۔ یہاں کا سلطان اُرخان عثمانی تھا (یہ وہی سلطان تھا جس سے بازنطینی شہنشاہ جان ششم نے اپنی بیٹی تھیوڈورا بیاہ دی تھی اور جس نے یورپ میں عثمانی حکومت کی بنیاد

ڈالی۔ بروسہ کے بعد نیسقیہ میں ابن بطوطہ نے چالیس دن قیام کیا۔ نیسقیہ ایک تالاب کے بیچ میں واقع تھا۔ اس میں بہت سے باغات تھے۔ یہاں کے لوگ عربی سے ناواقف تھے۔ ابن بطوطہ وہاں سے بہت مصیبتیں جھیل کر بولی پہونچا جہاں اخوان کی خانقاہ میں ٹھہرا۔ اخوان قیستان بھی کہلائے جاتے تھے۔ انہوں نے ابن بطوطہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور وہاں کے حاکم نے لباس اور گھوڑا عطا کیا۔ قسطمونیہ ہوتا ہوا بحر اسود کی جنوبی بندرگاہ سنوپ پہونچا۔ وہاں سے بحر اسود پار کرکے کریمیا کی بندرگاہ کرش میں اترا۔ یہاں سے زریں اردو (Golden Horde) کے خان محمد اوزبک کی سلطنت شروع ہوئی جو بہت وسیع تھی۔ کوہ قاف سے لے کے بحیرہ خوارزم (Aral sea) تک پھیلی ہوئی تھی اور دریائے والگا اور دریائے ڈان اس کے قلم رو میں بہتے تھے۔ سلطان محمد اوزبک نے 1312ء سے 1340ء تک حکومت کی۔ قرم پہونچ کر ابن بطوطہ وہاں کے حاکم سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ دارالسلطنت سرا جانے والا ہے۔ ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی حاکم کے ساتھ ہو لیے۔ جس گاڑی میں انہوں نے اور حاکم اور اس کے بھائی اور دو بیٹوں نے سفر کیا اس پر بانات کا ایک ہلکا خیمہ لگا ہوا تھا۔ خیمے کی کھڑکیاں جالی دار تھیں۔ خیمے میں کھانے پینے، لکھنے پڑھنے اور سونے کا انتظام تھا۔ اکیس دن چلنے کے بعد اوزاق (Azou) پہونچے جو ڈان ندی پر واقع تھا۔ اوزاق کے امیر نے ابن بطوطہ کی بہت عزت کی، اسے اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھا۔ بڑی شاندار دعوت کی، ابن بطوطہ کو ایک گھوڑا دیا۔ یہاں گھوڑوں کی بہت افراط تھی۔ ایک اچھا گھوڑا ایک مراکشی دینار میں مل جاتا تھا۔ گھوڑے ہندوستان بھیجے جاتے جہاں وہ فوج کے کام آتے۔

ترکوں میں عورتوں سے زیادہ احترام

ترکوں کے ملک میں عورتوں کی مردوں سے بھی زیادہ عزت کی جاتی ہے۔ قرم سے نکلتے ہوئے پہلے شہزادی جو ابن بطوطہ نے دیکھی تھی وہ امیر کی بیوی تھی وہ بیش بہا اونی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ جس خیمہ میں وہ سفر کر رہی تھی اس کے دروازے اور دریچے کھلے ہوئے تھے۔ جب شہزادی امیر کے خیمہ کے پاس گاڑی سے اتری تو تیس کنیزوں نے اس کے دامن کے حلقے پکڑ کر اٹھائے۔ امیر اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے برابر بٹھایا۔ دونوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ امیر نے اسے ایک قیمتی لباس دیا۔ عورتوں کے لباس کے مقابلے میں مردوں کا لباس بہت سادہ ہوتا ہے۔ مرد بکرے کے بالوں کی عبا پہنتے اور اسی کی اونچی ٹوپی اوڑھتے تھے۔

سلطان محمد اوزبک

سلطان محمد اوزبک بیش داغ میں تھا۔ ابن بطوطہ وہاں پہونچا مگر سلطان وہاں سے روانگی کا حکم دے چکا تھا۔ چنانچہ ابن بطوطہ ماجر آیا اور وہاں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمد اوزبک کھلے دربار میں ہر جمعہ کی نماز کے بعد زریں خیمہ میں تخت پر بیٹھ کر دربار کرتا تھا۔ تخت جواہرات سے مرصع تھا۔ اس کی چاروں بیویاں خاتون طیطغلی ' خاتون کبک ' خاتون بیالون (جو بازنطینی شہنشاہ کی بیٹی تھی) اور خاتون اردو خاں کی ' سلطان کے اردگرد بیٹھتیں۔ ہر خاتون کی آمد پر سلطان اٹھتا اور ہاتھ پکڑ کر اس کی مقررہ جگہ پر بٹھاتا۔ سلطان کی لڑکی اس کے سامنے بیٹھتی مگر لڑکے تخت کے دائیں اور بائیں جانب کھڑے رہتے۔ ابن بطوطہ سلطان محمد اوزبک کو دنیا کے سات بڑے بادشاہوں میں شامل کرتا ہے۔ وہ سات بادشاہ یہ ہیں: سلطان مراکش مصر و شام ' سلطان عراقین ' سلطان محمد اوزبک ' سلطان ترکستان ' سلطان ہند اور شاہ چین۔ ابن بطوطہ بڑی خاتون طیطغلی اور تیسری خاتون بیالون کے یہاں حاضر ہوا۔ دونوں نے خاطر مدارات کی۔ جب خاتون طیطغلی کے یہاں حاضر ہوا تو وہ تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھی۔ خاتون بیالون نے ابن بطوطہ سے اس کے سفر کے حالات سنے تو اس کے آنسو جاری ہوگئے۔ شاید اس کی وجہ اپنے وطن اور عزیزوں سے دوری ہو۔ رخصت کرتے وقت خاتون بیالون نے ابن بطوطہ کو کئی گھوڑے اور بہت سے کپڑے دیئے۔

بلغار کاشغر

سلطان سے اجازت لے کر ابن بطوطہ بلغار گیا۔ یہ ماجر سے آٹھ میل کے فاصلہ پر والگا کے بائیں کنارے پر واقع تھا اور پوستین کی تجارت کا بڑا مرکز تھا۔ یہ سفر رمضان کے مہینے میں درپیش آیا۔ افطار کے بعد نماز مغرب و نماز فجر کے درمیان بس اتنا وقفہ ہوتا کہ نماز عشاء ادا کی جاسکے۔ بلغار میں ابن بطوطہ تین دن ٹھہرا۔ وہ سائبیریا (Siberia) بھی جانا چاہتا تھا مگر وہاں کا سفر صرف کتا گاڑی پر جس کے پہیے نہیں ہوتے کیا جاتا تھا ' اس لیے وہاں نہ گیا۔ سائبیریا میں تجارت کا عجیب طریقہ رائج تھا۔ سوداگر اپنے اپنے مال کے ڈھیر لگا کر چلے جاتے تھے۔ دوسرے دن ہر ڈھیر کے پاس پوستینوں کا ڈھیر ملتا۔ اگر سوداگر سمجھتا کہ اس کے مال کا مناسب معاوضہ مل گیا تو وہ پوستین اٹھا لیتا اور اپنا مال چھوڑ دیتا۔ اگر پوستین نہ اٹھاتا تو اگلے دن یا تو پوستینوں کی تعداد میں اضافہ پاتا یا پوستینوں کے مالک انہیں اٹھالے جاتے۔ پوستینوں کے واپس لے لینے کے یہ معنی ہوتے کہ اس سے زیادہ قیمت دینی منظور نہیں۔ "خلاصہ تحفۃ النظار" کے مولف نے لکھا ہے کہ یورپ والوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ابن بطوطہ نے بلغار جانے بغیر وہاں کے سنے سنائے حالات بیان کر دیئے ہیں۔ اس نے جو رمضان کے مہینے میں جاکر

اسی مہینے میں واپس ہونا بتلایا ہے ' اس میں یا تو ابن بطوطہ سے بھول ہوگئی ہے یا پھر ابن جزی نے آنے جانے کی تاریخیں غلط لکھ دی ہیں۔ اس بنا پر اس سفر کو مشکوک نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

قسطنطنیہ کا سفر

واپسی پر ابن بطوطہ کو معلوم ہوا کہ تیسری ملکہ لشتی خاتون بیالون جو حاملہ تھی اپنے وطن جانے والی ہے۔ ابن بطوطہ کو قسطنطنیہ جانے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ سلطان نے اسے تیسری ملکہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور پندرہ سو دینار ' کئی گھوڑے اور لباس فاخرہ عطا کیا۔ ہر ملکہ نے چاندی کے ڈلے (جو خرید و فروخت میں بطور مبادلہ استعمال ہوتے تھے) دیئے۔ سلطان کی بیٹی نے ابن بطوطہ کو سب سے زیادہ عطیات سے نوازا۔ ملکہ بیالون کو ایک منزل تک پہونچانے خود سلطان بڑی ملکہ طیطغلی اور ولی عہد گئے۔ دوسری اور چوتھی ملکہ دوسری منزل تک گئیں۔ امیر بیدرہ پانچ ہزار فوج کے ساتھ قسطنطنیہ تک بحفاظت پہونچانے پر متعین ہوا۔ اس کے علاوہ خود خاتون بیالون کے اپنے پانچسو سوار تھے جن میں دو سو یونانی تھے۔ دو سو عورتیں جن میں اکثر یونانی تھیں اس کی خدمت میں تھیں۔ کچھ ہندوستانی جوان بھی ساتھ گئے۔ دو سو گاڑیاں ' دو ہزار سواری اور گاڑیوں کے گھوڑے ' تین سو بیل اور سو اونٹ ہمراہ تھے۔ راستہ میں لوگ تحائف پیش کرنے آتے۔ ہر حاکم ملکہ کو اپنے علاقہ کی سرحد تک پہونچاتا ' بابا سلطوق کا شہر سلطان کی سلطنت کا آخری شہر تھا۔ وہاں سے یونانیوں کے علاقے تک پہونچنے کے لیے ایک غیر آباد صحرا میں اٹھارہ دن تک کا سفر کیا۔ قلعہ مہتول سے یونانی سلطنت کا علاقہ شروع ہوا۔ یہاں فوج کے ساتھ ایک بڑا افسر اور کچھ شہزادیاں اور خواص موجود تھیں۔ امیر بیدرہ مسلمان فوج اور خدام سب وہاں روک دیئے گئے اور شراب اور سور کا استعمال شروع ہوگیا۔ صرف ابن بطوطہ اور ایک ترک کو اس نے اپنے ساتھ چلنے اور نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ فنیقہ کے مقام پر خاتون نے اپنے والد کے محل میں تین دن قیام کیا۔ خاتون کا بھائی پانچ ہزار سواروں کے ساتھ اس سے ملنے آیا۔ بھائی عمر میں بہن سے چھوٹا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے سے اتر کر خاتون کی رکاب کو بوسہ دیا اور خاتون نے اس کی پیشانی چومی اور شہزادوں اور سرداروں نے بھی خاتون کی رکاب چومی ' قافلہ قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا۔ اگلے دن ولی عہد دس ہزار سوار لے کر استقبال کو آیا۔ ایک خیمہ میں بھائی بہن کی ملاقات ہوئی جس کا حال ابن بطوطہ معلوم نہ کرسکا۔ قسطنطنیہ جب دس میل رہ گیا تو قافلہ نے خیمے نصب کئے اور وہیں ٹھہر گئے۔ سارا شہر خاتون کے استقبال کو امنڈ آیا۔ اگلے دن علی الصباح شہنشاہ اور خاتون کی حقیقی والدہ بیٹی کو لینے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ آئی۔ خاتون نے گھوڑے سے اتر کر ماں باپ کے سامنے زمین کو بوسہ دیا اور پھر ان کے گھوڑے کے سموں کو چوما۔ لوگوں نے خوشی کے مظاہرے کئے جس سے انتظام درہم برہم ہوگیا۔ دوپہر کے وقت خاتون قسطنطنیہ میں داخل ہوئی ہر طرف گھنٹے بج رہے تھے۔ ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی ترک کو محل کے

پہلے دروازے پر مسلمان ہونے کی وجہ سے روک دیا۔ جب خاتون نے اپنے باپ سے سفارش کی تو شہنشاہ نے ابن بطوطہ کو محل کے قریب رہنے اور بازاروں میں گھومنے کی اجازت دی، تین دن بعد شہنشاہ کے دربار میں خاتون بیالون نے اپنے ہندوستانی خادم کے ذریعے ابن بطوطہ کو بلایا۔ چار پھاٹکوں سے گزر کر جب پانچویں پھاٹک پر پہونچا تو ابن بطوطہ کی تلاشی لی گئی۔ دربار میں ایک یہودی ترجمان موجود تھا۔ ابن بطوطہ نے اس سے پوچھا کہ شہنشاہ کو سلام کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ تو اس نے کہا کہ اپنے قاعدے سے السلام علیکم کہو۔ بادشاہ نے ابن بطوطہ سے یروشلم گنبد صخرہ وغیرہ کا حال پوچھا۔ پھر بیت اللحم، خلیل، دمشق، قاہرہ، عراق اور اناطولیہ کے بارے میں سوالات کئے۔ شہنشاہ نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ ابن بطوطہ کی عزت کی جائے اور اسے شاہی حفاظت میں تصور کیا جائے۔ اس کے بعد جیسے خاندان شاہی کے افراد کے آگے چتر لگایا جاتا تھا، ابن بطوطہ کے آگے بھی لگایا جانے لگا۔ شہنشاہ نے ابن بطوطہ کو انعام و اکرام دیئے اور شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت دی۔ ابن بطوطہ نے قسطنطنیہ کی شان و شوکت اور مال و دولت کے ذکر کے علاوہ شہر کے متعلق مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اس نے بتایا کہ شہر کو شاخ زریں (Golden Horn) دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ مشرقی حصہ استنبول کہلاتا ہے۔ استنبول میں شہنشاہ اور امراء رہتے ہیں۔ بازار وسیع، سڑکیں کشادہ اور ان کے فرش پتھر کے ہیں۔ ہر بازار کا دروازہ رات کو بند کر دیا جاتا ہے۔ عموماً عورتیں سامان بناتی ہیں اور وہی فروخت کرتی ہیں۔ مغربی حصے کے بازاروں میں ابن بطوطہ نے بہت گندگی دیکھی۔ ابن بطوطہ نے سینٹ صوفیہ کا کلیسا دیکھا جسے شہنشا جسٹینین (Justinian) نے تعمیر کرایا تھا۔ ابن بطوطہ نے سابق شہنشاہ سے بھی جو تارک الدنیا راہب بن گیا تھا ملاقات کی۔ اس نے ابن بطوطہ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا زہے نصیب میں ان ہاتھوں کو چھو رہا ہوں جو یروشلم میں داخل ہو چکے ہیں، پھر ابن بطوطہ کے پیروں کو چھو کر اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ کیونکہ وہ پیر گنبد صخرہ اور بیت اللحم کی زمین کو چھو چکے تھے۔

خاتون بیالون نے اپنے وطن ہی میں رہنا پسند کیا۔ اس نے اسلام ترک کر کے عیسائیت اختیار کی۔ ابن بطوطہ کو بہت مال و سامان دے کر رخصت کیا۔ ابا سلطوق تک ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی کو پہونچانے ایک یونانی امیر آیا۔ ابن بطوطہ سلطان محمد اوزبک کے پاس پایہ تخت سرا میں پہونچا۔ سرا بہت وسیع اور بارونق شہر تھا۔ یہ استراخاں سے دو سو پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔

سارٹن کہتا ہے کہ سرا سے خوارزم، بخارا، سمرقند، بلخ، ہرات، طوس، نیشاپور، ہندوکش، غزنہ اور کابل ہوتا ہوا 12 ستمبر 1333ء کو ابن بطوطہ سندھ پہونچا۔ سندھ سے وہ دہلی گیا جہاں اس نے سات سال سلطان محمد ثانی ابن تغلق کے دربار میں گزارے۔ اس سلطان نے 1324ء سے 1351 تک حکومت کی۔ سلطان نے ابن بطوطہ کو دہلی کا مالکی قاضی مقرر کیا اور بعد میں چین جانے والے وفد کا امیر

مقرر کیا۔ (یہاں تیسری جلد ختم ہوئی)۔

خوارزم، بخارا، سمرقند، ترمذ

"خلاصہ تحفۃ النظار" کے بموجب سرا سے خوارزم جانے میں چالیس دن کی مسافت کا ایک صحرا پڑا۔ چارے کی قلت کی وجہ سے گھوڑوں کے بجائے اونٹ کرائے پر لیے اور گھوڑے سستے داموں بیچ دیئے۔ راستے میں گڑھوں میں کہیں کہیں بارش کا پانی ملا۔ جوں توں کر کے خوارزم پہونچے مگر وہاں پہونچ کر سفر کی ساری کوفت دور ہوگئی۔ خوارزم ترکوں کی مملکت کا سب سے خوب صورت شہر تھا۔ خوارزمی نہایت متدین اور مہمان نواز تھے۔ یہاں کے لوگ کوئلہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ایران اور ہندوستان میں بھی کوئلہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ البتہ چین میں پتھر کا کوئلہ جلایا جاتا تھا۔ خوارزم کے امیر نے ابن بطوطہ کو ایک ہزار درہم کا عطیہ دیا جس سے اس نے کئی گھوڑے خریدے۔ خوارزم سے بخارا جانے میں پھر ایک صحرا سے گزرنا پڑا۔ بخارا کے قریب پہونچے تو باغوں میں بہتی ہوئی نہروں کے نظاروں سے دل باغ باغ ہوگیا۔ اپنے عروج کے زمانے میں بخارا علوم دین کا مرکز تھا مگر چنگیز نے اسے تاراج کر دیا تھا۔ تعلیم کا چرچا باقی نہیں رہا تھا۔ نخشب کے چھوٹے سے قریہ میں ابن بطوطہ کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ بخارا کے سلطان نے ابن بطوطہ کو سو نقرئی دینار، ایک پوستین، دو گھوڑے اور دو اونٹ عطا کئے۔

سمرقند کو بھی تاتاریوں نے تباہ کر دیا۔ ایک بزرگ تو تم ابن العباس کے مزار پر (جنہیں تاتاریوں نے قتل کر دیا تھا) یکشنبہ اور پنجشنبہ کو شہر کے لوگ فاتحہ خوانی کے لیے جاتے تھے۔ یہاں سے بطوطہ کا قافلہ ترمذ پہونچا، ترمذ کو جو جیحون ندی کے کنارے آباد تھا چنگیز نے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ وہاں سے دو میل کے فاصلے پر نیا ترمذ آباد کیا گیا۔ باغ لگائے گئے اور نہریں جاری کیں۔ چنانچہ وہاں بہترین انگور پیدا ہونے لگا۔ ترمذ کے لوگ سر کے بالوں کو دودھ سے دھوتے تھے۔

بلخ، ہرات، مشہد، نیشاپور

دریائے جیحون کو پار کر کے ریگستان سے گزر کر قافلہ بلخ پہونچا۔ بلخ کے بارے میں چنگیز کو بتایا گیا تھا کہ یہاں کے گھروں میں خزانے گڑے ہوئے ہیں۔ اس نے بے شمار مکان کھدوا دیئے۔ بہت سی مسجدیں بھی خزانوں کی تلاش میں منہدم کی گئیں مگر کوئی خزانہ نہ ملا۔ جب ابن بطوطہ بلخ گیا ہے تو اسے ویران پایا۔ یہاں سے قافلہ ہرات گیا جو اس وقت خراساں کا سب سے زیادہ آباد شہر

تھا۔ ہرات سے قافلہ جام پہونچا وہاں شہتوت کے درخت بکثرت تھے اور ریشم پیدا کیا جاتا تھا' وہاں سے طوس اور پھر مشہد میں قافلہ ٹھہرا۔ مشہد میں حضرت امام علی الرضا کا عالی شان مقبرہ ہے۔ اس کے سامنے ہی خلیفہ ہارون رشید کا مزار ہے جس کی شیعہ لوگ بے حرمتی کرتے ہیں۔ مشہد کے جنوب میں زوا ہے جہاں شیخ قطب الدین حیدر کے مرید بہت پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کے درویش ہاتھوں میں لوہے کی چوڑیاں اور کانوں میں لوہے کی بالیاں پہنتے ہیں۔ وہاں سے ابن بطوطہ نیشاپور گیا جہاں میوہ کے درخت اور نہریں بکثرت تھیں۔ نیشاپور کو اس کی رونق اور شادابی کی وجہ سے دمشق صغیر کہتے تھے۔ یہاں ریشم اور مخمل تیار کر کے ہندوستان بھیجتے تھے۔ ابن بطوطہ شیخ قطب الدین نیشاپوری کی خانقاہ میں ٹھہرا۔ اس نے شیخ کے کشف و کرامت کا حال بیان کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے بسطام' قندوز اور بغلان کے متبرک مقامات کی زیارت کی۔ بغلان سے وہ اندراب پہونچا جہاں ہندوکش پہاڑ پار کرانے کے لیے ایک رہبر ساتھ لیا۔

ہندوکش' غزنی' کابل

ہندوکش پہاڑ کو ہندوکش کیوں کہتے ہیں' اس کی وجہ ابن بطوطہ نے یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کی گرم آب و ہوا کے عادی لوگ اور بالخصوص بچے جب اس پہاڑ سے گزرتے تو سخت سردی کی وجہ سے اکثر مر جاتے تھے۔ چنانچہ یہ پہاڑ ہندوکش کہلانے لگا۔ ابن بطوطہ کا قافلہ موسم گرما کے آغاز میں خاوک کے راستے پہاڑ سے گزرا۔ اونٹوں کے پیروں کے نیچے نمدے بچھا دیئے گئے تھے تاکہ برف میں نہ دھنسیں۔ پروان اور کچھ اور مقامات سے گزر کر قافلہ غزنی پہونچا۔ سلطنت غزنویہ ختم ہونے کے بعد یہ شہر ویران ہو گیا تھا۔ یہاں بہت سردی پڑتی ہے اس لیے جاڑوں میں یہاں کے لوگ قندھار منتقل ہو جاتے تھے۔ غزنی سے قافلہ کابل پہونچا جو ایک معمولی قصبہ تھا۔ وہاں کے لوگوں کا پیشہ عموماً راہزنی تھا۔ کابل سے قافلہ کرماش گیا۔ راستے میں افغانوں سے تصادم ہوا۔ سندھ کا صحرا پندرہ دن میں طے کیا۔ بادسموم کے تھپیڑے کھا کر بالآخر محرم 734ھ مطابق 12 ستمبر 1333ء کو پنجاب میں دریائے سندھ پر ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی پہونچے۔ ہندوستان کے محکمہ خبر رسانی نے ملتان کے گورنر کو کارواں کے آنے کی اطلاع بھیجی۔

ہندوستان خطوط رسانی کے دو طریقے

سندھ سے دہلی کا سفر پچاس دن کا ہے لیکن محکمہ برید (ڈاک) پانچ دن میں خطوط سلطان کو پہونچا دیتا ہے۔ خطوط رسانی کے دو طریقے ہیں۔ ایک گھوڑوں کے ذریعہ اور دوسرا پیدل ہرکاروں کے

ذریعہ۔ پہلے طریقے میں ہر چار میل پر گھوڑے بدلے جاتے ہیں اور دوسرے طریقے میں ہر تہائی میل پر ہرکارے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ ہرکاروں کے ذریعے خطوط کم وقت میں پہونچ جاتے۔ خراسان کے تازہ پھل بھی سلطان تک انہی طریقوں سے پہونچائے جاتے تھے۔ جب سلطان محمد بن تغلق دولت آباد میں ہوتا تو اس کے لیے گنگا کا پانی بھی اسی طرح بھیجا جاتا۔ نوواردوں کی ان کی حیثیت کے مطابق خاطر تواضع کی جاتی۔

پنجاب کی ایک ندی پار کرتے ہوئے ابن بطوطہ نے اپنی زندگی میں پہلی بار گینڈا دیکھا۔ ہرات کے قاضی اور مشہور عالم علماء الملک خراسانی سے ابن بطوطہ کی ملاقات ہوئی۔ اسے سلطان محمد بن تغلق نے سندھ میں لاہری کا گورنر مقرر کر دیا تھا (لاہری کے کھنڈر کراچی سے اٹھائیس میل جنوب مشرق میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔) لاہری کی بندرگاہ میں یمن و فارس وغیرہ کے جہاز موجود تھے۔ خود گورنر کے پندرہ جہاز تھے۔ لاہری کے گورنر سے ملنے کے بعد ابن بطوطہ ملتان کے گورنر قطب الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب ابن بطوطہ نے سلطان محمد کی ملازمت کرنے کا خیال ظاہر کیا تو اسے دہلی جانے کی اجازت مل گئی۔ دہلی کا سفر چالیس دن کا تھا۔ اجودھن (پاک پٹن) میں شیخ فریدالدین نامی بزرگ سے ملاقات کی۔ ابن بطوطہ نے ایک ہندو عورت کو ستی ہوتے یعنی زندہ جلتے دیکھا تو قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گھوڑے سے گر پڑے' ایک ساتھی نے اسے سنبھال لیا۔ سلطان کی اجازت حاصل کئے بغیر کوئی ہندو بیوہ ستی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے خاندان والے یا پنڈت اسے مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی مرضی سے عورتیں آگ میں کود پڑتی تھیں۔

ابن بطوطہ کا دہلی میں قیام

مسعود آباد (جو دہلی سے دس میل پر تھا) پہونچ کر ابن بطوطہ نے تین دن قیام کیا۔ سلطان دہلی میں نہ تھا۔ وزیر نے شہر کے قاضی کو ابن بطوطہ کے مسعود آباد میں قیام کی اطلاع دی۔ قاضی اور کچھ علماء اور امرا ابن بطوطہ کو لینے آئے۔ دہلی کی وسعت و شوکت کو دیکھ کر ابن بطوطہ نے کہا کہ تمام دنیائے اسلام میں دہلی سب سے بڑا اور پر رونق شہر ہے۔ (سلطان کی والدہ نے ابن بطوطہ کی جو دعوت کی تھی اس کا حال ابن بطوطہ نے مفصل بیان کیا ہے۔ "خلاصہ تحفتہ النظار" میں یہ بیان نہیں درج کیا گیا لیکن سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی تصنیف "تمدنی جلوے" میں جو 1963ء میں معارف پریس اعظم گڑھ بھارت میں چھپی ہے' اس دعوت کا حال "سفر نامہ ابن بطوطہ" سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیالے' رکابیاں' لوٹے اور گھڑے سب سونے کے تھے۔ پہلے شربت لایا گیا۔ جب مہمان شربت پی چکے تو حاجبوں نے بسم اللہ کہا اور کھانا شروع ہوا۔ کھانے کے بعد نبیذ کا دور چلا۔ پھر پان تقسیم ہوئے۔ پھر حاجبوں نے بسم اللہ کہا تو لوگ دسترخوان سے اٹھے۔ مہمانوں کو زر بفت

تھا۔ ہرات سے قافلہ جام پہونچا وہاں شہتوت کے درخت بکثرت تھے اور ریشم پیدا کیا جاتا تھا، وہاں سے طوس اور پھر مشہد میں قافلہ ٹھہرا۔ مشہد میں حضرت امام علی الرضا کا عالی شان مقبرہ ہے۔ اس کے سامنے ہی خلیفہ ہارون رشید کا مزار ہے جس کی شیعہ لوگ بے حرمتی کرتے ہیں۔ مشہد کے جنوب میں زوا ہے جہاں شیخ قطب الدین حیدر کے مرید بہت پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کے درویش ہاتھوں میں لوہے کی چوڑیاں اور کانوں میں لوہے کی بالیاں پہنتے ہیں۔ وہاں سے ابن بطوطہ نیشاپور گیا جہاں میوہ کے درخت اور نہریں بکثرت تھیں۔ نیشاپور کو اس کی رونق اور شادابی کی وجہ سے دمشق صغیر کہتے تھے۔ یہاں ریشم اور مخمل تیار کرکے ہندوستان بھیجتے تھے۔ ابن بطوطہ شیخ قطب الدین نیشاپوری کی خانقاہ میں ٹھہرا۔ اس نے شیخ کے کشف و کرامت کا حال بیان کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے بسطام، قندوز اور بغلان کے متبرک مقامات کی زیارت کی۔ بغلان سے وہ اندراب پہونچا جہاں ہندوکش پہاڑ پار کرانے کے لیے ایک رہبر ساتھ لیا۔

ہندوکش، غزنی، کابل

ہندوکش پہاڑ کو ہندوکش کیوں کہتے ہیں، اس کی وجہ ابن بطوطہ نے یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کی گرم آب و ہوا کے عادی لوگ اور بالخصوص بچے جب اس پہاڑ سے گزرتے تو سخت سردی کی وجہ سے اکثر مر جاتے تھے۔ چنانچہ یہ پہاڑ ہندوکش کہلانے لگا۔ ابن بطوطہ کا قافلہ موسم گرما کے آغاز میں خاوک کے راستے پہاڑ سے گزرا۔ اونٹوں کے پیروں کے نیچے نمدے بچھا دیئے گئے تھے تاکہ برف میں نہ دھنسیں۔ پروان اور کچھ اور مقامات سے گزر کر قافلہ غزنی پہونچا۔ سلطنت غزنویہ ختم ہونے کے بعد یہ شہر ویران ہو گیا تھا۔ یہاں بہت سردی پڑتی ہے اس لیے جاڑوں میں یہاں کے لوگ قندھار منتقل ہو جاتے تھے۔ غزنی سے قافلہ کابل پہونچا جو ایک معمولی قصبہ تھا۔ وہاں کے لوگوں کا پیشہ عموماً راہزنی تھا۔ کابل سے قافلہ کرماش گیا۔ راستے میں افغانوں سے تصادم ہوا۔ سندھ کا صحرا پندرہ دن میں طے کیا۔ بادسموم کے تھپیڑے کھا کر بالآخر محرم 734ھ مطابق 12 ستمبر 1333ء کو پنجاب میں دریائے سندھ پر ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی پہونچے۔ ہندوستان کے محکمہ خبر رسانی نے ملتان کے گورنر کو کارواں کے آنے کی اطلاع بھیجی۔

ہندوستان خطوط رسانی کے دو طریقے

سندھ سے دہلی کا سفر پچاس دن کا ہے لیکن محکمہ برید (ڈاک) پانچ دن میں خطوط سلطان کو پہونچا دیتا ہے۔ خطوط رسانی کے دو طریقے ہیں۔ ایک گھوڑوں کے ذریعہ اور دوسرا پیدل ہرکاروں کے

ذریعہ۔ پہلے طریقے میں ہر چار میل پر گھوڑے بدلے جاتے ہیں اور دوسرے طریقے میں ہر تہائی میل پر ہرکارے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ ہرکاروں کے ذریعے خطوط کم وقت میں پہونچ جاتے۔ خراسان کے تازہ پھل بھی سلطان تک انہی طریقوں سے پہونچائے جاتے تھے۔ جب سلطان محمد بن تغلق دولت آباد میں ہوتا تو اس کے لیے گنگا کا پانی بھی اسی طرح بھیجا جاتا۔ نوواردوں کی ان کی حیثیت کے مطابق خاطر تواضع کی جاتی۔

پنجاب کی ایک ندی پار کرتے ہوئے ابن بطوطہ نے اپنی زندگی میں پہلی بار گینڈا دیکھا۔ ہرات کے قاضی اور مشہور عالم علماء الملک خراسانی سے ابن بطوطہ کی ملاقات ہوئی۔ اسے سلطان محمد بن تغلق نے سندھ میں لاہری کا گورنر مقرر کر دیا تھا (لاہری کے کھنڈر کراچی سے اٹھائیس میل جنوب مشرق میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔) لاہری کی بندرگاہ میں یمن و فارس وغیرہ کے جہاز موجود تھے۔ خود گورنر کے پندرہ جہاز تھے۔ لاہری کے گورنر سے ملنے کے بعد ابن بطوطہ ملتان کے گورنر قطب الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب ابن بطوطہ نے سلطان محمد کی ملازمت کرنے کا خیال ظاہر کیا تو اسے دہلی جانے کی اجازت مل گئی۔ دہلی کا سفر چالیس دن کا تھا۔ اجودھن (پاک پٹن) میں شیخ فریدالدین نامی بزرگ سے ملاقات کی۔ ابن بطوطہ نے ایک ہندو عورت کو ستی ہوتے یعنی زندہ جلتے دیکھا تو قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گھوڑے سے گر پڑے، ایک ساتھی نے اسے سنبھال لیا۔ سلطان کی اجازت حاصل کئے بغیر کوئی ہندو بیوہ ستی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے خاندان والے یا پنڈت اسے مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی مرضی سے عورتیں آگ میں کود پڑتی تھیں۔

ابن بطوطہ کا دہلی میں قیام

مسعود آباد (جو دہلی سے دس میل پر تھا) پہونچ کر ابن بطوطہ نے تین دن قیام کیا۔ سلطان دہلی میں نہ تھا۔ وزیر نے شہر کے قاضی کو ابن بطوطہ کے مسعود آباد میں قیام کی اطلاع دی۔ قاضی اور کچھ علماء اور امرا ابن بطوطہ کو لینے آئے۔ دہلی کی وسعت و شوکت کو دیکھ کر ابن بطوطہ نے کہا کہ تمام دنیائے اسلام میں دہلی سب سے بڑا اور پر رونق شہر ہے۔ (سلطان کی والدہ نے ابن بطوطہ کی جو دعوت کی تھی اس کا حال ابن بطوطہ نے مفصل بیان کیا ہے۔ "خلاصہ تحفۃ النظار" میں یہ بیان نہیں درج کیا گیا لیکن سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی تصنیف "تمدنی جلوے" میں جو 1963ء میں معارف پریس اعظم گڑھ بھارت میں چھپی ہے، اس دعوت کا حال "سفر نامہ ابن بطوطہ" سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیالے، رکابیاں، لوٹے اور گھڑے سب سونے کے تھے۔ پہلے شربت لایا گیا۔ جب مہمان شربت پی چکے تو حاجبوں نے بسم اللہ کہا اور کھانا شروع ہوا۔ کھانے کے بعد نبیذ کا دور چلا۔ پھر پان تقسیم ہوئے۔ پھر حاجبوں نے بسم اللہ کہا تو لوگ دسترخوان سے اٹھے۔ مہمانوں کو زر بفت

کے خلعت دیئے گئے ۔جب مہمان محل کے دروازے پر آئے تو حاجبوں نے پھر بسم اللہ کہا سب لوگ ٹھہر گئے ۔ محل کے اندر سے ریشم کتان کے اور سوتی تھان آئے جو سب مہمانوں میں تقسیم ہوئے ۔ اس کے بعد خشک میوے کی ایک طلائی سینی آئی پھر دو اور سینیاں لائی گئیں ۔ ایک میں گلاب اور دوسرے میں پان تھے ۔ وزیر نے بتایا کہ مہمان خصوصی سینی کو ایک ہاتھ میں لے کر دوسرے ہاتھ سے زمین کو چھوتا ہے ۔چنانچہ ابن بطوطہ نے ایسا ہی کیا۔

ابن بطوطہ کو سلطان نے فرقہ مالکی کا قاضی مقرر کیا اور پانچ ہزار دینار سالانہ آمدنی کے گاؤں اسے عطا کئے ۔جب اودھ کے گورنر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے سلطان گیا تو ابن بطوطہ اس کے ساتھ تھا ۔ ابن بطوطہ نے سلطان مستمہ شیخ شہاب الدین سے جو سلطان محمد بن تغلق کا مخالف تھا ' ایک غار میں جا کر ملاقات کی' جس کے باعث مورد عتاب ہوا ۔ ابن بطوطہ نے مسلسل پانچ روز کا روزہ رکھا اور پانی کے علاوہ کچھ نہ کھایا پیا ۔ پھر ایک اور روزہ چار دن کا رکھا ۔ اُسی اثنا میں شیخ شہاب الدین کا انتقال ہوگیا اور ابن بطوطہ رہا کر دیا گیا ۔ ابن بطوطہ امام کمال الدین کے حلقہ میں شامل ہو کر دنیا سے کنارہ کش ہو گیا ۔سلطان نے طلب کر کے اسے سابقہ ملازمت پر بحال کرنا چاہا مگر ابن بطوطہ نے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت چاہی ۔ اوائل دسمبر 1341ء میں سلطان نے اجاز دے دی ۔ لیکن پھر ابن بطوطہ سے کہا کہ وہ سفیر بن کر چین جائے ۔ وہ 22 جولائی 1342ء کو چین کے لیے نکلا ۔ کچھ ہندو باغیوں نے جلالی پر جو علی گڑھ کے قریب ہے ' حملہ کیا ۔ ابن بطوطہ کے ساتھ جو شاہی قافلہ تھا ' اس نے باغیوں کو مار بھگایا ۔ سلطان کو اطلاع ہوئی تو اس قافلے کو وہیں ٹھہرنے کا حکم دے دیا ۔ ایک دن پھر باغیوں نے حملہ کیا ۔ ابن بطوطہ کو پکڑ کر سارا سامان چھین لیا ۔ کئی دن تک بھوکا پیاسا بھٹکتا رہا آخر کار ایک گاؤں میں پہونچا جہاں کے مقامی حاکم دلشاد نے اس کی مدد کی ۔ یہ وہی ہے جس سے ہندوستان میں ملنے کی شیخ مرشدی نے فوّا کے مقام پر پیش گوئی کی تھی۔

جنوبی ہند کے حالات

سارٹن لکھتا ہے کہ جب ہندوؤں نے ابن بطوطہ کو پکڑ لیا تو وہ چین کی سفارت سے دست بردار ہوگیا ۔جب چھوٹا تو گوالیار ' اُجینؔ ' دولت آباد ' کیمبے ' کالی کٹ ہوتا ہوا جزائر مالدیپ پہونچا جہاں وہ قاضی مقرر کیا گیا ۔ اٹھارہ مہینے رہ کر سیلون گیا مگر پھر مالدیپ واپس آیا ۔ وہاں سے بنگال اور سماترا ہوتا ہوا بالآخر وہ چین کی سب سے بڑی بندرگاہ زیتون پہونچا ۔ اس میں چین کے متعدد شہروں مثلاً کینٹن اور پیکنگ دیکھے ۔ اس نے چین کی صنعتوں اور رسم و رواج کا حال مفصل لکھا ہے ۔ چین سے پھر سماترا واپس ہوا ۔ " خلاصہ تحفۃ النظار " سے ان سفیروں کے بارے میں کچھ تفصیلات فراہم کرنا مناسب ہو گا۔

قنوج اور گوالیار ' مرتھ ' اُجینؔ وغیرہ ہوتا ہوا ابن بطوطہ کا وفد دولت آباد پہونچا ۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ مرتھ کے ہندو مضبوط جسم کے تھے اور ان کی عورتیں بہت حسین تھیں ۔ دولت آباد ابھی زیر تعمیر تھا ۔ وہاں سے مرہٹوں کے علاقے سے گزرتا ' ساگر ہوتا ہوا کمبے پہونچا ۔ مرہٹوں کی عورتیں بھی بہت خوبصورت تھیں ۔ اس علاقے کے ہندو گوشت اور شراب سے سخت پرہیز کرتے تھے ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی شراب سے نفرت تھی ۔ اگر کبھی کوئی پی لیتا تو اس کے اسی درے لگاتے اور تین مہینے قید میں رکھتے ۔ کمبے میں خوبصورت مسجدیں تھیں ۔ کمبے سے ہندوؤں کے علاقوں سے گزرتا ہوا جہاز سے سند پور پہونچا (سند پور اب گوا (Goa) کہلاتا ہے) ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہاں جزر کے وقت جب سمندر کا پانی ہٹ جاتا تو نیچے جو پانی رہ جاتا وہ میٹھا اور پینے کے قابل ہوتا ۔سند پور سے وفد ہوناور پہونچا ۔ وہاں کی عورتیں قرآن حفظ کرتی تھیں اور وہاں تیرہ مدرسے لڑکیوں کے اور تیئیس لڑکوں کے تھے ۔ وہاں کے سلطان کا نام جمال الدین تھا ۔یہاں روٹی کے بجائے چاول کھائے جاتے تھے ۔ وفد کا جہاز جب ملیبار کے ساحل پر جا لگا تو ابن بطوطہ کو اس علاقے کے رسم و رواج سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا ۔ ملیباری ہندو مسلمانوں کو اپنے گھر میں داخل ہونے نہیں دیتے تھے ۔ مسلمانوں کو کیلوں کے پتوں پر کھانا دیتے اور پانی اوک سے پینا پڑتا ۔ یہ علاقہ بہت سرسبز تھا ۔ ناریل کے درخت بے شمار تھے اور گنا بھی بہت پیدا ہوتا تھا ۔ مسلمان تاجروں نے جگہ جگہ مکانات بنا لیے تھے ۔ دولت مند لوگ ڈولی میں جاتے ' راجہ گھوڑے پر اور عوام پیدل ۔ کوئی سامان جانوروں پر نہیں لادا جاتا تھا بلکہ آدمی ہی بار برداری کا کام کرتے تھے ۔ کہیں چوری نہیں ہوتی تھی ۔ مسلمانوں کی بڑی عزت تھی ' راجہ کا بیٹا راجہ نہیں بنتا تھا بلکہ راجہ کی بہن کے بیٹے کو گدی ملتی تھی ۔ ہر جگہ سلطان ہند کے وفد کی بڑی قدر و منزلت ہوئی ۔ منجرور (منگلور) میں فارس اور یمن کے سوداگر کالی مرچ اور ادرک خریدنے بکثرت آتے تھے ۔ شہر میں چار ہزار مسلمان آباد تھے ۔ منگلور سے وفد کا جہاز ہیلی پہونچا ۔یہاں کی جامع مسجد کا ہندو بھی احترام کرتے اور نذرانے چڑھاتے تھے ۔ واہ پٹن میں راجہ کے دادا کی بنائی ہوئی مسجد تھی ۔ وہ راجہ مسلمان ہوگیا تھا ۔جب ابن بطوطہ واہ پٹن پہونچا تو وہاں برہمنوں کو مسلمانوں کا سخت دشمن پایا ۔ پندیرانی میں مسلمانوں کی تین مسجدیں تھیں اور وہ تین محلوں میں آباد تھے ۔ یہاں سے وفد قال قوت (کالی کٹ) پہونچا جو دنیا کی بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی ۔جب سلطان کا وفد بندرگاہ میں پہونچا تو راجہ کے نمائندے نے پرجوش خیر مقدم کیا اور پر تکلف دعوت دی ۔ موافق ہوا کے انتظار میں وفد کالی کٹ میں تین مہینے ٹھہرا اور راجہ کا مہمان رہا (سارٹن کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ جلالی ضلع علی گڑھ میں ہندوؤں کے گرفتار کرنے پر ابن بطوطہ سفارت سے دستبردار ہوگیا تھا ۔ سفارتی وفد کالی کٹ تک آیا ۔ مگر طوفان نے اسے تتر بتر کر دیا اور تحائف تلف ہوگئے ۔ تب مجبوراً ابن بطوطہ جزائر مالدیپ چلا گیا ۔ جس کا ذکر آگے آئے گا)۔

بڑے جہاز جنک ' درمیانی ڈھو اور چھوٹے لکم کہلاتے تھے ۔ بڑے جہاز پر ایک ہزار آدمی

سوار ہوتے ۔ ان پر چار عرشے ہوتے ۔ ہر عرشے پر چھوٹے کمرے اور حمام ہوتے جن میں مسافر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ۔ ملاح بھی اپنے بیوی بچے ساتھ لے جاتے تھے ۔ لوگ جہاز پر لکڑی کے بکسوں میں مٹی بھر کے ترکاریاں پیدا کر لیتے ۔ ہر جہاز پر مسلح سپاہی بھی جاتے ۔ جس چینی جہاز میں وفد روانہ ہوا اس کا عامل سلیمان صفدی تھا ۔ اس نے جو کمرہ ابن بطوطہ کو دیا ' اس کے ساتھ حمام نہ تھا ۔ جب ابن بطوطہ نے شکایت کی تو عامل نے کہا کہ تاجروں نے بڑے کمرے آنے جانے کا کرایہ دے کر پہلے سے محفوظ کرا لیے تھے اس لیے کوئی اچھا کمرہ باقی نہ رہا تھا ۔ صفدی نے مشورہ دیا کہ ابن بطوطہ چھوٹے جہاز میں اپنے سامان اور غلاموں اور کنیزوں کو لے کر آرام سے سفر کرے ۔ ابن بطوطہ نے اس مشورے پر عمل کیا ۔ ابھی ابن بطوطہ چھوٹے جہاز پر سوار بھی نہ ہوا تھا کہ سخت طوفان آیا ' جس کی وجہ سے ایک بڑا جہاز جو ابھی ساحل ہی پر تھا ' ساحل سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور وفد کا چھوٹا جہاز ساحل سے دور بہہ گیا اور اس کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا کہ کہاں چلا گیا ۔ ایک خبر یہ ملی کہ سارے تحائف اور لونڈی غلام ڈوب گئے ۔ ابن بطوطہ ہونادر پہونچا اور وہاں کے سلطان جمال الدین سے ملا اور جمال الدین کے ساتھ گوا (Goa) پر فوج کشی میں شریک ہوا ۔ جمال الدین نے گوا کے راجہ کو شکست دے کر گوا فتح کیا ۔ ابن بطوطہ پھر کالی کٹ پہونچا تو گمشدہ ملاحوں میں سے دو سے ملاقات ہوئی ۔ انہوں نے بتایا کہ جہاز پر جو سامان تھا اس پر مختلف آدمیوں نے قبضہ کر لیا ۔ کنیزوں کو سماترا کے فرماں روا نے پکڑ لیا اور باقی سب لوگ تتر بتر ہو گئے ۔ یہ خبر پا کر ابن بطوطہ پھر گوا گیا ۔ جس راجہ کو ہرا کر سلطان جمال الدین نے گوا پر قبضہ کیا تھا ' اس نے گوا پر فوج کشی کی ۔ ابن بطوطہ اور دوسرے مسلمانوں کو قلعہ بند ہونا پڑا ۔ کسی طرح قلعہ سے نکل کر ابن بطوطہ پھر کالی کٹ پہونچا ۔ وہاں سے جہاز کے ذریعے دس دن میں جزائر مالدیپ پہونچا ۔

جزائر مالدیپ کے حالات

ان جزیروں کی تعداد دس ہزار ہے ۔ بارہویں صدی میں یہاں کے باشندے مسلمان ہو گئے تھے ۔ ابن بطوطہ نے ان کو راست باز اور متدین پایا ۔ جزیرے بارہ صوبوں میں منقسم تھے ۔ مہل کے صوبے میں سلطان رہتا تھا ۔ اس صوبے کے نام کی وجہ سے یہ جزیرے ذیب المہل کہلانے لگے تھے ۔ ان جزائر کے صرف ایک صوبے میں اناج کی کاشت ہوتی تھی کیونکہ اناج کم کھایا جاتا تھا ۔ لوگ عموماً مچھلی اور ناریل کھاتے تھے ۔ یہ دونوں چیزیں یمن اور ہندوستان بھی بھیجی جاتی تھیں ۔ لوگ نحیف الجثہ اور صلح پسند تھے ۔ ان کی کوئی فوج تھی اور نہ ہی وہ لڑنا جانتے تھے ۔ ان کے یہاں قید خانے بھی نہ تھے ۔ سڑکوں کے دونوں طرف پیڑ لگے ہوئے تھے اور سڑکوں پر جھاڑو دی جاتی تھی ۔ مسجدوں کو صاف ستھرا رکھتے ۔ گرمی کی وجہ سے سب لوگ دن میں دو دفعہ نہاتے ' مردتہ بند باندھ کر اوپر سے ایک کپڑا اوڑھ لیتے ۔ عورتیں ہاتھ اور بازو کھلے رکھتیں ۔ اکثر کمر سے اوپر کا حصہ بھی برہنہ رکھتیں ۔ جوتے

پہننے کا رواج نہیں تھا ۔ کوڑیوں سے خرید و فروخت کرتے ۔ ایک طلائی دینار میں چار لاکھ کوڑیاں آتیں ۔ عورتیں بہت کم مہر پر شادی کر لیتیں ۔ مسافر جو تھوڑے دنوں کے لیے آتے ان سے بھی شادی کر لیتیں ۔ جب وہ جانے لگتے تو ان کے ساتھ جانے کی بجائے ان سے طلاق لے لیتیں ۔ کاغذ یہاں صرف قرآن مجید اور مذہبی کتابیں لکھنے کے لیے استعمال ہوتا ۔ اس کے علاوہ کچھ لکھنا ہوتا تو ناریل کے پتوں پر لکھتے ۔ ناریل کے ریشوں کو سڑا کر رسے بناتے جنہیں قیر کہتے ' یہ بہت مضبوط ہوتے تھے اور جہازوں کے تختوں کو جوڑنے کے کام آتے تھے ۔ جزیروں کی حکمراں خدیجہ نامی سلطانہ تھی ۔ اس کا شوہر جمال الدین نام کے لیے وزیر مگر سیاہ و سفید کا مالک تھا ۔ اس نے چاہا کہ ابن بطوطہ ان کی بیوہ لڑکی سے شادی کرلے ۔ اس لڑکی کی دو بار شادی ہو چکی تھی ۔ مگر دونوں بار شب زفاف سے پہلے شوہر مر گئے تھے ۔ ابن بطوطہ اس منحوس سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوا ۔ وزیر سلیمان کی لڑکی سے ابن بطوطہ کی شادی طے ہوئی ۔ جب مہمان جمع ہو گئے تو لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا ۔ وزیر نے سلطانہ خدیجہ کی ایک رشتے دار لڑکی سے شادی کرا دی اور خود جہیز دیا ۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ وہ بہترین عورت تھی ۔ جمال الدین نے ابن بطوطہ کو منصب قضا قبول کرنے پر مجبور کیا ۔ وہاں کے معززین کی بیٹیوں سے ابن بطوطہ نے تین اور شادیاں کیں ۔ وزیر جمال الدین جو اس بات سے ناراض تھا کہ اس کی لڑکی سے شادی نہیں کی تھی ' بالآخر ابن بطوطہ کا دشمن ہوگیا ۔ ابن بطوطہ نے مالدیپ سے چلا جانا مناسب سمجھا ۔ 22 اگست 1344ء کو وہ معبر (کورمنڈل ساحل) کے لیے روانہ ہوگیا مگر اس کا جہاز لنکا جا پہونچا ۔ چار مہینے بعد معلوم ہوا کہ جمال الدین کا انتقال ہو گیا ۔

لنکا کے حالات

ابن بطوطہ جزائر مالدیپ سے معبر جانے کے خیال سے چلا تھا مگر اس کا جہاز سیلون کے ایری چکرورتی راجہ کی ایک بندرگاہ میں جا پہنچا ۔ اس جزیرے کا قدیم سنسکرت نام سیلون تھا ۔ عربوں نے اس کو جزیرہ سراندیپ کہا ہے ۔ سیلون سے معبر کا چوبیس گھنٹے کا سفر تھا ۔ ابن بطوطہ نے راجہ سے کہا کہ وہ معبر کے سلطان کا بہنوئی ہے ۔ دراصل وہ ہم زلف تھا ۔ راجہ نے بہت خاطر مدارت کی ۔ راجہ فارسی جانتا تھا ' ابن بطوطہ نے فارسی میں اس سے گفتگو کی اور مختلف ممالک کے حالات بتائے ۔ راجہ ابن بطوطہ سے بہت خوش ہوا اور جب ابن بطوطہ نے کوہ سراندیپ پر جا کر حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم کی زیارت کرنا چاہی تو راجہ نے اپنے محافظ دستہ کے ساتھ اسے بھجوایا ۔ ابن بطوطہ سے پہلے شیخ ابو عبداللہ قدم آدم کی زیارت کر چکے تھے ۔ ان کی کرامت سے ہاتھی جو وہاں کے جنگل میں بڑی تعداد میں رہتے تھے ' زائرین کی راہ میں حائل نہیں ہوتے ہیں ۔ ابن بطوطہ پچیس تیس آدمیوں کے ساتھ زیارت کو چلا ۔ بیچ میں کئی شہر پڑے ۔ شہر کو رونگالہ کے باہر شیخ عثمان شیرازی (چاؤش) کی مسجد ہے ۔ شیخ کی قبر کی زیارت کو بہت لوگ اور خود بادشاہ آتا ہے ۔ کوہ سراندیپ بہت اونچا ہے ۔

ابن بطوطہ اور اس کے ساتھ جب چوٹی پر پہونچے تو بادل ان سے نیچے رہ گئے۔ اوپر چڑھنے کا راستہ راہ بابا اور اترنے کا راستہ راہ ماما حوا کہلاتا تھا۔ چڑھنے کے راستے میں مشکل جگہوں پر زنجیریں لٹکا دی گئیں تھیں۔ قدم کا نشان ایک چٹان پر ہے۔ اس کی لمبائی گیارہ بالشت ہے اور نقش کافی گہرا ہے۔ قدیم زمانہ میں چینی اس چٹان سے انگوٹھے کا نشان کاٹ لے گئے تھے اور شہر زیتون کے بت خانے میں تبرکاً نصب کر دیا تھا۔ ماما حوا کی سڑک سے ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی واپس آئے۔ پہاڑ کے نیچے یاقوت کی کان کا بڑا تالاب تھا۔ دیوندرا' اور کلان بو (کولمبو) وغیرہ ہوتا ہوا ابن بطوطہ راجہ ایری چکرورتی کے پاس واپس پہونچا اور پھر معبر چلا گیا۔ مولوی عبدالرحمٰن خان کوہ سراندیپ کے بارے میں اس معلومات کا اضافہ کرتے ہیں کہ اس کی سب سے اونچی چوٹی حالیہ پیمائش کے مطابق آٹھ ہزار دو سو چھیانوے فٹ ہے اور جس چوٹی پر حضرت آدم کے قدم کا نشان ہے' اس کی اونچائی سات ہزار تین سو باون فٹ ہے۔

ابن بطوطہ کہتا ہے کہ سیلون کے علاوہ اس نے دنیا میں کہیں اور سفید ہاتھی نہیں دیکھے۔ جس ساحل پر ابن بطوطہ کا جہاز سیلون میں آ کر ٹھہرا تھا' وہاں دارچینی کے درخت بکثرت پائے جاتے تھے۔ معبر اور ملیبار کے لوگ ان درختوں کو جو پانی کے سیلاب میں بہہ آتے تھے' مفت اپنے وطن لے جاتے تھے۔ سیلون میں تقریباً ہر جگہ لعل پائے جاتے ہیں۔ نیلم اور پکھراج کی بھی کانیں ہیں۔ سیلون کے بندروں کا رنگ کالا ہوتا ہے اور نر بندر کے ڈاڑھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے سردار کی پوری اطاعت کرتے ہیں۔ کسی سے کوئی قصور ہوتا ہے تو اسے باقاعدہ سزا دی جاتی ہے۔

ساحل کورومنڈل (معبر) پر مسلمانوں کی حکومت

ہندوستان کا یہ جنوبی حصہ 1311ء میں سلطان ہند کے قبضہ میں آچکا تھا۔ غیاث الدین دامغانی یہاں کا گورنر تھا۔ جب ابن بطوطہ دہلی میں تھا تو اس نے دامغانی کی بیوی کی بہن سے شادی کی تھی۔ بنا بریں ابن بطوطہ نے خود کو سیلون میں معبر کے حاکم کا بہنوئی یا ہم زلف بتایا تھا۔ جب ابن بطوطہ غیاث الدین کے دربار میں پہونچا تو اس کی بڑی آؤبھگت ہوئی۔ ابن بطوطہ نے غیاث الدین کو مشورہ دیا کہ جزائر مالدیپ کو اپنی حکومت میں شامل کرے۔ مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے غیاث الدین اپنی فوج وہاں نہ بھیج سکا۔ غیاث الدین کے ساتھ ابن بطوط فتن (نگاپٹن) گیا۔ فتن کی بندرگاہ بہت بڑی تھی۔ شہر میں ایک بہت بڑی مسجد تھی۔ وہاں ابن بطوطہ نے شیخ محمد نیشاپوری سے ملاقات کی۔ شیخ نے ایک شیر ببر پال رکھا تھا جو ایک ہرن کے ساتھ رہتا تھا۔ فتن سے ابن بطوطہ جدورا گیا جو معبر کا دارالحکومت تھا۔ وہاں غیاث الدین طاعون میں مرگیا۔ ابن بطوطہ بھی اسی مرض میں مبتلا ہوا لیکن بچ گیا۔ جدورا سے پھر فتن گیا اور فتن سے کولم گیا جہاں تین مہینے رہا۔ وہاں سے سلطان ہینور

کے پاس جانے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ راستے میں لٹیروں نے لوٹ لیا۔ کالی کٹ آیا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ مالدیپ کی سلطانہ نے دوسرا نکاح کر لیا اور جس بیوی کو وہ حاملہ چھوڑ آیا تھا' اس کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اپنا لڑکا دیکھنے کی غرض سے ابن بطوطہ مالدیپ گیا۔ لڑکا دو سال کا ہو چکا تھا۔ ابن بطوطہ کی بیوی نہ تو اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوئی اور نہ لڑکا دینے پر۔ انہیں چھوڑ کر ابن بطوطہ بنگال چلا گیا۔

بنگال کے حالات

بنگال کو بہت سرسبز و شاداب ملک پایا۔ یہاں دنیا بھر سے زیادہ ارزانی دیکھی۔ ایک درہم میں آٹھ مرغ یا پندرہ کبوتر خریدے جا سکتے تھے۔ ایک مینڈھے کی قیمت دو درہم تھی۔ دو دینار میں پندرہ گز بہت عمدہ قسم کا باریک کپڑا ملتا تھا۔ جس بندرگاہ پر ابن بطوطہ کا جہاز اترا تھا' اس کا نام سات گاؤں ہوگلی تھا۔ (جو موجودہ شہر ہوگلی کے شمال مغرب میں تھا) اس کے قریب ہی گنگا اور برہما پترا کا سنگم تھا۔ دریا میں سلطان کا ایک بھاری جنگی بیڑہ مقیم تھا۔ مسلمانوں نے 1204ء میں بنگال فتح کیا تھا۔ اس وقت فخرالدین بنگال کا سلطان تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے اسے باجگزار بنانا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ لکھنوتی کے حاکم علی شاہ اور فخرالدین کے درمیان جنگ رہتی۔ ایک ماہ کا سفر طے کر کے ابن بطوطہ کوہ کامروپ پہونچا۔ اس پہاڑ کا سلسلہ چین اور تبت تک چلا گیا ہے۔ ابن بطوطہ کی رائے میں اس علاقے کے لوگ ترکوں سے بہت مشابہ تھے اور ان کی طرح پھرتیلے اور محنتی تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی نے اپنے چار مریدوں کو ابن بطوطہ کی مشائعت کے لیے بھیجا۔ ان کے ساتھ شیخ کے پاس گیا جو ایک غار میں رہتے تھے۔ مسلم و غیر مسلم سب ان کے معتقد تھے اور انہیں کھانا' کپڑا فراہم کرتے۔ شیخ صائم الدہر تھے' وہ دس دن میں ایک مرتبہ روزہ افطار کرتے تھے اور ان کی غذا صرف گائے کا دودھ تھی۔ اس پہاڑ کے لوگ انہیں کی برکت سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ تین دن شیخ کا مہمان رہ کر ابن بطوطہ سونار گاؤں (جو ڈھاکہ سے جنوب میں پندرہ میل کے فاصلے پر ہے) پہونچا اور وہاں سے سماترا جانے والے جہاز پر سوار ہو کر سماترا روانہ ہوا۔

سماترا کے حالات

سونار گاؤں سے روانہ ہو کر پندرہ دن بعد ابن بطوطہ کا جہاز ایک ایسے ملک میں پہونچا جہاں کے مردوں کی شکل کتوں کی سی تھی مگر عورتیں خوبصورت تھیں۔ مرد یا تو بالکل ننگے رہتے یا گھاس کی ایک تھیلی کمر سے لٹکا لیتے۔ عورتیں کمر سے نیچے پتے باندھ کر ستر پوشی کرتیں۔ اس ملک میں ہاتھی بہت تھے جو سب کے سب بادشاہ کی ملکیت تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر مسافروں سے ملنے آیا۔ وہ بکرے

کی پوستین کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مسافروں نے سیاہ مرچ، ادرک، الائچی، سوکھی مچھلی اور کپڑا بادشاہ کو نذر کیا۔ وہاں کے لوگ کپڑا خود پہننے کی بجائے ہاتھیوں کی جھولیں بنانے پر صرف کرتے تھے۔ (محققین کی رائے ہے کہ یہ ملک برما کا وہ حصہ تھا جو اراکان کہلاتا ہے) یہاں سے چل کر پچیس دن بعد جہاز سماترا پہونچا۔ اس زمانے میں وہ عام طور پر جاوا صغیر کہلاتا تھا۔ یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ یہ جزیرہ بہت سرسبز و شاداب تھا۔ چھالیہ لونگ، عودالہند، کٹھل، آم، جامن، نارنگی اور کافور کے درخت بکثرت تھے۔ خوشبوؤں کے درخت زیادہ ترکفار کے علاقہ میں پائے جاتے تھے۔ ٹین کے ٹکڑے سکہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ سلطان نے قاضی اور کچھ علما کو ابن بطوطہ کے استقبال کے لیے سواری کے گھوڑے دے کر بھیجا۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں کی کوشش سے سماترا میں تیرہویں صدی ہجری میں اسلام پھیلا اور اس صدی کی آخری دہائی میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ بادشاہ "الملک الظاہر" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس زمانے کا بادشاہ جمعہ کی نماز کے لیے پاپیادہ مسجد جاتا تھا۔ مہمانوں کو سلطان کی طرف سے لباس فاخرہ عطا ہوا۔ مہمانوں کو سلطان نے غلام اور کنیزیں بھی تحفہ میں دیں اور تین دن تک آرام کرنے کو کہا۔ چوتھے دن مہمانوں کو اپنے پاس بلایا۔ سلطان کے یہاں سے روزانہ تین بار کھانا آتا جس میں مٹھائیاں اور میوے بھی ہوتے۔ یہاں کا قاعدہ تھا کہ جب سلطان ہاتھی پر نکلتا تو امرا گھوڑوں پر سوار ہوتے اور جب سلطان گھوڑے پر سوار ہوتا تو امرا ہاتھی پر بیٹھتے۔ سماترا کا شہر وسیع اور خوش نما تھا اور لکڑی کی دیوار اور لکڑی کے میناروں سے گھیرا گیا تھا۔ جزیرہ جاوا کو سماترا سے امتیاز کرنے کے لیے جاوا کبیر کہتے تھے۔ جاوا شہر کی تاسیس مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ پندرہ دن سلطان کا مہمان رہ کر ابن بطوطہ نے اپنا سفر پھر شروع کیا۔

مل جاوا کے حالات

چوبیس دن سلطان سماترا کے ملک کے کنارے کنارے سفر کرنے کے بعد مل جاوا کے ملک میں جہاز پہونچا۔ یہاں غیر مسلموں کی حکومت تھی۔ یہ علاقہ دو مہینے میں طے ہوتا تھا۔ اس ملک کا ایک شہر قاقلا تھا جس کے چاروں طرف پتھر کی فصیل تھی۔ یہاں باربرداری کا کام ہاتھیوں سے لیا جاتا تھا۔ عود کے درخت اتنے زیادہ تھے کہ ان کی لکڑی جلائی جاتی تھی۔ ہر شخص کے دروازے پر سواری کا ہاتھی بندھا رہتا۔ بادشاہ زمین پر بیٹھ کر فنون سپاہ گری کا معائنہ کرتا۔ بادشاہ کے سوا کسی کے پاس گھوڑے نہ تھے۔ ابن بطوطہ کے لیے فرش بچھوایا گیا تو اس نے کہا کہ جب بادشاہ زمین پر بیٹھا ہے تو وہ فرش پر کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ وہاں مہمان نوازی کا یہی قاعدہ ہے۔ چنانچہ ابن بطوطہ فرش پر بیٹھ گیا۔ ایک شخص نے آکر بادشاہ سے گفتگو کی پھر خود اپنا سر قلم کر دیا۔ ابن بطوطہ کو بتایا گیا کہ اس نے بادشاہ کے احسانات کا بدلہ اپنا سر کاٹ کر دیا۔ اس کے باپ اور دادا نے بھی بادشاہ کے باپ اور دادا کے سامنے ایسا ہی عمل کیا تھا۔ بادشاہ نے اس جاں نثار کے بیوی بچوں کے لیے معقول

انتظام کر دیا۔

چین کے حالات

مل جاوا سے روانہ ہونے پر چونتیس دن بعد ابن بطوطہ کا جہاز بحرالکاہل میں پہونچا۔ اس کا پانی گدلا سرخی مائل تھا۔ ہوا کا نام نہ تھا، اس لیے جہاز کو کھینا پڑا۔ چین کے بارے میں ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ نہایت وسیع ملک ہے۔ یہاں اناج، میوہ، سونا، چاندی غرض ہر چیز بہ افراط میسر ہے۔ دنیا کا کوئی ملک چین کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے ایک بڑے دریا کو ابن بطوطہ نہرالحیات کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے دونوں کناروں پر پھلوں کے باغات اور بازار ایسے ہی ہیں جیسے مصر میں دریائے نیل کے کنارے، آبپاشی میں پہیے دار چرخ استعمال کیے جاتے ہیں۔ چین کا گنا مصر کے گنے سے بہتر ہوتا ہے۔ مٹی کے وہ برتن جن کے لیے چین دنیا بھر میں مشہور تھا، زیتون اور چین کلاں (Canton) میں بنتے تھے۔ یہ پہاڑ کی مٹی کو جلا کر بنائے جاتے ہیں۔ مٹی کو جلا کر پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ بہترین برتن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مٹی پانی میں ایک مہینے تک سڑائی جائے۔ چین میں یہ برتن معمولی مٹی کے برتنوں کی طرح سستے بکتے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت چین کے باہر ہے۔ چینی بتوں کو پوجتے اور اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ چین کے ہر شہر میں مسلمانوں کا محلہ علیحدہ ہے اور مسجدیں بھی ہیں۔ سور اور کتے کا گوشت بازار میں بکتا ہے۔ باوجود دولت مند ہونے کے چینی سادہ زندگی بسر کرتے اور معمولی کپڑے پہنتے۔ چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے سب لکڑی کے سہارے چلتے اور اس لکڑی کو اپنا تیسرا پاؤں کہتے۔ ریشم کے کیڑے وہاں خود بخود پرورش پاتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ریشم کا کپڑا بہت بنایا جاتا اور سستا بکتا جس کی وجہ سے غریب بھی ریشم پہن سکتے تھے۔ سوتی کپڑا ریشمی کپڑے سے مہنگا ہوتا۔ چینی سوداگر سونے چاندی کو پگھلا کر بڑے بڑے ڈلے بنا لیتے جن کا وزن پچھپن سیر یا اس سے بھی زیادہ ہوتا۔ ملک بھر میں کاغذ کا سکہ رائج تھا۔ کاغذی سکوں کے علاوہ اگر کوئی چاندی یا سونے کے عوض کچھ خریدنا چاہتا تو نہیں خرید سکتا تھا۔ لکڑی کے بجائے پتھر کا کوئلہ جلایا جاتا۔

ابن بطوطہ کہتا ہے کہ چینی دست کاری میں سب قوموں سے آگے ہیں اور مصوری میں بہت کمال حاصل کیا ہے۔ جب ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی عراقی لباس پہن کر شاہی محل گئے تو ان سب کی تصویریں چپکے سے مصوروں نے کھینچ لیں اور انہیں معلوم بھی نہ ہوا۔ واپسی میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی تصویریں بازار میں آویزاں تھیں۔ تصویریں بالکل اصل کے مطابق تھیں۔ جو باہر کے مسلمان سوداگر چین جاتے تھے وہ یا تو مسلمانوں کے ساتھ ٹھہرتے تھے یا پھر سرکاری مسافر خانے میں جہاں کھانے پینے کا معقول انتظام ہوتا اور سوداگروں کے مال کی حفاظت کی جاتی۔ اگر کوئی شخص

دوران قیام عورت کی رفاقت چاہتا تو اجرت پر عورت فراہم کر دی جاتی ۔ لونڈیاں بھی سستی تھیں ۔ چینی اپنے بچوں کو لونڈی غلام کی حیثیت سے بیچنے میں عار محسوس نہیں کرتے ۔ لیکن جو کنیز بیرونی مسافر کے ساتھ ملک سے باہر جانا نہ چاہتی اسے جانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا اور جو جانا چاہتی اسے روکنا ممنوع تھا۔ ملک میں مکمل امن و امان تھا۔ راستے محفوظ تھے اور رہزنی کا خوف نہ تھا۔

سب سے پہلے ابن بطوطہ چین میں زیتون کی بندرگاہ میں اترا تھا ۔ چینی زبان میں اس شہر کا نام تسوان چو فو ہے ۔ زیتون دنیا کی بندرگاہوں میں سب سے بڑا تھا ۔ بندرگاہ میں ایک سو بڑے جہاز اور بے شمار چھوٹے جہاز کھڑے ہو سکتے تھے ۔ زیتون میں مسلمانوں کا محلہ علیحدہ تھا ۔ چین کے ہر مکان کے ساتھ ایک باغیچہ اور ایک کھیت ہوتا جس کے باعث شہر کا پھیلاؤ بہت بڑھ جاتا ۔ زیتون میں ابن بطوطہ کی ایک چینی امیر سے ملاقات ہوگئی جو سلطان محمد بن تغلق کے دربار میں سفیر ہو کر آیا تھا ۔ اس نے ابن بطوطہ کے ٹھہرنے کا انتظام کرایا اور سربر آوردہ مسلمان ابن بطوطہ سے ملنے آئے ۔

جب کوئی مسلمان مسافر دور دراز مقام سے چین آتا تو چینی مسلمان بہت خوش ہوتے ۔ قرآن مجید نے زکوۃ میں مسافر کا حصہ رکھا ہے ۔ چینی تاجر زکواۃ کا اتنا روپیہ اسے دیتے کہ وہ مالدار ہو جاتا ۔ چنانچہ وہ ابن بطوطہ کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار تھے ۔ زیتون کے شہر سے باہر شیخ برہان الدین گازرونی کی خانقاہ تھی ۔ شیخ ابواسحاق گازرونی کی نذر و نیاز کی رقم شیخ برہان الدین کی تحویل میں رہتی تھی، جو وہ کار خیر پر صرف کرتے ۔ خاقان چین کو اطلاع بھیجی گئی کہ ابن بطوطہ جو سلطان ہند کا فرستادہ ہے، زیتون پہونچ گیا ہے ۔ ابن بطوطہ نے حکومت کے نمائندے سے درخواست کی کہ طلبی کا حکم آنے تک چین کے کسی علاقے کی سیاحت کا انتظام کر دیا جائے، چنانچہ ایک چینی جہاز پر سوار ہو کر ستائیس دن اس نے ندی اور نہروں کا سفر کیا ۔ ہر روز دوپہر کو جہاز کسی گاؤں کے پاس کھڑا کر دیا جاتا ۔ وہ سیر کرکے اور ظہر کی نماز پڑھ کر ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی دوسرے گاؤں کے لیے روانہ ہوتے اور شام کو دوسرے مقام پر ٹھہرتے ۔ اس طرح وہ چین کلاں (Canton) پہونچے ۔ اس شہر کے نزدیک دریا (جسے ابن بطوطہ نہر الحیات کہتا ہے) سمندر میں گرتا ہے ۔ اس شہر کی ابن بطوطہ نے بہت تعریف کی ہے ۔ یہاں سے چینی برتن ہند اور یمن بھیجے جاتے تھے ۔ وسط شہر میں بہت بڑا مندر تھا ۔ اس مندر میں اندھوں، اپاہجوں، بوڑھوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کا معقول انتظام تھا ۔ مسلمانوں کا محلہ علیحدہ تھا جس میں ان کی مسجد، مسافر خانہ اور بازار تھے ۔ مسلمانوں کے مقدمات قاضی کے سامنے آتے اور شیخ الاسلام مسلمانوں اور حکومت کے درمیان ربط قائم کرتا ۔ یہاں ابن بطوطہ چودہ دن ٹھہرا ۔ ہر روز مسلمان تاجر اس کی دعوت کرتے اور قیمتی تحفے دیتے ۔ سدّ یاجوج و ماجوج وہاں سے ساٹھ دن کے سفر کے فاصلے پر تھی، مگر راستے میں آدم خور رہتے تھے ۔ اس لیے لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے ۔

جب ابن بطوطہ زیتون واپس آیا تو معلوم ہوا کہ خاقان چین نے طلب کیا ہے ۔ جو کشتی گورنر کے لیے مخصوص تھی اس میں ابن بطوطہ کو روانہ کیا گیا ۔ اس زمانے میں فوچو (Fuchow) دارالسلطنت تھا ۔ (یہ صحیح نہیں ہے ۔ اس کی توضیح آگے کی جائے گی) ابن بطوطہ زیتون سے دس دن میں وہاں پہونچا ۔ مسلمان تاجر فوچو کو تنجن فو کہتے تھے ۔ شہر کے باہر قاضی شیخ الاسلام اور مسلمان تاجروں اور شہر کے حاکموں نے استقبال کیا ۔ شہر کی چار فصیلیں تھیں، پہلی اور دوسری کے درمیان خاقان کے غلام اور محافظ رہتے تھے ۔ دوسری اور تیسری کے درمیان سوار فوج اور شہر کا گورنر رہتا تھا ۔ تیسری اور چوتھی کے درمیان مسلمانوں کے مکانات تھے ۔ چوتھی فصیل کے اندر چینی رہتے تھے ۔ یہاں ابن بطوطہ کی اپنے ایک ہم وطن قوام الدین (البشریٰ) سے ملاقات ہوئی ۔ یہاں ملاقات ہونے سے پہلے اس سے دہلی میں بھی ملاقات ہوئی تھی ۔ وہ بہت بڑا تاجر ہوگیا تھا ۔ جب چین واپس جا کر ابن بطوطہ مغربی افریقہ میں سفر کر رہا تھا تو وہاں قوام الدین کے بھائی سے بمقام سجلماسہ ملاقات ہوئی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے کے مسلمان سیر و سیاحت اور تجارت کے سلسلے میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھومتے پھرتے تھے ۔ ابن بطوطہ نے فوچو میں پندرہ دن قیام کیا ۔

چین میں تاتاریوں کی حکومت

فوچو سے جہاز کے ذریعہ ابن بطوطہ "Hong - Chong" پہونچا ۔ ابن بطوطہ کے خیال میں یہ شہر دنیا کے تمام شہروں سے بڑا تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ اس شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچنے میں تین دن لگتے ہیں ۔ مسلمانوں کا محلہ بہت صاف ستھرا تھا اور اسلامی طرز پر بنا ہوا تھا ۔ پندرہ دن تک ابن بطوطہ کی روز دعوتیں ہوئیں ۔ شہر کے سب سے زیادہ خوبصورت حصے میں صرف خاقان کے ملازم رہتے تھے ۔ شہر میں تین نہریں بہتی ہیں ۔ یہاں کا حاکم قُرطائی کہلاتا تھا ۔ (واضح رہے کہ 1280ء سے 1368ء تک چین پر چنگیز خان کی اولاد کی حکومت رہی ۔ پہلا بادشاہ چنگیز کا پوتا کبلائی خاں تھا ۔ چین کے اس تاتاری حکمران خاندان کو یوان (Yuan) خاندان کہا جاتا ہے ۔ جس زمانے میں ابن بطوطہ چین میں تھا، وہاں اس خاندان کا پندرہواں اور آخری بادشاہ ہوئی سونگ (Hui - Tsung) حکمران تھا ۔ وہ 1333ء میں تخت نشین ہوا تھا ۔ 1368ء میں اس کی موت کے ساتھ یوان خاندان کا خاتمہ ہوگیا ۔ جارج سارٹن لکھتا ہے کہ اس آخری بادشاہ کے خلاف بہت سی سازشیں اور بغاوتیں ہوئیں ۔ اس نے 1340ء میں سرکاری ملازمین کی بھرتی بند کر دی تو چینی اس سے اور دل برداشتہ ہو گئے ۔ اس نے سوچا کہ لی ۔ لیو ۔ چاؤ ۔ چنگ اور وانگ خاندان کے تمام لوگوں کو قتل کروا دے ۔ مگر اتنا بڑا اور مہلک قدم اٹھانے کی ہمت نہیں پڑی ۔ بغاوتوں کی وجہ سے قحط پڑ گیا ۔ پیہم لڑائیوں کے مصارف برداشت کرنے کے باعث خزانہ خالی ہوگیا ۔ ایک غریب مگر حوصلہ مند چینی چو یوان چانگ (Chu Yuan Chang) نے باغیوں کو منظم کیا ۔ رفتہ رفتہ باغیوں کا مختلف حصوں پر قبضہ ہوتا گیا اور 1368ء میں

تھان بلاق (Peking) فتح کر کے باغیوں نے یوان خاندان کا خاتمہ کر دیا ۔ 1372ء میں قراقرم سے اور 1381ء میں یونان (Yunnan) سے تاتاریوں کو بیدخل کر دیا ۔ چوں کہ بغاوت کا زیادہ زور پیکنگ کے شمال میں تھا' اس لیے جنوبی حصہ میں ابن بطوطہ نے اس کے اثرات نہ پائے جس کی بنا پر وہ کہتا ہے کہ ہر جگہ امن و امان ہے ۔ سارٹن کہتا ہے کہ چین میں یوں تو مسلمان آٹھویں صدی عیسوی سے ہی بسنے لگے تھے مگر سید شمس الدین عمر کے زمانے سے چین میں ان کا عروج شروع ہوا ۔ سید شمس الدین عمر نے چنگیز خاں کی ملازمت اختیار کرلی تھی ۔ اس کی اولاد نے چین میں بڑے بڑے اعزاز حاصل کیے ۔ ان کا بیٹا ناصر الدین صوبہ یونان کا گورنر مقرر کیا گیا ۔ 1292ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بھائی حسین اس کی جگہ گورنر مقرر ہوا ۔ 1280ء میں کبلائی خان چین کا بادشاہ ہوگیا اور اس نے 1294ء تک حکومت کی ۔ اس کے جانشینوں نے بھی سید شمس الدین عمر کے خاندان کی سرپرستی کی ۔ 1235ء میں چین کے تاتاری شہنشاہ نے سید شمس الدین عمر کی اولاد کی درخواست پر ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے اسلام کو سچا اور پاکیزہ (Ching Chen . Chiao) مذہب تسلیم کیا گیا ۔ (اس کے چند سال بعد ہی ابن بطوطہ چین پہونچا اور اس نے مسلمانوں کو چین میں خوش حال اور باوقار پایا۔ حبیب احمد)

ہانگ چو میں ابن بطوطہ کا شاندار استقبال ہوا ۔ استقبال کے لیے قاضی شہر شیخ الاسلام بہت سے علما اور شہر کے حکام باجے اور جھنڈوں کے ساتھ آئے تھے ۔ قرطائی بھی اس سے بہت مہربانی سے پیش آیا ۔ قرطائی نے ابن بطوطہ کو بتایا کہ سولہ سو کاریگر اور اس سے تگنے چوگنے ان کے شاگرد کپڑا بننے میں مصروف رہتے ہیں ۔ دس سال تک یہ کاریگر شہر سے باہر نہیں جا سکتے تھے ۔ شہر میں رہنے بسنے اور کام کی اجازت تھی ۔ دس سال کے بعد شہر سے باہر تو جا سکتے تھے ۔ مگر ملک سے باہر جانا ممنوع تھا ۔ جب کسی کاری گر کی عمر پچاس سال کی ہو جاتی تو پھر اس سے کام نہ لیا جاتا اور اس کی بقیہ زندگی میں حکومت اس کی کفیل ہوتی ۔ کاریگروں کے علاوہ دوسرے بوڑھوں کی کفالت بھی حکومت کی ذمہ داری تھی ۔ ساٹھ سال کی عمر کے بعد بوڑھے قانونی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کر دیے جاتے اور ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور ان کو "اتا" یعنی باپ کہتے ۔ قرطائی امیروں میں سب سے بڑا ہوتا ۔ اس کا عہدہ سپہ سالار کے برابر سمجھا جاتا ۔ جب قرطائی نے ابن بطوطہ کی دعوت کی تو از راہ مہمان نوازی اس نے ابن بطوطہ کے سامنے رکابیاں رکھیں اور خود کھانا پیش کیا اور اس کا اہتمام کیا کہ صرف ذبح کیے ہوئے جانوروں کا گوشت دسترخوان پر آئے ۔ قرطائی کے بیٹے کے ساتھ ابن بطوطہ نے ایک کشتی پر سیر کی ۔ یہ امیرزادہ فارسی زبان کو بہت پسند کرتا تھا ۔ (اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس زمانے میں ایران اور ترکستان پر بھی تاتاریوں کی حکومت تھی اور چین اور ایران کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ متواتر جاری تھا)۔

دوسری کشتی میں گانے والے چینی' عربی اور فارسی اشعار گا رہے تھے ۔ فارسی اشعار کی

امیرزادہ نے بہت داد دی ۔ ان اشعار کا مفہوم یہ تھا کہ جب تک ہم دنیا کے جھگڑوں میں تھے تو فکرمند رہے ۔ مگر جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو تفکرات سے چھٹکارا مل گیا ۔ جس نہر میں امیرزادہ' ابن بطوطہ اور گانے والے کشتی میں سفر کر رہے تھے' اس میں تماشائیوں کے کئی جہاز جن کے پردے رنگین ریشم کے تھے' چل رہے تھے ۔ شام کو قرطائی نے اپنے محل کے صحن میں بازی گروں کا تماشا دکھایا ۔ بازیگر نے پہلے ایک شاگرد کو اوپر ہوا میں اتنی اونچائی پر بھیج دیا کہ وہ نظر سے غائب ہوگیا ۔ پھر خود اوپر گیا اور شاگرد کے اعضاء کاٹ کاٹ کر نیچے پھینکے ۔ اس کے بعد شعبدہ باز نیچے اترا ۔ اس کے کپڑے خون میں آلودہ تھے ۔ ابن بطوطہ پر ہیبت طاری ہوگئی ۔ اس کے بعد شعبدہ باز نے شاگرد کے سب اعضاء اٹھا کر ایک ٹوکری میں رکھے اور ٹھوکر ماری ۔ لڑکا صحیح سالم اٹھ کھڑا ہوا ۔

خنسائے خاں بلق (Peking) کا سفر چونسٹھ دن کا تھا ۔ دونوں طرف ہرے بھرے کھیت اور باغات نظر آتے تھے ۔ خاں بلق ابھی دس میل تھا کہ ابن بطوطہ کا جہاز روک دیا گیا ۔ امیر البحر کی اجازت حاصل کی تو جہاز بندرگاہ میں گیا ۔ خان بلق کے مکانات کے ساتھ باغ نہیں تھے بلکہ سارے باغ شہر کے باہر تھے ۔ ابن بطوطہ شیخ برہان الدین کے یہاں ٹھہرا جسے خاقان چین نے صدر الجہاں کا خطاب عطا فرمایا ۔ حکومت نے برہان الدین کو پورے چین کے مسلمانوں کا گورنر تسلیم کیا تھا ۔ خان بلق (Peking) بہت وسیع شہر تھا ۔ خاقان کا محل شہر کے اندرونی حصہ میں تھا ۔ اس کا بیشتر حصہ نقشین لکڑی کا بنا ہوا تھا ۔ جب ابن بطوطہ خان بلق پہونچا تو خاقان اپنے رشتہ کے بھائی یا بھتیجے فیروز سے لڑنے قراقورم گیا ہوا تھا ۔ ابن بطوطہ خاقان کا نام توگوں تیمور بتاتا ہے ۔ (سارٹن نے خاقان کا نام ہوئی سونگ اور باغیوں کے سرغنہ کا نام چو یوان چانگ لکھا ہے) خاقان سے اکثر امراء منحرف ہو گئے اور باغیوں سے مل گئے تھے ۔ خاقان کو شکست ہوئی اور مارا گیا ۔

خاقان چین کی تدفین

خاقان کی شکست اور اس کے قتل کے بعد خان بلق میں ایک ہفتہ تک کھیل تماشے اور دعوتیں ہوئیں اور شادیانے بجے ۔ خاقان کی اور اس کے سو رشتے داروں کی لاشیں لائی گئیں ۔ ایک تہ خانہ تیار کیا گیا ۔ اس میں سونے چاندی کے ظروف اور اسلحہ وغیرہ رکھا گیا اور خاقان کی لاش کے ساتھ چار زندہ کنیزیں اور چھ سربرآوردہ مملوک تہ خانے میں بند کر دیئے گئے ۔ اس پر اتنی مٹی ڈالی گئی کہ ایک ٹیلہ بن گیا ۔ پھر اس پر چار گھوڑے دوڑائے گئے ۔ جب وہ تھک کر گر گئے تو ایک ایک ڈنڈا دم کی طرف سے منہ تک داخل کر کے گھوڑوں کو بلیوں پر لٹکا دیا ۔ خاقان کے مقتول رشتہ داروں کے ساتھ بھی کم و بیش یہی عمل کیا گیا ۔ سارے شہری باغیوں کا لباس پہنے ہوئے دفن کے وقت موجود تھے ۔ فیروز نے خان بلق کے بجائے قراقورم کو اپنا پایہ تخت بنایا (اس سے پہلے کہا گیا تھا کہ فوچو ملک کا

پایہ تخت تھا۔ یہاں خان بلق کے بجائے قراقورم کو پایہ تخت بنانے کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ خاقان کا پایہ تخت فوچو نہیں تھا۔ بلکہ خان بلق تھا جس کے بجائے فیروز نے قراقورم پسند کیا۔ ول ڈیوراں نے "ہمارا مشرقی ورثہ" (Our Oriental Heritage) میں لکھا ہے: تاتاریوں سے پہلے سونگ خاندان کے حکمرانوں کا پایہ تخت ہونگ چو تھا۔ کبلائی خاں نے پیکنگ کو جو اس وقت کمبالک (Cambaluc) کہلاتا تھا، اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس لیے فوچو کو ملک کا پایہ تخت کہنا صحیح نہیں۔ ممکن ہے وہ صوبے کا دارالحکومت ہو۔

کچھ امرا فیروز کے خلاف ہوگئے اور اس کے خلاف ہر جگہ بغاوت ہونے لگی۔ ("خلاصہ تحفۃ النظار" کے مصنف کی رائے ہے کہ فیروز کے تخت نشین ہونے کا واقعہ مشتبہ ہے۔ اس نام کا کوئی بادشاہ چین میں نہیں ہوا۔ ابن بطوطہ جنوری 1347ء میں چین سے واپس ہوکر کالی کٹ پہونچ گیا تھا۔ اس لیے اس کے بعد کے واقعات سنے سنائے اور ناقابل اعتبار ہیں)۔

چین سے ابن بطوطہ کی واپسی

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ ابن بطوطہ ساترا سے جنوری 1347ء میں کولم گیا۔ وہاں کالی کٹ، ظفار، مسقط، شیراز، بصرہ اور بغداد ہوتا ہوا 1348ء میں دمشق پہنچا۔ وہاں سے حج کو گیا اور قاہرہ واپس آکر وہاں سے کئی مقامات سے ہوتا ہوا 13 نومبر 1349ء کو فاس پہونچا۔ پھر اسپین اور مراکش، مغربی سوڈان میں سیاحت کی اور نابھرندی کے شہر دیکھے۔ مالی میں آٹھ مہینے رہ کر 1354ء کے شروع میں فاس پہونچا۔

"خلاصہ تحفۃ النظار" میں جو حالات بقیہ سفروں کے لکھے ہیں ان میں سے کچھ یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ چین سے واپسی میں ابن بطوطہ پھر ساترا آیا۔ سلطان نے دوبارہ اس کو تحفے تحائف دیئے اور وہ سلطان کی ممیری بہن کی شادی میں شریک ہوا۔ جنوری 1347ء میں کولم پہونچا۔ وہاں عید کی نماز پڑھی۔ پھر کالی کٹ گیا۔ پہلے دہلی جانے کا ارادہ کیا مگر پھر جہاز ذفاری (سارٹن نے ظفار لکھا ہے) اور وہاں سے مسقط چلا گیا۔ کئی مقام پر ٹھہرتا ہوا شیراز پہونچا۔ پھر اصفہان، تستر (سوستر) ہوتا ہوا بصرہ گیا۔ وہاں سے دوبارہ حضرت علی کے مزار کی زیارت کے لیے نجف اور پھر حلہ گیا۔ شوال 748ھ مطابق جنوری 1348ء میں بغداد پہونچا۔ اس زمانے میں بغداد و عراق کا سلطان شیخ حسن تھا جو سلطان ابو سعید کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ ابو سعید کے انتقال پر اس نے حکومت پر قبضہ کرکے ابو سعید کی بیوی دلشاد سے شادی کرلی تھی۔ جب ابو سعید سلطان تھا تو اس نے شیخ حسن کو مجبور کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی

بغداد خاتون کو طلاق دے۔ طلاق کے بعد ابو سعید نے بغداد خاتون سے شادی کرلی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ابو سعید نے دمشق خواجہ کی بیٹی دلشاد سے شادی کرلی۔ اس پر بغداد خاتون نے ابو سعید کو زہر دلوا دیا۔ ابو سعید زہرخورانی سے مرگیا تو امرا نے بغداد خاتون کو بھی مار ڈالا۔ اب شیخ حسن کو صرف تخت و تاج ہی نہیں ملا بلکہ ابو سعید کی بیوی دلشاد بھی مل گئی۔

ابن بطوطہ بیس سال بعد دمشق پہنچا

بغداد سے چل کر کئی جگہ ٹھہرتا ہوا بیس سال کے بعد ابن بطوطہ پھر دمشق پہونچا۔ بیس سال پہلے دمشق میں وہ اپنی ایک بیوی کو حاملہ چھوڑ گیا تھا۔ ہندوستان میں اسے خبر ملی تھی کہ اس کے بیٹا پیدا ہوا ہے۔ وہاں سے بیٹے کے لیے اس نے چالیس دینار ہندی بھجوائے تھے۔ اس نے جامع مسجد کے امام سے اپنے بیٹے کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ اسے مرے بارہ سال ہوگئے تھے۔ طنجہ کے ایک عالم سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ پندرہ سال ہوئے اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ مگر والدہ ابھی زندہ تھی۔ دمشق میں سخت قحط تھا۔ قحط کے باعث دمشق کا برا حال تھا۔ ابن بطوطہ دمشق سے حلب پہونچا۔ وہاں معلوم ہوا کہ عین تاب میں ایک درویش اپنے ایک مرید کے ساتھ پہاڑ پر رہتا ہے اور اپنے ضبط نفس پر فخر کرکے کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بغیر عورت کے نہ رہ سکے تھے اور میں بغیر عورت زندگی بسر کر رہا ہوں۔ چاروں مذاہب کے فقیہوں نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا اور وہ قتل کیا گیا۔ ابن بطوطہ حمص گیا مگر وہاں سے طاعون کے باعث پھر دمشق واپس آیا۔ یروشلم، خلیل، غازہ اور اسکندریہ ہوتا ہوا قاہرہ پہونچا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ جب قاہرہ میں طاعون زوروں پر تھا، تو صرف ایک دن میں اکیس ہزار آدمی مرے تھے۔ طاعون نے بیسیوں شہر تباہ کر دیئے۔ توقع تھی کہ یہ معلوم کرکے کہ والدہ ابھی زندہ ہیں ابن بطوطہ قاہرہ سے طنجہ جاتا۔ مگر وہ حج کے لیے روانہ ہوگیا اور 22 شعبان 749ھ مطابق 16 نومبر 1348ء کو مکہ معظمہ پہونچا۔ حج کرکے مدینہ مدینہ، یروشلم، غازہ ہوتا ہوا قاہرہ واپس آیا۔ وہاں سے چلا تو قابس میں میلاد النبی کی تقریب میں 31 مئی 1349ء مطابق 12 ربیع الاول شریک ہوا۔ فاس (FEZ) 13 نومبر 1349ء کو پہونچا مگر پہونچنے سے پہلے اسے اپنی والدہ کے انتقال کی خبر ملی۔ چنانچہ وہ طنجہ گیا اور والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے سبتہ (Ceuta) گیا جہاں تین مہینے تک بیمار پڑا رہا۔ اچھا ہوا تو اندلوسیہ چلا گیا۔ اندلوسیہ جانے سے کچھ عرصہ پہلے جبل الطارق کا عیسائیوں نے دس مہینہ تک محاصرہ کیا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ مرینی خاندان مراکش کا سلطان ابوالحسن 1332ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس وقت جبل الطارق پر عیسائیوں کا قبضہ تھا، اس نے 1333ء میں جبل الطارق کو عیسائیوں کے بیس سال کے قبضہ کے بعد چھڑایا تھا۔ اس نے پہاڑ پر بہت بڑا قلعہ تعمیر کیا اور اس کے چاروں طرف فصیل بنوائی۔ اس کے بعد عیسائیوں نے جبل الطارق پر پھر حملہ کیا۔ مگر اس کا دس مہینے کا محاصرہ کامیاب نہ رہا۔ سلطان ابوالحسن

نے 1348ء تک حکومت کی ۔ اس کے بعد ابو عنان سلطان ہوا ۔ ابن بطوطہ جبل الطارق گیا۔ جبل الطارق سے ابن بطوطہ رواندا پہونچا جہاں کا قاضی اس کا ایک رشتہ دار ابوالقاسم محمد بن یحییٰ بن بطوطہ تھا۔ وہاں سے مرلا اور پھر مالقہ گیا۔ مالقہ وسیع اور خوبصورت شہر تھا اور یہاں چیزیں ارزاں تھیں ۔ وہاں سے کئی مقامات سے گزرتا ہوا انوسیہ کے پایہ تخت غرناطہ پہونچا ۔ غرناطہ کو عروس البلدان کہتا ہے ۔ شہر سے متعلق چالیس میل میں پھیلے ہوئے باغات کے بیچ سے ایک ندی (دریائے شفیل) بہتی تھی اور پہاڑ بھی نخلستانوں اور باغوں سے ڈھکے ہوئے تھے ۔ سلطان بیمار تھا ' اس سے ملاقات نہ ہوسکی ۔ سلطان کی والدہ نے ابن بطوطہ کو دیناروں کا تحفہ بھیجا ۔ ابن بطوطہ نے علما اور صوفیوں سے ملاقات کی ۔ غرناطہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر العقاب کی پہاڑی پر صوفیوں کی خانقاہ تھی ۔ غرناطہ میں کچھ بیرونی درویش رہتے تھے جو سمرقند ' تبریز اور ہندوستان کے باشندے تھے ۔ غرناطہ سے کئی مقامات ہوتا ہوا سبتہ واپس آیا ۔ پھر مراکش کے شہر میں پہونچا (جس کی بنیاد المرابطہ حکمرانوں نے 1007ء میں ڈالی تھی) مگر اسے اجڑا ہوا پایا ۔ اس کے اجڑنے کی وجہ یہ ہوئی کہ مراکش کے بجائے اپنا پایہ تخت فاس کو بنالیا ۔ مراکش میں ابن بطوطہ کی سلطان ابو عنان سے ملاقات ہوئی اور اسی کے ساتھ وہ فاس آیا۔

افریقہ کے ان ممالک کا سفر جہاں سیاہ فام اقوام آباد تھیں

سلطان ابو عنان سے اجازت لے کر ابن بطوطہ صحارا اور دریائے نائجر کے ممالک کی سیاحت کو نکلا ۔ وہ فاس سے چل کر سجل ماسہ پہونچا ۔ چین کے حالات میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ فوچو کے شہر میں ابن بطوطہ کی ایک بہت بڑے تاجر قوام الدین البشری سے ملاقات ہوئی تھی ۔ اس کا بھائی ابو محمد البشری سجل ماسہ میں رہتا تھا ۔ ابن بطوطہ اس کا مہمان ہوا اور اس کے بھائی قوام الدین سے ملنے کا حال بتایا ۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ سجل ماسہ کا خرما بصرہ کے خرمے سے بہتر ہے ۔ یہاں خرمے کی ایک قسم کا نام ایرار ہے ۔ ویسا خرما اور کہیں نہیں ہوتا ۔ مولف " خلاصہ تحفتہ النظار " میں لکھتے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی تک سجل ماسہ کوہ اطلس کے جنوب میں سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا ۔ اب اس کے کھنڈر وادی زیریں تفیلت (Tefilelt) سے کچھ فاصلے پر پانچ میل تک پھیلے پڑے ہیں ۔ سجل ماسہ سے 18 فروری 1353ء کو وہ ایک کارواں کے ساتھ تغاز کے لیے روانہ ہوا ۔ اپنے اونٹ کے لیے چار مہینے کا چارہ بھی ساتھ لیتا گیا ۔ کارواں پچیس دن میں تغاز پہونچا ۔ یہاں کے مکانات کی دیواریں معدنی نمک کے کندوں کی تھیں ' اور چھتیں اونٹ کے چمڑے کی ۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی ۔ ریت کے نیچے نمک کی کانیں تھیں جن سے کھانے کے نمک کی سلیں کھود کر نکالی جاتی تھیں ۔ پیڑوں کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ یہاں کا پانی کھاری تھا اس مقام میں صرف نمک کھودنے والے غلام رہتے تھے ۔ ایک اونٹ پر نمک کی دو سلیں لادی جاتی تھیں ۔ کھانے پینے کی چیزیں باہر سے یہاں لائی جاتی تھیں ۔

نمک کے عوض سامان خریدا جاتا تھا ۔ ابوالاتن میں ایک اونٹ نمک آٹھ دس مثقال زر میں بکتا اور مالی کے شہر میں بیس سے تیس مثقال میں ۔ مکھیاں اور جوئیں بکثرت تھیں ۔ لوگ جوئیں مارنے کو پارے کے ہار گلے میں ڈال لیتے تھے ۔ بارش کا پانی جو گڑھوں میں جمع ہو جاتا اسی کو لوگ پیتے ۔ کہیں کہیں چٹانوں کے بیچ میں بھی میٹھا پانی پایا جاتا تھا۔

ابو الاتن

تغاز سے کارواں تاسرحلہ پہونچا ' جہاں پانی کے زیر زمین طبقات تھے ۔ یہاں لوگ پانی کی داغ دوزی کرتے اور ہوا سے بچانے کے لیے تھیلیوں میں بند کر لیتے ۔ ابن بطوطہ اور اس کے ساتھی ایک رہنما کو لے کر آگے بڑھے ۔ ساتویں دن اس جگہ پہونچے جہاں ان کو ابوالاتن لے جانے والی جماعت میں شامل ہونا تھا ۔ اس جماعت کو پہلے سے ایک تکشیف کے ذریعہ کارواں آنے کی اطلاع دے دی گئی تھی ۔ دو مہینے میں کارواں ابوالاتن پہونچا ۔ یہ شہر سیاہ قوموں کے ملک کی شمالی سرحد پر واقع ہے ۔ کارواں نے اپنا سارا سامان ایک کھلے میدان میں پھیلا دیا اور مقامی لوگوں کی سپردگی میں دے دیا ۔ پھر سلطان کے نائب کے پاس گئے جو سفید فام لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا پسند نہ کرتا تھا ۔ اس سے مل کر ابن بطوطہ ایسے ملک کی سیاحت پر آنے پر پچھتایا ۔ اس نے پہلے سے ایک شخص کو مکان کرائے پر لے رکھنے کے لیے لکھ دیا تھا ۔ چنانچہ اس مکان میں پچاس دن تک ابن بطوطہ رہا ۔ ترجمان نے جس کا نام فشاجو تھا دعوت کی ۔ اس دعوت میں کٹا ہوا باجرہ ' شہد اور دودھ کھانے کو ملا ۔ ابوالاتن کے لوگوں نے ابن بطوطہ کی قدر دانی کی اور دعوتیں دیں ۔ یہاں کے لوگوں میں بربر قبیلہ مسوفہ کی اکثریت تھی ۔ ان کی عورتوں کا حسن حیرت انگیز تھا ۔ عورتوں کی مردوں سے زیادہ عزت کی جاتی تھی ۔ عورتیں بے پردہ مردوں کے ساتھ بے تکلف پھرتی تھیں ۔ باہر والوں سے عقد کرنے میں انہیں اعتراض نہ تھا ۔ مگر وہ اپنا شہر چھوڑنا گوارا نہ کرتی تھیں یہاں کے لوگ نماز روزے کے پابند تھے ۔ عورتیں بھی نماز کی سختی سے پابند تھیں ۔ مگر یہاں عجیب رواج تھا کہ عورتیں "مرد دوست" اور مرد "عورت دوست" رکھتے تھے اور اپنے گھروں میں انہیں بلاتے اور ان کی دعوت کرتے تھے ۔ ایک دن ابن بطوطہ قاضی شہر سے ملنے گیا تو اس کے پاس ایک نہایت حسین نوجوان عورت کو بیٹھے دیکھ کر واپس آنے لگا ۔ قاضی نے کہاں کیوں واپس جاتے ہو یہ تو میری دوست ہے ۔ قاضی نے بتایا کہ وہ اس سال حج کرنے جائے گا اور اسے اپنے ساتھ ایک دوست عورت کو لے جانے کی اجازت مل چکی ہے۔

ابو الاتن سے سفر اور مالی کے حالات

ابو الاتن سے مالی کا سفر چوبیس دن کا تھا۔ یہ راستہ محفوظ تھا' اس لیے یہ ضروری نہ تھا کہ مسافر پورے کارواں کے ساتھ جائے۔ ابن بطوطہ کے ساتھ تین اشخاص اور ایک رہنما تھا۔ راستے میں بے پتوں اور بے ڈالیوں کے درخت جو "بے اوباب" کہلاتے تھے دیکھے۔ ان کے تنے اتنے بڑے تھے کہ ایک بڑا کارواں ان کے سایہ میں ٹھہر سکتا تھا۔ جہاں پانی کی قلت ہوتی وہاں لوگ ان تنوں کو کھوکھلا کر کے ان میں بارش کا پانی جمع کر لیتے تھے۔ ایک جولاہے کو اپنے پورے سامان کے ساتھ تنے کے اندر کپڑا بنتے دیکھا۔ اس علاقے میں سفر کرنے والے نمک کے ٹکڑے' شیشے کے منکے اور خوشبوئیں زاد راہ کے طور پر لے کر جاتے تھے۔ جن کے عوض جس گاؤں سے گزرتے باجرہ' چاول' مرغ وغیرہ خرید لیتے۔ ان کے یہاں کا چاول سفید فام کھاتے تو انہیں متلی ہونے لگتی۔

ابو الاتن سے دس دن چلنے کے بعد ایک بڑا قصبہ ملا' نام زاغری تھا۔ "ونجراتا" قوم کے سیاہ فام تاجر آباد تھے۔ کچھ عبادی قبیلہ کے سفید فام لوگ بھی بس گئے تھے۔ عبادی خوارج کی ایک شاخ تھی جو اس وقت عمان' زنجبار اور جنوبی الجیریا میں آباد تھی۔ زاغری ابو الاتن کو اناج فراہم کرتا تھا۔ زاغری سے ابن بطوطہ ناجر ندی کے کنارے پہونچا۔ وہ اسے دریائے نیل کہتا ہے۔ (جارج سارٹن کہتا ہے کہ اس زمانے میں دریائے سندھ کو بھی کبھی کبھی دریائے نیل کہہ دیتے تھے اور ناجر کو عموماً سوڈانی نیل ہی کہا جاتا تھا۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ ابن بطوطہ نے ناجر کو دریائے نیل سمجھا جو مصر میں بہتا ہے صحیح نہ ہوگا) اس ندی کے کنارے کاہرا اور زاغہ آباد تھے۔ دونوں کے سلطان الگ الگ تھے مگر دونوں مالی کے شہنشاہ کے تابع تھے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ زاغہ کے لوگ اس علاقے میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے تھے۔ وہ روزہ نماز کے پابند تھے اور علم دین کا شوق رکھتے تھے۔ دریائے ناجر کے کنارے ابن بطوطہ نے چھوٹی کشتی کے برابر لمبا مگر مچھ دیکھا۔ کرنخو ٹھہرتا ہوا ابن بطوطہ شہر مالی پہونچا اور کرائے کے مکان میں چند ماہ رہا۔ قاضی شہر عبد الرحمٰن اور کچھ اور لوگوں نے اس کی دعوتیں کیں۔ ایک بار ابن بطوطہ اور اس کے ساتھیوں نے ایسا کھانا کھایا کہ ابن بطوطہ نماز فجر میں بے ہوش ہو کر گر گیا اور اس کا ایک ساتھی مر گیا۔ ابن بطوطہ دو مہینے بیمار رہا۔ مالی کا شہنشاہ منسا سلیمان بہت بخیل تھا۔ اس نے ابن بطوطہ کو ایک بار خوان نعمت بھیجا جس میں صرف تین روٹیاں' زیتون میں پکا ہوا گوشت اور نصف کدو کھٹا دہی تھا۔ دو مہینے بعد رمضان شروع ہوا۔ ابن بطوطہ نے کہلوا بھیجا کہ میرے وطن میں جب لوگ یہاں کی فیاضی کا حال پوچھیں گے' تو میں کیا بتاؤں گا۔ اس پر سلطان نے ابن بطوطہ کو رہنے کے لیے مکان دیا اور اس کے خورد و نوش کے اخراجات کا کفیل ہوا۔ شب قدر کو 33/1/3 مثقال زر عطا کیا اور جب ابن بطوطہ مالی سے رخصت ہوا تو ایک سو مثقال اسے دیئے۔ مالی میں

کوڑیوں کے ذریعے خرید و فروخت ہوتی تھی۔

سلطان کا دربار صحن میں ایک پیڑ کے نیچے لگتا تھا۔ سرخ مخمل کا لباس پہن کر سلطان آتا تخت پر بیٹھتے وقت باجا بجتا۔ یہاں کے لوگ سب مطیع و فرمانبردار تھے۔ بادشاہ کی قسم کھاتے تھے۔ جسے بادشاہ طلب کرتا وہ میلے کچیلے کپڑے پہن کر حاضر ہوتا۔ جس کی خدمت گزاری پسند کی جاتی وہ اپنے سر اور پیٹھ پر مٹی ڈال لیتا۔ اس ملک میں چوری بالکل نہیں ہوتی تھی۔ جمعہ کے دن نماز کے لیے ہر شخص اپنا بوریئے کا مصلیٰ لے کر مسجد جاتا تھا۔ باوجود صوم و صلوٰۃ کے پابند ہونے کے کچھ نہایت مذموم رسوم کو جائز کر رکھا تھا۔ بادشاہ کے سامنے عورتیں بے پردہ اور لڑکیاں ننگی پیش کی جاتی تھیں اور لوگوں کے یہاں بھی کنیزیں اور جوان لڑکیاں بالکل برہنہ پھرتی تھیں۔ گدھے اور کتے کا گوشت کھا لیتے تھے۔ 28 جون 1352ء کو ابن بطوطہ مالی آیا تھا اور آٹھ مہینے رہ کر 27 فروری 1353ء کو واپس ہوا۔ دونوں عیدیں اس نے یہیں کیں۔

مالی سے واپسی

واپسی میں ابن بطوطہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ نماز مغرب کے بعد ناجر کی ایک نہر عبور کی۔ چونکہ دن میں مچھر بہت ہوتے تھے' اس لیے رات میں سفر کیا جاتا تھا۔ سولہ فرس البحر (Hippopo-tamus) نہر میں اترتے دیکھے۔ ان کے شکار کا یہ طریقہ تھا کہ رسی باندھ کر برچھیاں ان میں پھینکتے تھے۔ برچھیاں ان کے پاؤں یا گردن میں چبھ جاتیں تو کھینچ لیتے اور ان کا گوشت کھاتے۔

ابن بطوطہ نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے کہ جب منسا موسیٰ سلطان تھا تو اس نے ایک سفید فام قاضی کو چار ہزار مثقال چرانے کی سزا میں مردم خوروں کے علاقے میں بھیج دیا تھا تاکہ وہ قاضی کو کھا جائیں۔ مردم خوروں نے سفید فام ہونے کی وجہ سے قاضی کو کھانے کے قابل نہ سمجھا۔ اس امید پر کہ شاید اس کا رنگ بدل جائے چار سال تک اسے انہوں نے اپنے یہاں رکھا۔ جب رنگ تبدیل نہ ہوا تو قاضی کو واپس کر دیا۔ ایک اور واقعہ کے بیان میں کہا جاتا ہے کہ مردم خوروں کا ایک وفد ایک بار سلیمان کے دربار میں آیا۔ مردم خور ریشمی چادریں اوڑھے ہوئے تھے اور ان کے کانوں میں آدھ بالشت چوڑی بالیاں تھیں۔ سلطان نے ان کی خدمت کے لیے سیاہ فام عورت بھیجی۔ مردم خوروں نے اسے کھا لیا اور ہاتھ منہ پر اس کا خون مل کر سلطان کا شکریہ ادا کرنے آئے۔

"خلاصہ تحفۃ النظار" کے مؤلف نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی سوڈانی سلطنت غانہ کی تھی۔ نویں سے گیارہویں صدی تک کمبی کے سوننکے غانہ پر حکمران رہے۔ 1076ء میں مراکش کے مرابطین

سلطان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ مرابطین کے زوال کے بعد کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں۔ 1235ء میں ماری جاتا نے سوسنگے کی سلطنت پر اقتدار حاصل کیا بعد میں وہ مسلمان ہوگیا اور مالی کو پایہ تخت بنایا۔ 1240ء میں اس نے غانہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد کئی بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ منسا موسیٰ کے زمانے میں یہ سلطنت اپنے عروج کو پہونچی۔ منسا سلطان کو کہتے ہیں۔ منسا موسیٰ نے 1307ء سے 1336ء تک حکومت کی 1325ء میں اس نے گاؤ گاؤ اور تمبکتو فتح کیا۔ موسیٰ ماری جاتا کی بہن کا نواسا تھا۔ منسا سلیمان نے 1336ء سے 1359ء تک حکومت کی۔ اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ منسا سلیمان منسا موسیٰ کا بھائی تھا۔

ابن بطوطہ کے واپسی کے سفر میں اس کا اونٹ مر گیا تو اس کی غیرموجودگی میں مرے ہوئے اونٹ کو لوگوں نے کھا لیا۔ تمبکتو سے ابن بطوطہ ایک چھوٹی کشتی میں روانہ ہوا۔ یہ کشتی پیڑ کے تنے کو کھوکھلا کرکے بنائی گئی تھی۔ اس مقام کے حاکم حاجی فربا سلیمان نے جو بہت لمبا تڑنگا تھا، اسے ایک غلام دیا جسے ابن بطوطہ اپنے ساتھ مراکش لے گیا۔ پھر ابن بطوطہ گاؤ گاؤ پہونچا جو اس ملک کے سب سے بڑے شہروں میں سے تھا۔ یہ بہت بڑا تجارتی مقام تھا۔ یہاں کئی اطراف کی سڑکیں آ کر ملتی تھیں (مولوی عبدالرحمٰن خان کہتے ہیں کہ گیارہویں صدی میں اس کا بادشاہ بربر قوم کا تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ بالآخر گاؤ گاؤ اور تمبکتو کو سلطان مراکش نے 1591ء میں اپنے قلمرو میں شامل کر لیا)۔ ابن بطوطہ گاؤ گاؤ میں ایک مہینہ رہا۔ وہاں سے تغذہ کی طرف چلا اور اس کا قافلہ برداما کی قوم کے ملک میں داخل ہوا۔ یہ قوم بربر نژاد تھی۔

برداما قوم کے ملک کے حالات

برداما کے ملک میں سفر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ان سے محافظت کا وعدہ لیا جائے۔ ان کی عورتوں کے وعدے مردوں کے وعدے سے زیادہ قابل اعتبار سمجھے جاتے تھے۔ اس قوم کی عورتیں نہایت خوبصورت اور گورے رنگ کی تھیں۔ تغذہ کے مکان سرخ پتھر کے تھے پانی تانبے کی کانوں سے گزر کر بہتا تھا۔ یہاں کے لوگ کپڑا مصر سے منگاتے تھے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ لوگ بہت مرفہ الحال تھے۔ تغذہ ملک توراغ کا سب سے بڑا شہر تھا اور اس کا سلطان برائے نام شہنشاہ مالی کا تابع تھا۔ ابن بطوطہ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح تانبا برآمد کیا جاتا ہے، کیسے اس کی سلاخیں بنائی جاتی ہیں اور یہ مال کہاں کہاں بھیجا جاتا ہے۔ برنو کو بھی یہ مال جاتا تھا جہاں کا سلطان چہرہ نہیں دکھاتا تھا بلکہ پردے کے پیچھے سے گفتگو کرتا تھا۔ ابن بطوطہ تغذہ سے اس سے ملنے گیا۔ سلطان بڑے اخلاق سے پیش آیا اور چھ دن مہمان رکھا۔ چلتے وقت ایک اونٹنی اور دس مثقال سونا عطا کیا۔ تغذہ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ مرینی سلطان مراکش ابو عنان نے اسے بلانے کے لیے قاصد بھیجا

ہے۔ ستر دن کی زاد راہ لے کر اس کا کارواں 11 ستمبر 1353ء کو تغذہ سے روانہ ہوا۔ کارواں کا ایک ایسے علاقہ سے گزر ہوا جہاں تین دن تک سفر بے آب و دانہ کرنا پڑتا تھا۔ پھر پندرہ دن تک کارواں صحرا میں چلتا رہا۔ کہیں کہیں پانی مل جاتا تھا۔ مگر پانی میں کپڑے دھونے سے کالے پڑ جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مقام کا پانی لوہے کی کانوں سے گزر کر آتا تھا۔ نجرّ میں بربری آباد تھے۔ یوں تو وہ لوگ مفسد تھے مگر ماہ رمضان کی عظمت کے پیش نظر انہوں نے کارواں کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا۔ کارواں بودا پہونچا جہاں کھجور کے کچھ درخت تھے اور باقی ہر طرف ریت اور نمک کی دلدلیں تھیں۔ یہاں کے لوگ صبح کو ٹڈے پکڑتے۔ ان کی غذا کھجور اور ٹڈے تھے۔ وسط ذوالقعدہ 754ھ مطابق نومبر 1353ء میں ابن بطوطہ سجل ماسہ پہونچا۔ 29 دسمبر 1353ء کو وہاں سے روانہ ہوا تو ام جنیبہ میں سخت برف باری ہو رہی تھی۔ عید کی نماز ابن بطوطہ نے دارالتمع میں پڑھی۔ اوائل 1354ء میں فاس پہونچ کر سلطان ابو عنان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے اپنے کاتب ابن جزی کو ابن بطوطہ کے حالات سفر لکھنے پر متعین کیا۔

جارج سارٹن کہتا ہے کہ سر ہنری یول کے تخمینہ کے مطابق پچھتر ہزار میل کا سفر ہوا۔ یہ فاصلہ اس سے بہت زیادہ ہے جو مارکو پولو یا کسی اور سیاح نے بھاپ سے چلنے والے جہازوں کے عہد سے پہلے طے کیا ہو۔ ابن بطوطہ نے تمام اسلامی ممالک کے علاوہ کئی غیر اسلامی ممالک یعنی سیلون، چین اور ہندوستان کے راجاؤں کے علاقے اور قسطنطنیہ وغیرہ کا سفر بھی کیا اور اپنی زندگی کا بہترین حصہ سیر و سیاحت میں صرف کیا۔ ہر چند ابن بطوطہ سائنس داں نہیں تھا مگر اس نے ہر طرح کی معلومات کا ڈھیر لگا دیا ہے، جس میں سائنس کے لیے کافی مواد ملتا ہے اور یہ مواد متنوع ہے۔

رحلہ کی صداقت

جارج سارٹن کہتا ہے "رحلہ" میں کہیں کہیں سن و تاریخ کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ ہوسکتی کہ ابن بطوطہ کا بہت سے مقامات میں ایک سے زیادہ بار گزر ہوا۔ بعض مقامات اس نے دوسری یا تیسری بار بہت مدت کے بعد دیکھے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے جو واقعات کسی شہر میں پہلے پیش آئے تھے، اس نے انہیں بعد کے واقعات سے خلط ملط کر دیا ہو۔ جو شخص کم و بیش تیس سال کی مدت تک برابر سفر میں رہا ہو اس سے اس قسم کی فروگزاشتیں سرزد ہونا قابل گرفت نہیں۔ سن و تاریخ کی غلطیوں کے علاوہ واقعات کی فروعی غلطیوں سے بھی سفرنامہ کی صداقت مجروح نہیں ہوتی۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا ابن بطوطہ اپنے سفر کے حالات قلمبند کرتا جاتا تھا، سارٹن کہتا ہے کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ اس زمانے کے لوگ تحریر سے زیادہ اپنے حافظہ پر بھروسہ کرتے تھے، یہ خیال کرنا قرین قیاس نہیں کہ ہزاروں مقامات کے لاتعداد مشاہدات و واقعات کو تیس سال تک حافظہ

میں محفوظ رکھ کر انہیں بالتفصیل بیان کیا جا سکے ۔ غالباً ابن بطوطہ نے باقاعدہ ڈائری رکھ کر روز اندراجات کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی تھی ۔ لیکن اس نے مختصر یادداشتیں ضرور رکھی ہوں گی جن کی بنا پر وہ تیس سال کے واقعات بیان کر سکا ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ سچی باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں ۔ چنانچہ مارکو پولو کی کچھ سچی باتوں کو بھی لوگ اس کی من گھڑت سمجھے تھے ۔ حالاں کہ وہ واقعات پر مبنی تھیں ۔ سارٹن کی رائے میں اگر ان قصوں سے قطع نظر کر لیا جائے جن میں کرامت و خرق عادت کا ذکر ہے اور ایسی فروگزاشتوں کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے جو بھول چوک کی بنا پر سرزد ہوئیں تو یہ کہنا درست ہو گا کہ ابن بطوطہ نے واقعات کو صداقت اور راست گوئی سے بیان کیا ہے ۔ چونکہ اس کا رجحان تصوف کی طرف تھا ۔ وہ اس قسم کی باتوں کو کہ مشہد علی پر جا کر لقوہ فالج کے مریض شفایاب ہو جاتے تھے ' بے پس و پیش صحیح تسلیم کر لیتا ہے ۔ اس قسم کی اور بہت سی کرامتوں کو مان لینے کا سبب بھی یہی مذہبی رجحان تھا ' جو مراکش کے لوگوں میں عموماً پایا جاتا ہے ۔ وہاں کے لوگ عموماً اولیاء پرست ہوتے ہیں اور ولیوں کی کرامتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں ۔ ابن بطوطہ نے یوں تو نباتات ' حیوانات ' معدنیات ' جمادات وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے مگر ہر ملک میں اس کا اصل مرکز توجہ انسان تھا ۔ وہ اس کے رہنے سہنے ' کھانے پینے 'زراعت و تجارت 'صنعت و حرفت 'معیشت و حکومت کا بالخصوص ذکر کرتا ہے ۔ ہر شہر میں پہونچ کر سب سے پہلے وہ وہاں کے اہل علم و اہل ورع سے ملاقات کرتا تھا اور پھر اہل اقتدار سے ملتا ۔ ان طبقات کے لوگوں کے حالات اس کے رحلہ میں بکثرت ملتے ہیں ۔ اپنے طویل سفر کے درمیان اسے مختلف نسلوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ۔ اس نے ہر ایک نسل کی خصوصیات اور اس کے رسم و رواج کا مطالعہ کیا ۔ نسلی خصوصیات بیان کرنے میں اس نے بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے ۔ تیس سال کی طویل مدت میں اس نے مختلف ملکوں کی عورتوں سے شادیاں کیں اور کنیزوں سے تمتع کیا ۔ رحلہ میں مختلف ممالک کی عورتوں کے حسن کا ذکر بار بار کیا ہے اور مختلف نسلوں کی عورتوں کی جنسی خصوصیات کی تشریح بھی کی ہے ۔ ایک آدھ بات تو ایسی بتائی ہے جس پر یقین آنا مشکل ہے ۔ بنگال سے روانہ ہو کر جب اس کا جہاز اراکان کے ساحل سے گزرا تو وہاں کے مردوں کو اس نے کتوں کے ہم شکل پایا ۔ اس کے باوجود ان کی عورتوں کو خوب صورت بتاتا ہے ۔ یہ بات سمجھ میں آنی مشکل ہے کہ جب کسی قوم میں لڑکا پیدا ہو تو کتے کی صورت کا ہو اور لڑکی ہو تو نہایت خوبصورت ہو ۔ مالی جاتے ہوئے ابن بطوطہ نے ابوالاتن میں پچاس دن قیام کیا ۔ وہاں بربر قبیلہ فسوفہ کی عورتوں کو حیرت انگیز حد تک حسین پایا اور مالی سے واپسی میں جب برداما قوم کے ملک سے گزرا تو وہاں کی عورتیں اسے بہت حسین نظر آئیں ۔ پھر مرہٹوں کے علاقے سے گزرا تو وہاں بھی عورتوں کو نہایت خوبصورت پایا ۔ ان حسین نظاروں میں کچھ ابن بطوطہ کے حسن نظر کا تصرف بھی کارفرما معلوم ہوتا ہے ۔

ہر ملک کے نظام حکومت پر بھی ابن بطوطہ نے روشنی ڈالی ہے ۔ مجموعی طور پر چین کے

نظام حکومت سے ابن بطوطہ بہت متاثر ہوا ۔ اس نے ہر جگہ امن و امان پایا ' وہاں چوری بالکل نہ ہوتی تھی ۔ بوڑھوں کی بہت عزت کی جاتی اور خود حکومت ان کے اخراجات کی کفیل ہوتی ۔ لوگ خوش حال تھے ۔ مسلمانوں کو چین میں مذہبی آزادی حاصل تھی ۔ حکومت شیخ الاسلام کے ذریعے ان سے رابطہ قائم رکھتی تھی ۔ مسلمان چین میں باوقار زندگی بسر کرتے تھے اور تجارت کی وجہ سے متمول اور مرفہ الحال تھے ۔ چین میں کاغذ کا سکہ چلتا تھا سونے چاندی کے عوض خرید و فروخت ممنوع تھی ۔ جزائر مالدیپ کی حکومت فوج رکھنا غیر ضروری سمجھتی تھی ۔ وہاں کے امن پسند لوگوں کے ذہن میں جنگ کا تصور تک نہ تھا ۔

نباتات میں وہ پھولوں ' مسالوں ' ترکاریوں ' اناج اور ایسے درختوں کا ذکر کرتا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے کام میں آتے ہیں ۔ حیوانات میں بھی وہ ایسے جانور منتخب کرتا ہے جو سواری یا بار برداری میں استعمال ہوتے ہیں ۔ اسی سلسلہ میں اس نے ان کتوں کا ذکر کیا ہے جو بے پہیوں کی گاڑی کھینچتے تھے ۔ دریائی گھوڑوں اور اڑنے والی جونکوں کا ذکر اس نے بطور عجائبات کیا ہے ۔ کچھ زہریلے جانوروں کا حال بھی بیان کیا ہے ۔ مچھلیوں کا ذکر انسانی غذا کے تحت آیا ہے ۔ صدف کا ذکر موتی نکالنے کے سلسلہ میں کرتا ہے ۔ لنکا میں اس نے کالے بندر اور سفید ہاتھی دیکھے تو ان کا ذکر بھی بطور عجائبات کیا ہے ۔

عموماً ہر جگہ لکڑی جلانے کے کام میں آتی ہے ۔ مگر جب اس نے چین میں پتھر کے کوئلے کا استعمال دیکھا تو اس کا ذکر خاص طور پر کیا ۔ تانبے اور لوہے کی کانوں کا جہاں پتہ چلا اس کی نشاندہی بھی ابن بطوطہ نے کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو پانی لوہے کی کانوں میں سے برآمد ہو کر آتا ہے ' اس میں کپڑے دھوئے جائیں تو کالے ہو جاتے ہیں ۔ لنکا میں ابن بطوطہ نے یاقوت ' نیلم اور پکھراج کی کانیں دیکھیں ۔ تغاذ میں اس نے دیکھا کہ لوگ مکانوں کی دیواریں معدنی نمک کی سلوں سے بناتے ہیں اور چھت کے لیے اونٹ کی کھال استعمال کرتے ہیں ۔ اس علاقہ میں نمک کے عوض خرید و فروخت ہوتی تھی گویا نمک ہی ان کا سکہ تھا ۔ اس نواح میں مکھیاں اور جوئیں بکثرت تھیں جن سے محفوظ رہنے کے لیے لوگ پارے کے ہار گلے میں ڈال لیتے ۔ ابوالاتن جاتے ہوئے اس نے بے پتوں اور بے ڈالیوں کے درخت دیکھے جن کے تنوں کو کھوکھلا کر کے بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ مختصر یہ کہ وہ ہر ایسی چیز کو جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی بہ نظر غائر دیکھتا اور اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا تھا ۔ ہندوستان میں بیوہ عورتوں کا ستی ہونا ' یوگیوں کی حیرت انگیز ریاضتیں اور فریب آفریں شعبدے ' مثلاً رسی سے آسمان کی طرف چڑھنا وغیرہ ۔ سب کچھ اس نے بے کم و کاست بیان کر دیا ہے ۔

ابن بطوطہ مختلف ملکوں کی معیشت کا جائزہ بھی لیتا ہے ۔ وہ مختلف مقامات میں اشیاء کی قیمتوں کا موازنہ کرتا ہے ۔ شام کے شہر سرفین کی صابون اور سوتی کپڑوں کی صنعتوں کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ یہ مصنوعات قاہرہ اور دمشق بھیجی جاتی ہیں ۔ تعذہ میں تانبے کی سلاخیں بنائی جاتی تھیں ۔ ابن بطوطہ نے بتایا ہے کہ وہ کن ممالک کو برآمد کی جاتی تھیں ۔ مالدیپ میں ناریل کا کپڑا بنتا تھا ۔ یہ کپڑا، خشک مچھلیاں اور برتن بیرونی ممالک کو برآمد کیے جاتے تھے ۔ چین کی ظروف سازی اور ریشمی کپڑے کی صنعتوں کا مفصل ذکر کیا ہے ۔ اس نے بتایا ہے کہ کس ملک میں کوڑیاں چلتی تھیں ۔ کہاں مال کے بدلے مال خریدا جاتا تھا ۔ کہاں کاغذی سکہ رائج تھا اور کہاں درہم و دینار کے ذریعہ خرید و فروخت ہوتی تھی ۔ لنکا میں یاقوت کی افراط پائی ۔ بنگال میں اشیاء کی ارزانی کی کیفیت بیان کی ہے اور مختلف چیزوں کی قیمتیں بتائی ہیں ۔ لنکا میں دارچینی کے درخت بہت ہوتے تھے ۔ جو درخت سیلاب میں بہہ آتے انہیں معبر اور ملیبار لوگ مفت اپنے وطن لے جاتے ۔ مل جاوا میں اگر کے درختوں کی اتنی افراط تھی کہ لوگ انہیں جلاتے تھے ۔

جغرافیائی نقطہ نظر سے بھی ابن بطوطہ کا سفرنامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس نے بیسیوں ملکوں اور ہزاروں قصبوں اور شہروں کے حالات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں ۔ مختصر یہ کہ یہ سفرنامہ ہر طرح کی معلومات کا خزانہ ہے ۔ بلاشبہ ابن بطوطہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا سیاح تھا ۔ رحلہ کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا گیا ۔

رحلہ کے بہت سے قلمی نسخے موجود ہیں ۔ خود ابن جزی کے ہاتھ کا نسخہ جو اس نے فروری 1356ء میں مرتب کیا تھا ۔ پیرس میں موجود ہے ۔

احمد ابن محمد ابن ہلال المقدسی الشافعی 1314ء میں پیدا ہوا اور 1364ء میں اس کا قاہرہ میں انتقال ہوا ۔ وہ یروشلم کے ایک مدرسے میں مدرس تھا ۔ 15 اکتوبر 1351ء کو اس نے اپنی تصنیف "مثیر الغرام الا زیارۃ القدس والشام" مکمل کی ۔ یہ بیت المقدس کی زیارت اور شام کی سیاحت سے متعلق ہے ۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلے حصے میں شام و فلسطین کے عام جغرافیائی حالات بیان کیے ہیں ۔ چودھویں صدی کے آخر میں عماد المالکی نے (جو 1368ء سے 1440ء تک زندہ رہا) اس کتاب کی تلخیص کی ۔

المقدسی کی دوسری تصنیف کا نام "کتاب المصباح فی الجمع بین الاذکار والصلاح" ہے ۔ یہ النوادی اور محمد ابن ہمام کی کتابوں پر مبنی ہے ۔

عبدالرشید ابن صالح ابن نوری اباکوی کا سن پیدائش و وفات معلوم نہیں ۔ وہ باکو کا رہنے والا تھا جو بحر الخضر (Caspian Sea) کے مغربی ساحل پر واقع ہے ۔ اس کے والد کا انتقال 1403ء میں ہوا ۔ اس نے چودھویں صدی کے آخر یا پندرہویں صدی کے آغاز میں القزوینی کے جغرافیہ کا عربی میں خلاصہ کیا اور اس کا نام "تلخیص الآثار و عجائب الملک القہار" رکھا ۔ القزوینی کی جغرافیہ میں مقامات کے عرض البلد اور طول البلد نہیں تھے ۔ اس کمی کو اباکوی نے پورا کیا ۔ طول البلد کی تعیین کی غرض سے اس نے قرطناتس (Canary Islands) کو مرکزی حیثیت دی ہے (جیسے آج کل گرین وچ کو حاصل ہے) یہ کتاب دراصل جغرافیہ کی ڈکشنری ہے ۔ ہر ملک کے حیوانات، نباتات اور معدنی اشیاء کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا خیال تھا کہ سونا صرف ریگستانوں اور پہاڑوں میں پایا جاتا ہے ۔ چاندی تانبا اور لوہا پتھروں سے دستیاب ہوتا ہے اور گندھک ایک خاص قسم کے پتھر سے ۔ اسی طرح اس نے حیوانات و نباتات کی جائے وقوع کے بارے میں بھی کچھ اصول مرتب کیے تھے ۔

جارج سارٹن نے اسپین کے نامور مورخ ابن خطیب، تونس کے مشہور عالم مورخ ابن خلدون اور مصر کے مورخ القلقشندی کو بھی جغرافیہ دانوں کی صف میں ممتاز مقام دیا ہے اس لیے ان کا ذکر بھی مختصراً کر دینا مناسب ہوگا ۔

لسان الدین ابوعبداللہ محمد ابن عبداللہ محمد ابن عبداللہ السلمانی ابن الخطیب غرناطہ کے قریب مقام لوجہ میں 15 نومبر 1313ء کو پیدا ہوا ۔ اس کا مورث اعلیٰ السلمان یمن کا رہنے والا تھا ۔ ابن الخطیب نے نصری دربار میں ملازمت اختیار کی ۔ 1349ء میں وزیر کے عہدے پر فائز ہوا اور دس سال تک وزیر رہا ۔ 1359ء میں نصری سلطان محمد پنجم تخت سے اتارا گیا تو ابن الخطیب سلطان کی جلاوطنی میں اس کے ساتھ رہا ۔ 1362ء میں سلطان محمد پھر تخت نشین ہوا تو ابن الخطیب نے وزارت کا قلمدان دوبارہ سنبھالا ۔ لیکن 1371ء میں اسے بھاگ کر سبتہ میں پناہ لینی پڑی ۔ وہاں سے بھاگ کر وہ تمسان اور پھر فاس پہونچا ۔ فاس میں گرفتار کر کے اسے قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور وہیں 1374ء میں قتل کر دیا گیا ۔ سیاست سے وابستہ رہنے اور اس کے نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود ابن الخطیب نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں ۔ وہ اسپین کے عظیم اہل علم میں آخری تھا ۔ وہ تاریخ، طب اور جغرافیہ میں ید طولیٰ رکھتا تھا ۔ "خطرات الطیف فی رحلۃ الشتاء والصیف" میں اس نے سلطنت غرناطہ کے مشرقی علاقے میں اپنے سفر کے حالات اور اسپین کے شہروں کی کیفیت بیان کی ہے ۔ اسپین کے جغرافیائی حالات پر اس کتاب میں مفید معلومات فراہم کی ہیں ۔ ابن الخطیب کی کتاب کے طویل اقتباسات کا لاطینی، فرانسیسی، انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے ۔

ابوزید ولی الدین عبدالرحمٰن ابن محمد ابن خلدون التونسی الحضرمی الاشبیلی المالکی 27 مئی

1332ء کو تونس میں پیدا ہوا۔ وہ جنوبی عرب کے قبیلہ کندہ کا فرد تھا۔ اس کے مورث اعلیٰ خلدون کے بزرگ اشبیلیہ سے تیرہویں صدی کے وسط میں تونس چلے آئے، جہاں ابن خلدون پیدا ہوا۔ ابن خلدون کے والد کا تونس میں 1349ء میں طاعون سے انتقال ہوا۔ 1347ء میں مراکش کے مرینی خاندان نے تونس فتح کر لیا۔ 1352ء میں بیس سال کی عمر میں ابن خلدون سلطان کا کاتب مقرر ہوا۔ کاتب کی حیثیت سے اس نے اور بادشاہوں کی ملازمت بھی کی۔ بیس سال تک وہ کسی نہ کسی دربار میں کاتب رہا۔ کبھی وہ کسی سلطان کا معتمد خاص بن جاتا اور کبھی قید خانے کی ہوا کھاتا۔ 1374ء میں وہ گوشہ نشین ہوگیا اور چار سال اپنی تاریخ "کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر فی ایام العرب والعجم و البربر و من عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر" کے مشہور عالم مقدمہ کی تصنیف میں صرف کیے۔ پھر اپنی تاریخ کے لیے مواد فراہم کرنے کے لیے اس نے بہت سے مقامات کا سفر کیا۔ 1382ء میں وہ قاہرہ میں مالکی مذہب کا قاضی مقرر ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد اس کے گھر والے جہاز کے سفر میں ڈوب کر مر گئے اور اس کا سارا مال و دولت ضائع ہوگیا۔ 1401ء میں جب سلطان الناصر تیمور لنگ کے مقابلے کی غرض سے دمشق گیا تو ابن خلدون بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے تیمور لنگ سے ملاقات بھی کی۔ مارچ 1206ء میں اس کا انتقال ہوا۔

جارج سارٹن کی رائے میں ابن خلدون کا مقدمہ قرون وسطیٰ کی تمام تاریخی تصانیف میں سب سے زیادہ اہم و قابل ستائش ہے۔ اس کے ابتدائی اوراق میں ابن خلدون نے جغرافیائی موسمیاتی اور نسلی اعتبار سے انسانی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ عربی النسل ہونے کے باوجود اس نے عربوں کی کچھ خصوصیات کے نقائص بیان کیے ہیں۔ اس نے تاریخ عالم کو غیر جانبدارانہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اس موضوع پر طویل بحث کی ہے کہ قوموں کی تاریخ جغرافیائی حالات سے بڑی حد تک متاثر ہوتی ہے۔ تاریخ کی تشکیل میں جغرافیہ کی اثر اندازی کو نمایاں کرنے میں ابن خلدون کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے لیے وہ ہر تعریف کا مستحق ہے۔

ابن خلدون کی تاریخی تصانیف نے بہت جلد قبول عام حاصل کر لیا۔ لیکن عرب ممالک میں مقدمہ کی پذیرائی نہ ہوئی۔ سب سے پہلے مقدمہ کی طرف ترکوں نے توجہ کی۔ شیخ الاسلام محمد پیرزادہ نے جو ایک ترک عالم تھے، اس کا 1730ء میں ترکی میں ترجمہ کیا۔ اس سے پہلے چند اور ترکوں مثلاً حافظ الدین محمد ابن احمد العجمی (متوفی 1550ء)، احمد ابن مصطفیٰ تشکو پروزادہ (متوفی 1561ء) اور حاجی خلیفہ (متوفی 1657ء) نے اعتنا کیا تھا۔ ابن خلدون کی تصانیف بار بار چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا یورپی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

ابو العباس شہاب الدین احمد ابن القلقشندی المصری 56-1355ء میں مصر میں بمقام

قلقشندہ پیدا ہوا۔ وہ عربی النسل تھا۔ اس نے مملوک بادشاہ کے دیوان الانشاء (Chancellery) کی ملازمت اختیار کی اور اسی میں اپنی زندگی گزار دی۔ اس کا انتقال 15 جولائی 1418ء کو ہوا۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف "صبح الاعشافی صناعۃ الانشاء" ہے۔ یہ دراصل تاریخی، جغرافیائی انتظامی معلوماتی قاموس ہے جو مصری حکام کی رہنمائی کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ اس کی تصنیف 1387ء کے بعد شروع ہوئی اور 1412ء میں تکمیل کو پہونچی۔ اس قسم کی قاموسیں ابن قیتبہ اور فضل اللہ العمری بھی مرتب کر چکے تھے۔ صبح الاعشاء مقدمہ اور خاتمہ کے علاوہ دس مقالوں پر مشتمل ہے، دوسرے مقالہ میں اسلامی ممالک کے جغرافیہ اور تاریخ سے بحث کی گئی ہے اور دسویں مقالہ میں کبوتروں کے ذریعے خط رسانی (برید) کا بیان ہے۔ مملوک سلطان بیبرس نے (جس نے 1260ء) سے 1277ء تک مصر میں حکومت کی) کبوتروں کے ذریعہ نظام برید قائم کرنے پر خاص توجہ دی تھی۔ اس سے پہلے فاطمی فرمانرواؤں نے یہ نظام 1170ء میں قائم کیا تھا۔ مگر مملوکی دور میں اس نے بہت فروغ حاصل کیا اور اس پر بہت روپیہ خرچ کیا۔ کبوتروں کے لیے بہت سے بروج بنائے گئے۔ جلد اطلاع پہونچانے کا یہ بہت اچھا طریقہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دور سے نظر آنے والے اشاروں (Optical Signals) کے ذریعہ بھی خبریں بھیجی جاتی تھیں۔ 1400ء میں تیمور کے حملے نے اس مفید نظام کو ناقابل تلافی نقصان پہونچایا اور تھوڑے عرصے بعد یہ بالکل ختم ہوگیا۔

سوڈان کے حالات میں غفتہ النوم کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ابن خلدون نے بھی اس بیماری کا ذکر کیا تھا۔ یورپ والے اس بیماری سے 1734ء تک ناواقف تھے۔ "صبح الاعشیٰ" کے مختلف حصوں کا یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

____ تیمور کا ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ تیمور چنگیز کے بیٹے چغتائی کی اولاد میں سے ہے۔ پریم نگر لاہور کے جناب سید عبدالصبور طارق صاحب نے مطلع فرمایا ہے کہ تیمور چغتائی کی اولاد میں سے نہ تھا بلکہ اس کے اجداد میں سے ایک فرد چغتائی کا وزیر تھا۔ میں اس تصحیح کے لیے جناب طارق کا شکرگزار ہوں۔ مجھ سے یہ غلطی اس وجہ سے سرزد ہوئی کہ جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ 1370ء میں تیمور چنگیز اور چغتائی کے جانشین کی حیثیت سے بلخ کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کی عبارت اب دوبارہ پڑھنے پر واضح ہوا کہ تیمور چنگیز کے خاندان سے نہ تھا بلکہ اس کا باپ تاراغائی ایک ترکی قبیلہ کا سردار تھا۔

تاریخ طبیعی

تاریخ طبیعی

تاریخ طبیعی (Natural History) کے تحت علم الحیوان ، علم النبات اورعلم الجمادات آتے ہیں ۔ سائنسداں اورفلسفی دنیا کی ہر چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ فلسفی ذہنی کاوش یعنی غور و فکر پر اکتفا کر لیتے ہیں ۔ لیکن سائنسداں غور و فکر کے ساتھ ساتھ عملی تجربات سے نتائج اخذ کرتے ہیں ۔ قرون وسطیٰ کے مسلمان سائنسدان اپنی کوششوں کو کسی ایک علم تک محدود نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف علوم میں دستگاہ حاصل کرتے ۔ مثلاً عبداللہ الخوارزمی اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ریاضی داں اور ماہر فلکیات تھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جغرافیہ کا بھی بہت بڑا عالم تھا ۔ اس نے بطلیموس کے جغرافیہ پر بہت کچھ اضافہ کیا ۔ اسی طرح المسعودی ' البیرونی ' ابن سینا ' عبداللطیف الادریسی ' ابن رشد وغیرہ ایک سے زیادہ علوم کے ماہر تھے ۔ ایسے مسلمان سائنسدانوں میں سے بہت سوں نے تاریخ طبیعی پر بھی لکھا ہے ۔ اس لیے ان کے نام کئی علوم کے تحت لانا ضروری ہے ۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے صرف تاریخ طبیعی پر لکھا ۔ دونوں قسم کے سائنسدانوں کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں آئے گا۔

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں تاریخ طبیعی میں مسلمانوں نے یورپ کی رہنمائی کی ہے ۔ ابن سینا نے علم الحیوان (Zoology) پر ارسطو کی انیس کتابوں کا عربی میں خلاصہ مرتب کیا۔ مسلمان سائنسدانوں نے اس پر متعدد شرحیں لکھیں جن میں اپنے مشاہدات کا اضافہ کیا۔ ان شرحوں کے ذریعے یہ علم تمام اسلامی ممالک میں پھیل گیا ۔ یونان جو ارسطو کا ملک تھا اس علم سے بے بہرہ ہو چکا تھا ۔ عربی کتابوں کے ذریعہ دوبارہ علم الحیوان یورپ میں پہنچا مگر صدیوں تک انہوں نے اس سے زیادہ اعتنا نہ کیا ۔ یہ صورت حال چودہویں صدی کے بعد تک قائم رہی ۔ چودہویں صدی کی تاریخ طبیعی پر لکھتے ہوئے جارج سارٹن کہتا ہے کہ تاریخ طبیعی پر لکھنے والے مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ

آسانی کے خیال سے انہیں چارحصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا چنانچہ اس نے انہیں (1) مغرب (2) یمن (3) مصر (4) ایران میں تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ ذکر کیا ہے ۔ اس نے محمد الشرفہ ' ابن لیون ' الجاہد علی الدمشقی ' ابن شبیب ' النویری العمری ' ابن المنذر ' حمداللہ مستوفی ۔ النظام ' ابن رشد ' المسعودی ' ابن سینا ' البیرونی ' ناصر الدین طوسی ' النافقی ' الادریسی ' عبداللطیف ' ابن الصوری ' ابوالعباس البناتی ' ابن البیطار ' ابن العوام ' اسامہ ' ابن منقذ ' ابن الجوالیقی ' عبدالمومن ' الدمیاتی ' الجاحظ ' نظام ' نظامی عروضی ' ابن طفیل ' الدمیری ' اسحاق ابن مراد ' العباس الرسولی ' ابن الدریہم ' ابن ہذیل ' ابن جزی ' ابن خلدون ' ابن بطوطہ ' التیفاشی ' بیلک القبیجقی اور رشیدالدین الہمدانی کے نام بالخصوص لیے ہیں ۔ ان ناموں میں چودہویں صدی سے پہلی صدیوں کے علمائے تاریخ طبیعی بھی شامل ہیں۔

نظریہ ارتقاء

لفظ ارتقا (Evolution) یورپ میں سب سے پہلے چارلس بونٹ نے 1762ء میں استعمال کیا تھا ۔ اس نے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا تھا جو المسعودی ' الجاحظ ' نظامی عروضی ' ابن طفیل ' ابن رشد وغیرہ کے نظریوں سے واضح ہوتے ہیں ۔ سارٹن نے النظام کو بھی نظریہ ارتقا کا حامی کہا ہے مگر اس نے یہ اسلامی عقیدہ پیش کیا ہے کہ تمام انسانوں کی روحیں بیک وقت پیدا کی گئی ہیں ۔ لیکن سب انسان بیک وقت نمودار نہیں ہوتے بلکہ رفتہ رفتہ مختلف اوقات میں دنیا میں آتے ہیں ۔ اس کے نظریہ تخلیق میں ارتقائی عمل نہیں پایا جاتا ۔ النظام کا انتقال 845ء میں ہوا ۔ الجاحظ اس کا شاگرد تھا ۔ عقائد کے اعتبار سے یہ دونوں معتزلی تھے ۔ مگر ان کے تخلیق کے نظریات مختلف تھے ۔ النظام کہتا ہے کہ تخلیق مکمل ہو چکی تھی اس کا ایک حصہ مکمون ہے اور ایک ظاہر ہو چکا ہے جو مکمون ہے وہ معینہ اوقات میں ظاہر ہوتا رہتا ہے اور اسی طرح ظاہر ہوتا رہے گا۔

عمر عثمان عمر ابن بحر ' الجاحظ 69-868ء میں بصرہ میں پیدا ہوا ۔ اس کو جاحظ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھینگا تھا ۔ عقائد کے لحاظ سے وہ معتزلی تھا ۔ اس نے اپنے عقائد پھیلانے کی غرض سے ایک علیحدہ فرقہ بنایا جو اس کے نام پر الجاحظیہ کہلایا ۔ اس کو فلسفہ سے بہت دلچسپی تھی ۔ اس نے عربوں کے تمدن اور سائنس پر ایک کتاب لکھی جس کا نام " کتاب الحیوان " ہے ۔ وہ عربی النسل تھا ۔ اس کی اس تصنیف نے عربی ادب کو بڑی حد تک متاثر کیا ۔ بہت کچھ رطب ویابس کے ساتھ ساتھ اس میں فکر انگیز خیالات بھی پائے جاتے ہیں ۔ اس کے نظریہ ارتقاء نے ان نظریوں کے لیے جو بہت بعد میں یورپ میں پھیلے ' مواد فراہم کیا ہے ۔ اس نے تنازع للبقا (Struggle for Existence) ' مطابقت پذیری (Adaptation) اور نفسیات حیوانی (Animal Psychology) پر اظہار خیال کیا ہے ۔ اس کا نظریہ ارتقاء یہ تھا کہ دنیا کی ہر چیز ترقی پذیر ہے ۔ جمادات ترقی کر کے نباتات کا درجہ حاصل کر لیتے

ہیں اور نباتات حیوانات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حیوانات کی ارتقائی منزل انسان ہے۔ ول ڈیوراں اپنی تصنیف "مذہب کا دور" (Age of Faith) میں لکھتا ہے کہ جلال الدین رومی نے اس نظریہ پر قیاس کرکے کہا کہ انسان ترقی کرکے فرشتہ اور مزید ترقی کر کے خدا بن سکتا ہے۔ شاید ول ڈیوراں نے مولانا رومی کے مندرجہ ذیل اشعار سے یہ مطلب اخذ کیا ہو:

صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود
(تم سینکڑوں قسم کے حشر دیکھ چکے
تا کنوں ہر لحظہ از بدو وجود
ابتدائے وجود سے اس وقت تک)

از جمادی بے خبر سوئے نما
(پہلے تم جماد تھے پھر تم میں قوت نمو پیدا ہوئی
وز نما سوئے حیات و ابتلا
پھر تم میں جان آئی)

باز سوئے عقل و تمیزات خوش
(پھر عقل و تمیز
باز سوئے خارج ایں پنج و شش
پھر حواس خمسہ کے علاوہ اور حواس حاصل ہوئے)

در فناہا ایں بقاہا دیدۂ
(جب فناؤں میں تم نے یہ بقائیں دیکھیں
بر بقائے جسم چوں چفسیدۂ
تو جسم کی بقا پر کیوں جان دیتے ہو)

تازہ می گیر و کہن را می سپار
(نیا لو اور پرانا چھوڑ دو
کہ ہر امسالت فزونست از سہ پار
کیوں کہ تمہارا ہر سال پار سال سے اچھا ہے)

مندرجہ بالا اشعار اور ان کا مطلب مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف "سوانح مولانا روم" سے لیا گیا ہے۔ ان اشعار میں انسان سے فرشتہ اور پھر خدا بن جانا مذکور نہیں۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ جیسے ہر فنا کے بعد بہتر زندگی ملتی ہے، اسی طرح انسان کے مرنے کے بعد وہ بہتر مقام حاصل کرے گا۔ مولانا روم کے یہاں کچھ اشعار ایسے ضرور ملتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ انسان اللہ سے قرب حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً:

بہ زیر کنگرہ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

پس ازیں پستی سوئے بالا شرم
طالب آں دلبر زیبا شدم
آشنائی داشتم زاں سوئے جاں
باز زاں جا کامدم آں جا شدم
چار بودم سہ شدم اکنوں دوام
از دوئی بگذشتم و یکتا شدم

رو نمود اللہ اعلم مرمرا
کشتۂ اللہ و پس اعلم شدم

رنگ آہن محو رنگ آتش ست
ز آتشے می لافد و آہن وش ست
چوں بہ سرخی گشت ہم چو زر کاں
پس انا النار ست لافش بے گماں
شد ز رنگ و طبع آتش محتشم
گوید او من آتشم من آتشم

آخری تین شعروں میں کہا گیا ہے کہ لوہا آگ میں جل کر ہمرنگ آتش کی خوبی اختیار کرتا ہے۔ اس لیے اس کا یہ کہنا کہ میں آتش ہوں، صحیح ہو گیا۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے حلول کا مسئلہ ناقابل قبول ہے۔ لوہے اور آگ کی مثال سے حلول کا ثبوت فراہم کرنا صحیح نہ ہو گا۔ کیونکہ بہر حال دونوں کی ماہیت علیحدہ علیحدہ برقرار رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ول ڈیوراں کو اس قسم کے اشعار سے غلط فہمی ہو گئی ہے۔

ابو الحسن علی ابن الحسین ابن علی المسعودی بقول امیر علی صحابی رسول عبداللہ بن مسعود کی اولاد میں تھا۔ وہ معتزلی عقائد رکھتا تھا۔ وہ بغداد میں دسویں عیسوی کی ابتداء میں پیدا ہوا۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ الجاحظ کے نظریہ ارتقاء سے اتفاق کرتے ہوئے المسعودی نے اپنی تصنیف "کتاب التنبیہ و الاشراف" میں یہ نظریہ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ اس کا فرانسیسی میں 1896ء میں ترجمہ ہوا۔

احمد ابن عمر ابن علی السمرقندی النظامی العروضی کی پیدائش اور وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ وہ گیارہویں صدی کے آخر میں پیدا ہوا اور 1152ء یعنی بارہویں صدی کے وسط میں زندہ تھا۔ اس کا بھی یہی نظریہ تھا کہ جمادات ترقی کرکے نباتات، نباتات ترقی کرکے حیوانات اور حیوانات ترقی کرکے انسان بن جاتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ ایک درجہ سے دوسرے درجہ تک پہونچنے میں ایسی شکلیں بھی ہونی چاہیں جن میں دونوں درجوں کی خصوصیت پائی جائیں کیوں کہ ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں انتقال جست لگا کر نہیں ہوتا بلکہ بتدریج ہوتا ہے۔ نظامی عروضی نے بتایا کہ جمادات اور نباتات کی درمیانی کڑی مونگا (Coral) ہے۔ نباتات اور حیوانات کی درمیانی کڑی کھجور کا درخت ہے اور حیوانات اور انسان کی درمیانی کڑی نسناس (بے دم بندر) ہے۔

نظام عروضی کی تصنیف "چہار مقالہ" مشہور ہوئی، اس میں شاعروں، نجومیوں، طبیبوں اور کاتبوں کے بارے میں قصے اور لطیفے درج کیے ہیں اور بتلایا ہے کہ ہر بادشاہ کے لیے شاعر، نجومی، طبیب اور کاتب (سکریٹری) ناگزیر ہیں۔

ابو بکر محمد ابن عبدالمالک ابن محمد ابن محمد ابن طفیل قبیلہ قیس سے تھا۔ اس کی ولادت وادی آش میں جو اسپین میں ہے، 1115ء کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ سلطان ابو یعقوب یوسف اول کا معالج تھا۔ 86 - 1185ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف "حی ابن یقظان" میں مختلف موضوعات پر فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور مذہب کو فلسفہ کے لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابن طفیل تخلیق خودرو (Spontaneous Generation) کا قائل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ارتقائی عمل سے اشیاء خود بخود وجود میں آتی رہتی ہیں۔

ابو الولید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد (Averroes) 1126ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا شمار دنیا کے صف اول کے فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ فلسفہ کے علاوہ وہ کئی دوسرے علوم میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ طب پر اس نے "کتاب الکلیات فی الطب" لکھی اور فلکیات پر "کتاب فی حرکات الفلک"۔ اس کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ ابن رشد ارتقائے حیات کا قائل تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ صرف اللہ کے ایک بار کن فیکون کہہ دینے سے تخلیق کی تکمیل نہیں ہوگئی اور نہ چھ دن میں یہ کام پورا ہو کر ختم ہو گیا بلکہ اللہ کا تخلیقی کام ہر لحظہ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ مخلوق ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہ سکتی بلکہ جو چیزیں پیدا ہو چکی ہیں، ان میں امتداد زمانہ کے ساتھ مختلف تبدیلیاں آنا لازمی ہیں۔ وہ جس طرح ارسطو کا فلسفہ میں قائل تھا، ویسا ہی نظریہ ارتقاء میں بھی اس کی "فطرت کی تدریج" کو صحیح سمجھتا تھا۔ فطرت کی تدریجی ترقی سے فطرت کی سیڑھی مراد ہے یعنی فطرت ہر چیز بلند تر مقام پر پہونچنے کی سعی کرتی ہے اور بالآخر پہونچتی ہے۔

علم الحیوان

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ابن سینا نے ارسطو کی کچھ کتابوں کا خلاصہ مرتب کیا تھا جو مسلمانوں میں علم الحیوان کے مطالعہ کی بنیاد بنا اور اس بنیاد پر علمائے حیوانیات نے اپنے مشاہدوں سے کافی اضافہ کیا۔ مسلمانوں کا اضافہ کیا ہوا علم عربی کتابوں کے ترجموں کے ذریعہ آہستہ آہستہ یورپ میں پہونچا۔ دوسرے الفاظ میں اس علم میں بھی مسلمانوں نے یورپ کی رہنمائی کی۔ سارٹن لکھتا ہے کہ مسلمان گھوڑوں، بھیڑوں، گدھوں اور دوسرے پالتو جانوروں میں گہری دلچسپی لیتے اور اپنے مشاہدات کی بنا پر ان کی پرورش، ان کے علاج، ان کے استعمال پر کتابیں لکھتے تھے۔ گھوڑوں پر بالخصوص سب سے زیادہ توجہ مبذول کرتے جس کے نتیجہ میں علم الخیل (علم الفروس) وجود میں آیا۔ گھوڑوں کے شجرے رکھے جاتے۔ ان کے نام رکھتے، ان کی خصوصیات کا ذکر کرتے اور انہیں جنگ اور شکار میں استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتاتے۔ علم الفروس پر سب سے اچھی کتاب ابن المنذر کی "کتاب الناصری" ہے۔ ایسی کتاب قرون وسطیٰ میں عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں لکھی

گئی۔

علم الحیوان پر لکھنے والوں میں زیادہ مشہور مندرجہ ذیل علماء ہیں:

عبدالملک ابن قریب اصمعی بصرہ میں 40-739ء میں پیدا ہوا اور نوے برس سے زیادہ زندہ رہ کر 830ء میں وفات پائی۔ وہ عربی النسل تھا۔ اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس نے گھوڑوں پر "کتاب الخیل"، اونٹوں پر "کتاب الابل"، جنگلی جانوروں پر "کتاب الوحوش"، بھیڑوں پر "کتاب الشاء" اور انسانوں پر "کتاب خلق الانسان" لکھی۔

ابو الحسن علی ابن سہل ابن ربان الطبری کا باپ ایرانی یہودی تھا۔ علی الطبری مشرف بہ اسلام ہوا اور بہت پکا مسلمان ثابت ہوا۔ اس نے اسلام پر اعتراضات کے رد میں ایک کتاب لکھی (اس کا انگریزی ترجمہ ہو گیا ہے)۔ وہ قرون وسطیٰ کے سب سے بڑے طبیب الرازی کا استاد تھا۔ اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخ نہیں معلوم مگر یہ معلوم ہے کہ وہ عباسی خلیفہ المتوکل کے زمانے میں تھا جس نے 847ء سے 861ء تک حکومت کی۔ اس کی تصانیف میں "فردوس الحکمہ" مشہور ہے۔ اس کتاب میں اس نے علم الحیوان، علم الجنین، نفسیات، علم ہیئت، موسمیات، تاریخ طبیعی اور فلسفہ سے بحث کی ہے۔

ابو علی الحسین عبداللہ ابن سینا (Avicenna) 980ء میں پیدا ہوا اور اس نے 1037ء میں ہمدان میں وفات پائی۔ اس کا ذکر طبیبوں کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ اس نے علم الحیوان کی بحیثیت سائنس بنیاد ڈالی۔ ابن سینا کی تصنیف "کتاب الشفاء" میں جو حصہ تاریخ طبیعی سے متعلق ہے، اس کا انگیزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابو مظفر اسامہ ابن مرشد ابن منقذ شیزر کے قلعہ میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ اس نے صلیبی مجاہدوں کے خلاف 1150ء سے 1153ء تک لڑائیوں میں حصہ لیا۔ وہ سپہ گری کے علاوہ شاعری اور شکار کا بہت دلدادہ تھا۔ اس نے اپنی سوانح عمری "کتاب الاعتبار" میں اپنے شکاروں کا ذکر کرتے ہوئے ان جانوروں کا حال بیان کیا ہے جنہیں وہ شکار کرتا تھا اور ان کا بھی جو وہ شکار کرنے میں استعمال کرتا تھا۔ وہ اور اس کے والد مل کر شیروں، سؤروں اور جنگلی گدھوں کا شکار کھیلتے تھے۔ وہ کتوں کے علاوہ چیتوں کے ذریعہ بھی شکار کھیلتے۔ ابن منقذ نے فہد (چیتا) اور نمر (تیندوا) کی خصلتوں کا فرق بیان کیا ہے۔ اس کی کتاب کا ایک حصہ شاہین بازی اور تعاقب کر کے شکار مارنے (Chase) کے لیے وقف ہے۔ اس نے مچھلیوں کے شکار کے مختلف طریقے لکھے ہیں۔

نور الدین محمد العوفی صحابی رسول حضرت عبد الرحمن بن عوف کی اولاد میں سے تھا۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ وہ خراسان اور بخارا میں رہا۔ پھر ہندوستان آیا۔ ناصر الدین قباچہ والی سندھ کے دربار میں 1206ء کے بعد پہونچا۔ 1228ء میں قباچہ کے انتقال کے بعد العوفی نے سلطان شمس الدین (التمش) کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس نے اپنی تصنیف "لباب الالباب" میں تین سو فارسی شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کی دوسری تصنیف "جوامع الروایات" مختلف قسم کی معلومات کا مجموعہ ہے۔ اس میں علم الحیوان پر بھی معلومات فراہم کی ہیں۔

ابو محمد عبد المومن ابن خلف الدمیاتی مصر میں دمیات کے قریب ایک جزیرے میں 1217ء میں پیدا ہوا۔ وہ شافعی المذہب تھا اور علم الحدیث میں گہری نظر رکھتا تھا۔ قاہرہ میں سلطان المنصور قلاؤن نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں الدمیاتی مدرس مقرر ہوا۔ بعد میں وہ مدرسہ الظاہریہ میں پڑھانے لگا۔ 1306ء میں وفات پائی۔ اس نے گھوڑوں کے متعلق حدیثوں کو جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام "کتاب فضل الخیل" رکھا۔ اس کتاب کے آٹھ حصے ہیں: (1) جہاد میں استعمال کیے جانے والے گھوڑوں کے اوصاف کا بیان۔ (2) آختہ کرنے کی ممانعت۔ (3) گھوڑوں کا انتخاب کرنے میں رنگ کی اہمیت۔ (4) بدشگونی کی علامات۔ (5) گھوڑوں اور اونٹوں پر دوڑ میں انعامات دینے کا جواز۔ (6) مال غنیمت میں سوار کا حصہ۔ (7) مسلمانوں کے گھوڑوں پر کوئی محصول لگانا جائز نہیں۔ (8) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں کے نام۔ یہ کتاب مذہبی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے مگر اس سے بھی عرب گھوڑوں کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔

شہاب الدین ابو العباس احمد ابن عبد الوہاب النویری مصر میں 1279ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد جن کا انتقال 1300-1299ء میں ہوا سرکاری ملازم تھے۔ اس نے بھی سرکاری ملازمت اختیار کی اور مملوک سلطان الناصر محمد ابن قلاؤن کا مقرب خاص بن گیا۔ یہ سلطان تین دفعہ تخت نشین ہوا۔ پہلی تخت نشینی 1293ء میں شروع ہو کر 1294ء میں ختم ہو گئی۔ چار سال بعد وہ پھر 1298ء میں تخت نشین رہا اور دس سال حکومت کی۔ تیسری بار 1309ء سے 1340ء تک تخت نشین رہا۔ النویری نے مختلف اوقات میں سلطنت کے مختلف مقامات پر فرائض منصبی انجام دیئے۔ وہ طرابلس، شام، دخالیہ اور المرتاحیہ میں فوج کا سپرنٹنڈنٹ رہا۔ 1332ء میں 16 جون کو اس کا قاہرہ میں انتقال ہوا۔

النویری نے صرف ایک کتاب "نہایت الارب فی فنون الادب" لکھی (ارب کے معنی ذہانت کے ہیں) یہ کتاب اس نے اپنے محسن سلطان ناصر کے نام معنون کی۔ یہ ایک بہت ضخیم کتاب ہے۔ النویری کا مقصد یہ تھا کہ ایک کتاب میں وہ تمام معلومات یکجا کر دی جائیں جس کی ایک بیدار مغز عالم کو ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر منقسم کی گئی ہے: (1) افلاک و زمین کے بارے میں

جس میں علم کائنات اور رسم الارض کا بیان ہے۔ (2) انسان کے بارے میں جس میں علم الاخلاق اور علم السیاست کا بیان ہے۔ (3) حیوانوں کے بارے میں۔ (4) نباتات کے بارے میں۔ (5) تاریخ۔ (تاریخی حصہ کا جو اسپین سے متعلق ہے ہسپانوی زبان میں ترجمہ کیا گیا) حیوانوں کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے:

1- جنگلی جانور مثلاً شیر، چیتا وغیرہ۔
2- دوسرے جانور مثلاً ہاتھی، گینڈا وغیرہ۔
3- گھوڑے، مویشی، خچر، گدھے، اونٹ
4- زہریلے جانور، وہ جن کا زہر موت کا باعث ہو اور وہ جن کا زہر جان لیوا نہ ہو۔
5- پرند اور مچھلیاں۔ ان کا بیان آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، آخری باب ان کے شکار کے بارے میں ہے۔

نباتات کو بھی ان کی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ تقسیم کیا ہے:

1- نباتات کا ماخذ، ان کے اگنے کی نوعیت، ہر علاقہ کے مخصوص پودے، ترکاریاں۔
2- پیڑ جن کے پھل کے چھلکے خاردار ہوتے ہیں، وہ پیڑ جن کے پھلوں میں گٹھلیاں یا بیج ہوتے ہیں، وہ پیڑ جن کے پھلوں میں گٹھلیاں اور بیج نہیں ہوتے اور نہ چھلکے میں خار ہوتے ہیں۔
3- خوشبودار پھول۔ جن سے عطر کشید کیے جا سکتے ہیں، جیسے گلاب، کنول (نیلوفر) وغیرہ۔ پھول جن کا عطر کشید نہیں کیا جاتا، جیسے نرگس، بنفشہ وغیرہ۔
4- باغ۔ خوشبودار پھولوں کے علاوہ پھول، اٹھارہ قسم کے گوند (صمغ) امنان۔
5- خوشبودار تیل اور دوائیں۔ مشک کی مختلف قسمیں۔ عنبر، عود، سنبل ہندی، قرنفول، قسط، بالوں میں لگانے کے روغن نضوحات، آب مقطر و غیر مقطر، ادویہ۔

اس تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حیوانات و نباتات کا کیسا جامع جائزہ لیا گیا ہے۔ النویری خوشنویس تھا۔ اس نے صحیح بخاری کے اسّی نسخے لکھے اور ایک ایک ہزار درہم فی نسخہ کے حساب سے بیچے۔

محمد ابن ابراہیم ابن یحییٰ الوطواط 1235ء میں پیدا ہوا اور 1318ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ اس کی تصنیف "مباہج الفکر و مناہج العبر" جغرافیہ اور علوم طبیعی کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس میں تاریخ طبیعی پر بہت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

نور الدین محمد العوفی صحابی رسول حضرت عبد الرحمن بن عوف کی اولاد میں سے تھا۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ وہ خراسان اور بخارا میں رہا۔ پھر ہندوستان آیا۔ ناصر الدین قباچہ والی سندھ کے دربار میں 1206ء کے بعد پہونچا۔ 1228ء میں قباچہ کے انتقال کے بعد العوفی نے سلطان شمس الدین (التمش) کی ملازمت اختیار کر لی ۔ اس نے اپنی تصنیف "لباب الالباب" میں تین سو فارسی شعراء کا تذکرہ کیا ہے ۔ اس کی دوسری تصنیف "جوامع الروایات" مختلف قسم کی معلومات کا مجموعہ ہے۔ اس میں علم الحیوان پر بھی معلومات فراہم کی ہیں۔

ابو محمد عبد المومن ابن خلف الدمیاتی مصر میں دمیات کے قریب ایک جزیرے میں 1217ء میں پیدا ہوا ۔ وہ شافعی المذہب تھا اور علم الحدیث میں گہری نظر رکھتا تھا ۔ قاہرہ میں سلطان المنصور قلاؤن نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں الدمیاتی مدرس مقرر ہوا ۔ بعد میں وہ مدرسہ الظاہریہ میں پڑھانے لگا ۔ 1306ء میں وفات پائی ۔ اس نے گھوڑوں کے متعلق حدیثوں کو جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام " کتاب فضل الخیل " رکھا۔ اس کتاب کے آٹھ حصے ہیں : (1) جہاد میں استعمال کیے جانے والے گھوڑوں کے اوصاف کا بیان ۔ (2) آختہ کرنے کی ممانعت ۔ (3) گھوڑوں کا انتخاب کرنے میں رنگ کی اہمیت ۔ (4) بدشگونی کی علامات ۔ (5) گھوڑوں اور اونٹوں پر دوڑ میں انعامات دینے کا جواز ۔ (6) مال غنیمت میں سوار کا حصہ ۔ (7) مسلمانوں کے گھوڑوں پر کوئی محصول لگانا جائز نہیں ۔ (8) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں کے نام ۔ یہ کتاب مذہبی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے مگر اس سے بھی عرب گھوڑوں کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔

شہاب الدین ابو العباس احمد ابن عبد الوہاب النویری مصر میں 1279ء میں پیدا ہوا ۔ اس کے والد جن کا انتقال 1300-1299ء میں ہوا سرکاری ملازم تھے ۔ اس نے بھی سرکاری ملازمت اختیار کی اور مملوک سلطان الناصر محمد ابن قلاؤن کا مقرب خاص بن گیا ۔ یہ سلطان تین دفعہ تخت نشین ہوا ۔ پہلی تخت نشینی 1293ء میں شروع ہو کر 1294ء میں ختم ہو گئی ۔ چار سال بعد وہ پھر 1298ء میں تخت نشین رہا اور دس سال حکومت کی ۔ تیسری بار 1309ء سے 1340ء تک تخت نشین رہا ۔ النویری نے مختلف اوقات میں سلطنت کے مختلف مقامات پر فرائض منصبی انجام دیئے ۔ وہ طرابلس ، شام ، دخالیہ اور المرتاحیہ میں فوج کا سپرنٹینڈنٹ رہا۔ 1332ء میں 16 جون کو اس کا قاہرہ میں انتقال ہوا۔

النویری نے صرف ایک کتاب "نہایت الارب فی فنون الادب" لکھی (ارب کے معنی ذہانت کے ہیں) یہ کتاب اس نے اپنے محسن سلطان ناصر کے نام معنون کی ۔ یہ ایک بہت ضخیم کتاب ہے ۔ النویری کا مقصد یہ تھا کہ ایک کتاب میں وہ تمام معلومات یکجا کر دی جائیں جس کی ایک بیدار مغز عالم کو ضرورت پڑتی ہے ۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر منقسم کی گئی ہے : (1) افلاک و زمین کے بارے میں

جس میں علم کائنات اور رسم الارض کا بیان ہے ۔ (2) انسان کے بارے میں جس میں علم الاخلاق اور علم السیاست کا بیان ہے ۔ (3) حیوانوں کے بارے میں ۔ (4) نباتات کے بارے میں ۔ (5) تاریخ ۔ (تاریخی حصہ کا جو اسپین سے متعلق ہے ہسپانوی زبان میں ترجمہ کیا گیا) حیوانوں کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے:

1- جنگلی جانور مثلاً شیر ، چیتا وغیرہ۔
2- دوسرے جانور مثلاً ہاتھی ، گینڈا وغیرہ۔
3- گھوڑے ، مویشی ، خچر ، گدھے ، اونٹ
4- زہریلے جانور ، وہ جن کا زہر موت کا باعث ہو اور وہ جن کا زہر جان لیوا نہ ہو۔
5- پرند اور مچھلیاں ۔ ان کا بیان آٹھ ابواب پر مشتمل ہے ، آخری باب ان کے شکار کے بارے میں ہے۔

نباتات کو بھی ان کی نوعیت کے لحاظ سے علیحدہ تقسیم کیا ہے:

1- نباتات کا ماخذ ، ان کے اگنے کی نوعیت ، ہر علاقہ کے مخصوص پودے ، ترکاریاں۔
2- پیڑ جن کے پھل کے چھلکے خار دار ہوتے ہیں ، وہ پیڑ جن کے پھلوں میں گٹھلیاں یا بیج ہوتے ہیں ، وہ پیڑ جن کے پھلوں میں گٹھلیاں اور بیج نہیں ہوتے اور نہ چھلکے میں خار ہوتے ہیں۔
3- خوشبودار پھول ۔ جن سے عطر کشید کیے جا سکتے ہیں ، جیسے گلاب ، کنول (نیلوفر) وغیرہ ۔ پھول جن کا عطر کشید نہیں کیا جاتا ، جیسے نرگس ، بنفشہ وغیرہ۔
4- باغ ۔ خوشبودار پھولوں کے علاوہ پھول ، اٹھارہ قسم کے گوند (صمغ) امنان۔
5- خوشبودار تیل اور دوائیں ۔ مشک کی مختلف قسمیں ۔ عنبر ، عود ، سنبل ہندی ، قرنفول ، قسط ، بالوں میں لگانے کے روغن نضوحات ، آب مقطر و غیر مقطر ، ادویہ۔

اس تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حیوانات و نباتات کا کیسا جامع جائزہ لیا گیا ہے ۔ النویری خوشنویس تھا ۔ اس نے صحیح بخاری کے اسّی نسخے لکھے اور ایک ایک ہزار درہم فی نسخہ کے حساب سے بیچے۔

محمد ابن ابراہیم ابن یحییٰ الوطواط 1235ء میں پیدا ہوا اور 1318ء میں اس نے وفات پائی ۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ اس کی تصنیف "مباہج الفکر و مناہج العبر" جغرافیہ اور علوم طبیعی کا انسائیکلوپیڈیا ہے ۔ اس میں تاریخ طبیعی پر بہت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

ابو یحییٰ زکریا ابن محمد ابن محمد و القزوینی 4-1203ء میں پیدا ہوا اور 1283ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے ۔ اس کی تصنیف "عجائب المخلوقات و غرائب الموجودات" حیوانات، نباتات اور جمادات پر بہت مواد فراہم کرتی ہے۔

ابو عبداللہ محمد ابن عمر (محمد ابن رشد) سبتہ (اندلس) میں 1259ء میں پیدا ہوا اور 1321ء میں فاس میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ اس نے دو سفرنامے لکھے جن کا نام "رحلتانی" ہے ۔ ایک اسپین اور دوسرا افریقہ سے متعلق ہے ۔ ان دونوں میں تاریخ طبیعی پر مفید معلومات فراہم کی گئیں۔

حمد اللہ ابن ابی بکر مستوفی قزوین میں 1281ء میں پیدا ہوا ۔ وہ حُرالریاحی کی اولاد میں سے تھا ۔ حر امام حسین کے خلاف لڑنے آیا تھا مگر یزید کی فوج کو چھوڑ کر وہ حضرت حسین سے آملا تھا اور ان کے ساتھ 680ء میں کربلا میں شہید ہوا تھا ۔ حمد اللہ کا دادا امین الدین نصر عراق میں محاسب (Accountant) تھا ۔ محاسب کو مستوفی کہتے تھے ۔ چنانچہ مستوفی خاندانی نام ہو گیا ۔ رشید الدین الہمدانی ایل خانی بادشاہ کا طبیب اور مشیر تھا، اس نے حمد اللہ اور اس کے بھائی زین الدین محمد کو محاسب مقرر کر دیا ۔ اس بادشاہ کا نام الجیتو تھا ۔ اس نے 1304ء سے 1312ء تک حکومت کی ۔ حمد اللہ کے رشید الدین کے علمی حلقہ میں داخل ہونے کے باعث اس زمانہ کے اہل علم سے گہرے تعلقات ہو گئے جن سے مستفید ہو کر اس کی معلومات میں اضافہ ہوا ۔ اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ اہم کتاب " نزہت القلوب " ہے جو 1340ء میں مکمل ہوئی ۔ یہ فارسی میں لکھی گئی ہے ۔ اس کے پہلے مقالے میں علم الحیوان، علم النباتات اور معدنیات (Minerology) سے بحث کی گئی ہے ۔ دو سو اٹھائیس جانوروں کے حالات بیان کیے ہیں اور ان کی ایک سو کے قریب بیماریوں کی نشاندہی کی ہے ۔ جانوروں کو زاد بوم کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے : (1) پالتو جانور ۔ (2) جنگلی جانور ۔ (3) شکار کرنے والے جانور ۔ (4) زہریلے اور رینگنے والے جانور اور (5) وہ جانور جن میں انسانی مشابہت پائی جاتی ہے ۔ ان جانوروں کے بیان میں سائنس کا عنصر غالب ہے ۔ حمد اللہ مستوفی نے بہت کچھ مواد محمد العوفی اور زکریا القزوینی سے (جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) لیا ہے ۔ جانوروں کے ترکی اور منگولی نام بھی کہیں کہیں لکھے ہیں ۔ گو کتاب فارسی میں ہے مگر ناموں کی ترتیب عربی حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے ۔ عربی نام لکھ کر ان کا فارسی ترجمہ بھی درج کیا ہے ۔ اس کی تاریخ وفات معلوم نہیں نہیں۔

حمد اللہ مستوفی نے پچھتر ہزار اشعار کی ایک نظم "ظفر نامہ" لکھی ۔ یہ اس مقصد سے لکھی گئی تھی کہ فردوسی نے جو "شاہنامہ" میں ایرانی تاریخ و تمدن بیان کیا تھا، اس کو 1331ء تک کے حالات

لکھ کر پورا کیا جائے ۔ اس کا قلمی نسخہ جس میں شاہنامہ بھی شامل ہے، برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

حمد اللہ نے ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس کا نام "تاریخ گزیدہ" ہے ۔ نزہت القلوب کے کچھ حصوں کا انگریزی اور فارسی میں ترجمہ ہوا۔

الملک المجاہد علی ابن داؤد الرسولی یمن کے رسولی خاندان کا پانچواں سلطان تھا ۔ اس نے 1321ء سے 1362ء تک اکتالیس سال حکومت کی ۔ اس نے گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی پرورش اور تربیت پر ایک اہم کتاب لکھی جس کا نام " کتاب الاقوال الکافیہ و الفصول الشافیہ فی العلم البیطرہ " ہے ۔ اس کتاب کے چھ حصے ہیں جن میں پالتو جانوروں مثلاً گھوڑوں، خچروں، گدھوں، اونٹوں ہاتھیوں، بھینسوں، بھیڑوں اور مویشیوں کی نسل کشی، پرورش و پرواز و پرداخت، علاج اور سدھانے کے طریقے بتائے ہیں ۔ اس میں نسل کشوں (Breeders) اور بیطاروں (Veterinarians) کی دلچسپی کا اچھا مواد فراہم کیا گیا ہے اور علم الحیوان کے عالم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ بالخصوص جو معلومات ہاتھیوں اور اونٹوں کے بارے میں پیش کی گئی ہیں وہ اوروں کی کتابوں میں نایاب یا کمیاب ہیں ۔ اس میں اس طاعون و با کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس نے 1327ء میں یمن کے گھوڑوں کی بڑی تعداد کو ہلاک کر دیا تھا ۔ اس کتاب کا کچھ مواد دوسری کتابوں سے بھی لیا گیا ہے ۔ مگر زیادہ تر خود مصنف کے مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے ۔ 1837ء یں فخرالدین ابن احمد ابن مولا خضر الرودباری نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کے کچھ اقتباسات کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا ہے۔

ابو بکر ابن بدر الدین ابن المنذر کی پیدائش اور وفات کی تاریخ معلوم نہیں ۔ اس کی زندگی کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں ۔ اس کا باپ بیطار تھا چنانچہ ابن المنذر نے بھی وہی پیشہ اختیار کیا ۔ غالباً یہ دونوں مملوک سلطان الناصر ناصر الدین محمد ابن قلاؤن کے یہاں ملازم تھے ۔ اس زمانہ میں بادشاہوں کے اصطبل میں ہزاروں گھوڑے ہوتے تھے ۔ ان دونوں کو گھوڑوں کے بارے میں بڑے پیمانے پر معلومات حاصل کرنے کا اچھا موقع ملا ہو گا ۔ ابن المنذر نے علم الخیل اور علم البیطار پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس کا نام " کاشف الویل فی معرفت امراض الخیل " یا " کامل الصنعتین البیطارہ و الزطفہ " ہے ۔ یہ کتاب سلطان کے نام سے معنون ہونے کی وجہ سے " کتاب الناصری " کہلانے لگی۔

یہ علم الخیل اور علم البیطارہ پر قرون وسطیٰ کی سب سے زیادہ مکمل اور سب سے زیادہ باترتیب کتاب ہے ۔ عرب مصنفین کے علاوہ، ابن المنذر نے یونانی مصنفین ہرمیز، بقراط، ارسطو اور جالینوس کے حوالے بھی دیئے ہیں ۔ مگر بیشتر مواد اپنے تجربات و مشاہدات سے اخذ کیا ہے ۔ " کتاب الناصری " نو مقالات پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلے مقالے میں بیس ابواب ہیں ۔ اس میں جہاد ' گھوڑوں کی نسلوں ' ان کی نسل کشی ' ان کی عمر ' ان کے دانتوں ' ان کی شریانوں ' ان کی فصد ' ان کے ڈھانچے 'تناسب اعضا' خوراک اور پرورش 'زین اور ساز و سامان اور کھال پر قدرتی نشانات وغیرہ کا بیان۔

دوسرے مقالہ میں دس ابواب ہیں ۔ اس میں گھوڑوں ' خچروں اور گدھوں کی کھالوں ' بالوں اور رنگوں کا ذکر ہے۔

تیسرے مقالے میں دس ابواب ہیں ۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ میں استعمال کرنے کے لیے کس قسم کے گھوڑے منتخب کیے جائیں ۔ اصیل گھوڑے ' گھوڑوں اور گھوڑیوں کا فرق ' گھوڑوں کے ہنہنانے کے مختلف طریقے ' پیدائشی خامیاں ' گھوڑوں اور گدھوں کے بچے ' خچروں اور گدھوں کی مختلف قسموں پر بھی لکھا ہے۔

مقالہ 6-7 اور 8 میں بہت سے ابواب ہیں ۔ اس میں دواؤں کو ان کی خصوصیات کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے ۔ مثلاً سفوفوں کو علیحدہ ' مرہموں کو علیحدہ اور آنکھوں کی دواؤں کو علیحدہ درج کیا ہے۔

اس کتاب کا فرانسیسی میں 60-1852ء میں ترجمہ ہوا۔

ابو یحییٰ محمد ابن رضوان ابن ارقام (ارقم) اسپین کا رہنے والا تھا۔ اس کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں ۔ اس کا انتقال 1352ء میں ہوا ۔ وہ ریاضی داں ہونے کے علاوہ گھوڑوں سے بھی دلچسپی رکھتا تھا ۔ اس نے غرناطہ کے ناصری بادشاہ محمد ثالث کے لیے گھوڑوں پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب الاحتفال فی استیفاء تصنیف مالتخیل" (خیل کے بعد "من الاحوال" بھی ہونا چاہیے)۔

ابو عبداللہ شمس الدین محمد ابن ابراہیم الانصاری السنجیری المصری السخادی کا زیادہ مشہور نام ابن الاکفانی ہے ۔ اس کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں ۔ اس کا انتقال 9-1348ء میں ہوا ۔ اس کا ذکر طبیبوں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے ۔ اس کی کئی تصانیف ہیں ۔ "ارشاد القاصد الاسناء المقاصد" میں اس نے اور علوم کے علاوہ بیطاری 'شاہینوں کی پرورش و پرداخت اور زراعت سے بھی بحث کی ہے ۔ وہ یوں تو طبابت کرتا تھا مگر تاریخ طبیبی کا بھی عالم تھا ۔ اس نے تاریخ طبیبی پر دو کتابیں لکھی تھیں ۔ اس کی تصنیف " نخب الذخائر فی احوال الجواہر " میں چودہ جواہر کی ماہیت سے بحث کی گئی ہے ۔ نخب کا جرمنی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابو محمد عبداللہ ابن محمد ابن جزی ۔ اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ چودھویں صدی کے تیسرے ربع میں موجود تھا ۔ اس کے بھائی ابو عبداللہ محمد نے 1354ء میں ابن بطوطہ کے سفرنامے "رحلہ" کی تالیف کے فرائض انجام دیئے۔

ابو محمد عبداللہ نے علم الخیل پر ایک کتاب لکھی جس کا نام " کتاب مطلع الیمن و الاقبال فی انتقاء کتاب الاحتفال و استدراک مافاتہ 'من المقال " ہے ۔ یہ کتاب اس نے غرناطہ کے ناصری بادشاہ محمد پنجم کے نام سے (جو 1354ء سے 1359ء تک اور پھر 1362ء سے 1391ء تک تخت نشین رہا) معنون کی ۔ دراصل یہ کتاب محمد ابن رضوان ابن ارقم کی تصنیف " کتاب الاحتفال فی استیفا تصنیف مالتخیل من الاحوال " میں ردوبدل کر کے تالیف کی گئی ہے ۔ ابن ارقم نے اپنی تصنیف ناصری سلطان محمد اول کے نام سے معنون کی تھی ۔ اس سلطان کا زمانہ حکومت 1232ء سے 1273ء تک ہے ۔ ابن ارقم کا انتقال 1259 میں ہوا (نوٹ سارٹن نے ایک جگہ ابن ارقام سے یہ کتاب منسوب کی ہے اور دوسری جگہ ابن ارقم سے ۔ ابن ارقام کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی کتاب ناصری سلطان ناصر ثالث کے نام سے معنون کی تھی ۔ ابن ارقام کی تاریخ وفات 1356ء بتائی ہے اور ابن ارقم کی 1259ء ۔ سارٹن کی کتاب کا انڈکس دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ارقم اور ابن ارقام دو مختلف اشخاص نہیں بلکہ صرف ایک شخص ہے جس کا صحیح نام محمد بن رضوان ابن ارقم ہے ۔ اسی کو ابن ارقام لکھ دیا ہے۔ جس ابن ارقام کا حال سارٹن نے بیان کیا ہے اس کا سال وفات 1356ء لکھا ہے)۔

ابن ارقم کی کتاب میں بہت سی فنی اصطلاحات تھیں جن میں سے بیشتر ابن جزی نے حذف کر دیں اور کئی ابواب کا اضافہ کیا جن میں جانوروں کی ذہانت کے متعلق قصے بیان کیے ہیں ۔ ان میں ہد ہد کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اس نے علاج و معالجہ کا بیان بھی نظر انداز کر دیا ہے ۔ ان وجوہ سے ابن جزی کی کتاب علمی کتاب ہونے کے بجائے قصہ کہانیوں کی کتاب بن گئی ہے۔

علی ابن عبدالرحمٰن ابن ہذیل کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ وہ چودھویں صدی کے دوسرے نصف اور غالباً پندرھویں صدی کی ابتدا میں بقید حیات تھا ۔ ابن ہذیل غرناطہ کا رہنے والا اور ابن جزی کا شاگرد تھا۔ اس نے گھوڑوں پر تین کتابیں لکھی ہیں:

1- "کتاب الفوائد المطرہ فی علم البیطارہ" — یہ کتاب ناصری سلطان محمد پنجم کے نام معنون کی۔

2- "تحفۃ الناس و شعار سکان الاندلس" — یہ کتاب بھی ناصری سلطان محمد پنجم کے نام معنون کی۔

3- "حیات الفرسان و شعار الشجعان" یہ کتاب ناصری سلطان محمد ہفتم کے نام معنون کی۔

حیات الفرسان دراصل تحفۃ الانفس کی مختصر اور ترمیم شدہ شکل ہے۔ اس میں بیس ابواب ہیں: (1) گھوڑوں کی تخلیق، ان کو سدھانا اور جگہ جگہ پھیلا دینا (2) ان کی مخفی خصوصیات (3) ان کی داشت و پرداخت (4) مختلف اعضاء کے نام (5) قدرتی اور اکتسابی خرابیاں (9) ان کو پرکھنے کے طریقے، ان کے چہرے مہرے کی بنا پر قیافہ (10) سواری کے گھوڑے (11) گھڑ دوڑ اور بازی لگانا (12) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں کے نام اور دوسرے مشہور گھوڑے (13) ان کے متعلق اصطلاحات (14) ان کے متعلق اشعار (15) تلوار (16) نیزہ (17) تیر کمان (18) زرہ بکتر (19) ڈھال (20) ہتھیار اور دوسرا سازوسامان۔

تحفۃ الانفس کا پہلا حصہ جہاد اور رباط پر مشتمل ہے اور دوسرے حصہ میں علم الخیل سے بحث کی گئی ہے۔ حیات الفرسان میں جہاد و رباط کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تحفۃ الانفس کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا جا رہا ہے۔

تاج الدین علی ابن محمد ابن عبدالعزیز ابن الدریہم 1312ء میں موصل میں پیدا ہوا۔ اس نے دمشق، قاہرہ، حلب کا سفر کیا۔ وہ بنی امیہ کی دمشق کی مسجد میں مدرس مقرر ہوا۔ 1359ء میں وہ قاہرہ منتقل ہو گیا۔ مملوک سلطان الناصر حسن نے اسے سفارت پر حبش بھیجا مگر وہ راستہ میں بمقام قوص دسمبر 1360ء میں فوت ہو گیا۔

ابن الدریہم علم الحیوان کا عالم تھا۔ اس نے جانوروں کی خصوصیات پر "کتاب منافع الحیوان" لکھی جو 1354ء میں مرتب ہوئی۔ اسکوریل (Escorial) میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ یہ عربی کے نہایت خوبصورت قلمی نسخوں میں سے ہے۔ اس میں دو سو پچاس جانوروں کی سنہری سطح پر بنی ہوئی تصویریں شامل ہیں۔ تصویروں کو اصل کے مطابق بنانے میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ جو باقی ہے اس میں پالتو اور جنگلی جانوروں، چڑیوں، مچھلیوں، رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

جانوروں، پودوں، پھولوں وغیرہ کی تصویریں بنوانا (Inconography) اور اپنی کتابوں کو تصویروں سے مزین کرنا مسلمان مصنفین کو بہت مرغوب تھا۔ تاریخ طبیعی کی بہت سی

کتابیں آج بھی موجود ہیں جن میں ایسی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ ابن صوری (جس کا ذکر آگے آئے گا) مصور کو اپنے ساتھ جنگل لے جاتا تھا تاکہ جڑی بوٹیوں کی تصویریں بنوا کر اپنی کتاب میں شامل کرے۔

ابوالبقا کمال الدین محمد ابن موسیٰ الدمیری 1342ء میں قاہرہ میں پیدا ہوا۔ الازہر میں تعلیم پائی بعد میں وہ خود اس جامع میں مدرس مقرر ہوا۔ 1360ء اور 1379ء کے درمیان اس نے پانچ حج کیے۔ 1379ء کے بعد دو سال وہ مکہ میں مقیم رہا۔ 1405ء میں اس کا قاہرہ میں انتقال ہوا۔ وہ امام شافعی کا پیرو تھا۔ وہ فرقہ خانقاہیہ میں شامل ہو کر صوفی ہو گیا۔ اس نے مذہب پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم النوادی کی شافعی فقہ پر "منہاج الطالبین" کی شرح ہے جس کا نام "النجم الوہاج فی شرح المنہاج" ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

جو کتاب الدمیری کی شہرت کا باعث ہوئی وہ "کتاب حیات الحیوان" ہے۔ اس کی تصنیف 1372ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں بہت سے جانوروں کا حال بیان کیا ہے جن میں کچھ محض خیالی ہیں مثلاً براق۔ جانوروں کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے لیکن شیر کو جنگل کا بادشاہ ہونے کی وجہ سے اس ترتیب سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ مقالات کی ترتیب یہ ہے: (1) جانوروں کا نام اور اس کی لغوی حیثیت (2) جانور کے حالات (3) جانوروں کے متعلق وہ حدیثیں جو صحاح ستہ یا دوسری کتابوں میں ملتی ہیں (4) جانوروں کے متعلق قانونی مسائل۔ اس کے حلال و حرام ہونے پر چاروں اماموں کی رائے، ان کے علاوہ اور فقہاء مثلاً امام غزالی کے اقوال (5) ہر جانور کے بارے میں زبان زد کہاوتیں (6) جانوروں کے مختلف اعضاء کے خواص، طبی نقطہ نظر سے۔ (7) مختلف جانوروں کو خواب میں دیکھنے کی تعبیریں۔

الدمیری بہت پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے آٹھ سو سات مصنفین کے حوالے دیے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی کتابوں کے بھی حوالے دیئے ہیں جن کے مصنفین کے نام معلوم نہیں۔ بہت سے یونانی مصنفین مثلاً ہرمیز، بقراط، افلاطون، ارسطو، جالینوس بھی ان مصنفین میں شامل ہیں، جن کے حوالے الدمیری نے دیئے ہیں۔ الدمیری اکثر اصل موضوع سے ہٹ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتا ہے۔ اِوَز (ہنس) پر لکھتے لکھتے وہ خلافت کی تاریخ لکھنے لگتا ہے اور پورے بہتر صفحے اس کی نذر کر دیتا ہے۔ عقرب (بچھو) کے بیان میں شطرنج اور نرد کا ذکر آتا ہے۔ علق (جونک) کے ذکر میں حضرت موسیٰ کے بچپن کے حالات بیان کرنے لگتا ہے۔ بہت سی کہانیاں کتاب "حیات الحیوان" اور "الف لیلہ" میں مشترک ہیں۔ ان قصے کہانیوں کی وجہ سے الدمیری کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے تین طرح کے نسخے الکبرہ، الوسط اور الصغرہ رائج ہو گئے۔ السیوطی نے اس کتاب کے اشعار

یکجا کرکے ایک رسالہ مرتب کیا جس کا نام "دیوان الحیوان" رکھا۔ اس کا 1664ء میں لاطینی میں ترجمہ ہوا اور اس کا بڑا حصہ فرانسیسی میں منتقل کیا گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل اے۔ ایس۔ جی۔ جیکر (Jayakar) نے نے جلد اول و دوم کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو ایک ہزار چار سو اٹھانوے صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ 8-1906ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ کتاب "حیات الحیوان" کے اقتباسات کا فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

محمد ابن منگلی الناصری کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ مملوک سلطان الاشرف شعبان کے (جس نے 1363ء سے 1376ء تک حکومت کی) محافظ فوجی دستہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ ابن منگلی نے شہ سواری اور شکار پر کئی کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور و معروف "انس الملا بوحش الفلا" ہے۔ یہ اپنے موضوع پر بہت ہی جامع تصنیف ہے۔ سب سے پہلے وہ شکار کے حلال یا حرام ہونے کے مسئلہ کو لیتا ہے۔ جو شکار ذبح نہ کیا گیا ہو وہ حلال نہیں، جو کند آلہ سے مارا گیا ہو وہ بھی حلال نہیں۔ اس کے بعد وہ شکار کے ہتھیاروں کے استعمال کا طریقہ بتاتا ہے۔ شکار کھیلنے میں جو مختلف قسم کی کمانیں، نیزے، پھینک کر مارنے والی برچھیاں، پتھر، ڈنڈے، تلواریں اور خنجر استعمال کیے جاتے تھے، وہ ان میں سے ہر ایک کا موقع محل اور صحیح استعمال بتاتا ہے۔ چیتوں کو زندہ پکڑنے، انہیں سدھانے اور پھر ان کے ذریعہ شکار کھیلنے کی ترکیبیں بتاتا ہے۔ تیندوے کو سدھانے اور اسے شاہین کے ساتھ شکار میں استعمال کرنے اور کتوں کو شکار کی تربیت دینے کے طریقے بیان کرتا ہے۔ جن جانوروں کا شکار کھیلنے کے لیے انتخاب کیا ہے وہ ہیں غزال، شیر، ہاتھی، باگھ، لکڑ بھگا، بھیڑیئے، سور، چیتے، تیندوے، بن بلاؤ اور ایرانی سیاہ گوش، صقر، باز، عقاب کی مختلف قسموں کا ذکر کرتا ہے اور انہیں سدھانے کے طریقے بتاتا ہے۔ نسر (Eagle) اور انواق (Pygargus) کو شکار میں استعمال کرنے اور صقر (شاہین) سے شترمرغ کا شکار کھیلنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان شکاری چڑیوں کے نر اپنی مادہ کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں۔ لاسا استعمال کرنے کا قاعدہ بھی بتاتا ہے۔ جال میں خرگوش اور دوسرے جانوروں کو پھانسنے کی ترکیبیں بتائی ہیں۔ نقصان پہونچانے والے جانوروں اور پرندوں، چوہوں، چھچھوندروں، کیڑوں اور چیونٹیوں کو کھیتوں اور تاکستانوں سے نکالنے کی تدبیریں اور سانپوں سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں بیان کی ہیں۔ موروں، مگرمچھوں (تماسح) سقنقوروں، کچھووں، دریائی گھوڑوں اور بلاؤں (قندسوں) کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ جانوروں کے مختلف اعضاء اور ان کو بطور دوا استعمال کرنے کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ یہ کتاب صرف ایک سو چون صفحات پر مشتمل ہے، لیکن یہ بہت مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ طرز تحریر بھی خوش آئند ہے۔ کہیں کہیں دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، بغیر کسی ابہام کے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔

محمد ابن لاجین الحسینی الطرابلسی الرّماح کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ طرابلسی الرماح کے معنی ہیں طرابلسی نیزہ باز۔ اس نے 9-1378ء میں امیر اشک تیمور سیف الدین الماردینی کے لیے جو حلب کا گورنر تھا، سوار فوج (Cavalry) کی تربیت اور داؤ پیچ پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "بغیۃ القاصدین بالعمل فی المیادین" ہے۔ اس کے والد نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "تحفۃ المجاہدین فی العمل بالمیادین" تھا۔ محمد ابن لاجین شام کا رہنے والا تھا۔ اس موضوع پر تین اور کتابیں اس سے منسوب ہیں۔

طیبغا ابن عبد اللہ الاشرفی البکلمشی الیونانی۔ وہ یونانی ترک تھا۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں صحیح طور پر معلوم نہیں۔ شاید اس کا انتقال 1394ء میں ہوا۔ اس نے مملوک سلطان الاشرف شعبان کے لیے تیرکمان سے شکار کھیلنے پر ایک قصیدہ لکھا جس کا نام "بغیۃ المرام و غایۃ الغرام" یا "غنیۃ الرامی و غایۃ المرام" ہے۔ اس نے اس موضوع پر دو اور کتابیں بھی لکھیں جن کے نام ہیں "غنیۃ الطلاب فی معرفت الارمی بالنشاب" اور "کتاب فی الجہاد و الفردوسیہ و فنون الآداب الحربیہ" ہیں۔

محمود ابن محمد البارجینی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ وہ بارجین کا رہنے والا تھا جو جنوب مغربی اناطولیہ میں ایک قصبہ ہے۔ چوتھی صدی کے تیسرے ربع میں محمود نے ترکی زبان میں شاہین بازی پر "باز نامہ" لکھا۔ دیباچہ میں وہ لکھتا ہے کہ باز نامہ پہلے ایک مہذب زبان میں لکھا گیا تھا۔ (سارٹن کا خیال ہے کہ شاید مہذب زبان سے یونانی زبان مراد ہو) اس کا عربی میں ترجمہ ہوا پھر عربی سے فارسی میں اور فارسی سے ترکی میں ہوا۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ محمود کا باز نامہ صرف ترجمہ ہے، یا یہ کئی کتابوں سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ذاتی مشاہدات کا ذکر کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ ذاتی مشاہدات محمود کے تھے یا "مہذب زبان" لکھنے والے کے۔

یہ کتاب صرف پچانوے صفحات پر مشتمل ہے مگر اس میں ایک سو پچیس ابواب ہیں جن میں کچھ بہت مختصر ہیں۔ اس کتاب میں محمود نے کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جو بارہویں صدی میں اس موضوع پر تصنیف ہوئی تھیں، ان کے مصنفین کے نام یہ ہیں: جمالی محمد گنجہ جو ساسانی خاندان سے تھا۔ اس نے اپنی کتاب 1145ء میں لکھی۔ عزالدین محمد البلالا ساغنی نے 1181ء میں ایک ترکی سلطان اور ہندوستان کے بادشاہ کے لیے دمشق میں لکھی۔ ابوالقاسم نے اسکندریہ میں ایک کتاب 1194ء میں لکھی۔ امام الدین اصفہانی نے 1195ء میں ایک کتاب بعلبک میں تصنیف کی۔ مولانا بدرالدین محمد بلخی نے 1174ء میں حلب میں ایک کتاب لکھی۔ خراسان کے علی کامہ کے لیے شرف الدین الپ ارسلان قرابلی نے ایک کتاب عرض روم میں 1195ء میں لکھی۔ اس نے شہنشاہ قسطنطنیہ کے لیے 1175ء میں ایک کتاب قسطنطنیہ میں مرتب کی۔

یکجا کر کے ایک رسالہ مرتب کیا جس کا نام "دیوان الحیوان" رکھا۔ اس کا 1664ء میں لاطینی میں ترجمہ ہوا اور اس کا بڑا حصہ فرانسیسی میں منتقل کیا گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل اے۔ ایس۔ جی۔ جیکر (Jayakar) نے نے جلد اول و دوم کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو ایک ہزار چار سو اٹھانوے صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ 1906-8ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ کتاب "حیات الحیوان" کے اقتباسات کا فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

محمد ابن منگلی الناصری کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ مملوک سلطان الاشرف شعبان کے (جس نے 1363ء سے 1376ء تک حکومت کی) محافظ فوجی دستہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ ابن منگلی نے شہ سواری اور شکار پر کئی کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور و معروف "انس الملا بوحش الفلا" ہے۔ یہ اپنے موضوع پر بہت ہی جامع تصنیف ہے۔ سب سے پہلے وہ شکار کے حلال یا حرام ہونے کے مسئلہ کو لیتا ہے۔ جو شکار ذبح نہ کیا گیا ہو وہ حلال نہیں، جو کند آلہ سے مارا گیا ہو وہ بھی حلال نہیں۔ اس کے بعد وہ شکار کے ہتھیاروں کے استعمال کا طریقہ بتاتا ہے۔ شکار کھیلنے میں جو مختلف قسم کی کمانیں، نیزے، پھینک کر مارنے والی برچھیاں، پتھر، ڈنڈے، تلواریں اور خنجر استعمال کیے جاتے تھے، وہ ان میں سے ہر ایک کا موقع محل اور صحیح استعمال بتاتا ہے۔ چیتوں کو زندہ پکڑنے، انہیں سدھانے اور پھر ان کے ذریعہ شکار کھیلنے کی ترکیبیں بتاتا ہے۔ تیندوے کو سدھانے اور اسے شاہین کے ساتھ شکار میں استعمال کرنے اور کتوں کو شکار کی تربیت دینے کے طریقے بیان کرتا ہے۔ جن جانوروں کا شکار کھیلنے کے لیے انتخاب کیا ہے وہ ہیں غزال، شیر، ہاتھی، باگھ، لکڑ بھگا، بھیڑیئے، سور، چیتے، تیندوے، بن بلاؤ اور ایرانی سیاہ گوش، صقر، باز، عقاب کی مختلف قسموں کا ذکر کرتا ہے اور انہیں سدھانے کے طریقے بتاتا ہے۔ نسر (Eagle) اور انواق (Pygargus) کو شکار میں استعمال کرنے اور صقر (شاہین) سے شترمرغ کا شکار کھیلنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان شکاری چڑیوں کے نر اپنی مادہ کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں۔ لاسا استعمال کرنے کا قاعدہ بھی بتاتا ہے۔ جال میں خرگوش اور دوسرے جانوروں کو پھانسنے کی ترکیبیں بتائی ہیں۔ نقصان پہونچانے والے جانوروں اور پرندوں، چوہوں، چھچھوندروں، کیڑوں اور چیونٹیوں کو کھیتوں اور تاکستانوں سے نکالنے کی تدبیریں اور سانپوں سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں بیان کی ہیں۔ موروں، مگرمچھوں (تماسح) سقنقوروں، کچھووں، دریائی گھوڑوں اور بلاؤں (قندسوں) کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ جانوروں کے مختلف اعضاء اور ان کو بطور دوا استعمال کرنے کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ یہ کتاب صرف ایک سو چون صفحات پر مشتمل ہے، لیکن یہ بہت مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ طرز تحریر بھی خوش آئند ہے۔ کہیں کہیں دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، بغیر کسی ابہام کے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔

محمد ابن لاجین الحسینی الطرابلسی الرّماح کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ طرابلسی الرماح کے معنی ہیں طرابلسی نیزہ باز۔ اس نے 1378-9ء میں امیر اشک تیمور سیف الدین الماردینی کے لیے جو حلب کا گورنر تھا، سوار فوج (Cavalry) کی تربیت اور داؤ پیچ پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "بغیۃ القاصدین بالعمل فی المیادین" ہے۔ اس کے والد نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "تحفۃ المجاہدین فی العمل بالمیادین" تھا۔ محمد ابن لاجین شام کا رہنے والا تھا۔ اس موضوع پر تین اور کتابیں اس سے منسوب ہیں۔

طیبغا ابن عبد اللہ الاشرفی البکلمشی الیونانی۔ وہ یونانی ترک تھا۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں صحیح طور پر معلوم نہیں۔ شاید اس کا انتقال 1394ء میں ہوا۔ اس نے مملوک سلطان الاشرف شعبان کے لیے تیرکمان سے شکار کھیلنے پر ایک قصیدہ لکھا جس کا نام "بغیۃ المرام و غایۃ الغرام" یا "غنیۃ الرامی و غایۃ المرام" ہے۔ اس نے اس موضوع پر دو اور کتابیں بھی لکھیں جن کے نام ہیں "غنیۃ الطلاب فی معرفت الرامی بالنشاب" اور "کتاب فی الجہاد و الفردوسیہ و فنون الآداب الحربیہ" ہیں۔

محمود ابن محمد البارجینی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ وہ بارجین کا رہنے والا تھا جو جنوب مغربی اناطولیہ میں ایک قصبہ ہے۔ چوتھی صدی کے تیسرے ربع میں محمود نے ترکی زبان میں شاہین بازی پر "بازنامہ" لکھا۔ دیباچہ میں وہ لکھتا ہے کہ بازنامہ پہلے ایک مہذب زبان میں لکھا گیا تھا۔ (سارٹن کا خیال ہے کہ شاید مہذب زبان سے یونانی زبان مراد ہو) اس کا عربی میں ترجمہ ہوا پھر عربی سے فارسی میں اور فارسی سے ترکی میں ہوا۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ محمود کا بازنامہ صرف ترجمہ ہے، یا یہ کئی کتابوں سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ذاتی مشاہدات کا ذکر کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ ذاتی مشاہدات محمود کے تھے یا "مہذب زبان" لکھنے والے کے۔

یہ کتاب صرف پچانوے صفحات پر مشتمل ہے مگر اس میں ایک سو پچیس ابواب ہیں جن میں کچھ بہت مختصر ہیں۔ اس کتاب میں محمود نے کئی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جو بارہویں صدی میں اس موضوع پر تصنیف ہوئی تھیں، ان کے مصنفین کے نام یہ ہیں: جمالی محمد گنجہ جو ساسانی خاندان سے تھا۔ اس نے اپنی کتاب 1145ء میں لکھی۔ عزالدین محمد البلالاساغنی نے 1181ء میں ایک ترکی سلطان اور ہندوستان کے بادشاہ کے لیے دمشق میں لکھی۔ ابوالقاسم نے اسکندریہ میں ایک کتاب 1194ء میں لکھی۔ امام الدین اصفہانی نے 1195ء میں ایک کتاب بعلبک میں تصنیف کی۔ مولانا بدرالدین محمد بلخی نے 1174ء میں حلب میں ایک کتاب لکھی۔ خراسان کے علی کامہ کے لیے شرف الدین الپ ارسلان قرابلی نے ایک کتاب عرض روم میں 1195ء میں لکھی۔ اس نے شہنشاہ قسطنطنیہ کے لیے 1175ء میں ایک کتاب قسطنطنیہ میں مرتب کی۔

اس کتاب میں شاہین بازی کی ابتدا کے بارے میں قیاس آرائی کی گئی ہے جس کی صحت مشتبہ ہے۔ محمود نے شکاری پرندوں کی مختلف انواع کا اور ان کے رنگوں اور خواص کا ذکر کیا ہے اور شکاری نقطہ نظر سے ان کے اچھے اور برے ہونے کا معیار مقرر کیا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ انہیں کیا کھلانا چاہیے اور انہیں کس طرح سدھایا جائے۔ اس کتاب کے ابواب 30 تا 155 سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ان میں بازوں کی مختلف اقسام کی بیماریوں کو بیان کرکے ان کے علاج تجویز کیے ہیں۔ چڑیوں کے ترکی، عربی اور فارسی نام لکھے ہیں۔ اسی کتاب کا جرمن میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

علم النبات

قرون وسطیٰ میں نباتات پر لکھنے والوں میں سب سے زیادہ اہم مسلمان تھے۔ نویں اور دسویں صدی میں تین بڑے نباتی (Botanists) الدینوری، ابن الوحشیہ اور ابو عبداللہ التمیمی ہوئے ہیں الدینوری نے "کتاب النبات"، ابن الوحشیہ نے "کتاب الفلاحہ احتیاطہ" (طسے) اور ابو عبداللہ نے "کتاب المرشد الاجواہر الاغذیہ و القواء المفردات" لکھی۔ ان تینوں نے نباتات پر مستقل کتابیں لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ بارہویں، تیرہویں اور چودھویں صدیوں میں مسلمان نباتیوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اور ابن البیطار جیسا عظیم نباتی پیدا ہوا۔ ابن البیطار کے بارے میں رابرٹ بریفو اپنی مشہور تصنیف "انسانیت کی تعمیر" (The Making of Humanity) میں لکھتا ہے کہ اس نے سارے اسلامی ممالک سے نباتات کے نمونے جمع کیے اور ایران اور ہندوستان کی نباتات کا یونانی اور اسپین کی نباتات سے مقابلہ کیا۔ اس نے ایک ہزار چار سو پودوں کا حال بیان کیا۔ یہ انسانی مشقت و استقلال کا شاندار کارنامہ ہے۔ نباتات پر علیحدہ کتابوں اور رسالوں (Herbals) کے علاوہ معلومات کا بڑا ذخیرہ ان قاموسوں میں پایا جاتا ہے جو الدمشقی، العمیری ابن شبیب وغیرہ نے مرتب کیں۔

ابو حنیفہ احمد داؤد الدینوری عراق عجم میں بمقام دینور 815ء اور 825ء کے درمیان پیدا ہوا۔ اس کا انتقال 895ء میں ہوا۔ وہ اپنے وطن کے علاوہ اصفہان میں بھی رہا۔ وہ نباتی ہونے کے ساتھ ساتھ مورخ اور ہیئت دان بھی تھا۔ اس کی تصنیفوں میں سب سے زیادہ اہم "کتاب النبات" ہے۔ یہ علم النبات کی تاریخ پر گرانقدر تصنیف ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں اس نے علم زراعت اور علم نباتات پر جن عام اصولوں کو بیان کیا ہے وہ بالخصوص قابل قدر ہیں۔ "کتاب النبات" دستیاب نہیں مگر اس کتاب کے اقتباسات ابن سیدہ ابن البیطار اور دوسرے نباتیوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس کتاب سے تین چار سو پودوں کا حال دوسروں نے نقل کیا ہے۔

ابو بکر احمد (یا محمد) ابن علی ابن الوحشیہ الکلدانی (یا النباطی) کی ولادت اور وفات کی تاریخیں

معلوم نہیں۔ وہ بابل کے کلدانیوں کے نباتی خاندان سے تھا۔ 912ء سے قبل اس کا انتقال ہوا۔ عربوں پر کلدانیوں کو فوقیت دینے کے لیے اس نے زراعت پر "کتاب الفلاحہ النباطیہ" لکھی اور یہ مشہور کیا کہ اس نے کلدانی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھو کہ اس زمانہ کی تہذیب کتنی ترقی یافتہ تھی جس میں ایسے اچھے طریقوں سے زراعت ہوتی تھی۔ یہ کسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ خود ابن وحشیہ کی تصنیف ہے۔ اس میں زراعت پر مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کچھ توہمات بھی اس میں شامل ہیں۔

ابو عبداللہ محمد ابن احمد ابن سعید التمیمی المقدسی۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں مگر وہ 980ء میں زندہ تھا۔ وہ بیت المقدس میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا پیشہ طبابت تھا۔ اس نے دواؤں پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "المرشد الاجواہر الاغذیہ و قواء المفردات" ہے جس میں نباتات اور معدنی دواؤں پر مفید معلومات ملتی ہیں۔ اس کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔

ابو جعفر ابن محمد الغافقی کی تاریخ ولادت نہیں معلوم۔ اس کا انتقال 1165ء میں ہوا۔ وہ غافق کا رہنے والا تھا جو قرطبہ کے قریب ہے۔ وہ طبیب اور نباتی تھا۔ اس کا ذکر طبیبوں کے سلسلہ میں کیا جاچکا ہے۔ نباتات کی تلاش میں وہ اسپین اور افریقہ میں گھومتا پھرا۔ اس نے جو پودوں کی تفصیلات و کیفیات بیان کی ہیں ان سے زیادہ صحیح کسی قرون وسطیٰ کے نباتی نے نہیں بیان کیں۔ مفرد ادویہ پر وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی تصنیف "کتاب الادویہ المفردہ" بہت مشہور ہوئی اور اس کی دو تلخیصیں مرتب کی گئیں۔ ابن البیطار نے اس کی کتاب کے اقتباسات اپنی کتاب میں جگہ جگہ دیئے ہیں۔

ابو زکریا یحییٰ ابن محمد ابن احمد ابن العوام الاشبیلی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں نہیں معلوم البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ بارہویں صدی کے آخر میں زندہ تھا۔ اس نے زراعت پر قرون وسطیٰ کی سب سے اہم کتاب لکھی، جس کا نام "کتاب الفلاحہ" ہے۔ اس کے چونتیس باب ہیں جن میں سے تیس ابواب زراعت سے متعلق ہیں اور باقی چار مویشیوں، مرغیوں اور شہد کی مکھیوں پر ہیں۔

ابن العوام نے ابن الوحشیہ کی کتاب "الفلاحہ النباتیہ" سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن بہت کچھ اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھا ہے۔ اس نے پانچ سو پچاسی نباتات اور بہت سے پھل والے درختوں کا حال بیان کیا ہے۔ زمین کی مختلف قسموں کی قوت نامیہ اور مختلف کھادوں کے انتخاب کے بارے میں رائے دی ہے۔ قلم لگانے کے صحیح طریقے بتائے ہیں۔ پیڑوں میں باہمی موانست اور مغائرت کی

نشاندہی کی ہے۔ بہت سی بیماریوں کی جو درختوں اور بیلوں میں ہوتی ہیں، علامتیں واضح کی ہیں اور ان کا علاج بھی بتایا ہے۔

ابو عبداللہ محمد الادریسی 1100-1099ء میں سبتہ (اسپین) میں پیدا ہوا اور 1166ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔ اس نے "نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق" میں تین سو ساٹھ مفردات کا حال بیان کیا ہے اور نباتات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ نباتات کے علاوہ حیوانوں کے متعلق بھی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ "نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق" جغرافیہ اور تاریخ طبیعی پر ایک گرانقدر تصنیف ہے۔

ابو محمد عبداللطیف بغداد میں 1162ء میں پیدا ہوا اور بغداد ہی میں اس کا انتقال 1231ء میں ہوا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے دمشق کی جامع مسجد کے مدرسہ میں پروفیسر مقرر کر دیا تھا۔ صلاح الدین کے انتقال کے بعد وہ جامع الازہر قاہرہ میں مدرس مقرر ہوا۔ مصر میں اس نے نباتات، حیوانات، آثار قدیمہ وغیرہ کا بنظر غائر مشاہدہ کیا اور اپنے مشاہدات کو اپنی تصنیف "الافادت والاعتبار فی الامور المشاہدات والحوادث المعانیت بہ ارض مصر" میں درج کیا ہے۔ اس کتاب کا وہ حصہ جو نباتات سے متعلق ہے، بالخصوص بہت اہم ہے۔ عبداللطیف عالم متبحر تھا۔ اس سے ایک سو ساٹھ تصانیف منسوب ہیں۔ اس کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔

منصور (یا ابو منصور) ابن ابی فضل ابن علی رشید الدین ابن الصوری 78-1177ء میں صور (Tyre) میں پیدا ہوا اور دمشق میں 1242ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے دمشق میں عبداللطیف سے طب پڑھی اور ایوبی سلطان المعظم کے یہاں ملازمت کی۔ المعظم 1227ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے جانشین سلطان الناصر نے ابن الصوری کو رئیس الاطباء مقرر کیا۔ ابن الصوری ایک اچھا طبیب ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک اچھا نباتی بھی تھا۔ اس نے نباتات کے نمونے حاصل کرنے کے لیے لبنان کے پہاڑوں میں بہت وقت گزارا۔ وہ اپنے ساتھ ایک مصور کو لے جاتا تھا تاکہ وہ پودوں کی تصویریں بناتا جائے اور ہر ایک کو اس کے صحیح رنگ میں دکھائے۔ ایک ایک پودے کی کئی کئی تصویریں بنواتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہر پودے کے نشو و نما کے مختلف مدارج کی تصویریں حاصل کرے۔ اس نے غائر مطالعہ کے بعد مفرد دواؤں پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "الادویہ المفردہ" تھا۔ وہ یونانی حکماء ڈائی اوس کو ریڈیز (Dioscorides) اور جالینوس (Galen) کی کتابوں سے اچھی طرح واقف تھا اور الغافقی کا بھی مطالعہ کر چکا تھا۔

ابو العباس احمد ابن مفرج (یا ابن الرومیہ) النباتی 66-1165ء تا 73-1171ء میں اشبیلیہ

(اسپین) میں پیدا ہوا۔ اسے ابن الرومیہ اس لیے کہا گیا کہ اس کی والدہ یونانی یا عیسائی تھی۔ وہ حافظ قرآن اور حاجی تھی۔ چونکہ وہ بہت بڑا نباتی تھا، اس لیے النباتی کے نام سے مشہور ہوا۔ عموماً لوگ نباتات کا علم طبی اغراض کے لیے حاصل کرتے تھے۔ مگر ابو العباس نے ان کا مطالعہ خالص نباتی نقطہ نظر سے کیا۔ اس نے یہ علم کتابوں کے بجائے زیادہ تر اپنے مشاہدات و تجربات سے حاصل کیا۔ اس نے مختلف ممالک کی نباتات سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے اسپین، شمالی افریقہ، مصر اور حجاز کے سفر کیے۔ ایوبی سلطان العادل السیف الدین نے چاہا کہ ابو العباس قاہرہ میں مستقل قیام کرے۔ مگر وہ کچھ عرصہ رہ کر نباتات کی جستجو میں شام اور عراق کے سفر پر روانہ ہو گیا جہاں اسے کچھ ایسے پودے دستیاب ہوئے جو مغربی ممالک میں نہیں پائے جاتے تھے۔ طویل عرصے کے بعد وہ غالباً صقلیہ (Sicily) ہوتا ہوا اپنے وطن اسپین میں پہونچا۔ وہاں اس نے اپنے سفر کے حالات میں "کتاب الرحلہ" لکھی جس میں زیادہ تر نباتات کا حال قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب ناپید ہے لیکن اس کے بہت سے اقتباسات ابن البیطار کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ بحر قلزم (Red sea) کے کنارے اگنے والی نباتات میں اس نے کچھ ایسی جڑی بوٹیوں کی نشاندہی کی جن سے لوگ واقف نہ تھے۔ اس سے دو اور کتابیں بھی منسوب ہیں۔ ان میں سے ایک دواسازی پر ہے۔ ابن البیطار ابو العباس کا شاگرد تھا۔ ابن العباس کا انتقال 40-1239ء میں ہوا۔

ابو محمد عبداللہ ابن البیطار المالقی بارہویں صدی کے آخری حصہ میں مالقہ (Malaga) میں پیدا ہوا اور 1248ء میں اس نے دمشق میں وفات پائی۔ وہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ قرون وسطیٰ میں دنیا کا سب سے بڑا نباتی تھا۔ وہ ابو العباس النباتی کا شاگرد تھا اور اس نے اپنے استاد کے ساتھ کچھ عرصہ تک جنگلوں میں جا کر نباتات کے نمونے فراہم کیے تھے۔ 1219ء میں اس نے شمالی افریقہ اور مصر کا سفر کیا۔ کچھ عرصے بعد اسے مصر کے ایوبی سلطان الکامل نے رئیس علی سائر العشابین (Chief Herbalist) مقرر کیا (عشب ہری جڑی بوٹی کو کہتے ہیں)۔ 1237ء میں سلطان الکامل کے قلمرو میں دمشق بھی آگیا تو ابن البیطار اس کے ساتھ دمشق گیا۔ کچھ عرصے کے لیے مصر واپس آیا مگر پھر دمشق چلا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ ابن البیطار نے فلسطین شام اور عرب کے جنگلوں سے بھی نباتات کے نمونے حاصل کیے۔

ابن البیطار کی اہم ترین تصنیف "کتاب الجامع الادویہ المفردہ" ہے۔ پہلی صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی کے وسط تک کوئی کتاب اس موضوع پر "کتاب الجامع" ایسی نہیں لکھی گئی۔ اس میں صرف مفردات اور ادویہ ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ غذائی نباتات کی مختلف انواع کا حال بھی درج ہے۔ اس نے ایک ہزار چار سو نباتات سے بحث کی ہے، ان میں دو سو پودے وہ ہیں جن کی نشاندہی پہلی بار اس نے کی۔ اس نے اپنی کتاب میں ایک سو پچاس مصنفین کے حوالے دیئے ہیں

جن میں ذائی اوس کریڈیز اور جالینوس ' الرازی اور ابن سینا بھی شامل ہیں ۔ نباتات کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے کی ہے۔

ابن البیطار کی دوسری اہم تصنیف " کتاب المعنی فی الادویہ المفردہ " ہے ۔ یہ بیس ابواب پر مشتمل ہے ۔ ہر باب میں ایک ایک اعضا کے امراض کی دوائیں درج کی ہیں ۔ مثلاً پہلے باب میں سر کے امراض کی دواؤں کا بیان ہے ' دوسرے میں کان کے امراض کی اور تیسرے میں آنکھ کے امراض کی دواؤں کا بیان ہے ۔ آخر کے ابواب میں وہ تیل اور ابٹن بتائے ہیں جو بالوں اور چہروں پر لگائے جاتے ہیں ۔ مفردات کا جن سے بخاروں کا علاج کیا جاتا ہے اور متفرق ادویہ اور تریاقوں کا ذکر بھی کیا ہے ۔ کتاب المعنی دراصل مخزن الادویہ ہے ۔ اس میں ابوالقاسم (Abulcasis) کی کتاب "التصریف" کا بار بار حوالہ دیا ہے ۔ ابوالقاسم مسلمان ماہرین جراحی میں سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔

سولھویں صدی میں پوسٹل (Guillaume postel) نے ابن البیطار کی تصانیف کو یورپ میں رائج کرنے کی کوشش کی ۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں دوسرے مستشرقین نے ابن البیطار کی اہمیت کا احساس کیا۔ 1824ء میں اس کی کتابوں کا کئی یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

شہاب الدین ابوالعباس احمد ابن یحییٰ ابن فضل اللہ العمری القریشی الشافعی دمشق میں 11 جون 1301ء کو پیدا ہوا اور دمشق ہی میں طاعون سے 28 فروری 1349ء کو اس کا انتقال ہوا ۔ اس نے 1340-41ء میں " التعریف بالمصطلح الشریف " لکھی اور اپنی عمر کے آخری سات سال میں اس نے "مسالک الابصار فی ممالک الامصار " تصنیف کی ۔ یہ دراصل ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جو تیئیس یا ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اس میں جغرافیہ ' تاریخ ' عربی شاعری کی تاریخ اور مشہور لوگوں کے سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں ۔ العمری کا ذکر جغرافیہ دانوں کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے ۔ مسالک الابصار میں تاریخ طبیعی پر معلومات کا کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

مسالک الابصار کے مختلف حصوں کا فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابوالفداء اسماعیل ابن علی نومبر 1273ء میں پیدا ہوا اور اکتوبر 1331ء میں اس نے وفات پائی ۔ وہ بہت بڑا جغرافیہ داں اور مورخ تھا ۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ وہ علم النبات اور مخزن الادویہ سے بخوبی واقف تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ علم طب پر بھی اس نے ایک کتاب لکھی تھی ۔ اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں جن کے نام " مختصر تاریخ البشر " اور تقویم البلدان " ہیں ۔ ان کتابوں کے مختلف حصوں کے یورپی زبانوں میں ترجمے کیے گئے ہیں۔

ابوعثمان سعد ابن احمد ابن لیُون التجیبی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ۔ وہ 30 اگست 1349ء کو طاعون میں مبتلا ہو کر فوت ہوا ۔ اس کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو تجیب سے تھا ۔ یہ خاندان اسپین فتح ہوتے ہی وہاں جا بسا تھا ۔ ابن لیون کی زندگی کا کچھ حصہ غرناطہ میں گزرا ۔ اسپین کا مشہور طبیب اور مورخ ابو عبداللہ محمد ابن عبداللہ السلمان امین الخطیب (1313ء سے 1374ء) ابن لیون کا شاگرد تھا ۔ ابن لیون نے زراعت باغبانی پر نظم میں ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "ابداء الملاوا نہاء الرجاحہ فی اصول صناعۃ الفلاحہ " ہے ۔ یہ نظام پندرہ سو سطروں (مصرعوں) پر مشتمل ہے ۔ اس میں بہت سی لاطینی اور ہسپانوی اصطلاحات بھی نظم کی ہیں ۔ 1940ء میں اس کا اسپین میں ترجمہ کیا جا رہا تھا۔

ابوعبداللہ محمد ابن علی القربلیانی الشفرہ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات معلوم نہیں ۔ وہ چوتھی صدی کے ربع اول میں زندہ تھا ۔ شفرہ اس بڑے چاقو کو کہتے ہیں جو شاخیں کاٹنے اور جڑیں کھودنے میں استعمال ہوتا ہے ۔ چونکہ ابوعبداللہ محمد مشہور نباتی تھا ' اور غالباً وہ عموماً بڑا چاقو استعمال کرتا ہو گا ' اس لیے شفرہ کہلانے لگا ۔ وہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں پہاڑوں میں گھومتا پھرتا تھا ۔ اس نے علم النبات میں اچھی دستگاہ حاصل کی ۔ وہ نباتی ہونے کے علاوہ طبیب اور ماہر جراحی بھی تھا ۔ اس کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

اس کی " کتاب الاستقصاء والابرام فی علاج الجراحات والاورام " کے تین قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔

ابوالخیر رشید الدین فضل اللہ ابن عماد الدولہ الہمدانی 1247ء میں ہمدان میں پیدا ہوا ' وہ ایل خانی بادشاہوں کا طبیب تھا ۔ سلطان غازان محمود نے 1298ء میں اسے اپنا وزیر اعظم بنایا ۔ سلطان الجائیتو کو زہر دینے کے الزام میں 18 جولائی 1318ء کو رشید الدین اور اس کا لڑکا قتل کیا گیا ۔ رشید الدین عالم متبحر تھا ۔ اس کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ اس کی ایک تصنیف تاریخ طبیعی پر بھی ہے جس کا نام " کتاب الاحیاء والآثار " ہے ۔ اس کے چوبیس ابواب ہیں جن میں موسمیات ' زراعت ' علم الاشجار اور نخل پروری پر لکھا ہے اور نباتات کے دشمن کیڑے مکوڑے مارنے ' کاشتکاری کرنے ' مویشی پالنے ' زمین سے دھات نکالنے ' دھاتوں کو صاف کرنے اور عمارتیں اور جہاز بنانے کے طریقے بیان کیے ہیں۔

ابوعبداللہ محمد ابن عبداللہ ابن محمد ابن بطوطہ 24 فروری 1204ء کو پیدا ہوا اور 1277-78ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس کا مفصل ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ اس کے سفر نامہ "رحلہ"

میں نباتات ' حیوانات اور دھاتوں پر مفید معلومات ملتی ہیں ۔ وہ جس ملک میں گیا وہاں کے پیڑوں ' پھلوں ' مسالوں ' وغیرہ کا ذکر عموماً کیا ہے ۔ رحلہ میں ایسے جانوروں کا ذکر بھی ملتا ہے جو کسی خاص ملک سے مخصوص ہوں ۔ مثلاً گینڈا ' رخ ' سفید ہاتھی اور دریائی گھوڑا وغیرہ ۔ جو اہرات اور کچھ دھاتوں کا حال بھی اس نے لکھا ہے ۔

الملک الافضل العباس ابن علی الرسولی کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ۔ وہ یمن کے رسولی خاندان کا چھٹا فرمانروا تھا ۔ اس نے 1362ء سے 1376ء تک حکومت کی ۔ اس کے والد سلطان المجاہد علی کا ذکر حیوانات کے عالموں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ العباس نے زراعت پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی جس کا نام "بغیۃ الفلاحین فی الاشجار المثمرہ و الریاحین" ہے ۔ اس کے سترہ ابواب ہیں جن میں حسب ذیل چیزوں کا بیان ہے :

(1) زمینوں کی قسمیں (2) مختلف کھاد (3) پانی (4) زمین کی اصلاح (5) موسموں کا کاشتکاری سے تعلق (6) مختلف اناج جو ' گیہوں ' چاول ' باجرہ ' کودوں وغیرہ پیدا کرنے کے طریقے (7) مختلف دالیں پیدا کرنے کے طریقے (8) خربوزے ' تربوز ' سردا ' بیگن ' پیاز ' شلغم ' گاجر پیدا کرنے کے طریقے ۔ (9) مسالے (10) خوشبوئیں (11) پھل والے درخت ' کھجور ' انگور ' انجیر ' انار ' سیب ' ناشپاتی ' زیتون ' ناریل کیلا ' گنا ' کپاس ' لیموں ' نارنگی ' سنترہ وغیرہ کا ذکر (12) پیڑوں کا کاٹنا (13) قلم لگانا (14) مختلف نباتات کی خصوصیتیں (15) پودوں کو محفوظ رکھنا (16) متفرق باتیں مثلاً بطور دوا استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں ' یمن میں (1333-4ء) میں لوہے کی دریافت (17) ناپ تول کے اوزان ۔ سات قسم کی آب و ہوا ۔

ابو العباس نے جگہ جگہ اپنے والد کی یاد داشتوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ کیا کیا اس نے اپنے والد سے لیا ہے ۔ اس کے دادا اور پردادا بھی نباتات و حیوانات سے خاص شغف رکھتے تھے ۔ اس کے پردادا سلطان الاشرف عمر ابن یوسف نے زراعت پر "ملح الملاحہ فی معرفت الفلاحہ" اور اصطرلاب پر "معین الطلاب علی عسل الاصطرلاب" لکھی تھیں ۔ العباس نے افلاطون ' ارسطو ' خلیل ابن احمد اور ابن البصّال کے حوالے دیئے ہیں مگر اشبیلیہ کے ابن العوام کا ذکر نہیں کیا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن العوام کی کتاب اس وقت تک یمن نہیں پہونچی تھی ۔

جارج سارٹن کی رائے میں اس مفید کتاب کا ترجمہ یورپی زبانوں میں کیا جانا چاہیے ۔ سارٹن کہتا ہے کہ زراعت پر یہ اپنے زمانہ کی بہترین کتاب تھی ۔ یہ کاشتکاری اور باغبانی پر نہایت جامع تصنیف ہے ۔

اسحٰق ابن مراد کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ وہ ترا تویب اور نباتی تھا ۔ وہ اناطولیہ کا باشندہ تھا ۔ غالباً اس کی پیدائش جرید (Perede) میں ہوئی تھی جو Black sea جسے بحر اسود بھی کہتے ہیں کے جنوب میں واقع ہے ۔ اس کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ اس نے ترکی میں دو کتابیں لکھیں جن کے نام " خلاصۃ الطب " اور " خواص الادویہ " ہیں ۔ ان دونوں کا سال تصنیف 1388-89ء ہے ۔ ابن مراد نے پہاڑوں اور جنگلوں میں گھوم پھر کے بہت سی نباتات کا بغور مشاہدہ کیا ۔ خواص الادویہ میں صرف ان جڑی بوٹیوں کا ذکر ہی نہیں ہے جو بطور دوا استعمال میں آتی ہیں ' بلکہ اور نباتات کا حال بھی بیان کیا ہے ۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں ۔ پہلے میں جڑی بوٹیوں کو حروف تہجی کے لحاظ سے لکھا ہے اور دوسرے میں ان کا استعمال بتایا ہے ۔

علم جمادات

علم جمادات پر مسلمان حکماء میں سب سے پہلے المسعودی نے جو دسویں صدی عیسوی میں ہوا ہے ' اظہار خیال کیا ۔ علم طبقات الارض (Geology) کے نقطہ نظر سے دنیا کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا کہ ہیئتی اور طبیعی عوامل کے باعث جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے ' دنیا کی ہیئت میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے ۔ ندیاں سمندر بن جاتی ہیں ' سمندر خشک ہو کر زمین کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ' خشک زمین سمندر میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ البیرونی جو (973ء سے 1048ء تک زندہ رہا) المسعودی کا ہم خیال تھا ۔ اس کی رائے میں وادی سندھ پہلے سمندر میں ڈھکی ہوئی تھی ۔ سمندر کی تہ میں مٹی جمتی گئی اور پانی کم ہوتا گیا ۔ یہاں تک کہ سمندر غائب ہوتا گیا اور زمین خشک ہو کر رہنے کے قابل ہو گئی ۔ البیرونی نے اپنی کتاب " تحدید نہایات الاماکن فی تسطیح مسافات المساکن " میں المسعودی کے اس نظریہ کو سمندر زمین میں اور زمین سمندر میں تبدیل ہوتی رہتی ہے ' بڑے اعتماد کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ ابن سینا نے بھی اپنی تصنیف " کتاب الشفاء " میں طبقات الارضی نظریہ پیش کیا ہے جو المسعودی اور البیرونی کے نظریوں سے مطابقت رکھتا ہے ۔ " کتاب الشفاء " کا تیرہویں صدی کی ابتدا میں ہی لاطینی میں ترجمہ ہو گیا تھا ۔ چنانچہ ابن سینا کا نظریہ المسعودی اور البیرونی کے نظریوں سے پہلے یورپ میں پھیلا ۔ ابن سینا 980ء سے 1037ء تک زندہ رہا ۔ اس کی کتابیں یورپ میں بہت مقبول ہوئیں ۔ کتاب الشفاء میں ابن سینا نے قیمتی پتھروں کی فہرست (Lapidary) بھی دی ہے ۔ المسعودی ' البیرونی اور ابن سینا کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ۔ معدنیات سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے مصنفین کا حال نیچے درج کیا جاتا ہے :

ابو العباس احمد ابن یوسف شہاب الدین التیفاشی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ۔ 1353-4 میں اس کا انتقال مصر میں ہوا ۔ اس نے جواہرات پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام " کتاب

ازہار الافکار فی جواہر الاحجار " ہے (ازہار کے معنی غنچوں کے ہیں) یہ کتاب پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلاباب دراصل دیباچہ ہے اور باقی چوبیس میں چوبیس قیمتی پتھروں کا الگ الگ بیان ہے۔ ہر پتھر کے بارے میں یہ معلومات فراہم کی ہیں:

(1) ماخذ (2) وہ مقامات جہاں سے برآمد ہوتا ہے (3) اوصاف (4) غیر معمولی صفات (5) استعمال (6) تجارتی اعتبار سے قدر و قیمت۔

ایک اور کتاب "مطالع البدور فی منازل السرور" بھی اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن یہی کتاب علی ابن عبداللہ علاؤ الدین البہائی الغرولی الدمشقی سے بھی منسوب ہے۔ علی ابن عبداللہ کا انتقال 1412-13ء میں ہوا۔ اس کتاب کے پچاس ابواب ہیں۔ اس میں جواہرات اور ان کے استعمال سے بحث کی گئی ہے۔ التیفاشی نے محبت کے بارے میں تین کتابیں لکھیں جن میں "نزہت الالباب فی مالا یوجد فی کتاب" بہت مشہور ہوئی۔ ابو جعفر محمد ابن محمد ابن الحسن ناصر الدین طوسی 1201ء میں پیدا ہوا اور 1274ء میں اس نے وفات پائی۔ وہ بہت بڑا ریاضی داں تھا۔ اس کا ذکر ریاضی دانوں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ اس نے معدنیات پر فارسی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "تنسوق نامہ اہل خانہ" ہے (تنسوقات کمیاب اشیاء اور عجائبات وغیرہ کو کہتے ہیں)۔

بیلک القبجقی کی ولات و وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ 1242ء سے 1282ء تک وہ قاہرہ میں مقیم تھا۔ اس لیے 1283ء میں جواہرات پر "کتاب کنزالتجار فی الاحجار" لکھی اور اسے مملوک سلطان المنصور ثانی سیف الدین قلاؤن کے نام معنون کیا۔ اس سلطان نے 1279 سے 1290ء تک حکومت کی۔ مصنف نے تیئیس دوسرے مصنفوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں یونانی مصنفین ہرمیز، اپولونی ارس، ارسطو اور بطلیموس اور مسلمان مصنفین المسعودی، البیرونی، الغزالی اور التیفاشی شامل ہیں۔ اس کا مواد زیادہ تر التیفاشی کی کتاب سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں قطب نما کا بھی ذکر کیا ہے جو ملاح جہاز رانی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس نے یہ قطب نما 1242-43ء میں بحر روم میں استعمال ہوتے دیکھا تھا (بحر روم کو بحر ابیض متوسط بھی کہتے ہیں)۔

شمس الدین ابو عبداللہ محمد ابن ابراہیم ابن ابی طالب الانصاری الصوفی الدمشقی کی پیدائش 1256-7ء میں غالباً دمشق میں ہوئی اور صفد میں 1326-27ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک انصاری صحابی کی اولاد میں تھا۔ وہ الربوہ کی مسجد کا امام تھا۔ الربوہ دمشق کی پہاڑیوں پر واقع تھا۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "کتاب نخبت الدہر فی عجائب البر والبحر" ہے۔ اس کے نو حصے ہیں۔ دوسرے حصے میں اس نے سات دھاتوں یعنی سونا، چاندی، تانبا، لوہا، جست، سیسہ (یا پارہ) اور

رانگا (ٹین) کا حال لکھا ہے۔ الدمشقی کو معدنیات، طبقات الارض اور دھاتوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے نباتات اور حیوانات پر بھی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ الدمشقی کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔

نجم الدین احمد ابن حمادان ابن شبیب الحرانی الحنبلی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں تاہم 1332ء میں اس کا مصر میں ہونا ثابت ہے۔ اس کی تصنیف "جامع الفنون (یا جامع العلوم) و سلوت الحزون" ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں اور موضوعات کے علاوہ تاریخ طبیعی پر بھی لکھا ہے۔ اس نے معدنوں اور قیمتی پتھروں کا بالخصوص ذکر کیا ہے۔ ابن شبیب کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔

ابو عبداللہ شمس الدین محمد ابن ابراہیم الانصاری السنجاری المصری السخاوی معروف بہ ابن الاکفانی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ اس کا انتقال 1348-49ء میں ہوا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک انصاری صحابی کی اولاد میں سے تھا اور عراق کا باشندہ تھا۔ اس کا پیشہ طبابت تھا۔ اس نے قاہرہ میں طبابت کی اور طاعون کی وبا میں وہ فوت ہوا۔ اس کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں دو تاریخ طبیعی سے متعلق ہیں۔ "نخب الذخائر فی احوال الجواہر" میں اس نے بارہ جواہرات کے حال اور خصوصیات سے بحث کی ہے۔ "ارشاد القاصد الاسناد المقاصد" میں اور موضوعات کے علاوہ اس نے زراعت، بیطار اور عقابوں کی نسل کشی اور داشت و پرداخت کے طریقے بتائے ہیں۔

خام دھاتوں کو صاف کرنے کا فن (Metallurgy): اس فن میں مسلمانوں نے بڑی دستگاہ حاصل کی تھی۔ ابویحییٰ زکریا ابن محمد ابن محمود القزوینی نے (جو تیرہویں صدی میں ہوا ہے اور جس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جاچکا ہے) سابورقان (خام دھات) نرم آہن اور فولاد کی امتیازی خصوصیات بتائی ہیں۔ خام آہن سے فولاد بنانے کے طریقوں سے مسلمان خوب واقف تھے، دمشق اور طلیطلہ (اسپین) کی تلواریں فولاد کی خوبی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور تھیں۔ ان تلواروں کے فولاد کو بڑی عرق ریزی سے تیار کیا جاتا تھا۔ پختگی کے ساتھ ساتھ لچک بھی پیدا کی جاتی تھی اور خوشنمائی کے لیے دھاریاں بھی فولاد کے اندر ڈالی جاتی تھیں۔ سارٹن کہتا ہے کہ لوہے کے معاملہ میں مسلمان قرآن کی اس ہدایت پر جو سورہ حدیدؐ میں دی گئی ہے، عمل کرتے تھے یعنی وہ اس سے جنگی ہتھیار بھی بناتے تھے اور اسے مفید کاموں میں بھی استعمال کرتے تھے۔

سارٹن کا خیال ہے کہ فولاد بنانے کی صنعت سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوئی۔

(۱)

اس سورۃ کی پچیسویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے لوہا اتارا (پیدا کیا) جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے منافع ہیں۔ (حبیب احمد)

بعد میں مسلمانوں کے ذریعہ یہ صنعت یورپ اور وسط ایشیا کے ذریعہ چین و جاپان پہونچی ۔ بہت جلد جاپانی عمدہ فولاد بنانے لگے ۔ ممکن ہے کہ وہ یہ صنعت پہلے ہی سے جانتے ہوں ۔ لوہے کو بار بار گرم اور ٹھنڈا کرنے کے تجربات کیے جائیں تو فولاد بنانا آجاتا ہے مگر بہترین فولاد بنانے کے لیے بہت تجربہ درکار ہوتا ہے ۔

ول ڈیوراں نے اپنی مشہور تصنیف "مذہب کا عہد" (Age of Faith) میں مسلمانوں کی حیوانات ، نباتات اور جمادات سے دلچسپی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مویشی ، گھوڑے ، اونٹ ، ہاتھی ، بکریاں اور کتے پالتے اور سو طرح کے اناج ، ترکاریاں ، پھل ، پھول اور میوے پیدا کرتے تھے ۔ دسویں صدی عیسوی سے قبل سنترے کے پیڑ ہندوستان سے لا کر انھوں نے عرب میں لگائے اور پھر اس پھل کو شام ، ایشیائے کوچک ، فلسطین ، مصر اور اسپین میں پھیلایا جہاں سے یہ جنوبی یورپ میں پہونچا ۔ یورپ میں سب سے پہلے کپاس مسلمانوں ہی نے بوئی اور زراعت کو ترقی دینے کی غرض سے نہروں کے جال بچھادیئے ۔

دسویں صدی میں جو چار ارضی جنتیں سمجھی جاتی تھیں وہ یہ تھیں : (1) دمشق کے اردگرد کا علاقہ (2) جنوبی ایران (3) جنوبی عراق اور (4) بخارا اور سمرقند کا درمیانی علاقہ ۔ اسپین میں بھی مسلمانوں نے زراعت اور باغبانی کو بہت ترقی دی ۔ مسلمانوں سے پہلے وہاں بیلوں سے ہل چلاتے تھے ۔ مسلمانوں نے بیل کے بجائے گھوڑے ، گدھے اور خچر استعمال کرنا شروع کیے اور پھر انہیں کا رواج ہوگیا ۔ عرب کے گھوڑے دنیا بھر میں مشہور تھے ۔ اسپین میں عرب گھوڑوں کے ذریعہ نسل کشی کر کے وہاں کے گھوڑوں کو بہتر بنایا گیا ۔ عربوں ہی نے یورپ کو چاول ، گنے ، انار ، آڑو ، کیلے ، چیری ، سنترے ، لیموں ، کھجور ، انجیر ، اسٹرابری ، پالک ، ادرک ، لوبان ، اور روئی وغیرہ سے آشنا کیا ۔ انھوں نے سارے اسپین میں بے شمار باغ لگائے ۔ قرطبہ ، غرناطہ اور ویلنشیا کے مضافات باغوں کی کثرت کی وجہ سے یورپ میں ارضی جنتیں کہلانے لگے ۔ جزیرہ مجورکا (Majorca) جسے مسلمانوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں فتح کیا تھا ، پھلوں اور پھولوں کا فردوس بن گیا ۔

معدنی ذخائر کے بارے میں ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ اسپین میں جو سونے ، چاندی ، ٹین ، تانبے ، لوہے ، سیسے ، پھٹکری ، گندھک وغیرہ کی کانیں تھیں ، ان کی کھدائی وغیرہ کا کام ہاتھ میں لے کر مسلمانوں نے دولت میں اضافہ کیا ۔ سمندر سے موتی اور کانوں سے یاقوت نکالنے کی صنعتوں میں توسیع کی ۔ بہترین فولاد تیار کر کے تلواریں اور ڈھالیں بنائیں ۔ چنانچہ طلیطلہ کی تلواریں اور قرطبہ کی ڈھالیں دنیا بھر میں مشہور ہوگئیں ۔

مختصر یہ کہ جس طرح قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے ریاضی ، ہیئت ، طب اور دیگر علوم کو بہت ترقی دی اور انہیں دنیا بھر میں پھیلا دیا ، ویسے ہی حیوانات ، نباتات ، اور معدنیات کو ترقی دی اور انہیں اسلامی ممالک کے علاوہ یورپ میں بھی پھیلانے کا باعث بنے ۔

"مسلمانوں کی مختصر تاریخ" (A Short History of the Saracens) میں سید امیر علی نے لکھا ہے کہ عربوں کی حکومت کے دور میں اسپین کے برابر دنیا کا کوئی ملک زرعی حیثیت سے خوشحال نہیں تھا ۔ انھوں نے زراعت کو سائنس بنا لیا تھا ۔ اپنی زرعی معلومات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انھوں نے محنت و مشقت اور تندہی سے کام لیا اور دیکھتے دیکھتے سارے ملک کو خوشحال بنا دیا ۔ افتادہ اور بنجر زمینوں کو مناسب کھادوں کے ذریعے قابل کاشت بنایا اور پھر ان میں ایسی فصلیں بوئیں جن سے ان کی زرخیزی میں اضافہ ہوا ۔ عربوں نے اسپین میں چاول ، گنا ، کپاس ، زعفران ، پالک اور بہت سے پھلدار درخت لگائے جن سے وہاں کے لوگ ناآشنا تھے ۔ عربوں کے لائے ہوئے اناج ، پھل اور ترکاریاں رفتہ رفتہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں اگائی جانے لگیں ۔ مسلمانوں نے اسپین میں بہت سی نہریں بنائیں جن سے زراعت کو بڑی ترقی ہوئی ۔ عباسیوں کے دور میں زراعت کا ذکر کرتے ہوئے امیر علی نے لکھا ہے کہ خلیفہ مہدی نے واسط کے ضلع میں ایک نہر بنوائی جس سے ایک بہت بڑا رقبہ زراعت کے قابل بن گیا ۔ اس کے علاوہ اور بہت سی نہریں بنا کر زراعت اور باغبانی کو خوب ترقی دی ۔ مسلمانوں میں زراعت کو ترقی دینا ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عراق اور جنوبی ایران باغوں اور کھیتوں کی کثرت کے باعث جنت ارضی کہلانے لگے ۔ خراسان میں لوہے اور کرمان میں سیسے اور چاندی کی کانوں سے تربیت یافتہ لوگوں کی نگرانی میں معدنی ذخائر نکالے جاتے تھے ۔

نہروں کا جو نظام زراعت کی ترقی کے لیے مسلمان فرمانرواؤں نے صدیوں میں قائم کیا تھا اسے ہلاکو اور تیمور نے توڑ پھوڑ کر عراق عرب اور عراق عجم کو ریگستان میں تبدیل کر دیا تھا ۔ جیسے قدیم زمانے میں سرسبز یمن آبپاشی کے ذرائع سے محروم ہو کر تباہ ہو گیا تھا ، ویسے ہی عراق عرب و عراق عجم نظام آبپاشی درہم برہم ہو جانے کے بعد ویران ہو گئے ۔ بخارا اور سمرقند کے درمیانی علاقہ کی جنت ارضی کو چنگیز اس سے پہلے ہی نذر آتش کر چکا تھا ۔ رہی اسپین میں مسلمانوں کی بنائی ہوئی جنت وہ اسپین کے مسلمانوں کے ساتھ ختم ہو گئی ۔ امیر علی نے مسلمانوں کی مختصر تاریخ میں دو یورپی مورخین کے تاثرات درج کیے ہیں ۔ کونڈی (Conde) جو خود اسپین کا باشندہ ہے ، مسلمانوں کے اسپین سے اخراج پر لکھتا ہے کہ ان ممالک کو ایک دائمی اداسی اور بے رونقی نے ڈھانپ لیا ہے ، جو مسلمانوں کے دم سے ہشاش بشاش اور متمول تھے ...... ہزیمت خوردہ مسلمان ستائش و ناموری کے اور فتحیاب اسپین والے انحطاط و ہلاکت کے مستحق ہیں ۔ لین پول (Lane Poole) نے لکھا ہے کہ

مسلمانوں کی یاددہانی اسپین کی وہ بنجر زمینیں کراتی ہیں جہاں مسلمان انگور، زیتون اور طرح طرح کے اناج اگاتے تھے۔ مسلمانوں کو ملک بدر کرنے ہی کی یہ سزا ملی کہ اہل اسپین دوسری قوموں کی بہ نسبت قعر مذلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

علم الطبیعیات (Physics): کے تحت علم المناظر جسے علم النور اور بصریات[1] (Optics) کہتے ہیں، موسیقی، علم سکون سیالات (Hydrostatics) ماقوائیات (Hydraulics) علم الصناعہ (Technology)، میکینکس اور مقناطیسیت (Magnetism) انجینیری وغیرہ آتی ہے۔ مسلمانوں نے کچھ اور علوم کی طرح اس علم کو بھی یونانیوں سے لے کر اپنے مشاہدات و تجربات سے بہت ترقی دی۔ جن مسلمان حکماء نے بہت شہرت حاصل کی ان کے نام یہ ہیں:

ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق ابن الصباح الکندی (Alkindus)، ابونصر محمد ابن طرخان ابن ازلغ الفارابی (Alpharabius)، ابوعلی الحسن ابن حسن (یا حسین) ابن الہیثم (Alhazen)، ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی، ابو علی الحسین عبداللہ ابن سینا (Avicenna)، ابوالفتح عبدالریحان المنصور الخازنی، ابوجعفر محمد ابن محمد ابن الحسن ناصر الدین الطوسی، محمود ابن مسعود ابن مصلح قطب الشیرازی، صفی الدین عبدالمومن ابن فقیر (یا فاخر) الارموی البغدادی، کمال الدین ابو الحسن (یا حسین) محمد ابن الحسن الفارسی اور عبد القادر ابن غیبی۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز ابن الہیثم ہے۔ وہ قرون وسطیٰ کے حکماء ہی میں نہیں بلکہ ہر دور کے ممتاز ترین حکمائے علم المناظر میں شمار کیا جاتا ہے۔

علم المناظر

ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق ابن الصباح الکندی کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ عباسی خلیفہ المامون اور اس کے کئی جانشینوں کے عہد میں موجود تھا۔ اس کا انتقال 873ء میں ہوا۔ اس وقت خلیفہ المعتمد حکمران تھا۔ الکندی عالم متبحر تھا وہ ریاضی، علم نجوم، طبیعیات، موسیقی، طب، دواسازی، جغرافیہ اور فلسفہ میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دو سو ستر کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں سے بیشتر اب ناپید ہیں۔ اس کی کئی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ علم المناظر پر اس کی تصنیف کا لاطینی نام ڈی ایس پکٹیبس (De As Pectibus) ہے۔ اس تصنیف میں علم ہندسہ (Geometry) اور علم افعال اعضاء (Physiology) کے نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ علم المناظر کا آنکھ سے تعلق ہے اس لیے علم افعال اعضاء سے آنکھ کی حد تک واقفیت رکھنا ضروری ہے۔ الکندی، ابن سینا اور ابن الہیثم طب میں بھی پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے آنکھ کے صحیح فعل کو پیش نظر رکھ کر علم النور کو سمجھا ہے۔ الکندی کی اس کتاب سے یورپ کے دو

(1) اسے علم مناظر و مرایا بھی کہتے ہیں۔

بڑے سائنس دانوں یعنی راجر بیکن اور وٹلو نے استفادہ کیا۔ الکندی فلسفہ نوافلاطونیت کا قائل تھا جس کی رو سے روح کو صحیح تربیت دے کر انسان لافانی بن سکتا ہے۔ وہ ارسطو کے فلسفہ سے بہت متاثر تھا۔ ارسطو کے خیال میں مادہ قدیم ہے۔ خدا اس کا خالق نہیں بلکہ اس کو حرکت میں لا کر فعال بناتا ہے۔ ان عقائد کی بناء پر الکندی پر اسلام سے انحراف کا الزام عائد کیا گیا اور اسے طرح طرح کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ الکندی سے پہلے مسلمانوں نے کوئی کتاب موسیقی پر نہیں لکھی تھی البتہ جو کتابیں اب دستیاب ہیں ان میں سب سے قدیم الکندی کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں اس نے موسیقی کے زیر و بم کو معین کرنے کی غرض سے ترسیم اعداد (Notation) کا طریقہ درج کیا ہے۔

ابوعلی الحسن ابن الحسن (یا حسین) ابن الہیثم (Alhazen) جارج سارٹن کے مطابق بصرہ میں 965ء میں پیدا ہوا (سید امیر علی نے "مسلمانوں کی مختصر تاریخ" میں لکھا ہے کہ وہ اسپین میں پیدا ہوا۔) 1039ء میں اس کے کچھ عرصے بعد اس کا قاہرہ میں انتقال ہوا۔ وہ زیادہ تر مصر میں رہا اور فاطمی خلیفہ الحاکم کی قائم کردہ رصدگاہ میں قاہرہ میں اس نے علم المناظر، علم ہیئت اور دیگر علوم پر تحقیقی کام کیا۔ (جارج سارٹن اور سید امیر علی کے درمیان خلیفہ الحاکم کی علم دوستی کے بارے میں اختلاف ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ چھٹے فاطمی خلیفہ الحاکم نے ایک دارالحکمہ اور رصدگاہ قائم کی جس میں ابن یونس، ابن الہیثم، ماسویہ المار دینی وغیرہ نے مشاہدات و تجربات کیے۔ سید امیر علی اس دارالحکمہ کے قیام کا سہرا الحاکم کے سر نہیں باندھتا بلکہ کہتا ہے کہ شروع کے فاطمی خلفا علم اور سائنس کے بہت دلدادہ تھے۔ انہوں نے بہت سے مدرسے، کتب خانے اور دارالحکمہ قائم کیے تھے۔ الحاکم کے بارے میں سید امیر علی نے لکھا ہے کہ پچیس سال تک دیوانگی کے عالم میں وہ تخت نشین رہا۔ بہت سے ممتاز لوگوں کو ناحق مروا ڈالا۔ اس نے ایک نیا دین ایجاد کیا جس کی رو سے وہ خدا کا اوتار ٹھیرا۔ یہ دین لبنان کے دروزیوں (Druses) میں اب بھی پایا جاتا ہے اور الدرزیہ کہلاتا ہے۔ جب کبھی دیوانگی میں افاقہ ہوتا تو وہ اچھے کام بھی کرتا، چنانچہ اس نے مسجدیں، مدرسے اور رصدگاہیں بھی بنوائیں۔ بالآخر وہ قتل کیا گیا۔ کچھ مورخوں نے لکھا ہے کہ اس کی بہن ستہ الملک نے اسے قتل کروایا (مگر سید امیر علی اس سے متفق نہیں بلکہ کہتا ہے کہ ایک شخص نے قتل کا اقبال کیا اور قتل کی وجہ یہ بتائی کہ الحاکم دشمن دین تھا) ول ڈیوراں کہتا ہے کہ دارالحاکم نے قائم کیا تھا۔

جارج سارٹن کہتا ہے کہ عہد قدیم سے سولہویں صدی تک علم المناظر کا ابن الہیثم جیسا بڑا عالم اور کوئی نہیں ہوا۔ وہ قرون وسطیٰ ہی کا سب سے بڑا عالم بصریات نہیں تھا بلکہ اس علم میں اس کا

شمار دنیا کے ہر دور کے عظیم ترین حکماء میں ہوتا ہے ۔ اس کی موقر تصنیف " کتاب المناظر " کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا ۔ یورپ نے اس سے صدیوں استفادہ کیا ۔ مستفید ہونے والوں میں راجر بیکن اور کپلر بھی شامل ہیں ۔ یہ کتاب تجرباتی تحقیق میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے ۔ راجر بیکن تجربات سے نتائج اخذ کرنے پر اکتفا کرتا تھا بلکہ قیاس آرائی میں پڑ کر بھٹک جاتا تھا ۔ چنانچہ وہ نور کی ماہیت معلوم نہ کر سکا ۔ " کتاب المناظر " وٹلو (Witelo) کی کتاب پر فوقیت رکھتی ہے ۔

ابن الہیثم نے روشنی کے انعطاف (Refraction) پر بہت گراں قدر تحقیق کی ہے ۔ اس کی کچھ تحقیقات بیان کی جاتی ہیں:

1- علم نور کی اس شاخ پر تحقیق کی جس میں منعکس صورتوں کا بیان ہوتا ہے ۔ اسے انگریزی میں Catoptries کہتے ہیں ۔ اس کے تحت اس نے کروی (Spherical) اور قطع مکافی (Parabola) شکل کے آئینوں اور کروی انحراف (Spherical Aberration) پر مفید تحقیقات کیں ۔

2- علم نور کی اس شاخ پر جس میں روشنی کے انعطاف کا بیان ہوتا ہے یعنی (Diotries) پر تحقیق کی ۔ ابن الہیثم نے دریافت کیا کہ زاویہ تصادم (Angle of Incidence) و انعطاف کی نسبت ہمیشہ ایک ہی نہیں رہتی ۔ اس نے فضائی انعطاف اور عدسہ کی تکبیری قوت (Magnifying Power of Lens) پر قابل قدر تحقیق کی ۔

3- جھٹ پٹے (Twilight) کے بارے میں یہ دریافت کیا کہ وہ اس وقت ختم یا شروع ہوتا ہے جب سورج افق سے انیس ڈگری نیچے ہوتا ہے ۔ اس اصول کی بنا پر اس نے فضا کی اونچائی معلوم کرنے کی کوشش کی ۔

4- آنکھ اور نظارے کے بارے میں جو تصور چلا آتا تھا ' ابن الہیثم نے اس سے زیادہ صحیح تصور پیش کیا ۔ مگر اس کی یہ تحقیق صحیح نہیں تھی کہ آنکھ کے عدسے سے نظارے کی ابتدا ہوتی ہے ۔ اس کی ابتداء اس چیز سے ہوتی ہے جو دیکھی جائے ۔

5- اس نے نظارے میں دونوں آنکھوں کے فعل کی تشریح کی ۔

6- اس نے سب سے پہلے کیمرہ ابسکیورا (Camera Obscura) یعنی تاریک کمرے میں سوراخ سے آنے والی روشنی کے ذریعہ خارجی چیزوں کی تصویریں پردے پر منعکس کرنے کا طریقہ ایجاد کیا ۔ (اسی اصول پر بعد میں تصویر لینے کے کیمرے بنائے گئے ۔)

7- اس نے اس بات کی صحیح توجیہہ کی کہ جب سورج اور چاند افق کے نزدیک ہوتے ہیں تو ان کی جسامت زیادہ کیوں معلوم ہوتی ہے ۔

ابن الہیثم صرف بصریات ہی کا ماہر نہیں تھا بلکہ وہ ریاضی ' ہیئت اور طب میں بھی عالمانہ

دستگاہ رکھتا تھا ۔ چنانچہ اس نے ان علوم کے متعلق ارسطو اور جالینوس کی کتابوں پر شرحیں لکھیں ۔ اس نے طبیعیات اور ریاضی کے کئی مشکل مسئلے حل کیے جن میں الماہانی کا مساوات مکعب (Cubic Equation) کا معمہ بھی تھا ۔

کتاب المناظر میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں: آنکھ کی ساخت ' فریب نظر (Optical Illusions) اشیاء کا جائے وقوع اور فاصلہ کا ظاہری تناسب ' دو چشمی نظارہ ' پرچھائیاں ' الوان ' انعطاف نور ' فضا میں انعطاف نور ' جھٹ پٹے کی مدت ' فضائی بلندی ' چاند اور سورج افق کے نزدیک کیوں بڑے معلوم ہوتے ہیں ۔ تاریک کمرے میں انعکاس ' سراب ' شہاب ' کہکشاں ' قوس قزح ' ہالہ وغیرہ ۔ سارٹن کہتا ہے کہ ابن الہیثم نے اتنے سارے موضوعات پر علم المناظر کے تحت تحقیق کی کہ اب یہ کم از کم سات مختلف علوم کے تحت آئیں گے یعنی (1) علم تشریح (2) علم عمل اعضاء (3) نفسیات (4) ریاضی (5) ہیئت (6) طبیعیات اور (7) موسمیات ۔ اس کی تقلید میں متاخرین نے بھی ان پر طبع آزمائی کی ہے ۔ اس کے شارحین کو تو لامحالہ ان سے بحث کرنی ضروری تھی ۔ اس طرح یہ تمام علوم عام ہو گئے ۔

ابو علی الحسین عبداللہ ابن سینا (Avicenna) کا ذکر بحیثیت عالم طب کیا جا چکا ہے ' وہ طبیعیات کا بھی بہت بڑا عالم تھا ۔ اس نے حرکت ' حرکت کی قوت ' اتصال ' خلا ' روشنی ' گرمی اور لاتناہی (Infinity) کا گہرا مطالعہ کیا ۔ اس نے یہ اصول بیان کیا کہ جب روشنی اپنے مخرج سے ذرات کے ذریعہ پھیلتی ہے تو یہ لازم آتا ہے کہ اس کی رفتار خواہ کتنی ہو زیادہ محدود ہوگی ۔ ابن سینا نے ثقل نوعی پر تحقیقات کیں ۔ اس نے ایک خود پیما آلہ ایجاد کیا جو ورنیئر (Vernier) کے مماثل تھا ۔ اس نے " کتاب الشفاء " میں جو دراصل مختلف علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے ' موسیقی پر سیر حاصل بحث کی ۔ اس سے پہلے الکندی اور الفارابی موسیقی کو ایک مستقل علم کی حیثیت دے چکے تھے ۔ الفارابی کی موسیقی کے مقابلے میں یورپ کی موسیقی حقیر تھی ۔ ابن سینا نے الفارابی کی موسیقی پر گرانقدر اضافہ کیا ۔

ابن سینا 980ء میں پیدا ہوا تھا اور ستاون سال کی عمر میں 1037ء میں اس کا انتقال ہو گیا ۔ وہ ارسطو کے فلسفہ سے بہت متاثر تھا ۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ متکلمین کی ملامت کے خوف سے اس نے " کتاب الشفاء " میں مادہ کا قدیم ہونا ہیر پھیر کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کائنات سے بہ اعتبار زمانہ مقدم نہیں بلکہ بروئے منطق مقدم ہے یعنی خدا مرتبہ ' ماہیت اور سبب (Rank Essence and Cause) کے اعتبار سے مقدم ہے ۔ کائنات کے وجود کا انحصار خدا پر ہے جو اسے سنبھالے ہوئے ہے ۔ لیکن خدا ہر کام اور ہر واقعہ کا براہ راست سبب نہیں ہے ۔ اشیاء اپنی اندرونی

غائیت (Teledlogy) سے نشو و نما پاتی ہیں ۔ ان عقائد کی بناء پر ٹھیٹ عقائد رکھنے والے اس سے ناخوش تھے۔

ابوالفتح عبدالرحمٰن المنصور الخازنی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ وہ یونانی غلام تھا ۔ اس کے آقا علی الخازن المروزی نے اسے مرو کے مدارس میں سائنس اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم دلائی ۔ الخازنی نے سنجر ابن ملک شاہ ابن الپ ارسلان کے لیے (جو اس وقت خراسان کا گورنر تھا اور بعد میں سلطان بنا) "الزیج المعتبر السنجری" مرتب کی اور اس میں 16-1115ء کے ستاروں کی جائے وقوع بتائی ۔ 22-1121ء میں اس نے اپنی موقر تصنیف "کتاب المیزان الحکمۃ" مکمل کی ۔ یہ قرون وسطیٰ کے علم طبیعیات ، علم سکون سیالات اور میکینکس پر نہایت اہم کتاب ہے ۔ اس میں نظریہ کشش ثقل (Gravity) پر بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کائنات کی قوت حرکت اس کی مرکزیت اور کشش کے باعث ہے ۔ اس نے ہوائی کشش کی وضاحت بھی کی ۔ اس کتاب میں بہت سے طبیعی عوامل کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں اور ان کی تحقیق و دریافت کے طریقے بیان کیے ہیں ۔ مثلاً وقت کی ساخت کا طریقہ ' بیرم (Lever) کے ذریعہ وزنی چیزیں اٹھانے کا طریقہ ' حرکت کی قوت سے پتلی نلکیوں میں رقیق چیزوں کے اوپر چڑھنے (Capillary Attraction) کا نظریہ وغیرہ ۔ الخازنی نے بہت سی رقیق اور ٹھوس اشیاء کا ثقل نوعی معلوم کیا اور ثقل نوعی معلوم کرنے کے طریقوں کا تاریخی جائزہ بھی لیا ۔ چونکہ "کتاب المیزان الحکمہ" علم طبیعیات پر ایک جامع کتاب ہے ' اس لیے الخازنی کا ذکر بڑے ماہرین طبیعیات ابن الہیثم ' ابن سینا وغیرہ کے ساتھ کرنا مناسب سمجھا گیا۔

محمود ابن مسعود ابن مصلح قطب الدین الشیرازی 1236ء میں پیدا ہوا اور 1411ء تک زندہ رہا ۔ اس نے ناصر الدین طوسی سے تحصیل علم کی اور اس کے شاگردوں میں سب سے نامور شاگرد نکلا ۔ وہ بہت سے علوم میں دستگاہ رکھتا تھا ۔ اس کا ذکر ہیئت دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ اس کی سب سے اہم کتاب "نہایت الادراک فی درایت الافلاک" ہے ۔ اس میں علم ہیئت کے علاوہ علم پیدائش ارض (Geodesy) جغرافیہ ' موسمیات ' میکینکس اور علم المناظر سے بھی بحث کی گئی ہے ۔ اس کا علم المناظر کا مطالعہ بہت وسیع تھا ۔ سب سے پہلے اس نے قوس قزح کی ماہیت کی تشریح کی۔

کمال الدین الفارسی کا پورا نام کمال الدین ابوالحسن (یا حسین) محمد ابن الحسن ہے ۔ اس کی ولادت کی تاریخ معلوم نہیں ۔ اس کا انتقال 1320ء میں ہوا ۔ وہ ایرانی ریاضی دان اور طبیعی تھا مگر اس کی تصنیفات عربی میں ہیں ۔ وہ طبیعی ہونے کے علاوہ ریاضی داں بھی تھا ۔ اس نے ریاضی پر "اساس القواعد فی اصول الفوائد" اور "تذکرۃ الاحباب" لکھی ۔ (موخر الذکر ابن الخدام کی تصنیف "کتاب الفوائد البہائیہ فی القواعد الحسائیہ" پر شرح ہے جو حساب اور علم ہندسہ پر ہے ۔ ابن الخدام ' جس کا پورا نام

عماد الدین عبداللہ ابن محمد ابن الخدام العراقی البغدادی تھا 46-1245ء میں پیدا ہوا تھا ۔ وہ مشیخت الرباط میں رئیس الاطباء تھا ۔ ناصر الدین طوسی سے اس نے تحصیل علم کی تھی ۔ طبیب ہونے کے علاوہ ریاضی داں بھی تھا اور شافعی فقہ کا درس بھی دیتا تھا۔

کمال الدین نے قطب الدین سے ابن الہیثم کی "کتاب المناظر" پڑھی تھی ۔ اس نے کتاب المناظر پر شرح لکھی جس کا نام "تنقیح المناظر" رکھا ۔ اس تصنیف میں وہ اپنے نظریات کو بھی زیر بحث لایا ہے بالخصوص فضائی تناظر (Aerial Perspective) اور تاثیر الالوان (Colour) (Effect پر اس نے نہایت عمدگی سے اظہار خیال کیا ہے ۔ سارٹن کہتا ہے کہ اس کتاب کے موضوعات اتنے زیادہ ہیں کہ ان پر تبصرہ کرنا طول عمل ہو گا ۔ اس کی انعطاف نور کی تحقیق کے چند نتائج یہ ہیں:

روشنی کی رفتار اس قدر زیادہ ہے کہ اس پر لامحدود ہونے کا گمان کیا جانے لگا ' لیکن وہ بہت زیادہ ہونے کے باوجود محدود ہے ۔ روشنی کی رفتار کا انحصار مختلف چیزوں کی کثافت بصری (Optical Density) پر ہے ۔ یعنی مختلف کثافت بصری کی چیزوں میں سے گزرتے ہوئے روشنی کی رفتار مختلف ہو جاتی ہے ۔ روشنی کی رفتار اور کثافت بصری میں تناسب معکوس پایا جاتا ہے ۔ جس قدر یہ کثافت زیادہ ہو گی اتنی ہی رفتار کم ہو جائے گی ۔ کثافت بصری مختلف اشیاء میں مختلف ہوتی ہے (مثلاً شیشہ کی کثافت اور ہے اور پانی کی کثافت اور) بعد میں جو روشنی کی لہروں کا نظریہ (Wave Theory of Light) اور اس کے مقابلے میں نظریہ جسامت (Corpuscular Theory) دریافت کیا گیا ' اس میں کمال الدین کے نظریہ کثافت بصری کو دخل ہے ۔ کمال الدین نے جس اصول کو اختیار کیا تھا وہ قوتوں کی ترکیب (Composition of forces) کا اصول تھا۔

کمال الدین نے ابن الہیثم کے تاریک کمرے کے تجربات پر مزید تحقیق کی اور بتایا کہ جو تصویریں تاریک کمرے کے پردہ پر منعکس ہوتی ہیں ' ان پر روشنی داخل کرنے والے سوراخ کی شکل و صورت کا اثر نہیں پڑتا (یعنی چاہے وہ گول ہو چاہے چوکور یا تکونہ تصویریں ہر حال میں پردہ پر منعکس ہوں گی) البتہ سوراخ جتنا چھوٹا ہو گا تصویر اتنی ہی روشن ہو گی ۔ اس نے کسوف اور بادلوں اور چڑیوں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے کے لیے تاریک کمرے کو استعمال کیا ۔ اس نے دریافت کیا کہ چیزیں اور ان کی رفتار کی سمت پردے پر الٹی نظر آتی ہے۔

کروی انحراف (Spherical Aberration) سے بچنے کا طریقہ کمال الدین نے یہ بتایا کہ معمولی عدسہ کے بجائے Hyperboloidal Lenses استعمال کیے جائیں۔

1928-30ء میں "تنقیح المناظر" حیدر آباد دکن میں طبع ہوئی۔ اس کے کچھ اقتباسات کا ترجمہ جرمن زبان میں ہوا۔

شمس الدین ابو العباس احمد ابن ادریس الصنہاجی البہنسی القرافی بربر نسل کا مصری عالم دین تھا۔ وہ بہنسہ میں جو ضلع بنی مزار میں لیبیا کے ریگستان کے کنارے پر واقع ہے، پیدا ہوا۔ اس کے قبیلہ کا نام صنہاجہ تھا۔ قرافہ قاہرہ کے قبرستان کا نام ہے اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ اس نے دیرالطین میں اگست 1285ء میں وفات پائی۔ وہ قاہرہ میں مالکی فقہ کا سب سے زیادہ مشہور فقیہ تھا۔ اس نے مالکی فقہ پر کئی کتابیں لکھیں اور ایک کتاب اسلام کی حمایت اور تعریف میں لکھ کر صیدا (Sidon) کے اسقف پال الراہب کو بھیجی۔ یہ اسلام کی حمایت میں بہترین تحریر سمجھی جاتی ہے۔

شہنشاہ فریڈرک ثانی اور ایوبی سلطان الکامل کے دوستانہ تعلقات تھے۔ فریڈرک نے 1239ء سے کچھ قبل سلطان کو کچھ سوال لکھ کر بھیجے۔ القرافی نے سلطان کے کہنے پر ان کے جواب لکھے ان جوابوں نے کتابی شکل اختیار کر لی۔۔ اس کتاب کا نام "کتاب الاستبصار فی ماتدرکہ الابصار" ہے۔ اس میں قوس قزح اور کچھ دوسرے علم المناظر کے مسائل سے بحث کی ہے۔

علم المناظر کا بیان ختم کرتے ہوئے ول ڈیوراں کی کتاب "مذہب کا عہد" اور سید امیر علی کی کتاب "مسلمانوں کی مختر تاریخ" میں سے عینک، گھڑی اور دوربین کی ایجاد کے بارے میں دو قول نقل کیے جاتے ہیں:

1- قرطبہ کا ذکر کرتے ہوئے ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ المقری کا بیان ہے کہ قرطبہ کے ابن فرناس نے نویں صدی میں عینک اور گھڑی ایجاد کی تھی (المقری مورخ تھا۔ اس کا انتقال 1632ء میں ہوا)۔

2- سید امیر علی اپنی مذکورہ بالا کتاب کے پچیسویں باب میں لکھتے ہیں کہ ابوالحسن نے دوربین ایجاد کی تھی۔ اس آلے کے بارے میں ابوالحسن کا بیان ہے کہ یہ ایک نلکی ہے جس کے دونوں کناروں پر Diopters لگائے گئے تھے۔ عمودی اور افق کے متوازی زاویوں کے ناپنے کے آلے کو Diopter کہتے ہیں۔ سید امیر علی نے اپنی کتابوں میں سائنس دانوں کے ناموں پر اکتفا کیا ہے۔ ان کے حالات نہیں لکھے۔ اس لیے یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کس ابوالحسن نے یہ ایجاد کی تھی۔ ممکن ہے یہ ایجاد ابوالحسن المغربی نے کی ہو۔ ابوالحسن المغربی ان ہیئت دانوں میں سے ایک تھا جنہوں نے سلطان شرف الدولہ کی قائم کردہ رصد گاہ میں 988ء میں سات سیاروں کی حرکات کا مشاہدہ کیا تھا۔

یہ سلطان سائنس کا اتنا دلدادہ تھا کہ اس نے اپنے بغداد کے محل کے باغ میں رصد گاہ تعمیر کرائی تھی۔

موسیقی

موسیقی پر سب سے پہلے مسلمانوں میں الکندی نے لکھا پھر الفارابی اور ابن سینا نے گرانقدر اضافے کیے۔ ابن باجہ، ابوالصلت، ناصرالدین طوسی اور قطب الدین شیرازی نے مزید اضافے کیے، پھر صفی الدین عبدالمومن اور عبدالقادر ابن غیبی نے اس علم کو بام عروج تک پہنچایا۔ یہ دونوں آذربائیجان کے باشندے تھے۔ الکندی کا ذکر علم المناظر کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔

ابو نصر محمد ابن محمد ابن طرخان ابن ازلغ الفارابی (Alpharabius) ترکی النسل تھا۔ اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ وہ ترکستان میں فاراب کے قریب بمقام واسج میں پیدا ہوا، بغداد میں اس نے تعلیم پائی، حلب میں سکونت اختیار کی اور 950-51ء میں دمشق میں اس کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر اسّی سال تھی، وہ اپنے زمانے کی سائنس اور فلسفہ سے پوری طرح واقف تھا۔ ابتدا میں وہ ارسطو کے حلقہ بگوشوں میں تھا جس کی وجہ سے وہ بے دین مشہور ہوگیا۔ بغداد میں اس نے عیسائی عالموں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جب چاروں طرف سے اس پر بے دینی کا الزام لگایا جانے لگا تو اس کے مربی سیف الدولہ نے حلب میں اس کے رہنے کا انتظام کر دیا۔ وہاں اس نے صوفیوں کا مسلک اور ان کا لباس اختیار کر لیا۔ اپنی ضروریات زندگی سے بے نیاز ہوگیا۔ جب سیف الدولہ نے اس سے پوچھا کہ اس کا کیا وظیفہ مقرر کیا جائے تو اس نے کہا کہ میرے لیے چار درہم یومیہ کافی ہوں گے۔ چنانچہ یہ قلیل رقم اس کو زندگی بھر ملتی رہی۔ ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ آخر عمر میں وہ راسخ العقیدہ مسلمان بن گیا۔ الفارابی کے نزدیک فلسفہ کا اصل مقصد خدا کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔

الفارابی نے ارسطو کی طبیعیات، موسمیات اور منطق وغیرہ کی کتابوں پر شرحیں لکھیں۔ اس نے فلسفہ، عمرانیات اور سائنس پر بھی کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سب سے اہم "رسالہ فصوص الحکم"، "رسالہ فی مبادی آراء اہل المدینۃ الفاضلہ"، "کتاب الاحصاء العلوم" ہیں اور "کتاب الموسیقی" نظریہ موسیقی پر بڑی اہم کتاب ہے۔ الفارابی کی کچھ کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔

ابن سینا کاذکرعلم المناظر کے تحت کیاجاچکاہے۔

ابو بکر محمد ابن یحییٰ ابن الصائغ ابن باجہ (Avenpace) 1106 ء سے قبل سراقسطہ (Saragossa) میں پیدا ہوا۔ اس نے طب، علم ہندسہ، ہیئت، تاریخ طبیعی، کیمیا اور فلسفہ پر رسالے لکھے۔ اس پر ارسطو کا فلسفہ چھایا ہوا تھا جس کی بدولت وہ بے دین سمجھا جاتا تھا۔ وہ غرناطہ، سراقسطہ اور فاس میں رہا۔ فلسفہ پر اس کی دو مشہور کتابیں "کتاب تدبیر المتوحد" اور رسالہ الوداع" ہیں۔ ان دونوں کا عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ اس نے بطلیموس کے کچھ نظریوں کو غلط ٹھہرایا۔ ابن رشد نے ابن باجہ کے فلسفہ کا اثر قبول کیا۔

ابن باجہ کو موسیقی سے عشق تھا۔ وہ عود بجانے میں ماہرانہ استعداد رکھتا تھا۔ اس نے موسیقی پر ایک کتاب لکھی جو اب ناپید ہے۔ یہ کتاب مغرب میں ویسے ہی مقبول تھی جیسے الفارابی کی تصنیف "کتاب الموسیقی" مشرق میں مقبول تھی۔ ابن باجہ شاعر بھی تھا۔ ابن باجہ بھی تیس سال کا تھا کہ کسی نے اسے زہر دے کر مار ڈالا۔ (صائغ سنار کو کہتے ہیں ممکن ہے اس کا دادا سناری کرتا ہو)۔

ابوالفتح (یا ابوعمران) موسیٰ ابن یونس، کمال الدین ابن یونس کے نام سے مشہور ہے۔ وہ 1156ء میں موصل میں پیدا ہوا۔ اس نے بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی اور موصل کے ایک مدرسہ میں معلم ہو گیا۔ یہ مدرسہ بعد میں اس کے نام پر مدرسہ کمالیہ کہلایا۔ اس کا انتقال 1242ء میں ہوا۔ وہ عالم دین اور ریاضی داں تھا۔ اس نے قرآن پر تفسیر لکھی اور کئی کتابیں عربی قواعد، منطق، علم نجوم، حساب، الجبرا وغیرہ پر لکھیں اور ریاضی کے مشکل مسئلے حل کیے۔ وہ اپنے زمانے میں بہت بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔ وہ موسیقی کی تعلیم کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ جب قیصر ابن القاسم اس کا شاگرد بننے آیا تو سب سے پہلے کمال الدین نے اسے موسیقی پڑھانی شروع کی۔ کمال الدین کا ذکر ریاضی دانوں کے ساتھ کیاجاچکاہے۔

ابوالصلت امیہ ابن عبدالعزیز ابن ابی الصلت الاندلسی 68-1167ء میں تونس میں بمقام دینسیا پیدا ہوا اور اشبیلیہ (Seville) قاہرہ اور مہدیہ میں رہا۔ اس کا انتقال 1334ء میں ہوا۔ وہ طب، ریاضی اور ہیئت کا عالم تھا۔ اس نے طب پر "کتاب الادویہ المفردہ" لکھی جس کا لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ منطق پر اس نے "تقویم الذہن" اور اصطرلاب پر "رسالہ فی عمل بالاصطرلاب" تصنیف کی۔ اس نے موسیقی پر بھی ایک کتاب لکھی جس کے کچھ حصوں کا عبرانی ترجمہ اب دستیاب ہے لیکن اصل کتاب ضائع ہوگئی۔ ابوالصلت کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیاجاچکاہے۔

ابوجعفر محمد ابن محمد ابن الحسن ناصرالدین طوسی 1201ء میں پیدا ہوا اور 1274ء میں اس نے وفات پائی۔ وہ بہت بڑا سائنس داں تھا۔ ہلاکو نے اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس نے مراغہ میں بہت بڑی رصدگاہ قائم کی۔ اس کا ذکر ریاضی دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ اس نے موسیقی پر "کتاب فی علم الموسیقی" لکھی، علم المناظر پر اس کی کتاب کا نام "تحریر کتاب المناظر" ہے۔ علم المثلث پر اس نے گرانقدر تحقیق کی، اس علم پر اس کی تحقیق "کتاب شکل القطاع" قرون وسطیٰ کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ اس کاذکر ریاضی دانوں کے ساتھ کیاجاچکاہے۔

قطب الدین شیرازی کا ذکر علم المناظر کے تحت آچکا ہے۔ اس نے بھی موسیقی پر لکھا ہے۔

صفی الدین عبدالمومن ابن فقیر (یا فاخر) الارموی البغدادی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں، اس کا وطن ارمیہ تھا جو آذربائیجان میں ہے۔ مگر اس کی پیدائش تیرہویں صدی کے ربع اول میں بغداد میں ہوئی۔ وہ عباسی خلیفہ مستعصم کا کاتب اور رئیس المطربین تھا۔ جب ہلاکو نے 1258ء میں خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا اور خلیفہ کو مار ڈالا تو صفی الدین ہلاکو کے ایک وزیر کے دو لڑکوں کو جن کے نام بہاء الدین محمد اور اشرف الدین ہارون تھے، پڑھانے لگا۔ 1365ء میں بہاء الدین محمد عراق اور جنوبی ایران (عراق عجم) کا گورنر مقرر ہوا تو صفی الدین اس کے ساتھ اصفہان چلا گیا۔ بہاء الدین 1240ء میں پیدا ہوا اور 1279ء تک زندہ رہا۔ بہاء الدین کے انتقال کے بعد صفی الدین کی مالی حالت خراب ہو گئی۔ وہ قرض لے لے کر گزر اوقات کرنے لگا۔ قرض ادا نہ کرنے کے باعث اسے قید خانے میں بقیہ زندگی گزارنی پڑی اور وہیں 1294ء میں اس کا انتقال ہوا۔

صفی الدین علم موسیقی کا سب سے بڑا عالم ہوا ہے۔ اس نے موسیقی پر دو کتابیں لکھیں (1) "کتاب الادوار" اور (2) "رسالۃ الاشرفیہ"۔ اس دوسری کتاب کا نام اس نے اپنے شاگرد اشرف الدین کے نام پر رکھا تھا۔ موخرالذکر کتاب پر بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ اس کا ماخذ الفارابی کی "کتاب الموسیقی" ہے جس پر صفی الدین نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس نے دو تار والے آلات موسیقی ایجاد کیے جن کا نام "مغنی" اور "نزہیہ" رکھا۔ اس نے نغمہ نگاری میں ترسیم اعداد "Notation" کا استعمال کیا۔ اس نے موسیقی کے نظامی دبستان (Systematist School) کی بنیاد رکھی۔ جو اسکیل اس نے ایجاد کیا اس سے زیادہ مکمل اسکیل (Scale) کوئی اور ایجاد نہ کرسکا۔

صفی الدین نے ایک کتاب علم عروض، قافیہ اور خطابت پر بھی تصنیف کی جس کا نام "کتاب فی العروض القوافی والبدیع" ہے۔

محمد ابن علی الخطیب الاربیلی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ البتہ چودھویں صدی کے نصف اول میں اس کا پایا جانا ثابت ہے ۔ 1329ء میں اس نے موسیقی پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "جواہر النظام فی معرفت الانغام" ہے ۔ چونکہ یہ کتاب نظم میں ہے اس لیے اسے "القصیدہ فی الانغام" بھی کہتے ہیں ۔ جب وہ 1337ء میں ماردینی سلطان شمس الدین الصالح کے دربار سے وابستہ تھا' اس نے ایک رسالہ "رسالہ تعریف العلوم" لکھا ۔ اس میں مختلف علوم کی تعریفیں (Definitions) لکھ کر ان کی ماہیت پر روشنی ڈالی ۔ الاربیلی عراق کے شہر اربیل کا رہنے والا تھا جو دریائے دجلہ کے مشرق میں واقع ہے ۔

صفی الدین عبدالعزیز ابن سرایا الحلی 1278ء میں پیدا ہوا ۔ حلہ عراق میں اسی جگہ واقع ہے جہاں قدیم زمانے میں بابل تھا ۔ وہ جزیرہ کے ماردینی دربار کا شاعر تھا ۔ 1329ء میں قاہرہ جہاں مملوک سلطان حکمران تھا' گیا مگر جلد واپس آ گیا ۔ بغداد میں اس کا انتقال مارچ 1349ء میں ہوا ۔ اس نے موسیقی پر "فائدہ فی الانغام بعضہا عن بعض و ترتیبہا علی البروج" لکھی' اس میں جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ نغمہ سازی کرتے وقت منطقۃ البروج کی مطابقت کی جائے ۔ یعنی نغمہ سازی علم نجوم کے تحت کی جائے تو فائدہ مند ہو گی ۔ یہ خیال عربوں میں زمانہ قدیم سے چلا آتا تھا ۔ الکندی بھی اس کا قائل تھا ۔ الحلی مشہور شاعر بھی تھا اور آج بھی نوجوان ادیبوں میں مقبول ہے ۔

شمس الدین محمد ابن عیسیٰ ابن کرا الحنبلی 1282ء میں قاہرہ میں پیدا ہوا اور 1358ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ وہ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی ابن محمد کی اولاد میں تھا ۔ (مروان کو دریائے زاب کے کنارے حضرت عبداللہ بن عباس کے پوتے عبداللہ بن علی نے 25 جنوری 750ء کو شکست دی تھی ۔ وہ بھاگ کر مصر گیا اور بوصیر ایک شکستہ کنیسہ میں پناہ گزیں ہوا جو نیل کے مغربی کنارے پر واقع تھا ۔ عباسیوں نے اس کا تعاقب کیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کنیسہ تک پہنچ گئے ۔ مروان بہت تھکا ماندہ تھا پھر بھی تلوار ہاتھ میں لے کر باہر نکلا ۔ دشمن نے دور سے نیزہ پھینک کر مارا جس کی ضرب سے 5 اگست 750ء کو مروان کا کسمپرسی کی حالت میں انتقال ہو گیا)۔

ابن کرا نے موسیقی پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "غایت المطلوب فی فن الانغام و الضروب" ہے ۔

عبدالقادر ابن غیبی چودھویں صدی کے وسط میں مراغہ میں جو آذربائیجان کا صدر مقام تھا' پیدا ہوا' وہ جلائری سلطان حسین کا بغداد میں مغنی تھا ۔ 1379ء میں اس نے رمضان کے ہر دن کے لیے ایک نیا نغمہ بنایا ۔ سلطان حسین کے انتقال کے بعد اس کے جانشین سلطان احمد کے دربار سے

وابستہ رہا ۔ کچھ دنوں تک وہ عثمانی سلطان یلدرم بایزید کے دربار سے بھی منسلک رہا ۔ جب تیمور لنگ نے پہلی بار بغداد کو 1393ء میں فتح کیا تو اس نے عبدالقادر اور کچھ اور فنکاروں کو سمرقند بھیج دیا ۔ وہ شہزادہ میران شاہ کے پاس تبریز چلا گیا ۔ میران شاہ سے تیمور اس کی سرکشی کی وجہ سے خوش نہ تھا ۔ اس نے عبدالقادر کو سرکش شہزادے سے جاملنا پسند نہ کیا اور عبدالقادر کو قتل کرانا چاہا ۔ عبدالقادر فرار ہو کر بغداد واپس آ گیا ۔ تیمور نے 1401ء میں بغداد دوبارہ فتح کیا ۔ عبدالقادر گرفتار ہو کر تیمور کے سامنے پیش ہوا ۔ تیمور نے اس شرط پر جان بخشی کہ وہ تمام عمر اس کے (تیمور کے) دربار سے وابستہ رہے گا ۔ چنانچہ عبدالقادر کو پھر سمرقند جانا پڑا ۔ 1435ء کے طاعون میں اس کا ہرات میں انتقال ہو گیا ۔

تیمور کے ترک یا منگول ہونے کے بارے میں جارج سارٹن نے مختلف مقامات پر مختلف باتیں لکھی ہیں:

1- اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ سائنس" کی تیسری جلد کے صفحہ 1101 پر لکھتا ہے کہ تیمور لنگ جو ترک یا منگول تھا وہ دراصل خدا کا کوڑا (Scourge of God) تھا ۔

2- اسی جلد کے صفحہ 1467 پر لکھا ہے کہ "اس کا (تیمور کا) باپ تارغائی ایک ترکی قبیلہ کا سردار تھا" ۔

3- اسی جلد کے صفحہ 1467 پر لکھا ہے کہ "(ہندوستان میں) منگول بابر (Mangol Babar) کی فتح تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی" ۔

بابر تیمور کی پانچویں پشت میں تھا ۔ بابر منگول (یا مغل) خاندان کا بانی تھا جو 1525ء سے 1857ء تک چلا ۔

4- اسی جلد کے صفحہ 1470 پر لکھا ہے کہ "منگولوں کے تین حملوں میں سے جو چنگیز خان' ہلاکو اور تیمور نے کیے' تیسرا حملہ سب سے زیادہ ہولناک تھا ۔" ان چاروں بیانوں میں سے پہلے میں تیمور کو منگول یا ترک کہا ہے دوسرے میں ترک بتایا ہے ۔ تیسرے میں بابر کو جو تیمور کی اولاد میں سے تھا منگول کہہ کر تیمور کو منگول ٹھہرایا ہے اور چوتھے میں چنگیز خان' ہلاکو اور تیمور کے حملوں کو منگول حملے کہہ کر پھر تیمور کو منگول کہا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جارج سارٹن کا رجحان تیمور کے منگول ہونے کی جانب زیادہ ہے ۔

ول ڈیوراں نے اپنی تصنیف "اصلاح دین" (The Reformation) میں تیمور کو تاتاری کہا ہے جو منگول کے مترادف ہے ۔ عثمانی ترک سلطان بایزید اور تیمور کے درمیان 1202ء کی معرکہ آرائی کا ذکر کرتے ہوئے ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ ترک سلطان کو پورا یقین تھا ۔ وہ اپنے تاتاری حریف (تیمور) کو شکست دے دے گا مگر تیمور نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا ۔ اس طرح یورپ

میں ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔ اس پر ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ:

"نصف صدی کے لیے تاتاریوں (Tartars) نے مسیحی دنیا کو ترکوں سے محفوظ رکھا"۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ول ڈیوراں کی رائے میں تیمور تاتاری یعنی منگول تھا۔ مگر اکثر مورخین نے تیمور کو ترک ہی لکھا ہے۔

تیموری دربار سے وابستہ ہونے کے بعد عبدالقادر نے علم موسیقی پر اپنی اہم کتابیں مرتب کیں۔ یہ تصانیف اس کو قریب قریب وہی مقام عطا کرتی ہیں جو صفی الدین عبدالمومن کا ہے۔ اس کی تصانیف کے نام یہ ہیں: (1) "جامع الالحان" (2) "مقاصد الحان" (3) "کنز الحان" اور "شرح الادوار"۔ ان تصانیف میں موسیقی کے نظریات کے علاوہ موسیقی کے آلات کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ "کنز الحان" جس میں عبدالقادر نے اپنے بنائے ہوئے نغمے جمع کیے تھے، اب دستیاب نہیں ہے۔ وہ نغمہ ساز ہونے کے علاوہ عود بجانے میں کمال رکھتا تھا۔ چودھویں صدی میں جو موسیقی بہت مقبول تھی وہ نوبہ کہلاتی تھی۔ یہ چار حرکات یعنی قول، ترانہ، غزل اور فروداشت (یا فردست) پر مشتمل تھی۔ اس نے ایک اور حرکت "مستزاد" کا اضافہ کیا۔

عبدالقادر شاعری، مصوری اور خطاطی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔

عبدالعزیز ابن عبدالقادر نے جو متذکرہ بالا عبدالقادر کا بیٹا تھا، موسیقی پر "نقاوت الادوار" تصنیف کی اور اسے عثمانی سلطان محمد ثانی الفاتح کے نام (جس نے 1451ء سے 1481ء تک حکومت کی) معنون کیا۔

محمود ابن عبدالعزیز ابن القادر نے موسیقی پر "مقاصد الالحان" لکھی اور اسے عثمانی سلطان بایزید ثانی کے نام (جس نے 1481ء سے 1512ء تک حکومت کی) معنون کیا۔

مسلمانوں کی موسیقی کا یورپ میں نفوذ

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ تمام علوم میں سب سے پہلے اہل یورپ نے مسلمانوں کی موسیقی کو (جو یورپ کی موسیقی سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھی) اپنایا۔ مسلمانوں نے مساعتی (Mensural) موسیقی ایجاد کی تھی۔ یہ موسیقی گیارہویں صدی کے آخر تک اسپین میں اور اسپین کے توسط سے یورپ کے

کچھ اور ممالک میں رائج ہو گئی۔ موسیقی پر عربی کی کئی کتابوں کا لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ کیا گیا جن میں سے ایک ابوالصلت کی تصنیف تھی۔ آج ابوالصلت کی تصنیف دستیاب نہیں مگر اس کا عبرانی ترجمہ موجود ہے۔ (یورپی) موسیقی کی ایک اصطلاح اوکیٹس (Ochetus) ہے جو دراصل عربی لفظ ایقاعات کی لاطینی شکل ہے۔ ایقاع کے معنی تال کے لحاظ سے سروں کو ترتیب دینے کے ہیں۔ عرب موسیقی کے ساتھ ساتھ اہل یورپ نے وہ آلات بھی اپنا لیے جن پر عربی نغمے گائے جاتے تھے۔ ایسے آلات میں سے چند عود، قانون، بربط، رباب وغیرہ ہیں۔ الفانسو السابیو (Alfonso el Sabio) کے بنائے ہوئے نغموں میں جو آج تک یورپ میں مقبول ہیں، عرب موسیقی کا اثر صاف نمایاں ہے۔

جس طرح درویشوں کے اذکار میں موسیقی کے رواج پا جانے پر اس کے جائز و ناجائز ہونے کا سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا، ویسے ہی بعد میں یہ سوال دنیائے عیسائیت میں اٹھا اور مذہبی اغراض کے لیے موسیقی جائز ٹھہری۔ امام غزالی نے بھی کچھ سخت شرائط کے ساتھ اسے جائز سمجھا ہے۔

اپنی گرانقدر تصنیف "تعمیر انسانیت" (The Making of Humanity) میں رابرٹ بریفو لکھتا ہے کہ یورپ کے جو ممالک جہالت کی تاریکی سے سب سے پہلے نکلے، وہ وہی تھے جن پر عربی تمدن سب سے پہلے اثر انداز ہوا تھا۔ چنانچہ پروونس (Provence) اور صقلیہ (Sicily) نے جن پر مسلمان ایک مدت تک حکمران رہے تھے، عربی شاعری و موسیقی کو اپنایا۔ وہاں سے وہ یورپ کے دوسرے ممالک میں پھیلیں۔ اہل یورپ کو یہ بات ماننا گوارا نہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ ناقابل قبول تاویل کی ہے کہ پروونس کی شاعری خود رو پیداوار کی ایک غیر معمولی مثال ہے۔ جب یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ یہ تاویل پیش کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کا تعصب یورپ پر عرب تمدن کے تمام اثرات کی نفی کرتا ہے تو اس تاویل کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اثر انداز ہونے سے پہلے جو شاعری پروونس میں رائج تھی وہ راہبوں کے زٹل قافیہ (Monkish Doggerel) تک محدود تھی۔ غزل کی طرز کے یورپی نغمے (Troubadour Songs) ان کی ہم آہنگی، ہر دوسرے مصرع میں قافیہ کا اہتمام (جو غزل کا جزو لاینفک ہے) مشکل قوافی میں شعر کہنا، یہ سب عربی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں جو پروونس نے مستعار لیں۔ معنی کے اعتبار سے بھی اسی قسم کے عاشقانہ جذبات اور پر تکلف لطافت جو عربی و فارسی شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، پروونس کی شاعری میں آ گئی اور اسپین اور پروونس کی شاعری ہی کی بازگشت سارے یورپ میں سنائی دینے لگی۔

صقلیہ میں شہنشاہ فریڈرک ثانی نے صرف عربی شاعری ہی مستعار نہیں لی بلکہ عربوں کی تہذیب و تمدن کو مکمل طور پر اپنایا۔ چنانچہ اسی کے درباری شاعروں نے سب سے پہلے اطالوی زبان

میں غزل کے طرز پر غنائی شاعری کی ۔ اسپین کے مسلمانوں کے بغیر ٹروبڈور (Troubadour) شاعر وجود میں نہ آتے اور ٹروبڈور شاعر نہ ہوتے 'دانتے (Dante) بھی نہ ہوتا۔

بریفو کہتا ہے کہ اہل یورپ تار والے آلات موسیقی سے ناواقف تھے ۔سب سے پہلے مسلمانوں نے انہیں ان آلات[1] سے روشناس کرایا ۔ ایسے آلات کے نام بریفو نے لکھے ہیں ۔ ان کے انگریزی نام اور ان کے وہ معنی جو ڈکشنری میں مل سکے یہ ہیں:
(1) Lute یہ العود سے بنا لیا گیا ۔ (2) Rubeb رباب ' یہی وہ باجہ ہے جو اب وائلن کہلاتا ہے ۔ (3) Psaltery سرود ۔ اس نے اب پیانو کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ (4) Zither چھ تار والا ستار یا بربط جسے میز پر رکھ کر بجاتے ہیں ۔ (5) Tabor طنبورہ اور (6) Guitar ستار ۔

بریفو کے بیان کے مطابق مسلمانوں کی تہذب موسیقی اور شاعری نے یورپ کے بے شعور ' جاہل اور نہانے دھونے سے تنفر نوابوں اور رئیسوں کو مہذب بنانے میں بہت مدد دی ۔ مسلمان تہذیب کے پھیلانے میں فریڈرک ثانی کو جو اس تہذیب کا دلدادہ تھا ' بڑا دخل ہے ۔ اس کے برطانیہ کے بادشاہ سے خوشگوار تعلقات تھے ۔ ان تعلقات کی بنا پر برطانیہ میں بھی یہ تہذیب پھیلی ۔ فریڈرک کے خلاف جو الزامات پوپ نے لگائے تھے ' ان میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ مسلمانوں کی طرح روزانہ غسل کرتا تھا ۔ حتیٰ کہ اتوار کے مقدس دن بھی ۔ اس کافرانہ بدعت سے باز نہیں آتا تھا۔

نہریں ' پل ' شاہراہیں ' ناعورے ' بند ' انجینئری کی وہ صنف جس کا تعلق تعمیرات سے ہے ' علم طبیعیات کے تحت آتی ہے ۔ قریب قریب آغاز اسلام ہی سے مسلمانوں نے نہریں ' سڑکیں ' پل ' قلعے ' محل ' مسجدیں ' مدرسے ' شفاخانے بنانے کا کام مستعدی سے ہاتھ میں لیا اور ان کی شاندار عمارتیں آج بھی ان کے فن تعمیر کے اعلیٰ معیار کی گواہی دے رہی ہیں۔

مصر فتح کرنے کے بعد حضرت عمر فاروق کے عہد میں مسلمانوں نے جو سب سے بڑی نہر کھودی وہ نہر امیر المومنین تھی جس کے ذریعے دریائے نیل کو بحر احمر سے ملا دیا گیا ۔ ول ڈیوراں اپنی مشہور تصنیف "مذہب کا عہد" میں لکھتا ہے کہ یہ نہر اسی میل لمبی تھی ۔ اس نہر کے ذریعہ بحر روم سے جہاز نیل میں ہوتے ہوئے بحر احمر میں آتے اور وہاں سے بحر ہند میں جہاں چاہتے جا سکتے تھے ۔ جارج سارٹن "مقدمہ تاریخ سائنس" کی پہلی جلد میں لکھتا ہے کہ فراعنہ میں سے کسی نے عہد قدیم میں یہ نہر کھدوائی تھی ۔ ساتویں صدی قبل مسیح سے پہلے مٹی بھر جانے کے باعث یہ معدوم ہو چکی تھی ۔ چھبیسویں خاندان کے دوسرے بادشاہ نیکو (Necho) نے جس نے 609ء سے 593ء ق ۔ م تک حکومت کی ' چاہا کہ دریائے نیل کی مشرقی شاخ کو نہر کے ذریعے بحر احمر سے ملا دیا جائے ۔ اس کے

[1] مگر موسیقی خاص طور سے اس کے آلات کی ایجاد تعیش کے مظاہر ہیں جن کے رواج وشوق سے خود مسلمانوں کو نقصان پہنچا ۔ (م ۔ ق)

انجینئروں نے بتایا کہ بحر احمر کی سطح نیل کے دہانے (Delta) سے زیادہ اونچی ہے جس کی وجہ سے سمندر کا کھاری پانی زمین پر پھیل جائے گا ۔ جو کام نیکو کے انجینئر نہ کر سکے وہ حضرت عمرو بن العاص گورنر مصر نے بآسانی کرا دیا۔

حضرت عمر کے عہد میں کئی نہریں کھدوائی گئیں جن میں بصرہ کی نہر ابی موسیٰ اور نہر معقل زیادہ مشہور ہیں ۔ نہریں کھدوانے کا جو سلسلہ حضرت عمر کے زمانے میں شروع ہوا تھا ' وہ بعد میں صرف جاری ہی نہیں رہا بلکہ بہت پھیلتا گیا ۔ جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں وہاں نہریں وجود میں آتی گئیں ۔ بلاذری کی مشہور تاریخ "فتوح البلدان" کا سید ابوالخیر مودودی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو دار الطبع عثمانیہ حیدر آباد دکن سے 1932ء میں شائع ہوا ۔ اس میں متعدد نقشے شامل ہیں ۔ بغداد کے نقشے پر جو صفحہ 506 کے بعد لگایا گیا ہے ' نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس شہر کو کتنی ساری نہریں احاطہ کیے ہوئے تھیں ۔ نہروں کے نام یہ ہیں : (1) نہر فضل (2) نہر جعفری (3) نہر الحائط (4) نہر موسیٰ (5) نہر بین (6) نہر معلیٰ (7) نہر صراط (8) نہر نیر ازین (9) نہر ابو عتاب۔

العراق کا نقشہ دیکھنے سے کئی اور نہروں کا پتہ چلتا ہے ۔ مثلاً نہر ثر ثر ' نہر اسحٰق ' نہر تاطول ' نہر نہروان ' نہر وبیل ' نہر کوثیٰ ' نہر بدات ' نہر ابوالجنید ' نہر صراط اعظم ' نہر الزاب ' نہر الملک ' نہر خالص۔

بغداد تو بنو عباس کے دور حکومت میں وجود میں آیا ۔ اس سے پہلے بنو امیہ نے بھی آب رسانی کے ذرائع کو وسعت دینے میں بہت دلچسپی لی تھی ۔ سید امیر علی "مسلمانوں کی مختصر تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ دمشق میں جو بنو امیہ کا دار الحکومت تھا ' سات بڑی بڑی نہریں بہتی تھیں جن سے بے شمار گُولیں نکالی جاتی تھیں جن کے ذریعہ شہر کے ہر گھر کو پانی فراہم کیا جاتا تھا ۔ بنو امیہ کا آب رسانی کا یہ نظام آج بھی جاری ہے اور ان کی عظمت کی شہادت دیتا ہے۔

نہر عیسیٰ جس کا نام بغداد کی نہروں کے سلسلے میں اوپر لیا گیا ہے اتنی بڑی نہر تھی کہ اس میں جہاز رانی کی جاتی تھی ۔ یہ دریائے فرات سے نکالی گئی تھی اور بغداد سے گزر کر دریائے دجلہ میں جا ملی تھی ۔ خلیفہ منصور عباسی کے چچا نے یہ نہر بنوائی تھی ' خلیفہ مہدی نے ایک بڑی نہر شہر واسط کے لیے کھدوائی ' خلیفہ ہارون الرشید کی نامور ملکہ زبیدہ نے اپنے ذاتی خرچ سے 802ء میں مکہ مکرمہ کی آب رسانی کے لیے وہ نہر بنوائی جو نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہوئی ۔ اس پر پندرہ لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوئے۔

سید امیر علی کہتے ہیں کہ حرابن یوسف نے جو خلیفہ ہشام اموی کے عہد میں گیارہ سال تک موصل کا گورنر رہا، موصل کو پانی فراہم کرنے کے لیے ایک نہر بنوائی جو آج بھی جاری ہے۔ حر کے پردادا حکم۔ خلیفہ مروان اول کے والد تھے۔

سید امیر علی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عضد الدولہ نے ملک کے بہترین انجینئروں کی نگرانی میں دریائے بندہ میر (Bedemir) کی شاخوں کو اتنا گہرا کرایا کہ جہاز سمندر سے شیراز تک آنے لگے۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ملحقہ اضلاع میں جو سیلابی پانی پھیل جاتا تھا، وہ ندی کے گہرے ہو جانے کے باعث سمندر میں جانے لگا اور وہ اضلاع سیلاب کی تباہی سے محفوظ ہو گئے۔ عضد الدولہ عباسی خلیفہ کا امیر الامراء تھا۔

جیسا کہ پچھلی فصل میں مذکور ہو چکا ہے، قرون وسطیٰ میں ایشیاء میں چار علاقے ایسے تھے جنہیں ارضی جنت کہا جاتا تھا۔ یہ علاقے دمشق کے ارد گرد کا علاقہ، جنوبی ایران، جنوبی عراق اور بخارا اور سمرقند کا درمیانی علاقہ تھے۔ موخرالذکر کو چنگیز خاں نے اور باقی تین علاقوں کو چنگیز کے پوتے ہلاکو نے اور پھر تیمور نے تمام نہریں توڑ پھوڑ کر ریگستانوں میں تبدیل کر دیا۔

یورپ میں اسپین کو ارضی جنت کہتے تھے۔ وہاں بھی مسلمانوں نے نہروں کا جال بچھا دیا تھا۔ بالخصوص قرطبہ، غرناطہ اور ویلنشیا کے مضافات باغوں سے پٹے پڑے تھے۔ عبدالرحمٰن الداخل اور عبدالرحمٰن الناصر نے آبپاشی کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور متعدد نہریں کھدوائیں۔ قرطبہ کے لیے ایک علیحدہ نہر بنوائی گئی جس سے یہ شہر اور اس کے مضافات باغوں سے آراستہ ہوئے۔ عرب مہندسوں نے وادی الکبیر (Guadal Quivir) پر پتھر کا ایک بہت بڑا پل بنایا جس میں سترہ محرابیں تھیں اور ہر محراب میں پچاس کوٹھیاں (Spans) تھیں۔ اسپین کے دوسرے مسلمان فرمانرواؤں نے بھی بہت سی نہریں بنوائیں۔

سید امیر علی نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن الناصر نے ایک اور بہت بڑی نہر بنوائی جو عبدالرحمٰن الداخل کی اور دوسرے فرمانرواؤں کی نہروں پر سبقت لے گئی۔

حضرت عثمان خلیفہ سوم نے مدینہ منورہ کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کی غرض سے شہر سے تھوڑے فاصلہ پر مدری کے مقام پر ایک بند بندھوایا اور ایک نہر کھدوائی جس کے ذریعہ پانی کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ امیر معاویہ نے مدینہ کے مضافات میں نہر کظامہ، نہر ازرق اور نہر شہداء کھدوائیں۔ شاہ معین الدین احمد تاریخ اسلام حصہ دوم میں لکھتے ہیں کہ جو متعدد نہریں امیر معاویہ نے

کھدوائی تھیں ان کی بدولت لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہوئی۔

مصر کی نہروں میں ول ڈیوراں نے امیر المومنین کے علاوہ ایک اور نہر کا بھی ذکر کیا ہے۔ سلطان سیف الدین قلاؤن کے بیٹے سلطان ناصر نے ایک لاکھ مزدور لگا کر ایک نہر کھدوائی جس کے ذریعے اسکندریہ کو دریائے نیل سے ملا دیا۔ سلطان ناصر کے بارے میں ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ جب اسے ایسا سفر درپیش آتا جس میں ریگستان سے گزرنا پڑتا تو چالیس اونٹوں پر عمدہ مٹی کا ایک سفری باغ ساتھ چلتا اور بادشاہ کو سفر کے دوران ہر روز تازہ ترکاریاں اگا کر دی جاتیں۔

ول ڈیوراں نے یہ بھی لکھا ہے کہ نویں صدی عیسوی میں افریقہ کے صحرائے اعظم (Sahara) کو عبور کر کے ٹمبکٹو، اور جھیل چاد (Lake Chad) تک پہونچنے کی غرض سے تین راستے نکالے گئے جن کی لمبائی پندرہ سو سے دو ہزار میل تھی۔ ول ڈیوراں ان بڑی شاہراہوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو بغداد سے رے، نیشاپور، مرو، بخارا، سمرقند، کاشغر، بصرہ، شیراز، کوفہ، مدینہ، مکہ، موصل اور دمشق جاتی تھیں۔ ان سڑکوں پر سرائیں اور حوض جگہ جگہ بنائے گئے تھے تاکہ مسافروں اور ان کے جانوروں کو راستے میں کھانا، چارہ اور آرام میسر آسکے۔

نہروں کے ساتھ ساتھ مسلمان ممالک میں بے شمار ناعورے (Water Wheels) بھی نصب کیے گئے صرف شہر حماہ میں بتیس نواعیر تھے۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ بارہویں صدی سے پہلے یورپ میں اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ صلیبی جنگوں میں شریک ہونے کے لیے جو ہزاروں لاکھوں عیسائی شام، فلسطین اور مصر آئے تھے وہ ناعوروں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یورپ واپس ہونے والے عیسائیوں نے اسلامی ممالک کی جو بہت سی چیزیں یورپ میں رائج کیں، ان کے ناعورے اور حمام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک غسل کرنا ایک غیر مستحسن فعل تھا۔ ان کے ولیوں میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہوں نے تمام عمر غسل نہیں کیا بالخصوص عیسائی راہب نہانے کو خدا پرستی کے خلاف اور اخلاقی تنزل کا باعث سمجھتے تھے۔ ول ڈیوراں نے اپنی متذکرہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ راہبہ سیلویا (Silvia) نے انگلیوں کے علاوہ اپنے جسم کا کوئی حصہ کبھی نہیں دھویا۔ ایک خانقاہ میں ایک سو تیس عورتیں راہبانہ زندگی بسر کرتی تھیں جن میں سے کسی نے بھی نہ کبھی غسل کیا اور نہ پیر دھوئے۔ شام کے شمالی حصہ میں ایک راہب نے جس کا نام سیمین (Simeon) تھا، ایک ساٹھ فٹ اونچا ستون بنایا اور اس پر سے اترے بغیر متواتر تیس سال تک اس پر رہا۔ اس نے اپنے جسم کو ایک رسی سے ستون سے باندھ لیا تھا۔ رسی گوشت میں پیوست ہو گئی اور گوشت سڑ گیا۔ اس میں کیڑے پڑ گئے۔ جو کیڑا نیچے گر پڑتا اسے وہ خود اٹھا کر اپنے سڑے ہوئے زخم پر رکھ دیتا۔ اس کی نفس کشی کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے معتقد ہو گئے۔ معتقدین میں کچھ سیڑھی کے ذریعہ کھانا

پہونچاتے اور گندگی کو نیچے اتار کر لاتے۔ سیمین کے تتبع میں بارہ صدیوں تک ستونوں پر رہنے کا رواج قائم رہا۔ ولیوں اور راہبوں کے غسل نہ کرنے کا رواج عام تھا۔ جب صلیبی مجاہدین نے حمام قائم کیے تو اسے اسلامی بدعت کہہ کر مذموم ٹھہرایا گیا۔ لیکن جیسے جیسے کلیسا کا زور کم ہوتا گیا یورپ میں حمام بنتے گئے۔

ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ اموی خلیفہ ولید اول کے مشرقی صوبوں کے گورنر حجاج بن یوسف نے دلدلوں سے پانی نکلوا کر زمینوں کا بہت بڑا رقبہ قابل کاشت بنا دیا اور نہریں کھدوا کر زراعت کو بہت ترقی دی۔ شاہ معین الدین احمد کہتے ہیں کہ امیر معاویہ کے عہد میں عبداللہ بن زیاد نے بخارا کے کوہستان میں ایک نہر نکالی۔ پہاڑ کی گھاٹیوں کے گرد بند بندھوا کر آبپاشی کی غرض سے تالاب بنوائے گئے۔ اموی خلیفہ سلیمان کے عہد میں مکہ مکرمہ کو آب رسانی کی غرض سے کوہ شبیر کے دامن میں پتھر کا ایک بڑا تالاب بنایا گیا اور یہاں سے سیسے کے نلوں کے ذریعہ پانی پہونچایا جاتا۔ خلیفہ ہشام کے عہد میں حاجیوں کی آسائش کے لیے راستوں میں جگہ جگہ حوض اور تالاب بنائے گئے۔

نئے شہر

حضرت عمر فاروق کے عہد میں جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا تو کچھ نئے شہر تعمیر کیے گئے۔ "خلفائے راشدین" میں شاہ معین الدین احمد لکھتے ہیں کہ 14ھ میں عتبہ بن غزوان نے حضرت عمر کے حکم سے بصرہ بسایا۔ ابتداء میں صرف آٹھ سو آدمیوں نے یہاں سکونت اختیار کی لیکن بہت جلد اس کی آبادی دو لاکھ ہو گئی اور بصرہ ایک علمی مرکز بن گیا۔

کوفہ کے بارے میں لکھا ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے حضرت عمر کے حکم سے عراق کے قدیم عرب فرماں روا نعمان بن منذر کے پایہ تخت کو آباد کیا اور چالیس ہزار آدمیوں کے لائق مکانات بنوائے۔ حضرت عمر نے شہر کے نقشے کے متعلق خود ایک یادداشت لکھ کر بھیجی جس میں ہدایت کی تھی کہ بڑی سڑکیں چالیس چالیس ہاتھ چوڑی اور دوسری سڑکیں تیس تیس اور بیس بیس ہاتھ چوڑی رکھی جائیں۔ جامع مسجد اس قدر وسیع و عریض بنائی گئی کہ اس میں چالیس ہزار آدمی نماز پڑھ سکیں۔ یہ شہر حضرت عمر کے عہد ہی میں بہت ترقی کر گیا۔ کوفہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں امام مخنی، حماد، امام ابو حنیفہ اور اما شعبی ایسے علمائے دین نے سکونت اختیار کی۔

فسطاط کے بارے میں شاہ معین الدین احمد کے دو متضاد بیانات ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ عمرو بن العاص نے بہ اصرار فاروق اعظم سے اجازت لے کر چار ہزار فوج کے ساتھ مصر پر حملہ کیا۔ چند

مقامات فتح کرنے کے بعد فسطاط کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور امداد کے لیے حضرت عمر کو لکھا۔ جب زبیر بن العوام اور کچھ اور صحابہ دس ہزار فوج لے کر پہونچے تو حضرت زبیر کی غیر معمولی شجاعت سے قلعہ مسخر ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فسطاط پہلے سے موجود تھا اور وہاں کا قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ عمرو بن العاص کی چار ہزار فوج اسے مسخر نہ کر سکی۔ بلکہ چودہ ہزار فوج نے بڑی شجاعت سے کام لے کر یہ مہم سر کی۔

دوسری جگہ لکھا ہے کہ دریائے نیل اور جبل مقطم کے درمیان ایک کف دست میدان تھا۔ عمرو بن العاص نے اثنائے جنگ میں یہاں پڑاؤ کیا۔ ایک کبوتر نے ان کے خیمے میں گھونسلا بنا لیا۔ انہوں نے خیمہ کو ویسے ہی چھوڑ دیا اور خود مصر کی تسخیر میں آگے بڑھ گئے۔ جب مصر فتح کر لیا تو اس مقام پر جہاں خیمہ گڑا چھوڑ دیا تھا ایک شہر بسایا اور چونکہ خیمے کو عربی میں فسطاط کہتے ہیں، اس شہر کا نام فسطاط رکھ دیا۔ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ نہ کوئی فسطاط کا قلعہ تھا، نہ اس کا محاصرہ کیا گیا۔ بلکہ فسطاط جہاں بسایا گیا وہ ایک کف دست میدان تھا جہاں اسلامی فوج کے خیمے نسب کیے گئے تھے۔

"فتوح البلدان" میں بلاذری نے لکھا ہے کہ الفرماء فتح کرنے کے بعد عمرو الفسطاط کی طرف بڑھے اور جنان الریحان (مہندی کے باغوں) میں اترے اس شہر کا نام الیونہ تھا۔ مسلمانوں نے اس کا نام الفسطاط رکھا کہ یہ قوم کی خیمہ گاہ اور اس کا مقام اجتماع تھا۔ لیکن ایک جماعت کہتی ہے کہ اس کا نام الفسطاط اس لیے رکھا گیا کہ عمرو نے یہاں خیمہ نصب کیا تھا۔ کہتے ہیں عمرو اہل فسطاط کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ الزبیر بن العوام دس ہزار بقول بعض بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ ان کی مدد کو پہونچے۔ ایک جانب الزبیر جنگ کر رہے تھے اور دوسری جانب عمرو بن العاص سیڑھی لائے اور اس پر چڑھ کر قلعے پر پہونچے اور اسے فتح کیا۔ عمرو نے اس کے باشندوں کو اہل الذمہ کی حیثیت سے برقرار رکھا۔

بلاذری کے بیان سے صاف واضح ہے کہ شہر الیونہ پہلے سے موجود تھا۔ فتح کرنے کے بعد اس کا نام بدل کر الفسطاط رکھ دیا گیا۔

موصل۔ شاہ معین الدین احمد لکھتے ہیں کہ موصل ایک گاؤں تھا۔ حضرت عمر کے حکم سے یہاں ہرثمہ بن عرفجہ نے شہر کی بنیاد رکھی اور ایک مسجد تعمیر کرائی۔ چونکہ یہ مشرق و مغرب کو آپس میں ملاتا ہے، اس لیے اس کا نام موصل رکھا گیا۔ یہ بہت جلد ایک عظیم الشان شہر بن گیا۔

جیزہ۔ فتح اسکندریہ کے بعد عمرو بن العاص نے اسکندریہ سے کچھ فاصلے پر لب ساحل تھوڑی سی فوج مقرر کر دی تھی۔ انہیں وہاں کا منظر بہت پسند آیا اور وہاں سے واپس آنا نہ چاہا۔ چنانچہ وہاں ایک

قلعہ بنایا گیا جس کے ارد گرد شہر بس گیا۔ یہ شہر جیزہ کہلایا۔

قیروان ۔ شاہ معین الدین احمد لکھتے ہیں کہ امیر معاویہ نے افریقہ میں ایک نیا شہر قیروان بسایا۔ عقبہ بن نافع فہری نے ساحل سے ہٹ کر اور جنگل کٹوا کر ایک فوجی چھاؤنی قائم کی ' قلعہ بنایا اور شہر کے وسط میں دار الامان تعمیر کیا ۔ اس کے چاروں طرف مسلمانوں کے محلے تعمیر کر کے ایک جامع مسجد بنائی ۔ رفتہ رفتہ اس شہر نے اتنی ترقی کی کہ شمالی افریقہ کا مرکزی شہر بن گیا۔

ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ مصر میں مفتوحہ علاقوں کے تحفظ کے لیے مسلم سپہ سالار چالیس ہزار فوج لے کر کارتھج کی طرف بڑھا ۔ موجودہ تونس سے اسی میل جانب جنوب اس نے ایک مقام پر اپنا نیزہ گاڑ دیا اور وہاں قیام کیا ۔ اسی مقام پر بعد میں قیروان وجود میں آیا ۔قیروان کے معنی ہیں آرام کرنے کا مقام ۔ چونکہ اس مقام پر مسلمانوں کی فوج آرام کرنے کی غرض سے ٹھہری تھی ' اس لیے اس شہر کا یہی نام پڑ گیا ۔ یہ شہر 670ء میں وجود میں آیا ۔ اٹھائیس سال بعد 698ء میں مسلمانوں نے کارتھج فتح کیا ' تھوڑے ہی عرصے بعد بحر ظلمات تک مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ۔ شمالی افریقہ کو مسلمانوں نے تین صوبوں میں تقسیم کیا: (1) مصر (2) افریقیہ (3) مغرب ۔ مصر کا دار الحکومت فسطاط کو بنایا ' افریقیہ کا دار الحکومت قیروان کو اور مغرب کا دار الحکومت فاس (Fez) کو۔

واسط ۔ اموی خلیفہ عبد الملک کے مشرقی صوبوں کے گورنر حجاج بن یوسف نے عراق میں واسط بسایا ۔ شاہ معین الدین احمد لکھتے ہیں کہ صرف شہر پناہ ' قصر حکومت اور جامع مسجد کی تعمیر میں کئی کروڑ صرف ہوئے تھے ۔ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المہدی نے واسط کے ضلع میں ایک نہر کھدوائی ۔ جس کی وجہ سے بہت بڑا رقبہ زیر کاشت لایا جا سکا۔

رملہ ۔ اموی خلیفہ ولید اول کے زمانہ میں اس کا بھائی سلیمان فلسطین کا حاکم تھا ۔ شاہ معین الدین احمد نے لکھا ہے کہ سلیمان کو رملہ کی جائے وقوع اور اس کی آب و ہوا بہت پسند آئی ۔ اس نے اپنے قیام کے لیے وہاں چند عمارتیں بنوائیں ۔ جب ولید کے بعد وہ خلیفہ ہوا تو رملہ کو بسایا ۔ بہت سی عمارتیں اور تالاب اور حوض بنوائے ۔ آبادی بڑھانے کے لیے لوگوں کو یہاں منتقل کیا اور خلیفہ سلیمان خود وہیں رہنے لگا ۔ اس طرح رملہ کو پایہ تخت کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔

رصافہ ' منصورہ اور محفوظ ۔ شاہ معین الدین احمد نے لکھا ہے کہ اموی خلیفہ ہشام کے عہد میں شام کے قنسرین کے علاقہ میں رصافہ آباد کیا گیا ۔ گرمیوں میں خلیفہ یہیں رہتا تھا ۔ سندھ میں منصورہ اور محفوظ بسائے ۔ منصورہ سندھ کا دار الحکومت تھا۔

بغداد ۔ عباسی خلیفہ المنصور نے بغداد بسایا جو بہت جلد دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے اہم شہر ہو گیا ۔ ول ڈیوراں نے بغداد کے بسائے جانے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شہر بابل والوں کے زمانہ سے چلا آ رہا تھا ۔ جب مسلمانوں نے عراق فتح کیا تو یہاں کچھ نسطوری راہبوں نے اپنی خانقاہیں قائم کر لیں ۔ خلیفہ منصور کوفہ اور بصرہ کو سیاسی وجوہ سے اور اس لیے بھی کہ وہاں مچھر بہت ہوتے تھے ' پسند نہیں کرتا تھا ۔ راہبوں نے منصور کو بتایا کہ جہاں وہ رہتے ہیں وہاں مچھر نہیں ہوتے اور گرمیوں میں یہ مقام ٹھنڈا رہتا ہے ۔ منصور نے یہاں دار الحکومت بنانے کا فیصلہ کیا اور بغداد کے چاروں طرف تین مدور دیواریں بنوائیں اور ان کو ایک خندق سے محصور کر دیا ۔ 762ء میں اس نے سرکاری دفاتر کو کوفہ سے بغداد منتقل کیا اور بغداد کا نام بدل کر مدینۃ السلام رکھا ۔ بغداد کے معنی خدا کا عطیہ ہیں اور مدینۃ السلام کے معنی ہیں سلامتی کا شہر ۔ شہر کے بیچوں بیچ منصور نے اپنا محل بنوایا ۔ گرمیوں میں قیام کے لیے اور دوسرا محل دجلہ کے مغربی کنارے پر شہر کی فصیل کے باہر بنوایا ۔ اپنے بیٹے المہدی کے لیے دجلہ کے مشرقی کنارے پر منصور نے ایک محل اور ایک مسجد بنوائی ۔ جن کے ارد گرد رُصافہ کا قصبہ آباد ہو گیا جسے دو پلوں کے ذریعہ بغداد سے ملا دیا ۔ خلیفہ ہارون الرشید کے بعد عموماً خلیفہ رصافہ ہی میں رہنے لگے اور اسی پر بغداد کا اطلاق ہونے لگا ۔ ہر پیشہ والوں کا علیحدہ بازار تھا ۔ دسویں صدی میں بغداد دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا ۔ اس میں ہزار ہا قصر و محلات بن گئے جن میں سے کچھ کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

اس بات کی تصدیق بلاذری کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ بغداد ایک قدیم شہر تھا ۔ مگر جو شہر عباسیوں نے بنایا اس کو اس بغداد سے کوئی نسبت نہیں جو پہلے سے موجود تھا ۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ " کہتے ہیں بغداد قدیم شہر تھا ۔ امیر المومنین المنصور رحمتہ اللہ نے اس کو آباد کیا اور اس میں 'مدنیّہ' پیدا کی ۔ یہ کام اس نے 145ھ میں شروع کیا" ۔

خلیفہ کے محل سے تھوڑے فاصلے پر جامع مسجد تھی اور اسی اندرونی دیوار کے احاطہ میں شہزادوں اور امیروں کے محلات اور سرکاری دفاتر تھے ۔ یہ مدینۃ المنصور کہلاتا تھا ۔ جب دجلہ کے دوسرے کنارے پر مہدیہ بن گیا تو شہر کا قطر بارہ میل ہو گیا ۔ بغداد کی آبادی بیس لاکھ تک پہونچ گئی ۔ مہدیہ جو مشرقی جانب تھا ' شہر کے مغربی حصہ سے زیادہ شاندار اور بارونق ہو گیا ۔ بغداد کی سڑکیں بہت چوڑی چوڑی تھیں ۔ وہ سڑکیں جو شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک جاتی تھیں ' ان میں سے کوئی بھی چالیس کیوبٹ سے کم چوڑی نہ تھی ۔ (ایک کیوبٹ کی لمبائی اٹھارہ سے بائیس انچ تک ہوتی ہے) یعنی ایسی چھوٹی سے چھوٹی سڑک ساٹھ فٹ سے ساڑھے تہتر فٹ چوڑی تھی۔

بغداد کے بہت سے پھاٹک تھے جن میں سے زیادہ اہم یہ ہیں: (1) باب الشماسیہ (2) باب

الکز (ریشم کا دروازہ) (3) باب البصرہ (4) باب الدّیہ (5) باب السام (6) باب البستان (7) باب الطاق (8) باب الشیراز (9) باب الخیزران (10) باب الصبیان (بچوں کا دروازہ) (11) باب التین (انجیروں کا دروازہ)

مہدیہ کے دروازوں میں زیادہ اہم یہ تھے: (1) باب الغرابہ (بید کے درختوں کا دروازہ) (2) باب سوق التمر کھجوروں کے بازار کا دروازہ) (3) باب النوبی (4) باب العامہ (5) باب المراتب (سیڑھیوں کا دروازہ)۔

سڑکوں پر رات میں روشنی کی جاتی تھی۔ بغداد سنگ مرمر کے محلوں کا شہر تھا۔ اکثر مکانات کئی کئی منزل کے تھے۔ دریائے دجلہ کے کنارے پر کئی بندرگاہیں تھیں جن میں سمندر میں چلنے والے جہاز بھی موجود رہتے۔

سید امیر علی نے بغداد کی تفصیلات کئی صفحوں میں دی ہیں ان سے صرف چند باتیں یہاں درج کی گئی ہیں۔

مہدیہ۔ 909ء میں عبید اللہ المہدی نے افریقیہ میں فاطمی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ 916ء میں اس نے بحر روم کے کنارے مہدیہ شہر کی بنیاد رکھی۔ یہ شہر پانچ سال میں تیار ہوا۔ شہر کے چاروں طرف مضبوط فصیل بنائی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ بھی سنگ مرمر کے محلوں کا شہر بن گیا۔ نومبر 972ء تک یہ شہر فاطمیوں کا پایہ تخت رہا۔ مصر فتح کرنے کے بعد انہوں نے قاہرہ بسایا جو نومبر 972ء (15 رمضان 372ھ) سے 1172ء (محرم 567ھ) تک ان کا پایہ تخت رہا۔ اس کے بعد صلاح الدین ایوبی نے نور الدین زنگی کے نائب کی حیثیت سے اس پر تھوڑے عرصے تک حکومت کی۔ پھر نور الدین کی وفات کے بعد بحیثیت سلطان مصر و شام وہ اس پر حکمران ہوا۔

المنصوریہ۔ فاطمی خلیفہ المنصور بامر اللہ نے سوسہ کے قریب ایک نہایت شاندار شہر بسایا جس کا نام اس کے نام پر المنصوریہ پڑا۔ منصور نے 946ء سے 953ء تک حکومت کی۔

القاہرہ۔ 928ء میں فاطمی خلیفہ المعزلدین اللہ کا مصر پر قبضہ ہوا۔ اس کے سپہ سالار جوہر نے مارچ 969ء میں فسطاط کے مقابل قاہرہ کی بنیاد ڈالی اور ساڑھے تین سال بعد نومبر 972ء میں المعز نے اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ بہت جلد یہ ایک شاندار شہر ہو گیا۔ خلیفہ کا محل قصر الکبیر الشرقی قاہرہ کے مشرقی حصے میں بنایا گیا اور اسے ایک زیر زمین راستے کے ذریعہ قصر الغربی سے ملا دیا۔ ان دو محلوں کے علاوہ خلیفہ کے اور محل بھی تھے۔ امراء نے بھی بہت بڑے بڑے محل تعمیر کرائے جو شاہی محلوں کی ہمسری کرتے تھے۔ ہر محل کے ساتھ بہت بڑے بڑے باغ تھے۔ چار جامع مسجدیں، یعنی الجامع الازہر، الجامع النور، الجامع المعز، الجامع الحکم اور بہت سی اور مسجدیں وجود میں آئیں۔ امام حسین

کے ماتم کی غرض سے ایک بڑی عمارت تعمیر کی گئی جو حسینیہ کہلاتی تھی۔ شہر میں بیس ہزار دکانیں اور شہر کے ہر حصے میں حمام تھے۔ خواتین کے حمام مردوں کے حمام سے الگ تھے۔ خواتین کے حمام بہت مزین کیے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ بآسانی پہچانے جا سکتے تھے۔ شہر کے چاروں طرف فصیل تھی جس میں بہت سے دروازے تھے۔ شہر کے انتظام میں امیر الجیوش کو بہت دخل تھا جسے سپہ سالار ہونے کے ساتھ وزیر کا منصب بھی حاصل تھا۔

شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ علم طبیعیات کے تحت نئے شہروں کا ذکر کیوں کیا گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی نئے شہر کی منصوبہ بندی اور تعمیر کے لیے انجینئری کی اعلیٰ درجہ کی استعداد ضروری ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھارت اور پاکستان میں نئے شہروں کی تعمیر کے سلسلہ میں دنیا کے بہترین ماہرین فن کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ہندوستان میں صوبہ مشرقی پنجاب میں چندی گڑھ اور صوبہ اوڑیسہ میں بھبنیشور کے نئے شہر بنائے گئے اور پاکستان میں اسلام آباد۔ ان تینوں شہروں کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی نگرانی دنیا کے بہت بڑے بڑے انجینئروں نے کی۔ اسی پر قیاس کیجئے کہ جب بغداد یا قاہرہ تعمیر کیے گئے ہونگے تو اس زمانے کے بہترین انجینئروں نے ان کے نقشے بنائے ہوں گے اور کئی کئی سال تک ان کی تعمیر کی نگرانی بھی کی ہوگی۔ اسی طرح شاہی محل، مقبرے، مسجدیں، یونیورسٹیاں، شفاخانے وغیرہ بھی مشہور و معروف انجینئروں کے مشورے سے بنائے جاتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے مقبرے کے لیے مختلف ممالک کے انجینئروں نے نقشے بنائے تھے جن میں سے ایک انجینئر کا نقشہ پسند کر کے اس کے مطابق مقبرہ بنایا گیا۔ دنیا کی مشہور ترین عمارت تاج محل کا نقشہ محمد آفندی نے جو ترک تھا، بنایا تھا۔

مسلمانوں کی مشہور عمارتیں

یوں تو دیہات یا شہر میں جہاں کہیں انسان رہتا ہے، اپنے رہنے کے لیے اچھے یا برے مکان بنا ہی لیتا ہے۔ لیکن متمدن و تہذیب یافتہ قوموں کی عمارتیں ان کے تمدن اور تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہیں اور انہیں دیکھ کر ان کی علمی ترقی کا مقام اور ان کی قومی شخصیت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے براعظموں میں جہاں کہیں مسلمانوں نے حکومت کی وہاں ان کی عمارتیں ان کی انجینئری کی اعلیٰ استعداد و مہارت کی شہادت دیتی ہیں۔ ان کی ہزارہا بے مثال عمارتوں میں سے زمانہ کی دستبرد سے آج جو عمارتیں بچی ہوئی ہیں، ان کی تعریف اور توصیف میں جو کچھ بالخصوص اہل یورپ نے کہا اس کو جمع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں بآسانی تیار کی جا سکتی ہیں۔ تاج محل، جو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے، مسلمانوں ہی کا بنایا ہوا ہے۔ یورپ کے تنگ

نظر و متعصب لوگوں نے بہت دنوں تک یہ کوشش کی کہ تاج محل کی منصوبہ بندی و تعمیر کا سہرا کسی یورپی انجینئر کے سر باندھا جائے ۔ مگر بالآخر اہل یورپ کو تسلیم کرنا پڑا کہ اس کا نقشہ ایک مسلمان ہی کا بنایا ہوا تھا ۔ میجر جنرل سر ولیم ہنری سلیمین (Sleeman) جو ایک متعصب انگریز تھا اور جو اودھ کی بادشاہت ختم کرانے کا بڑی حد تک ذمہ دار تھا ' اپنی کتاب "ہندوستانی سرکار کے ایک عہدیدار کی غیر مسلسل باتیں اور یادداشتیں " Rambles and Recollections of an Indian official) میں جو 1844ء میں شائع ہوئی تھی ' مشہور سیاح ٹریورنیر (Travernier) کے حوالے سے جو تاج محل کی تکمیل کے وقت ہندوستان میں موجود تھا ' لکھتا ہے کہ تاج محل کی تعمیر میں پچیس سال تک بیس ہزار کاری گر روزانہ کام کرتے رہے اور اس پر تین کروڑ سترہ لاکھ اڑتالیس ہزار چھبیس روپے صرف ہوئے ۔ مشہور مورخ وی ۔ اے ۔ اسمتھ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ محمد عیسیٰ آفندی نے اس مقبرہ کا نقشہ بنایا تھا ۔ وہ ترک تھا جیسا کہ اس کے توصیفی نام آفندی سے ظاہر ہے ۔ اس کے بیٹے محمد شریف نے اس کے معاون کی حیثیت سے کام کیا ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمد شریف سمرقند کا باشندہ تھا ۔ یہ معلومات اسمتھ نے ان دستاویزات سے حاصل کیں جو تاج محل کی تعمیر کے بارے میں فارسی میں لکھی گئی تھیں۔

سلیمین نے پہلے پہل تاج محل کو دیکھ کر جو اثر قبول کیا وہ یہ تھا:

"تاج محل کے پھاٹک کو ' بے نظیر گنبد اور میناروں کو ' کشادہ صحن کو ' غرض جس چیز کو دیکھا میری توقع سے کہیں زیادہ نکلی ۔ اس امید میں کہ کہیں نہ کہیں کوئی خامی تو نظر آئے گی ' اس عمارت کے ایک ایک جز کو میں نے بہت غور سے دیکھا ۔ مگر مجھے انگشت نمائی کے لیے کچھ نہ ملا ۔ جو تاثر پہلی نگاہ میں دل نے قبول کیا تھا ' وہ گہرا ہوتا گیا ۔ گنبد اور میناروں سے لے کر مزار کی جالی کے پھولوں تک تفصیلی جائزہ لینے پر ہر چیز کی دلکشی بڑھتی گئی ۔ یہ عمارت بار بار دامن دل کھینچتی ہے اور ہر بار اسے دیکھ کر ایک لازوال مسرت کا احساس دل میں پیدا ہوتا ہے" ۔

اور عمارتوں کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ مسلمانوں کی تعمیری خصوصیات کے متعلق سید امیر علی اور ول ڈیوراں کے اقتباسات درج کر دیئے جائیں ۔ سید امیر علی نے "مسلمانوں کی تاریخ" میں لکھا ہے:

"عربوں کی عمارتیں رومی اور ایرانی عمارتوں سے زیادہ خوب صورت ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم کا طرز تعمیر اس کی زاد بوم اور قدیم

حالات ' بود و باش کی عکاسی کرتا ہے ۔ چنانچہ عربوں کی خوبصورت محرابیں ' ستون ' مینار اور قبے ان محرابوں اور قبوں سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں جو ان کے کھجوروں کے باغوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور جن کا نظارہ عربوں کو بہت عزیز ہے" ۔

ول ڈیوراں نے "مذہب کا عہد" میں لکھا ہے:

"اسپین کے الحمرا سے ہندوستان کے تاج محل تک جتنی عمارتیں بنائیں ان میں اسلامی آرٹ مکان و زبان کی تمام حدود لانگھ کر ' نسل وخون کے تمام امتیازات کا مذاق اڑاتا ہوا گزر گیا اور اس نے ایسا عدیم المثال مگر متنوع طرز تعمیر تخلیق کیا جو انسانی سرشت کو بڑی لطافت سے رونما کرتا ہے اور جس پر سبقت پانا کسی کو نصیب نہیں ہوا" ۔

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ باہر سے مردانہ قوت کی آئینہ دار ہوتیں اور اندر کے نقش و نگار میں نسائی حسن اور نزاکت نمایاں ہوتی ۔

<u>قلعے</u> ' <u>محل</u> اور <u>مسجدیں</u> : جس مسلمان فرمانروا نے اپنے لیے محل بنوایا ' اس نے ایک شاندار مسجد بھی عموماً بنوائی ۔ مسلمان فرمانرواؤں میں سب سے پہلے جس نے محل بنوایا وہ امیر معاویہ تھے ۔ ان کے محل کا نام قصر الخضرا تھا ۔ ان کے عہد میں مختلف شہروں میں بڑی بڑی مسجدیں تعمیر ہوئیں ۔ "تاریخ بنی امیہ" میں معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں کہ امیر معاویہ نے الطرطوس ' بلینارس اور مرقیہ میں نئے قلعے رومیوں کے حملے روکنے کے خیال سے بنوائے ۔ جزیرہ روڈس میں بھی ایک قلعہ بنوایا جو سات برس تک فوجی مرکز رہا۔

اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے ابتدائی دور میں مکہ معظمہ پر حضرت عبداللہ بن زبیر کا قبضہ تھا ۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ عبدالملک نے یروشلم میں چند شاندار عمارتیں بنوائیں جو مجموعی طور پر الحرم الشریف کہلاتی ہیں ۔ ان عمارتوں میں المسجد الاقصیٰ اور صخرا کا گنبد بھی شامل ہیں ۔ صخرا وہ چٹان ہے جہاں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات آسمان پر تشریف لے گئے تھے ۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ عبدالملک نے حکم دیا کہ مکہ کے خانہ کعبہ کے بجائے اب لوگ صخرہ کو کعبہ سمجھیں مگر کچھ عرصے بعد عبدالملک کے قبضہ میں مکہ معظمہ بھی آگیا تو اس حکم پر تعمیل کرانے کی ضرورت باقی نہ رہی ۔ مورخ مقدسی کے نزدیک عبدالملک کی بنائی ہوئی مسجد الاقصیٰ اس عظیم مسجد سے زیادہ خوبصورت تھی جو اس کے بیٹے خلیفہ ولید اول نے دمشق میں بعد میں بنائی۔

ولید اول نے دمشق میں ایک بہت بڑی اور پرشکوہ مسجد تعمیر کرائی جس پر اس نے سات سال کی مالگزاری صرف کی۔ یہ اسلام کی سب سے عظیم و شاندار مسجد سمجھی جاتی تھی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں بارہ ہزار لیمپ جلائے جاتے تھے۔ 1400ء میں جب تیمور لنگ تاخت و تاراج کرتا ہوا دمشق پہونچا تو اس نے اس خانہ خدا کو بھی نہ چھوڑا اور اسے نذر آتش کر دیا۔ تیموری طوفان گزر جانے کے بعد اس کی مرمت کر کے اسے دوبارہ پر رونق بنایا گیا۔ پانچ سو سال بعد 1894ء میں اس میں پھر آگ لگ گئی۔ ترک حکمرانوں نے مرمت تو کرائی مگر یہ مرمت مسجد کے شایان شان نہ تھی۔ نقش و نگار سے اسے مزین کرنے کے بجائے استرکاری اور سفیدی کرا دینے ہی پر اکتفا کیا گیا۔ یہ مسجد آج بھی موجود ہے۔ "تاریخ بنی امیہ" میں لکھا ہے کہ سات سال کا خراج جو ولید اول نے اس مسجد پر صرف کیا تھا، وہ چھپن لاکھ اشرفیوں کے برابر تھا۔ اس مسجد میں بیس ہزار آدمی سما سکتے تھے، پوری عمارت سنگ مرمر کی تھی اور قندیلوں کی زنجیریں سونے کی تھیں۔

ولید اول نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو جو اس وقت مدینہ منورہ کے گورنر تھے، مسجد نبوی کو از سر نو تعمیر کرنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے بڑے اہتمام اور ذوق و شوق سے یہ کام کرایا۔ صرف قبلہ رخ دیوار اور اس کے طلائی کام اور اعلیٰ درجہ کی میناکاری کرائی اور ایک خوبصورت فوارہ بنوایا۔ تین سال میں تعمیر مکمل ہوئی تو خلیفہ ولید اسے دیکھنے آیا اور بہت خوش ہوا۔ اظہار خوشی میں اہل مدینہ کو نقد روپیہ اور طلائی و نقرئی ظروف دیئے۔ از راہ احتیاط حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مزار مبارک کے چاروں طرف دوہری دیواریں تعمیر کرائی تھیں۔

ول ڈیوراں نے مسجد نبوی کی تعمیر کا سہرا ولید ثانی کے سر باندھا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

706ء میں ولید اول نے دمشق میں ایک بہت بڑا شفاخانہ بنوایا جو بیمارستان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں مریضوں کے علاج کے علاوہ علم طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ شفاخانہ بنی امیہ کی سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی کئی صدیوں تک چلتا رہا۔ 918ء میں اس میں چوبیس اطباء کام کرتے تھے۔

قرہ بن شریک نے جو ولید اول کے عہد میں نائب السلطنت تھا، جامع مصر تعمیر کرائی اور اسے خوب آراستہ کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے سمرقند و خراسان کے حاکموں کو راستوں اور شہروں میں سرائیں بنوانے کی ہدایت کی جس کی تعمیل کی گئی۔ ان کا حکم تھا کہ ہر مسافر کی ایک شب و روز میزبانی کی جائے اور بیمار مسافروں کو دو دن مہمان رکھا جائے۔ تمام مسافروں کی سواریوں کی حفاظت سرکاری حکام کی ذمہ داری تھی۔

عباسی خلیفہ منصور نے جب بغداد بسایا تو شہر کے بیچوں بیچ اپنا پرشکوہ محل بنوایا جس کا نام الخلد رکھا۔ اس کا بڑا پھاٹک سونے کا تھا۔ قصر الخلد کے ایوان پر سبز گنبد تعمیر کیا گیا جس کی اونچائی اسّی کیوبٹ (سوا سو فٹ سے زیادہ) تھی۔ اس گنبد کے اوپر ایک شہ سوار کا مجسمہ بنایا گیا جو ایک ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے تھا۔

منصور نے قصر الخلد کے قریب ہی جامع مسجد بنوائی جو بہت وسیع اور خوبصورت تھی۔ بغداد کے دوسرے حصے میں جو منصور کے بیٹے مہدی کے نام پر مہدیہ کہلاتا تھا، ایک نہایت شاندار قصر خلافت تعمیر کیا گیا اور اس کے گرد بہت بڑا باغ لگایا گیا۔ یہ قصر الخلافت منصور کے بعد بنایا گیا۔ مشہور مورخ ابو الفدا کے حوالے سے ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ خلیفہ کے محل میں بائیس ہزار قالین بچھے ہوتے اور اڑتیس ہزار پردے در و دیوار کو آراستہ کرنے میں استعمال ہوتے۔ ابو الفداء کا زمانہ آخر تیرہویں اور ابتدائی چودہویں صدی کا زمانہ تھا۔ جب تک بنو عباس کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے یہ معلومات دوسروں سے حاصل کی ہوگی۔ ول ڈیوراں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بغداد میں ستائیس ہزار حمام تھے۔ بغداد کی زیادہ آبادی جو بتائی گئی ہے، وہ بیس لاکھ ہے اگر حمام کی یہ تعداد صحیح ہے تو ہر چوہتر افراد پر ایک حمام کا اوسط پڑتا ہے۔

عباسی خلیفہ مہدی بہت دیندار اور فیاض تھا۔ اس نے مسجد نبوی کو از سر نو بنوایا اور آراستہ کیا۔ جب وہ حج کرنے گیا تو تین کروڑ درہم اس نے اہل حجاز میں تقسیم کیے۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کے سر اسلامی ممالک کی سب سے پہلی رصد گاہ بنانے کا سہرا ہے۔ یہ رصد گاہ شماسیہ میں قائم کی گئی تھی۔ بعد میں واسط اور کچھ اور مقامات پر بھی رصد گاہیں بنائی گئیں۔ رصد گاہوں کے علاوہ مامون نے بغداد میں سائنس کی تحقیق کی غرض سے بیت الحکمۃ قائم کیا۔

عباسی خلیفہ المتوکل نے بغداد میں ایک وسیع و شاندار جامع مسجد تعمیر کرائی۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ اس پر سات لاکھ دینار جو بتیس لاکھ پچاس ہزار ڈالر کے برابر ہوتے ہیں، صرف کیے۔ بلاذری نے فتح البلدان میں لکھا ہے کہ متوکل نے اس پر بہت دولت خرچ کی اور اس کے مینار اس قدر

بلند رکھے کہ کئی کئی فرسخ سے نظر آتے تھے ۔ لوگ منصور کی بنوائی ہوئی جامع مسجد کو چھوڑ کر اس میں جمعہ پڑھنے گئے ۔ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ جو جامع مسجدیں عباسی خلفاء نے بغداد میں بنوائیں ، وہ نہایت شاندار تھیں اور خلیفہ ولید اول کی مسجد کے ہم پلہ تھیں۔

ول ڈیوراں کہتا ہے کہ متوکل نے قریب قریب اتنے ہی صرفہ سے ایک محل بھی تعمیر کرایا اور اس کا نام جعفریہ رکھا ۔ متوکل کا پورا نام المتوکل علی اللہ جعفر ابو الفضل تھا ۔ یعنی محل کا نام اس نے اپنے نام جعفر پر رکھا تھا۔

عباسی خلیفہ المعتضد نے چار لاکھ دینار (جو انیس لاکھ ڈالر کے برابر ہوتے ہیں) خرچ کر کے ایک قصر بنوایا جس کا نام ثریا رکھا ۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قصر کے اصطبلوں میں نو ہزار گھوڑے ، اونٹ اور خچر باندھے جاتے تھے۔

عباسی خلیفہ المکتفی نے خلیفہ معتضد کے محل کے قریب ایک اور محل بنوایا جس کا نام قصر التاج (Palace of the Crown) تھا۔

عباسی خلیفہ المقتدر نے ایوان الشجر (Hall of the tree) بنوایا ۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ باغ میں جو تالاب تھا اس میں ایک سونے چاندی کا پیڑ نصب کیا گیا تھا ۔ چاندی کی شاخوں اور پتوں پر مصنوعی چڑیاں بٹھائی گئی تھیں جن کی چونچوں سے نغمے نکلتے تھے ۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ 917ء میں یونانی سفیر بغداد آئے تو وہ خلیفہ کے نفیس شاندار محلوں کو دیکھ کر بہت مرعوب ہوئے ۔ سنگ مرمر کے ستون اور غلام گردشیں نہایت خوبصورت اور لاتعداد قالین اور پردے ، چمکیلی وردیوں میں ایک ہزار سائیس ، سونے اور چاندی کی زینیں ، گھوڑوں پر زربفت و کمخواب کی جھولیں ، باغوں میں طرح طرح کے جانور ، مکانوں کے برابر کشتیاں جن پر دجلہ میں خلیفہ سیر کرتا تھا ___ یہ کروفر اور ساز و سامان جب سفیروں نے دیکھا تو ان کے دل میں خلیفہ کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا ۔ ایک اور ایوان کا نام ایوان الفردوس تھا جس میں دیواروں میں جواہرات جڑے ہوئے تھے ۔ بغداد میں یوں تو سینکڑوں مدرسے تھے مگر ان میں دو کی بہت شہرت ہوئی ۔ ایک وہ جو ملک شاہ کے وزیر نظام الملک نے 1065ء میں قائم کیا ۔ اس کا نام مدرسہ نظامیہ ہے ۔ دوسرا وہ جو ڈیڑھ سو سال بعد 1234ء میں خلیفہ المستنصر نے قائم کیا ۔ ایسا مدرسہ نہ اس سے پہلے قائم ہوا تھا اور نہ اس کے بعد ۔ اس کی عمارتیں ، ساز و سامان اور لوازمات اور تمام مدرسوں سے سبقت لے گئے ۔ اس میں طلباء کو مفت تعلیم اور کھانا دیا جاتا اور ایک دینار ماہانہ جیب خرچ ملتا ۔ طلبہ کا علاج معالجہ بھی سرکاری طور پر مفت کیا جاتا ۔ مدرسہ کا کتب خانہ بہت بڑا تھا جس سے اساتذہ اور طلبہ مستفید ہوتے۔

عضد الدولہ کے شیراز کے محل میں تین سو ساٹھ کمرے تھے ۔ ہر ایک کا رنگ مختلف تھا ۔ یہ تین سو ساٹھ کمرے سال کے تین سو ساٹھ دنوں کو ملحوظ رکھ کر بنائے گئے تھے ۔ ہر دن کا ایک کمرہ تھا ۔ اس میں ایک دو منزلہ کتب خانہ تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ کسی موضوع پر بھی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو یہاں موجود نہ ہو ۔ نیشاپور کی مسجد اپنے زمانے کے عجائبات میں شمار ہوتی تھی ۔ اس کے سنگ مرمر کے ستون ، طلائی کام اور نقش و نگار سے مزین دیواریں دل کھینچتی تھیں ۔ ہرات کی مسجد بھی ایسی خوبصورت تھی کہ اس کے آگے پورے خراسان و سیستان کی مسجدیں ماند پڑ جاتی تھیں۔

عباسی خلفاء کے بسائے ہوئے چند شہروں کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے ۔ ان کا سب سے پہلا خلیفہ ابو العباس عبد اللہ السفاح تھا ۔ اس نے اپنے دار الحکومت کوفہ سے کچھ فاصلے پر ایک نیا شہر بسایا تھا جس کا نام مدینۃ الہاشمیہ رکھا تھا ۔ واضح رہے کہ بنی امیہ کے خلاف جو سیاسی تحریک حضرت عبد اللہ بن عباس کے پوتے محمد بن علی نے چلائی تھی اور جسے ان کے بیٹوں ابراہیم اور ابو العباس نے زیادہ شدت سے جاری رکھا تھا ، وہ بنی ہاشم کی مشترکہ تحریک تھی ۔ اس لیے جب ابو العباس السفاح نے خلیفہ بن کر نیا شہر بسایا تو اس کا نام ہاشمیوں کا شہر رکھا ۔ بنو عباس کے ہاتھ میں خلافت آنے سے پہلے مدینہ منورہ میں جمع ہو کر ہاشمی خاندان کے ممتاز افراد نے ایک خفیہ جلسہ میں اتفاق رائے سے حضرت حسن کے پرپوتے محمد النفس الزکیہ کو اپنا امام تسلیم کیا تھا اور ان کی اطاعت کی بیعت کی تھی ۔ بیعت کرنے والوں میں ابو العباس کا چھوٹا بھائی ابو جعفر بھی ، جو بعد میں خلیفہ المنصور کے نام سے مشہور ہوا ، شامل تھا ۔ افسوس کہ اطاعت کرنے کے بجائے منصور نے نفس الزکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کو مروانے کی کوشش کی اور ان کے والد اور خاندان والوں کو گرفتار کر لیا ۔ بالآخر وہ دونوں اس کے خلاف خروج کرنے پر مجبور ہوئے جس کے نتیجے میں شہادت پائی ۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کو نفس الزکیہ اور ابراہیم کی حمایت کرنے کی سزا میں منصور نے سخت اذیتیں دیں۔

نفس الزکیہ کے ایک اور بھائی ادریس ، خلیفہ الہادی کے زمانے میں بھاگ کر شمالی افریقہ کے صوبہ مغرب الاقصیٰ (Mauritania) پہونچے ۔ آل رسول ہونے کی وجہ سے بہت جلد وہ وہاں کے بربری قبیلوں میں مقبول ہو گئے ۔ ان قبیلوں نے انہیں اپنا امام تسلیم کیا اور عباسی گورنر کو شکست دے کر ادریسی خاندان کی حکومت قائم کی جو 785ء سے 922ء تک یعنی ایک سو سینتیس برس چلی ۔ اس سلطنت کو ختم کرنیوالی آل رسول کی ایک دوسری شاخ تھی جو فاطمی کہلائی ۔ امام ادریس نے مغرب الاقصیٰ کو فتح کر کے ایک نیا شہر فاس (FEZ) بسایا اور اسے اپنا دار الحکومت بنایا تھا ۔ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ ادریس ایک بیدار مغز فرماں روا ثابت ہوئے اور ان کی مساعی جمیلہ سے یہ شہر بہت جلد علم و ثقافت کا مشہور مرکز بن گیا۔

اغلب خاندان نے افریقیہ پر 801ء سے 909ء تک یعنی ایک سو آٹھ سال حکومت کی۔ اس خاندان کے پہلے فرمانروا نے قیروان کے نزدیک ایک نیا شہر عباسیہ بسا کر اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ یہی وہ خاندان تھا جس نے صقلیہ (Sicily) کو فتح کیا۔ 831ء میں صقلیہ کے دارالحکومت بالرم (Palermo) پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور بہت جلد سارا جزیرہ ان کے زیرنگیں آ گیا۔ 846ء میں مسلمان فوج روم کے مضافات تک پہونچ گئی۔ 883ء میں اٹلی کے جنوبی علاقہ کو تسخیر کیا۔ 1152ء تک مسلمان صقلیہ پر قابض رہے۔

ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ 876ء میں پوپ مجبور ہوا کہ مسلمانوں کو پچیس ہزار مینگ کس (Mancus) جو پچیس ہزار ڈالر کے برابر ہیں ' سالانہ دے کر مسلمانوں کے حملوں سے جان چھڑائے۔ ول ڈیوراں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب 970ء میں ابو حوقل بالرم گیا تو وہاں تین سو مسجدیں پائیں۔ صقلیہ کی تہذیب و بود و باش پر اسلامی رنگ پوری طرح چڑھ گیا تھا۔ صقلیہ میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی یہ رنگ قائم رہا۔ حالانکہ مجوس (Normans) نے مسلمانوں کی عمارتیں مسمار کر دیں مگر خود جو عمارتیں بنائیں وہ اسلامی طرز کی بنائیں۔ قصر الازیزا (Palace of Laziza) اور اس قصر کا گرجا ویسا ہی بنایا جیسے مسلمان اپنی عمارتیں بناتے تھے اور ان کو مسلمانوں کی عمارتوں ہی کی طرح مزین و آراستہ کیا۔ (ول ڈیوراں نے مجوسیوں کی فتح کا زمانہ 1060ء سے 1091ء تک لکھا ہے۔ مگر سید امیر علی کہتے ہیں کہ کاؤنٹ راجر نے 1152ء میں صقلیہ میں مجوسی حکومت قائم کی۔)

رابرٹ بریفو " تعمیر انسانیت " میں لکھتا ہے کہ یورپ کو متمدن و مہذب بنانے میں صقلیہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شہنشاہ فریڈرک ثانی نے مسلمانوں کے طور و طریق اپنا کر انہیں یورپ میں رائج کرنے اور فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

جب خلافت عباسیہ کمزور پڑ گئی تو 869ء میں احمد ابن طولون نے مصر و شام پر قبضہ کر لیا۔ 884ء میں اس کا بیٹا خمارویہ بادشاہ ہوا۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ اس نے اپنے محل کی دیواروں پر سونے کی استرکاری کرائی اور ایک حوض کو سیماب (پارے) سے بھروانے پر بہت دولت صرف کی۔ حوض کو سیماب سے بھروانے کا مقصد یہ تھا کہ چمڑے کے گدے اس پر تیرتے رہیں اور بادشاہ اس پر استراحت فرمائے۔

احمد ابن طولون نے مصر فتح کیا تو فسطاط کے مضافات میں ایک نیا شہر قطائی بسایا۔ 878ء میں ابن طولون نے ایک نہایت شاندار مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کی خستہ عمارت کے آثار آج بھی اس کی عظمت کی شہادت دیتے ہیں۔ ول ڈیوراں کا خیال ہے کہ اس مسجد کی خوبصورت نکیلی محرابوں

کی نقل پہلے صقلیہ میں جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی کی گئی۔ صقلیہ کے مسلمانوں کے بعد وہاں کے مجوس ویسی ہی محرابیں بناتے رہے اور رفتہ رفتہ یورپ کی گاتھی (Gothic) عمارتوں میں بھی ان کا رواج ہو گیا۔ ابن طولون کی مسجد میں اٹھارہ ہزار لیمپ روشن کیے جاتے تھے جن میں سے اکثر مختلف رنگوں کے شیشے کے تھے۔

اسمٰعیلی امام محمد الحبیب بڑے حوصلہ مند اور دور اندیش رہنما تھے۔ وہ حمص کے قریب سلامیہ میں رہتے تھے۔ وہاں سے انہوں نے داعیوں کو مختلف اسلامی ممالک میں تبلیغ کے لیے بھیجا تاکہ ان کا مسلک قبول عام حاصل کرے۔ چنانچہ ابوعبداللہ الحسین ابن محمد ابن زکریہ کو انہوں نے افریقیہ روانہ کیا۔ آٹھ سال کی مسلسل تبلیغ کے نتیجہ میں کچھ بربری قبیلوں کی مدد سے اس نے اغلبی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اس کے دارالحکومت پر قابض ہو گیا۔ اس عرصے میں الحبیب کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے صاحبزادے عبیداللہ نے امامت کا منصب سنبھال لیا تھا۔ ابوعبداللہ نے امام عبیداللہ کو افریقیہ بلایا۔ انہوں نے افریقیہ پہونچ کر فاطمی حکومت کی بنیاد 910ء میں ڈالی۔ 968ء میں فاطمیوں نے مصر فتح کیا اور قاہرہ بسایا۔ اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ المعز تھا۔ اس نے مصر کے علاوہ شام اور حجاز کو بھی فتح کیا اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اس کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ دریائے فرات سے بحر ظلمات تک فاطمیوں کی سلطنت پھیل گئی۔ فاطمیوں نے کئی نئے شہر بسائے اور سینکڑوں خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں۔ انہوں نے سائنس کو فروغ دینے کے لیے ایک بہت بڑی رصد گاہ بنائی جس میں مسلمانوں کے سب سے بڑے ہیئت دان ابن یونس نے مشاہدے کیے اور الزیج الکبیر الحاکمی مرتب کی۔ یہ زیج فاطمی سلطان الحاکم کی سرپرستی میں تیار کی گئی تھی۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے عالم طبعیات ابن الہیثم کو بھی الحاکم کی سرپرستی حاصل رہی۔ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی الازہر کے قیام کا سہرا بھی فاطمیوں ہی کے سر ہے۔ اس کی بنیاد 970ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کی عمارت میں وقتاً فوقتاً ترمیم کی جاتی رہی۔ مگر اب بھی قدیم عمارت کا کچھ حصہ باقی ہے جو گواہی دیتا ہے کہ اس میں بھی ویسی ہی خوبصورت اور نکیلی محرابیں بنائی گئی تھیں۔ جیسی ابن طولون کی مسجد میں ملتی ہیں۔ یہ محرابیں سنگ مرمر ' سنگ خارا اور سنگ سماق (Porphyry) کے تین سو اسی ستونوں پر اٹھائی گئی تھیں۔ الجامع الحاکم کا بھی بیشتر حصہ باقی ہے۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ اس کی آب و تاب اور چمک دمک کا کچھ اندازہ اس کی طغرائی گلکاری اور ستونوں کے بالائی حصہ پر کوفی نقوش سے کیا جا سکتا ہے جو امتداد زمانہ کے باوجود دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ ان پرانی مسجدوں کی دیدہ زیب پچی کاری ' دل آویز خطاطی اور خوش نماٹائلوں کے نمونے اب یورپ و امریکہ کے عجائب خانوں کی زینت کا باعث ہو رہے ہیں۔

جب شمالی افریقہ میں فاطمیوں کا دور دورہ تھا اسی زمانے یعنی گیارہویں صدی کے آغاز میں محمود غزنوی نے افغانستان ' خراسان اور پنجاب میں ایک عظیم و پرشکوہ سلطنت قائم کی۔ عباسی خلیفہ

نے یمین الدولہ و امین الدولہ کے خطابات دیئے ۔ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی حکومت ایشیا کی نہایت درخشندہ حکومتوں میں سے تھی ۔ اس نے غزنی کو سنگ مرمر کے محلوں کا پر رونق شہر بنا دیا۔ محمود غزنوی کے دربار سے البیرونی ایسا عظیم سائنسداں اور فردوسی ایسا عظیم شاعر وابستہ تھا۔ جب محمود غزنوی کا 1030ء میں انتقال ہوا تو اس کی سلطنت اس زمانے کی سب سے زبردست اور مستحکم سلطنت تھی۔

پھر سلجوقیوں کا عظیم الشان دور شروع ہوا ۔ ان کے سردار طغرل بیگ کے سر پر عباسی خلیفہ قائم باللہ نے دو تاج رکھے اور اسے عربوں اور ایرانیوں کے ممالک پر حاکم مقرر کیا۔ سلجوق ایشیا کے بہت بڑے علاقے کے حکمران بن گئے ۔ ان کے عظیم سلطانوں طغرل ' الپ ارسلاں اور ملک شاہ نے علوم و فنون کو بہت ترقی دی ۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ سلجوقیوں ' ایوبیوں اور مملوکوں نے اسلامی آرٹ میں ایک نئی روح پھونکی اور افسوس کرتا ہے کہ آج سلجوقیوں کی عمارتوں میں بمشکل ایک باقی ہے ۔ انہوں نے قونیہ ' موصل ' ہمدان ' بغداد ' قزوین وغیرہ میں نہایت عمدہ و نفیس مسجدیں ' مدرسے اور دوسری عمارتیں تعمیر کی تھیں ۔ مگر اصفہان کی جامع مسجد ان کے فن تعمیر کی بہترین مثال ہے اس کے مقابلے میں ایران کی اگر کوئی اور عمارت پیش کی جا سکتی ہے تو وہ امام رضا کا مقبرہ ہے ۔ اس پر نظام الملک کا نام 1088ء لکھا ہوا ہے ۔ اس کا پھاٹک 180 فٹ اونچا ہے جن کی پچی کاری عدیم المثال ہے ۔ اس مسجد میں وقتاً فوقتاً ترمیم کی گئی ۔ اس کی محراب جو 1310ء میں بنائی گئی ' اس کی گلکاری اور کوفی خطاطی آپ اپنی مثال ہے۔

ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ سلجوقی ماہرین تعمیر نے ایک عظیم انقلاب پیدا کیا ۔ ایرانی عمارتوں میں گلکاری ' نقاشی اور آرائش پر بہت توجہ دی جاتی تھی ۔ سلجوقیوں نے اس کے برخلاف بھاری بھرکم اور پرشکوہ عمارتیں بنائیں ۔ ان کے انجینئر حوصلہ مند اور دلیر تھے ۔ ان کی وسیع النظری ان کی پرشکوہ تعمیرات سے عیاں ہے ۔ اب تک عموماً یہ ہوتا تھا کہ مسجد کو محل کے صحن کے ایک کونے میں بنا دیتے تھے ۔ سلجوقیوں نے مسجدوں کے لیے نمایاں ترین مقامات منتخب کیے ۔ ان کی کرسی اور اونچائی میں اضافہ کیا اور ان پر شاندار مدور یا مخروطی قبے بنائے ' محرابوں اور قبوں میں ہم آہنگی پیدا کی اور مناسب حد تک نقاشی و خطاطی کو جائز رکھا ۔ سلجوقیوں کا طرز تعمیر عراق ' ایران اور ایشیائے کوچک میں بہت مقبول ہوا۔

ایوبی سلطنت سلطان صلاح الدین نے 1175ء میں قائم کی ۔ ہر چند اس کی حکومت کا بیشتر زمانہ صلیبی جنگوں میں صرف ہوا ' مگر اس نے پھر بھی بہت سے تعمیری کام کیے ۔ شاہ معین الدین احمد نے تاریخ اسلام حصہ چہارم میں لکھا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے تمام بڑے

شہروں میں شفاخانے بنوائے جن میں اسکندریہ اور قاہرہ کے شفاخانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مدرسوں کے قیام کی طرف سلطان نے خاص توجہ دی ۔ مقریزی ' سیوطی وغیرہ نے صلاح الدین کے عہد کے مدرسوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مصر میں مندرجہ ذیل مدرسے قائم کیے گئے۔

مدرسہ صلاحیہ ' مدرسہ سیوفیہ ' مدرسہ شرفیہ ' مدرسہ قمحیہ ' مدرسہ عالیہ ' مدرسہ فائزہ ' مدرسہ فاضلیہ ' مدرسہ ارکشیہ ' مدرسہ فخریہ ' مدرسہ عاشوریہ ' (یہ مدرسہ ایک ایوبی امیر کی بیوی نے قائم کیا تھا) مدرسہ قطبیہ (یہ مدرسہ سلطان کی بھتیجی ملک العادل کی لڑکی مونسہ خاتون نے قائم کیا تھا) مدرسہ مہدیہ ' مدرسہ شریفیہ ' مدرسہ صالحیہ ' مدرسہ مسروریہ اور مدرسہ ناصریہ۔

شاہ معین الدین احمد لکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض مدرسے ایسے عظیم الشان اور اس سروسامان کے تھے کہ آج اس کا یقین کرنا مشکل ہو گا ۔ سلطان صلاح الدین کے زمانے میں جب مشہور سیاح ابن جبیر اسکندریہ گیا تو اس نے وہاں کے مدرسوں کی بہت تعریف کی اور لکھا کہ اس شہر کے مناقب و مفاخر میں جس کا سہرا سلطان کے سر ہے ' اس کے مدارس و اقامت گاہیں ہیں ۔ دمشق کے حالات میں ابن جبیر نے لکھا ہے کہ مسجدیں ' مدرسے اور خانقاہیں بنوانے کا شوق اتنا عام ہو گیا ہے کہ عورتیں بھی مسجدیں اور خانقاہیں بنواتی ہیں ۔ حلب میں اتنے مدرسے قائم ہوئے کہ وہ شام کا تعلیمی مرکز بن گیا ۔ قاہرہ کے شفاخانے کے بارے میں ابن جبیر نے لکھا ہے کہ یہ ایک نہایت خوبصورت اور شاندار ایوان معلوم ہوتا ہے ۔ اس میں دواؤں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔ مریضوں کے لیے بہت سے کمرے ہیں ۔ شفاخانہ کا مہتمم دوا اور غذا کا معقول انتظام کرتا ہے ۔ عورتوں کا شفاخانہ اس سے متصل مگر علیحدہ تھا۔ اسی طرح پاگلوں کا شفاخانہ بھی علیحدہ بنایا گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین سے پہلے نور الدین زنگی نے 1160ء میں دمشق میں ایک شفاخانہ قائم کیا تھا جو ملک میں سب سے بڑا دار الشفا تھا اور بیمارستان نوری کہلاتا تھا۔ یہاں غذا اور دوائیں مفت فراہم کی جاتی تھیں ۔ دو سو سترسٹھ سال تک اس شفاخانہ کا مطبخ چلتا رہا ۔ اس عرصہ میں کبھی اس کی آگ نہیں بجھی۔

ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ جب ابن جبیر 1184ء میں بغداد آیا تو وہاں کے بیمارستان کو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ دجلہ کے کنارے یہ ایک شاہی محل ہے ۔ یہاں بھی غذا اور دوا مفت دی جاتی تھی۔

اسپین کی عمارتیں

بنی امیہ کی سلطنت اسپین سے سندھ تک اور خراسان سے یمن تک پھیلی ہوئی تھی ۔ مگر زاب کی لڑائی میں جو 11 جمادی الثانی 132 ھ مطابق 25 جنوری 750ء کو ہوئی ' یہ عظیم سلطنت ختم ہو گئی ۔ بنو عباس نے فتح پانے کے بعد اموی خاندان کے لوگوں کو چن چن کر مارنا شروع کیا۔ اموی خلیفہ ہشام کا پوتا عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام سے بھاگ کر مغرب الاقصیٰ پہونچا ۔ اس نے اسپین کے ان قبیلوں سے رابطہ قائم کیا جو بنو امیہ کے حامی تھے ۔ بالآخر وہ ستمبر 755ء میں خود اسپین پہونچا اور اپنے حامیوں کی مدد سے 13 مئی 756ء کو عباسی خلیفہ کے گورنر یوسف کو شکست دے کر زمام حکومت سنبھالی ۔ عبدالرحمٰن (الداخل) کی قائم کردہ اموی سلطنت اسپین میں 756ء سے 1035ء تک یعنی دو سو نواسی برس قائم رہی ۔ ان اموی سلطانوں میں کئی نہایت بیدار مغز و حوصلہ مند فرمانروا ہوئے ۔ بالخصوص عبدالرحمٰن ثالث الناصر جس نے 912ء سے 961ء تک حکومت کی ' اس خاندان کا گل سرسبد تھا۔

عبدالرحمٰن الداخل نے قرطبہ میں ایک نہایت عظیم الشان مسجد کی تعمیر شروع کرائی جو اس کے بیٹے ہشام کے عہد (788ء سے 796ء تک) میں مکمل ہوئی ۔ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ اس خوبصورت مسجد کی مزید تزئین عبدالرحمن الناصر نے کی ۔ سونے چاندی کی نقاشی نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے اور یہ قرطبہ کی خوبصورت عمارتوں میں نمایاں حیثیت کی حامل بن گئی۔

عبدالرحمٰن الداخل نے محل کے صحن میں ایک نہایت دلکشا باغ رصافہ بنایا جس کے نمونے پر یورپ کے فرمانرواؤں نے اپنے اپنے محلوں کے صحن میں باغ لگانے کا اہتمام کیا ۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اپنا ہی محل اور باغ بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ملک کے ہر صوبے میں اس نے عمدہ عمدہ مسجدیں ، قصر ، قلعے ، حمام اور پل بنوائے ۔

اسپین کا قصر الزہرا عبدالرحمٰن الناصر نے بنوایا تھا ۔ یہ قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر بنایا گیا ۔ قصر سے متعلق ایک شہر آباد کیا جس کا نام بھی الزہرا پڑ گیا ۔ سب سے بڑے پھاٹک پر ملکہ کا مجسمہ نصب کیا گیا کیونکہ یہ محل اسی کے نام سے منسوب تھا ۔ سید امیر علی نے الزہرا کے معنی The Beautiful لکھے ہیں ۔ کچھ لوگ پھول کے معنی لیتے ہیں ۔ جس لفظ کے معنی پھول کے ہیں وہ زہرۃ ہے ۔ زہر کے معنی چمکنے اور ضوافگنی کرنے کے ہیں اور ازہر کے معنی درخشاں کے ہیں ۔ سید امیر علی نے غالباً ضوافگنی کو پیش نظر رکھ کر الزہرا کا ترجمہ خوبصورت کیا ہے ۔ اس محل کی خوبصورتی بیان کرنے میں سید امیر علی رطب اللسان ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا سنگ مرمر دنیا کے مختلف ممالک سے

فراہم کیا گیا تھا تاکہ ہر رنگ کا پتھر دستیاب ہو سکے ۔ جو سنگ مرمر اس محل میں لگا وہ سفید ' گلابی ' سبز ' زرد اور سیاہ رنگ کا تھا ۔ مشرقی دیوان خانے میں سونے کے بنے ہوئے جانور جن میں جواہر جڑے ہوئے تھے ' نصب کیے گئے تھے ۔ ان کے منہ سے فوارے ابلتے تھے ۔ دیوان خاص میں سونے کی میناکاری کے ساتھ ساتھ جواہرات کی مرصع کاری بھی کی گئی تھی ' ستونوں کا تناسب اور ان کی نقاشی حیرت خیز تھی ' کچھ ستون خالص سونے کے تھے جن پر عمدہ گلکاری کی گئی تھی ۔ محل میں ایک خوبصورت تالاب بھی تھا ۔ باغ سے ملحق مختلف اقسام کے جانوروں اور پرندوں کا عجائب خانہ تھا ۔ خدم و حشم کے لیے قصر سے کچھ فاصلے پر عمدہ مکانات تھے ۔ دس ہزار مزدور و معمار روز کام کرتے تھے ۔ یہ قصر بیس سال میں مکمل ہوا ۔ الزہرا کا قصبہ آباد کرنے کی غرض سے وہاں آ کر بسنے والوں میں سے ہر ایک کو چار سو درہم کا عطیہ دیا جاتا ۔ بہت جلد ایک کثیر تعداد الزہرا میں آبسی۔

سید امیر علی نے لکھا ہے کہ قرطبہ کی وسعت و عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں تین ہزار آٹھ سو مسجدیں ' ساٹھ ہزار قصر و محل ' اسّی ہزار دکانیں ' دو لاکھ مکانات ' سات سو حمام اور بہت سی سرائیں اور اقامت گاہیں تھیں ۔ قرطبہ کی شہرت تمام یورپ میں پھیل گئی اور یہ دنیا کا تابندہ ترین گوہر سمجھا جانے لگا ۔ دراصل بغداد بھی قرطبہ سے کم نہ تھا ۔ بلکہ کئی حیثیتوں سے قرطبہ سے بڑھ کر تھا ۔ مگر یورپ والے بغداد سے بہت دور ہونے کے باعث قرطبہ ہی کو دنیا کا سب سے پر رونق شہر سمجھتے تھے ۔

اندلس کا فن تعمیر اندلس تک محدود نہ رہا بلکہ مصر کو چھوڑ کر تمام شمالی افریقہ میں بارہویں صدی عیسوی میں پھیل گیا ۔ چنانچہ مراکش ، فاس ، تلمسان ، تونس ' طرابلس وغیرہ میں اسی طرز کی مسجدیں اور محل بننے لگے ۔ بارہویں صدی میں مصر ' شام ' فلسطین ' عراق عرب ' عراق عجم ' ایران اور خراسان میں سلجوقی طرز تعمیر زیادہ مقبول تھا۔

اندلس کے مسلمان سلطانوں کا وزیر اعظم حاجب کہلاتا تھا ۔ جب سلطان حاکم کا 976ء میں انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ہشام صرف گیارہ برس کا تھا ۔ محمد بن ابی عامر نے سلطان ہشام ثانی کو نظر بند کر کے حاجب کا عہدہ سنبھالا اور سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا ۔ اس نے حاجب المنصور کا لقب اختیار کیا اور قصر الزہرا کی ہمسری کرنے کی غرض سے اپنے لیے ایک عظیم الشان قصر تعمیر کرایا جس کا نام قصر زاہرہ (تابندہ قصر) رکھا ۔ یہ قصر بھی تمام تکلفات و مرصع کاری سے مزین تھا ۔ محمد بن ابی عامر بہت بیدار مغز اور شجاع تھا ۔ اس نے چھبیس سال حکومت کی ۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ اس نے باون معرکے سر کیے ۔ اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں ان میں سے کسی ایک میں بھی شکست کا منہ نہ دیکھا ۔ اس نے سلطنت کو حدود الجبال البسط (Pyrenees) تک جو فرانس اور اسپین کے درمیان ہے ' توسیع دی ۔

محمد بن ابی عامر 1002ء میں فوت ہو گیا' اس کے دو بیٹوں نے چند سال حکومت کی مگر لوگوں نے بغاوت کی اور قصر زاہرہ جلا دیا۔ پھر طوائف الملوکی شروع ہو گئی۔ مغربی افریقہ کی رابطین حکومت نے 1086ء میں اسپین کی سیاست میں دخل دیا۔ جن علاقوں پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تھا انہیں واپس لیا۔ 1147ء میں خاندان موحدین کے نامور سلطان عبدالمومن نے اسپین میں فوج اتاری۔ اس نے اور پھر اس کے لائق بیٹے ابویعقوب یوسف نے 1199ء تک بڑے رعب و دبدبہ سے حکومت کی۔ پھر مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی یہاں تک کہ تیرہویں صدی کے اول نصف میں غرناطہ کی ریاست کے علاوہ سارے اسپین پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ابویعقوب یوسف بہت علم دوست تھا' ابن زہرہ' ابن باجہ اور ابن رشد جیسے طبیب و فلسفی کی اس نے سرپرستی کی اور ایک نہایت عالیشان رصد گاہ تعمیر کرائی جو یورپ میں جرالڈا (Giralda) کے نام سے مشہور ہوئی۔ ابویعقوب یوسف نے طلیطلہ (Toledo) کے انجینئر جلوبی کے نقشے کے مطابق ایک محلّ بھی تعمیر کرایا تھا جس کا نام القصر تھا۔ یہ عمارت قلعہ کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ بعد میں عیسائی بادشاہوں کی رہائش گاہ بن گئی۔

1236ء میں قرطبہ اور 1248ء میں اشبیلیہ (Seville) عیسائیوں نے فتح کر لیے۔ صرف غرناطہ کی چھوٹی سی ریاست پر مسلمانوں کا قبضہ باقی رہ گیا۔ یہ ریاست بہت سخت جان ثابت ہوئی اور مزید ڈھائی سو سال یعنی 1492ء تک چلی۔ اس طرح جس اسلامی سلطنت کی بنیاد طارق بن زیاد نے اسپین میں 30 اپریل 711ء کو جبل الطارق پر اتر کر ڈالی تھی' وہ کم و بیش آٹھ سو سال بعد اسپین سے بالکل معدوم ہو گئی۔

جب اسپین میں الموحدین کی حکومت تیرہویں صدی کے نصف اول میں ختم ہو گئی تو ابن الاحمر نے جس کا نام محمد بن یوسف تھا' بڑی ہوشمندی اور تدبر سے غرناطہ' مالقہ (Malaga) المیریا وغیرہ پر اقتدار حاصل کر کے غرناطہ کو اپنا پایہ تخت بنایا اور الغالب باللہ کا لقب اختیار کر کے حکومت کرنے لگا۔ اس نے غرناطہ کے مقابل ایک پہاڑی پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا' جو اس کے نام پر یا قلعہ کے سرخ رنگ کی وجہ سے الحمرا کہلایا۔ الحمرا تمام دنیا میں مشہور ہو گیا۔ مسلمانوں کو اشبیلیہ سے بے دخل کر دینے کے سو سال بعد وہاں کے عیسائی بادشاہ پیٹر سفاک (Peter the Cruel) نے جس کا دور حکومت 1350ء سے 1369ء تک رہا' الحمرا کے طرز پر ایک محل بنوایا جس کا نام القصر (Alcazar) رکھا۔ جارج سارٹن القصر کا الحمرا سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہر چند مسلمانوں کی اشبیلیہ سے بیدخلی کو ایک صدی گزر گئی تھی۔ مگر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا اثر اسپین کے عیسائیوں پر اس قدر غالب تھا کہ پیٹر نے اپنا محل خالص مسلمانوں کے طرز پر بنایا مگر القصر الحمرا کے مقابلے میں کم تر ہی رہا۔

الحمرا صرف ایک قلعہ ہی نہ تھا بلکہ دراصل ایک پورا شہر تھا۔ اس کے حصار میں چالیس ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی۔ چنانچہ اس کا نام مدینۃ الحمرا' اس کے شہر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ "مسلمانوں کی مختصر تاریخ" میں سید امیر علی لکھتے ہیں کہ اس مختصر کتاب میں اس عظیم و حسین شہر کی صحیح و مکمل تصویر پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس کے مینار' قلعے' محل' ان کا سبک و خوش وضع طرز تعمیر' ان کی دیدہ زیب غلام گردشیں اور ستونوں کی قطاریں' ان کے قبے اور چھتیں جن کے نقش و نگار کی تابانی آج تک کم نہیں ہوئی' ان کے ہوادار کمرے اور ایوان جن میں باغ کے پھولوں کی خوشبو دار ہواؤں کے آنے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا' ان کے بے شمار فوارے جن کے پانی ابلنے کی رفتار کو مرضی کے مطابق کم و بیش کیا جا سکتا تھا۔ فواروں کے پانی کو مستطیل چادروں کی شکل میں پھیلاتے اور ان میں ملحقہ عمارتوں' فواروں اور نیلگوں آسماں کو منعکس کر دیتے تھے۔ ان عمارتوں کے دل آویز طغرائی نقش و نگار اور پچی کاری سے چھوٹے سے چھوٹا کمرہ بھی آراستہ کیا گیا تھا۔ کمروں کی سنہری' گلابی' گلابی' ہلکی نیلی اور دھندلی ارغوانی روشنی' دیواروں کے زیریں حصے پر چینی مٹی (Porcelain) کی تختیوں پر پچی کاری سے بنائی ہوئی طرح طرح کی خوشنما تصویریں' شیروں کے کشادہ ہال میں پتلے پتلے نازک ایک سو اٹھائیس ستون' ان کا نیلا اور سفید فرش جس میں گلناری' لاجوردی اور طلائی رنگوں کے امتزاج سے دلفریب ہم آہنگی پیدا کی گئی تھی' اس پر مختلف رنگوں کے طغرائی نقوش جن کو دیکھ کر کشمیری شال کا دھوکہ ہو' اس کی محرابوں کی حسین طلاکاری' اس کی خوبصورت چھتریاں' اس کے بیچوں بیچ سنگ جراحت کا مشہور عالم کٹورہ' وہ دلنواز ایوان موسیقی جس میں سلطان و امراء جمع ہو کر شہ نشینوں میں بیٹھے ہوئے مغنیوں کی موسیقی سے محظوظ ہوتے تھے۔ وہ دلکش حرم سرا جس میں پیتل کی نازک جالیاں اور نہایت خوش نما چھتیں تھیں۔ وہ چھوٹے کمروں کے مخروطی استروں کے نظر فریب رنگ۔ ان سب کا کماحقہٗ بیان کرنے کے لیے ایک ماہر فن کا قلم درکار ہے۔

شہر کے حدود کے اندر ہی ایک دوسری پہاڑی پر الحمرا کے سامنے ایک اور محل بنایا گیا تھا جس کے متعلق جامع العارف ایک مسجد تھی۔ اسی مسجد کے نام پر اس محل کا نام جامع العارف (Al Generaliffe) پڑ گیا۔ یہ بھی حسن کا ایک حیرت انگیز شاہکار تھا۔ اس میں بھی فواروں' باغوں اور پھولوں کی کثرت تھی۔ اس کے باغ اس ایمفی تھیٹر (Amphitheatre) کی طرح بنائے گئے تھے' جس کی قطاریں زینے کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی آبپاشی کے لیے پانی چوٹی پر پہونچایا جاتا تھا اور وہاں سے چشموں کی طرح بہہ کر باغوں کی سیڑھیوں سے گزرتا تھا۔ پانی اس طرح بہایا جاتا جیسے آبشاروں سے گر رہا ہو۔ اب ان باغوں کی یادگاری میں کچھ دیو ہیکل سرو اور چنار کے درخت کھڑے ہیں۔

مملوک سلطانوں کی اور کچھ قابل ذکر عمارتیں

جو سلطنت سلطان صلاح الدین ایوبی نے 1175ء میں قائم کی تھی وہ مصر میں 1250ء اور شام میں 1260ء میں ختم ہوگئی اور اس کی جگہ مملوکوں نے لے لی۔ ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ ایوبی سلطان کے شاہی حرس (Body Guard) میں عموماً ترک یا منگول غلام جو جسیم اور نڈر ہوتے تھے، بھرتی کیے جاتے تھے۔ انہی غلاموں نے مملوک حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جب 1249 میں مصر کے ایوبی سلطان الصالح کا انتقال ہوا تو اس کی بیوہ نے جو ابتدا میں کنیز تھی اور جس کا نام شجرالدر تھا، اپنے سوتیلے بیٹے کو مروانے کی کامیاب سازش کی۔ اس کے مرنے کے بعد وہ خود فرماں روا بن گئی۔ درباری عورت کی فرمانبرداری پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ ایبک کو جو ایک غلام رہ چکا تھا، شجرالدر کا شریک کار بنا دیا۔ ایبک کو قابو میں رکھنے کی غرض سے شجرالدر نے اس سے شادی کرلی۔ مگر جب ایبک نے پر پرزے نکالے اور حکومت پر قابض ہونا چاہا تو شجرالدر نے اس کو 1257ء میں غسل خانے میں مروا ڈالا۔ اس پر مشتعل ہوکر کنیزوں نے شجرالدر کو کھڑاؤں سے مار مار کر ختم کر دیا۔ ایبک نے اپنی اس ہفت سالہ مشترکہ حکومت میں مملوک سلطنت کی بنیاد ڈال دی جس کو بیبرس اور قلاؤن ایسے ہوشمند اور باہمت غلاموں نے مستحکم کیا۔

جب فرانس کے بادشاہ لوئی نے 1250ء میں ساتویں صلیبی جنگ کی پیشوائی کرتے ہوئے مصر پر حملہ کیا تو بیبرس نے جو اس وقت تک سلطان نہ ہوا تھا، لوئی کو شکست دی۔ اس کے دس سال بعد 1260ء میں اس سے بھی سخت معرکہ پیش آیا۔ ہلاکو خاں نے 1258ء میں خلافت عباسیہ کا چراغ گل کرکے مسلمانوں کی تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔ تاتاری فوج جہاں جاتی اس کے آگے کوئی نہیں ٹھہرتا تھا۔ مملوک سلطان قطز اور بیبرس تاتاریوں کے مقابلہ کو مصر سے نکل کر فلسطین آئے اور عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں کو شکست فاش دی۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ بیبرس نے واپسی میں سلطان کو مار ڈالا اور خود سلطان بن گیا۔ ایبک کی طرح بیبرس بھی غلام تھا۔ اس نے ملک کا نظم و نسق درست کیا، بندرگاہوں، شاہراہوں اور نہروں پر خاص توجہ دی اور شام کو فتح کرکے اپنے قلمرو میں شامل کیا۔ ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جو اس کے نام سے موسوم ہوئی۔ سلطان بیبرس مملوکوں کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس نے 1277ء تک حکومت کی۔ ایک اور طالع آزما غلام قلاؤن نے بیبرس کے بیٹے کو تخت سے اتار کر 1279ء میں زمام حکومت سنبھالی اور الملک المنصور کا لقب اختیار کیا۔ یہ بھی بہت بیدار مغز سلطان تھا۔ اس نے 1258ء میں قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا دارالشفاء قائم کیا جو اس کے نام پر بیمارستان المنصور کہلایا۔ ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ ایک کشادہ صحن کے چاروں طرف شفاخانے کی چار عمارتیں بنائی گئی تھیں جو محرابوں سے آراستہ کی گئی تھیں اور فضا کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے فوارے اور چشمے بنائے گئے تھے۔ مختلف امراض کے علیحدہ علیحدہ وارڈ تھے۔ روبصحت

(Convalescent) مریضوں کو دیگر مریضوں سے الگ رکھا جاتا۔ بیماروں کو کتب خانے سے کتابیں فراہم کی جاتیں۔ عبادت کے لیے مسجد بنی ہوئی تھی۔ پاگلوں کو الگ نہایت خوش گوار ماحول میں رکھا جاتا۔ غریب، امیر، غلام، آزاد، عورت، مرد سب کا علاج مفت کیا جاتا۔ ہر مریض کو شفاخانہ چھوڑتے وقت ایک رقم دی جاتی تاکہ وہ گھر پر آرام کرے اور تنگدستی کے باعث فوراً کام کرنے پر مجبور نہ ہو۔ بے خوابی کا علاج موسیقی اور قصہ خوانی سے کیا جاتا۔ پاگلوں کے شفاخانے ہر بڑے شہر میں تھے۔

ول ڈیوراں کی رائے میں قرون وسطیٰ میں مصری فن تعمیر کا سب سے شاندار زمانہ مملوکی سلطنت کا دور تھا۔ انہوں نے رفاہ عام کے بہت سے تعمیری کام سرانجام دیئے، جس کے نتائج میں قاہرہ سب سے مالدار شہر بن گیا۔ 1258ء سے 1453ء تک یعنی دو سو سال تک قاہرہ اسلامی دنیا کا سب سے عظیم اور سب سے خوبصورت شہر رہا۔ ابن بطوطہ 1326ء میں قاہرہ گیا اور اس کی بہت تعریف کی۔ ابن خلدون نے اس شہر کو 1383ء میں دیکھ کر کہا کہ قاہرہ ام البلاد ہے۔ بے شمار محلوں، مدرسوں، خانقاہوں اور نیل سے سینچے ہوئے باغوں نے قاہرہ کو جنت نشاں بنا دیا ہے۔ سلطان حسن کی مسجد اس عہد کے عجائبات میں شمار ہوتی تھی اور آج بھی یہ مملوکی فن تعمیر کی سب سے شاندار یادگار ہے۔ اس مسجد کو تعمیر کرانے کی غرض سے سلطان نے مختلف ممالک کے ماہرین تعمیرات کو جمع کیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ یہ مسجد دنیا کی سب عمارتوں سے زیادہ اونچی بنائی جائے۔ چنانچہ اس کا مینار اسّی فٹ بلند بنایا گیا۔ تعمیرات کا سب سے زیادہ دلدادہ برجی سلطان قعیت بے تھا۔ اس نے مکہ، مدینہ اور یروشلم میں بیش بہا عمارتیں بنوائیں۔ سلطان صلاح الدین کے قلعے اور جامع الازہر کو اصلی حالت پر لانے میں بہت دولت صرف کی۔ اس نے کئی خوبصورت اور شاندار مسجدیں بنوائیں جن کی زیبائش پر خاص توجہ دی۔ سلطان برقوق الظاہر جو غلامی سے مسند حکومت تک پہونچا تھا، ایک نہایت شاندار مقبرے میں مدفون ہے۔

تلمسان، المغرب کا ایک بڑا اور خوش حال شہر اور زیارتی سلطانوں کا پایہ تخت تھا۔ اس میں چونسٹھ مسجدیں تھیں جن میں جامع الکبیر، جو 1136ء میں تعمیر ہوئی، ابوالحسن کی مسجد جو 1298ء میں بنی اور الحلوی کی مسجد جو 1353ء میں بنی، مسلمانوں کی بہترین مسجدوں میں سے تھیں۔ ان کے بچے کھچے مرمر کے ستون، ان کی پیچ در پیچ پچی کاری، ان کی محرابوں کی آب و تاب، ان کے سایہ دار صحن، ان کی لکڑی پر کندہ کاری اور ان کے سر بفلک مینار آج بھی ان کی گزشتہ عظمت کی شہادت دے رہے ہیں۔ اب تلمسان کا نام و نشان اس کے کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے۔

ایل خانی اور تیموری عمارتیں

ہلا کو اور تیمور نے سینکڑوں شہر تباہ اور لاکھوں انسان ہلاک کرنے کے بعد کچھ تھوڑی بہت تلافی بھی کی۔ ہلا کو خان 1258ء میں بغداد اور مسلمانوں کی تہذیب کو برباد کرنے کے بعد سات سال تک زندہ رہا۔ اس نے ناصر الدین طوسی کی تحریک و ترغیب پر اپنے پایہ تخت مراغہ میں ایک رصد گاہ قائم کی۔ جارج سارٹن لکھتا ہے کہ اتنی بڑی رصد گاہ اس سے پہلے کہیں قائم نہیں کی گئی تھی۔ اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں فراہم کی گئیں اور مختلف اسلامی ممالک کے سائنسدانوں کو مراغہ بلا کر اس رصدگاہ میں کام کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ بارہ سال کی مسلسل تحقیق کے بعد 1272ء میں الزیج الایل خانی مرتب ہوئی۔ یہ اس رصدگاہ کا سب سے بڑا اور مفید کارنامہ تھا۔ اس رصد گاہ کی عمارتوں کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی امر کافی ہے کہ اس کے کتب خانے میں چار لاکھ کتابوں کی گنجائش تھی۔ ہلا کو خاں کے خاندان والے رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی تہذیب کو اپنا کر اسے فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس خاندان کی حکومت کل اناسی سال یعنی 1258ء سے 1337ء تک قائم رہی۔ ان کا سب سے اولوالعزم اور نادر بادشاہ سلطان غازاں خان تھا۔ اس نے اپنے پایہ تخت تبریز میں بہت سے مدرسے، مسجدیں، کتب خانے، شفاخانے وغیرہ بنوائے۔ مشہور یورپی سیاح مارکو پولو کی رائے میں تبریز ایک عظیم و رفیع الشان شہر تھا۔ فرااوڈرک (Fraoderic) نے 1320ء میں تبریز کو دیکھ کر اسے دنیا کا سب سے بڑا شہر کہا تھا۔ اس شہر کے محاصل پورے فرانس کے محاصل سے زیادہ تھے۔

سلطان غازاں خاں کا نامی طبیب اور وزیر رشید الدین بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے تبریز کے مضافات میں ایک یونیورسٹی اور اس سے متعلق ایک شہر بنایا۔ اس کا ایک خط کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کا نام ربع رشیدی تھا۔ اس میں چوبیس کارواں سرائیں، ڈیڑھ ہزار دکانیں اور تیس ہزار مکانات تعمیر کرائے گئے تھے۔ وہاں کاغذ بنانے کے کارخانے بھی قائم کیے گئے تھے۔ اس خط کی اور تفصیلات چونکہ تعمیرات سے متعلق ہیں، اس لیے ان کو بیان کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس یونیورسٹی سے تیس ہزار مکانات اور ڈیڑھ ہزار دکانیں متعلق ہوں، کس قدر بڑی یونیورسٹی ہو گی۔

تیمور شہروں کو ویران اور انسانوں کو ہلاک کرنے میں چنگیز اور ہلا کو سے کم نہ تھا۔ اس کی رگوں میں بھی منگول خون تھا جس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس نے جو کچھ کیا اس کے

بارے میں جارج سارٹن کی رائے ہے کہ تاتاریوں کی تین یورشوں میں جو چنگیز خاں، ہلا کو اور تیمور نے کیں، تیسری یورش سب سے زیادہ ہولناک تھی۔

سید امیر علی نے "مسلمانوں کی مختصر تاریخ" میں لکھا ہے کہ دراصل منگول اور ترک ایک ہی نسل کے ہیں جو منگولی قبیلہ خانہ بدوش ترک کی اسلامی تہذیب کے زیر اثر آ گئے۔ ول ڈیوراں نے اپنی تصنیف اصلاح دین (The Reformation) میں لکھا ہے کہ جو منگول یا تاتاری قبیلے چنگیز کے بیٹے چغتائی کہلائے، ان میں سے ایک قبیلے میں تیمور پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اس پر زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ تیمور نے چنگیز اور ہلا کو کے بہیمانہ طریق کار کو کیوں قبول کیا۔ اس نے قبول ہی نہیں کیا بلکہ ان دونوں پر اس معاملے میں سبقت لے گیا۔ چونکہ یہاں اس کے تخریبی کاموں کے بجائے تعمیری کاموں کو بیان کرنا مقصود ہے، اس لیے اس کے قتل و غارت گری کی داستان سے صرف نظر کرنا مناسب ہو گا۔

بحیثیت سپہ سالار تیمور کا شمار دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ سکندر کی طرح اسے بھی کسی بڑے معرکے میں شکست نہیں ہوئی۔ اس نے جو کچھ غنائم مسلمان ملکوں پر فوج کشی کر کے سمیٹے تھے، انہیں اپنے پایہ تخت سمرقند کو جنت ارضی بنانے میں صرف کیا۔ ہندوستان سے واپسی پر تیمور بہت سے صناع، کاری گر اور ماہرین فنون لطیفہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان سے تین مہینے کی مختصر مدت میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی۔ اس کا صدر دروازہ سو فٹ اونچا تھا اور اس میں چار سو اسی پتھر کے ستون تھے۔ اس مسجد کے علاوہ تیمور نے اپنی مرحومہ بہن کے نام پر ایک مسجد بنوائی جو اس دور کی عمارتوں میں فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اپنی مرحومہ رفیقہ حیات بی بی خانم کے ایصال ثواب کی غرض سے جب اس نے ایک مسجد بنوانی شروع کی تو اس کی نگرانی کا کام اپنے ذمہ لیا۔ کاریگروں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کو گاہ بگاہ انعامات دیتا اور کام کے دوران انہیں خوراک فراہم کرتا رہتا۔

ہرات میں اس نے چکنی مٹی کی نیلی ٹائلیں (Tiles) دیکھیں تو وہاں سے بہت سے کمہار سمرقند لے گیا اور ان سے لاکھوں ٹائلیں بنوا کر محلوں اور مسجدوں میں لگوائیں۔ دمشق میں اس نے ایک گنبد دیکھا جس کی شکل پیاز سے مشابہ تھی۔ اسے یہ گنبد بہت پسند آیا۔ جس عمارت پر یہ گنبد تھا وہ اس کے حکم سے شہر میں لگائی ہوئی آگ کے باعث منہدم ہونے کے قریب تھی۔ تیمور نے اپنے انجینئروں کو حکم دیا کہ گرنے سے پہلے گنبد کے مختلف حصے ناپ لیے جائیں اور ان کا صحیح نقشہ تیار کر لیا جائے۔ اس نے سمرقند میں ایسے بہت سے گنبد بنوائے جو اسلامی ممالک میں بہت مقبول ہوئے۔ چنانچہ تاج محل کا گنبد بھی اسی شکل کا ہے۔ روس نے بھی اس گنبد کو قبول کر کے اپنی

عمارتوں پر ایسے گنبد بنائے۔

شاہ کستیلہ (Castile) کا سفیر کلویجو (Clavijo) جب 1404ء میں سمرقند آیا تو وہ سمرقند کو دیکھ کر ششدرہ گیا۔ اس نے اس شہر کی ہر چیز اپنی توقع سے بہت زیادہ پائی۔ سمرقند کے مکانات کے بارے میں اس کی رائے تھی کہ وہ نہایت خوبصورت اور شاندار ہیں۔ رہے محل اور مسجدیں تو ان کی آب و تاب اور شان و شوکت کا کہنا ہی کیا۔ انہیں دیکھ کر تو نظریں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ محل باغات سے گھرے ہوئے تھے۔ ندی سے نلوں کے ذریعہ شہر کی آب رسانی کی جاتی تھی۔ ندی سے نکلی ہوئی نہروں نے سمرقند کے تمام ملحقہ علاقوں کو سرسبز بنا دیا تھا۔ بڑی سڑکوں کے کنارے پیڑوں کی قطاریں تھیں۔ جو سب سے بڑی سڑک شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتی تھی' اس کا خاص حصہ شیشہ کا بنایا گیا تھا۔

سمرقند میں مختلف چیزیں بنانے کے بہت سے کارخانے تھے۔ یہاں کے بنے ہوئے قرمزی رنگ کپڑوں ہی سے انگریزی لفظ کرمسن (Crimson) ماخوذ ہے۔ تیمور کے بیٹے شاہ رخ کے زمانے میں فن تعمیر نے اور زیادہ ترقی کی۔ اس کی ملکہ گوہر شاد نے مہندس قوام الدین سے مشہد میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو اس کے نام سے مشہور ہوئی۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ ایرانی فن تعمیر کا یہ نہایت مرصع اور پر تکلف نمونہ ہے۔ اس نے اس کے میناروں' محرابوں' ستونوں' دیواروں کی دلکشی اور ایوان کے امتزاج کی خوبی و پائیداری وغیرہ کی بہت تعریف کی ہے۔ بالخصوص اس کے طغرائی نقوش کے ایوان کی آب و تاب کو نہایت دیدہ زیب کہا ہے۔

مشہد میں اور بہت سی عمدہ عمدہ عمارتیں ہیں جن میں حضرت امام رضا کا مقبرہ فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ شیعوں نے امام رضا سے اپنی انتہائی عقیدت کا اظہار ان دلآویز عمارتوں کی شکل میں کیا ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مشہد میں تعمیر کیں اور ان میں ایرانی فن تعمیر کی سحرکاری کوٹ کوٹ کے بھر دی۔ ان عمارتوں کے آگے جب زائر کھڑا ہوتا ہے تو جذبہ تقدس سے سرشار ہو جاتا ہے۔

تیمور کا مقبرہ اس کی وفات کے بعد تعمیر کیا گیا۔ یہ نہایت ہی پرشکوہ ہے۔ قبر کے اوپر گہرے سبز رنگ کے جیڈ (Jade) کی سل ہے جس کی لمبائی ایک سو بانوے سینٹی میٹر' چوڑائی پونے سینتیس میٹر اور موٹائی تیس سینٹی میٹر ہے۔ اس کا وزن دو ہزار دو سو پچاس پونڈ ہے۔ جارج سارٹن لکھتا ہے کہ یہ مقبرہ اور اس کے اردگرد شاہی خاندان کے دیگر افراد کے مقبرے پر فیروزی ٹائلیں لگی ہوئی ہیں اور جنھیں نہایت ہی نفیس پچی کاری سے آراستہ کیا گیا ہے' ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں

جس کی دلآویزی بھلا دینا ممکن نہیں۔

سلطان شاہ رخ کے بیٹے اور تیمور کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں ایک رصدگاہ بنائی جو مراغہ کی رصد گاہ پر بھی سبقت لے گئی۔ قرون وسطیٰ کی اس سب سے بڑی رصدگاہ میں 1437ء میں ایک زیج بنائی گئی جو یورپ میں اٹھارہویں صدی تک نہایت احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ جب واسکوڈا گاما 1498ء میں ہندوستان کے تاریخی سفر پر نکلا تو اسی زیج نے اس کی رہنمائی کی۔ اس کے جہاز کا قائد (Captain) بھی ایک مسلمان ہی تھا۔

1258ء میں خلافت عباسیہ ختم ہو گئی۔ بیبرس نے تاتاریوں کو عین جالوت میں شکست دینے اور اس کے بعد سلطان بننے کے بعد 1261ء میں عباسی خاندان کے ایک فرد احمد نامی کو جو بغداد کے قتل عام سے کسی صورت بچ گیا تھا' دنیائے اسلام کا خلیفہ بنایا۔ سب سے پہلے خود سلطان نے بیعت کی' پھر قاضی القضاۃ تاج الدین نے اور پھر دوسرے شیوخ و امراء نے تتبع کیا۔ خلیفہ نے المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ سلسلہ جو المستنصر باللہ سے چلا اور 1517ء تک چلتا رہا' اس کے بعد مصر میں عثمانی ترکوں کی حکومت ہو گئی اور خلافت بھی ان میں منتقل ہو گئی۔ حضرت حسن بن علی کے بعد جو لوگ خلیفہ کہلائے ان میں عمرو بن عبدالعزیز کو چھوڑ کر سب کے سب دراصل بادشاہ تھے۔ انہیں خلفائے راشدین کا صحیح جانشین کسی صورت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ البتہ مرکزیت کا ایک تصور قائم تھا۔ اس تصور کو ختم کرنے کا سہرا اتاترک کے سر ہے۔

عثمانی سلاطین کی عمارتیں

سلطان محمد ثانی اور اس کے جانشینوں نے پندرہویں صدی میں قسطنطنیہ میں نہایت ہی خوبصورت مسجدیں تعمیر کرائیں۔ بروسا' نیقیہ' قونیہ وغیرہ میں بھی جو مسجدیں انہوں نے بنائیں وہ دامن دل کھینچتی ہیں۔ ول ڈیوراں کا خیال ہے کہ عثمانی ترکوں نے بازنطینی' ایرانی' ارمنی اور چینی فن تعمیر کے امتزاج سے جو طرز تعمیر پیدا کیا اس میں بہت سی خوبیاں جمع ہو گئیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی فن تعمیر کے پرستاروں کے لیے یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے شہوت انگیز مجسموں اور گاتھی عمارتوں میں (جن کا بارہویں صدی سے سولہویں صدی تک یورپ میں رواج تھا) کوئی کشش نہ تھی۔ اس لیے وہ اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اس کی رائے میں قسطنطنیہ کی مسجدوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ترکوں کا فن تعمیر نقطہ عروج تک پہونچ گیا تھا۔ ان کے آگے مشہد اور اصفہان کی پرشکوہ و دلفریب عمارتیں بھی نظر میں نہیں جچتیں۔ سلطان سلیمان جو ترکوں کا سب سے عظیم بادشاہ تھا اور جسے یورپ نے عظیم الشان کا خطاب دیا تھا' مسجدوں کی تعمیر کے معاملے میں اپنے دادا سلطان محمد

فاتح سے بھی بڑھ گیا۔ اس نے قسطنطنیہ میں سات مسجدیں بنوائیں جن میں سے سلیمانی مسجد جو 1556ء میں مکمل ہوئی خوبصورتی میں بازنطینی عمارت سینٹ صوفیہ پر بھی سبقت لے گئی۔ اس کی اندرونی آرائش یعنی سنگ مرمر پر طلائی کام، سنگ ساق کے ستون، سفید و سیاہ مرمر کی محرابیں، ترشے ہوئے خوبصورت پتھروں کی کھڑکیوں میں رنگین شیشے، منبر پر نہایت دیدہ ریزی سے کی ہوئی نقاشی نہایت پر تکلف و تابناک ہیں۔ یہ آرائش و زیبائش اس قدر زیادہ ہے کہ ایک عبادت گاہ کو زیب نہیں دیتی۔ اس مسجد کا نقشہ البانیہ کے سنان نے بنایا تھا۔ اس نے اور ستر مسجدوں کے نقشے بھی بنائے۔ اس نے ایک سو دس سال کی عمر پائی۔

ہندوستان و پاکستان میں اسلامی دور کی جو متعدد پرشکوہ اور حسین عمارتیں ہیں، ان کا ذکر اس لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ لوگ ان سے پہلے ہی اچھی طرح واقف ہیں۔

ثقل نوعی (Specific Gravity) تیسری صدی قبل مسیح میں سرکوسہ (Syracuse) کے نامور ریاضی داں ارشمیدس (Archimedes) نے جو 287ق م میں پیدا ہوا اور 212ق م میں فوت ہوا ثقل نوعی معلوم کرنے کا یہ اصول دریافت کیا کہ جب کوئی چیز کسی سیال چیز میں ڈبو دی جائے تو ڈوبی ہوئی چیز کا وزن اتنا گھٹ جاتا ہے جتنا خارج شدہ سیال کا وزن ہوتا ہے۔ اس اصول سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور بہت سی چیزوں کا ثقل نوعی دریافت کیا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ آلات بھی ایجاد کیے جن کے ذریعہ اوزان اور ثقل نوعی معلوم کرنے میں آسانی ہوئی۔ الخازنی نے جس کا ذکر پچھلی نشست میں کیا جا چکا ہے، ثقل نوعی دریافت کرنے کے مختلف طریقوں کو تفصیل سے بیان کیا۔ اس میں علم سکون سیالات (Hydrostatics) سے کام لیا گیا ہے۔ ثقل نوعی کی تحقیق کرنے والوں میں مندرجہ ذیل حکما زیادہ ممتاز ہیں:

ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی (Rhazes) نویں صدی عیسوی کے وسط میں رے میں پیدا ہوا۔ وہ بہت بڑا سائنس داں اور مسلمانوں کا سب سے بڑا طبیب تھا۔ اس کا ذکر طبیبوں کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ طب کے علاوہ علم کیمیا اور طبیعیات میں بھی اچھی دست گاہ رکھتا تھا۔ اس نے ثقل نوعی معلوم کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا جسے "المیزان الطبیعی" کے نام سے موسوم کیا۔ اس آلے کی مدد سے اس نے مختلف چیزوں کا ثقل نوعی دریافت کیا۔

ابو الطیب سند ابن علی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ وہ عباسی خلیفہ المامون کے زمانہ میں ہوا ہے۔ اس کا انتقال 864ء کے بعد ہوا۔ وہ ریاضی و ہیئت داں تھا۔ اس نے ایک رصد گاہ بنانے میں حصہ لیا۔ مامون نے ہیئتی مشاہدات کرنے کے لیے کچھ ہیئت دانوں کو منتخب کیا تھا۔ سند بن علی کی

سرکردگی میں مشاہدات کیے گئے۔ اس نے ثقل نوعی پر بھی تحقیقات کیں۔

ابو علی الحسین عبداللہ ابن سینا کا ذکر علم المناظر کے تحت پچھلی فصل میں کیا جا چکا ہے۔ اس نے ثقل نوعی پر بھی کام کیا۔ ابو الریحان محمد ابن احمد البیرونی خوارزم میں 973ء میں پیدا ہوا اور 1048ء میں غزنہ میں فوت ہوا۔ وہ بہت بڑا سائنسدان تھا۔ اس کا ذکر ہیئت دانوں میں ہو چکا ہے۔ اس نے اٹھارہ جواہرات اور دھاتوں کا ثقل نوعی نہایت صحت کے ساتھ معلوم کیا۔

ابو الفتح عمر ابن ابراہیم الخیامی غیاث الدین، عمر خیام کے نام سے مشہور ہے۔ وہ نیشاپور میں 1038ء اور 1048ء کے درمیان پیدا ہوا اور وہیں 24-1123ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ قرون وسطیٰ کے عظیم ترین ریاضی دانوں میں سے تھا۔ الجبرا میں اس نے گرانقدر اضافے کیے۔ اس کا ذکر ریاضی دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ اس نے ثقل نوعی دریافت کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ سارٹن کا خیال ہے کہ خیام لاادریا (Agnostic) تھا۔ یعنی اس کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا اور دوسری مادی اشیاء کے بارے میں نہ تو ہمیں کچھ معلوم ہے اور نہ کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

ان کے علاوہ الخازنی، مظفر ابن اسمٰعیل الاسفزاری، سموئل ابن عباس وغیرہ نے بھی ثقل نوعی پر تحقیقات کیں۔

گھڑیاں، قطب نما، عینک، ہوائی چکی: ول ڈیوراں نے "مذہب کا عہد" میں لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے پانی سے چلنے والی ایک گھڑی شارلیمان (Charlemagne) کو تحفتاً بھیجی تھی۔ یہ چمڑے اور پیتل کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا وقت بتانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہر گھنٹہ گزرنے پر دھات کے بنے ہوئے شہسوار گھڑی کا دروازہ کھول کر نکلتے اور گھڑی کے جھانجھ پر اتنے گولے ڈال دیتے جتنے گھنٹے بتانا ہوتے، پھر گھڑی کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیتے۔

محمد ابن علی ابن رستم الخراسانی الساعاتی نے 1146ء اور 1199ء کے درمیان ایک بڑی گھڑی (Clock) بنائی جو دمشق کے باب الجیرون پر نصب کی گئی اور اس ساعہ (گھڑیال) کی وجہ سے یہ دروازہ باب الساعہ کہلانے لگا۔ اس کا انتقال 85-1184ء میں ہوا۔ اپنے مرتے دم تک وہ اس ساعہ کی دیکھ بھال پر مقرر رہا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے رضوان ابن الساعاتی نے اس گھڑی کی مرمت کی اور کچھ مفید اضافے کیے۔ 1203ء میں رضوان نے اس گھڑی کی ساخت اور استعمال پر ایک کتاب لکھی۔ مسلمانوں کی گھڑی سازی کی تاریخ پر بھی اس کتاب نے روشنی ڈالی ہے۔

ابوالعز اسمٰعیل ابن الرزار بدیع الزماں الجزری کی ولادت و وفات کی تاریخیں نہیں معلوم مگر 1181ء سے 1206ء کے درمیان زندہ تھا۔ وہ مشین ساز (Mechanician) تھا۔ اس نے مشینوں پر "کتاب فی معرفت الحیل الہندسیہ" لکھی جس میں زیادہ تر پانی سے چلنے والی مشینوں، فواروں وغیرہ کا ذکر ہے۔ گھڑیوں پر بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں، دن کی چوبیس گھنٹوں میں تقسیم اور پھر موسم روشنی و تاریکی کے لحاظ سے مزید تقسیم کے قاعدے بتائے ہیں۔ یہ کتاب مشین سازی پر بہت اہمیت رکھتی ہے۔

ول ڈیوراں المقری کے حوالے سے لکھتا ہے کہ قرطبہ کے ابن فرناس نے نویں صدی میں عینک، گھڑی اور اڑنے والی مشین ایجاد کی تھی۔ قطب نما کو ایجاد کرکے مسلمانوں نے جہاز رانی کو آسان کر دیا۔ واضح رہے کہ آغاز اسلام سے سولہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کے جہاز دنیا کے ہر حصے میں آتے جاتے تھے۔ تمام سمندروں پر ان کی حکمرانی تھی۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کولمبس سے بہت پہلے عرب امریکہ پہونچ چکے تھے۔ کولمبس کے جہاز کے رہنما بھی مسلمان ہی تھے۔ واسکوڈا گاما بھی جس جہاز سے ہندوستان پہونچا تھا اس کا قائد مسلمان تھا۔

پون چکیاں

ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ بارہویں صدی سے پہلے یورپ والے ہوا سے چلنے والی چکیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ مشہور مورخ المسعودی نے ایسی چکیاں ایران اور مشرق قریب میں دسویں صدی میں دیکھی تھیں۔ ول ڈیوراں کا خیال ہے کہ صلیبی مجاہدوں نے اسلامی ممالک میں پون چکیاں دیکھ کر یورپ میں انہیں رائج کیا۔

اوزان

مسلمان اوزان کی صحت پر بہت زور دیتے تھے کیوں کہ قرآن نے ٹھیک تولنے اور ٹھیک ناپنے کی ہدایت کی تھی۔ اوزان کی جانچ پڑتال کی غرض سے مسلمان حکومتیں محتسب مقرر کرتی تھیں۔

عبدالرحمٰن ابن نصر ابن عبداللہ ابن محمود الشافعی، جس نام سے مشہور ہوا وہ ابن الاخوۃ ہے۔ وہ مصر یا شام کا رہنے والا تھا۔ اس کا انتقال 1329ء میں ہوا۔ اس نے حسبہ پر ایک نہایت مفصل کتاب لکھی جس میں ستر ابواب ہیں۔ اس کا نام "معالم القربہ فی احکام الحسبہ" ہے۔ اس میں اوزان کے

علاوہ بازار کی تمام چیزوں کے احتساب کا ذکر ہے۔

طباعت

سب سے پہلے چھپائی (Block Printing) چین میں چھٹی صدی میں شروع ہوئی اور آٹھویں صدی کے وسط تک اچھی طرح رائج ہو گئی۔ چنگیز کے پوتے کبلائی خاں نے 1280ء میں چین فتح کرنے کے بعد چھپائی کو رائج کرنے میں بہت کوشش کی جس کے نتیجہ میں چھپائی خوب پھیل گئی۔

مصر میں 1881ء کے لگ بھگ المدینہ (مدینۃ الفیوم) میں کھدائی کی گئی تو ایک لاکھ سے زیادہ دستاویزیں پپرس (Papyrus) جھلیوں اور کاغذوں پر لکھی ہوئی برآمد ہوئیں۔ یہ دستاویزات دس زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ جو دستاویزیں کاغذ پر لکھی گئیں وہ 797ء سے 1388ء کے درمیان کی ہیں۔ ان میں سے پچاس دستاویزیں چھپی ہوئی ہیں۔ ان پچاس چھپی ہوئی دستاویزوں میں سے صرف ایک قبطی زبان میں ہے اور باقی سب عربی میں ہیں۔ ان چھپی دستاویزوں کا زمانہ 900ء سے 1350ء تک متعین کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے ابتدائی دور کی دستاویزوں کی تعداد کم اور بعد کے دور کی دستاویزیں زیادہ ہیں۔ ان میں وہی طریق کار پایا جاتا ہے جو چینی اور وسط ایشیا کی چھپائی کا تھا۔ ان سب کی عبارتیں مذہب سے متعلق ہیں۔ یہ قرآن کی آیتوں، دعاؤں، اللہ کے ننانوے ناموں اور تعویذوں پر مشتمل ہیں۔ چودہویں صدی کے بعد اسلامی ممالک میں چھپائی اس لیے بند کر دی گئی کہ قرآن کو چھاپنے سے اس کی بے حرمتی ہوتی تھی۔ پھر 1825ء میں مسلمانوں نے چھپائی کا کام شروع کیا۔ مصر میں چھپائی کے پورے زمانے میں یورپ نے چھپائی کی طرف اعتنا نہ کیا۔

مندرجہ بالا معلومات جارج سارٹن کے "مقدمہ تاریخ سائنس" سے ماخوذ ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 900ء تک مسلمان چھپائی کے طریقے سے واقف ہو گئے تھے۔ یورپ میں پانسو سال بعد چھپائی کا آغاز ہوا۔

یہ بات قرین قیاس نہیں کہ چھپائی مصر تک ہی محدود رہی ہو۔ دسویں اور گیارہویں صدیاں مسلمانوں کے علمی عروج کی صدیاں تھیں۔ جو علمی دریافت مسلمانوں کے ایک ملک میں ہوتی وہ چند سالوں میں سارے اسلامی ممالک میں پہونچ جاتی۔ یہ تو اتفاقی امر ہے کہ مصر میں چھپائی کی شہادت ایک پرانے شہر کی کھدائی سے برآمد ہوئی۔ ورنہ یہی کہا جاتا کہ 1825ء تک مسلمان چھپائی سے ناواقف تھے۔

یہ تو نہیں معلوم کہ چین میں کاغذی سکہ کب رائج ہوا ۔ مگر 807ء میں اس کے رائج ہونے کی شہادت موجود ہے ۔جب چنگیز کے ایک پوتے ہلاکو نے عراق 'ایران 'خراسان پر اپنی حکومت قائم کرلی اور دوسرے پوتے کبلائی خاں نے چین میں قریب قریب اسی زمانے میں اپنی حکومت قائم کر لی تو چین اور اسلامی ممالک میں ربط ضبط بڑھا ۔ مسلمانوں کے علوم چین پہنچے اور ان کے علوم سے مسلمان واقف ہوئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1294ء میں تبریز میں جو ایل خانی بادشاہوں کا پایہ تخت تھا ' کاغذی سکہ رائج ہوگیا ۔ یہ سکہ چھپا جاتا تھا ۔ مشہور یورپی سیاح مارکو پولو جب تبریز پہنچا تو اس نے وہاں کاغذی سکہ کا رواج پایا ۔ مگر یہ رواج مقبول نہ ہوا ۔ 1337ء میں ایل خانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا ۔ شاید اسی کے ساتھ کاغذی سکہ بھی معدوم ہوگیا ہو ۔

علم کیمیا

کیمسٹری (Chemistry) اور الکیمی (Alchemy) میں فرق نمایاں کرنے کے لیے "القاموس العصری" 'تالیف الیاس انطون الیاس میں ان الفاظ کے مندرجہ ذیل معنی دیئے ہیں:

Chemistry علم طبائع و خاصیات الاجسام (وہ علم جو اجسام (Substances) کی ماہیت اور خاصیتیں بتائے) Alchemy ۔ علم تحویل المعادن ۔ الیٰ ذہب (وہ علم جو دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کے متعلق ہو) ۔

مولوی عبدالحق کی انگریزی ۔ اردو ڈکشنری میں Alchemy کے معنی کیمیا گری اور کیمیا سازی اور Chemistry کے معنی علم کیمیا دیئے ہیں ۔

القاموس العصری میں Chemist کے معنی کیمیائی اور Chemical کے معنی کیمی لکھے ہیں ۔

مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں Chemist کے معنی کیمیا داں اور دواساز اور Chemical کے معنی کیمیاوی دیئے ہیں ۔ میں اس مضمون میں الکیمی کے لیے کیمیا گری یا کیمیا سازی اور کیمسٹری کے لیے علم کیمیا استعمال کروں گا ۔ کیمیکل کے لیے کیمیاوی لکھنا مناسب ہوگا ۔

پرانے زمانے میں یہ خیال قریب قریب ساری دنیا میں پھیلا ہوا تھا کہ دھاتوں کی ماہیت کیمیاوی عمل کے ذریعہ تبدیل کی جا سکتی ہے اور کم قیمت دھاتوں سے سونا بنایا جا سکتا ہے ۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جابر بن حیان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ دھاتوں کو ذی روح (Animistic) سمجھتا تھا ۔ اس خیال میں جاندار چیزوں کی طرح دھاتوں کا بھی نشوونما ہوتا ہے مگر یہ نشوونما ہزاروں سال میں مکمل ہوتا ہے ۔ سیسہ سونے کی نابالیدہ شکل ہے ۔ ہزاروں سال میں نشوونما کے مدارج طے

کر کے وہ سونا بن جاتا ہے ۔ کیمیاوی عمل نشوونما کی اس مدت دراز کو مختصر کر سکتا ہے ۔ چنانچہ کیمیا سازی کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ دھاتوں کے نشوونما کی طویل مدت کو مختصر کر کے انہیں سونے میں منتقل کر دے۔

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ سب سے پہلے جس یونانی حکیم نے کیمیا گری پر کتاب لکھی اس کا نام ڈیموکریٹس (Democritos) تھا ۔ اس کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس عہد میں ہوا ہے ۔ ایک گمان یہ ہے کہ وہ پہلی صدی عیسوی میں پیدا ہوا اور دوسرا یہ کہ وہ تیسری صدی میں موجود تھا ۔ جو کتابیں اس سے منسوب ہیں وہ یونانی زبان میں نہیں ملتیں مگر سریانی میں دستیاب ہیں۔

تیسری صدی عیسوی کے آخر یا چوتھی صدی کے شروع میں زوسیموس (Zosimos) نے کیمیا گری پر کتابیں تصنیف کیں ۔ وہ پینوپولس (Panopolis) کا باشندہ تھا جو شمالی مصر کا ایک شہر تھا ۔ قریب قریب اسی زمانے میں مصر کے شہر تھبیز (Thebes) میں اولم پیوڈورس (Olympiodoros) گزرا ہے ۔ وہ مورخ تھا، مگر اس نے اپنی تصانیف میں کیمیا گری سے بھی بحث کی ہے۔ اس کی کیمیا گری دراصل یونانی فلسفہ اور مصری قیاس آرائی پر مبنی تھی۔

بریفو اپنی کتاب " تعمیر انسانیت " (The Making of Humanity) میں کہتا ہے کہ چھان بین کے صبر آزما طریقے، مثبت معلومات کی فراہمی، سائنس کی دقیقہ سنجی اور تفصیلی و طویل مشاہدوں اور تجربوں پر مبنی تحقیق یونانیوں کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی ۔ تحقیقات کی نئی روح، دریافت کے نئے انداز فکر، تجربہ، مشاہدہ اور پیمائش کے نئے طریق کار یعنی وہ چیزیں جو سائنس کے لوازم ہیں ان سے عربوں نے یورپ کو متعارف کرایا ۔ یونانی نظریوں اور تعمیمی کلیوں (Generalization) کے دلدادہ تھے اور حقائق کی جستجو میں لاپروائی برتتے تھے ۔ اس کے برخلاف عرب محققین ٹھوس حقائق پر اپنی توجہ مرکوز کرتے اور اپنے علم کو صحیح اوزانی ترتیب دینے میں سرگرمی دکھاتے۔

ارسطو یونانی علوم کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا علم ہمہ گیر تھا اور اس نے انسانی معلومات میں گرانقدر اضافہ کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سی فاش غلطیاں کی ہیں جن کی نشاندہی جارج سارٹن نے کی ہے، مثلاً ارسطو کا یہ نظریہ کہ نباتات جنسی ارتباط کے بغیر پیدا ہوتے ہیں بہت بڑی غلطی تھا ۔ ظاہر ہے کہ وہ مشاہدے اور تجربے کرنے کا عادی ہوتا تو اس نتیجہ پر نہ پہنچتا ۔ ارسطو اس غلط نظریہ کا قائل تھا کہ انسان کے جسم میں عقل و فہم کا مرکز دل ہے اور

دماغ کا فعل صرف اس قدر ہے کہ وہ بلغم بنائے جس سے دل کو ٹھنڈک پہنچے ۔ اسی طرح اس نے وریدوں اور شریانوں کے فعل کو صحیح طور پر نہ سمجھا ۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وریدیں گندا خون پھیپھڑوں میں پہنچاتی ہیں اور وہاں صاف ہو کر وہ شریانوں کے ذریعے جسم میں پھیل جاتا ہے ۔ چونکہ حکماء میں ارسطو کا مقام بہت بلند تھا اس لیے اس کے غلط نظریہ کی تصحیح بالآخر تیرہویں صدی میں ابن النفیس المتوفی 1288-89 ء نے کی ۔ چنانچہ جارج سارٹن ابن النفیس کو قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ماہر عضویات (Physiologist) کہتا ہے۔

کیمیا سازی مسلمانوں کو یونانیوں اور مصریوں سے ملی تھی ۔ بریفو کہتا ہے کہ عربوں نے یونانیوں کے اخذ کردہ نتائج کو اپنی تحقیق کے دوران عارضی نظریوں کے طور پر استعمال کیا ۔ یہ علم ابتدا میں مصر کے ملمع سازوں اور خام دھاتوں کو صاف کرنے والوں کے ہاتھ میں تھا۔ ملمع ساز مختلف دھاتوں کی آمیزش سے مختلف مرکبات بناتے اور ان پر ایسا رنگ و روغن چڑھاتے کہ وہ سونے کے مشابہ ہوتے ۔ ان مرکبات کی ملمع سازی کی ترکیبوں کا راز کلیسا کے ملازمان تک محدود رہتا تھا اور ان ترکیبوں کو ضبط تحریر میں لانے کی غرض سے نہایت پر اسرار علامتیں ایجاد کی گئی تھیں ۔ تاکہ لوگ ان ترکیبوں کو معلوم نہ کر سکیں ۔ یہی پر اسرار علم جب مسلمانوں تک پہنچا تو انہوں نے ان ترکیبوں کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا اور تجربات کے مختلف طریقے ایجاد کیے جن میں تقطیر (Distillation)، تصعید (Sublimation) اور تصنیف (Filtration) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے اپنی تحقیق کو راز بنا کر رکھنے کے بجائے دنیا کے سامنے پیش کیا ۔ یہ بات اس علم کو پھیلانے اور اس میں اضافے کرنے کا باعث ہوئی ۔ انہوں نے بہت سی کیمیاوی چیزیں مثلاً الکحل، القلی، کئی تیزاب اور کئی چیزوں کے نمک دریافت کیے ۔ اس طرح جدید علم کیمیا اور طبیعی تحقیق کی بنیاد پڑی۔

ول ڈیوراں اپنی موقر تصنیف " مذہب کا عہد " میں لکھتا ہے کہ قرون وسطیٰ کی سائنس نے کیمیا گری کو وہ تجرباتی طریقہ تحقیق عطا کیا جو زمانہ حال کی ترقی کا سب سے عظیم اور قابل فخر آلہ کار ہے ۔ جب جابر ابن حیان کے پانچ سو سال بعد راجر بیکن نے اس طریقہ تحقیق سے یورپ کو روشناس کر کے علم کی روشنی پھیلائی تو دراصل یہ روشنی اسپین کے مسلمانوں کی رہین منت تھی ۔ خود اسپین میں یہ روشنی مشرقی اسلام سے آئی تھی۔

دوسرے مقام پر ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ علم کیمیا (Chemistry) دراصل مسلمانوں کی ایجاد ہے ۔ ان سے پہلے یونانی مبہم مفروضوں کو لیے بیٹھے تھے ۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے پیہم

تجربات و مشاہدات سے کام لے کر اشیاء کی ماہیت کا صحیح ریکارڈ مرتب کیا' انہوں نے الانبیق ایجاد کیا۔ الانبیق کا لفظ بھی یورپی زبانوں نے قبول کر لیا چنانچہ تقطیر کے آلے کو Alembic کہنے لگے۔ مسلمانوں نے اپنی بے شمار اشیاء کا تجزیہ کیا۔ القلی (Alkali) اور تیزاب (Acid) کا فرق نمایاں کیا۔ عناصر کے باہمی میلان پر تحقیق کی اور سینکڑوں دوائیں بنائیں۔ انہیں مصر سے کیمیا گری ملی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے علمی تجربات و مشاہدات سے کیمیا گری کو علم کیمیا بنا دیا۔

چونکہ مسلمان کیمیا دانوں کا ذکر کیمیا سازوں کے تحت کیا جاتا ہے اس لیے مندرجہ بالا آراء پیش کرنا مناسب سمجھا گیا۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کچھ لوگ اس علم کو صرف سونا بنانے کی غرض سے سیکھتے تھے' تب بھی ان کے تجربات و مشاہدات کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہو گا۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ کسی کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو' اس کے کیمیاوی تجربات سے جو نتائج برآمد ہوئے ان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس وضاحت کے بعد اب مسلمان کیمیا دانوں اور کیمیا گروں کا انفرادی ذکر کیا جاتا ہے۔

ابو موسیٰ جابر (Geber) ابن حیان الازدی' الطرطوسی الحرانی کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات جارج سارٹن نے نہیں لکھی مگر یہ بتایا ہے کہ 776ء میں کوفہ میں ان کا پایا جانا معلوم ہے۔ جابر کو وہ عربوں کا سب سے بڑا کیمیا داں بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اسے مسلمانوں کا سب سے بڑا کیمیا داں اس لیے نہیں لکھا کہ جابر غالباً صابی تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ جابر اسلام قبول کر کے ایک جوشیلا مسلمان بن گیا تھا۔ سید امیر علی "اسپرٹ آف اسلام" میں ابن خلکان کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جابر امام جعفر صادق کا شاگرد تھا۔ اس نے ایک کتاب جو دو ہزار صفحوں پر مشتمل تھی' تصنیف کی اور اس میں کیمیاوی مسائل کو شامل کیا جن پر امام جعفر صادق نے اظہار خیال کیا تھا۔ دوسری جگہ سید امیر علی نے لکھا ہے کہ امام جعفر صادق خود سائنس داں تھے۔ انہیں کے فراہم کردہ مواد پر جابر نے تحقیقی کام کیا۔ وہ جابر کو زمانہ حال کے علم کیمیا کا بانی و موجد کہتا ہے۔

جو بہت سی کتابیں جابر سے منسوب ہیں ان کے بارے میں جارج سارٹن کہتا ہے کہ ان میں دو طرح کے تصورات ملتے ہیں۔ کچھ کتابیں ایسی ہیں جن میں بے جان اشیا مثلاً دھاتوں کو ذی روح (Animistic) قرار دیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں سائنس کے نقطہ نظر سے ناقابل اعتنا ہیں۔ دوسری قسم کی تصانیف وہ ہیں جن میں کیمیاوی تحقیق کے نہایت معقول و معتبر طریقے بیان کیے ہیں۔ ان دھاتوں کی بناوٹ اور تشکیل کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ علم طبقات الارض کی رو سے بالکل صحیح ہے۔ یہ طریقہ بھی صحیح ہے کہ چھ دھاتیں گندھک اور پارے کے تناسب کے اختلاف کے باعث

ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جابر نے کیمیاوی عمل سے مختلف چیزیں تیار کرنے کے جو طریقے بتائے ہیں وہ بھی صحیح ہیں' مثلاً سیسے کا کاربونیٹ بنانے کا طریقہ' دھاتوں کو صاف کرنے کا طریقہ' فولاد بنانے کا طریقہ' کپڑے اور چمڑے کو رنگنے کا طریقہ' کپڑے پر روغنی وارنش لگا کر اسے پانی کے اثر سے محفوظ کرنے کا طریقہ' شیشہ سازی کا طریقہ' سنہری حروف میں لکھنے کے لیے Iron Pyrites کے استعمال کا طریقہ اور سرکے کو تقطیر کے عمل سے ایسیٹک ایسڈ (Acetic Acid) بنانے کا طریقہ۔ جابر نے مقناطیسی کشش پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

جابر کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عربی تصانیف کا مکمل جائزہ لیا جائے۔ لیکن جو تھوڑی بہت معلومات ابھی تک حاصل ہو سکی ہیں ان کی بنا پر بھی یہ کہنا درست ہو گا کہ جابر کی شخصیت بہت عظیم تھی اور وہ قرون وسطیٰ کے عظیم ترین سائنسدانوں میں سے تھا۔ مندرجہ ذیل کتابیں اس کی عظمت کی شہادت دیتی ہیں:

(1) THE BOOK OF THE KINGDOM

(2) THE LITTLE BOOK OF THE BALACES

(3) THE BOOK OF MERCURY

(4) THE BOOK OF CONCENTRATION

(5) THE BOOK OF EASTERN MERCURY

جابر کی تصانیف کی تلخیص جو لاطینی زبان میں مرتب کی گئی وہ Summa Perfectionise کہلاتی ہے۔ یہ تلخیص اس کی عربی کتابوں پر مبنی ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ اس کتاب نے لاطینی علم کیمیا کی بنیاد رکھی۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ گو جابر ابن حیان کا پیشہ طبابت تھا مگر وہ اپنا بیشتر وقت الانبیق اور کٹھالی (Crucible) کی مدد سے تجربات کرنے میں صرف کرتا تھا۔ ول ڈیوراں نے جابر کی تاریخ ولادت 702ء اور تاریخ وفات 765ء بتائی ہے۔ مگر جارج سارٹن نے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے' 776ء میں اس کا کوفہ میں پایا جانا بتایا ہے۔ جابر کے والد کوفہ میں عطاری کا پیشہ کرتے تھے۔ تحقیق کے جو طریقے جابر نے اختیار کیے تھے وہ آٹھویں' نویں اور دسویں صدی تک رائج رہے' اس کے بعد انحطاط شروع ہوا اور رفتہ رفتہ علم کیمیا پر اسرار و مخفی علم بن گیا۔ جابر قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا کیمیا داں تھا۔

ایم۔ برتھیلوٹ (M.Berthelot) نے جابر ابن حیان سے منسوب کچھ تصانیف کا ترجمہ کیا جو تین جلدوں میں 1893ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ اوکٹیو ہوڈس (Octave Houdas) نے جابر

کی کچھ عربی کتابیں مدون کیں۔ جرمن میں لاطینی سے کچھ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا جو 1922ء میں برلین سے شائع ہوئیں۔

عطارد ابن محمد الحاسب (یا الکاتب) نویں صدی میں ہوا ہے۔ اس نے جواہرات پر ایک رسالہ (Lapidary) تصنیف کیا۔ یہ سب سے پہلا رسالہ ہے جو ایک مسلمان نے لکھا۔ اس میں قیمتی پتھروں کی خاصیتوں کو واضح کیا ہے۔ اس رسالہ کا نام "منافع الاحجار" یا "کتاب الجواہر والاحجار" ہے۔ یہ رسالہ ابھی شائع نہیں ہوا۔ الرازی نے اس کا ذکر اپنی مشہور تصنیف "الحاوی" میں کیا ہے۔

ابوالفیض ثوبان ابراہیم الاخمیمی المصری کا لقب ذوالنون تھا، اسی لقب سے وہ مشہور ہے۔ اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں لیکن اس کا انتقال 60-859ء میں ہوا۔ وہ اسلامی تصوف کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کیمیا ساز بھی تھا۔ کیمیا سازی پر جو کتاب اس سے منسوب ہے اس کا نام "مجربات" ہے۔ ابن ندیم نے "فہرست" میں اس کا ذکر کیمیا سازوں کے ساتھ کیا ہے۔ القفطی اس کو جابر ابن حیان کا ہمسر سمجھتا ہے وہ بالائی مصر کے مقام اخمیم کا باشندہ تھا۔ ثوبیہ کو بھی اس کا وطن کہا گیا ہے۔ ذوالنون نے تصوف کے اصول و قواعد مرتب کیے۔ جارج سارٹن لکھتا ہے کہ عیسائیت، نوافلاطونیت، غناسطیت (Gnosticism) اور بدھ مت سے اخذ کیے ہوئے نظریات کو اسلامی ڈھانچے میں سمو کر اسلامی تصوف کی تشکیل کی گئی ہے۔ دراصل یہ مختلف ادیان کے عقائد کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔ تصوف سائنس کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔

ابو بکر محمد بن زکریا الرازی (Rhazes) کا ذکر طبیبوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ الرازی مسلمانوں کا سب سے بڑا طبیب و معالج ہی نہ تھا بلکہ وہ کیمیا داں اور طبیعی بھی تھا۔ الرازی ذوالنون کی طرح کیمیا ساز نہ تھا بلکہ وہ صحیح معنوں میں کیمیا داں تھا۔ اس نے علم کیمیا پر کئی کتابیں لکھیں، کیمیاوی تجربات میں جو آلات استعمال ہوتے تھے ان کی تفصیل بیان کی، جمادات وغیرہ کا اصطفاف (Classification) کیا اور اپنی کیمیائی معلومات کو طب میں استعمال کیا۔

"الحاوی" کا لاطینی ترجمہ 1486ء میں شائع ہوا جس کے بہت سے ایڈیشن وقتاً فوقتاً نکلے۔ اس کی دوسری مشہور تصنیف "کتاب المنصوری" کا لاطینی ترجمہ 1481ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد بار بار چھپا۔ اس تصنیف کی نویں کتاب یورپ میں بہت ہی مقبول ہوئی اور اسے علیحدہ کر کے بکثرت چھاپا گیا۔ کچھ حصوں کا فرانسیسی اور جرمن میں اس صدی میں ترجمہ شائع کیا گیا۔

ابو عثمان عمر ابن بحر الجاحظ کا ذکر تاریخ طبیعی کے تحت کیا جا چکا ہے۔ علم الحیوان سے

گہری دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ کیمیاوی تجربات بھی کرتا تھا اور گوبر سے امونیا (Ammonia) اور سالمیک (Salmiac) بنا لیتا تھا۔ جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ الجاحظ کے معنی Goggle - Eyed کے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی اسٹوڈینٹس ڈکشنری میں Goggle کے معنی ترچھا دیکھنا، کن انکھیوں سے دیکھنا، بھینگے پن سے دیکھنا، آنکھیں نکالنا، ابھری ہوئی پھرتی آنکھ کی پتلی، کے دیئے ہیں۔ چنانچہ میں نے الجاحظ کا ترجمہ بھینگا کیا۔ میرے ایک کرم فرما نے مطلع کیا ہے کہ جاحظ اس کو کہتے ہیں جس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی ہونے کے باعث نہایت بدنما معلوم ہوں۔ میں اس تصحیح کے لیے مشکور ہوں۔

ابوالقاسم مسلمہ ابن احمد المجریطی کا ذکر ہیئت دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ اس نے کیمیا سازی پر بھی دو کتابیں تصنیف کی تھیں جن کے نام (1) رتبۃ الحکم (Sages Step) کا 1252ء میں لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ ابو منصور موفق ابن علی النہری کا ذکر طبیبوں اور دوا سازوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ دوا سازی کے سلسلہ میں اس نے کیمیاوی تجربات کیے اور سوڈیم کاربونیٹ (Sodium Carbonate) اور پوٹاشیم کاربونیٹ (Potassium Carbonate) کا فرق نمایاں کیا۔ جارج سارٹن لکھتا ہے کہ ابو منصور موفق علم کیمیا سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے بہت سے جمادات اور دیگر اشیا کی خاصیتیں دریافت کیں اور مرکبات بنانے کے طریقے معلوم کیے۔ وہ سنکھیا اور تانبے کے آکسائیڈ (Oxide)، سلیکا کے تیزاب (Silcic Acid) اور سرمے کی خاصیتوں سے واقف تھا۔ وہ تانبے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات کی نشاندہی کرتا ہے اور ان بجھے چونے (Quicklime) کی یہ خاصیت کہ اس سے بال اڑائے جا سکتے ہیں واضح کرتا ہے۔ وہ پلاسٹر آف پیرس کے استعمال اور اس کے اجزائے ترکیبی کا علم رکھتا تھا۔ مختصر یہ کہ علم کیمیا کی ترقی میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا۔

ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا کا ذکر طبیبوں کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ جو کتابیں جابر بن حیان سے منسوب ہیں ان میں سے کچھ یہ نظریہ پیش کرتی ہیں کہ دھاتوں میں عمل ارتقا جاری ہے جو ہزاروں برسوں میں رونما ہوتا ہے مثلاً سیسے کی ہیئت میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور وہ بالآخر سونا بن جاتا ہے۔ کیمیاوی عمل سے مدت دراز مختصر کی جا سکتی ہے اور سیسے سے سونا بنایا جا سکتا ہے۔ مصر میں کیمیا گری کی جو شکل تھی وہ اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ ملمع سازی سے کم قیمت دھاتوں کو سونے کی ہم شکل بنا دیتے تھے۔ ابن سینا نے شد و مد سے اس نظریہ کی تردید کی کہ ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ مختلف دھاتوں کی ہیئت مختلف ہوتی ہے اور ان میں کسی کیمیاوی عمل سے تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ مروجہ نظریئے کی تردید کرنے سے پیشتر اس نے عملی تجربے کر کے اپنا نظریہ قائم کیا ہو گا۔ ابن سینا کا نظریہ آج بھی صحیح سمجھا جاتا ہے۔

ابوالحکیم محمد ابن عبدالملک الخوارزمی الکاثی کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات معلوم نہیں ' 1034ء میں اس کا بغداد میں موجود ہونا ثابت ہے ۔ اس سال اس نے علم کیمیا پر ایک اہم کتاب لکھی جس کا نام "عین الصنعہ وعوات الصنعا" ہے۔

ابو بکر محمد ابن یحییٰ ابن الصائغ 1106ء سے پہلے پیدا ہوا ۔ وہ ابن باجہ کے نام سے مشہور ہوا ۔ یورپ والوں نے اس کا نام Avenpace کر دیا۔ صائغ کے معنی سنار کے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے والد سنار تھے ۔ وہ بہت سے علوم میں دستگاہ رکھتا تھا ۔ اس کا ذکر طبیبوں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے ۔ فلسفہ میں اس نے بہت شہرت حاصل کی ۔ فلسفہ پر اس کی دو تصانیف " کتاب المتوحد " اور " رسالہ الوداع " ہیں جن کا عبرانی میں ترجمہ کیا گیا ہے ۔ ابن رشد اس کے فلسفہ سے بہت متاثر ہوا ۔ اس نے بطلیموس کے ہیئتی نظریوں کی تنقیص کی ۔ اس کے اتباع میں ابن طفیل اور البطروجی نے بھی بطلیموس کے نظریوں کو غلط ٹھہرایا ۔ ریاضی میں علم ہندسہ (Geometry) پر بھی اس کی تصانیف ہیں ۔ طبیعیات میں موسیقی پر اس نے ایک کتاب لکھی ۔ گو وہ 1138-39ء میں یعنی بتیس تینتیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا مگر اس کی ہمہ گیر شخصیت نے بہت سے علوم کا احاطہ کیا اور ان میں قابل قدر اضافہ کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو زہر دیا گیا ۔ اپنے فلسفیانہ خیالات کی بنا پر اسے بہت سی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں ۔ سرا قطہ (Saragossa) کا گورنر اس کی شاعری کا بہت دلدادہ تھا۔

ابواسمٰعیل الحسن ابن علی ابن محمد الطغرائی 1061ء کے لگ بھگ اصفہان میں پیدا ہوا ۔ موصل کے سلجوق سلطان مسعود ابن محمد کا وزیر مقرر ہوا ۔ اس نے کیمیا سازی پر کئی کتابیں تصنیف کیں ' وہ اچھا شاعر بھی تھا ۔ الحاد کے الزام میں 1121ء میں قتل کیا گیا اس وقت وہ ساٹھ سال کا تھا۔

ابوالحسن علی ابن موسیٰ ابن ارفع الجبیانی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ۔ اس کا 1196-97ء میں فاس میں انتقال ہوا ۔ وہ کیمیا ساز تھا اس نے پارس پتھر (Philosophers' Stone) کی خاصیت پر نظمیں لکھیں اور ان نظموں کے مجموعے کا نام "شذور الذہب فی من السللات " رکھا۔

الحسن الرماح تیرہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ہوا ہے ۔ وہ شام کا رہنے والا تھا ۔ اس نے شورے (Saltpetre) کو صاف کرنے کے طریقے بیان کیے ہیں ۔ اس نے علم الحرب (Art of War) پر دو کتابیں عربی میں تصنیف کیں۔

عزالدین علی ابن ایدمُر ابن الجلاکی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ۔ 1339 سے 1342ء تک اس کا قاہرہ میں پایا جانا اور دمشق میں پایا جانا معلوم ہے ۔ اس کی وفات کے بارے میں مختلف قول

ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کا انتقال 1342-43ء میں ہوا اور دوسرا یہ کہ 1360-61ء میں ہوا ۔ الکیمیا پر اس سے بیس تصانیف منسوب ہیں جن میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں:

(1) البدر المنیر فی اسرار الاکسیر ۔ یہ موسیٰ ابن ارفع "شذور الذہب فی من السللات " کی شرح ہے۔
(2) بغیتہ الخبیر فی قانون طلب الاکسیر ۔ یہ دمشق میں 1339-40ء میں تصنیف کی گئی۔
(3) البرہان فی اسرار علم المیزان ۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کے چار حصے ہیں۔
(4) الدر المنثور ۔ یہ بھی موسیٰ ابن ارفع کی تصنیف شذور الذہب کی شرح ہے۔
(5) الدر المکنون فی شرح قصیت ذی النون ۔ یہ ذوالنون مصری کی کتاب کی شرح ہے ۔ 1342ء میں قاہرہ میں تصنیف کی۔
(6) المصباح فی اسرار علم المفتاح (الکیمیہ کو علم المفتاح بھی کہتے ہیں) اس کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے الکیمیا کا تاریخ جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے امیر خالد بن یزید ' جابر ابن حیان ' محمد ابن اُمیل التمیمی ' مسلمہ ابن احمد المجریطی ' الحسن ابن علی الطغرائی ' علی ابن موسیٰ ابن ارفع ابوالقاسم العراقی سے استفادہ کیا ہے۔
(7) نتائج الفکر فی احوال الحجر۔
(8) نہایتہ الطب فی شرح مکتسب ۔ یہ ابوالقاسم العراقی کی تصنیف " کتاب العلم المکتسب فی زراعتہ الذہب " کی مفصل تفسیر ہے ۔ یہ الکیمیا پر اہم کتاب ہے ۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ چاندی سونے کے مخلوط مرکب سے چاندی علیحدہ کرنے کی غرض سے شورے کے تیزاب استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

جارج سارٹن نے پندرہ کتابوں کے نام لکھے ہیں ۔ طوالت کے خیال سے اور نام چھوڑ دیئے گئے ۔ سارٹن کہتا ہے کہ جس شخص نے اتنی ساری کتابیں اس موضوع پر لکھیں وہ یقیناً کیمیاوی تحقیق میں گہری دلچسپی لیتا ہوگا ۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کا کام رسکا (Ruska) اسٹیپل ٹن (Stapleton) ' ہوم یارڈ (Holmyard) وغیرہ نے شروع کیا ہے جب یہ کام سرانجام ہو جائے تو الجلاکی کا صحیح مقام متعین کیا جانا ممکن ہوگا ۔ اس کی کچھ کتابیں بمبئی ' قاہرہ وغیرہ میں چھاپی گئی ہیں ان کے نام یہ ہیں:

شذور الذہب اور اس پر الجلاکی شرح	بمبئی 1881ء
مصباح فی اسرار المفتاح	قاہرہ 1882ء
نتائج الفکر فی احوال الحجر	بلاق (تاریخ اشاعت درج نہیں)
نہایتہ الطب فی شرح مکتسب	بمبئی 1890ء

ابوالقاسم عبداللہ ابن علی ابن محمد ابن ابی طاہر الکاشانی کی حال ہی میں ایک نہایت اہم تصنیف دستیاب ہوئی ہے جس میں مٹی کے برتنوں کو شیشے کے پانی سے چمکانے (Glaze) کی وہ ٹیکنیک معلوم ہوئی ہے جو اسلامی ممالک میں رائج تھی ۔ یہ کتاب 1300ء میں تبریز میں لکھی گئی تھی اس کا نام " کتاب الجواہر العرائس و اطائب النفائس " ہے ۔ اس میں قیمتی پتھروں اور خوشبوؤں کے ذکر کے ساتھ ساتھ آخری باب میں مٹی کے چھلکے برتنوں یعنی غضارہ (Enamelled Pottery) سے بحث کی ہے ۔ یہ کتاب استنبول کے کتب خانہ (Hagia Sophia) میں ملی ۔ جارج سارٹن کا خیال ہے کہ عثمانی سلطان سلیم اول ایرانیوں کو 23 اگست 1514ء کو چلدران (Chaldiran) کے مقام پر شکست دے کر اس کتاب کو لے گیا ہوگا ۔ وہ اس لڑائی کے بعد مفتوحہ ایران سے کئی سو کاریگر بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

عبداللہ ابن علی کاشانی کمہاروں کے خاندان سے تھا ۔ اس کے بھائی یوسف ابن علی ابن محمد نے 1305ء میں امام یحییٰ کے مقبرے کی وہ خوبصورت اور تاباں محراب بنائی تھی جس کے ٹکڑے اب لینن گراڈ (Leningrad) میں محفوظ ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن علی خود ایک منجھا ہوا کاریگر تھا اور غضارہ میں کمال رکھتا تھا ۔ آخری باب میں اس موضوع پر جو لکھا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے ' اس نے اپنے فن کو اکسیر کا نام دیا ہے ۔ اس نے تفصیل سے بتایا ہے کہ مسالے میں کیا کیا اجزا کس مقدار میں ڈالے جاتے ہیں ۔ بھٹی میں کس طرح پکایا جاتا ہے ' کون کون سے آلات استعمال کیے جاتے ہیں اور کس طرح برتنوں کو مزین کیا جاتا ہے ۔ مسالے کے اجزا میں سے بیشتر کاشان کے قرب و جوار میں دستیاب تھے اور کچھ کرمان ' خراسان ' یزو ' اصفہان ' ایشیائے کوچک ' چین اور فرانس وغیرہ سے درآمد کیے جاتے تھے ۔ چونکہ بیشتر اجزاء کاشان میں بآسانی مل جاتے تھے اس لیے غضارہ کی صنعت نے وہاں فروغ پایا اور کاشان اس کا مرکز بن گیا ۔ برتنوں پر مسالے کے استعمال کے کئی طریقے بتائے ہیں ۔ ایک طریقے میں شعلوں کو برتنوں تک نہیں آنے دیا جاتا تھا ۔ اس غرض کے لیے ڈھکی ہوئی بھٹی (Muffle Kiln) استعمال کی جاتی تھی ۔ ہفت رنگی اور مینائی آرائش کے طریقے بھی بیان کیے ہیں ۔ یہ صنعت کاشان ' بغداد اور تبریز کے علاوہ غالباً اور کسی جگہ نہیں پائی جاتی تھی ۔ عبداللہ ابن علی نے ان ہی تین مقامات کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان تین مختلف شہروں میں کون کون سے مختلف طریقے رائج تھے ۔ اس کتاب کے دستیاب ہونے کے بعد سے غضارہ کے ماہرین نے کاشانی برتنوں پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس صنعت کا مرکز کاشان ہی تھا ۔ دیواروں کو مزین کرنے کے لیے جو رنگین ٹائلیں (Tiles) لگائی جاتی تھیں انہیں کاشی یا کاشانی کہتے تھے ۔ حال میں اس صنعت کی بھٹیاں بھی کاشان میں نکلی ہیں اور ان کے قریب ہی ناقص برتن (جو ناقص ہو جانے کی وجہ سے پھینک دیئے جاتے تھے) بھی برآمد ہوئے ہیں ۔ جارج سارٹن یہ سوال اٹھاتا ہے کہ یہ صنعت چین سے ایران پہنچی ۔ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس کا

کوئی ثبوت نہیں ۔ " مقدمہ تاریخ سائنس " کی تیسری جلد صفحہ 758ء پر جارج سارٹن کہتا ہے کہ غضارہ (Glazed Pottery) کی ابتدا قدیم زمانہ میں مصر اور عراق عرب میں ہوئی تھی ۔ چین میں یہ صنعت بہت بعد میں پہنچی ۔ یہ چین کی ایجاد نہیں ۔ لوفر (Laufer) کی رائے میں بحر روم کے ملکوں سے یا عراق یا ایران سے قدیم زمانہ میں یہ صنعت چین پہنچی تھی ۔

شمس الدین ابو عبداللہ محمد ابن ابراہیم ابی طالب الانصاری الصوفی الدمشقی کا ذکر جغرافیہ دانوں کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے ۔ اس نے اپنی موقر تصنیف " کتاب نخب الدہر فی عجائب البر والبحر " کے دوسرے حصے میں سات دھاتوں یعنی سونے ' چاندی ' تانبے ' لوہے ' جست ' ٹین اور سیسے اور قیمتی پتھروں کا ذکر کیا ہے اور ان کی خاصیتوں سے سیر حاصل بحث کی ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ کیمیا کا اچھا علم رکھتا تھا ۔

ابوزید ولی الدین عبدالرحمٰن ابن محمد ابن خلدون کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے اس کا علم ہمہ گیر تھا ۔ وہ قرون وسطیٰ کا سب سے عظیم مورخ ہونے کے علاوہ اور بہت سے علوم میں دستگاہ رکھتا تھا ۔ چنانچہ علم کیمیا پر جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ ماہرانہ انداز میں لکھا ہے ۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ جس روشن دماغی سے ابن خلدون نے الکیمیا کا جائزہ لے کر تبصرہ کیا ہے ' ویسا کسی اور نے نہیں کیا ۔ خالد ابن یزید ابن امیر معاویہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کیمیا اور طب کا عالم تھا اور اس نے ان علوم پر کتابیں تصنیف کی تھیں ۔ چنانچہ سید امیر علی نے " مسلمانوں کی مختصر تاریخ " میں اس بات کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ بنی امیہ کے عہد میں صرف ایک سائنس داں ہوا ہے اور وہ خالد بن یزید تھا ' جس نے کیمیا اور طب پر کئی کتابیں لکھی تھیں ۔ ابن خلدون نے اپنے مشہور عالم مقدمہ میں کیمیا دانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ خالد بن یزید نرا بدو تھا ۔ اسے سائنس اور فنون سے کیا لگاؤ ہو سکتا تھا ۔ جو کتابیں اس سے منسوب کی گئی ہیں وہ اس کی نہیں ہو سکتیں ۔ امام غزالی سے جو الکیمیا کی کتابیں منسوب تھیں ' ان کے بارے میں ابن خلدون نے کہا کہ وہ ان کی نہیں ہیں کیونکہ غزالی ایسا صاحب فہم و ادراک الکیمیا ایسے لغو علم کو قابل توجہ نہیں سمجھ سکتا تھا ۔ اس کے خیال میں دھاتوں کی قلب ماہیت (Transmutation) بالکل ناممکن ہے ۔ پارس پتھر (Philosophers' Stone) کا کوئی وجود نہیں ۔ کیمیا گری سراسر دھوکا ہے ۔ اس کو علم سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کرنا مضرت رساں ہے ۔

علم کیمیا سے ماخوذ صنعتیں

کاغذ سازی ۔ کاغذ یا کاغد (دال مہملہ کے ساتھ) فارسی اور قرطاس عربی لفظ ہے لیکن عربی

میں کاغذ لے لیا گیا ہے اور اس کی جمع کواغد بنائی ہے ۔ کاغذ سازی کی ایجاد چین میں پہلی صدی عیسوی میں ہوئی ۔ اس کا موجد Tsai Lun تھا ۔ اموی خلیفہ ولید اول کے عہد حکومت میں 712ء میں مسلمانوں نے سمرقند فتح کیا تو انہوں نے چینیوں سے کاغذ بنانے کی صنعت سیکھنا شروع کی اور 757ء میں پہلی بار مسلمانوں نے سمرقند میں کاغذ بنایا ۔ وہاں سے یہ صنعت رفتہ رفتہ تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی ۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ کاغذ کا استعمال مکہ میں 707ء میں ، مصر میں 800ء میں ، اسپین میں 950ء اور صقلیہ (Sicily) میں جو مسلمانوں کے زیر نگیں تھا ، 1102ء میں شروع ہوا ۔ صقلیہ اور اسپین سے کاغذ یورپ پہنچا ۔ چنانچہ 1154ء میں اٹلی میں ، 1228ء میں جرمنی میں اور 1309ء میں انگلستان میں بھی کاغذ استعمال ہونے لگا ۔ ول ڈیوراں کے بموجب کاغذ کا سب سے پہلا کارخانہ 794ء میں خلیفہ ہارون کے وزیر کے بیٹے الفضل نے بغداد میں قائم کیا تھا۔

ایک طبیب کو بخارا کے سلطان نے اپنی ملازمت میں رکھنا چاہا تو اس نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس کے کتب خانہ کو بخارا لے جانے کے لیے چار سو اونٹ درکار ہوں گے ۔ جب ہلا کو نے 1258ء میں بغداد کو تباہ کیا تو بے شمار نجی کتب خانوں کے علاوہ بغداد میں چھتیس عام کتب خانے تھے ۔ شہزادہ صاحب بن عباس کے کتب خانے میں دسویں صدی میں اتنی کتابیں تھیں جتنی یورپ کے تمام کتب خانوں میں مجموعی طور پر تھیں ۔ موصل کے کتب خانے میں کتابوں کے ساتھ پڑھنے والوں کو کاغذ بھی فراہم کیا جاتا تھا ۔ بصرہ کے کتب خانے میں پڑھنے والوں کے لیے وظیفے مقرر کیے جاتے تھے ۔ ول ڈیوراں کہتا ہے کہ شاید چین کو چھوڑ کر آٹھویں ، نویں ، دسویں اور گیارہویں صدیوں میں دنیا بھر میں کتابوں کی اتنی مانگ اور اشاعت نہ تھی جتنی اسلامی ممالک میں تھی ۔ مسلمانوں نے عربی کو دنیا کی سب سے بڑی علمی و ادبی زبان بنا دیا تھا۔

جارج سارٹن کہتا ہے کہ المغرب کے صرف ایک شہر فاس (Fez) میں بارہویں صدی کے آخر تک کاغذ کے چار سو کارخانے قائم ہو گئے تھے ۔ اسپین میں کاغذ سازی کا مرکز شاطبہ (Jativa) تھا ۔ وہاں کا کاغذ اپنی عمدگی کی وجہ سے تمام اسلامی دنیا میں مشہور ہو گیا اور مصر تک اسی کاغذ کا رواج ہو گیا ۔ 1238-39ء میں شاطبہ کو عیسائیوں نے فتح کر لیا ۔ بیس سال بعد 1258ء میں ہلا کو نے بغداد کو تباہ کر دیا ۔ مشرقی اسلامی ممالک کی تباہی دراصل ہلا کو کے دادا چنگیز نے 1218ء میں شروع کی تھی جسے ہلا کو نے چالیس سال بعد تکمیل کو پہنچایا ۔ ادھر اسپین میں عیسائیوں نے قرطبہ کو 1236ء میں اور اشبیلیہ کو 1248ء میں فتح کیا ۔ غرناطہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کے علاوہ سارے اسپین پر قبضہ کر لیا ۔ اس طرح تیرہویں صدی میں اسلامی تہذیب و تمدن کو بہت بڑا دھکا لگا ۔ ان کی لاکھوں بے بہا کتابیں تلف ہو گئیں اور درس و تدریس کا نظام منتشر ہو گیا۔

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ کاغذ سازی پر عربی کی کتاب "عمدۃ الکتاب و عدۃ ذوی الالباب" بڑی اہم تصنیف ہے ۔ وہ تونس کے زیری خاندان کے فرمانرواؤں میں سے ایک فرمانروا امیر المعز ابن بادیس سے منسوب ہے ۔ اس خاندان نے 1015ء سے لے کر 1061ء تک حکومت کی ۔ اس کتاب میں کاغذ سازی کے تمام مراحل تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں ۔ پہلے ماوا (Pulp) بنانے پھر تاؤ (Sheets) بنانے ، پھر انہیں دھونے پھر انہیں کیمیاوی عمل سے سفید (Bleech) کرنے ، پھر رنگ کی آمیزش دینے پھر انہیں جلا دینے غرض شروع سے آخر تک ہر عمل کے کرنے کے تمام طریقے اس کتاب میں بتائے گئے ہیں بلکہ وہ طریقہ بھی بتایا ہے جس سے کاغذ پرانا معلوم ہو ۔ اسے "صنعت تعتیق الکاغذ" کہتے ہیں ۔ سارٹن کی رائے میں گیارہویں صدی تک عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔

عربوں کے ذریعہ یورپ میں کاغذ پہنچنے کی ایک کھلی شہادت یہ بھی ہے کہ عربی کا لفظ رزمہ جو بہت سے اوراق کے لیے استعمال ہوتا ہے ، یورپ کی قریب قریب ہر زبان میں داخل ہو گیا ہے ۔ ہسپانوی و پرتگالی زبانوں میں یہ (Resma) ، فرانسیسی میں Ramf کے ٹے لونیا کی زبان (Catalon) میں Raima ، جرمن میں Ries ، اور انگریزی میں Ream کہلایا ۔ شاطبہ کو فتح کرنے سے پہلے ہی شاید اسپین کے عیسائی کاغذ بنانے لگے تھے ۔ شاطبہ پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو یہاں کی کاغذ سازی کی صنعت بھی ان کے ہاتھ آ گئی ۔ پھر رفتہ رفتہ اور مقامات پر بھی کاغذ بننے لگا۔

بارود (Gunpowder) اہم ترین ایجادوں میں سے ہے کیونکہ اس کے نتائج بہت دور رس ہوئے ۔ بندوقیں ، توپیں ، بم وغیرہ اسی ایجاد کی بدولت وجود میں آ سکے ۔ ان ہتھیاروں نے قوموں کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے میں اکثر اہم کردار ادا کیا ہے ۔ اس ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے اس بارے میں کئی نظریے ہیں ۔ ایک یہ کہ چین نے سب سے پہلے بارود بنایا ، دوسرا یہ کہ انگریز سائنس داں راجر بیکن (Roger Bacon) جو 1292ء میں فوت ہوا ، بارود کا موجد تھا ۔ تیسرا یہ کہ بارود مسلمانوں نے ایجاد کیا اور چوتھا یہ کہ بارود یورپ میں سب سے پہلے بنا ۔ جارج سارٹن نے پہلے اور دوسرے نظریہ کو مسترد کر دیا لیکن وہ کوئی فیصلہ قطعی طور پر نہ کر سکا کہ اسے مسلمانوں نے ایجاد کیا یا یورپ والوں نے ۔

بارود کے اجزا شورہ (Potassium Nitrate) گندھک اور کوئلہ ہیں ۔ پوٹاشیم نائٹریٹ کو عام طور پر سالٹ پیٹر (Saltpeter) کہتے ہیں ۔ شورے اور بارود کا ذکر ابن بیطار کی کتابوں میں ملتا ہے ۔ ابن بیطار بہت بڑا نباتی (Botanist) تھا ۔ اس کا انتقال دمشق میں 1248ء میں ہوا ۔ پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم ہے کہ وہ بارہویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا تھا ۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ محض یہ بات کہ ابن بیطار شورے کا استعمال جانتا تھا اور اس نے شورے کا ذکر بارود کے تحت کیا ہے یہ ثابت

کرنے کے لیے کافی نہیں کہ شورے سے اس کی مراد بارود تھا جو بعد میں آتشیں اسلحہ میں استعمال ہوا۔ جارج سارٹن کا یہ استدلال عجیب سا ہے۔ جب یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ ابن بیطار نے شورے کا ذکر بارود کے تحت کیا ہے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ وہ شورے اور بارود دونوں سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ شورہ بارود کا ایک جز ہے۔

پھر الحسن الرماح کا ذکر کرتے ہوئے جارج سارٹن کہتا ہے کہ اس نے شورے کو صاف کرنے کا طریقہ بتایا ہے اور لڑائی کے ہتھیاروں پر دو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ ابن بیطار کا انتقال تیرہویں صدی کے پہلے نصف میں ہوا اور الحسن الرماح اس کے انتقال سے کچھ عرصہ بعد تیرہویں صدی کے دوسرے نصف میں گزرا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی میں مسلمان شورے کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ ابن بیطار نے شورے کا ذکر بارود کے تحت کیا تھا جارج سارٹن کہتا ہے کہ یہ تسلیم کرنا ضروری نہیں کہ بارود سے مراد گن پوڈر (Gunpowder) ہی تھا۔ دوسری جگہ سارٹن کہتا ہے کہ بارود مسلمانوں کی ایجاد ہو لیکن اغلب یہ ہے کہ مغربی یورپ والوں نے اسے ایجاد کیا مگر مغربی یورپ کے حق میں فیصلہ دینے کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ اگر ابن بیطار بارود سے واقف نہ ہوتا تو وہ اس کے ایک جز یعنی شورے کا ذکر بارود کے تحت کیسے کرتا۔ اگر جارج سارٹن کے نزدیک وہ بارود جس کا ذکر ابن بیطار نے کیا تھا گن پوڈر کے علاوہ کچھ اور چیز تھی تو اس کی وضاحت کی ذمہ داری جارج سارٹن پر تھی۔ اس وضاحت کی عدم موجودگی میں تو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ ابن بیطار کا بیان کردہ بارود وہی بارود تھا جو آج بھی بارود کے نام سے موسوم ہے۔ اس امکان کو ترجیح دینا کہ بارود مسلمانوں کی ایجاد ہے زیادہ قرین قیاس ہے کہ اگر دوسرا بارود جیسے جارج سارٹن مغربی یورپ کی ایجاد سمجھتا ہے' ابن بیطار کے بارود سے مختلف ہوتا تو وہ بارود کے بجائے کسی اور نام سے موسوم ہوتا۔

غضارہ اور شیشہ سازی

یہ صنعتیں بہت پرانی ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے مصر' مشرق قریب اور عراق عرب میں پائی جاتی تھیں۔ چین میں یہ صنعتیں بہت بعد میں پہنچیں۔ محقق لوفر (Laufer) کی رائے ہے کہ یہ صنعتیں چین میں پیدا نہیں ہوئیں بلکہ بحر روم اور عراق کے علاقوں میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے پہنچ چکی تھیں۔ البتہ چین میں مٹی کے برتنوں کی صنعت میں نویں صدی عیسوی میں کچھ ایجادیں ہوئیں اور اس نے وہاں بہت ترقی کی۔

عبداللہ بن علی کی کتاب "الجواہر العرائس و اطائب النفائس" جس کا ذکر کیا جا چکا ہے' مسلمانوں کی غضارہ کی صنعت کو خوب وضاحت سے بیان کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لسٹر ٹیکنیک (Lustre Technique) مشرقی اسلامی ممالک میں ایجاد ہوئی تھی۔ اس ٹیکنیک کے ذریعہ مختلف رنگوں سے قوس قزح کی سی کیفیت پیدا کی جاتی تھی۔ بارہویں صدی میں اس ٹیکنیک سے بنائے ہوئے برتن تمام دارالاسلام میں رائج ہو گئے تھے اور ان کے کچھ نمونوں نے یورپ میں بھی داخلہ پا لیا تھا۔ اسپین کے مسلمانوں نے اس فن کو قابل ستائش ترقی دی جہاں سے اس صنعت کے نمونے یورپ پہنچے۔ چودہویں صدی تک اس صنعت کا مرکز اسپین کا شہر مالقہ (Malaga) میں تھا۔ 1487ء میں مالقہ کو عیسائیوں نے فتح کیا' مالقہ سے یہ صنعت اٹلی پہنچی۔ اسپین کے مسلمانوں نے چینی اور شیشے کے برتنوں کی صنعت ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ چمکدار ٹائیلوں (Tiles) کے بنانے پر بھی خاص توجہ دی۔ یہ ٹائیلیں مسلمانوں کی عمارتوں کا جزو لاینفک بن گئیں۔ اسپین اور پرتگال کے عیسائیوں نے بھی اپنی عمارتوں کو ٹائیلوں سے مزین کیا۔

جہاں تک اسلامی ممالک میں شیشہ اور اس کے ظروف بنانے کا تعلق ہے اس کی شہادت ان بہت سے نمونوں سے ملتی ہے جو آج بھی دنیا کے مختلف عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ مٹی کی مصنوعات کی طرح شیشے کی مصنوعات کو بھی مسلمان Enamel کرتے تھے۔ اس صنعت کے تقریباً تین سو نمونے لیمپوں اور بوتلوں کی شکل میں مختلف عجائب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ قاہرہ کے عربی عجائب خانے میں ان تین سو میں سے ایک سو اٹھارہ نمونے محفوظ ہیں' ان میں اکثر پر بنانے کی تاریخ اور امراء کا نام جن کے لیے وہ بنائے گئے تھے' پائے گئے۔ سب سے پرانا نمونہ وہ ہے جس پر دمشق و حلب کے سلطان صلاح الدین الصغیر کا نام ہے۔ اس سلطان نے 1250ء سے 1260ء حکومت کی تھی۔ سب سے بعد والے نمونوں پر سلطان قائب بے کا نام ہے۔ اس کا دور حکومت 1468ء سے 1495ء تک ہے۔ یہ پہلے نمونوں کے مقابلے میں کم تر حیثیت کے ہیں اور صنعت کے انحطاط کا پتہ دیتے ہیں۔ مملوک سلطان ناصر الدین کا نام انتالیس اور سلطان ظاہر برقوق کا نام چوبیس نمونوں پر ملتا ہے۔

حلب کے بنے ہوئے ایک لیمپ کا جو پیرس کے Louyre میں محفوظ ہے' پال رویسے (Paul Rayiisse) نے تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ امیر ارغون الناصری کے لیے بنایا گیا تھا جو 1331ء میں فوت ہوا تھا۔

1400ء میں تیمور لنگ نے دمشق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور وہاں کے کاریگروں کو گرفتار کر کے سمرقند لے گیا مگر سمرقند میں یہ صنعت نہ پنپی' البتہ شام میں تباہ ہو گئی۔

جارج سارٹن لکھتا ہے کہ لیمپوں کے جو نمونے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں ان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شیشہ گری کے فن میں مسلمان یورپ والوں سے بہت آگے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وینس (Venice) کے اس زمانے کے بنے ہوئے ظروف کے ایسے نمونے نہیں پائے جاتے جو شام کے ان نہایت نفیس (Superb) نمونوں کا مقابلہ کر سکیں ۔ اس زمانے میں وہاں صرف تسبیح کے دانے اور کپڑوں میں ٹانکنے کے شیشے کے موتی وغیرہ بنائے جاتے تھے ۔ چودھویں صدی میں مغربی یورپ میں جو شیشہ سازی کی صنعت تھی وہ وینس کی مرہون منت نہ تھی ' بلکہ اس صدی میں مشرق قریب سے بڑی مقدار میں شیشے کا سامان یورپ جاتا تھا ۔ "مقدمہ تاریخ سائنس" کی دوسری جلد کے صفحہ 1040 پر سارٹن لکھتا ہے کہ تیرہویں صدی کے دوسرے نصف میں وینس شیشہ سازی کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا ۔ اس میں اور پہلے بیان میں کہ وہ صرف تسبیح کے دانے اور کپڑوں پر ٹانکنے کے موتی بناتا تھا ' تضاد ہے ۔ بہر حال اسے یہ تسلیم ہے کہ وینس کی بنی ہوئی چیزوں کا شام کی نہایت نفیس مصنوعات سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

عرق گلاب ' آب مقطر ' خوشبوئیں : مسلمانوں نے جہاں الانبیق سے اپنے تجربات میں کام لیا وہیں عرق گلاب ' آب مقطر ' اور خوشبوئیں وغیرہ بنانے میں اس سے مدد لی ۔ شامی مورخ عمر ابن العدیم نے عطر سازی پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

ادویہ سازی :- مسلمانوں نے علم کیمیا کے ذریعہ بے شمار چیزوں کی خاصیتیں دریافت کیں ۔ اس معلومات سے دواسازوں نے بہت فائدہ اٹھایا ۔ مسلمانوں کی کتاب الادویہ (Pharmaco-poeia) پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے بے شمار دوائیں بنائی تھیں۔

علم اللسان

علم اللسان (Philology) جارج سارٹن کی رائے میں کسی زبان کی ساخت اور اجزائے ترکیبی کا علم حاصل کرنا اتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا کہ جسم کی ساخت کے بارے میں علم التشریح (Anatomy) کا ۔ کسی زبان کو علمی زبان بنانے اور علوم کو نشوونما دینے اور پھیلانے کے لیے یہ لازمی امر ہے کہ اس کی جبلی و غیر شعوری حالت کی قلب ماہیت کر کے اس طرح باقاعدگی سے منظم و مرتب کیا جائے کہ صحت کلی کے ساتھ وہ ہر خیال کے اظہار پر قادر ہو جائے ۔ قرون وسطیٰ میں زبان کے حکیمانہ مطالعہ کو اس جذبے نے اکسایا کہ الہامی کتابوں کے ایک ایک حرف کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے ۔ اس مطالعہ کی تحریک کی دوسری ضرورت اس وقت پڑی جب دوسری زبانون کی سائنس کی کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنا مقصود ہوا ۔ اس وقت علمی اصطلاحات کا وضع کرنا ناگزیر ہو گیا ۔ جارج سارٹن نے عربی ' فارسی اور ترکی زبانوں کے ارتقاء کے متعلق "مقدمہ تاریخ سائنس" کی مختلف جلدوں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں درج کیا جاتا ہے ۔ مگر اس سے پہلے مناسب ہو گا کہ سائنس کی نوعیت کے بارے میں بھی اس کے کچھ خیالات بیان کر دیئے جائیں۔

کائنات کی ہر چیز پر غور و خوص کرنے کا نام سائنس ہے ۔ سائنس کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے ایک بے نقص خدا کا سازوغ درکار ہے چونکہ انسان کا دماغ بے نقص نہیں اس لیے اس کی سائنس بھی بہت ناقص ہے ۔ صرف ماضی کی سائنس ہی ناقص نہ تھی بلکہ آج کی سائنس بھی ناقص ہے اور ہمیشہ ناقص رہے گی البتہ سائنس کو ترقی دینے کے لامحدود امکانات ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس تیسری جلد حصہ اول سے لیا گیا ہے ۔ اسی میں وہ لکھتا ہے کہ چونکہ سائنس کا انحصار مثبت معلومات پر ہے اس لیے وہ فلسفہ اور دینیات سے مختلف ہے ۔ سارٹن کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فلسفہ کی بنیاد قیاس آرائی پر ہونے کی وجہ سے اور دینیات کا انحصار ماورائی باتوں پر ہونے کے باعث ان کی بیان کردہ حقیقتیں ایسی نہیں جن کو مشاہدات کی کسوٹی پر پرکھا جا سکے ۔

اس لیے وہ سائنس کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ علم التنجیم (Astrology)، کیمیا سازی (Alchemy)، علم الوجہ (Physiognomy) اورعلم الرویہ (Bneirology) کو سائنس نہ ماننے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ مشاہدے کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔

لیکن سارٹن علم اللسان کو وہی درجہ دیتا ہے جو علم التشریح کا ہے اس لیے عربی، فارسی اور ترکی کے علم اللسان کو سائنس کے دوسرے علوم کے شانہ بہ شانہ جگہ دینا غیر مناسب نہ ہو گا۔

عربی لسانیات

سارٹن لکھتا ہے: قرآن نے عربی کو ادبی حیثیت عطا کی اور اس کو اتنا مستحکم بنا دیا جتنا کسی زبان کو مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔ قرآن کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس کے لحاظ سے وہ بے نقص ہے۔ اس اعتبار سے قرآن اور بائیبل کے عہد نامہ عتیق میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ بہت کم عیسائی ایسے ہوں گے جو عہد نامہ عتیق کو عبرانی زبان میں پڑھتے ہوں وہ ترجمہ پر قناعت کرتے ہیں۔ مگر ترجمے اصل سے تھوڑے بہت ہٹے ہوئے ضرور ہوتے ہیں۔ اصل کتاب کتنی ہی بے نقص کیوں نہ ہو اس کے ترجمے میں انسانی خامیوں کی بدولت خامی آجاتی ہے۔ مسلمانوں نے قرآن کو خامیوں سے پاک رکھنے کے لیے اس کا ترجمہ کرنا ممنوع قرار دیدیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے درمیان صرف مذہبی رشتہ ہی قائم نہیں ہوا بلکہ مشترکہ زبان نے بھی انہیں منسلک کر دیا۔ زبان کا یہ ربط باہمی مذہبی رشتے سے کم متبرک اور کم محکم نہیں۔ افسوس کہ ہم نے یورپی زبانوں کے مقابلے میں عربی زبان کو بے مایہ سمجھ کر مشترک زبان کا رشتہ توڑ دیا۔ یہ ہمارے جدت پسند مگر ناعاقبت اندیش رہنماؤں کے غلط نظریات کا ہمیں سخت نقصان دہ انعام ملا ہے جس کی بدولت ہم نے یورپ و امریکہ کی ذہنی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا ہے اور اب اس طوق کو اتار پھینکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

زمانہ جاہلیت میں عربی بولنے والے قبیلوں نے ادبی زبان، بالخصوص شاعری کو ترقی دی تھی۔ لیکن یہ اسلام ہی تھا جس نے عربی کو استحکام بخشا اور اسے بین الاقوامی اہمیت دی۔ اگر عربی اسلام کی مقدس زبان نہ ہوتی تو یہ عالمی زبان کے بجائے قبائلی بولی ہو کر رہ جاتی۔ آٹھویں صدی کے دوسرے نصف میں زیریں عراق عرب ذہنی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ بصرہ، کوفہ اور بغداد کے نو تعمیر شہروں میں نئی ثقافت کو جواں ہمتی سے تشکیل کیا جا رہا تھا۔ بازنطینی سلطنت اور ایران و ہندوستان سے نکل کر علم کے چشمے اسلامی سلطنت میں آملے تھے۔ مسلمانوں کی نوخیز تہذیب کی زبان عربی تھی جو کبھی پہلے حکمت و فلسفہ کی ترجمانی کرنے کے لیے استعمال نہیں ہوئی تھی۔

یونانی سنسکرت اور پہلوی سے جب علوم کا عربی میں ترجمہ کرنے کا مرحلہ درپیش آیا تو عربی میں علمی اصطلاحات بالکل ناپید تھیں۔ ایسی اصطلاحات کو وضع کر کے منتقل شدہ علوم کو عربی بولنے والوں کے لیے قابل فہم بنانا ایسی دشوار مہم تھی کہ اگر عربوں کے دلوں میں انتہائی رجائیت اور ان کے حوصلوں میں فتح مندی کا عزم محکمہ نہ ہوتا تو اس سے عہدہ برآنہ ہو سکتے۔ عربی کو علمی زبان بنانے میں جس سعی بلیغ سے انہوں نے کام لیا وہ لائق ستائش ہے۔

عربی کا فروغ

عربی زبان کی پیچیدہ ساخت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بہت پرانی زبان ہے لیکن اس کی پرانی ادبی دستاویزات بہت ہی کمیاب ہیں۔ عربی نثر کی پہلی اہم کتاب قرآن ہے۔ چونکہ یہ الہامی کلام ہے اس کا بے نقص ہونا لازم آتا ہے۔ عربی کو قرآن نازل ہوتے ہی مضبوط ترین بنیاد مل گئی۔ اسلام کو سیاسی میدان میں غیر معمولی کامیابی ہوئی تو عربی بھی اس کے ساتھ ہر جگہ پہنچی اور خوب پھلی پھولی۔ عربی رسم الخط نے عربی زبان سے بھی زیادہ وسعت حاصل کی اور کئی زبانیں مثلاً فارسی و ترکی اسی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔ یہودیوں نے عبرانی اور ایرانی اور عیسائیوں نے ارامی اور قبطی زبانوں کے بجائے عربی اختیار کی۔ غیر عرب مسلمانوں نے عربی اس لیے قبول کی کہ ان کے مذہب کا دارومدار اسی پر تھا اور غیر مسلموں کو، مذہبی تعصب کے باوجود عربی کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

جو اسباب کسی زبان کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں بالادستی حاصل کرنے میں مدد کر دیتے ہیں، ان کا مکمل تجزیہ مشکل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسباب ایسے ہوں جو شاعروں اور علمائے لسانیات کے لیے قابل قبول ہوں۔ زبان کا حسن یا الفاظ کی بہتات عوام کو اس کی طرف مائل کرنے کے لیے ضروری نہیں۔ انگریزی کی طرح تھوڑی سی عربی بھی آسانی سے سیکھی جاتی ہے اور اس تھوڑی سی تحصیل سے بہت سا کام لیا جا سکتا ہے۔ عربی میں ادبی زبان کے دوش بدوش بہت سی مقامی بولیاں بھی شامل ہیں۔ عربی عموماً اعراب کے ساتھ نہیں لکھی جاتی۔ چنانچہ مختلف مقامی بولیوں میں الفاظ کا تلفظ مختلف طور پر کیا جاتا ہے۔ ایک ہی عبارت تکلف و تصنع کے ساتھ بھی بولی جا سکتی ہے اور عوامی لہجے میں بھی۔ جس زبان میں اتنی لچک ہو اس کا ہر طبقے میں قبول عام حاصل کر لینا ظاہر ہے۔

قرون وسطیٰ میں عربی و لاطینی علمی زبانیں ہونے کی حیثیت سے نمایاں تھیں۔ لاطینی خالص ادبی زبان تھی اور اسے صرف بولتے تھے۔ عربی علمی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ تکلف سے بری

تھی اور اسے عورتیں بھی بولتی تھیں چنانچہ لاطینی معدوم ہوگئی اور عربی زندہ رہی ۔جب عورتیں کوئی زبان بولیں تو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ اسے پوری دریا دلی کے ساتھ بولیں گی ۔ زبان ان کے دہن سے زندگی بخش ندی کی طرح بہتی ہے ۔ ان کے بچے بغیر کسی کوشش کے مادری زبان سیکھ لیتے ہیں۔جب بولنے والوں کی تعداد بڑھتی ہے تو زبان میں وسعت کے ساتھ بالیدگی خود بخود آجاتی ہے ۔عربی کے زندہ رہنے اور لاطینی کی موت کی یہی وجہ تھی ۔ گو ناخواندہ لوگ صاف ستھری زبان بولنے پر قادر نہیں ہوتے مگر وہ کم و بیش سمجھ لیتے ہیں اور اس کو معیاری چیز سمجھ کر بنظر احترام دیکھتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ نہ سیکھ سکے تو خیر اسے ان کے بچے سیکھ لیں گے ۔ اس طرح ادبی زبان اور مقامی بولیاں ایک دوسرے کی دستگیری کرتی ہیں ۔ ادب زبان کو نجابت عطا کرتا ہے اور مقامی بولیاں اسے زندگی بخشتی ہیں ۔ یہ عربی کی مقامی بولیوں کی ہماہمی ہی تھی جس نے اسے مذہبی حدود کے اندر مقید رہنے سے باز رکھا ۔ لاطینی دراصل کیتھولک مذہب کی زبان تھی اور اسی کی ہو کر رہ گئی ۔عربی عیسائیوں یہودیوں اور مسلمانوں کی مشترک زبان بن گئی۔

مقامی بولیاں نئے الفاظ اور نئے تجربات کا خیر مقدم کرتی ہیں ۔ ادبی زبان اپنی قدامت پسندی کی روک تھام کرنے اور زبان کو استقامت بخشنے میں صرف کرتی ہے ۔ دونوں کے امتزاج سے زبان ترقی پاتی ہے۔

عربی علم اللسان کا نشوونما قرآن شائع ہوتے ہی تیزی سے ہونے لگا۔جب اسلام نہایت سرعت سے بہت بڑے خطہ زمین میں پھیل گیا تو وہاں کی غیر عرب قوموں کو عربی سیکھنے کی ضرورت پڑی ۔ اس وقت عربی لغت اور صرف و نحو کی کتابیں ناپید تھیں ۔عربی نے سریانی زبان کے نمونے پر اپنی گرامر مرتب کرلی اور ان تین صدیوں میں علم و نحو کو ایسی ترقی دی کہ پھر سریانی گرامر عربی اصولوں پر مرتب کی جانے لگی ۔عربی گرامر بصرہ میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی ۔ کہا جاتا ہے کہ عربی گرامر کو ابوالاسود نے جو 68-69ء میں فوت ہوا ' ایجاد کیا۔ خلیل ابن احمد نے جس کا انتقال 791-92ء میں ہوا ' صرف و نحو کے اصول مرتب کیے اور اس کے ایرانی شاگرد سیبویہ نے جو چالیس سال کی عمر میں 1795ء میں فوت ہوا ' عربی صرف و نحو کی پہلی مبسوط تصنیف "الکتاب" تالیف کی ۔ سیبویہ اپنے استاد کے انتقال کے تین چار برس کے بعد ہی انتقال کر گیا ۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس کی "الکتاب" خلیل احمد کی نگرانی میں مرتب ہوئی ہوگی یا مرتب ہونے کے بعد اس کی نظر سے گزری ہوگی ۔ خلیل احمد علم عروض کا بھی بانی تھا اور اس نے ایک لغت کی تالیف بھی شروع کی تھی ۔ مگر پہلا مکمل لغت ابن درید نے (جو 933ء میں فوت ہوا) مرتب کیا۔

ابو حنیفہ احمد ابن داؤد الدینوری کی تصنیف "کتاب النبات" یوں تو علم النبات پر ہے اور

اس علم میں ایک اہم مقام رکھتی ہے ' مگر دراصل وہ لسانی نقطہ نظر سے لکھی گئی تھی ۔ اس کا انتقال نویں صدی کے آخر میں 895ء میں ہوا ۔ ابن قتیبہ کی "کتاب الشعر و الشعراء" اور "کتاب ادب الکاتب" علم ہجا (Orthography) اور الفاظ کے انتخاب اور طرز تحریر پر اہم تصانیف ہیں ۔ وہ بھی نویں صدی کے آخر یعنی 889ء میں فوت ہوا ۔ دسویں صدی کے نصف ثانی تک علم اللسان کی تالیف کا کام سارے دارالاسلام میں پھیل چکا تھا ۔ اسپین کے ابن القوطیہ (المتوفی 977ء) نے فعل کی گردان (Conjugation) پر پہلی کتاب لکھی ۔ اسمٰعیل ابن عباد نے جو 995-6ء میں فوت ہوا ' ایک ضخیم لغت "کتاب المحیط" مرتب کیا ۔ الجوہری (المتوفی 1002ء) نے ایک دوسرے ضخیم لغت "کتاب الصحاح فی لغۃ" کا آغاز کیا ۔عربی حروف تہجی کے انتیس حروف میں سے اس نے پندرہویں حرف ض تک یہ لغت لکھا اور بقیہ اس کے شاگرد ابواسحٰق ابراہیم ابن صالح نے مکمل کیا ۔ ابن جنّی نے 'جو 1002ء میں فوت ہوا ' اپنی کئی کتابوں میں علم صرف و نحو کے فلسفے سے بحث کی ۔ اسپین کے ایک اور باشندے ابن سیدہ جس کا انتقال 1065-66ء میں ہوا ۔ایک بہت ضخیم لغت "کتاب المحکم و المحیط الاعظم" مرتب کیا ۔ حمزہ ابن الحسن الاصفہانی نے جو شعوبی تحریک کا سرگرم حامی ہونے کی حیثیت سے عربی کی بالادستی ختم کرنا چاہتا تھا ' خود عربی علم صرف (Etymology) پر کتاب لکھی اس کا انتقال دسویں صدی کے آخر میں ہوا۔

چودھویں صدی کے آخر میں لغت اور گرامر پر اہم لکھنے والے یہ ہیں : الحریری ' ابن الجوالیقی ' ابن الانباری ' ابن الحاجب السکاکی ' صفی الدین ' التفتازانی ' المیدانی ' الزمخشری ' ابن منظور اور الفیروز آبادی ۔ ان میں المیدانی ' الزمخشری اور الفیروز آبادی ایرانی اور السکاکی اور التفتازانی ترک تھے۔

اسپین میں بارہویں ' تیرہویں اور چودہویں صدیوں میں گرامر اور لغت پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ۔ وہاں بنو امیہ کی حکومت کے 1035ء میں ختم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کا دور انحطاط شروع ہو گیا تھا ۔ افریقہ سے مرابطین اور ان کے بعد موحدین نے اسپین آ کر عیسائیوں کو شکستیں دیں اور اپنی حکومتیں قائم کیں مگر یہ حکومتیں دیرپا ثابت نہ ہوئیں ۔ بالآخر 1236ء میں قرطبہ پر اور تھوڑے عرصے بعد اشبیلیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا ۔صرف غرناطہ کی چھوٹی سی ریاست پر مسلمانوں کا قیام باقی رہا۔ ان حالات میں مسلمان علماء و حکماء اسپین چھوڑ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

المغرب (Morocco) کے ابن آجروم (Ibnajurrum) نے جس کا انتقال 1323ء میں ہوا ' مکہ معظمہ میں بیٹھ کر عربی گرامر کی تلخیص میں "کتاب المقدمہ الآجرومیہ فی مبادی علم العربیہ" لکھی ۔ مملوک سلطانوں کے عہد میں غرناطہ سے ترک وطن کر کے مصر میں بسنے والے ابو حیانی (المتوفی 1342ء) ' ابن الموردی (المتوفی 1394ء) اور ابن ہشام (المتوفی 1360ء) نے علم صرف و نحو پر کتابیں

تصنیف کیں ۔ ابن الوردی شام کا اور ابن ہشام مصر کا باشندہ تھا ۔ ایران میں افجار بردی اور نظام الابرج نے گرامر پر کتابیں لکھیں۔

اصطلاحات کے لغت ۔ علمی وفنی اصطلاحات کے لغت لکھنے کا رواج دسویں صدی میں شروع ہوا ۔ ابو یعقوب اسحٰق ابن سلیمان الاسرائیلی نے "کتاب الاستقسات" اور عبداللہ محمد ابن احمد ابن یوسف الخوارزمی نے "مفتاح العلوم" دسویں صدی میں لکھیں جو اصطلاحات کے لغت ہیں ۔ عبدالرزاق کاشانی (المتوفی 30-1329 ء) نے تصوف کی اصطلاحات کا لغت تیار کیا اور اس کا نام "کتاب اصطلاحات الصوفیہ" رکھا۔

شہنشاہ فریڈرک ثانی عربی کا بہت دلدادہ تھا ۔ جب 1334 ء میں اس نے نیپلز (Naples) میں یونیورسٹی قائم کی تو عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کی فراہمی کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا ۔ اسی طرح اسپین کے الفانسو السیبو نے جب 1254 ء میں اشبیلیہ میں تعلیم گاہ قائم کی تو اس میں ہسپانوی زبان کے ساتھ ساتھ عربی کو بھی ذریعہ تعلیم بنایا ۔ اسپین میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد بھی ایک عرصے تک یہودی اور عیسائی عربی بولتے رہے ، چنانچہ طلیطلہ (Toledo) کے اسرائیل بن جوزف نے عشائے ربانی کی رسوم پر عربی میں ایک کتاب لکھی تاکہ عربی داں عیسائیوں کو رسوم ادا کرنے میں آسانی ہو۔

ایک تیز طبع فرانسیسی وکیل Pierre Dubois نے فرانسیسی لڑکیوں کو عربی سکھانے کی ایک اسکیم بنائی ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ عربی داں لڑکیاں مسلمانوں کے ملکوں میں بھیجی جائیں تاکہ وہاں وہ جن مسلمانوں سے تعلق پیدا کریں انہیں فرانس کا حامی بنائیں اور جب بہت سے حامی ہو جائیں تو ان کے ذریعہ فرانس کا اقتدار قائم کیا جائے (مقصد برآری کے لیے اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے عصمت فروشی کرانے کی تقلید اب مشرقی ممالک میں بھی شروع ہو گئی ہے ۔ مغربی تقلید نے ایک ہی نہیں بلکہ ایسی بہت سی نعمتیں ہمیں عطا کی ہیں جن میں سب سے گرانقدر نعمت دین سے بیزاری ہے)۔

نامہ نگاری ۔ مسلمانوں نے نامہ نگاری (Dictamen) کے فن کو بہت ترقی دی ۔ ابن فضل اللہ العمری اور القلقشندی نے مملوک سلطنت کے اہلکاروں کو مراسلات جاری کرنے کے آداب سکھانے کی غرض سے رسالے تصنیف کیے ۔ امراء اور علماء تو ایک طرف ، عرب عوام بھی معیار سے گری ہوئی تحریروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ عرب اپنے شجرہ نسب کے تحفظ کا بہت خیال رکھتے ہیں اور جن القاب و آداب کے وہ مستحق ہیں ان سے مخاطب کیے جانے پر اصرار کرتے ہیں ، اس

لیے یہ ضروری تھا کہ وزارتوں سے جو مراسلات جاری ہوں ان میں ہر ایک کے منصب و مقام کے پیش نظر مناسب الفاظ و القاب درج کیے جائیں ۔ فرامین و مراسلات کو عموماً ہم وزن فقروں سے مزین کیا جاتا تھا ۔ یہاں تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا کیونکہ خود عربی زبان کی ساخت ایسی متناسب ہے کہ اس میں ہم وزن فقروں کا پایا جانا بالکل نیچرل ہے ۔ چنانچہ عربی کی عبارت میں ہم وزن فقروں کو لانے سے زیادہ مشکل ان کو ترک کرنا ہے لیکن سرکاری و نیم سرکاری مراسلات میں مسجع عبارت کا اہتمام کرنا اور جا بجا شعر لکھنا بھی رواج پا گیا تھا ۔ جو رسالے آداب نامہ نگاری پر لکھے گئے ان میں عبارت کی تزئین میں افراط سے کام لینے کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور اعتدال کو مدنظر رکھنے کی تلقین کی گئی۔

عربی و لاطینی مراسلات میں یہ نمایاں فرق تھا کہ عربی مراسلات میں تصنع لاطینی کی عبارتوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتا تھا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان اور وزیر جو زبان سرکاری تقریبوں میں بولتے تھے اس میں طمطراق تو ہوتا مگر وہ روزمرہ کی زبان سے مختلف نہ ہوتی ۔ اس کے برخلاف یورپ کے بادشاہ اور ان کے وزیر سرکاری تقریبوں میں ایسی زبان استعمال کرتے جو وہ اپنے گھروں میں نہ بولتے تھے ۔ خالص ادبی زبان Belles Lettres مشرق و مغرب کی تفریق کے بغیر سب درباروں میں مقبول تھی البتہ عربی کی ادبی زبان کی سرکاری سرپرستی سے قومی زبان یعنی عربی خوب پھولتی پھلتی مگر لاطینی کی سرپرستی سے قومی زبانیں دب جاتیں ۔ یورپ کی عوامی زبانوں کے سب سے بڑے دشمن وہ عمال تھے جو تصنع پسندی میں سسرو (Cicero) کی نقالی کرتے تھے۔

خطاطی ۔ عربی کے رسم الخط کا فطری حسن اس کا مقتضی ہے کہ خطاطی (Calligraphy) سے تحریر میں گلکاری کی جائے اور پیہم تجربات سے گلکاریوں میں تنوع پیدا کیا جائے ۔ چنانچہ ہر سند و فرمان کی پیشانی پر جو فرمانروا کی طرف سے جاری ہوتا اس کے نام کا خوبصورت طغرا ہوتا ۔ بعض طغرے تو ایسے دلآویز ہوتے کہ دستاویزات کو چار چاند لگ جاتے ۔ لاطینی فرمان ، سندیں اور سرکاری دستاویزات جلی حروف میں لکھی جاتیں مگر وہ عربی کے خوبصورت طغروں سے معرا ہوتیں ۔ لاطینی میں اچھی خطاطی کمیاب اور خوبصورت خطاطی نایاب تھی ۔ ہر چند کہ مملوک سلطان ترک تھے ، انہوں نے عربی نامہ نگاری کے فروغ میں دلچسپی لی ۔ اپنے اہل کاروں کی تربیت کے لیے کتابیں لکھوائیں اور عربی زبان کو استقامت بخشنے میں معتدبہ حصہ لیا۔

فارسی لسانیات ۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ نغمات حمد (Gathas) جو ایرانیوں کی مذہبی کتاب اوستا کا قدیم ترین جز ہیں ، زرتشت نے تصنیف کیے تھے ۔ یہ نغمات ایسی توحید کی تبلیغ کرتے ہیں جو یہودیوں کی توحید سے کسی طرح کم نہیں ۔ زرتشت کی زندگی کا بیشتر حصہ ساتویں صدی قبل مسیح میں بلخ میں گزرا ۔ وہ ایرانیوں کا پیغمبر تھا ۔ اس کا لایا ہوا مذہب کیانی (Achaemenian)

خاندان کے بادشاہوں سے لے کر ساسانی بادشاہوں کے اختتام تک چلا (میرے فاضل دوست مجنوں گورکھپوری نے بتایا کہ ایکیمینین کا صحیح ترجمہ ہنجامیشی[1] ہے مگر براؤن کی ایرانی تاریخ میں لکھا ہے کہ کیانی خاندان کیقباد سے شروع ہو کر دارا دوم تک چلا۔ جب سکندر نے دارا کو شکست دی تو اس خاندان کی حکومت ختم ہو گئی — اس کے پہلے کیانی بادشاہ گشتاسب کے زمانہ میں زرتشت نے آگ کی پرستش کو رائج کیا تھا۔ اے وی۔ ڈبلو جیکسن نے زرتشت کی ولادت کا سال 660. ق م اور وفات کا سال 583 ق م بتایا ہے۔ کچھ اور ماہرین کا خیال ہے کہ وہ دسویں صدی قبل مسیح میں ہوا ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ جس زبان میں اوستا لکھی گئی اسے زند کہتے ہیں۔ ول ڈیوراں اوستا کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ ان کتابوں کا مجموعہ ہے جن میں زرتشت کے اقوال کو اس کے ماننے والوں نے جمع کیا تھا۔ زند، اوستا کی شرحوں کو کہتے تھے۔ چیمبرس ڈکشنری میں زند کے دو معنی دیئے ہیں۔ وہ زبان جس میں اوستا لکھی گئی (2) جب اوستا کے پہلے زند لکھیں گے تو زند اوستا سے وہ اوستا مراد ہو گی جس میں اوستا کی شرح بھی شامل ہو۔

ول ڈیوراں نے "ہمارا قدیم ورثہ" میں زرتشتی مذہب کے بارے میں لکھا ہے کہ زرتشت نے ان تمام دیوتاؤں کی پوجا کو ممنوع قرار دیا جنہیں ایرانی پوجتے تھے اور صرف ایک خدا کو قابل عبادت ٹھہرایا جسے وہ اہورا مزدا (Ahura - Mazda) کہتے تھے۔ مرنے کے بعد اچھی روحیں پل پر سے گزر کر نعمتوں کے محلوں (Abodf of Song) میں پہنچ جائیں گی، جہاں جوان و خوبصورت لڑکیاں ان کا خیرمقدم کریں گی اور یہ نیک روحیں اہورا مزدا کے سایہ عافیت میں رہیں گی۔ بری روحیں پل سے گر کر جہنم کے غاروں میں جا پڑیں گی۔ جن لوگوں نے گناہوں کے ساتھ اچھے کام بھی کیے تھے وہ بارہ ہزار سال دوزخ میں رہیں گے، اس کے بعد انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ وہاں نہ بڑھاپا آئے گا نہ موت آئے گی۔ سب سے بڑا گناہ کفر ہے۔ مرتد موت کا سزاوار ہے۔ سب سے اہم فرض خدا کی عبادت ہے (ان عقائد کے پیش نظر زرتشتی مذہب کو الہامی مذہب کہنا نامناسب نہ ہو گا)۔

مگر زرتشت کے اہورا مزدا کی ماتحتی میں پارسیوں نے اور کئی دیوتاؤں کو ڈھونڈ نکالا۔ ول ڈیوراں لکھتا ہے کہ جیسے عیسائیت وحدت سے تثلیث میں تبدیل ہو گئی ویسے ہی ایران میں بھی وحدت کثرت میں تبدیل ہو گئی۔ اہرمن جو شیطانی قوتوں کا منبع تھا، سانپ، موذی جانوروں، حشرات الارض وغیرہ کا خالق سمجھا جانے لگا۔ سات دیو اہورا مزدا سے برسرِ پیکار رہنے لگے۔ وہ جنہیں نیکی کی طرف بلاتا یہ اسے گناہ کی طرف کھینچ لے جاتے۔

ساسانی بادشاہوں کے عہد (227ء تا 641ء) میں اوستا کا پہلوی زبان میں ترجمہ ہوا۔ عباسی خلیفہ مامون کے زمانے میں زرتشتی مذہب کے دفاع میں پہلوی زبان میں آتور فرنبگ

1- میں نے بھی اکثر کتابوں میں ہنجامیشی ہی پڑھا ہے اور یہ خاندان " کیانی خاندان " سے پہلے گزرا ہے۔ (ماہر القادری)

(Aturfarnbag) نے ایک کتاب دین کرت (Dinkart) لکھنی شروع کی۔ یہ 881ء میں یعنی مامون کے انتقال کے اڑتالیس سال بعد آتور پات نے مکمل کی۔ اس میں زرتشتی روایات، رسوم، تاریخ اور ادب کے متعلق مفید معلومات ہیں۔ یہ کتاب ایک لاکھ انہتر ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے کچھ قصوں کا انگریزی اور فرانسیسی میں ترجمہ ہوا ہے۔

نویں صدی میں ایک اور کتاب پہلوی زبان میں تصنیف کی گئی جس کا نام "شکند گو فانگ ویجار" (شکوک رفع کرنے والی تصریح) ہے۔ یہ کتاب مرتان فرخ (Martan Farukh) نے غالباً دین کثرت سے کچھ پہلے تصنیف کی تھی۔ اس میں دہریوں، مادہ پرستوں، یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں اور مانی کے پیروؤں کے نظریات پر زرتشتی مذہب کی فوقیت ثابت کی ہے۔ شکند کو بارہویں صدی کے اواخر میں نیریوسنگ (Neryosang) نے پاژند سنسکرت میں منتقل کیا۔ یہ نسخہ موجود ہے مگر پہلوی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔

پاژند دراصل پہلوی عبارت کو زند زبان کے رسم الخط میں لکھنے کا نام ہے۔ ایسا کرتے وقت عبارت سے ارمی الفاظ نکال کر ان کی جگہ ہم معنی پہلوی الفاظ رکھ دیتے ہیں۔ جو ایرانی ہندوستان کے مغربی ساحل پر آ کر بس گئے تھے، پارسی کے نام سے موسوم ہیں۔ جیسے ایرانیوں نے فارسی لکھنے کے لیے عربی رسم الخط اختیار کیا، پارسیوں نے بھی اپنی کتابوں کا رسم الخط عربی رکھا۔

مسلمانوں سے پہلے جو کتابیں پہلوی میں لکھی گئی تھیں ان میں سے دو اہم کتابیں دستیاب ہوئیں ہیں، ایک " کارنامک ارتکشتر پکان (Karnamak-I-Artakshatr-I-Papakan) اور دوسری "خدائے نامک ہے۔ "اول الذکر چھٹی صدی کی تصنیف ہے اور اس میں پاپک کے بیٹے اردشیر کے کارنامے درج ہیں۔ فردوسی نے "شاہنامہ" میں جو حالات اردشیر کے بیان کیے ہیں، وہ اسی کتاب سے لیے ہیں اور انہیں بالکل صحت کے ساتھ درج کیا ہے۔ خدائے نامک کا مصنف دہقان دانشور تھا، اس میں گیومرث سے لے کر ساسانی بادشاہ خسرو پرویز تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب یزدگرد سوم کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ آٹھویں صدی میں عبداللہ ابن مقفع نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "سیر الملوک العجم" رکھا۔ مسلمان مورخوں نے ایرانی تاریخ لکھنے میں اسی پر بھروسہ کیا ہے۔ اب خدائے نامک نہ پہلوی میں دستیاب ہے نہ عربی میں۔

ایران میں اسلام پھیل گیا تو ایرانیوں نے پہلوی کے بجائے عربی حروف تہجی اپنا لیے اور ان میں چار حروف پ، چ، ژ، اور گ کا اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے حلق سے نکلنے والے ثقیل حروف مثلاً ع، کا تلفظ بدل دیا۔ سارٹن کہتا ہے یہ صحیح نہیں کہ مسلمانوں کے ایران فتح کرنے

کے بعد پہلوی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ نویں صدی میں دین کرت اور شکندگو مانیک وبجار کی تصنیف کا ذکر کیا جا چکا ہے اور بارہویں صدی میں موخرالذکر کو پاژند۔ سنسکرت میں منتقل کرنے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جن ایرانیوں نے عربی سیکھ لی تھی، وہ بھی اپنے گھروں میں فارسی بولتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو عربی کی بالادستی کو مٹا کر اپنی زبان کو قومی زبان بنانا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے شعوبی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے بانیوں میں ابوعبیدہ (728ء سے 825ء تک) تھا اور حامیوں میں حمزہ ابن الحسن الاصفہانی جو دسویں صدی کے دوسرے نصف میں بغداد میں موجود تھا، سرگرم شعوبی تھے۔ شعوبی تحریک کے بارے میں سارٹن نے ڈی۔ بی میکڈونلڈ کے حوالے سے لکھا ہے کہ تحریک کے بانی ایرانیوں کو شعوبی کہتے ہیں اور اس نام پر سورۃ الحجرات کی تیرہویں آیت سے استدلال کرتے تھے جس میں لفظ شعوب آیا ہے:

وجعلنا کم شعوباً و قبائل لتعار فوا ط

(اور ہم نے تمہارے شعوب (گروہ) اور قبائل بنا دیئے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)۔

تحریک کے بانی کہتے تھے کہ اس آیت میں قبائل سے مراد اہل عربی ہیں اور شعوب سے اہل عجم چنانچہ انہوں نے اس نام سے اہل عجم کی بالادستی کے لیے شعوبی تحریک اٹھائی اور زور دیا کہ عربی کو چھوڑ کر فارسی کو قومی و علمی زبان بنایا جائے۔ اس تحریک کی الاصمعی، ابن درید اور زمخشری وغیرہ نے مخالفت و مذمت کی مگر ایرانی اپنے آپ کو عربوں سے زیادہ مہذب سمجھتے تھے۔ چنانچہ البیرونی ایسا بالغ نظر حکیم بھی عربوں کی بالادستی سے بیزار تھا اور ایرانی تہذیب کو دوبارہ رائج کرنے کا متمنی تھا۔ فردوسی نے شاہنامہ میں جس حقارت سے عربوں کا ذکر کیا ہے وہ متعصب ایرانیوں کے جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ شعوبی تحریک ایرانیوں کے دل کی آواز تھی۔ رفتہ رفتہ علمی کتابیں فارسی میں لکھی جانے لگیں۔

چنانچہ ابومنصور موفق نے 968ء اور 977ء کے درمیان دواؤں پر فارسی میں "کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ" تصنیف کی۔ یہ جدید فارسی میں نثر کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ پھر جب فردوسی نے نظم میں "شاہنامہ" کے نام سے قومی تاریخ لکھی اور اسے پچیس سال کی محنت کے بعد 1010ء میں مکمل کیا تو ایرانی فخر سے کہنے لگے کہ ان کی زبان عربی سے کسی طرح کم تر نہیں۔ اس کے بعد گیارہویں صدی میں بہت سی اہم کتابیں فارسی میں لکھی گئیں مثلاً ناصر خسرو کا سفر نامہ، امراض چشم پر زریں وست کی "نور العین" نظام الملک کا "سیاست نامہ" اور اسدی طوسی کی "لغت فرس"۔ اس طرح فارسی زبان کی عمارت مضبوط بنیاد پر کھڑی ہو گئی اور مشرق میں اس کی وسعت بڑھتی گئی۔ چنانچہ غزنوی فرمانرواؤں نے اسے دہلی تک پہنچا دیا۔ بعد میں فارسی شمالی ہندوستان کی ایک اہم زبان بن گئی

اور اس نے ہندی پر اثر انداز ہو کر اردو کو جنم دیا۔

1258ء میں ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد اس کے دارالسلطنت مراغہ میں اس کے وزیر ناصرالدین طوسی نے بہت بڑی رصد گاہ قائم کی جس میں مختلف مقامات سے بلا کر سائنس دانوں کو جمع کیا۔ یہاں فارسی ایک علمی زبان کی حیثیت سے پھولی پھلی۔ چونکہ چین میں بھی منگول حکومت قائم تھی اور انجینئر اور ٹیکنیشن (Technicians) مثلاً جمال الدین جس کا چینی نام چامالی ٹنگ (Cha-Ma-Li-Ting) ہو گیا، ایران سے چین بھیجے جاتے تھے، اس طرح فارسی چین پہنچی۔ ابن بطوطہ نے جو چودہویں صدی کے نصف اول میں چین گیا تھا، لکھا ہے کہ جب اس نے قرطائی کے بیٹے کے ساتھ کشتی پر سیر کی تو قرطائی کے بیٹے نے ابن بطوطہ سے کہا کہ اسے فارسی زبان بہت پسند ہے۔ چینی امراء میں قرطائی سب سے بڑا ہوتا تھا۔ اس نے ابن بطوطہ کے اعزاز میں بہت بڑی دعوت کی تھی اور ابن بطوطہ کو سیر کرانے کی غرض سے اپنے بیٹے کو اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ جس کشتی پر ابن بطوطہ اور قرطائی کا بیٹا سوار تھا اس کے علاوہ اور بھی کشتیاں تھیں۔ دوسری کشتیوں میں مغنی فارسی و عربی اشعار گا رہے تھے۔ جب فارسی اشعار گائے جاتے تو امیر زادہ ان کی داد دیتا۔

غرناطہ کے ابوحیان (1256ء تا 1344ء) نے فارسی کی گرامر لکھی جو اب دستیاب نہیں۔ السلطانی نے جو پنجاب میں رہتا تھا 1317ء میں فارسی میں قرآنی اصطلاحات کی تشریح میں ایک کتاب تصنیف کی۔ فارسی بولنے والوں کے علاقوں میں اور زبانیں بولنے والے بھی آباد تھے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ایسی ڈکشنریاں مرتب کی جائیں جن میں کئی زبانوں کے ہم معنی الفاظ جمع کیے جائیں۔ چنانچہ یونانی، سریانی، عربی، فارسی الفاظ پر مشتمل ڈکشنریاں مرتب کی گئیں جو نسطوریوں کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ اب یہ ڈکشنریاں ناپید ہیں مگر سولومن بن سمویل کی مرتبہ عبرانی، فارسی ڈکشنری آج بھی موجود ہے۔ رشیدالدین البناکتی اور حمداللہ مستوفی کی تصانیف سے ان کی متعدد زبانوں سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ رشید الدین اور البناکتی کی تصانیف میں منگول، ترکی اور چینی الفاظ کی بڑی تعداد ملتی ہے۔ حمداللہ کی فارسی تصانیف میں جانوروں کے نام فارسی کے علاوہ عربی، ترکی اور منگولی زبانوں میں بھی دیئے گئے ہیں۔ النخشبی نے سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ نخشب، جسے عربی میں نسف کہتے ہیں، بخارا اور سمرقند کے درمیان واقع ہے۔ نخشبی ہندوستان آیا اور کچھ عرصہ صوبہ متحدہ کے شہر بدایوں میں رہا۔ اس کی کتابوں میں سے ایک کا نام "طوطی نامہ" ہے۔ یہ سنسکرت کی کتاب "سکسپتتی (Sukasasptati) یعنی طوطے کی ستر کہانیوں کا ترجمہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانی نے "شعر العجم" کے حصہ اول میں لکھا ہے:

"عجب بات ہے کہ یورپ نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ اعتنا

کیا۔ مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا۔ لیکن یورپ نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کر لیا کہ زرتشت سے لے کر نوشیرواں کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہو گئی۔ پروفیسر دارمستیٹر جرمنی نے فرنچ زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں گیومرث سے لے کر اسلام کے عہد تک چار دور قائم کیے اور ہر دور کی زبان کی نحو و صرف لغات، الفاظ و تغیرات پر مفصّل ریویو لکھا.... یورپ کے اور محققین نے خاص خاص زبانوں پر مستقل تصنیفات کیں۔ خصوصاً اوستا اور ژند کی زبان کے متعلق اس قدر کثرت سے معلومات مہیا کیں کہ نکتہ نکتہ حل ہو گیا۔ پروفیسر نولدیکی نے خاص شہنامہ کے تاریخی ماخذوں پر ایک مستقل کتاب جرمنی زبان میں لکھی۔ سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب پروفیسر براؤن نے لکھی۔ ان کوششوں کے علاوہ قدیم فارسی زبان کو اصل کتابیں بہم پہنچائیں اور چھاپ کر شائع کیں۔ آج مسلمانوں کے پاس پہلوی زبان کا ایک حرف موجود نہیں، لیکن یورپ نے پہلوی زبان کی بہت سی تصنیفات شائع کیں جن میں سے ایک کتاب یات زریراں حضرت عیسیٰ سے پانچ سو برس قبل کی تصنیف ہے۔"

مولانا شبلی کے مندرجہ بالا بیان کی تائید بڑی حد تک ان معلومات سے ہوتی ہے جو جارج سارٹن نے فارسی علم اللسان کے بارے میں فراہم کی ہیں۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح نہ ہو کہ یورپ نے اسلام سے پہلے لکھی ہوئی پہلوی تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ سارٹن نے ایسی چند کتابوں ہی کے نام لیے ہیں۔ اگر اور بہت سی پہلوی تصنیفات مل گئی ہوتیں تو سارٹن ضرور ان کے بارے میں لکھتا۔ سارٹن نے لکھا ہے کہ خسرو اول یعنی نوشیرواں عادل کا عہد حکومت جو 531ء سے 579ء تک رہا، پہلوی زبان کا عہد زریں تھا جس میں بہت سی یونانی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ ان کتابوں میں سے اس نے صرف "کلیلہ و دمنہ" کا ذکر کیا ہے جس کا مؤلف نوشیرواں کا طبیب برزویہ تھا۔ نوشیرواں نے اسے ہندوستان اس لیے بھیجا تھا کہ وہاں کے علم طب کے بارے معلومات فراہم کرے۔ وہ ہندوستان سے طب کی کتابوں کے علاوہ کچھ اور بھی تحفے لایا، جن میں شطرنج کا کھیل اور بدپئی کے افسانے تھے۔ برزویہ نے افسانوں کا پہلوی میں ترجمہ کیا، پہلوی سے ابن المقفع نے عربی ترجمہ کر کے اپنی کتاب کا نام "کلیلہ و دمنہ" رکھا۔ کلیلہ و دمنہ عربی نثر کی سب سے پرانی کتابوں میں سے ہیں۔

مولانا شبلی نے ایران کی شاعری کے بارے میں فرمایا ہے کہ "تمام دنیا کی شاعری ایک

طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف"۔ اس مبالغے میں بھی وہی فیاضانہ شان اور دریادلی نمایاں ہے جو اس ارشاد میں ہے کہ یورپ نے پہلوی زبان کی کتابوں کا بہت بڑا سرمایہ فراہم کر لیا۔

ترکی لسانیات

ترک آغاز اسلام سے قبل وسط ایشیا میں پائے جاتے تھے۔ 568ء میں بازنطینی شہنشاہ جسٹینوس دوم نے اپنے سفیر زمرکوس (Zemarchos) کو قسطنطنیہ اور کریمیا کے راستے سمرقند اس غرض سے بھیجا تھا کہ ترکوں کے خان اور ایرانیوں سے معاہدہ کیا جائے۔ ایران نے بازنطینی حکومت کے ساتھ ریشم کی تجارت بند کر دی تھی۔ بازنطینی شہنشاہ چاہتا تھا کہ ایران پر دباؤ ڈال کر اسے پھر جاری کیا جائے۔ اس کے کچھ عرصے بعد جیتا گپتا نامی ایک ہندوستانی ترکوں کے خان توپو (To - po) اور اس کے جانشین کے پاس 575ء سے 585ء تک مقیم رہا۔ یہ بدھ مت کی تبلیغ کی غرض سے وہاں گیا تھا۔ وہ سنسکرت کی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ اس کے اثر سے ترکوں میں بدھ مذہب پھیلا۔ جیتا گپتا بعد میں چین گیا۔ چین کے شہنشاہ نے اس امید پر کہ ترک اس کا مذہب اختیار کرلیں، بدھ مذہب کی ایک کتاب کا ترکی میں ترجمہ کروا کر ترکوں کے خان کو بھیجا۔

ترکوں کا ایک قبیلہ جو یوای غور (Uighur) کہلاتا تھا مشرقی ترکستان میں آباد ہو گیا تھا۔ ان کا دارالحکومت طورخان تھا۔ وہ مانی کے مذہب کے پیرو تھے۔ ترکی زبان میں اس مذہب کی کتابوں میں Khuastuanift یعنی اعتراف عقیدہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ کتابیں 1907ء اور 1908ء میں دستیاب ہوئیں ہیں۔ اس قبیلے کی ثقافت مشرقی ترکستان میں آٹھویں سے بارہویں صدی تک رائج رہی۔ اس عرصے میں ترکوں نے بدھ مت اختیار کر لیا تھا اور اس مذہب کی کئی کتابوں کے کئی سوتر (Sutra) چینی و تبتی زبانوں سے ترکی میں منتقل کیے جا چکے تھے۔ بہت سے ترکوں نے اسلامی اور نسطوری اثرات بھی قبول کر لیے تھے۔ تن ہوانگ (Tun - Huang) کے غاروں سے جو کتابیں نکلی ہیں وہ تبتی، سنسکرت، صغدی، مشرقی، ایرانی، ترکی اور عبرانی میں لکھی ہوئی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکوں پر اثرانداز ہونے کی کئی قومیں کوشش کر رہی تیں۔ ایک نظم کدتکوبلک (Kudatku Bilik) جو بغراخاں کے حاجب یوسف نے کہی تھی اور جس کے معنی ہیں وہ علم جس سے خوشی میسر ہوتی ہے، اسلامی اثر کا بین ثبوت ہے۔ یہ 1069-70ء میں کہی گئی تھی۔ اس کے چند سال بعد محمود کاشغری نے "دیوان لغت الترک" 1073-74ء میں شائع کیا۔ یہ مشرقی ترکی زبان کی فرہنگ ہے۔ اس میں گرامر سے بھی بحث کی ہے اور ترکوں کی مختلف بولیوں کا موازنہ بھی کیا ہے۔ 1900ء میں کدتکوبلک کا روسی میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب اصول حکومت پر ہے اور شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد ہے۔

جس رسم الخط کو یوای غور رسم الخط کہتے ہیں وہ مانی کے ایجاد کردہ رسم الخط پر مبنی ہے اور مانی کا رسم الخط سریانی پر مبنی تھا۔ مانی غالباً ہمدان میں 16-215ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ایک مذہب ایجاد کیا تھا جس میں پچھلے تمام مذاہب کے عقائد کا کچھ امتزاج تھا مگر زیادہ تر غناسطی اور مزو کے عقائد پر اس کی بنیاد تھی۔ وہ ہرمیز 'افلاطون 'بدھ 'زرتشت اور حضرت عیسیٰ کو نبی مانتا تھا اور اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ کا داعی کہتا تھا۔ وہ ثنویت کا قائل تھا جس میں روشنی و تاریکی دونوں ساتھ ساتھ کارفرما ہیں۔ اس نے اپنے مذہب کی تصریح میں چھ کتابیں سریانی میں اور ایک پہلوی میں لکھی جس کا نام "شیرقان" یا "شاہ پہرکان" تھا۔ یہ سب اس کے ایجاد کردہ رسم الخط میں لکھی گئی تھیں۔ اصل کتابیں ناپید ہیں مگر ان کے کچھ اقتباسات دوسری کتابوں میں ملتے ہیں۔ بہرام اول نے مانی کو 276ء میں قتل کرا دیا۔ کم و بیش ہزار سال تک یہودیوں 'عیسائیوں اور مسلمانوں پر اس کی تعلیمات اثر انداز ہوتی رہیں اور اس کا مذہب مشرق و مغرب کے درمیان ربط کا ایک ذریعہ بن گیا۔ سینٹ آگسٹائن جو پانچویں صدی کے نصف اول میں ہوا ہے کئی سال تک اس مذہب کا پیرو رہا۔ ابن الندیم نے جو دسویں صدی میں ہوا ہے اپنی کتاب "الفہرست" میں لکھا ہے کہ صرف بغداد میں تین سو آدمی اس مذہب کے پیرو تھے۔ البیرونی نے گیارہویں صدی میں لکھا ہے کہ بہت سے مشرقی ترک 'چین اور تبت کے لوگ اور کچھ ہند و مانی کے عقائد اور شریعت کے تابع تھے۔ وسط ایشیا میں مانی کا اثر سب سے زیادہ تھا۔

ترکی زبان و ادب کے ارتقاء کا پہلا عروج گیارہویں صدی میں ہوا اور دوسرا چودھویں میں۔ تیرہویں صدی میں 46-245ء میں ایک عربی 'ترکی فرہنگ مرتب کی گئی۔ اس کے بعد فارسی 'ترکی 'منگول فرہنگ تصنیف ہوئی۔ 1313ء میں غرناطہ کے ابوحیان نے عربی میں ترکی زبان کی گرامر لکھی۔ ابوحیان کئی زبانیں جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے عربی 'فارسی 'ترکی 'حبشی زبان کی گرامریں تصنیف کیں۔ ابوحیان نے قاہرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں مملوک ترکوں کی حکومت تھی۔ چنانچہ اس نے ترکی زبان پر خاص توجہ دی اور اس پر پانچ کتابیں تصنیف کیں۔ ایک میں صرف فعل سے بحث کی 'دوسری میں ترکی زبان پر بحیثیت مجموعی اظہار خیال کیا 'تیسری میں علم نحو پر لکھا اور چوتھی میں ترکی کی بود و باش کا ذکر کیا۔ یہ چاروں کتابیں ناپید ہیں۔ پانچویں "کتاب الادراک فی لسان الاتراک" خوش قسمتی سے پائی جاتی ہے۔ گو اس سے پہلے کی لکھی ہوئی فرہنگوں میں ترکی زبان کی گرامر سے تھوڑی بہت بحث کی گئی تھی 'مگر صرف و نحو کے اصولوں کو باقاعدگی اور وضاحت سے بیان کرنے کی حیثیت سے یہ سب سے پہلی ترکی گرامر ہے۔ یہ عربی گرامر کے نمونہ پر مرتب کی گئی ہے۔ زیر بحث زبان مشرقی ترکی ہے جو مصر میں ذرا بگڑی ہوئی صورت میں بولی جاتی ہے۔ ابوحیان نے اس زبان کو قپچاقی (Qipcaqi) اور ترکمانی اور دوسری ترکی زبانوں سے ممیز کیا ہے 'الفاظ کی ساخت اور ان کی آوازوں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

ابوحیان سے ترکی گرامر کی ایک اور کتاب "القوانین الکلیہ فی ضبط اللغۃ الترکیہ" بھی منسوب کی جاتی ہے 'لیکن یہ بعد کی تصنیف ہے۔ ابوحیان کا انتقال 1344ء میں ہو چکا تھا مگر اس میں تیمورلنگ کے ہاتھوں 1400ء میں دمشق کی تباہی کا حال بھی درج ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی اور کی تصنیف ہے۔

ایک اور گرامر کی کتاب کے تین نسخے بوڈلین (Bodleian) میں 'ایک برلین اور ایک پیرس میں موجود ہے۔ اس کا نام "کتاب حیات الانسان و جنۃ اللسان" ہے۔ ان پانچوں نسخوں پر مصنف کا نام نہیں پایا جاتا لیکن چھٹے نسخے پر جو استنبول میں ہے 'مصنف کا نام جمال الدین ابن مہنا درج ہے۔ یہ غالباً تیرہویں صدی کے اواخر یا چودھویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کی 1903ء میں "Platon Mikhailovich Melioraski" نے تدوین کر کے شائع کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ استنبول میں دستیاب ہوا ہے جسے اپنے دیباچہ کے ساتھ کلیسی مہد رفت (Kilisi Mehmed Rifat) نے 22-1919ء میں استنبول میں شائع کیا (مہد رفت سے مراد شاید محمد رفعت ہو۔ اتاترک کے حکم سے عربی ناموں کو ترکی بنا دیا گیا تھا)۔

"القوانین الکلیہ" کو کوپرولوزادہ محمد فواد بے نے تدوین کر کے 1928ء میں استنبول میں شائع کیا۔ سارٹن کہتا ہے کہ ترکی ناموں کے جدید طریقے کے لحاظ سے اب محمد فواد بے کا نام مہد فوامت کوپرولو لکھا جائے گا۔

جمال الدین ابو محمد عبداللہ الترکی نے مملوکی عہد میں "کتاب بلغۃ المشتاق فی اللغۃ الترک و القفجاق" تصنیف کی تھی۔ یہ 39-1938ء میں Wski Ananiasz Zajacko کی تدوین کے بعد وارسا (Warsaw) سے شائع کی گئی۔ اس لغت میں الفاظ حروف تہجی کے بجائے معانی کے لحاظ سے دیئے گئے ہیں۔ محمود الکاشغری کی تصنیف "دیوان لغت الترک" 17-1915ء میں استنبول سے شائع ہوئی۔

ابوحیان کی اور تصانیف کا ذکر اس کے حالات کے ساتھ کیا جائے گا۔

مغربی ترکی زبان کا پہلا نمونہ "رباب نامہ" ہے جسے جلال الدین رومی کے بیٹے بہاؤالدین سلطان ولد نے 1301ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے بعد عاشق پاشا نے "غریب نامہ" اور یونس امری اور گلشیری نے ترکی میں نظمیں لکھیں جن کا موضوع تصوف ہے۔ گلشیری نے فرید الدین عطار کی

"منطق الطیر" کا فارسی سے ترکی میں ترجمہ کیا۔ سلطان ولد، عاشق پاشا اور گلشیری قرامان کے اور یونس اسفندیار کا رہنے والا تھا۔

کومن (Coman) زبان ترکی کی ایک بولی ہے۔ تیرہویں صدی میں زریں اردو (Golden Horde) کے تاتاریوں نے باتو (Batu) کی سرکردگی میں جنوبی اور وسطی روس میں ایک سلطنت قائم کی اور دریائے والگا پر اپنا دارالسلطنت سرائے (Sarai) بنایا۔ یہ تاتاری کومن زبان بولتے تھے اب بھی اس کی ایک ضمنی قسم کازان کے تاتاری بولتے ہیں۔ اٹلی کے شہر جینیا (Genoa) کی تجارت بحر نبطس (Black Sea) کے سواحل پر پھیلی ہوئی تھی اور کچھ تاجر کریمیا، روس اور ایران تک پہنچتے تھے۔ انہیں کومن، روسی اور ایرانی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ 1303ء میں ایک اطالوی باشندے نے لاطینی، فارسی اور کومن لغت (Codex Cumanicus) تیار کی۔ یہ لغت وینس کے کتب خانے میں واپس آ گئی۔ یہ لغت صرف بیاسی اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں گرامر کے اصولوں کے علاوہ مسالوں، جڑی بوٹیوں، دھاتوں، قیمتی پتھروں، ہتھیاروں، پیڑوں، پھلوں، ترکاریوں، جانوروں اور چڑیوں وغیرہ کے نام بھی درج کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں جو بعد میں شامل کیا گیا فارسی کے بجائے جرمن الفاظ شامل کیے گئے۔ اس کے یورپ میں کئی ایڈیشن چھاپے گئے۔ اس کے باوجود کہ منگول ایشیا اور یورپ کے بہت بڑے علاقوں پر حملہ آور ہوئے، منگولی بولیوں کے مقابلے میں ترکی بولیوں نے زیادہ وسعت پائی۔ ترکی بولیاں بولنے والے منگولی بولنے والوں کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہیں۔

عربی، فارسی اور ترکی کے ارتقا کے بیان کے بعد اب ان زبانوں کو ترقی دینے والوں کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔ جہاں کسی فارسی یا ترکی تصنیف کا نام آئے گا تو واضح طور پر بتا دیا جائے گا کہ فارسی یا ترکی میں لکھی گئی ہے۔

ابوالاسود الدؤلی۔ بصرہ میں رہتا تھا۔ پچاسی برس کی عمر میں اس کا انتقال غالباً 89-688ء میں ہوا۔ عربی گرامر کی ایجاد اس سے منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی نے اسے عربی گرامر لکھنے کی تلقین کی۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ حضرت علی نے ابوالاسود کو بتایا کہ اجزائے کلام تین ہیں یعنی اسم، فعل اور حرف۔ انہی پر گرامر کی عمارت کھڑی کرو۔ ارسطو بھی اسم، فعل اور حرف کو اجزائے کلام سمجھتا تھا۔ جس طرح یونانی گرامر نے ایتھنز (Athens) کے بجائے مصر کے شہر اسکندریہ میں جنم لیا، ویسے ہی عرب کے بجائے عراق کے شہر بصرہ اور کوفہ میں عربی گرامر پیدا ہوئی۔ اہل زبان کو گرامر کی ضرورت نہیں ہوتی، جو آغوش مادر میں سیکھتے ہیں وہی بولتے ہیں۔ عراق میں فارسی اور سریانی بولنے والے بھی تھے اور انہیں عربی سیکھنے کے لیے اس کے قواعد معلوم کرنے ضروری

تھے۔ چنانچہ بصرہ اور کوفہ میں اس ضرورت کو پورا کیا گیا۔

ابو محمد الحجاج ابن یوسف۔ اموی خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں عراق کا گورنر تھا۔ اس کی دلچسپی اور اثر کی وجہ سے بصرہ میں قواعد زبان سکھانے کا مدرسہ قائم ہوا۔ قرآن کے حروف پر نقطے اور اعراب نہ ہونے کی وجہ سے اسے غیر عرب پڑھنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ حجاج نے حروف کے اوپر نیچے نقطے لگوائے اور اعراب ایجاد کیے یا کروائے۔ اس کا یہ کارنامہ بہت اہم ہے۔ حجاج 714ء میں ترپن برس کی عمر میں فوت ہوا۔

عبداللہ ابن المقفع کا ایرانی نام روزبہ تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا مگر زرتشتی اثر باقی رہا۔ نسلاً وہ ایرانی تھا، بصرہ میں رہتا تھا۔ 58-757ء میں قتل کیا گیا۔ اس نے پہلوی سے عربی میں منطق، طب اور تاریخ کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ پہلوی کتاب "خدائے نامک" یعنی بادشاہوں کی کتاب کا اس نے ترجمہ کرکے "سیر ملوک العجم" نام رکھا۔ یہ کتاب اور "کلیلہ و دمنہ" اس کی شہرت کا باعث ہوئیں۔ نوشیروان عادل کے طبیب برزویہ نے بدپئی کی کہانیوں کا سنسکرت سے پہلوی میں 570ء میں ترجمہ کیا تھا۔ پہلوی سے ابن مقفع نے ترجمہ کرکے اپنی کتاب کا نام "کلیلہ و دمنہ" رکھا۔ بدپئی کا دوسرا نام پلپے (Pilpay) بھی بتایا جاتا ہے۔ اس نے کہانیوں کی یہ کتاب 300ء میں تصنیف کی تھی۔

"خدائے نامک" اور "سیر ملوک العجم" دونوں ناپید ہیں۔ کلیلہ و دمنہ 1816ء میں پیرس میں چھپی۔ اس کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ میں 1819ء میں اور جرمن ترجمہ Stuttgart میں 1837ء میں شائع ہوا اور دوسری بار ترجمہ 1839ء میں شائع ہوا۔

ابو عبیدہ معمر ابن المثنیٰ غلام تھا۔ وہ 728ء میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ وہیں رہا اور 825ء میں فوت ہوا۔ اس کے والدین یہودی النسل ایرانی تھے۔ وہ شعوبی تحریک کا، جس کا مقصد عربی کی بالادستی کو مٹانا تھا، زبردست حامی تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے تاریخ اور لسانیات پر کتابیں لکھیں جن سے ابوالفرج الاصفہانی اور ابن الاثیر نے استفادہ کیا۔ اب یہ کتابیں ناپید ہیں۔ ابن خلکان اور ابن ندیم نے ابو عبیدہ کی تصانیف کی طویل فہرست دی ہے۔

خلیل ابن احمد بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت غالباً 717ء ہے۔ وہ چوہتر سال کی عمر میں 92-791ء میں فوت ہوا۔ عربی لغت، صرف و نحو اور علم عروض کا ماہر تھا۔ علم عروض کو اسی نے ایجاد کیا۔ اس نے ایک لغت لکھنا شروع کیا تھا جسے مکمل نہ کر سکا۔ اس کے ایرانی شاگرد سیبویہ نے خلیل سے علم صرف و نحو حاصل کیا اور عربی کی سب سے پہلی گرامر "الکتاب" تصنیف کی۔ خلیل

"منطق الطیر" کا فارسی سے ترکی میں ترجمہ کیا۔ سلطان ولد، عاشق پاشا اور گلشیری قرامان کے اور یونس اسفندیار کا رہنے والا تھا۔

کومن (Coman) زبان ترکی کی ایک بولی ہے۔ تیرہویں صدی میں زریں اردو (Golden Horde) کے تاتاریوں نے باتو (Batu) کی سرکردگی میں جنوبی اور وسطی روس میں ایک سلطنت قائم کی اور دریائے والگا پر اپنا دارالسلطنت سرائے (Sarai) بنایا۔ یہ تاتاری کومن زبان بولتے تھے اب بھی اس کی ایک ضمنی قسم قازان کے تاتاری بولتے ہیں۔ اٹلی کے شہر جینا (Genoa) کی تجارت بحر نبطس (Black Sea) کے سواحل پر پھیلی ہوئی تھی اور کچھ تاجر کریمیا، روس اور ایران تک پہنچتے تھے۔ انہیں کومن، روسی اور ایرانی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ 1303ء میں ایک اطالوی باشندے نے لاطینی، فارسی اور کومن لغت (Codex Cumanicus) تیار کی۔ یہ لغت وینس کے کتب خانے میں واپس آ گئی۔ یہ لغت صرف بیاسی اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں گرامر کے اصولوں کے علاوہ مسالوں، جڑی بوٹیوں، دھاتوں، قیمتی پتھروں، ہتھیاروں، پیڑوں، پھلوں، ترکاریوں، جانوروں اور چڑیوں وغیرہ کے نام بھی درج کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں جو بعد میں شامل کیا گیا فارسی کے بجائے جرمن الفاظ شامل کیے گئے۔ اس کے یورپ میں کئی ایڈیشن چھاپے گئے۔ اس کے باوجود کہ منگول ایشیا اور یورپ کے بہت بڑے علاقوں پر حملہ آور ہوئے، منگولی بولیوں کے مقابلے میں ترکی بولیوں نے زیادہ وسعت پائی۔ ترکی بولیاں بولنے والے منگولی بولنے والوں کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہیں۔

عربی، فارسی اور ترکی کے ارتقا کے بیان کے بعد اب ان زبانوں کو ترقی دینے والوں کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔ جہاں کسی فارسی یا ترکی تصنیف کا نام آئے گا تو واضح طور پر بتا دیا جائے گا کہ فارسی یا ترکی میں لکھی گئی ہے۔

ابوالاسود الدؤلی۔ بصرہ میں رہتا تھا۔ پچاسی برس کی عمر میں اس کا انتقال غالباً 688-89ء میں ہوا۔ عربی گرامر کی ایجاد اس سے منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی نے اسے عربی گرامر لکھنے کی تلقین کی۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ حضرت علی نے ابوالاسود کو بتایا کہ اجزائے کلام تین ہیں یعنی اسم، فعل اور حرف۔ انہی پر گرامر کی عمارت کھڑی کرو۔ ارسطو بھی اسم، فعل اور حرف کو اجزائے کلام سمجھتا تھا۔ جس طرح یونانی گرامر نے ایتھنز (Athens) کے بجائے مصر کے شہر اسکندریہ میں جنم لیا، ویسے ہی عرب کے بجائے عراق کے شہر بصرہ اور کوفہ میں عربی گرامر پیدا ہوئی۔ اہل زبان کو گرامر کی ضرورت نہیں ہوتی، جو آغوش مادر میں سیکھتے ہیں وہی بولتے ہیں۔ عراق میں فارسی اور سریانی بولنے والے بھی تھے اور انہیں عربی سیکھنے کے لیے اس کے قواعد معلوم کرنے ضروری

تھے۔ چنانچہ بصرہ اور کوفہ میں اس ضرورت کو پورا کیا گیا۔

ابو محمد الحجاج ابن یوسف۔ اموی خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں عراق کا گورنر تھا۔ اس کی دلچسپی اور اثر کی وجہ سے بصرہ میں قواعد زبان سکھانے کا مدرسہ قائم ہوا۔ قرآن کے حروف پر نقطے اور اعراب نہ ہونے کی وجہ سے اسے غیر عرب پڑھنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ حجاج نے حروف کے اوپر نیچے نقطے لگوائے اور اعراب ایجاد کیے یا کروائے۔ اس کا یہ کارنامہ بہت اہم ہے۔ حجاج 714ء میں ترپن برس کی عمر میں فوت ہوا۔

عبداللہ ابن المقفع کا ایرانی نام روزبہ تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا مگر زرتشتی اثر باقی رہا۔ نسلاً وہ ایرانی تھا، بصرہ میں رہتا تھا۔ 757-58ء میں قتل کیا گیا۔ اس نے پہلوی سے عربی میں منطق، طب اور تاریخ کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ پہلوی کتاب "خدائے نامک" یعنی بادشاہوں کی کتاب کا اس نے ترجمہ کر کے "سیر ملوک العجم" نام رکھا۔ یہ کتاب اور "کلیلہ و دمنہ" اس کی شہرت کا باعث ہوئیں۔ نوشیروان عادل کے طبیب برزویہ نے بدپئی کی کہانیوں کا سنسکرت سے پہلوی میں 570ء میں ترجمہ کیا تھا۔ پہلوی سے ابن مقفع نے ترجمہ کر کے اپنی کتاب کا نام "کلیلہ و دمنہ" رکھا۔ بدپئی کا دوسرا نام پلپے (Pilpay) بھی بتایا جاتا ہے۔ اس نے کہانیوں کی یہ کتاب 300ء میں تصنیف کی تھی۔

"خدائے نامک" اور "سیر ملوک العجم" دونوں ناپید ہیں۔ کلیلہ و دمنہ 1816ء میں پیرس میں چھپی۔ اس کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ میں 1819ء میں اور جرمن ترجمہ Stuttgart میں 1837ء میں شائع ہوا اور دوسری بار ترجمہ 1839ء میں شائع ہوا۔

ابو عبیدہ معمر ابن المثنیٰ غلام تھا۔ وہ 728ء میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ وہیں رہا اور 825ء میں فوت ہوا۔ اس کے والدین یہودی النسل ایرانی تھے۔ وہ شعوبی تحریک کا، جس کا مقصد عربی کی بالادستی کو مٹانا تھا، زبردست حامی تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے تاریخ اور لسانیات پر کتابیں لکھیں جن سے ابوالفرج الاصفہانی اور ابن الاثیر نے استفادہ کیا۔ اب یہ کتابیں ناپید ہیں۔ ابن خلکان اور ابن ندیم نے ابو عبیدہ کی تصانیف کی طویل فہرست دی ہے۔

خلیل ابن احمد بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت غالباً 717ء ہے۔ وہ چوہتر سال کی عمر میں 791-92ء میں فوت ہوا۔ عربی لغت، صرف و نحو اور علم عروض کا ماہر تھا۔ علم عروض کو اسی نے ایجاد کیا۔ اس نے ایک لغت لکھنا شروع کیا تھا جسے مکمل نہ کر سکا۔ اس کے ایرانی شاگرد سیبویہ نے خلیل سے علم صرف و نحو حاصل کیا اور عربی کی سب سے پہلی گرامر "الکتاب" تصنیف کی۔ خلیل

کے انتقال کے تین چار سال بعد ہی سیبویہ نے وفات پائی ۔ گمان غالب یہ ہے کہ سیبویہ نے یہ گرامر اپنے استاد کی نگرانی میں مرتب کی ہوگی ۔ جو لغت خلیل نے لکھنا شروع کیا تھا اس کا نام " کتاب العین " تھا ۔ اس نے ایقاع (Rhythm) پر بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام " کتاب الایقاع " تھا ۔ یہ اب ناپید ہے ۔ خلیل عربی النسل تھا ۔

ابوالبشر (یا ابوالحسن) عمر ابن عثمان ابن قنبر کا نام سیبویہ تھا اور اسی نام سے وہ مشہور ہے ۔ وہ ایران کا رہنے والا تھا بتیس سال کی عمر میں وہ بصرہ آیا اور خلیل ابن احمد سے علم صرف و نحو حاصل کیا ۔ اس نے سب سے پہلی عربی گرامر لکھی جس کا نام " الکتاب " ہے ۔ یہ صرف و نحو پر ایک مکمل تصنیف ہے بعد میں اوروں نے کچھ اصطلاحات کا اضافہ کیا مگر نفس مضمون کے اعتبار سے کوئی قابل ذکر تبدیل نہیں کی گئی ۔ پیرس میں یہ کتاب 89-881ء میں چھپی اور برلین میں 1894-1900ء میں شائع ہوئی ۔

سیبویہ کچھ عرصہ بغداد میں بھی رہا ۔ وہاں سے شیراز چلا گیا جہاں چالیس سال کی عمر میں 795ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ سارٹن نے لکھا ہے کہ سیبویہ سے اس کا نام سیبویہہ (Sibawaihi) ہو گیا تھا ۔

ابو حنیفہ احمد ابن داؤد الدینوری کی ولادت 515ء اور 525ء کے درمیان عراق عجم کے مقام دینور میں ہوئی ۔ اپنے وطن کے علاوہ وہ اصفہان میں بھی رہا ۔ اس کا انتقال 895ء میں ہوا ' وہ فرہنگ نویس (Lexicographer) مورخ ' نباتی اور ہیئت داں تھا ۔ اس نے ایرانی نقطہ نظر سے ایک تاریخی کتاب لکھی جس کا نام " کتاب الاخبار الطوال " ہے ۔ نباتات پر اس کی تصنیف کا نام " کتاب النبات " ہے ۔ یہ اس نے دراصل لسانی نقطہ نظر سے لکھی تھی ' گو اپنے موضوع پر بھی یہ اہم کتاب ہے ۔ اس کتاب کا مقدمہ بہت خوب لکھا ہے ۔ " کتاب النبات " اب دستیاب نہیں مگر تین چار سو پودوں کا حال اس کتاب سے ابن سیدہ ' ابن البیطار وغیرہ نے اخذ کیا ہے وہ موجود ہے ۔

" کتاب الاخبار الطوال " 1888ء اور 1912ء میں لائیڈن (Leiden) سے شائع کی گئی ۔

ابو محمد عبداللہ ابن مسلم ابن قتیبہ الدینوری بغداد میں 29-828ء میں پیدا ہوا ۔ اس کے والدین ایرانی تھے ۔ اس کا 889ء میں بغداد میں انتقال ہوا ۔ وہ عالم لسانیات اور مورخ تھا ۔ اس سے پہلے بصرہ اور کوفہ علم صرف و نحو کے مرکز تھے ۔ اس نے بغداد میں اس علم کی ترویج کی ۔ اس کی دو کتابیں یعنی " کتاب الشعر و الشعراء " ا " کتاب ادب الکاتب " لسانیات سے متعلق ہیں ۔ اس میں علم ہجا

(Orthography) ' اسلوب بیان اور انتخاب الفاظ سے بحث کی ہے ۔ اس کی سب سے اہم تصنیف " عیون الاخبار " یعنی منتخب تواریخ ہے ۔ تاریخ پر اس کی ایک اور تصنیف " کتاب المعارف " ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے اپنے زمانے تک کے عام حالات بیان کیے ہیں ۔ اس نے علم التنجیم (Astrology) پر بھی دو کتابیں لکھی تھیں ۔

" عیون الاخبار " 1898ء میں لائیڈن سے شائع ہوئی ۔ اس سے پہلے 1850ء میں " کتاب المعارف " گیوٹنگن (Gottingen) سے شائع کی گئی تھی ۔ " کتاب الشعراء " 1904ء میں لائیڈن سے شائع ہوئی ۔ نولدیکی (Noldeke) نے اس کے مقدمہ کا جرمن ترجمہ ہنوور (Hannover) سے 1864ء میں شائع کیا ۔ " کتاب ادب الکاتب " لائیڈن سے 1900ء میں شائع ہوئی ۔ اس سے پہلے اس کا ایک اقتباس جرمن ترجمہ کے ساتھ 1877ء میں لائپزگ (Leipzig) سے شائع کیا گیا تھا ۔

ابو بکر محمد ابن الحسن ابن درید الازدی 38-837ء میں بصرہ میں پیدا ہوا ۔ وہ جنوبی عرب کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا وہ بصرہ اور عمان میں رہا ۔ 892ء میں وہ ایران چلا گیا جہاں 21-920ء تک رہا پھر بغداد چلا آیا ۔ بغداد ہی میں 933ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ وہ شاعر ' لغت نویس اور ماہر انساب (Genealogist) تھا ۔ اس نے عربی کا سب سے پہلا لغت " الجمہرہ فی اللغۃ " لکھا ۔ اس کی دوسری کتاب عرب قبیلوں کے انساب پہ ہے جس کا نام " کتاب الاشتقاق " ہے ۔ یہ اس نے شعوبی تحریک کے رد میں لکھی تھی ۔ اس نے ایک نظم جس کا نام " المقصورہ " ہے ' بھی کہی تھی جو بہت مشہور ہوئی ۔

کتاب الاشتقاق 854ء میں گیوٹنگن سے شائع ہوئی ۔ المقصورہ کئی بار یعنی 1773ء ' 1786 اور 1828ء میں لاطینی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ۔ ابن درید نے یہ نظم ایران میں قیام کے دوران کہی تھی ۔

ابوالفرج علی ابن الحسین ابن محمد ابن احمد القریشی الاصبہانی آخری اموی خلیفہ مروان کی اولاد میں سے تھا ۔ اس کا خاندان اصفہان میں بس گیا تھا ۔ وہ 98-897ء میں پیدا ہوا ۔ اس نے اپنی زندگی بغداد ' حلب اور رے میں گزاری ۔ وہ شاعر اور مورخ تھا ۔ اس کی تصنیف " کتاب الاغانی " عربی شاعری ' موسیقی اور آثار قدیمہ پر مشتمل ہے ۔ عرب قدیم کے مطالعہ کے لیے یہ ایک نہایت اہم تصنیف ہے ۔ ابن خلدون اسے عربوں کا رجسٹر کہا کرتا تھا ۔ ابوالفرج نے اپنی کئی کتابیں اسپین کے اموی حکمرانوں کے نام معنون کی تھیں ۔

کتاب الاغانی 1868ء میں بولاق میں بیس جلدوں میں چھپی ۔ ایک جلد 1888ء میں لائیڈن

سے شائع ہوئی ۔ کچھ حصے لاطینی ترجمے کے ساتھ Greifswaid میں 1840ء اور 1846ء میں شائع ہوئے، کچھ اور 1900ء میں لائیڈن میں چھپے۔

حمزہ ابن الحسن الاصفہانی ایران میں پیدا ہوا ۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ وہ مورخ اور علم صرف و نحو کا ماہر تھا ۔ وہ عربی کی بالادستی کو ماننے والی شعوبی تحریک کا پرجوش حامی تھا مگر اپنی کتابیں عربی ہی میں تصنیف کرتا تھا ۔ اس نے عربی کی گرامر پر ایک کتاب لکھی ۔ 961ء میں اس نے ایرانی ماخذوں پر مبنی ایک تاریخ لکھی جو لائپزگ میں 1844-48ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

ابو بکر محمد ابن عمر ابن عبدالعزیز ابن القوطیہ کے بزرگوں میں سے کسی نے ایک گاتھی (Gothic) شہزادی سے دمشق میں شادی کی تھی ۔ گاتھی کو قوطیہ کہتے ہیں ۔ اس شہزادی کی اولاد اور اولاد کی اولاد قوطیہ کہلائی ۔ دمشق سے یہ خاندان اسپین منتقل ہو گیا ۔ ابن القوطیہ قرطبہ میں پیدا ہوا ۔ سال ولادت معلوم نہیں ۔ وہ قرطبہ میں 977ء میں فوت ہوا ۔ اس نے فعل کی گردان (Conjugation) پر سب سے پہلی کتاب لکھی جس کا نام " کتاب تصریف الافعال " ہے ۔ اس کی دوسری تصنیف "تاریخ الاندلس " ہے جس میں اندلس کی فتح سے لے کر 893-94ء تک کے واقعات لکھے ہیں۔

"تاریخ الاندلس " 1899ء میں پیرس سے شائع ہوئی ۔ عربی کے متن کے ساتھ فرانسیسی ترجمہ بھی دیا گیا ہے ۔ لائیڈن میں 1894ء میں چھپی۔

ابوالقاسم اسمٰعیل ابن عباد ابن العباس الطالقانی کی ولادت اصطخر میں ہوئی یا طالقان میں ۔ پیدائش کے سال کے بارے میں بھی دو قول ہیں، ایک یہ کہ 936ء میں ہوئی دوسرا یہ کہ 938ء میں ہوئی ۔ وہ کئی بویہہ سلطانوں کا وزیر رہا ۔ اس نے ایک ضخیم لغت لکھا جس کا نام " کتاب المحیط " ہے ۔ ابن عباد ادب اور ادیبوں کی سرپرستی کرتا تھا۔

ابونصر اسمٰعیل ابن حماد الجوہری نسلاً ایرانی تھا مگر اس کی ولادت فاراب (ترکستان) میں ہوئی سال ولادت معلوم نہیں ۔ زبان کی تحقیق کے سلسلے میں وہ مدتوں سفر میں رہا ۔ بالآخر خراسان کے شہر نیشاپور میں سکونت اختیار کی اور وہیں 1001ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس نے حروف تہجی کے لحاظ سے ایک لغت مرتب کرنا شروع کیا جو ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا ۔ اس کے شاگرد ابواسحٰق ابراہیم ابن صالح الوراق (یعنی کتب فروش) نے اسے تکمیل کو پہونچایا ۔ اس کا نام " کتاب

الصحاح فی اللغتہ " ہے ۔ حروف تہجی کے لحاظ سے جو ترتیب دی تھی اس کا انحصار آخری بنیادی حروف (Last Radical Letters) پر تھا ۔ یہی ترتیب اس کے بعد لکھے جانے والے لغتوں میں رکھی گئی۔

1282ء میں یہ لغت بولاق میں چھپا ۔ اس کے کچھ حصے کا لاطینی میں ترجمہ ہوا اور عربی ۔ لاطینی لغت 1774ء میں شائع ہوا ۔ ابوالفتح عثمان ابن جنی الموصلی ایک یونانی غلام کا بیٹا تھا ۔ وہ 941-42ء میں موصل میں پیدا ہوا، اور موصل و بغداد میں رہا ۔ 1002ء میں اس کا بغداد میں انتقال ہوا ۔ اس نے اپنی کئی تصانیف میں علم اللسان کا فلسفیانہ نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے ۔ اس کی کتاب " مختصر التصریف الملوکی " لائپزگ میں 1885ء میں عربی و لاطینی میں شائع ہوئی ۔ اس کتاب کا نام " جمل اصول التصریف " بھی ہے۔

ابومنصور موفق ابن الہردی ایرانی ماہر دوا سازی (Pharmacologist) تھا ۔ موفق کو سارٹن نے کہیں " ق " سے لکھا ہے اور کہیں " ک " سے ۔ اس کا سال ولادت اور سال وفات معلوم نہیں ۔ وہ سامانی سلطان منصور اول ابن نوح (961ء تا 976ء) کے زمانے میں ہرات میں تھا ۔ اس کا ذکر ہو چکا ہے ۔ علم اللسان میں اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے علمی فارسی نثر کی سب سے پہلی کتاب لکھی جس کا نام " کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ " ہے ۔ اس کتاب نے دراصل فارسی علم اللسان کو ایک مستحکم بنیاد فراہم کی اور اہل ایران فارسی میں علمی کتابیں لکھنے پر مائل ہوئے۔

ابوالقاسم فردوسی کا سال ولادت غالباً 932ء ہے، وہ خراسان کے شہر طوس میں پیدا ہوا اور وہیں مرا ۔ وہ ایران کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔ اس نے 975ء میں "شاہنامہ " لکھنا شروع کیا اور 1010ء میں مکمل کیا ۔ یہ ساٹھ ہزار اشعار میں ایران کی تاریخ ہے ۔ فارسی کو سمجھنے کے لیے شاہنامہ کا مطالعہ ایسا ہی ضروری ہے جیسا یونانی کو سمجھنے کے لیے ہومر کی ایلیڈ (Iliad) کا یا اطالوی کو سمجھنے کے لیے دانتے کی ڈوائن کمیڈی (Divine Comedy) کا مطالعہ ضروری ہے۔

فارسی نثر میں موفق کی کتاب الابنیہ اور نظم میں فردوسی کا شاہنامہ وجود میں آجانے کے بعد ایرانی فخر سے سر اٹھا کر اپنی زبان کو عربی کے ہم مرتبہ ہونے کا دعویٰ کرنے لگے ۔ ان دو کتابوں کی فارسی زبان میں بنیادی حیثیت ہے۔

مولانا شبلی نعمانی بھی " شعر العجم " حصہ اوّل میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "ایران میں اس درجہ کا کوئی شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا ۔ فردوسی نے اس تعصب کی وجہ سے جو اسے عربوں اور عربی سے تھا، شاہنامہ کو خالص فارسی میں لکھنے کی کوشش کی ہے " ۔ مولانا شبلی کہتے ہیں کہ "شیخ بوعلی سینا نے

حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ فردوسی کی قدرت زبان دیکھو کہ ساٹھ ہزار شعر لکھ کر ڈال دیئے اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ عربی کے جو الفاظ خال خال آئے ہیں، اکثر وہ ہیں جو خاص مصطلح الفاظ ہیں، مثلاً دین، میمنہ، میسرہ، قلب، سلاح، عناں وغیرہ وغیرہ۔ یہ الفاظ اس طرح اس زبان میں شائع تھے جس طرح آج کل اردو میں جج، کلکٹر، ٹکٹ، اسٹیشن وغیرہ ہیں کہ ان کے بجائے اگر کوئی شخص اور لفظ استعمال کرے تو ناموزوں معلوم ہوں گے۔"

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ "حالانکہ مسلمانوں کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے فردوسی نے نہایت حقارت سے ان کو یاد کیا ہے، پھر بھی خراسان سے لے کر بغداد تک در و دیوار سے شاہنامہ کی صدا آنے لگی۔ تقریر و تحریر، تصنیف و تالیف "خلوت و جلوت، کوچہ و بازار اس کی آواز کی بازگشت سے گونج اٹھتے "عربوں کی تحقیر کے سلسلے میں، جو اسلام ایسی بے بہا نعمت لے کر ایران پہنچے تھے، مولانا شبلی نے فردوسی کے دو شعر نقل کیے ہیں۔

عرب را بجائے رسید است کار — زشیر شتر خوردن و سوسمار
کہ تخت کیاں را کنندہ آرزو — تفوبر تو اے چرخ گرداں تفو

ترجمہ (اونٹ کا دودھ اور سوسمار یعنی گوہ کھاتے کھاتے عربوں کو وہ مقام حاصل ہوگیا کہ تخت کیانی کی آرزو کرنے لگے۔ تف ہے، اے چرخ گرداں تجھ پر تف ہے)۔

شاہنامہ کا مکمل متن چار جلدوں میں 1829ء میں مسٹر ٹرنر میکن (Turner Macan) نے چھاپا۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ چھ جلدوں میں 68-1838ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ مختصر ترجمہ لندن سے 1832ء میں شائع ہوا۔ مکمل انگریزی ترجمہ آٹھ جلدوں میں 23-1905ء میں لندن میں چھپا۔ 1882ء میں کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کیا گیا۔ مختصر جرمن ترجمے 1877ء میں اشٹٹ گارٹ (Stuttgart) میں اور 1890ء میں برلین میں چھپے۔ آٹھ جلدوں میں اطالوی ترجمہ 89-1886ء ٹورینو (Torino) سے شائع ہوا۔

ابو بکر احمد ابن علی ابن ثابت الخطیب البغدادی 1002ء میں ورزنجان میں پیدا ہوا۔ بہت کچھ سیر و سیاحت کے بعد اس نے بغداد میں سکونت اختیار کی اور وہیں اس کا انتقال 5 ستمبر 1071ء کو ہوا۔ وہ محدث و مورخ تھا۔ چودہ جلدوں میں "تاریخ بغداد" کے نام سے اہل علم کے حالات لکھے۔ حدیث پر اس کی کتاب کا نام "کتاب الکفایہ فی معرفت اصول علم الراویہ" ہے۔ گرامر پر اس نے "مُتنَفِ تکمۃ المتلِف والمختلف" لکھی جس میں ناموں کے ہجوں سے بحث کی ہے۔

ابوالحسن علی ابن اسمٰعیل المرو ابن سیدہ 8-1007ء میں جنوب مشرقی اسپین کے شہر مرسیا (Murcia) میں پیدا ہوا، دینیا میں 66-1065ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ پیدائشی نابینا تھا۔ اس نے ایک ضخیم لغت "الکتاب المخصص فی اللغۃ" مرتب کیا۔ اس کو "کتاب المحکم والمحیط الاعظم" بھی کہتے ہیں۔

علی ابن احمد اسدی طوسی فردوسی کا بھتیجا تھا۔ اس کی ولادت اور وفات کے سال معلوم نہیں مگر 1056ء سے 1060ء تک اس کا پایا جانا ثابت ہے۔ اس نے فارسی زبان کا لغت "لغت فرس" 1060ء میں مرتب کیا۔ یہ فارسی زبان کے مطالعہ کے لیے نہایت اہم کتاب ہے۔ اسدی نے موفق کی "کتاب الانبیہ" کی نقل اپنے ہاتھ سے کی۔ اسدی کی یہ نقل فارسی کے ان قلمی نسخوں میں جو اب موجود ہیں سب سے پرانی ہے۔

اسدی کا لغت گوٹنگن سے 1897ء میں شائع ہوا۔ جس قلمی نسخے سے یہ کتاب چھاپی گئی وہ پاپائے اعظم کے محل ویٹیکن (Vatican) سے حاصل کیا گیا تھا۔

ابو محمد القاسم ابن علی ابن محمد الحریری 55-1054ء میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا انتقال 1122ء میں ہوا وہ عربی ادیب اور عالم صرف و نحو تھا۔ اس نے گرامر پر ایک نظم "ملحۃ الاعرب" لکھی۔ جو غلطیاں عموماً پڑھے لکھے لوگ کرتے ہیں ان کی نشاندہی "کتاب دراۃ الغواص" میں کی۔ عربی زبان کے نقطہ نظر سے الحریری اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم تھا۔

بدیع الزماں احمد ابن الحسین الہمدانی نے جو دسویں صدی کے آخر میں ہوا تھا۔ مقفیٰ نثر ایجاد کی تھی اور اس کا تتبع کیا جانے لگا تھا۔ الحریری نے مقفیٰ نثر میں کہانیوں کی ایک کتاب لکھی جو بہت مقبول ہوئی اور ادب کا شاہکار سمجھی گئی۔ اس کا نام "مقامات" ہے اس میں ایک شریر آدمی، ابوزید سروجی سے متعلق پچاس کہانیاں درج کی ہیں۔ کہانیوں کے بہانے مصنف نے اپنے زورقلم کی نمائش کی ہے۔ زبان نہایت صاف و شستہ ہے، مزاج میں لطافت، ظرافت میں حلاوت اور بیان میں نکتہ سنجیاں ہیں۔ یہ کتاب نو دس سال میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب کے طرز تحریر نے عربی ادب کو بہت متاثر کیا اور بعد میں عبرانی ادب میں بھی اس کا تتبع ہوا۔

پیرس میں "مقامات" کا عربی متن دیباچہ اور شرح کے ساتھ 1822ء میں شائع کیا گیا۔ دوسرا ایڈیشن 53-1847ء میں نکلا۔ اسٹین گاس (Stein Gass) نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو لندن سے 1890-1867ء میں شائع ہوا۔ فرانسیسی ترجمہ پیرس میں 89-1885ء میں چھپا۔ مشرقی ممالک میں یہ کتاب بار بار چھاپی گئی۔

ابو منصور موہوب ابن ابو طاہر ابن احمد ابن محمد ابن الخضر الجوالیقی بغداد میں 1073-74ء میں پیدا ہوا۔ جوالیق بوریوں کو اور جوالیقی بوریاں بنانے والے یا بیچنے والے کو کہتے ہیں۔ اس کی وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں مگر غالباً وہ 1134ء میں بغداد میں فوت ہوا۔ اس کی تصانیف یہ ہیں:

(1) کتاب المعرب بن الکلام العجمی۔ یہ ابن قتیبہ کی تصنیف "ادب الکاتب" کی شرح ہے۔
(2) کتاب التکملہ فی مایلحن فیہ العامہ۔ یہ الحریری کی "دراۃ الغواص" کا تکملہ ہے۔ اس میں عام لوگوں کی غلطیاں بتائی ہیں۔
(3) کتاب اسماء خلیل العرب و فرسانہا۔ اس میں گھوڑوں کا ذکر ہے۔
(4) کتاب المختصر فی النحو۔ اس میں علم نحو (Syntax) سے بحث کی ہے۔

"معرب" کی تدوین ساخو (E.Sachau) نے کی اور یہ 1867ء میں لائپزگ سے شائع ہوئی۔ "تکملہ" کی تدوین ڈیرن برگ (H.Derenbourg) نے کی اور 1825ء میں لائپزگ سے شائع ہوئی۔

ابو الفضل احمد ابن محمد ابن محمد المیدانی کی ولادت میدان زیاد میں ہوئی جو نیشاپور کا ایک علاقہ تھا۔ سال ولادت معلوم نہیں وہ 1124ء میں اپنے وطن میں فوت ہوا۔ 1104ء میں اس نے ایک لغت کی تالیف مکمل کی، اس کا نام "کتاب السامی فی الاسامی" (یعنی لفظوں پر نہایت عمدہ کتاب۔ اس میں الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے نہیں کی گئی بلکہ موضوع پر ترتیب کا انحصار رکھا ہے)۔ مثلاً فقہ سے متعلق الفاظ سب ایک جگہ جمع کیے گئے ہیں۔ تصریحات فارسی میں دی ہیں۔ نحو پر اس کی کتاب کا نام "کتاب الہادی للشہادی" ہے اس میں بھی تصریح و توضیح فارسی میں کی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف "کتاب مجمع الامثال" ہے جس میں کہاوتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ موخر الذکر کا 1838-41ء میں فرے ٹیگ (Freytag) کا کیا ہوا لاطینی ترجمہ بون (Bonn) سے شائع ہوا۔ کتاب مجمع الامثال کا عربی متن بولاق سے 1284ھ اور قاہرہ سے 1310 ہجری میں شائع ہوا۔

ابو القاسم محمد ابن عمر الزمخشری 1075ء میں خراسان میں پیدا ہوا اور 1144ء میں جرجانیہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ ایرانی ہوتے ہوئے وہ فارسی پر عربی کی برتری کا یقین رکھتا تھا اور اس نے شعوبی تحریک کی مخالفت کی۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف قرآن کی تفسیر "کتاب الکشاف عن حقائق التنزیل" ہے۔ عربی صرف و نحو پر اس نے 1119ء اور 1121ء کے درمیان "کتاب المفصل" لکھی۔ عربی۔ فارسی کا لغت مرتب کیا جس کا نام "کتاب مقدمۃ الادب" ہے۔ اس کی تصانیف جو یورپ میں چھپیں یہ ہیں:- "کتاب المفصل" 1859ء

میں کرسٹیانیہ (Christinia) میں چھپی۔ "کتاب الامکنہ و الجبال و المیان" جو علم جغرافیہ پر ہے، 1856ء میں لیڈ (Leyde) میں چھپی۔ "کتاب نوابغ الکلم" 1872ء میں لیڈ (Leyde) میں چھپی۔ "کتاب اطواق الذہب" 1876ء میں پیرس میں چھپی۔ 1850ء میں عربی، فارسی لغت لائپزگ (Leipzig) میں چھاپا گیا۔ مشرقی ممالک میں 1856ء میں کلکتہ میں "کتاب الکشاف" چھپی۔ یہ کتاب قاہرہ میں 8-1307 ہجری میں چھپی۔ "کتاب الفائق" جو حدیث پر ہے 1299ھ میں بولاق میں چھپی۔ "کتاب اساس البلاغہ" ہندوستان میں چھپی۔ "الکشاف" اور مقامات پر بھی چھاپی گئی۔

عبد الرحمٰن ابن ابی الوفا ابن عبید اللہ ابن ابی الوفا ابن عبید اللہ ابن ابی سعید ابن الانباری کا وطن الانبار بغداد سے بیالیس میل کے فاصلے پر دریائے فرات کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ وہ 1119ء میں پیدا اور 1181ء میں فوت ہوا۔ اس نے عربی صرف و نحو پر جو کتاب لکھی اس کا نام "کتاب الاسرار العربیہ" ہے۔ اس کے علاوہ اس نے عربی علم اللسان اور ادب کی تاریخ لکھی جس میں ماہرین علم لسانیات اور ادیبوں کے حالات زندگی، زمانی ترتیب (Chronological Order) کو ملحوظ رکھ کر لکھے ہیں۔ اس تصنیف کا نام "کتاب النزہت الکبار فی طبقات الادبا" ہے۔ "کتاب الاسرار العربیۃ" لائیڈن میں 1886ء میں اور "نزہت" قاہرہ میں 1877ء میں چھپی۔

برہان الدین الزنوجی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں نہیں معلوم۔ البتہ اس کا 1203ء میں بقید حیات ہونا معلوم ہے، وہ ماہر تعلیم تھا۔ اس کی تصنیف "تعلیم المتعلم" بہت مقبول ہوئی۔ یہ فلسفیانہ انداز کی پرائمر ہے اس کا ترکی میں ترجمہ ہوا۔ یہ رینلڈ (H.Renald) کی تدوین کے بعد 1709ء میں Utrechit سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد کسپیری (C. Caspari) کی تدوین کے بعد 1838ء میں لائپزگ میں چھپی۔

ابو عمر عثمان ابن عمر ابن الحاجب 1175ء میں بالائی مصر کے مقام فنا (Fana) میں پیدا ہوا۔ اس کے والد حاجب (Chamberlain) کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ ابن الحاجب نے قاہرہ میں تعلیم پائی اور دمشق میں معلمی کی۔ پھر قاہرہ میں سکونت اختیار کی اور 1249ء میں اسکندریہ میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ لسانیات کا عالم اور مالکی فقیہہ تھا۔ اس نے صرف و نحو، عروض اور فقہ پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ صرف و نحو کی کتابوں میں "الکافیہ" اور "الشافیہ" بہت مقبول ہوئیں۔ بالخصوص "الکافیہ" کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس نے عروض پر جو کتاب لکھی تھی اس کی مقبولیت کا بھی یہ حال تھا کہ اس پر پانچ شرحیں لکھی گئیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ شرحوں کی تعداد پانچ سے زیادہ تھی۔ اس نے مغرب اور مصر میں مالکی عقیدہ رکھنے والوں میں جو اختلاف پیدا ہو گئے تھے ان کو ہم آہنگ

کرنے کی غرض سے "منتہاء السّوال والا عمال" لکھی اور پھر اسی غرض سے ایک نسبتاً مختصر کتاب تصنیف کی جس کا نام "مختصر المنتہاء (یا مختصر الاصول)" ہے۔ دونوں کتابیں، بھی بالخصوص مغرب میں بہت مقبول ہوئیں۔

روم (Rome) میں "الکافیہ" 1591ء میں چھاپی گئی۔ "الشافیہ" کلکتہ میں 1805ء میں اور قسطنطنیہ میں 1850ء میں چھپی۔ مشرقی ممالک میں یہ کتابیں بار بار چھاپی گئیں۔ "الشافیہ" کے اقتباسات بہل (F.Buhl) کی ڈینش (Danish) شرح کے ساتھ لائپزگ میں 1878ء میں شائع ہوئے۔

ابو بکر یوسف ابن ابی بکر ابن محمد سراج الدین الخوارزمی السکاکی 1160ء میں خوارزم میں پیدا ہوا۔ ابتداء میں وہ قفل، چاقو وغیرہ بناتا تھا۔ اس لیے سکاکی کے نام سے مشہور ہوا۔ نسلاً وہ ترک تھا اور حنفی عقائد کا پیرو تھا۔ وہ 29-1228ء میں فوت ہوا۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف "مفتاح العلوم" تین حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ علم الاصوات (Phonology) پر ہے، دوسرا الفاظ کی ساخت اور گرامر سے بحث کرتا ہے، تیسرا علم المعانی و البیان (Rhetoric) سے متعلق ہے۔ تیسرے میں عروض اور استدلال کو بھی شامل کر لیا ہے۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس پر متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ اس طرح مفتاح العلوم اور اس کی تلخیص اور شرحیں عربی ادب پر چھا گئیں اور ابھی تک اثر انداز ہیں۔ اس وقت تک جتنی کتابیں علم صرف و نحو اور علم المعانی و البیان پر لکھی گئی تھیں ان میں مفتاح العلوم سب سے زیادہ مکمل تھی۔ مفتاح العلوم یورپ میں ابھی تک نہیں چھپی۔

مشرف الدین ابن مصلح الدین عبداللہ، سعدی شیراز میں 1184ء میں پیدا ہوئے اور تقریباً سو سال کی عمر میں 1283ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنی تعلیم بغداد کی مشہور درس گاہ نظامیہ میں مکمل کی۔ بغداد میں وہ شہاب الدین ابوحفص عمر السہروردی کے نظریات سے متاثر ہوئے۔ تہائی عمر گزارنے کے بعد دوسری تہائی میں انہوں نے مختلف ممالک کے مسلسل سفر کیے۔ وہ وسطی ایشیا، ہندوستان، حبش، یمن، مصر، فلسطین، ایشائے کوچک میں گھومتے پھرے، کہا جاتا ہے کہ وہ مغرب بھی گئے۔ عمر کا بقیہ تہائی حصہ انہوں نے اپنی گرانقدر تصانیف مرتب کرنے اور زندگی کو تامل و تفکر کی نگاہ سے دیکھنے میں شیراز میں صرف کیا۔ انہوں نے "بوستان" کو 1257ء اور "گلستان" 1258ء میں (یعنی جب ان کی عمر کا چوہتّرواں سال تھا) مکمل کیا۔ انہوں نے یہ دونوں کتابیں فارس کے فرمانروا اتابک ابوبکر کے نام معنون کیں۔ ان دو کتابوں کے علاوہ انہوں نے غزلوں اور چھوٹی چھوٹی نظموں کا دیوان مرتب کیا اور نصیحتوں کی ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "پند نامہ" ہے۔ جب 1258ء میں تاتاریوں نے بغداد تباہ کر کے عباسی خلافت کو ختم کر دیا تو انہوں نے مرثیہ لکھا۔

اس کے علاوہ آخری عباسی خلیفہ المستعصم (1242ء تا 1258ء) کی شان میں قصیدہ کہا۔ سعدی کی یہ سب تصانیف فارسی میں ہیں صرف چند نظمیں انہوں نے عربی میں کہی ہیں۔ سعدی ایران کے سب سے بڑے غنائی شاعر ہیں اور یہی بات ان کی ناصحانہ شاعری کے بارے میں درست ہے۔ ان سے زیادہ کسی اور ایرانی شاعر نے ایسی اور اتنی بین الاقوامی شہرت حاصل نہیں کی۔ 1354ء میں تفتازانی نے "بوستاں" کا ترکی میں ترجمہ کیا اور 1391ء میں سیف السرئی (Saif Al Sarayi) نے اس کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا جو مصر میں بولی جاتی تھی۔ 1634ء میں "گلستاں" کا ترجمہ فرانسیسی میں پیرس میں، 1651ء میں لاطینی میں ایمسٹرڈم میں، 1654ء میں جرمن میں ہیم برگ میں اور 1774ء میں انگریزی میں لندن میں شائع ہوا۔ بوستاں کا ولندیزی (Dutch) زبان میں ایمسٹرڈم میں 1688ء میں ترجمہ شائع ہوا۔ مختصر یہ کہ سترہویں صدی کے آخر تک سعدی سے مغربی یورپ والے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ یورپ کے بڑے بڑے ادیب سعدی سے متاثر ہوئے جن میں لافونٹین (La Fontaine)، والٹیئر (Voltaire) اور گوئٹے (Goethe) ایسے بلند پایہ ادیب شامل ہیں۔ یورپ میں سعدی کی مقبولیت کی ایک مثال یہ ہے کہ تھرموڈائی نمیکس (Thermodynamics) کا بانی جب 1796ء میں پیدا ہوا تو سعدی کے نام پر اس کا نام سعدی کارنٹ (Sadi Carnot) رکھا گیا۔ 1654 میں جو ترجمہ جرمن میں ہوا تھا وہ گوئٹے کے زیر مطالعہ رہا۔

فرید الدین عطار اور جلال الدین رومی کی شاعری اور سعدی کی شاعری میں یہ فرق ہے کہ سعدی تصوف کے پر اسرار نظریات پیش کرنے کے بجائے دنیا کی عملی زندگی کو موضوع کلام بناتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی دنیا سازی کے گر بھی بتا دیتے ہیں۔ ان کے کلام کی وسیع المشربی ہی نے اسے عالم گیر بنا دیا۔ ان کی تصانیف اس زمانے کے مشرقی طریقہ بود و باش کی آئینہ دار ہیں چنانچہ ان میں زندگی کے بہترین و بدترین عوامل مصروف کار نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان تصانیف کی تاریخی نقطہ نظر سے بھی اہمیت ہے۔ جن ترجموں کے شائع ہونے کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً ان کی تصانیف کا ترجمہ یا محض متن شائع ہوتا رہا۔ کلکتہ میں 95-1791ء کلیات دو جلدوں میں چھپا۔ بوستان کلکتہ میں 1824ء اور 1828ء میں کلیات سے علیحدہ چھپی۔ کانپور میں یہ 1832ء میں اور تبریز میں 1831ء میں چھپی۔ کے۔ ایچ گراف (K.H.Graf) کی مبصرانہ تدوین کے ساتھ Vienna میں 1858ء میں چھپی۔ گراف کا جرمن ترجمہ 1852ء میں جینا (Jena) میں چھپا۔ کلارک (Clarke) کا انگریزی ترجمہ لندن میں 1879ء میں چھپا۔ فرانسیسی ترجمہ پیرس میں 1880ء میں چھپا۔ ایک اور جرمن ترجمہ لائپزگ میں 1881ء میں چھپا۔ گلستان کلیات سے علیحدہ کلکتہ میں 1802ء میں چھپی۔ فرانسس گلیڈون (Francis Gladwin) کا انگریزی ترجمہ مع متن کلکتہ میں 1806ء میں دو جلدوں میں چھپا۔ 1850ء میں ایسٹ وک (E.B.Eastwick) کی مبصرانہ تدوین کے ساتھ ہرٹ فرڈ (Hertford) میں چھپی۔ فرانسیسی میں دو مختلف ترجمے 1834ء اور 1858ء میں پیرس میں چھپے۔

جرمن ترجمہ 1846ء میں لائپزگ میں چھپا۔ ایسٹ وک کا انگریزی ترجمہ 1852ء میں ہرٹ فرڈ میں چھپا۔ سرایڈون آرنلڈ (Sir Edven Arnold) نے دیوان کو مرتب کر کے کلکتہ میں چھپوایا۔ یہاں تک کہ وہ معلومات درج کی گئی ہیں جو سارٹن نے فراہم کی تھیں۔ اس کے بعد مولانا حالی، مولانا شبلی، ول ڈیوراں کے کچھ اقتباسات درج کیے جائیں گے۔

مولانا الطاف حسین حالی اس بات سے متفق نہیں کہ سعدی کی عمر تقریباً سو سال کی ہوتی تھی۔ انہوں نے حیات سعدی میں لکھا ہے:

"سرگور اوسلی نے اس کی ولادت 589ھ مطابق 1193ء لکھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا تھا.... اس کی ولادت کا سال اور کسی نے نہیں لکھا۔ صرف سال وفات سب نے لکھا ہے یعنی 691ھ اور اس کی عمر ایک سو دو، یا ایک سو دس یا ایک سو بیس بتاتی ہے۔ پس کم سے کم عمر ماننے سے اس کی ولادت 589ھ میں قرار پاتی ہے لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابو الفرج ابن جوزی جو بغداد میں اس کا جلیل القدر استاد تھا، اس کی وفات کے وقت جو قطعاً 597ھ ہوئی ہے، شیخ کی عمر نو برس سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلاف واقعہ ہے اسی لیے اس کی عمر ایک سو دو برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔"

جارج سارٹن نے جو سعدی کی عمر ننانوے سال بتائی ہے وہ غالباً اوسلی کے حساب کے مطابق ہی بتائی ہے۔ کیونکہ سن ہجری کے ایک سو دو سال سن عیسوی کے ننانوے کے برابر ہوتے ہیں۔ حالی نے "حیات سعدی" میں دوسری جگہ لکھا ہے:

"شیخ، جیسا کہ بوستاں کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے جوانی کے زمانے میں شیراز سے باہر گیا اور بغداد میں اس نے مدتوں امام ابن جوزی سے علم تحصیل کیا..... پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دو برس ہی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کر چکا تھا اور ایک سو دس برس کی قرار دی جائے تو لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو چکا اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانے میں نکل گیا تھا۔ پس جس طرح پہلی بات خلاف قیاس ہے اسی طرح دوسری بات خلاف واقعہ ہے۔"

اس استدلال پر حالی نے سعدی کی عمر ایک سو بیس برس قرار دی ہے۔ سارٹن نے جہاں ابن جوزی کے حالات بیان کیے ہیں وہاں ان کا سال وفات 1201ء یعنی 597ھ بتایا ہے۔ لیکن اس نے سعدی کی ولادت 1184ء کی (یعنی 580ھ کی) بتائی ہے۔ اس طرح بھی ابن جوزی کے انتقال کے وقت سعدی کی عمر سترہ برس ہی ہوتی ہے۔ حالی کا یہ کہنا کہ سترہ برس کی عمر میں سعدی کا تحصیل علم سے فارغ ہو جانا خلاف واقعہ ہے، درست معلوم ہوتا ہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سعدی 691ھ میں فوت ہوئے۔ اس لحاظ سے سارٹن نے جو سعدی کے انتقال کا سال 1283ء لکھا ہے وہ غلط ہے کیونکہ 691ھ سن عیسوی کے حساب سے 1291ء کے مطابق ہے۔ اگر ان کی پیدائش 1184ء کی بھی مانی جائے تو سعدی کی عمر سن عیسوی کے اعتبار سے ایک سو آٹھ اور سن ہجری کے اعتبار سے ایک سو گیارہ یا ایک سو بارہ سال ہوتی ہے۔ اس لیے یہ سال پیدائش صحیح نہیں۔ مولانا حالی کہتے ہیں کہ کسی نے سعدی کا سال ولادت نہیں لکھا۔ معلوم نہیں سارٹن نے ان کی پیدائش کا سال کیسے معلوم کیا۔ سارٹن اور حالی میں ایک اور امر میں بھی اختلاف ہے۔ سارٹن کہتا ہے کہ مصلح الدین عبداللہ سعدی کے والد کا نام تھا۔ حالی کہتے ہیں کہ مصلح سعدی کا لقب تھا اور اس کے والد کا نام عبداللہ تھا نہ کہ (مصلح الدین عبداللہ)۔

فارسی زبان کے فروغ میں سعدی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کے سلیس اور دلکش طرز بیان نے عربی کے ادیبوں کے دل میں بھی فارسی کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا۔ ان کا مشہور قطعہ جس کا پہلا شعر ہے:

گلے خوشبوئے در حمام روزے   رسید از دست محبوبے بدستم

عربی میں منتقل کیا گیا۔ حالی لکھتے ہیں، پوری گلستاں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا، جو کئی صدیوں تک عرب، شام، روم اور مصر میں متداول رہا۔ فارسی کے بڑے بڑے اہل قلم نے گلستاں و بوستاں کا جواب لکھنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ حالی لکھتے ہیں:

"تین کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جو شیخ کے بعد گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ایک مولانا عبدالرحمٰن جامی کی بہارستان، دوسری مجدالدین خوانی کی خارستان اور تیسری قاآنی شیرازی کی پریشان ..... جب بہارستان اور خارستان کو گلستان کے مقابلے میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کافور ہو جاتی ہے، اسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔"

رہی قاآنی کی پریشان تو حالی نے خود قاآنی کی عبارت نقل کی ہے جس میں وہ اعتراف کرتا ہے کہ سعدی کی ہمسری ناممکن ہے وہ کہتا ہے:

"ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ گلستاں کی طرز پر نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ میں نے کہا بھائی توبہ کر۔ میں اور شیخ کے طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں۔ مسلیمہ نے نبوت کا دعویٰ کرکے کذاب کے سوا اور کچھ خطاب نہ پایا۔ میں نے مانا کہ جگنو رات کو چمکتا ہے، لیکن کیا وہ چاند کی برابری کرسکتا ہے۔ شیخ کی گلستاں ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہل معنی کی جان قیامت تک اس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر جب اس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً کچھ نظم و نثر اور جد و ہزل ترتیب دے دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پرواز میں شہباز کی برابری نہیں کرسکتی لیکن اس کو بھی چار و ناچار اڑنا ہی پڑتا ہے۔"

مولانا شبلی نعمانی "شعر العجم" میں لکھتے ہیں کہ "غرض نہ ان کا (سعدی کا) یہ دعویٰ ہے کہ وہ رزم میں فردوسی اور نظامی کے دوش بدوش چل سکتے ہیں، نہ امیرخسرو وغیرہ کی یہ رائے صحیح ہے کہ وہ (سعدی) غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتے۔ قصائد اور مثنوی میں ان کی بلند پائیگی کا کون انکار کرسکتا ہے۔" لیکن جب امیرخسرو کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہیں تو شبلی کہتے ہیں کہ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سعدی کے قصیدے کو وہ بلند پایہ کہہ چکے ہیں۔ ایسے تضاد شبلی کے ہاں اور شاعروں کے بارے میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً خسرو کے بارے میں پہلے کہتے ہیں کہ وہ قصیدہ، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں۔ مگر پھر ان کی غزل کی توصیف ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثنوی کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ خسرو کا اصل مذاق نہیں اور قصیدہ کے ذکر میں کہتے ہیں کہ ان کا کوئی خاص انداز نہیں۔"

سعدی کی زبان کی سلاست اور سریع الفہمی کی وجہ سے گلستاں و بوستاں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں مگر ان کے بزرگوں کے لیے بھی ان کا مطالعہ نشاط قلب و روح فراہم کرتا ہے۔ صدیاں گزر گئیں مگر یہ کتابیں پرانی نہیں ہوئیں۔ ان میں آج بھی وہی تروتازگی ہے جو پہلے تھی۔ ان کتابوں کو کروڑوں نے پڑھا ہوگا اور خدا جانے کتنے اور پڑھیں گے۔ مگر جو پڑھتا ہے وہ خراج تحسین دینے پر مجبور ہوتا ہے ــــ سارٹن نے ٹھیک کہا ہے کہ سعدی کی تصانیف ایسی وسیع المشرب ہیں کہ ہر ایک کے لیے ان میں دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ جہاں تک ان کی غنائی شاعری کا تعلق ہے اس میں بھی

ان کے مقابلے میں کسی کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ قطعہ جس میں انہیں غزل کا پیغمبر کہا گیا ہے نہایت مشہور ہے:

در شعر سہ کس پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

سارٹن کا یہ قول اوپر درج کیا جاچکا ہے کہ سعدی ایران کے سب سے بڑے غنائی شاعر ہیں۔ حالی کہتے ہیں:

"شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور بامزہ کردیا کہ لوگ قصیدہ اور مثنوی چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے۔ غزل گویوں کے نام یا تو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں یا لاکھوں سے متجاوز ہوگئے، اسی واسطے بعض شعرا نے شیخ کو غزل کا پیمبر کہا ہے۔"

ول ڈیوراں نے "مذہب کا عہد" میں لکھا ہے کہ سعدی فلسفی تھا۔ پھر فلسفیوں کی ابہام پسندی کو واضح کرنے کے لیے لکھتا ہے کہ چونکہ قابل فہم زبان میں فلسفیانہ مسائل پیش کرنے کا جرم سعدی سے سرزد ہوگیا تھا، اس لیے وہ فلسفی کے نام سے پکارے جانے کے حق سے محروم رہا۔ ول ڈیوراں کی رائے میں سعدی کا فلسفہ عمر خیام کے فلسفے سے زیادہ صحت مند ہے کیونکہ سعدی کے فلسفے کو ایمان کی تقویت حاصل ہے اور وہ علم کی نیش زنی کا علاج مہر و محبت کی زندگی کی برکتوں سے کرنا سکھاتا ہے۔ سعدی کے بارے میں ول ڈیوراں کی فیصلہ کن رائے یہ ہے کہ بالآخر اس کی شاعرانہ فطرت اس کی فرزانگی پر غالب آئی اور سعدی نے خوش دلی سے اپنی بالغ نظری کو محبت کی بیش بہا غلامی کے حوالے کردیا۔ (یہ اشارہ ان کے تصوف کی طرف معلوم ہوتا ہے)۔

سعدی کے وطن شیراز کے متعلق حالی نے یہ خوش آئند انکشاف کیا ہے کہ "شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانے میں پڑی ہے۔ محمد بن قاسم جس نے مسلمانوں میں سب سے اول ہندوستان پر لشکر کشی کی، شیراز کا بانی ہے۔ یہ شہر پہلی صدی ہجری کے آخر میں ایک نہایت سرسبز و شاداب قطعہ زمین پر آباد کیا گیا تھا۔ تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے۔ شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو۔"

(تقویم البلدان مشہور جغرافیہ داں ابوالفدا کی تصنیف ہے۔ ابوالفداء کی ولادت 1273ء میں اور وفات 1331ء میں ہوئی)۔

صفی الدین عبدالمومن ابن فقر (یا فاخر) الازموی البغدادی تیرہویں صدی کے پہلے ربع میں بغداد میں پیدا ہوا اور 1294ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ علم موسیقی کا مسلمانوں میں سب سے بڑا عالم تھا۔ اس کا ذکر طبیعیات کے تحت کیا جا چکا ہے۔ موسیقی پر اس کی دو کتابوں (1) کتاب الادوار اور (2) رسالۃ الاشرفیہ ہیں۔ ان کے علاوہ عروض ، قافیہ اور علم المعانی و البیان (Rhetoric) پر بھی اس کی ایک کتاب ہے جس کا نام " کتاب فی العروض و القوافی و البدیع " ہے۔ یہ تصنیف عربی لسانیات میں اونچا مقام رکھتی ہے۔

جمال الدین ابوالفضل محمد ابن مکرم ابن علی ابن منظور الانصاری الخزرجی الافریقی 1232-33ء میں پیدا اور 1311ء میں قاہرہ میں فوت ہوا۔ وہ مورخ اور مدون لغت تھا۔ اس نے عربی کا مشہور و معروف لغت " لسان العرب " لکھا جس نے اس کے نام کو بقائے دوام بخشی۔ یہ بہت ہی جامع لغت ہے۔ اس میں ابن درید کی کتاب "الجمہرہ فی اللغۃ" اور ابن سیدہ کی "کتاب المحکم والمحیط الاعظم" کا نچوڑ بھی ہے اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ بھی ہے۔

ابن منظور نے شب و روز سے متعلق اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "نثار الازہار فی اللیل والنہار" ہے۔

احمد فارس کے حواشی اور مقدمہ کے ساتھ لسان العرب دو جلدوں میں بولاق میں 1883-91ء میں شائع ہوئی۔ نثار الازہار 1881ء میں قسطنطنیہ میں چھپی۔

علی ابن المخلص ابن شیخ (یا بابا) الیاس ، عاشق پاشا کے نام سے مشہور ہے 1271-72ء میں اناطولیہ کی ریاست قرامان میں پیدا ہوا۔ 3 نومبر 1332ء کو اس کا انتقال ہوا۔ وہ طریقہ بکتاشیہ کے بانی حاجی بکتاش کی صحبت سے مستفیض ہونے کے لیے قیرشہر میں رہنے لگا۔ وہیں اس نے 1329-30ء میں اپنی مشہور نظم " غریب نامہ " مکمل کی۔ غریب نامہ کو " معارف نامہ " بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب تصوف پر ہے ، عاشق پاشا پہلا شخص ہے جس نے ترکی زبان میں تصوف کی تبلیغ کی۔ یہ نظم دس ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں دس داستانیں ہیں ، پہلے باب کی داستانیں توحید سے متعلق ہیں۔ عاشق پاشا سے پہلے بھی ترکی زبان میں شعر کہے گئے ہیں۔ ترکی میں کچھ نظمیں جلال الدین رومی نے بھی کہی ہیں۔ مولانا روم کے بیٹے بہاء الدین سلطان ولد کے "رباب نامہ" میں ، جو 1301ء میں مکمل ہوا ، ایک سو چھپن اشعار سلجوقی ترکی میں ہیں۔ مولانا روم اور سلطان ولد کے ترکی اشعار کی نسبت عاشق پاشا کے معارف نامہ کی ترکی ادب میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ان تینوں نے ایک بحر یعنی بحر رمل مسدس میں اشعار کہے ہیں۔ (دراصل مولانا روم کی مثنوی بحر رمل مسدس محذوف میں ہے جس میں مقصور بھی

جائز ہے)۔

سلجوق ترکوں کی حکومت 1300ء میں ختم ہوئی اور عثمانی ترکوں کا دور 1299ء سے شروع ہوا۔ ان کا پہلا سلطان عثمان اول تھا۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ ترکی شاعری عثمانی ترکوں کے ساتھ شروع ہوئی۔ 1313ء میں ابو یحیانی غرناطی نے سب سے پہلے ترکی علم صرف و نحو پر باقاعدہ کتاب لکھی۔ ترکی شاعری کا آغاز و نشوونما کرنے والے بہاء الدین سلطان ولد ، عاشق پاشا ، یونس ایمرے اور گلشیری ہیں۔ چودھویں صدی میں ایک طرف عثمانی ترکوں کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا اور دوسری طرف ترکی ادب ترقی کرتا گیا۔

عاشق پاشا زادہ نے ، جو عاشق پاشا کا پوتا تھا ، پندرہویں صدی کے آخر میں عثمانی سلطانوں کی سب سے پہلی تاریخ لکھی۔ سوا چار سو سال بعد 1913-14ء میں ترکی حکومت کے حکم سے یہ تاریخ استنبول میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ 1929ء میں یہ تاریخ لائپزگ میں چھپی۔ عاشق پاشا کے "غریب نامہ" کے بہت سے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں مگر ابھی تک ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

یونس ایمرے (Yunus Amre) بولی (Boli) میں یا اس کے قریب کسی مقام میں پیدا ہوا۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں یاد نہیں ، مگر 1307ء میں اس کا پایا جانا ثابت ہے۔ وہ ترکوں کے عظیم شعراء میں سے ایک ہے لیکن مدتوں اس کی قدر نہ ہوئی کیونکہ وہ عوام کا شاعر تھا اور ارباب ادب کو جن پر عربی و فارسی کے اثرات غالب تھے ، اس کی شاعری میں گنوار پن نظر آتا تھا۔ وہ عربی و فارسی کی بحروں کے بجائے ترکی بحروں میں شعر کہتا اور اس کا انداز بیان بالکل غیر رسمی و غیر تقلیدی تھا۔ اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ ان پڑھ ہے۔ وہ صوفی تھا اور شاعری میں تقلید کے بجائے اپنے ذوق پر بھروسہ کرتا تھا۔ غالباً وہ مولانا روم کی مثنوی سے تھوڑا بہت واقف تھا۔ اس نے ترکوں میں تصوف کو مقبول بنایا۔ وہ ایک بہت غریب اور سیدھا سادہ آدمی تھا۔

اس کا کلام 1884-85ء میں اور پھر 1921-22ء میں استنبول میں چھپا۔ اس میں چھ سو اشعار مثنوی کے طرز پر ہیں اور تین چار سو غزلیں ہیں۔ پورا کلام صوفیانہ ہے اب وہ ترکی کا عظیم شاعر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بکتاشیہ درویشوں کے طریقہ کا پیرو تھا۔

احمد الگلشیری کا سال ولادت اور سال وفات معلوم نہیں مگر اس کا 1317ء میں پایا جانا ثابت ہے ، وہ فارسی اور ترکی میں شعر کہتا تھا۔ اس نے 1317-18ء میں فریدالدین عطار کی "منطق الطیر" کا ترکی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترکی شاعری میں ایک اہم تصنیف ہے۔ وہ فارسی شعراء میں سنائی

(1048ء تا 1141ء) ' نظامی گنجوی (1141ء تا 1203ء) ' فرید الدین عطار (متوفی 30-1229ء) سعدی (1184ء تا 1283ء) ' جلال الدین رومی (1207ء تا 1273ء) اور مولانا روم کے بیٹے سلطان ولد کو مسلم الثبوت شعراء مانتا تھا۔ منطق الطیر کا ترکی میں ترجمہ کرنے کے علاوہ اس نے مذہبی اصطلاحات پر " گلشن نامہ " تصنیف کیا۔ اس کے فارسی کلام کا نام " فلک نامہ " ہے۔ غالباً وہ جلال الدین رومی کے مولویہ طریقہ کا پیرو تھا۔

عبدالرزاق کمال الدین الکاشانی کے کئی نام بتائے جاتے ہیں یعنی کمال الدین کے بجائے جمال الدین ' یا ابی الفضائل یا ابی الغنائم یا ابن محمد۔ اس کا مشہور نام عبدالرزاق ہے۔ کاشان عراق عجم (جسے الجبال بھی کہتے ہیں) میں قم اور اصفہان کے درمیان ایک مقام ہے جو عبدالرزاق کا وطن تھا۔ یہیں 30-1329ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی ولادت کا سال معلوم نہیں۔ عبدالرزاق ابن عربی الاندلسی کا شاگرد تھا۔ وہ اپنے مرشد کے نو افلاطونی نظریات کا جنہیں ابن مسرا قرطبی (883ء تا 931ء) نے حیات نو بخشی تھی ' تبلیغ کرتا رہا مگر یہ احتیاط برتی کہ اپنے تصوف کے پینگ اتنے نہ بڑھائے کہ شریعت کی حدود پار کر جائے۔

اس نے تصوف کی اصطلاحات کا ایک لغت " کتاب الاصطلاحات الصوفیہ " تصنیف کیا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے کئی کتابیں لکھیں جن میں زیادہ مشہور " رسالہ فی القضا و القدر " ہے۔ اس میں تقدیر اور عمل کی آزادی پر بحث کی ہے۔ اس نے عبداللہ ابن محمد الہروی (متوفی 89-1088ء) کی " منازل السائرین " پر اور ابن عربی کی " مواقع النجوم " اور " فصوص الحکم " پر شرحیں لکھیں اور قرآن کی تفسیر بھی لکھی۔ ان کتابوں کی شرحیں لکھنے کے لیے اس نے اصطلاحات کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی جس کے نتیجہ میں " کتاب اصطلاحات " مرتب ہو گئی۔

کتاب اصطلاحات کے پہلے حصے کو تدوین کر کے اسپرنگر (Aloys Sprenger) نے 1845ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔ رسالہ فی القضاء تدوین کے بعد پیرس میں 1879ء میں چھپا۔

ابو حفص زین الدین عمر ابن مظفر القریشی البکری المعری ابن الوردی الشافعی 1290ء میں معرۃ النعمان میں جو شمالی شام میں واقع ہے پیدا ہوا۔ مشہور شاعر ابو العلاء المعری (973ء تا 1057ء) بھی اسی جگہ کا باشندہ تھا۔ ابن الوردی نے حماد ' دمشق اور حلب میں تعلیم پائی اور بقیہ زندگی حلب ہی میں گزاری۔ 8 مارچ 1349ء کو حلب میں طاعون سے انتقال ہوا۔ اس کی شاعری کے مجموعہ کلام میں ایک نظم طاعون پر بھی ہے جس نے بالآخر اسے لقمہ اجل بنایا۔ اس کی اس نظم کا نام " مقالہ فی الطاعون

العالم " ہے جس کو سیوطی نے اپنی کتاب میں شامل کیا جو طاعون پر لکھی تھی۔

ابن الوردی نے علم صرف و نحو ' تاریخ ' فقہ ' تصوف اور تعبیر الرویا (Oneiromancy) پر کتابیں لکھیں۔ صرف و نحو پر۔ نظم " التحفۃ الوردیہ " یہ محمد ابن عبداللہ الطائی الجیانی (1203ء تا 1273ء) کی نظم " الالفیہ " کے تتبع میں لکھی گئی تاریخ " تتمۃ المختصر فی اخبار البشر " یہ ابو الفداء کی تاریخ کی تلخیص ہے اور اس میں 49-1348ء تک کے واقعات درج کیے ہیں۔ فقہ " البہجۃ الوردیہ " عبدالغفار ابن عبدالکریم القزوینی (متوفی 1266ء) کی چھوٹی سی کتاب " الحاوی الصغیر " کو نظم میں منتقل کیا ہے۔

" المسائل الملقباۃ الوردیہ فی الفرائض " یہ قانون وراثت پر نظم ہے۔ تعبیر الرؤیا۔ " المقدمہ الوردیہ " جسے منظومہ فی تعبیر الرویہ " بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب اس نے عنفوان شباب میں لکھی تھی۔ اسے " الالفیہ الوردیہ " بھی کہتے ہیں۔ تصوف۔ " شہاب الثاقف و العذاب الواقف " (شہاب ثاقف۔ وہ شہاب جو تہذیب کا سبب ہوا)۔

" خریدۃ العجائب والفرید الغرائب " غلط طور پر الوردی سے منسوب کی جاتی ہے حالانکہ وہ سراج الدین ابو حفص ابن محمد الوردی کی تصنیف ہے جس کا انتقال 1457ء میں ہوا۔

الوردی کی سب سے زیادہ مشہور نظم " اللامیہ فی النصیحہ " ہے ' اسے " نصیحۃ الاخوان " بھی کہتے ہیں۔ یہ اس نے اپنے بیٹے کے لیے لکھی تھی۔ مقامہ فی الطاعون قسطنطنیہ میں 1300ھ مطابق 83-1882ء میں چھپی۔ الالفیہ الوردیہ قاہرہ میں 1326ھ میں چھپی۔ قاہرہ میں اس کے اور بھی ایڈیشن چھپے ہیں۔

التحفہ الوردیہ (گرامر پر کچھ مقالات کے ساتھ 1881ء میں ٹیلی چیری (Telli Cherry) میں چھپی۔ پھر 1891ء میں برسلو (Breslau) میں چھپی۔ 1906ء میں مدراس میں عبدالقادر الافراحی کی شرح کے ساتھ " مرقاۃ النحو " کے نام سے چھپی۔ تتمۃ المختصر 1868ء میں قاہرہ میں چھپی۔ پھر چار جلدوں میں قسطنطنیہ میں 1870ء میں طبع ہوئی۔

ابو عبداللہ محمد ابن محمد ابن داؤد الصنہاجی کا مشہور نام ابن آجروم ہے۔ وہ مغرب (Morocco) کا رہنے والا تھا ' وہ فاس میں 74-1273ء میں پیدا ہوا ' وہ نسلاً بربر تھا۔ آجروم کے معنی بربری زبان میں فقیر کے ہیں۔ اس کے دادا داؤد اس نام سے پکارے جاتے تھے۔ چنانچہ خاندانی نام ہو گیا۔ فاس میں تعلیم ختم کر کے وہ حج کرنے گیا اس سفر میں اسے اپنی تعلیم مکمل کرنے کا موقع ملا۔

قاہرہ میں اس زمانے کا سب سے بڑا عالم صرف ونحو ابو حیان غرناطی رہتا تھا۔ ابن آجروم اس کا شاگرد ہوگیا۔ اس زمانے میں ماسٹر کی ڈگری یہ ہوتی تھی کہ جب استاد اپنے شاگرد کی تعلیم مکمل کرا چکتا اور سمجھتا کہ اب شاگرد دوسروں کا معلم بن سکتا ہے تو وہ شاگرد کو "اجازہ" دے دیتا تھا۔ چنانچہ ابن آجروم اجازت حاصل کر کے فاس میں صرف ونحو اور قرآن پڑھانے لگا (آج کل دینی مدارس میں "دستار بندی" کی جاتی ہے۔ معلوم نہیں اس زمانے میں بھی اجازت دیتے وقت دستار بندی کی جاتی تھی یا نہیں)۔

ابن آجروم نے صرف و نحو، قرآنی علم ہجا اور قرأت پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن اس کی شہرت کا انحصار "کتاب المقدمہ الآجرومیہ فی مبادی علم العربیۃ" پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے اس نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران تصنیف کیا تھا۔ اختصار کی غرض سے اس کتاب کو عموماً الآجرومیہ کہتے ہیں۔ کتاب کو مختصر سے مختصر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ آسانی سے حفظ کی جا سکے۔ بے شمار طلبہ نے اسے حفظ کیا اور عربی سیکھنے والوں میں اب بھی اس کے حفظ کرنے کا رواج چلا آتا ہے۔ انتہائی ایجاز کے باعث مبتدی اسے مشکل سے سمجھ پاتے ہیں۔ یہ دشواری اساتذہ کی مدد سے یا شرحوں کو پڑھ کر دور کی جاتی ہے۔ الآجرومیہ پر بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ ان میں سے تقریباً ایک درجن چھپ چکی ہیں اور بہت سوں کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

یہ کتاب صرف اسلامی ممالک تک محدود نہیں رہی۔ یورپ والوں نے بھی عربی سیکھنے کے لیے اسے مفید پایا۔ انہوں نے اس کا عربی متن چھاپنے کے علاوہ ترجمے بھی شائع کیے۔ یہ مختصر سی کتاب عربی لسانیات کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

الآجرومیہ کا پہلا ایڈیشن روم میں چھپا۔ لاطینی ترجمہ لائیڈن میں 1617ء میں چھپا۔ پھر یہ کتاب روم میں 1931ء میں چھپی۔ ایمسٹرڈم میں 58-1756ء میں طبع ہوئی۔ اس کا عربی، فرانسیسی ایڈیشن پیرس سے 1833ء میں شائع ہوا، عربی میں 1844ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ عربی۔ انگریزی میں 1852ء میں کیمبرج سے، عربی۔ جرمنی میں 1871ء میں، میونخ (Munich) سے عربی اطالوی میں 1911ء میں روم سے شائع ہوئی۔ قاہرہ میں اس کے بہت سے ایڈیشن نکلے۔ تونس (Tunis) میں 1873ء چھاپی گئی۔

<u>جمال الدین ابو محمد عبداللہ ابن یوسف ابن ہشام</u> قاہرہ میں اپریل یا مئی 1309ء میں پیدا ہوا، اور ابو حیان غرناطی سے علم صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔ وہ مذہباً حنبلی تھا شافعی ہوگیا، آخر میں پھر حنبلی مذہب میں واپس آیا اس کا انتقال 17 ستمبر 1360ء کو ہوا۔ اس نے چوبیس تصانیف

چھوڑیں، جن میں سے بیشتر صرف ونحو پر ہیں۔ اس کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کی کتابوں پر بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ ان کی تلخیص ہوئیں اور کچھ کو نظم کا جامہ پہنایا گیا۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب" ہے۔ اس کی عبارتیں ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں نقل کی ہیں۔ ابن خلدون کی رائے میں ابن ہشام اپنے عہد کا سب سے عظیم عالم صرف ونحو تھا۔ ابن خلدون اسے ابن جنی (42-941ء تا 1002ء) کا ہمسر ٹھہراتا ہے۔

اس کی کتابوں کے مشرقی ممالک میں بہت سے ایڈیشن نکلے۔ یورپ میں اس کی مندرجہ ذیل کتابیں چھپیں:

"قطر الندا وبل الصدا" کا فرانسیسی ترجمہ لائیڈن میں 1887ء میں شائع ہوا۔
"الاعراب عن قواعد الاعراب" کا متن اور ترجمہ پیرس میں 1829ء چھپا۔
"بانت سعاد" یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں حضرت کعب ابن زہیر کا مشہور قصیدہ ہے اس کی شرح ابن ہشام نے لکھی جو لائپزگ میں 1871ء میں چھپی۔

<u>احمد ابن الحسن الجازبردی الشافعی</u> کی تاریخ ولادت معلوم نہیں، اس کا انتقال تبریز میں دسمبر 1345ء یا جنوری 1346ء میں ہوا۔ وہ دینیات اور صرف ونحو کا عالم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ البیضاوی (متوفی 1286ء) کا شاگرد تھا وہ تبریز میں اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس نے عربی میں "المغنی فی علم النحو" تصنیف کی۔ الزمخشری کی "الانموذج" اس کا ماخذ ہے۔ اس نے الزمخشری کی تفسیر "الکشاف عن حقائق التنزیل" کی شرح بھی لکھی۔ اس نے ابن الحاجب کی "الکافیہ" اور "الشافیہ" کی شرحیں بھی لکھیں۔ اس کے علاوہ اس نے شافعی عالم عبدالغفار ابن عبدالکریم القزوینی (متوفی 1260ء) کے فتووں کے مجموعہ "الحاوی الصغیر" کی شرح لکھی۔

<u>جلال الدین ابو المعال محمد ابن عبدالرحمٰن</u> کا مشہور نام الخطیب دمشق القزوینی ہے۔ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں کہ وہ ترک تھا یا ایرانی۔ وہ یا تو ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا یا قزوین میں۔ اس کا سال وفات 1267ء ہے۔ پہلے وہ اپنے وطن میں قاضی مقرر ہوا۔ پھر دمشق میں اور آخر میں وہ 1327ء میں قاہرہ کا قاضی القضاۃ ہوگیا۔ مملوک سلطان الناصر محمد اسے بہت مانتا تھا اور اس کی نصیحت قبول کرتا تھا۔ اپنے بیٹے عبداللہ کے اسراف کی وجہ سے وہ قاہرہ چھوڑ کر دمشق آنے پر مجبور ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد اس کا 1338ء میں انتقال ہوگیا۔

السکاکی کی "مفتاح العلوم" کے حصہ اول و دوم کی، جو صرف و نحو سے متعلق ہیں، اس

نے تلخیص کی اور اس کا نام "تلخیص المفتاح" رکھا۔ یہ تلخیص السکاکی کی مفتاح العلوم سے زیادہ مقبول ہوئی۔

اس نے علم المعانی والبیان (Rhetoric) پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "الایضاح فی المعانی و البیانی" ہے۔ اثیرالدین ابو حیان محمد ابن یوسف ابن حیان الغرناش النفری الجبالی نفزی قبیلہ کا بربر تھا جو حیان میں بس گیا تھا۔ اس نے غرناطہ اور دو ایک اور شہروں میں تعلیم پائی۔ حیان کو فریڈرک سوم نے 1246ء میں فتح کر لیا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ ابو حیان کا خاندان 1246ء کے بعد غرناطہ منتقل ہوگیا تھا جہاں 1256ء میں ابوحیان پیدا ہوا۔ اس نے داؤد الظاہری کا مذہب اختیار کیا۔ 1280ء میں یعنی چوبیس برس کی عمر میں وہ مغرب اور مصر کے سفر پر نکلا اور گھومتا پھرتا بحر قلزم کی بندرگاہ عیداب تک جا پہنچا۔ وہاں سے حج کرنے گیا اور شام کی سیر کرتا ہوا مصر آیا۔ قاہرہ میں اس نے حدیث کا درس دینا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ مشہور عالم صرف ونحو النحاس سے علم صرف ونحو کی تحصیل کرنے لگا۔ جب 1298ء میں النحاس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ ابوحیان گرامر پڑھانے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ مقبول ترین استاد بن گیا۔ اس کی بیٹی نھار نے بھی علم میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ مگر وہ چھتیس برس کی عمر میں 1339ء میں فوت ہوگئی۔ پانچ سال بعد ابو حیان کا 11 جولائی 1344ء کو قاہرہ میں انتقال ہوگیا۔ وہ باب النصر کے باہر صوفیوں کے قبرستان میں دفن ہوا۔

ظاہریہ کے عقائد جنبلیوں کے عقائد سے قریب تر ہیں چنانچہ وہ ابن تیمیہ سے متاثر ہوا۔ اور ان کی شان میں اس نے ایک نظم کہی مگر کچھ عرصے بعد اس نے ابن تیمیہ پر تجسم (Anthropomorphism) کا الزام لگایا اور ان سے منحرف ہو کر شافعی مذہب اختیار کر لیا۔ ابن حزم قرطبی نے اس کے بالکل برخلاف عمل کیا تھا۔ وہ پہلے شافعی تھے اور پھر ظاہریہ مذہب اختیار کر کے اس کی ترویج میں بہت کوشاں ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کی مساعی کے نتیجہ میں اس مذہب کو اسپین میں فروغ حاصل ہوا تھا۔

ابوحیان نے چھیاسٹھ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بیشتر ناپید ہیں۔ اس کی خودنوشتہ سوانح عمری کا نام "النھار فی مسلاۃ عن نھار" ہے نھار کے معنی خالص سونے کے ہیں۔ اس کی بیٹی کا نام نھار تھا یہ کتاب بیٹی کے انتقال کے بعد اشک شوئی کی غرض سے، جیسا کہ مسلات (Consolation) سے ظاہر ہے لکھی گئی۔ اس میں اس نے اپنے شباب کے سفر اور تعلیم وغیرہ کے حالات لکھے ہیں۔

ابوحیان کی تصانیف میں سے بہت سی کتابیں قرآن اور اس کی قرأت سے متعلق ہیں۔

اس کی تفسیر قرآن کا نام "البحر المحیط فی تفسیر القرآن العظیم" ہے۔ یہ بہت ضخیم تھی اس لیے خود اس نے اس کو مختصر کیا۔ تفسیر میں جا بجا قرآن کی زبان اور صرف ونحو سے بحث کی ہے۔ کئی کتابوں میں قرآن کو لحن سے اور مخصوص لہجے میں پڑھنے کے قواعد بیان کیے ہیں۔ ابن حزم کی تصنیف "محلی" کی جس میں ظاہری مذہب کے عقائد بیان کیے گئے ہیں، ابو حیان نے تلخیص کی اور النواوی کی "کتاب التقریب والتفسیر" کی شرح لکھی۔

ابو حیان نے ساٹھ جلدوں میں اسپین کی تاریخ جس کا نام "المبین فی تاریخ الاندلس" تھا لکھی تھی۔ یہ اب دستیاب نہیں۔ ابوحیان نے یوں تو بہت سے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور اس سے کیمیا سازی کی ایک کتاب بھی منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا اصل میدان نکر وعمل علم اللسان تھا۔ اس موضوع پر اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس کا اصل کارنامہ ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اسپین میں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے وہ ض اور ظ اور ک اور ق کے تلفظ میں امتیاز نہ کر سکتا تھا۔ اس خامی نے اسے علم الاصوات پر خاص توجہ مبذول کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ اس نے خود ض اور ظ کے تلفظ کے فرق کو نمایاں کرنے کی غرض سے "کتاب الارتضیٰ فی (فرق بینہ) ض و ظ" تصنیف کی۔ یہ کتاب اب ناپید ہے۔ اس نے عربی زبان پر چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "التذکرہ العربیہ" ہے اور اس کے علاوہ اس موضوع پر اور کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے یہ چار موجود ہیں:

(1) الارتشاف الضرب من لسان العرب (عربوں کی زبان میں شہد کا ذائقہ)

(2) لمعہ فی النحو (نحو پر ایک نظر)۔

(3) النکاۃ الحسان فی شرح غایۃ الاحسان (The Excellent Subtleties Being a Commentary on the Acme of Perfecton.)

(4) التخییل الملخص من شرح التحصیل (The Purified Ambiguity)

یہ چوتھی کتاب اسپین کے عظیم عالم صرف ونحو ابن مالک کی تصنیف "تحصیل الفوائد و تکمیل المقاصد" پر شرح ہے۔

محمد ابن عبداللہ ابن مالک الطائی کا خاندان بھی حیان میں بسا ہوا تھا۔ جب 1246ء میں اس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو یہ خاندان وہاں سے مشرق کو منتقل ہوگیا۔ ابن مالک دمشق میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی زندگی دمشق اور حلب میں بسر کی۔

ابو حیان نے عروض پر، سیبویہ کی گرامر پر، اسپین کے علما نے صرف ونحو پر عربی لسانیات کی مختلف قسموں پر، معنی وبیان وتصریف (Morphology) وغیرہ پر جو کتابیں لکھی تھیں

وہ اب ناپید ہیں۔

عربی کے علاوہ ابوحیان اور کئی زبانوں مثلاً ایرانی، ترکی اور حبشی پر بھی عبور رکھتا تھا۔ قاہرہ میں بہت سی بولیاں بولنے والے پائے جاتے تھے۔ ابو حیان کو زبانوں سے طبعی لگاؤ ہونے کے باعث ہر زبان سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق ہوتا۔ اس نے مندرجہ بالا زبانوں سے اتنی واقفیت بہم پہنچائی کہ ان کے صرف و نحو کے قواعد منضبط کر دیئے۔ حبشی زبان پر اس کی ایک کتاب کا نام "نور الغبش فی لسان الحبش" تھا (غبش کے معنی آخری رات کی تاریکی کے ہیں)۔ اس نے فارسی زبان پر بھی ایک کتاب لکھی۔ یہ دونوں کتابیں اب دستیاب نہیں۔

چونکہ اس وقت مصر میں مملوکوں کی حکومت تھی جو ترک تھے اور ترکوں کی حکومت ہونے کی وجہ سے قاہرہ میں ترکوں کی کثیر تعداد موجود تھی، اس لیے ابوحیان نے ترکی زبان پر خاص توجہ مبذول کی۔ اس نے اس زبان پر کم از کم پانچ کتابیں لکھیں، جن میں سے چار اب نہیں ملتیں۔ جو پانچ میں سے ایک کتاب محفوظ رہی اس کا نام "کتاب الادراک اللسان الاتراک" ہے۔ یہ ترکی زبان میں گرانقدر اضافہ ہے۔ یہ عربی میں لکھی گئی اور 18 جنوری 1313ء کو مکمل ہوئی۔ یہ ترکی گرامر کی پہلی کتاب ہے جو اصول و قواعد پر مبنی ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے ایک حصہ میں دو ہزار دو سو ترکی الفاظ کے ہم معنی عربی الفاظ دیئے ہیں۔ دوسرے میں صوتیات (Phonetics) اور تصریف (Morphology) سے بحث کی ہے اور تیسرا نحو پر ہے، یہ عربی قواعد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ جس زبان پر گفتگو کی ہے وہ مشرقی ترکی ہے جو کسی حد تک تصحف کا شکار ہو گئی تھی۔ ابو حیان نے ترکی کو خفچاقی (Qipcaqi) اور ترکمانی سے ممیز کیا ہے۔ ترکی الفاظ کے علاوہ کتاب الادراک میں ساٹھ فارسی، بیس عربی اور کچھ منگولی و یونانی الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔

استنبول کے شہید علی پاشا کے کتب خانے میں عربی میں لکھی ہوئی ترکی گرامر کا ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے۔ اس گرامر کا نام "القوانین الکلیہ لضبط اللغۃ الترکیہ" ہے۔ اسے ابو حیان کی تصنیف بتایا جاتا ہے مگر یہ دراصل بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ ابوحیان کا انتقال 1344ء میں ہو گیا تھا۔ اس کتاب میں تیمورلنگ کی 1400ء میں دمشق کی غارت گری کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب ابو حیان کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ کتاب الادراک اللسان الاتراک کو مصطفیٰ بے نے مدون کر کے 1891-92ء میں قسطنطنیہ سے شائع کیا۔ اس ایڈیشن پر شرح اور انڈکس کا اضافہ کر کے استنبول سے 1930-31ء میں شائع کیا گیا۔

سعید الدین مسعود عمر التفتازانی کی پیدائش تفتازان میں، جو خراسان میں ہے 1322ء میں

ہوئی۔ اس نے عبدالرحمٰن ابن احمد الایجی (متوفی 1355ء) اور محمد التحتانی (متوفی 1365ء) سے تحصیل علم کی۔ کچھ عرصہ وہ مغربی خفچاق کے خان جانی بیگ محمود کے دربار سے وابستہ رہا، پھر فارس کے فرمانروا شاہ شجاع ابن محمد کے یہاں شیراز چلا گیا۔ پھر تیمور کے دربار سے وابستہ ہو گیا جہاں تیمور نے اس کے علم و فضل کی بنا پر بہت احترام سے رکھا۔ علی ابن محمد الجرجانی السید الشریف بھی 1387ء میں تیمور کے دربار میں آ گیا، ان دونوں عظیم علماء کے درمیان خوب نوک جھوک اور چشمک رہتی تھی۔ التفتازانی کا 1390ء میں سمرقند میں انتقال ہوا۔ وہ نسلاً ترک تھا۔ تفتازانی نے بیس کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بیشتر پرانی کتابوں کی شرحیں تھیں۔ اس نے صرف و نحو اور علم المعانی و البیان پر یہ کتابیں چھوڑیں:

(1) شرح تصریف الزنجانی۔ عبدالوہاب ابن ابراہیم الزنجانی 1254ء میں بغداد میں تھا۔ اس نے اسم کی تصریف یا گردان (Declensions) اور فعل کی گردان (Conjugations) پر ایک کتاب لکھی تھی جس کی تفتازانی نے 1338ء میں، جبکہ اس کی عمر صرف سولہ سال کی تھی، یہ شرح مرتب کی۔

(2) ارشاد الہادی۔ یہ تفتازانی نے اپنے بیٹے کے لیے 1372ء تا 1376ء میں خوارزم میں لکھی۔ اس پر بعد میں بہت سی شرحیں نکلیں۔

(3) الترکیب الجلیل۔ یہ تجویز ہے۔

(4) ترکیب غریب و ترتیب عجیب۔ یہ بھی علم نحو میں ہے۔

(5) شرح تلخیص المفتاح، تفتازانی نے ہرات میں 1347ء میں لکھی بعد میں 1355ء غجدوان میں اسے مختصر کیا۔ یہ محمد ابن عبدالرحمٰن خطیب دمشق کی "تلخیص المفتاح" کی شرحیں ہیں۔ اصل کتاب "مفتاح العلوم" یوسف ابن ابی بکر السکاکی نے تصنیف کی تھی جو علم المعانی و البیان پر سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے۔

(6) شرح القسم الثالث من المفتاح 1385ء یا 1387ء میں سمرقند میں لکھی۔ یہ مفتاح کے تیسرے حصے کی شرح ہے۔

(7) شرح فوابغ الکلم۔ یہ الزمخشری کے ضرب الامثال کے مجموعہ فوابغ الکلم کی شرح ہے۔

ان کے علاوہ تفتازانی نے منطق، فقہ، دینیات اور تصوف وغیرہ پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ الزمخشری کی مشہور تفسیر قرآن الکشاف کی شرح لکھی۔ امام ابو حنیفہ کے شاگرد محمد ابن الحسن الشیبانی نے حنفی فقہ پر "جامع کبیر" مرتب کی تھی۔ اس پر تفتازانی نے شرح تلخیص الجامع الکبیر لکھی۔ شافعی فقہ پر بھی شرح لکھی۔ ابن عربی کی "فصوص الحکم" کے غلط عقائد پر "فضیحۃ الملحدین" تصنیف

کی۔

یہ سب کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں ۔ صرف سعدی کی بوستان کا منظوم ترجمہ ترکی میں کیا ہے ۔ حیرت ہے کہ تفتازانی کی فارسی کی کوئی تصنیف دستیاب نہیں ، مگر گمان غالب ہے کہ فارسی میں بھی یقیناً تصنیفات چھوڑی ہوں گی۔

تفتازانی بہت بڑا عالم تھا ۔ بہت سے درباروں نے اسے بلایا مگر تیمور نے اسے کہیں اور جانے کی اجازت نہ دی کیونکہ اس سے اس کے دربار کے وقار میں کمی آجاتی ۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں تفتازانی کی بہت مدح سرائی کی ہے ۔ مشرقی ممالک میں اس کی کتابوں کے بہت سے ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ مغرب میں اس کی کوئی کتاب نہیں چھپی۔

ڈاکٹر لطفی ایم سعدی نے تفتازانی کی تصنیف "تہذیب المنطق و الکلام" کی ایک عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پلانک (Planck) اور آئن سٹائن (Einstein) کے نظریات سے تفتازانی کی یہ عبارت بہت مشابہ ہے ۔ سارٹن کہتا ہے کہ یہ تقابل بے محل ہے ۔ البتہ تفتازانی کے طبیعی نظریات اس کے مستحق ہیں کہ ان پر غور و خوض اور تحقیق کی جائے۔

ابوالبقا کمال الدین محمد ابن موسیٰ الدمیری 1344ء میں قاہرہ میں پیدا ہوا اور وہیں 1405ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ وہ عربی النسل تھا ۔ اس نے پانچ حج کیے اور پھر 1379ء کے بعد بیس سال تک مکہ مکرمہ میں رہا ۔ مذہباً وہ شافعی تھا اور اس نے النویوی کی "منہاج الطالبین" پر چار جلدوں میں شرح لکھی جس کا نام "النجم و الوہاج فی شرح المنہاج" ہے ۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "کتاب حیاۃ الحیوان" ہے ، اس میں بہت سے جانوروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں ۔ سارٹن کی رائے ہے کہ "کتاب حیاۃ الحیوان" کو لغتوں میں شمار کرنا چاہیے ۔ یہ جانوروں کی ایک بڑی تعداد کے بارے میں ادبی قاموس ہے ، اس میں بے شمار نام ، مرادفات اور استعارات آئے ہیں ۔ اس کے ایک حصے کو کہاوتوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

حیاۃ الحیوان بہت مقبول ہوئی ۔ اس کے تین طرح کے ایڈیشن نکلے (1) الکبرا (2) الوسطا (3) الصغرا ۔ اس کی تلخیص کی گئیں ۔ عربی ، فارسی اور ترکی میں ترجمہ ہوا ۔ اس میں نظم کا حصہ علیحدہ کر کے السیوطی نے اس کا نام "دیوان الحیوان" رکھا ۔ 1664ء سے قبل دیوان الحیوان کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا ۔ قاہرہ میں کتاب حیاۃ الحیوان کے 1858ء اور 1912ء کے درمیان پانچ ایڈیشن نکلے ۔ فارسی میں یہ 1859ء میں غالباً تہران میں چھپی ۔ کرنل اے ۔ ایس ۔ جی جیکر (Jayakar) نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو 8-1906ء میں بمبئی سے شائع ہوا ۔ یہ ترجمہ ایک ہزار اٹھانوے صفحات پر

مشتمل ہے ، پھر بھی چوتھائی کتاب کا ترجمہ رہ گیا ہے ۔ کچھ حصوں کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا ، جو اسٹراس برگ (Strasbourg) میں چھپا ۔ اونٹوں ، مویشیوں ، بھیڑوں اور ہاتھیوں سے متعلق عبارتوں کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا اور پیرس میں 1860ء میں شائع ہوا۔

جمال الدین محمد ابن محمد الآقرائی ۔ فخرالدین الازی کا پرپوتا تھا ۔ آقرائی کے معنی سفید محل کے ہیں ۔ اناطویہ میں کئی مقامات کا نام آق سرائے ہے ۔ یہ آقسرائے جو جمال الدین کا وطن تھا غالباً قرمان کی نمک کی بڑی جھیل کے جنوب مشرق میں جھیل سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے ۔ عثمانی سلطان مراد اول (1360ء تا 1389ء) کے عہد میں قرمان کے مدرسۃ السلسلہ میں وہ مدرس تھا ۔ یہ اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ اس کا وطن وہی آق سرائے ہے جو قرمان کے قریب واقع ہے ۔ اس کا سال ولادت معلوم نہیں اور نہ صحیح سال وفات ہی معلوم ہے ۔ اس کا انتقال 1368ء اور 1378ء کے درمیان ہوا ۔ اس نے طب ، تفسیر اور علم المعانی و البیان کی کتابوں پر شرحیں لکھیں جو یہ ہیں:

(1) ابن النفیس کی الموجز فی الطب کی شرح (2) الزمخشری کی الکشاف کی شرح اور (3) خطیب دمشق کی الایضاح فی المعانی و البیان کی شرح ۔ الموجز پر جو شرح ہے اس کا نام "حل الموجز" ہے ۔ یہ دہلی میں 1870ء میں اور لکھنو میں 1877ء اور 1908ء میں چھپی۔

ابوطاہر محمد ابن یعقوب مجدالدین الشیرازی الشافعی الفیروز آبادی 1329ء میں کازرون میں جو شیراز کے پاس ہے پیدا ہوا ۔ وہ فیروز آباد کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ وہ مشرقی ممالک میں مدتوں سفر کرتا رہا ۔ اس نے شیراز ، واسط ، بغداد ، دمشق اور یروشلم میں تعلیم پائی ۔ یروشلم میں اس کا استاد علی السبکی تھا ۔ یروشلم میں اس کا قیام دس سال رہا ۔ پانچ سال اس نے دہلی میں گزارے ۔ شیراز میں 1393ء میں تیمور سے ملاقات کی ۔ اس نے اناطویہ ، شام ، مصر اور ایران کے سفر کیے ۔ مکہ مکرمہ میں کئی بار قیام کیا ۔ وہاں اس کا سب سے لمبا قیام 1368ء سے 1382ء تک تھا ۔ وہ یمن کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا اور یمن میں بمقام زبید 1414ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس کو بقائے دوام بخشنے والا وہ عربی لغت ہے جو "القاموس" کے نام سے مشہور ہے ۔ قاموس کے معنی سمندر کے ہیں مگر اس لغت کے باعث قاموس کے معنی لغت کے ہو گئے ۔ جتنے عربی کے لغت اس کے بعد لکھے گئے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ القاموس ہی پر مبنی ہیں ۔ اس لغت میں الجوہری ، ابن سیدہ اور الحسن ابن محمد الصاغانی (متوفی 1252ء) وغیرہ کے لغات سے الفاظ لیے گئے ہیں ۔ کیونکہ ہر نئے لغت میں پرانے لغات کے الفاظ شامل کرنا لازم ہے مگر الفیروز آبادی نے نئے الفاظ بھی کافی شامل کیے ہیں ۔ بہت سے ادیبوں اور عالموں سے جن سے مختلف ملکوں میں اس کی ملاقات ہوئی ، اس نے الفاظ حاصل کیے ۔ اس کے علاوہ جنوبی عرب کی بولیوں نے بھی اسے بہت سے نئے الفاظ دیئے ۔ الفیروز آبادی کا مقصد دراصل عربی میں الفاظ کی افراط اور اس زبان کی وسعت دکھانا تھا ، اس لیے اس نے ہر نئے لفظ کو ادبی کسوٹی پر پرکھنے کو غیر

ضروری سمجھا ۔ جو لفظ بھی عربی میں بولا جاتا تھا اسے حق تھا کہ لغت میں جگہ پائے ۔ اس نے ہزار لفظ ایسے بتائے جو بحیثیت نام یا بحیثیت استعارہ تلوار کے معنوں میں آتے ہیں ۔ اسی طرح شہد کے لیے اسی الفاظ تلاش کیے ۔ قاموس میں مقامات اور اشخاص کے اسمائے علم (Proper Names) دیئے گئے ہیں ۔ لسان العرب میں ایسے نام شامل نہیں کیے گئے تھے ۔ قاموس پر سب سے اہم شرح کا نام "تاج العروس" ہے ۔ یہ مصری عالم محمد المرتضیٰ الزبیدی کی تصنیف ہے ۔ الزبیدی 1732ء میں پیدا ہوا اور اس کی وفات 1791ء میں ہوئی۔

قاموس اکثر نقل کی گئی ۔ اس کے ترجمے ہوئے اور اس پر عربی ' فارسی ' ترکی میں شرحیں لکھی گئیں ۔ قاموس بہت بار چھپی ۔ کلکتہ میں 1817ء میں قاموس دو جلدوں میں چھاپی گئی ۔ اس میں میتھیولمسڈن (Mathew Lumsden) کا انگریزی میں دیباچہ شامل ہے ۔ اس کے بعد بمبئی میں 1855ء اور 1881-83ء میں تہران میں ' 1859ء اور 1860ء میں قاہرہ میں 1863-64ء میں بولاق میں 1872ء اور لکھنؤ میں 1873ء اور 1881ء میں شائع ہوئی ۔ اس کا فارسی ترجمہ "ترجمان اللغۃ" کے نام سے تہران میں 1857ء اور 1860ء میں چھپا اور ترکی ترجمہ "الاوقیانوس البسیط" کے نام سے قسطنطنیہ میں 1815-17ء ' 1815-88ء ' 1987-88ء اور 1988ء میں چھپا ۔ بولاق میں ترکی ترجمہ 1834ء میں چھپا۔ الفیروز آبادی نے پیغمبر اسلام کی سیرت پر فارسی میں ایک کتاب لکھی۔

ترکی لسانیات کی ترقی

چودھویں صدی کے نصف ثانی میں اور اس کے بعد بہت سی کتابیں ترکی میں چھپیں ۔ تفتازانی نے 1354ء میں بوستان سعدی کا ترکی میں ترجمہ کیا ۔ صلاح الدین یازی ای (Yaztyi) احمدی اور احمد واعی نے ترکی میں ناصحانہ شاعری کی ۔ اسحق ابن مراد حاجی پاشا اور شرف الدین ابن علی نے طب پر ترکی میں کتابیں تصنیف کیں ۔ بیطاری پر ترکی میں ایک کتاب ہے جو 1361ء سے 1400ء کے درمیان لکھی گئی ۔ محمود ابن محمد البار جلیسی نے شاہین بازی پر کتاب لکھی۔

مصر میں جہاں مملوک ترکوں کی حکومت تھی ' ترکی زبان کو کافی فروغ ہوا ۔ احمدی اور حاجی پاشا نے قاہرہ میں تعلیم پائی ۔ حاجی پاشا وہاں کے سب سے بڑے شفاخانے کا رئیس الاطباء مقرر ہوا ۔ اس نے طب پر ترکی میں کتاب لکھی جس سے اوروں کو بھی اس کی ترغیب ہوئی ۔ العینی نے مملوک سلطان ططار کے لیے حنفی فقہ کی ایک کتاب کا ترکی میں ترجمہ کیا اور دوسرے مملوک سلطان الاشرف بارس بے (Bars Bey) کے لیے ' جس نے 1422ء سے 1438ء تک حکومت کی ' اپنی تاریخ کو ترکی میں منتقل کیا۔

تیمور کے دربار میں زیادہ تر ترکی ہی بولی جاتی تھی ۔ ابن عرب شاہ نے جسے تیمور دمشق سے پکڑ کر سمرقند لے گیا تھا ' ترکی سیکھی اور بعد میں عثمانی سلطان محمد اول ابن بایزید کے لیے بہت سی عربی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کیا۔

ہندوستان کے مغل بادشاہوں میں ظہیرالدین بابر نے اپنی سوانح عمری ترکی میں لکھی ۔ غالباً "تزوکات تیموری" بھی ترکی میں لکھی گئی تھی ۔ بعد میں اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا ۔ اکبر اعظم (1556ء سے 1605ء) ابتدا میں صرف ترکی بولتا تھا ۔ پھر رفتہ رفتہ فارسی اور اردو بولنے لگا ۔ ایران کے بادشاہوں کا صفوی خاندان ترکی خاندان تھا ۔ چنانچہ اس کے دور حکومت کے ابتدائی زمانے میں ایران کی درباری زبان ترکی تھی ۔ اتنے سارے اسلامی ممالک میں ترکوں کی حکومت ہونے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی زبان خوب پھلی پھولی۔

اس صدی کے تیسرے عشرہ میں شام کے نامور مورخ و محقق محمد کرد علی شامی نے ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی جس کا نام "الاسلام و الحضارۃ العربیہ" ہے ۔ اس کا ترجمہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے جناب معین الدین احمد ندوی نے 1952ء میں "اسلام اور عربی تمدن" کے نام سے کیا ۔ اس کتاب میں عربی زبان کے نفوذ ' مقبولیت اور عالمگیر اثر کے بارے میں مفید معلومات جمع کی ہیں اور یہ بھی دکھلایا ہے کہ کن اسباب کی بنا پر عربی علوم پر انحطاط طاری ہو گیا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب شامی کے محققانہ نظریات سے استفادہ کیا جائے ۔ وہ لکھتے ہیں:

"عربی زبان قرآن مجید کے ذریعہ کامل اور مکمل شکل میں ظاہر ہوئی اور جس تیزی سے عربوں کی فتوحات ہوئیں اسی تیزی سے عربی زبان بھی پھیلی ..... عربی زبان کے ہر دور میں ' خواہ وہ اس کی قوت کا زمانہ رہا ہو یا ضعف کا ' اس کو خاص اہمیت و امتیاز حاصل رہا ہے اور ان مسلمان عجمی (یعنی غیر عرب) سلاطین کے زمانے میں بھی جو عربی ملکوں پر قابض ہو گئے تھے ۔ ترکوں کے علاوہ ایرانی ' چرکسی ' کرد ' اور بربر وغیرہ سارے سلاطین عربی زبان ہی میں معاہدے اور دستاویزیں وغیرہ لکھتے تھے اور اسلامی حکومتوں سے عربی میں سرکاری مراسلت کرنے کے لیے عرب ممالک سے عربی زبان کے ماہر کاتب اور منشی بلا بھیجتے تھے ۔ اندلس ' شام و مصر ' بغداد و جزیرہ اور فارس و سندھ وغیرہ تمام اسلامی ملکوں کی قرون وسطیٰ کی تاریخ اس کی شاہد ہے ۔ عربی کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ وہ ایک ہزار سال تک اسلامی مشرق سے تعلق رکھنے والی حکومتوں کی زبان رہ چکی ہے" ۔ ستر سال کی مختصر مدت میں بہت سے ملکوں کی زبان عربی ہو جانے کے بارے میں وہ کئی وجوہ پیش کرتے ہیں : "مسلمانوں نے جن جن ملکوں میں بود و باش اختیار اور حکومت کی وہاں ان کے موالی اور نئے اسلام قبول کرنے والوں کی وجہ سے ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے ۔ ان کے علاوہ عرب کے بہت سے قبائل نے ترک وطن کر کے

شام، عراق، مصر، شمالی افریقہ، اندلس اور جزیرہ وغیرہ میں سکونت اختیار کر لی اور اسی بنیاد پر اس عظیم الشان رقبہ کی تعریب کی عمارت تعمیر ہوئی اور ذمی فطرتاً عربی سیکھنے لگے ..... انہوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت مجوسیوں، یہودیوں، صائبین، نصاریٰ کے لیے ملازمت کے دروازے کھول دیئے اور قبطیوں، ایرانیوں، رومیوں، اسپینیوں، پرتگالیوں اور اطالویوں وغیرہ سے خدمت (یعنی اپنے کاروبار میں مدد) لینے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ اس لیے عربی حریت کے ماتحت موافق و مخالف سب کی مصلحتیں ایک ہو گئیں اور ذمی بھی مسلمانوں کے مخلص بن گئے اور ان کی حکومت کے زیر سایہ قابل رشک زندگی بسر کرنے لگے۔ ان سب کے تعاون سے ایک روشن و تاباں تہذیب پیدا ہوئی اور چند برس کے اندر عربی زبان نے ایران و عراق میں فارسی اور سریانی کو، شام میں رومی اور سریانی کو مصر میں قبطی اور رومی کو شمالی افریقہ میں لاطینی کو بے حقیقت بنا دیا اور ستر سال کے عرصے میں ان تمام ملکوں کی زبان عربی ہو گئی ..... ان عربی قبیلوں کی صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکتی جو جزیرۃ العرب سے نکل کر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مفتوحہ علاقوں میں آباد ہو گئے تھے ..... اسلام کے ابتدائی پچاس برسوں میں جو قبائل مفتوح ملکوں میں آباد ہوئے ان کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ بعض لوگوں کے تخمینہ کے مطابق، جو عرب اس زمانہ میں شام میں آباد ہوئے ان کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ بعض لوگوں کے نزدیک جو عرب اس زمانہ میں شام میں آباد ہوئے ان کی تعداد ڈھائی لاکھ بتائی جاتی تھی اور جب شام میں جو جزیرۃ العرب سے اس قدر قریب ہے، اتنی تعداد تھی تو دوسرے ملکوں میں اس سے بھی کم رہی ہو گی۔ عربی زبان کی اشاعت کو اس سے بڑی مدد ملی کہ نماز عربی میں فرض تھی۔ اس لیے جو عجمی (غیر عرب) اسلام قبول کرتے وہ عربی سیکھتے۔

عربی زبان کی پختگی

جناب شامی نے عربی زبان کی فطری وسعت و سلاست اور اس کی اشاعت کی وجہ بھی بتائی ہے جو یہ ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کے الفاظ کے لیے اپنا دامن تنگ نہیں کیا اور بے تکلف فارسی، رومی، سریانی، عبرانی، حبشی، قبطی اور ہندوستانی الفاظ قبول کیے اور بہت سے پرانے جاہلیت کے الفاظ ترک کرائے اور ایسی اصطلاحیں وضع کیں جن میں ان کے پرانے معنی کے بجائے نئے معنی پیدا ہو گئے۔ اس طرح عربی علمی زبان بھی بن گئی۔

سامی زبانوں کی تاریخ میں عربی زبان کا جائزہ لیتے ہوئے رینان اس بات پر تعجب کرتا ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو مختلف مدارج سے نہ گزری ہو۔ لیکن عربی جو نہایت غیر معروف زبان تھی مگر دفعتاً ایک پختہ زبان کی شکل میں نمودار ہوئی۔ وہ لکھتا ہے:

"یہ زبان ابتدا میں نہایت غیر معروف تھی مگر دفعتاً انتہائی کامل صورت میں ظاہر ہوئی یہ انتہائی سلیس اور بڑی دولت مند زبان ہے۔ یہ شروع سے اتنی مکمل تھی کہ اس زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک اس میں کوئی اہم تغیر نہیں ہوا، نہ کبھی اس کا بچپن تھا اور نہ کبھی اس پر بڑھاپا آیا۔ یہ ابتدا ہی سے نہایت مکمل اور مضبوط شکل میں ظاہر ہوئی۔ ہمارے علم میں عربی کے علاوہ روئے زمین کی تمام زبانوں میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے کہ جس کو حصول کمال میں مختلف مراحل سے نہ گزرنا پڑا ہو ..... اور نہ تاریخ میں اس سرعت کے ساتھ عربوں جیسی عظیم الشان فتوحات کی مثال ملتی ہے۔ اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے کہ عربی زبان دنیا کے بڑے حصے پر چھا گئی اور اس کے اس شرف و امتیاز میں کہ عربی عام و مقبول زبان تھی۔ دینی و سیاسی زبان تھی اور قوموں کے اختلاف سے بلند تھی۔ صرف دو زبانیں اس کے مقابل تھیں، ایک لاطینی اور دوسری یونانی لیکن ان دونوں کو عربی زبان کے رقبہ کی وسعت سے جس میں وہ پھیلی، کوئی نسبت نہیں۔

بیشک یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ کوئی زبان مختلف مدارج سے گزرے بغیر منزل کمال پائے مگر اس کی وجہ بھی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مسلمان جس زبان کو لے کر نکلے تھے وہ قرآن کی زبان تھی اور قرآن خود اس بات پر شاہد ہے کہ کسی انسان کی تالیف نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ جو کلام اللہ کا کلام ہو گا اسے کامل ترین ہونا ہی چاہیے۔ اس میں نہ بچپنے کے آثار نظر آئیں گے اور نہ اس کو بڑھاپا چھوئے گا۔ یہ اعتراف کہ جس دن سے عرب فاتحوں نے دنیا کو عربی سے متعارف کرایا، اسی دن سے وہ درجہ کمال پر نظر آئی، قرآن کی زبان کے الہامی زبان ہونے کا اعتراف ہے۔ قرآن کے نزول کو چودہ صدیاں گزر گئیں۔ کوئی اور زبان ایسی نہیں جو دعویٰ کر سکے کہ وہ آج بھی ویسی ہے جیسی چودہ سو سال پہلے تھی۔ رینان کا یہ کہنا کہ اس زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک عربی میں کوئی اہم تغیر نہیں ہوا، حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پر مبنی ہے۔ البتہ ان لوگوں کے لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں جو قرآن کو کلام الٰہی مانتے ہیں[1]۔

ایران نے عربی کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا۔ جناب شامی نے مختلف ممالک میں عربی کے نفوذ و اثر کا جائزہ گہری نظر سے لیا ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ گو ایران کے بڑے بڑے شہروں میں عربی قبول کر لی گئی تھی مگر دیہاتوں میں بہت عرصہ تک پہلوی و کردی ہی رائج رہی۔

1- یہ بھی قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی قرآن کریم کا ایک لفظ متروک یا غریب نہیں سمجھا گیا۔ (ماہر القادری)

"سب سے پہلے وہ (عربی) شام 'اس کے بعد عراق اور پھر ایران و مصر میں داخل ہوئی اور دو ہی پشتوں میں ایران کے علاوہ ان تمام ملکوں میں پھیل گئی۔ ایرانیوں ..... میں سے کچھ لوگوں نے معلاً اہل خراسان نے بطیب خاطر اسلام قبول کیا تھا لیکن عام طور سے ایرانیوں میں چوتھی صدی تک مجوسیت غالب رہی اور ان کا کوئی شہر اور کوئی علاقہ آتشکدوں سے خالی نہ تھا اور وہاں مجوسیوں کی تعداد غالب تھی۔ اگرچہ ایران کے بڑے بڑے مرکزی شہروں 'اصفہان 'مرو 'نیشاپور 'رے اور ہمدان وغیرہ میں عربی رنگ تھا اور ان میں تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک بڑے بڑے علما اور ادیب پیدا ہوئے اور ایرانیوں نے گو ظاہر میں عرب اور عربیت کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن ان کا دل ہمیشہ اس کے خلاف رہا..... باوجویکہ خلافت عباسیہ کے زمانے میں ایران کے شہروں میں بہت سے علمی مرکز تھے لیکن عربی زبان صرف چند مخصوص علمی مرکزوں تک محدود تھی حالانکہ وہ سرکاری اور علمی زبان تھی 'یہ شہروں کا حال تھا۔ دیہاتوں میں عربی مطلق نہ تھی بلکہ ان کی زبان پہلوی اور کردی تھی۔

قومی عصبیت کے باوجود حالات نے ایران کو عربی الفاظ قبول کرنے پر مجبور کیا' چنانچہ موجودہ فارسی میں بقول جناب شامی آدھے الفاظ عربی کے ہیں۔ کچھ انصاف پسندوں کو چھوڑ کر یورپ کے بیشتر مورخ یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ عربوں نے ایران میں نہ تو کوئی آتشکدہ رہنے دیا اور نہ کسی آتش پرست کو۔ حالانکہ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ ایران کو حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کے ساتھیوں نے فتح کیا تھا۔ وہ رسول اللہ کے صحابی تھے اور اللہ کے اس حکم کو اچھی طرح جانتے تھے کہ

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (بقرہ-256)

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے........

فتوحات کے زمانے میں حضرت عمر فاروق ایسے خلیفہ کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی جو ارشاد الہیٰ اور سنت رسولؐ کی پیروی میں انتہائی محتاط تھے اور جو مدینہ سے بیت المقدس تک صرف اس لیے گئے تھے کہ وہاں کے مفتوح عیسائی صحیح طور پر جان لیں کہ اسلامی سلطنت میں ذمیوں کے کیا حقوق ہیں اور دوسروں کے مذہب میں مداخلت کس قدر معیوب سمجھی جاتی ہے' چنانچہ حضرت عمر

نے جو عہد نامہ تحریر کر کے مفتوح عیسائیوں کو دیا تھا وہ اسلامی رواداری اور فراخدلی کی بہترین مثال ہے۔ سرٹامس آرنلڈ نے اپنی مشہور تصنیف "دعوت اسلام" (Preachings of Islam) میں اسے نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ کا بندہ اور مسلمانوں کا امیر عمر بن الخطاب' ایلیا (Aelia) کے لوگوں کو ضمانت دیتا ہے کہ بیمار ہوں یا تندرست سب کو امان ہے۔ ان کی املاک' کلیسا' صلیبیں اور جو کچھ بھی ان کے مذہب سے متعلق ہے سب محفوظ رہیں گے۔ کلیسا سکونتی مکانوں میں تبدیل نہیں کیے جائیں گے' نہ منہدم کیے جائیں گے۔ نہ ان میں اور نہ ان کے لوازمات و لواحقات میں کوئی تخفیف کی جائے گی۔ نہ لوگوں کی صلیبوں میں یا جو کچھ بھی ان کے قبضہ میں ہے 'اس میں کمی کی جائے گی۔ نہ ان پر مذہبی معاملات میں کوئی بندش لگائی جائے گی اور نہ ان میں سے کسی کو کسی طرح کا نقصان پہنچایا جائے گا۔

یہ تھا ان کا مسلک جن مسلمانوں نے ایران' عراق' شام و مصر فتح کیے تھے اور جو خدا اور اس کے رسول کے ایک ایک حکم کا اتباع کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے خدا کے کسی حکم کو پس پشت ڈال کر مذہب کے معاملے میں تشدد روا رکھا ہوگا۔ یہ ایران کی خوش قسمتی سمجھی جانے یا شومئی بخت کہ عراق' شام' فلسطین' مصر اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک کی طرح اس نے عربی کو اپنی زبان کی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ یورپ زدہ لوگ جو قومیت کو مذہب پر ترجیح دیتے ہیں' ضرور اسے خوش قسمتی سمجھیں گے' لیکن ایرانی عوام جن کا مذہب اسلام ہے ان کے لیے یقیناً یہ شومئی بخت ہے کہ وہ اس الہامی کتاب کی زبان سے محروم کر دیئے گئے جسے روزانہ پڑھنا بڑی سعادت ہے اور جس زبان میں وہ اپنی عبادت کو بجالانے کے لیے مکلف کیے گئے ہیں۔ ایران کی اس محرومی نے افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس سعادت سے محروم رکھا۔ ہندوستان کے بڑے حصہ پر جن سلاطین نے حکومت کی وہ اگر فارسی بولنے والے نہ ہوتے بلکہ عراقیوں' شامیوں' مصریوں وغیرہ کی طرح عربی کو اپنا چکے ہوتے تو شاید آج ہم بھی اس مقدس زبان کے رشتہ میں منسلک ہوتے۔ قوتوں کے اتحاد میں زبان بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر پاکستان سے لے کر بحر ظلمات تک ایک زبان بولنے والے ہوتے تو ایک دوسرے کے دکھ درد اور راحت و مسرت میں بہتر طور پر شریک ہو سکتے تھے۔ دوسرے ممالک میں عربی کے نفوذ کے بارے میں جناب کرد علی شامی لکھتے ہیں:

اندلس میں عربی کی مقبولیت

اندلس کی فتح کے کل پچاس برس کے اندر وہاں عربی اتنی عام اور مقبول زبان بن گئی تھی کہ ارباب کلیسا اپنی نمازوں کا ترجمہ عربی میں کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے تاکہ عام عیسائی اس کو سمجھ سکیں۔ وہ عربی پر ایسے شیفتہ ہو گئے تھے کہ عربوں کی طرح عربی زبان لکھتے تھے اور اپنے معاملات کی کتابت عربی ہی میں کرتے تھے۔ اس قسم کی دو ہزار تحریریں اسپین میں ملی ہیں جنہیں وہاں کے اصلی باشندوں نے عربی میں لکھا تھا۔ خاص اندلس کے عربی کے واقف کاروں کو چھوڑ کر جلیقیہ، قشتالیہ اور لیون وغیرہ کا ذہین طبقہ عربی بولتا تھا اور اندلس کے خلفا اور ان کے امرا داعیان کے پاس حصول ملازمت کے لیے آتا تھا..... اسپینی زبان میں اب تک عربی کے بکثرت الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شہروں، دریاؤں اور اندلس کے مختلف مقالوں اور بعض مسلمانوں کے نام اور اصطلاحیں وغیرہ۔ اسپینی زبان کے سینکڑوں الفاظ کے شروع میں تعریف کا الف لام ہے جو ان کے عربی ہونے کا بین ثبوت ہے..... اسی طرح پرتگالی، فرانسیسی، اطالوی اور دوسری لاطینی زبانوں میں بھی عربی الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن عربی کا زیادہ اثر اسپینی اور پرتگالی پر ہے..... پرتگالی زبان میں تقریباً تین ہزار الفاظ ہیں جن میں اکثر الفاظ کے شروع میں اب تک عربی کا الف لام موجود ہے۔ اسپینی زبان کے اندازاً ایک چوتھائی الفاظ عربی سے ماخوذ ہیں۔"

اندلس میں عربی کی درگت

قشتالیہ کے بادشاہ فرڈی نینڈ نے جنوری 1492ء میں غرناطہ کی آخری اسلامی ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا مفتوح مسلمانوں سے جو معاہدہ ہوا، اس کی روح سے انہیں مذہب کی پوری آزادی تھی مگر معاہدہ پر عمل نہ ہوا۔ مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کے عدالت تحقیق مذہب (Inquistion) کے حوالے کیا جانے لگا۔ عیسائی کارڈینل نے جو عدالت کا حاکم تھا، حکم نافذ کیا کہ جو مسلمان عیسائی مذہب اختیار نہ کریں انہیں قتل کر دیا جائے۔ ڈومینکی بلیڈا نے اس پر بھی قناعت نہ کی بلکہ جو مسلمان عیسائی ہو گئے تھے انہیں یہ الزام لگا کر کہ وہ صدق دل سے عیسائی نہیں ہوئے ہیں، قتل کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا اور جو ایک لاکھ مسلمان اسپین چھوڑ کر افریقہ کی اسلامی سلطنتوں میں پناہ لینے جا رہے تھے ان میں سے تین چوتھائی کو راستہ میں قتل کرا دیا۔ جناب شامی لکھتے ہیں:

"سیڈیلیو کا بیان ہے کہ فرڈی نینڈ کی فتح سے لے کر عربوں کی آخری جلاوطنی تک اسپین کے تیس لاکھ آدمی ضائع ہوئے..... لیبان کا

بیان ہے کہ اس قتل و ہلاکت کے مقابلے میں سینٹ بارتھیلیو کی قتل گاہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان تین مقتلوں کا (جو ایک صدی کے اندر اسپین میں تین بار ہوئے تھے)، جیسا وحشیانہ اور سنگدلانہ حادثہ بڑے سے بڑے وحشی اور سنگدل فاتحوں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ یہ اسپین کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس نے جس تیس لاکھ رعایا سے اپنے ہاتھوں اپنے کو محروم کیا ان میں تمام تر اونچے طبقے کے علما اور صناع تھے.....اسی کے ساتھ ساتھ کارڈینل سیزمروس نے اسلامی علوم کی کتابیں جلوا دیں..... پھر قشتالہ کے تمام مسلمان عیسائی بنائے گئے..... اور 1566ء میں میڈرڈ میں یہ حکم صادر ہوا کہ جو مسلمان اسپین میں باقی رہ گئے ہیں، وہ عربی زبان استعمال نہ کریں..... ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے رسوم و رواج چھوڑ دیں، اپنا لباس اور طرز زندگی بدل دیں"۔

اس کے بعد پرتگال میں جو مظالم ہوئے ان کو جناب کرد علی شامی بیان کرتے ہیں:

"جب وہ مسلمان لشبونہ (Lisbon) سے نکالے گئے تو پرتگالیوں نے فرانسیسی انگریز، جرمن اور بلجیم کے بحری ڈاکوؤں کی مدد سے مسلمانوں کے ساتھ بڑا وحشیانہ اور سنگدلانہ برتاؤ کیا۔ ان کے مردوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور عورتوں کو قتل کر دیا۔ مسلمانوں کی ہر چیز برباد کر دی۔ حتیٰ کہ غذا کا ذخیرہ تک جلا دیا"۔

"لیبان کا بیان ہے کہ غرناطہ میں کارڈینل کسمینس کو عربی کے مخطوطات مل سکے اور جن کی تعداد اسی ہزار تھی"۔

"(یہ ایک شہر غرناطہ کی کتابوں کی تعداد ہے) جلانے کے بعد اس کو یہ یقین تھا کہ اب اس کے دین کے دشمنوں کا نام تاریخ سے ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا"۔

جناب شامی لکھتے ہیں کہ غرناطہ کی کتابیں جلوانے کے بعد کارڈینل کسمینس نے 1511ء میں عام حکم جاری کر دیا کہ پورے اندلس کی عربی کتابیں برباد کر دی جائیں، چنانچہ پوری نصف صدی تک اس اندھے تعصب پر عمل ہوتا رہا۔ اگر عربی کتابوں کے لاطینی ترجمے باقی نہ رہ گئے ہوتے تو عربی تمدن کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ عربی کے ان بیش قیمت مخطوطات کو بھی جو آج کل اسکوریال کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں، آگ کا ایندھن بنا دینا چاہا تھا مگر مرکیز فیلاڈالا کے دل میں کچھ رحم آ گیا اور اس نے انہیں بچا لیا۔

والٹیر کا بیان ہے کہ "جس زمانہ میں عربوں نے اندلس فتح کیا تھا تو کسی نصرانی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ مگر جب عیسائی غرناطہ پر قابض ہوئے تو کارڈینل کسمینس نے اپنی دینی حمیت کے جذبے میں یا اس لیے کہ وہ ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتا تھا جو اس کے دبدبہ کے سامنے سرنگوں رہے، سارے عربوں کو عیسائی بنانا چاہا اور پچاس ہزار عربوں کو مجبور کیا کہ وہ اس مذہب کو قبول کریں، جس پر ان کا ایمان نہیں ہے"۔

یہ حشر ہوا اسپین اور پرتگال میں عربی اور عربوں کا۔ جو عرب عیسائی ہو گئے تھے وہ بھی اپنی مادری زبان بولنے اور لکھنے سے قانوناً روک دیئے گئے۔ البتہ اگر وہ اسپینی لکھنا چاہتے مگر اسپینی رسم الخط سے ناواقفیت کے باعث نہ لکھ سکتے تو انہیں اسپینی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی اجازت تھی، جو اسپینی زبان عربی رسم الخط میں لکھی گئی وہ خمیازو کے نام سے موسوم ہے۔

صقلیہ میں عربی زبان اور عربی تمدن

مسلمانوں نے صقلیہ (سسلی) کو 212ھ بمطابق 827ء میں فتح کیا تھا اور اس کے دارالحکومت پالرمو پر ان کا قبضہ 831ء میں ہوا تھا۔ اس کا فاتح سلطان زیادۃ اللہ بن اغلب فرمانروائے افریقیہ کا نائب قاضی اسد بن فرات تھا۔ تھوڑے دنوں بعد جنوبی اٹلی پر بھی مسلمانوں کی حکومت ہو گئی۔ صقلیہ پر مسلمانوں کی حکومت 484ھ بمطابق 1091ء تک یعنی تقریباً پونے تین سو سال رہی۔ اس میں مسلمانوں نے اسے جنت ارضی بنا دیا اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک کیا، انہیں تہذیب و تمدن سے صحیح معنوں میں آشنا کیا اور اس تہذیب سے یورپ نے بہت استفادہ کیا۔ جناب شامی لکھتے ہیں:

"عرب فاتحوں نے سسلی پر قبضہ کے بعد اس کے باشندوں کے عادات و رسوم، قوانین اور مذہبی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ ان کو بجنسہٖ قائم رکھا اور صرف معمولی خراج لینے پر اکتفا کیا جس کی مقدار یونانیوں کے زمانے کے خراج سے بہت کم تھی۔ زراعت اور صنعت و حرفت کو زندہ کیا اور بہت سی نئی چیزوں ..... کی کاشت کی جو پہلے سسلی میں نہیں تھیں۔ آبپاشی کا ایسا عمدہ نظام قائم کیا جو ہمیشہ آنکھوں کو دعوت نظارہ دیتا رہا۔ سسلی کے باشندوں کو نل اور پمپ کی نالیوں کا طریقہ سکھایا جس سے وہ

بالکل ناواقف تھے۔ کاغذ سازی کے کارخانے قائم کیے اور یہ صنعت سسلی سے ہی اٹلی پہنچی۔ سسلی میں سونے چاندی، پھٹکری، سرمہ، لوہے، سیسے اور نوشادر کی کانیں کھودیں اور اہل جزیرہ کو ریشم بنانے کی صنعت سکھائی ..... عرب، تونس اور سسلی کی بعض بندرگاہوں کے جہاز سازی کے کارخانوں میں جہاز تیار کرتے تھے ..... اماری نے اپنی کتاب "مسلمان سسلی" میں لکھا ہے کہ سسلی کی محکوم رعایا مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں بڑی راحت و مسرت کی زندگی بسر کرتی تھی اور اس کی حالت اس کے ان اطالوی بھائیوں سے کہیں بہتر تھی، جو جرمنوں اور فرنگیوں کے ماتحت پر محن اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سسلی کے تمام بڑے اور مرکزی شہروں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، ان میں سے بعض شہر نہایت خوبصورت تھے۔ ادریسی، قزوینی، یاقوت اور ابن حوقل نے ان کے اوصاف تحریر کیے ہیں۔ چنانچہ پامو کی جامع مسجد کے حالات میں ہے کہ اس کی صناعیوں کا تصور بھی ذہن میں نہیں لایا جا سکتا۔ پامو میں تین سو سے زیادہ اور اکثر شہروں مثلاً قطانیہ وغیرہ میں بکثرت مسجدیں تھیں، قریۃ البیضاء میں دو سو مسجدیں تھیں۔ ادریسی پامو کے حالات میں لکھتا ہے کہ اس شہر میں ایسی خوبصورت عمارتیں ہیں کہ سیاح و مسافر ان کے تعمیری حسن و جمال کا اشتہار دیتے پھرتے ہیں ... .. گیارہویں صدی عیسوی میں سسلی کے ہر شہر میں مسلمانوں کے خاص خاص محلے تھے جن میں وہ رہتے تھے اور ان کے خاص بازار اور حکام تھے۔ ہر شخص کو پوری آزادی تھی اور گرجے مسجدوں کے برابر تھے"۔

مسلمانوں کی آبادی جزیرہ کی کل آبادی کا نصف تھی۔ مسلمانوں کے بعد صقلیہ میں نارمنوں کی حکومت آئی تو انہوں نے مسلمانوں کی تہذیب کو اپنایا۔ مسلمان علما و حکما کو عزت سے رکھا اور مسلمانوں سے اچھا سلوک کیا یہ بات پاپائے روم کو پسند نہ تھی۔ کئی نارمن بادشاہوں پر مسلمان ہونے کا الزام لگایا۔ بالآخر پوپ اربن چہارم نے فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کی مدد سے نارمنوں کا تختہ الٹ دیا اور 663ھ میں لوئی کے بھائی کو تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم شروع ہو گئی۔ جو عیسائیت قبول کر لیتے وہ مرانیہ کہلاتے۔ بہت سے مسلمان ہجرت کر کے افریقہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ جو مسلمان نہ عیسائی ہوئے اور نہ صقلیہ چھوڑ کر بھاگے، ان کی اقتصادی اور معاشرتی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ وہ کھیتی باڑی کر کے یا مویشی چرا کے گزر اوقات کرنے پر مجبور ہوئے۔ جناب شامی لکھتے ہیں کہ:

"عربوں نے اپنے بعد سسلی میں اپنے بہت سے عادات و اطوار، اور سسلی اور اطالوی زبانوں میں عربی کے بہت سے الفاظ یادگار چھوڑے جو اب تک باقی ہیں۔ چنانچہ سسلی کے بہت سے مقاموں خصوصاً قلعوں، بندرگاہوں اور عام شاہراؤں کے نام برابر عربی رہے۔ قلعوں کے نام کے شروع میں قلعۃ کا لفظ ان کے ناموں کا جز ہے ان میں سے بعض قلعے اب شہر بن گئے ہیں۔ مثلاً قلعۃ النساء، قلعۃ فیمی، قلعۃ الحسن، قلعۃ البلوط۔ اسی طرح بندرگاہوں میں مرسی علی، مرسی المینا۔ منزل یوسف ارمل الموتہ، رمل السلطانہ، القنطرہ، وادی الطین، راس القلب، راس الخزیر اور راس القرن وغیرہ عربی ہیں۔ پامو کی سب سے بڑی سڑک کا نام آج بھی القصر ہے۔ اس شہر میں دو بڑے محل عربوں کی یادگار ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام قبہ اور دوسرے کا نام قلعۃ العزیزہ ہے۔ عربوں نے سسلی میں تعمیری آثار سے زیادہ علمی اثرات چھوڑے۔ رینالڈی کا بیان ہے کہ ان بے شمار الفاظ کا بڑا حصہ جو اطالوی زبان میں پائے جاتے ہیں، عربوں کے حاکمانہ اقتدار کے راستہ سے نہیں بلکہ اس تہذیب کی راہ سے داخل ہوا جو زندگی کے مختلف مظاہر کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے ..... اطالیہ کے ان تمام شہروں کے عوام کی زبان میں جو مشرق اور سسلی سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے، بہت ایسے الفاظ ہیں جن کی اصل عربی ہے۔ یہ الفاظ عربی تجارت کی راہ سے داخل ہوئے اور ان میں سے بہتیرے الفاظ اب تک ان کی لغت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس کے بعد اس نے اوزان اور پیمانوں کے نام، اور عربی الفاظ پیش کیے ہیں جو عربی سے اطالوی زبان میں لیے گئے اور لکھا ہے کہ سسلی کے مشہور مستشرق اماری نے یہ ثابت کیا ہے کہ وطنی شاعری کی ایجاد میں اس حیثیت سے سسلی عربوں کا مقروض ہے اور اٹلی سسلی کا کیونکہ جب سسلی کے دربار نے اسلامی بادشاہی کا لباس پہنا، اس وقت اس کی توجہ شاعری کی طرف ہوئی جو اطالوی شاعری کی بھی ترقی کا وسیلہ بنی ــــ رینالڈی کا بیان ہے کہ عربوں نے تنہا سسلی اور اطالیہ کی شاعری ہی کو مدد نہیں پہنچائی۔ بلکہ ہمارے قصوں اور افسانوں کی شکل صورت اور اس کے مواد میں بھی مدد دی۔ اس بیان سے اسپین کے نامور مستشرق اسپین کی اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ اطالوی شاعر دانتے نے اپنے قصہ المهزلۃ الالٰہیہ (Divine Comedy) کا مواد معری کے رسالہ الغفران سے اخذ کیا ہے ...... عربوں نے پامو میں طب کا سب سے پہلا مدرسہ قائم کیا جس کی مثال سارے

یورپ میں نہ تھی۔ سسلی کی اس عربی درسگاہ کے قیام کے بہت بعد یورپ میں دوسری طبی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ عربی زبان ملک کے باشندوں میں اتنی سرایت کر گئی تھی کہ عربوں کے ملک سے نکلنے کے بعد بھی اس کو یہاں عیسائی ایک مدت تک گفتگو اور تحریر میں استعمال کرتے اور ہجری تاریخ لکھتے رہے"۔

بحرمتوسط کے کچھ دور جزیروں میں بھی عربی پھیل گئی۔ میورقہ، یابسہ، قبرس، اقریطش (Crete) اور مالٹا میں عربی کا نفوذ ہوا مگر اقریطش اور مالٹا میں عربی کی حیثیت غیر مستقل رہی۔ ان میں عربی زبان اطالوی اور دوسری زبانوں سے خلط ملط ہو گئی اور ایک عجیب و غریب زبان پیدا ہو گئی جو آج تک رائج ہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ والے شام سے بیدخل کیے گئے تو ان میں سے کچھ مالٹا میں جا بسے چنانچہ مالٹا کی زبان پر شامی زبان کے اثرات پائے جاتے ہیں اور بدلی ہوئی صورت میں اس میں ہزاروں عربی الفاظ موجود ہیں۔ جنوبی فرانس میں دو صدیوں تک عربی رائج رہی۔ جنوبی فرانس پر عربوں کے قبضے کے بارے میں سڈیلیو کی یہ عبارت اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ وہ بہت عرصے تک عربوں کے اثر میں رہا۔

جنوبی فرانس میں عربی

"جب فرانس اور جرمنی میں وحشت خیمہ زن تھی تو عرب جنوبی فرانس میں کوہستان برنیات سے لے کر الپ تک کے علاقے پر قابض تھے اور اپنی نو آبادیوں سے وہ علوم، جو ان کے مدارس میں پڑھائے جاتے تھے، شمال میں برگنڈی اور سوئٹزرلینڈ تک اور جنوب میں ٹیرول اور لمبارڈ تک پھیلا رہے تھے۔ اسی زمانے میں یورپ میں عربی ہندسوں اور کسور عشریہ کا رواج ہوا جن کے نام باوجود تغیر کے اب تک عربی ہیں۔ فرانسیسی زبان میں لاطینی سے زیادہ عربی زبان کی نادر تحریریں داخل ہوئیں"۔

پنی ذی جولیوں اپنی تصنیف "فرانسیسی لغت اور ادب کی تاریخ" میں لکھتا ہے:

"ہمارے تمام علوم، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، جہاز رانی، آتش گیر مادوں کی ترکیب، طب، کیمیا، طباخی وغیرہ عربوں کے اثرات کے مقروض ہیں۔ ہم نے عربوں سے بہت سی چیزیں، رقم کا طریقہ، ارسطو کی شرحیں،

نامہ بر کبوتر ، موسیقی کے آلات وغیرہ حاصل کیں اگرچہ ان میں سے بہت سی چیزیں اپنے اصل ناموں سے اب موسوم نہیں پھر بھی کافی چیزوں کے اصل نام تھوڑے تغیر کے ساتھ اب تک محفوظ ہیں اور ان کی تعداد اتنی ہے کہ فرانسیسی زبان میں ان کا ایک بڑا مجموعہ مرتب کیا جاسکتا ہے"۔

میڈرڈ یونیورسٹی کے پروفیسر یہودا نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

"لوگوں کو اس کا اندازہ ہونے لگا ہے کہ قرون وسطیٰ کا یورپ اس عربی تمدن کا مقروض ہے جس کے چشمہ فیض سے مسلمان یہودی اور عیسائی یکساں سیراب ہوتے تھے ' اب اس حقیقت کو لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ یورپ کی اصلاح و ترقی کے زمانے میں علوم طبیعی ،فلسفہ و ریاضی کے اساسی قوانین اور دوسرے تمدنی علوم کی روح ان شیریں چشمہ سے مستفید ہوئی ہے جس کو عربی تمدن کہتے ہیں اور اس زمانہ کے علماء اس تہذیب کے مطالعہ میں جب دقت نظر سے کام لیتے ہیں تو وہ اس کا اثر موجودہ تہذیب میں پاتے ہیں ۔ انہوں نے یورپین زبانوں میں سینکڑوں ایسے الفاظ کا انکشاف کیا ہے جو عربی تمدن کے زمانہ میں داخل ہوئے تھے"۔

مشرقی زبانوں پر عربی کا اثر

جناب شامی لکھتے ہیں:

"مشرق کی اہم زبانوں میں سب سے زیادہ فارسی عربی سے متاثر ہوئی ہے ۔ حالانکہ وہ خود ایک ترقی یافتہ تمدن کی مالک تھی ۔ چنانچہ موجودہ فارسی زبان میں آدھے الفاظ عربی کے ہیں ۔یہی حال عثمانی اور ترکی زبان اور اس کے متعلق بولیوں قرقز قفچاق ' بشغرت اور چغتائی وغیرہ کا ہے ۔ اسی طریقہ سے ملائی یعنی جاوی ' افغانی (پشتو) مصری ' سوڈان اور افریقہ کی بربری زبانیں عربی سے متاثر ہوئی ہیں ۔سنیگال کے مسلمانوں کی زبان عربی ہے اور باقی دوسری ملکی زبانیں بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں ۔عربی فرانسیسی سوڈان اور عاج کے ساحلی علاقے میں عام طور سے رائج ہے ۔ نائیجریا میں تجارتی تحریریں اور مقامی زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں ۔ لیبریا کے غیر مسلم اپنے لغت کی تدوین میں عربی رسم الخط پر اعتماد کرتے ہیں ۔ شمالی نائیجریا کے پرائمری اسکولوں میں عربی پڑھائی جاتی ہے اور ملکی زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں ۔ شاد جبیوطی اور حبشہ کے علاقوں میں بھی عربی

پھیلی ہوئی ہے ۔ ان ملکوں کے مسلمان عام طور سے دو زبانیں بولتے ہیں ' ایک مقامی دوسری عربی ۔ یوگوسلاویہ کے مسلم سروی اور ترکی زبانوں کی تحریر میں عربی رسم الخط پر اعتماد کرتے ہیں ۔ قازان اور قرم کے تمام علماء عربی بولتے ہیں ۔یہی حال گرجستان ' طاغستان اور چرکستان کے علما کا ہے ۔ افغانستان کی مقامی زبان (پشتو) عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ۔سیام میں بھی تھوڑی بہت عربی پائی جاتی ہے ۔ فلپائن کے مسلمان بھی اپنی زبان کی تدوین میں عربی کو کام میں لاتے ہیں ۔ ہندوستان کے تمام مذہبی مدرسوں میں عربی پڑھائی جاتی ہے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور حیدر آباد دکن میں اس کا بڑا چرچا ہے ۔یہی حال ایران کا ہے ..... افریقہ کے جو ان پڑھ زنگی لکھ پڑھ جاتے ہیں وہ جب کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں تو عربی میں لکھتے ہیں ' گو ہر موقع پر اس کو نہیں بولتے لیکن انہوں نے تحریری عربی سے ایک علمی اور خط و کتابت کی زبان بنالی ہے ۔ ڈریپر لکھتا ہے کہ اسلام کی ترقی کو تلوار کی جانب منسوب کرنا نہایت لغو اور غلط ہے ۔ تلوار کبھی کسی قوم کا عقیدہ نہیں بدل سکتی ' وہ دلوں کی اثر پذیری کو بھی نہیں روک سکتی جو تلوار سے زیادہ قوی عامل اور خوف سے زیادہ اثر کرنے والی ہے ۔ اس لیے اسلام ایشیا اور افریقہ کے خواص و عوام کی زندگی پر چھا گیا اور اس نے مختلف بے شمار قوموں میں عربی کی اشاعت میں بڑی مدد پہنچائی ..... آج عربی تنہا یا دوسری زبانوں کے ساتھ مل کر حسب ذیل ملکوں میں بولی جاتی ہے: عرب ' عراق اور شام میں ایشیائے کوچک کی سرحد تک ' شمالی افریقہ میں طرابلس ' برقہ ' تونس ' الجزائر اور مغرب اقصیٰ وغیرہ ہیں ۔ ریگستانی ' مالٹا کے حدود اور مصر کے انتہائی جنوب مغربی تیل کے منبع تک اور گردو خان ڈار فور ' دادائی ' جانو ' نائیجریا ' سینگال اور مغرب اقصیٰ اور سینگال کے درمیان مغربی صحرا تک پھیلی ہوئی ہے ..... تونس اور صقلیہ کے درمیان جزیرہ قوصرہ میں اٹھارویں صدی تک عربی بولی جاتی تھی ۔ مڈ گاسکر کے بعض باشندے بھی عربی بولتے ہیں۔

جناب محمد کرد علی شامی نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ چنگیز کی غارت گری سے پہلے مسلمانوں کے ملکوں میں علم کا ہر جگہ چرچا تھا ۔ رے ' شیراز ' سمرقند ' بخارا ' مراغہ ' ہمدان ' غزنہ ' بصرہ ' کوفہ ' بغداد ' سامرہ ' واسط ' دمشق اور بہت سے شہر علوم کے بڑے بڑے مرکز تھے ' ان کے کتب خانے تمام علوم کی کتابوں سے بھرے پڑے تھے ۔ ہر شہر میں ہزاروں کی تعداد میں علماء و حکماء پائے جاتے تھے ۔ فرمانروا ' امرا اور دوسرے طبقوں میں تحصیل علم کا جوش موجزن تھا اور صدیوں کے جمع شدہ

علمی ذخائر تک ہر ایک کی دسترس تھی۔

تہذیب

اس عنوان کے تحت جغرافیہ اور علم الانسان ' انبیاء اور روشن ضمیر انسانوں کے الہام و کشف سے بحث کی گئی ہے۔

(1) خانہ بدوشی اور سکونت پذیری کی زندگیوں کا بیان ان کے معاشرتی اور تاریخی اسباب و نتائج اور ان کا پیہم تضاد۔

(2) حکمران خاندان، مختلف مناصب، اصول حکومت۔

(3) گاؤں اور شہر کی زندگی ۔ شہروں کو کس طرح بسانا چاہیے ۔ مشہور عبادت گاہیں ۔ شہریوں کے اخراجات میں اضافہ، دولت کا بتدریج چند لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹ آنا۔

(4) معاش کے ذرائع ، پیشے ، فنون اور تجارتیں ، کاروبار ، زراعت ، سامان زندگی کو ایک مقام سے دوسرے مقامات کو بھیجنا، تعمیرات ، مختلف پیشے۔

(5) مختلف علوم (Sciences) پڑھنے اور پڑھانے کی نفسیات ۔ علوم کی قسم وار تقسیم۔

جن خیالات کا مقدمہ میں بار بار اعادہ کیا گیا ہے وہ زیادہ تر معاشرتی ، سیاسی اور اقتصادی ہیں ۔ جو بے شمار مثالوں سے ذہن نشین کرائے گئے ہیں ۔ مقدمہ دراصل متذکرہ موضوعات پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے ۔ یہ بلاشبہ قرون وسطیٰ کی سب سے زیادہ اہم کتاب ہے ۔ اس میں اس قسم کے سوالات کا جواب دیا گیا ہے کہ تاریخی تحقیق کا مقصد کیا ہے ' یہ مقصد حاصل کرنے اور معلومات کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے ۔ تمدن اور ترقی کا صحیح مفہوم کیا ہے ۔ موجود دور کی تاریخ انہیں مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہے ۔ مقدمہ میں ابن خلدون اسلامی اداروں ' طرز حکومت ، ٹیکس ، مزدوروں ، صنعتوں ، فنون اور علوم پر معلومات کا بڑا ذخیرہ فراہم کرتا ہے ۔ وہ بدوی اور شہری زندگیوں کا بار بار تقابل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ گو تمدن کی ترقی کا انحصار شہروں پر ہے مگر تمدن کی ترقی ہی معاشرے کے انحطاط و تخریب کا باعث بن جاتی ہے ۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جیسے افراد کی زندگی بچپن اور جوانی سے گزر کر بڑھاپے پر ختم ہوتی ہے ' ویسے ہی سلطنتیں ان تینوں مدارج سے گزر کر ناپید ہو جاتی ہیں ۔ اس کے نزدیک معاشرے کے لیے مذہب کی رہنمائی ناگزیر ہے ۔ وہ آزادی کا اتنا ہی دلدادہ تھا جتنا تنظیم کا ۔ امن و امان قائم کرنے اور حکومت کے اخراجات فراہم کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کا اختیار تو ابن خلدون فرمانروا کو دیتا ہے مگر افراد کی آزادی پر نامناسب پابندیاں لگانے کو وہ ریاست اور افراد دونوں کے لیے مضرت رساں سمجھتا ہے ۔ حکومت کا یہ نظریہ اس کی وسیع النظری کا بین ثبوت ہے۔

ابن خلدون کو فلسفۂ تاریخ اور عمرانیات کا بانی کہا جاتا ہے ۔ بانی فلسفہ تاریخ ہونے کے بارے میں کوئی شک شبہ نہیں ۔ اس کے بانی عمرانیات ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ عمرانیات کا صحیح مفہوم کیا ہے ۔ اس نے تاریخ کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کا مقصد اجماع الانسانی کی حقیقت کو سمجھنا ہے ۔ عمرانیات کا مقصد بھی کم و بیش یہی ہے ۔ چنانچہ جارج سارٹن نے اسے عمرانیات کا بانی کہا ہے ۔ اس سے پہلے اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ارسطو ہے ۔ ابن خلدون ہی نے اس علم کا نام علم العمران رکھا ہے ۔ اس علم کے تحت وہ تہذیبوں کی ہیئت ' ان کے بننے کے اسباب اور ان کے نتائج سے بحث کرتا ہے۔

جارج سارٹن نے ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ پر کافی طویل بحث کی ہے اور اس کے نظریات کو سراہا ہے ۔ مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے فرانس کی سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے 1917ء میں ابن خلدون پر ایک رسالہ لکھا تھا ۔ وہ اتنا قابل تحسین سمجھا گیا کہ کالج دی فرانس نے اس پر سفتور کا مشہور انعام عطا کیا ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے ایما پر محمد عبد اللہ عنان نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا ۔ 1920ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مولانا عبدالسلام ندوی نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر طٰہٰ حسین فلسفہ تشکیک کے بڑے ماہر ہیں ۔ وہ دنیا کے ہر واقعہ پر شک کرتے ہیں ، پھر بمجبوری یقین ۔ اس لیے وہ بہت سے یقینات کی دولت سے محروم ہیں"۔

مولانا سلیمان ندوی کی رائے کی صداقت اس رسالہ کے مطالعہ سے بالکل نمایاں ہو جاتی ہے ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ان نجی واقعات میں سے بہت سوں کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا جو ابن خلدون نے اپنے بارے میں لکھے تھے اور اس کے بہت سے افعال کے بارے میں سوءِ ظن سے کام لیا ہے ۔ ایسے ناقد کی تحسینی رائے پر طرفداری اور بے جا ستائش کا گمان نہیں کیا جا سکتا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تفصیلی جائزے سے اقتباسات نقل کیے جائیں ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے کے علاوہ کہیں کہیں ابن خلدون کے کچھ اقوال بھی ' جو ڈاکٹر حسین کے رسالہ میں درج ہیں نقل کیے جائیں گے ۔ بیشتر اقتباسات ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے سے متعلق ہوں گے:

> (1) "ہمارے لیے اس کی جو چیز خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ اس کی ذہانت ' بلند خیالی ' اس کے علم کی وسعت ، پختگی اس کی رائے کی جدت اور اس کی کتابوں کی نفاست ہے ..... عربی علوم و فنون اسی کی بدولت یہ فخر کر سکتے ہیں کہ وہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا ' پہلا شخص تھا جس نے فلسفہ اجتماعیہ کو علمی قالب میں ڈھالا ۔ یہ ایک خفیف الحرکاتی ہوگی کہ ہم انسانی کمزوری کی آڑ پکڑ کر ایک ایسی شخصیت کی تنقیص کریں جس کی بڑائی میں

کوئی شبہ نہیں"۔

(2) "اجتماع انسانی کے متعلق اس نے اپنے بہت سے نادر اور بیشتر صحیح خیالات کی بنا پر ایک ایسا شرف حاصل کیا جس کی بنیاد نہایت مضبوط ہے۔۔ مقدمہ ایک عمیق مطالعہ کا مستحق ہے۔

(3) "ابن خلدون کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ اس نے سب سے پہلے اس علم (علم العمران) کو ایجاد کیا اور سب سے پہلے اس کی شرح کی"۔

(4) "وہ یہ بیان کرنا نہیں چاہتا کہ شخصی حکومت کا انقلاب کیونکر بے اعتدالی کی طرف ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارسطو نے کیا یا یہ کہ جمہوریت کا آئیڈیل (Ideal) کیا ہے، جیسا کہ افلاطون نے اس کی شرح کی ہے بلکہ اس کا مقصد اس سے زیادہ وسیع ہے۔ ابن خلدون یہ چاہتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی تشریح اس کے وسیع ترین معنوں میں کرے اور اس معاملے میں اس کی اجتماعی فکر ارسطو اور افلاطون بلکہ زمانہ قدیم کے مورخین سے بہت زیادہ اعلیٰ ہے"۔

(5) "ابن خلدون اگرچہ اپنے پیش نظر مقصد کو تمام تاریخی واقعات کی کنجی سے حاصل نہ کر سکا ..... تاہم وہی ایک شخص ایسا ہے جو اپنی ذہانت اور وسیع معلومات کے ذریعہ سے عالم اسلامی کی تاریخ کے بڑے حصے کی صحیح شرح کر سکا"۔

(6) "ابن خلدون کہتا ہے کہ عالم کے بڑے حصہ میں بت پرستوں کی قومیں آباد ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان کے یہاں سلطنتیں بھی ہیں اور قوانین بھی، تاہم نبوت اگرچہ سلطنت کی بنیاد قائم کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے، لیکن سلطنت کی مکمل ترین مثال کی بنیاد قائم کرنے کے لیے ضروری ہے"۔

(7) "ابن خلدون کے نزدیک مذہب کوئی اجتماعی چیز نہیں بلکہ ایک خارق عادت چیز ہے ..... اور چونکہ ابن خلدون ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہے، اس لیے وہ صرف آسمانی مذاہب کو قابل اعتنا سمجھتا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے مذاہب میں ایسی غلطیاں ہیں جو ذہن بشری کی ابتدائی حالت کو نمایاں کرتی ہیں"۔

(8) "ابن خلدون کہتا ہے کہ سلطنت مجتمعات بشری کا خاصہ ممیزہ ہے اور وہ اس چیز سے پیدا ہوتا ہے جو آدمی کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے اور وہ چیز اس کی روح ہے جس کی حقیقت اس کو نیکی پر آمادہ کرتی ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ بادشاہ ایک ایسا بے زنگ آئینہ ہو جس میں انسان کی فاضل

ترین روح کا عکس جلوہ گر ہو۔

(9) "اس کے مقدمے کے تیسرے حصے کو ایک مستقل کتاب قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اس حصہ میں ان تمام اجتماعی مظاہرے سے جو حکومت سے تعلق رکھتے ہیں، بحث کرتا ہے اور اس کے قائم ہونے کے اسباب، اس کی ترقی کی مدت اور اس کے زوال کے اسباب بتاتا ہے ..... اگرچہ ابن خلدون کا ذہن خالص مشرقی ہے لیکن اس کے ساتھ ہم کو یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ اس کی صائب اور عمیق رایوں کے اندر ایسی مشابہتیں نظر آتی ہیں، جن کی وجہ سے اس کے ذہن کو ہم کسی قدر گزشتہ اور موجودہ زمانوں کے بڑے بڑے ذہنوں سے قریب کر سکتے ہیں"۔

(10) "ابن خلدون کہتا ہے کہ اسلام سے پہلے بدو قبائل نے بہت بڑی قوت حاصل نہیں کی تھی ..... اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر بلند دینی مثال اور ہر سیاسی مقصد سے خالی الذہن تھے ..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل کے درمیان اتفاق پیدا کرنے اور ان کو ایک ایسی جماعت بنا دینے میں جو باہم ایک دوسرے کی معاون ہو، اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے چند ہی دنوں بعد یہ قبیلے ہمسایہ قوموں پر ٹوٹ پڑے اور ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرلی۔

(11) "ابن خلدون کہتا ہے کہ اس کی یعنی حکومت کے خود تجارت کرنے کی کامیابی ناممکن ہے۔ تاجروں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے قابل نہیں ..... وہ بادشاہ کے مقابلے میں شکست کھا جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام تباہی پھیل جاتی ہے اور آمدنی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عام ناراضی رعایا کو بادشاہ سے برگشتہ کر دیتی ہے"۔

(12) "ابن خلدون یہ ثابت کرتا ہے کہ ہر نظام حکومت کی اصل تلاش اس قوم کی نوعیت زندگی میں کرنی چاہیے جس نے اس کی بنیاد قائم کی ہے"۔

(13) "فکر انسانی کی گزشتہ صدیوں میں افلاطون اور ارسطو نے بھی ایسا ہی کیا ہے (یعنی سلطنت کے انقلابات اور ان کے آخری انجام کی شرح کی ہے) لیکن ہم ایک بار اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اجتماع بشری کے متعلق افلاطون اور ارسطو نے جو رائیں ظاہر کی ہیں، ان میں وہ دور رس اثر، وسعت، تعمیم اور علمی وصف نہیں پایا جاتا جو ابن خلدون کی رایوں میں پایا جاتا ہے"۔

(14) "ابن خلدون کے خیال میں صرف دینی حکومت بہترین حکومت ہے ...

جو قوانین خدا کی جانب سے جاری کیے جاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت دونوں میں انسانی سعادت کے بہترین ذمہ دار ہوتے ہیں"۔

(15) "ابن خلدون کا خیال ہے کہ ..... عقل اور دین حکومت کو پیدا تو نہیں کرتے تاہم وہ اس میں اصلاح و تغیر کرتے ہیں اور اس کو مجتمع (سماج) کی بھلائی کے قابل بنا دیتے ہیں"۔

(16) "خلافت صرف احکام خداوندی کے نافذ کرنے اور جمہور کے مصالح کی حفاظت کرنے کے لیے فرض کی گئی ہے"۔

(17) "ارسطو کی طرح ابن خلدون نے بھی شہروں کو آباد کرنے کی لازمی شرطیں گنائی ہیں ..... لیکن ان شرطوں کے وجوہات کی تفصیل کے لحاظ سے ابن خلدون ارسطو پر بہت فوقیت رکھتا ہے"۔

(17) "ابن خلدون (عیش پرستی کے علاوہ) دوسرے اسباب کا بھی پتہ لگاتا ہے جو عیش پرستی کے ساتھ انتہائی زوال تک پہنچانے میں موثر ہوتے ہیں۔ تمدنی زندگی یہ چاہتی ہے کہ جن مصنوعی قواعد کو اکثر مستبد بادشاہ بناتا ہے ان کے سامنے رعایا سر تسلیم خم کرے، لیکن رعایا ان کے سامنے صرف خوف سے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ ان کی بجا آوری اپنا فرض نہیں سمجھتی۔ اس موقع پر پھر خلافت کے زوال پر افسوس ظاہر کیا ہے جو حکومت کی اعلیٰ مثال اور ایک ایسا منفرد نظام تھی جو سلطنت پر انصاف کے منطبق کرنے کا کفیل تھا"۔

(19) "(ابن خلدون کہتا ہے) کہ جب تمدن انتہائی درجہ کو پہنچ جاتا ہے اور زوال کے مختلف اسباب اپنا کام کرنے لگتے ہیں تو افراد کی خود غرضی انتہائی درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک طرف حکومت اور رعایا میں، دوسری طرف خود رعایا کے افراد میں باہم عام بے اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور مجتمع (سماج) اپنی مستحکم وحدت کو ضائع کر دیتا ہے"۔

(20) "اگرچہ ارسطو اور ابن خلدون دونوں متفقہ طور پر انسان کو قدرت سے فائدہ اٹھانے کا حق دیتے ہیں تاہم اپنے بنیادی اصول کی تطبیق میں دونوں مختلف ہیں۔ ارسطو غلامی کو قائم رکھتا ہے ..... اور یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ کچھ لوگ آزاد زندگی بسر کرنے کے لیے اور کچھ لوگ غلام بننے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ..... لیکن ابن خلدون غلامی کو قائم نہیں رکھتا ..... انسان کی غلامی کسب (معاش) کا قدرتی ذریعہ نہیں بلکہ وہ صرف عارضی ذریعہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور مجتمع (سماج) میں انصاف پھیلنے اور ترقی کرنے

کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجتماع کا پہلا مقصد اس آزادی کی ضمانت اور شرف بشری کا احترام ہو۔ یہ وہ شرف ہے جس کو انسان نے اس خدا سے حاصل کیا ہے جس نے اس کو اپنی زمین کا خلیفہ بنایا ہے ..... اسی طرح جنگ کے مسئلہ میں بھی دونوں متفق نہیں۔ ارسطو جنگ کو کسب کے قدرتی ذرائع میں شمار کرتا ہے لیکن ابن خلدون جنگ اور سپہ سالاری کا شمار ان ذرائع میں نہیں کرتا اور اس کا سبب بعینہٖ وہی ہے یعنی خداوند تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو ریاست اور حکومت کے لیے اور دوسروں کی فرمانبرداری اور اطاعت کے لیے نہیں پیدا کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ انسانیت اور اس کے حقوق کا خیال ابن خلدون کے یہاں ارسطو کے خیال سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے"۔

(21) "ابن خلدون احتکار کی مذمت کرتا ہے کیونکہ وہ خریداروں اور خود تاجروں کے فوائد کے لیے مضر ہے ..... تاجر کو ایسے فائدے سے برکت نہیں ہوتی، اور یہ بھی مادی زندگی میں روح کی مخفی تاثیرات میں سے ایک تاثیر ہے"۔

مندرجہ بالا اقتباسات ابن خلدون کی وسعت نظر کے ساتھ ساتھ اس کے مذہبی لگاؤ کی بھی شہادت دیتے ہیں، وہ اسلامی شریعت کو ہر صورت میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اس کے تبحر علمی نے اس کے مذہبی عقائد کو تقویت دی اور دونوں کے امتزاج سے اس نے علم العمران کی ایسے صحیح خطوط پر تشکیل کی کہ آج بھی چھ سو سال گزر جانے کے بعد وہ مستند و معتبر سمجھے جاتے ہیں۔

علم و تعلیم بھی علم العمران کے تحت آتے ہیں۔ ابن خلدون نے ان پر بھی ویسی ہی مفکرانہ نظر ڈالی جیسی سیاست وغیرہ پر اور ایک حکیمانہ دستور تعلیم مرتب کیا۔ اس کے متعلق بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے رسالے کے اقتباسات دینا ہی مناسب ہو گا۔

(22) "وہ (ابن خلدون) پہلا مسلمان ہے جس نے مسلمانوں کی ادبی اور عقلی تحریک کی تاریخ تقریباً جدید طریقہ پر لکھی ہے ..... ابن خلدون جدید زمانے کے مورخین تہذیب سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے"۔

(23) "ابن خلدون کو علم میں ایک ایسا اجتماعی مظہر نظر آتا ہے جس پر اس کو اسی طرح بحث کرنی چاہیے، جس طرح اس نے دوسرے اجتماع و اجتماعی مظاہر پر بحث کی ہے ..... وہ کہتا ہے کہ علم، فکر کی حرکت کا نتیجہ ہے .....

وہ (فکر) اپنی انتہائی حدود تک صرف مجتمع (سماج) میں وسعت حاصل کر سکتی ہے کیونکہ اس کی وسعت کا اصلی سبب صرف مشق ہے ..... فکر اپنی مشق کا میلان مجتمع ہی میں پاتی ہے اور جس طرح فکر اجتماعی زندگی پر موقوف ہے ' اسی طرح وہ صرف شہری زندگی میں پورے طور پر پختہ ہوتی ہے ..ہم کسی خالص بدوی قبیلہ میں کسی پختہ علم کو کبھی نہیں پاتے۔"

(24) " کوئی قوم دین اور کسی قدر فلسفہ انسانیت سے بے نیاز نہیں ہوسکتی. علوم دینیہ اور فلسفہ ..... مستقل بالذات ہیں لیکن علوم دینیہ کا درجہ اول ہے کیونکہ وہ محفوظ ہے اور انسان کی حقیقی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔"

(25) "وہ افلاطون ' ارسطو اور مونٹسکیو کی طرح تربیت کا یہ مقصد نہیں خیال کرتا کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں ' جو بہترین حکومت کو مرتب کرسکیں۔ بلکہ اس کا مقصد ..... یہ ہے کہ ایسے اشخاص تیار کیے جائیں جو زندگی اچھی طرح بسر کرسکیں ..... وہ اس میں اور نظام حکومت میں کوئی علاقہ پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنے معاصرین کے طریقوں پر نکتہ چینی کرتا ہے اور خصوصیات کے ساتھ اس سختی پر حملہ کرتا ہے جو بچوں کی تربیت میں برتی جاتی ہے" ۔

وہ کہتا ہے کہ بہت زیادہ سختی ' خواہ باپ ماں کی طرف سے ہو ' خواہ استادوں کی طرف سے ' بچے کے اخلاقی اور عقلی شرف کو صدمہ پہنچاتی ہے اور چونکہ انسان فطرتاً مختلف قسم کی تربیت حاصل کرنے پر مائل ہے۔ اس لیے ہم اس کے میلان سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں ..... سختی بڑے[1] ' آزاد اور باعمل اشخاص نہیں پیدا کرتی ' بلکہ تنگ اور جاہل ذہن اور ذلیل و پست روحیں پیدا کرتی ہے۔

-1 لیکن شیخ سعدی فرماتے ہیں — جورِ استاد بہ زمہر پدر — بچوں کی تربیت میں بہرحال تادیب کی ضرورت پیش آتی ہے اور گوارا حد تک سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ (ماہر القادری)

قانون و عمرانیات

گزشتہ ابواب میں طب ' ریاضی ' ہیئت ' جغرافیہ ' تاریخ طبیعی ' علم الطبیعیات ' علم کیمیا اور علم اللسان سے بحث کی جاچکی ہے۔ انہیں کے تحت علم طبقات الارض (Geology) ' علم آثار قدیمہ (Archaeology) ' علم المعادن (Minerology) ' علم التنجیم (Astrology) ' کیمیا گری (Alchemy) ' علم علاج الفروس (Hippiatry) ' فلاحہ (Agriculture) ' باغبانی (Horticulture) ' علم البناء و ہندسہ (Architecture) وغیرہ کا بھی ذکر آگیا ہے۔ اس طرح قرون وسطیٰ کے سائنس کے موضوعات میں سے ہر ایک پر تھوڑا بہت لکھا جاچکا ہے۔ دو موضوع اور ہیں جن پر میں لکھنا چاہتا ہوں ' ایک قانون و عمرانیات ہے اور دوسرا تاریخ۔ گو تاریخ کے متعلق جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ اس علم نے اب سائنس کی حیثیت اختیار کرلی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ علم اور قانون و عمرانیات سائنس کے علوم میں شمار نہیں ہوتے۔ چونکہ ان علوم پر مسلمانوں نے قرون وسطیٰ میں خاص توجہ مبذول کی تھی تاکہ مسلمانوں کی اس سعی بلیغ سے بھی جو ان علوم کو موقر و منظم بنانے میں صرف ہوئی ' لوگ آشنا ہوجائیں۔

مستشرقین میں سے بہت سوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلامی قانون (فقہ) کی عمارت رومن قانون پر کھڑی کی گئی ہے۔ اس نظریہ کو ڈاکٹر صبحی محمصانی نے اپنی گرانقدر تصنیف " فلسفۃ التشریع فی الاسلام " میں قوی دلائل پیش کرکے بڑی خوبی سے غلط ثابت کیا ہے۔ ڈاکٹر محمصانی بیروت میں عدالت مرافعہ کے صدر ہیں۔ آپ نے فرانس اور انگلستان میں قانون کی تعلیم اور اعلیٰ سندیں حاصل کی ہیں۔ قانون پر آپ نے متعدد کتابیں فرانسیسی و عربی میں لکھی ہیں جن میں سے ایک " فلسفۃ التشریع فی الاسلام " ہے۔ یہ پہلی بار 1946ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری بار 1952ء میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا ترجمہ مولوی محمد احمد رضوی نے 1955ء میں کیا اور " فلسفہ شریعت اسلام " کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے شائع کیا۔

ڈاکٹر محمصانی نے چار مستشرقین کی مندرجہ ذیل کتابوں کو پیش نظر رکھ کر بحث کی ہے، جس کا خلاصہ پیش کیا جانے گا:

(1) گولڈزیہر (Goldziher) کی کتاب "محاضرات الاسلام"

(2) فون کریمر (Von Kremer) کی کتاب "تاریخ الثقافۃ الشرقیۃ فی ایام الخلفاء"

(3) ایموس (Amos) کی القانون المدنی الرومانی۔

(4) ایمیلیو بوسی (Emilio Bossi) کی "الابحاث فی العلاقات بین بیز نطیۃ و الاسلام"۔

یہ کتابیں فرانسیسی، انگریزی وغیرہ میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے نام جو اوپر دیئے گئے ہیں وہ عربی میں ترجمہ کرکے درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر محمصانی کہتے ہیں کہ ان میں ایموس کا قول کہ "شرح محمدی محض مشرقی رومی حکومت کا رومن لا ہے جس میں مملکت عربیہ کی سیاسیات کے لحاظ سے ترمیمیں کر دی گئی ہیں وہ بالکل ہی غیر وقیع ہے۔ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ رائیں اکثر مستشرقین نے ظاہر کی ہیں جو ان کے سطحی مطالعہ (اور تعصب) کی کھلی غمازی کرتی ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ شرع اسلامی کا ماخذ صرف کتاب اور سنت ہے۔ یہ دونوں چیزیں مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پہنچیں۔ آپ کی حیات میں اسلامی زندگی کا دائرہ عرب تک محدود تھا۔ رومی ثقافت سے اتصال تک نہ ہوا تھا چنانچہ یہ خیال کرنا کہ نبی اکرم نے رومی تصورارت کو قرآن و حدیث کی شکل میں پیش کیا ہے، نہایت ہی بے معنی بات ہے۔ اس کے برعکس جب سارا یورپ جہالت کی تاریکی میں پڑا ہوا تھا۔ اسلام کے علوم و تہذیب کی خوشہ چینی کرنے کے لیے اسپین، جنوبی فرانس اور صقلیہ (Sicily) میں جہاں مسلمان حکمران تھے، یورپ کے مختلف ممالک سے لوگ آتے اور واپس جا کر اپنے ملکوں میں بہت سی اسلامی باتوں کو رواج دینے کی کوشش کرتے تھے، مثلاً قانون تجارت کی تاریخ سے ثابت ہے کہ بارہویں صدی عیسوی سے پہلے اہل یورپ ہنڈی اور چیک سے بالکل ناواقف تھے جبکہ آٹھویں صدی عیسوی کی اسلامی فقہ کی کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ گراسوف کے مطابق یہ یورپ میں چار سو سال بعد یا تو صلیبی جنگوں کے دوران یا اندلس کے ذریعے پہنچے۔ فرانسیسی لفظ Aval عربی لفظ حوالہ (بمعنی چیک) سے ماخوذ ہے اور ایک اور فرانسیسی لفظ Avaries عربی لفظ عوار سے بنایا گیا ہے جو بحری تجارت کے قانون میں بحری نقصانات کے معنی میں آتا ہے۔

مسلمانوں نے دوسرے علوم کی جن جن بیرونی کتابوں کا یونانی فارسی، سریانی وغیرہ سے ترجمہ کیا ہے، ان کے بارے میں واضح طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ یہ فلاں فلاں زبان کی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ قانون کی کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ملتی جسے مسلمانوں نے لاطینی یا یونانی سے عربی میں منتقل کیا ہو۔ قانون کے معاملے میں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ شریعت اسلامیہ خدا اور اس کے رسول کے احکام پر مبنی اور ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ شریعت میں کسی اور قانون کی آمیزش کرنا

حرام ہے۔

مستشرقین نے رومن لا اور اسلامی قانون میں مشابہت ثابت کرنے کے لیے کچھ یکساں قوانین کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً یہ کہ بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی چیز ہے کہ ہر قانون مدعی سے دعویٰ کی تائید میں ثبوت طلب کرے گا۔ اسلام میں بار ثبوت کے بارے میں نبی کریم کی یہ حدیث ہے:

البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر
(مدعی پر بار ثبوت ہے اور انکار کرنے والے پر قسم ہے)۔

اگر اس قسم کے اعتراض کرنے والے مستشرقین اسلامی قانون کے ماخذوں سے ذرا بھی واقف ہوتے تو ایسے لچر اعتراض نہ کرتے۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم کے سامنے رومن لا کی کتابیں نہ تھیں۔ ان کی سینکڑوں حدیثیں ایسی ہیں جن پر فقہاء نے قانون کی بنیاد رکھی ہے۔

دوسری مشابہت بیع اور مقائضہ (تبادلہ اشیاء) کے بارے میں اسلامی اور رومن قانون میں بتائی جاتی ہے مگر یہ مشابہت بالکل خیالی ہے۔ رومن لا میں مقائضہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے مکمل ہونے کے لیے صرف فریقین کی رضامندی کافی نہیں، بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دونوں میں سے کوئی اس بیع کو نافذ بھی کرے۔ لیکن شرع اسلامی اس ظاہری فرق کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی بلکہ اس کی رو سے مقائضہ بھی بیع بالرضا کی ایک خاص قسم ہے۔

اسی طرح بیع اور ٹھیکہ کے تفصیلی احکام میں دونوں میں فرق ہے جیسے خیار، رویہ وغیرہ میں۔ رومن لا اور اسلامی شریعت کے کچھ اہم معاملات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ مثلاً:

سن بلوغ کے مسئلہ میں دونوں قانون میں کوئی مشابہت نہیں۔ رومن لا کے لحاظ سے لڑکی پوری بارہ سال میں بالغ سمجھی جاتی ہے اور لڑکا چودہ سال کی عمر میں لیکن شرع اسلامی میں لڑکی اور لڑکے دونوں کے لیے سن بلوغت کی آخری حد پندرہ برس ہے۔

رومی قانون کی رو سے عورتیں ساری عمر اپنے وارث کی سرپرستی میں رہتی ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر اپنا مال خرچ نہیں کر سکتیں۔ شریعت اسلامی عورت کو اس کے مال میں تصرفات کا

اختیار دیتی ہے۔

رومن لا کے مطابق بیوی یا اس کے سرپرست کے ذمہ شوہر کو مہر ادا کرنا ہے، شرع اسلامی میں شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کو مہر دے۔

شرع اسلامی متبنی کرنے کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ رومن لا تسلیم کرتا ہے۔

رومن لا کی رو سے معاملات میں عام طور پر ظاہری الفاظ کا اعتبار کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس شرع اسلامی کی رو سے نیت اور ارادہ معتبر ہیں۔ رومن لا میں قرضہ کی ضمانت جائز نہیں۔ تمام مذاہب اسلامی میں بلا اختلاف ایسی ضمانت جائز ہے۔

دونوں قوانین وراثت اور وصیت کے قواعد میں بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً اسلامی قانون میں وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ لیکن رومن لا میں وارث مقرر کرنے کے لیے وصیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ شفعہ اور وقف علی الاولاد کے احکام اسلامی شریعت میں بالکل عام ہیں جبکہ رومن لا میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ چوری اور زنا کی جو سزائیں اسلامی قانون میں پائی جاتی ہیں وہ ان سے مختلف ہیں جو رومن لا تجویز کرتا ہے۔

چونکہ اکثر جرائم مختلف قوانین کی رو سے قابل تعزیر ہیں اس لیے ان میں اگر کوئی مشابہت نظر آئے تو یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ ایک قانون نے دوسرے قانون کی یہ چیز اپنا لی ہے۔ مثلاً قانون اسلامی اور قانون انگریزی کے مابین مسئلہ فضولی (یعنی غیر کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا) میں اور حقوق کے بے جا استعمال کے قانون میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا اس مشابہت کی بنا پر یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ یا تو اسلامی قانون نے انگریزی قانون کا اتباع کیا ہے یا انگریزی قانون نے اسلامی قانون کا۔ اگر یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہے، تو پھر چونکہ اسلامی قانون کو انگریزی قانون پر تقدم زمانی حاصل ہے، یعنی اسلامی قانون اس وقت وجود میں آیا جب انگریزی قانون کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا، تو کیا اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ انگریزی قانون نے ان معاملات میں اسلامی قانون کا اتباع کیا ہے۔ ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

اس کے برخلاف اس بات کا ثبوت ہے کہ لاطینی قانون پر اسلامی قانون اثر انداز ہوا ہے۔ بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جو رومن لا میں پہلے نہ تھیں اور یورپ کے ارتقائے علمی کے زمانے میں ان شارحین اور مفسرین کے ذریعہ ان کا اضافہ ہوا جو اطالیہ کے مدرسہ بولونیا اور دوسرے مدارس سے

جو مسلمانوں کے علوم سے متاثر تھے، فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے۔ آج بھی یورپ کے کتب خانے عربی کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں اہل یورپ کے زیر مطالعہ رہ چکی ہیں اور انہوں نے ان سے بقدر ظرف و ضرورت استفادہ کیا ہے۔ لاطینی قانون کی بعض مثالیں تو اس کی واضح شہادت دیتی ہیں کہ وہ اسلامی فقہ کی کتابوں سے منقول ہیں۔ صدیوں بحر روم کی تجارت کلیتاً مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی جس کی وجہ سے ان کے کتنے ہی تجارتی قوانین اور اصطلاحات یورپ میں رائج ہو گئیں۔

البتہ مسلمانوں نے مفتوحہ قوموں کے ان رواجات کو جو اسلامی شریعت کے منشا و حکمت کے خلاف نہ تھے، اجماع یا استحسان یا مصالح مرسلہ وغیرہ کے ذریعہ قبول کر لیا۔ اس سے مفتوحہ قوموں کے نظام معاشرت کو حتی المقدور قائم رکھنا مقصود تھا۔ شام، فلسطین اور شمالی افریقہ کے جن علاقوں پر اہل رومہ کا قبضہ تھا وہاں کے رواجات خالص رومی نہ تھے بلکہ ان میں قدیم اقوام کے رواجات بھی شامل تھے جنہیں اہل رومہ نے "قانون قبائل" کے نام سے اپنے قانون میں شامل کر لیا تھا۔ جب ان ممالک سے رومی حکمران بیدخل کیے گئے اور وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو، وہاں کے صرف وہ رواجات جو شرع اسلامی کے مطابق تھے برقرار رکھے گئے۔ ان رواجات کو جو خود رومن لا پر مبنی نہ تھے برقرار رکھنا رومن لا کی دریوزہ گری کے مترادف کیسے ٹھہر سکتا ہے۔

جب یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اسلامی قانون قرآن کے نزول کی تکمیل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک مسلمانوں کو رومیوں کے قانون سے واقفیت حاصل کرنے کے مواقع پیدا نہ ہوئے تھے تو پھر قانون اسلامی کو رومن لا سے ماخوذ سمجھنا خام خیال نہیں تو اور کیا ہے۔ ایموس اور اس ایسے اور دریدہ دہنوں کا یہ کہنا کہ شرع محمدی دراصل مشرقی رومی حکومت کا قانون ہے جس میں تھوڑی بہت ترمیم کر دی گئی ہے ارتقائے علم و عقل کے لیے قابل اعتنا نہیں۔

اسلامی فقہ کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ دنیا کے کچھ اور قوانین پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی موقر تصنیف "الجہاد فی الاسلام" میں دوسرے مذاہب کے قوانین اور موجودہ بین الاقوامی ضوابط کا جائزہ لیا ہے۔ مگر میں ایک مسلمان کی تصنیف سے قصداً صرف نظر کر کے بیسویں صدی کے مشہور مورخ ول ڈیوراں کی کتابوں سے یونان کی دو ریاستوں "اسپارٹا" (Sparta) اور ایتھنز (Athens) اور رومیوں اور ہندوؤں کے قوانین پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

یونان کی ریاستوں کے قوانین کا جائزہ لینے سے پہلے یونانی تہذیب کے ارتقا کا کچھ حال لکھنا مفید ہو گا۔

یونانی تہذیب کا ارتقا

1104 ق م کے لگ بھگ یونان پر ڈورین (Dorian) قوم نے حملہ کیا۔ یہ لوگ مویشی پالتے اور شکار کھیلا کرتے تھے۔ ان ہی پر ان کی معاش کا انحصار تھا' زراعت سے رغبت نہ تھی۔ کبھی کبھار برائے نام کھیتی بھی کر لیتے تھے۔ انہوں نے یونانی تہذیب و تمدن کو جو مائی سینین (Mycenaean) کہلاتی تھی بہت کچھ مٹا دیا' یونان کو پھر سے مہذب و متمدن بننے میں کئی سو سال لگے۔ یونانی تہذیب و تمدن کی تعمیر نو میں مصر اور فنیقیہ (Phoenicia) نے نمایاں حصہ لیا۔ یونانی اس بات کے معترف ہیں کہ ان کی تہذیب کے بہت سے عناصر مصر سے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے کئی شہر مصر سے آ کر بس جانے والے لوگوں مثلاً کیڈمس (Cadmus) اور ڈنوس (Danaus) وغیرہ نے آباد کیے۔ ان کے علاوہ فنیقیہ اور اقریطش (Crete) کے ذریعے بھی مصری تہذیب یونان پہنچی۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں یونانی تاجروں کو دریائے نیل کی بندرگاہوں میں اپنا مال اتارنے کی اجازت ملی اور باقاعدہ آمدورفت شروع ہوئی' چنانچہ یونان کے مشہور علما و حکما مثلاً تھیلس (Thales) فیثا غورث (Pythagoras)' سولن (Solon)' افلاطون (Plato)' ڈیموکریٹس (Democritus) وغیرہ نے مصر جانے اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے پر اپنا وقت صرف کیا۔ یہ سب مصری تہذیب کی قدامت اور پختگی کو تسلیم کرتے ہیں۔ مصر میں ٹرائے (Troy) کے محاصرے سے جو 1194 ق م سے 1184 ق م تک جاری رہا' دو ہزار سال پہلے فنون ایک بہت بلند معیار پر پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ سولن سے ایک مصری پجاری نے کہا کہ تم یونانی باتونی بچوں کی طرح ہو جو قدیم زمانے کا کچھ بھی علم نہیں رکھتے مگر بہت بڑھ بڑھ کر بولتے ہو۔ یونانیوں کا آرفی (Orphic) عقیدہ کہ موت کے بعد حساب دینا پڑتا ہے اور یہ عقیدہ کہ زمین کی دیوی ڈمیٹر (Demeter) اور اس کی بیٹی پرسیفون (Persephone) مر کر زندہ ہوئی تھیں۔ مصریوں کے آئی سس (Isis) اور اوسیرس (Osiris) کے بارے میں عقائد پر منحصر ہیں جن کے بموجب مصریوں کا سورج دیوتا اوسیرس تھا جو رات کے وقت قتل کر دیا گیا۔ اس کی بہن آئی سس جو اس کی بیوی بھی تھی رات بھر سوگ کرتی رہی۔ صبح کو اوسیرس اپنے بیٹے ہورس (Horus) کی شکل میں پھر پیدا ہو گیا اور آئی سس سے شادی کر کے اسے غم و اندوہ سے نجات دی۔ اس سے ڈمیٹر اور اس کی بیٹی کے مرنے اور پھر جی اٹھنے کا افسانہ یونان نے اخذ کیا۔

یونانیوں نے مصریوں سے علم ہندسہ (Geometry) سیکھا۔ پیتل اور مٹی کے برتن بنانا اور کپڑا بننا سیکھا۔ اپنی بت تراشی میں مصری طرز بت تراشی کو دخل دیا۔ مصریوں کی صنعت تعمیر کو پیش نظر رکھ کر اپنی عمارتیں بنائیں۔ دھاتوں اور ہاتھی دانت کی صنعتیں مصریوں سے سیکھیں اور بالآخر اسکندریہ میں اپنے فلسفوں' اپنی رسموں اور دیوتاؤں کو مصر کے فلسفوں مصر کی رسموں اور مصر کے دیوتاؤں میں ضم کر دیا اور پھر انہیں رومیوں اور عیسائیوں نے حیات نو بخشی۔

مصر کے بعد یونان کی تہذیب کو فنیقیوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شام کا ساحلی حصہ فنیقیہ کہلاتا تھا اور اس کی بڑی بڑی بندرگاہیں صیدا (Sidon) طائر (Tyre) ببلس (Byblus) وغیرہ تھیں۔ ان کے تجارتی جہاز اسپین تک جاتے تھے۔ اتنا سفر طے کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بیچ میں جہازوں کے رکنے کے مقامات ہوں۔ چنانچہ فنیقیوں نے افریقہ کے شمالی ساحل پر چھ سات مقامات پر اپنی قیام گاہیں قائم کیں اور اردگرد کے لوگوں سے میل جول اور بیاہ شادی کے رشتے قائم کر کے ان مقامات کو محفوظ بنا لیا۔ یہاں تک کہ 813 ق م کے لگ بھگ قرطاجنہ (Carthage) کا شہر آباد کیا جو رفتہ رفتہ ایک بڑی بھاری سلطنت کا پایہ تخت بن گیا جس نے اسپین' جنوبی فرانس اور اٹلی پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ فنیقی نسلاً سامی تھے' ڈاڑھی رکھتے اوپر کے ہونٹ کے بال منڈواتے اور عمامہ باندھتے تھے اور ان کی عورتیں عموماً ناک میں نتھ پہنتی تھیں۔ ان کی تجارت برطانیہ تک پھیل گئی اور وہ بہت دولت مند ہو گئے۔ جس طرح اپنا تجارتی مال ایک ملک سے دوسرے ملک لے جاتے تھے ویسے ہی ایک ملک کی رسوم و روایات کو دوسرے ملک تک لے گئے۔ انہوں نے مصر اور مشرق قریب کے علوم و فنون اور عقائد کو یونان پہنچانے میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے یونانیوں کو جہازسازی' پارچہ بافی اور رنگ بنانے اور دھاتوں کے استعمال کے بہتر طریقے سکھائے اور وہ سامی حروف تہجی جن کا نشوونما مصر' اقریطش اور شام میں ہوا تھا' یونان پہنچائے۔ بابل والوں (Babylonians) سے یونانیوں نے سائنسی معلومات حاصل کیں۔ تولنے کے باٹوں اور ناپنے کی مقرر مقداروں کا علم' سکوں کے نام یعنی اوبل (Obol)' مینا (Mina) اور ٹیلنٹ (Talent)' پانی سے چلنے والی اور دھوپ گھڑیوں کے بنانے کے طریقے' علم ہیئت کے اصول' آلات اور زیچ وغیرہ بنانے کا علم' سال اور دائرے کو تین سو ساٹھ حصوں میں تقسیم کرنا اور دائرے کے تین سو ساٹھ حصوں میں سے ہر ایک کو ساٹھ دقیقوں (Minutes) میں اور ہر دقیقہ کو ساٹھ ثانیوں (Seconds) میں تقسیم کرنا' یہ سب باتیں یونان میں بابل یعنی عراق سے پہنچیں۔

لیڈیا کا علاقہ ایشیائے کوچک کا مغربی ساحلی علاقہ تھا اور یونان سے بہت قریب تھا۔ جب تقریباً 680 ق م میں وہاں کی حکومت نے سکہ جاری کیا' جس سے خرید و فروخت میں بہت آسانی ہو گئی تو یونان نے بھی اس ایجاد کو قبول کر کے اپنے یہاں سکہ چلایا۔

ایران کی تہذیب کچھ حیثیتوں سے یونانی تہذیب پر فوقیت رکھتی تھی ۔ ایرانیوں میں حصول آزادی اور تحصیل علم کا وہ جذبہ تو نہ تھا جو یونانیوں میں تھا مگر وہ شائستگی میں یونانیوں سے بڑھے ہوئے تھے اور ان کا نظام حکومت ' جو شہنشاہی تصور پر مبنی تھا زیادہ مستحکم تھا ۔ یہ تصور یونانیوں کے مزاج کے خلاف تھا ۔ وہ ایک بڑی سلطنت قائم کر کے ایک طاقتور حکمران کی نگرانی میں زندگی بسر کرنے پر چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں بنانے کو ترجیح دیتے تھے اور ان ریاستوں کے حکمرانوں کو جمہوری طریقوں کو قبول کرنے پر مجبور کرتے تھے ۔

اسپارٹا کے قوانین

یونان کی کئی ریاستوں میں اسپارٹا کی بھی ایک ریاست تھی جو اس وجہ سے مشہور ہوئی کہ وہاں شہریوں پر ایک سخت نظام تربیت نافذ تھا ۔ یہ نظام ان کو ریاست کا فدائی بنانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور اس کا واحد مقصد نہایت تندرست ' بہادر اور وطن پر جاں نثار کرنے والی قوم پیدا کرنا تھا ۔ اسپارٹا (Sparta) دراصل لیکونیا (Laconia) ریاست کا دارالحکومت تھا ۔ اسپارٹا کے معنی ہیں منتشر کے ۔ چونکہ اسپارٹا پانچ مختلف گاؤں پر مشتمل تھا لہٰذا اس کا یہ نام پڑا ۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس کی آبادی ستر ہزار تھی ۔ اب یہ چار ہزار آبادی کا معمولی قصبہ ہے ۔

لیکونیا کے معاشرہ میں تین طبقے تھے ' سب سے اوپر حکمران ذورین تھے ۔ ان کے قبضے میں ریاست کی ساری زمینیں تھیں ' وہ خود دارالحکومت میں رہتے اور ان کی زمینوں کو ان کے غلام لگان پر لے کر فصلیں اگاتے ۔ ریاست کی تین لاکھ چھہتر ہزار کی آبادی میں سے غلاموں کی تعداد دو لاکھ چوبیس ہزار تھی ۔ بتیس ہزار حکمران اور ان کے بیوی بچے تھے ۔ بقیہ ایک لاکھ بیس ہزار وہ آزاد لوگ تھے جن پر تجارت ' صنعت و حرفت وغیرہ کا دارومدار تھا ' جن سے ٹیکس اور فوجی خدمت لی جاتی تھی مگر جو نہ نظام حکومت میں کوئی حصہ لے سکتے تھے اور نہ حکمران طبقے کی شادی بیاہ کے رشتے قائم کر سکتے تھے ۔ غلام ہیلیٹس (Helots) کے نام سے موسوم تھے ۔

غلام معینہ لگان دینے کے پابند تھے ۔ ان کا وجود زمین سے وابستہ کر دیا گیا تھا ' نہ وہ بیچے جا سکتے تھے نہ ان کی زمین ۔ البتہ ان میں سے کچھ شہریوں کے خانگی ملازم کی حیثیت سے کام کر سکتے تھے ۔ ضرورت کے وقت ان سے فوجی خدمت لی جا سکتی تھی اور عمدہ کارکردگی پر کبھی کبھی آزاد بھی کر دیئے جاتے تھے ۔ ان کی بہت بڑی تعداد ہونے کی وجہ سے ان سے مستقل خطرہ رہتا ' اور پولیس ان کی خفیہ نگرانی کرتی تھی ۔ پولیس کو اختیار تھا کہ بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر وجہ بتائے جس غلام کو چاہے مار ڈالے ۔ پیلو پونیشیا (Peloponnesia) سے آٹھ سال کی جنگ کے درمیان لیکونیا کے غلام بڑی

بہادری سے لڑے ۔ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ غلام خود ایسے غلاموں کی فہرست مرتب کریں جو اس لڑائی میں بہت بہادری سے لڑے تھے تاکہ انہیں آزاد کر دیا جائے ۔ حکومت کا اصل مقصد یہ تھا کہ سب سے زیادہ من چلے اور دلیر غلاموں کی نشاندہی خود ان کی قوم کر دے تاکہ حکومت ایسے لوگوں کی نگرانی پر خاص توجہ کر سکے اور انہیں بغاوت کرنے کا موقع نہ دے ۔ دو ہزار بہادروں کی فہرست حکومت کو دی گئی اور منتخب شدہ لوگوں نے خوب خوشیاں منائیں ۔ یہ دو ہزار حکومت کی نگاہ میں سب سے زیادہ خطرناک ٹھہرے اور تھوڑے عرصے ہی میں وہ سب کے سب مروا ڈالے گئے ۔

یونانی مورخین متفق ہیں کہ اسپارٹا کے قوانین لائی کرگس (Lycurgus) نے مرتب کیے تھے ' وہ کب ہو گزرا ہے اس میں اختلاف ہے ۔ 900 ق م سے 600 ق م کے درمیان اس کے پائے جانے کی مختلف روایتیں ملتی ہیں ۔ وہ بادشاہ چاریلوسی (Charilausi) کا چچا اور ولی تھا ۔ اس نے اپنے قوانین کو دوام بخشنے کے لیے انوکھا طریقہ اختیار کیا ۔ اس نے شہریوں کو جمع کر کے ان سے حلف لیا کہ جب تک وہ ڈلفی (Delphi) کے دارالاستخارہ سے واپس نہ آ جائے اس کا بنایا ہوا کوئی قانون نہ بدلا جائے ۔ وہ ڈلفی سے کبھی نہیں لوٹا بلکہ اس نے کھانے پینے سے احتراز کر کے اپنے قوانین کو دائمی بنانے کی غرض سے بھوکوں مرنا گوارا کیا ۔ ان قوانین میں سے کچھ یہ تھے :

بیک وقت دو بادشاہ ہوں گے جو مجلس عمائد (Senate) کے تابع ہوں گے ۔ لڑائی میں فوج کی سپہ سالاری کریں گے اور عدالتی انتظام ان کے سپرد ہوگا ۔ سرکاری مذہب میں جو قربانیاں کرنا ضروری تھیں وہ ان کے اہتمام میں کی جائیں گی ۔

مجلس عمائد کے ارکان کی تعداد اٹھائیس مقرر کی گئی تھی ۔ ساٹھ برس سے کم عمر کے لوگ رکنیت کے لیے موزوں نہیں سمجھے جاتے تھے ۔ یہ مجلس قانون بناتی ' حکومت کی پالیسی متعین کرتی اور بڑے جرائم کے فیصلے کرتی ۔

اسمبلی آٹھ ہزار افراد پر مشتمل تھی ۔ اسے اپیلا (Apella) کہتے تھے ۔ اس کی رکنیت کے لیے تیس سال کی عمر کی قید تھی ۔ کوئی قانون اسمبلی کی منظوری کے بغیر قابل نفاذ نہ سمجھا جاتا ۔ تمام اہم معاملات میں اسمبلی کا فیصلہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا ۔ مگر لائی کرگس نے مجلس عمائد کو یہ اختیار دے دیا کہ اگر وہ اسمبلی کے کسی فیصلے کو غیر متدین (Crooked) سمجھے تو نہ مانے ۔ اس طرح بالادستی اسمبلی کے بجائے مجلس عمائد کو منتقل ہو گئی ۔ اسمبلی مجلس عمائد کے ارکان کا انتخاب بھی کرتی تھی ۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ سب امیدوار ایک ایک کر کے اسمبلی کے سامنے سے گزرتے تھے جس کے گزرنے پر اسمبلی سب سے زیادہ شور کرتی وہ رکن بن جاتا ۔

ساری زمینیں حکمران طبقے کی ملکیت تھیں ۔ ڈر تھا کہ تجارت پیشہ لوگ غیرملکوں سے دولت کما کر لائیں گے اور حکمران طبقے کی زمینیں خرید لیں گے ۔ لائی کرگس نے اس کا تدارک کیا کہ ملک میں باہر سے سونا چاندی لانا ممنوع ٹھہرایا اور صرف لوہے کے سکے کو خرید و فروخت کے لیے جائز قرار دیا۔

بیس برس کی عمر سے ساٹھ سال کی عمر تک ہر شہری پر فوجی خدمت لازم تھی ۔ باپ کو اختیار تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بچوں کو مار ڈالے۔

ہر بچہ انسپکٹروں کی کونسل کے سامنے پیش کیا جاتا ۔ جو کمزور ہوتا یا اس میں کوئی نقص ملتا اسے پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر ہلاک کر دیا جاتا ۔ شوہروں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی بیویوں کو غیر معمولی جسمانی قوت رکھنے والے مردوں کے پاس بھیجیں گے تاکہ بہت تنومند بچے پیدا ہوں ۔ بیمار اور ضعیف شوہروں کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو بہتر نسل کشی کی غرض سے نوجوانوں سے ملائیں ۔ جب لڑکا سات برس کا ہو جاتا تو حکومت اسے اس کے ماں باپ سے لے کر تربیت دیتی ۔ بڑی عمر والے چھوٹوں کو جان بوجھ کر لڑاتے تاکہ کوئی کسی کے مقابلہ سے جی نہ چرائے ۔ اگر کوئی بزدلی دکھاتا تو اسے حقارت سے دیکھتے ۔ ہر سال ایک خاص مقام پر لڑکوں کے بینتیں ماری جاتیں یہاں تک کہ جسم سے خون ٹپکنے لگتا ۔ جب بارہ برس کی عمر ہوتی تو لڑکوں کو اندرونی کپڑوں سے محروم کر دیا جاتا اور وہ پورے سال صرف ایک کپڑا پہنتے ۔ زیادہ نہانے کی ممانعت تھی کیونکہ نہانے سے جسم نرم پڑ جاتا ہے ۔ گرمی ہو یا جاڑا لڑکوں کو سینٹھوں کے بستر پر کھلے میدان میں سلایا جاتا ۔ کھیل بالکل ننگا کر کے کھلائے جاتے اور مرد عورت سب ننگے کھلاڑیوں کے کھیل دیکھتے ۔ تیس سال کی عمر تک جوانوں کو فوجی بارکوں میں رکھا جاتا جہاں پرمشقت زندگی گزارنی پڑتی۔

تعلیم صرف اتنی کافی سمجھی جاتی تھی کہ لکھنا پڑھنا آ جائے ۔ ذہنی نشوونما کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ 23 سال کی تربیت پوری کر کے جب تیس سال کی عمر ہوتی تو ان نوجوانوں کو شہری حقوق ملتے اور وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ کھانا کھانے کے مستحق ٹھہرتے۔

لڑکیوں کی تربیت کا انتظام والدین کرتے ۔ کھیل کود ، دوڑ ، کشتی وغیرہ میں انہیں مشغول رکھا جاتا کہ وہ تندرست و توانا ہو کر صحت مند اولاد پیدا کریں ۔ ان کے لیے لازمی تھا کہ جب ناچنے جائیں تو بالکل ننگی ہو کر جائیں ۔ جب ان کے جلوس نکلتے اس وقت بھی انہیں برہنہ ہونا ضروری تھا ۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے جسموں کو متوازن اور دیدہ زیب بنائیں ۔ لڑکیوں کے لیے تعلیم بالکل غیر

ضروری سمجھی جاتی تھی۔

محبت کے معاملے میں بہت آزادی تھی ۔ مرد لڑکوں سے بے تکلف صحبت کرتے تھے ۔ قریب قریب ہر شخص ایک لڑکا رکھتا تھا اور اس کی تربیت کرتا تھا ۔ مردوں کے لیے شادی کرنے کی عمر تیس سال اور عورتوں کے لیے بیس سال مقرر تھی ۔ جو شہری شادی نہیں کرتا تھا وہ حق رائے دہی سے محروم کر دیا جاتا اور وہ ان جلوسوں میں شرکت سے باز رکھا جاتا، جن میں مرد عورت ننگے جاتے تھے ۔ جو شادی سے گریز کرنے پر اصرار کرتے تھے ان کو زدوکوب اور بے عزت کرنے کے لیے عورتوں کی ٹولیاں مقرر کی جاتیں جو راہ چلتے انہیں ذلیل کرتیں ۔ جن مردوں کے بچے نہ ہوتے وہ بھی نہایت حقارت سے دیکھے جاتے۔

شادی والدین طے کرتے ۔ شادی طے ہونے کے بعد دلہن کو زبردستی اٹھا لانا دولہا کا فرض تھا اور دلہن سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ حتی المقدور مزاحمت کرے ۔ ایک طریقہ شادی کا یہ بھی تھا کہ مردوں اور عورتوں کو برابر تعداد میں لا کر اندھیرے گھر میں چھوڑ دیا جاتا اور اندھیرے گھر میں وہ اپنی شادیاں طے کرتے ۔ شادی کے بعد بھی دستور کے مطابق دلہن کو اس کے ماں باپ کے گھر کچھ مدت رکھا جاتا، اس کا شوہر اپنی بارک سے چوری چھپے آ کر ملتا ۔ ایسا بھی کبھی ہوتا کہ یہاں کئی بچوں کا باپ بن جاتا اور اسے روشنی میں اپنی بیوی کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا ۔ شوہر اپنے بھائیوں کو بھی اپنی بیوی سے جنسی تعلق قائم کرنے کی اجازت دے دیتا تھا ۔ اگر کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ کر کسی زیادہ خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہتا تو وہ مورد تعزیر ہوتا ۔ طلاق کا رواج قریب قریب نہ ہونے کے برابر تھا ۔ عورتیں ترکہ پاتیں اور دوسروں کے حق میں وصیت کر سکتی تھیں۔

قانون کی رو سے تیس سال سے ساٹھ سال کی عمر کے لوگوں کو عمومی مطعم — (Public Dining Hall) میں کھانا کھانا لازم تھا، جہاں بہت سادہ کھانا دیا جاتا اور اس کی مقدار ذرا کم رکھی جاتی تھی ۔ چونکہ ساٹھ برس کی عمر تک لوگوں سے فوجی خدمت لی جاتی تھی، اس لیے انہیں تن پروری کا موقع نہیں دیا جاتا تھا ۔ ہر شہری کے لیے ضروری تھا کہ وہ عمومی مطعم کو اپنے حصے کی جنس وغیرہ معینہ میعاد کے اندر پہنچاتا رہے، ورنہ اس کے حقوق شہریت ضبط کر لیے جاتے تھے ۔ اگر کسی کا پیٹ بڑھ جاتا تو حکومت اس کو تنبیہ کرتی اور تنبیہ کارگر نہ ہوتی تو جلاوطن کر دیتی۔

ان تمام احتیاطوں کے باوجود طمع کا مکمل انسداد نہ ہو سکا ۔ بادشاہ، سینیٹر، جرنیل، سفیر سب ہی خریدے جا سکتے تھے ۔ اسپارٹا میں مہمان نوازی کا رواج نہ تھا ۔ غیر ملکی لوگوں کو جلد از جلد اسپارٹا چھوڑنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور خود اسپارٹا والوں کے لیے بغیر حکومت کی اجازت کے ملک سے

باہر جانا ممنوع تھا۔ ان کو ایسا خود پسند اور بزعم خود غلط بنا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دنیا بھر سے بہتر و برتر سمجھتے تھے۔ اسپارٹا کا معاشرہ ایسا مصنوعی تھا کہ دوسرے معاشروں سے اتصال کے بعد اس کا قائم رہنا ممکن نہ تھا۔ جہاں نہ تعلیم ہو' نہ فنون ہوں' نہ آزادی ہو نہ آرام و راحت' وہاں بیرونی اثرات کے پہنچتے ہی معاشرے کی مصنوعی عمارت کا منہدم ہو جانا یقینی تھا۔ مزید برآں ملک میں دو تہائی سے زیادہ غلام تھے۔ انہیں دبائے رکھنے کے لیے آزادی کے بجائے طاقت کی ضرورت تھی۔ طاقت کے زور پر ہی اسپارٹا اپنی برتری قائم رکھ سکا' مگر اس کی اسے بھاری قیمت دینی پڑی۔ خود غرضی' سرد مہری اور بے رحمی قومی مزاج میں سرایت کر گئیں۔ لوگ ذہنی و اخلاقی پستی میں جا گرے اور اچھے انسان نہ بن سکے' صرف اچھے سپاہی بن کر رہ گئے۔

وِل ڈیوراں یہ سب کچھ اپنی تصنیف "یونانی زندگی" (The Life of Greece) میں بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ جب اسپارٹا والوں کو شکست ہوئی تو اس پر حیرت کرنے والے تو بہت تھے مگر آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ شکست انہیں 425 ق م میں جزیرہ سفاک ٹیریا (Sphacteria) میں ہوئی جہاں ان کی فوج کو ایتھنز کے بیڑے نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ آج اسپارٹا کے کھنڈروں میں ایسی ایک چیز بھی نہیں ملتی جو ان کی عظمت کی شہادت دے سکے۔

ایتھنز کے قوانین

یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست ایٹیکا (Attica) تھی جس کا دارالحکومت ایتھنز تھا۔ رفتہ رفتہ ایتھنز سارے یونان کا مشہور ترین شہر اور علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس ریاست کا آخری بادشاہ کوڈرس (Codrus) تھا جس نے 1068 ق م میں اپنی ریاست کو ڈوریئنوں (Dorians) کے حملے سے محفوظ رکھنے میں جان دے دی تھی۔ اس کے بعد نوابوں نے کسی کو بادشاہ بننے نہیں دیا کیونکہ بادشاہ کی اطاعت سے ان کی آزادی میں خلل پڑتا تھا۔ بادشاہ کے بجائے انہوں نے آرکن (Orchon) کا عہدہ نکالا۔ اس کے اختیارات بادشاہ کی طرح غیر محدود نہ تھے۔ جیتے جی آرکن حاکم رہتا اور ریاست کو چلاتا۔ 752 ق م میں آرکن کے عہدے کی میعاد دس سال کر دی گئی اور 683 ق م صرف ایک سال رہ گئی۔ اسی سال آرکن کے اختیارات کو تقسیم کر کے نو آرکن مقرر کیے گئے۔ حکومت دراصل چند متمول اور عالی نسب لوگوں کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے حکمران طبقے کی ایک کونسل بنا رکھی تھی۔ یہی کونسل آرکنوں کو منتخب کرتی' اپنی میعاد پوری کرنے کے بعد آرکن بھی کونسل میں شامل ہو جاتے۔ امراء کا طبقہ شہروں میں راحت و آرام سے رہتا اور ان کی زمینوں پر ان کے لیے مزدور یا غلام فصلیں اگاتے۔ یہ تاجروں کو روپیہ قرض دیتے اور ان کے منافع میں شریک ہوتے۔ امرا کے بعد کاروباری طبقہ تھا' جس میں تاجروں کے علاوہ اہل حرفہ اور آزاد مزدور بھی شامل تھے۔ ایٹیکا

کی زمین زرخیز نہ تھی۔ جیسے جیسے کاشت کاروں کی آبادی بڑھتی گئی ان کی اقتصادی حالت ابتر ہوتی گئی۔ شہر والے جب انہیں قرض دیتے تو سود کی شرح بھاری رکھتے' جب قرض ادا نہ ہوتا تو زمین کے مالک بن جاتے۔ کاشت کار ان کے یہاں مزدور کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور ہوتے۔ قرض خواہ کو قانوناً یہ حق بھی تھا کہ مقروض اور اس کے بیوی بچوں کو قرض کے عوض بیچ کر خریدار کی غلامی میں دے دے۔ اس طرح کاشتکار غلاموں میں تبدیل ہوتے گئے اور آزاد مزدوروں کے بجائے ان سے کام لیا جانے لگا۔ آزاد مزدور بے کار ہو گئے۔ معاشرے کا نچلا طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔

620 ق م کے لگ بھگ آرکنوں سے ڈریکو (Draco) نامی ارکن کو قانونی اصلاحات کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس نے غریبوں کی نسبت ان متوسط طبقے کے لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا جو تجارت و حرفت کے ذریعہ روز بروز مالدار ہوتے جا رہے تھے۔ اب تک طبقہ اول کے امراء ہی آرکن بن سکتے تھے۔ ڈریکو نے طبقہ متوسط کے لوگوں کو بھی چند شرائط کے ساتھ اس منصب کے لیے اہل قرار دیا۔ اس کی اصلاحات سے جاگیرداری نظام اور مستحکم ہو گیا۔ غریبوں کا استحصال اور ان کا غلام بنایا جانا بدستور جاری رہا۔ غریبوں اور امیروں کی مالی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ عدالتیں غریبوں کے بجائے امیروں کی' جو انہیں رشوتیں دینے میں فیاضی سے کام لیتے' حمایت کرتیں۔ جب کہیں کوئی سہارا نظر نہ آیا تو غریبوں نے انقلاب کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔

ملک کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے نازک موقع پر امراء کے طبقے کے ایک فرد سولن (Solon) نے عوام کی ایک ناکام بغاوت سے سبق حاصل کیا اور غریبوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی ٹھانی۔ دوسرے امیرزادوں کی طرح سولن بھی جوانی میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا' اس کی جذباتی شاعری سراہی جاتی۔ جب ادھیڑ عمر کو پہنچا تو وہ جتنی اخلاقی ترقی کرتا گیا اتنی ہی اس کی شاعری پھیکی پڑتی گئی اور اس کی حق پسندی اور دیانت داری کی شہرت بڑھتی گئی۔ 594 ق م میں جبکہ سولن کی عمر چوالیس پینتالیس سال کی تھی وہ آرکن بنایا گیا اور اس سے ایسا دستور اساسی مرتب کرنے کی فرمائش کی گئی جو معاشرے میں توازن پیدا کر سکے۔ سولن نے بہت سا روپیہ لوگوں کو قرض دے رکھا تھا اور بہت سی زمینیں اس کے پاس رہن تھیں۔ اس نے اپنے اور دوسرے قرض خواہوں کے مفاد کو پس پشت ڈال کر تمام قرضے معاف کر دیئے اور تمام زمینیں راہنوں کو واپس دے دینے کا قانون بنایا۔ پرانے کاشت کار جن کی زمینیں رفتہ رفتہ دوسروں کی ملکیت میں چلی گئی تھیں' توقع کر رہے تھے کہ ان کی مدتوں کی چھنی ہوئی زمینیں بھی واپس دلائی جائیں گی۔ مگر اس سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جانے اور خانہ جنگی کی نوبت آ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے سولن نے قرضے معاف کرنے اور مرہونہ زمینوں پر سے رہن کا بار ہٹانے پر اکتفا کیا۔ مزید برآں اس نے لوگوں کو غلامی سے آزاد کر دیا جو قرض کی وجہ سے غلام بنے تھے۔ جو لوگ غلام بنا کر باہر بھیج دیئے گئے ان کو آزاد کرا کے واپس

بلایا۔ تمام آزاد لوگوں پر قانون کو 'امیر و غریب کے امتیاز کے بغیر یکساں نافذ کیا۔ ڈریکو کے جاگیرداری نظام کو مستحکم کرنے والے قوانین منسوخ کیے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جب لوگوں نے چاہا کہ وہ زندگی بھر ان پر حکومت کرے تو اس نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ بائیس سال آرکن رہ کر مصر کی تہذیب و علوم کے مطالعہ کی غرض سے یونان سے مصر گیا۔ جب مصر میں اس کی معلومات میں اضافہ ہوا تو اس نے کہا کہ بڑھاپے میں بھی اس کی تحصیل جاری رہے۔ وہاں ایک مصری پجاری نے اس سے کہا کہ تم یونانی بچوں کی طرح ہو جو باتیں بنانے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ سولن نے کوئی جمہوری آئین مرتب کر کے جمہوریت کو نافذ کیا تھا۔ اس نے اعلیٰ طبقے کی حکمرانی برقرار رکھی۔ البتہ عالی نسبی کی شرط ہٹا کر آمدنی کو طبقاتی تفریق کا معیار بنا دیا۔ اس نے آزاد یونانیوں کے مندرجہ ذیل چار طبقے متعین کیے:

(1) پہلے طبقے میں وہ لوگ رکھے جن کی پیداوار پانچ سو بشل تھی یا اس پیداوار کے برابر آمدنی تھی (ایک بشل میں اتنا غلہ آتا ہے جتنا آٹھ گیلن برتن میں آنے گا)۔ صرف اس طبقے کے لوگ آرکن اور سینٹ کے رکن اور جنرل بن سکتے تھے۔ ان سے اوروں کی نسبت زیادہ ٹیکس لیا جاتا تھا۔

(2) دوسرے طبقہ میں وہ لوگ آتے جن کی پیداوار تین سے پانچ سو بشل کے درمیان تھی' ان کے ٹیکس کی شرح کچھ کم تھی۔ یہ ارکن سینٹر اور جنرل کے عہدوں کو چھوڑ کر اور سب منصب حاصل کر سکتے تھے۔ فوج میں سواروں کے رسالوں میں انہیں بھرتی کیا جاتا تھا۔

(3) تیسرے طبقے کے لوگوں کی پیداوار کا معیار دو سے تین سو بشل تھا۔ ان کے ٹیکس کی شرح طبقہ اول کی شرح کے مقابلے میں 5/12 تھی۔ یہ لوگ بھاری ہتھیاروں والی پیدل فوج (Heavy Armed Infantry) میں بھرتی کیے جاتے تھے۔

(4) چوتھا طبقہ ریاست کے بقیہ آزاد لوگوں کا طبقہ تھا اس طبقہ پر کوئی ٹیکس نہیں تھا۔ یہ فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے لڑ سکتے تھے۔ رہے غلام تو وہ حقوق پانے کے مستحق کیسے ٹھہرتے۔ سولن کا مقصد تو آزاد شہریوں کی باہمی کشمکش کو کم کرنا تھا نہ کہ غلاموں کا بوجھ اتارنا۔

سینٹ (Senate) جو حکومت چلاتی تھی وہ تو پہلے طبقے کے لوگوں کے ہاتھ میں رہی البتہ سولن نے چار سو ارکان پر مشتمل ایک کونسل بنائی جس کے سو سو ارکان ہر طبقہ منتخب کرتا۔ کونسل کے علاوہ اسمبلی بھی بنائی گئی جس میں تمام شہریوں کو شرکت کا حق دیا گیا۔ ہر سال یہ اسمبلی پہلے

طبقے کے لوگوں میں سے آرکن منتخب کرتی اور آرکنوں سے جواب طلب کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کا استحقاق رکھتی تھی۔ عدلتوں کے لیے چار طبقوں میں سے چھ ہزار جیورر (Jurors) بھی منتخب کیے گئے۔ یہ عدالتیں قتل اور بغاوت کے مقدموں کے علاوہ سب مقدموں کی سماعت کر سکتی تھیں۔

سولن کے آئین نے ایک حد تک غریبوں کی اشک شوئی کی اور متوسط طبقے کو اعلیٰ نسب لوگوں کے برابر لا کھڑا کیا کیونکہ اب وہ بھی اپنی کمائی اور آمدنی کی بناء پر طبقہ اول میں داخل ہونے کے اہل ہو گئے۔ مگر انسان اور انسان کے درمیان مساوات کا اصول اس آئین میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ لڑکی کو باپ کے اور بیوی کو شوہر کے ترکہ میں کوئی حصہ نہیں دیا گیا۔ صرف آزاد مردوں کو شہری حقوق ملے۔ غلاموں کی سزائیں آزاد شہریوں سے مختلف رہیں۔ ان کو جسمانی ایذائیں دینا بھی سولن کے قانون نے جائز رکھا۔

146 ق م میں یونان کو رومیوں نے فتح کر لیا۔ اس وقت تک کم و بیش وہی قانون جاری رہا جو سولن نے بنایا تھا۔

رومن لاء

روم کے وجود میں آنے کے بارے میں روایت ہے کہ رومانوس نے جو دیوتا (Mak) کا بیٹا اور شہزادی سلویا (Raea Silvia) کے بعد پیدا ہوا تھا' آٹھویں صدی قبل مسیح میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ روم کے سنگ بنیاد رکھے جانے کی اصل یا فرضی تاریخ بھی بتائی جاتی ہے جو 11 اپریل 753 ق م ہے۔ دو ڈھائی سو سال میں روم کی آبادی ڈھائی لاکھ سے متجاوز ہو گئی اور اس عرصے میں حکومت کا انتظام بادشاہ کے بجائے مجلس عمائد (Senate) کے ہاتھ میں آگیا۔ سب سے پہلے 518 ق م میں بادشاہ کی جگہ دو قونصل مقرر کیے گئے۔ انہوں نے سب سے پہلا قانون یہ بنایا کہ جو شخص بادشاہ بننے کی کوشش کرے اس کو بغیر مقدمہ چلائے تہ تیغ کر دیا جائے۔

سینٹ تین سو افراد پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ قبیلوں کے سردار تھے۔ رفتہ رفتہ امرا اور عوام میں طبقاتی کشمکش بڑھتی گئی۔ عوام کا مطالبہ تھا کہ جو آراضیاں فتح کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں وہ غریبوں میں تقسیم کی جائیں۔ عوام سے مجسٹریٹ اور پجاری بنائے جائیں اور ان کو امراء کے خاندانوں میں شادی بیاہ کے رشتے قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ 486 ق م میں قونصل کےسیس (Cassius) نے مفتوحہ آراضیوں کو غریبوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تو امراء نے یہ الزام رکھ کر کہ وہ عوام کی مدد سے بادشاہ بننا چاہتا ہے' اسے قتل کرا دیا۔

رومیوں کے پاس کوئی تحریری مجموعہ قانون نہ تھا۔ مجاری جو امراء میں سے ہوتے تھے، قانون کی حفاظت اور تشریح کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ عوام کا مطالبہ تھا کہ دنیاوی معاملات سے علیحدہ کرکے قوانین بنائے جائیں اور انہیں ضبط تحریر میں لایا جائے تاکہ ہر متنفس اپنی قانونی ذمہ داریوں اور حقوق سے واقف ہو جائے۔ اس مطالبہ پر جب بہت اصرار ہوا تو 454ق م میں ایک کمیشن یونان بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں کے قوانین سے واقفیت حاصل کرے۔ اس کے بعد دس آدمیوں کی قانون ساز کمیٹی بنی جس کا صدر ایک سخت رجعت پسند شخص کلوویس کو بنایا گیا، مقصد یہ تھا کہ قانون سازی میں کم سے کم فیاضی سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اس کمیٹی نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی نیا قانون نہیں بنایا بلکہ رواجوں اور روایتوں کو جو مدت سے چلی آرہی تھیں، یکجا کرکے بارہ تختیوں (Tables) پر لکھوادیا، یہ ابتدا تھی رومن قانون کی۔

مختلف قونصلوں نے اس کے بعد اپنے اپنے نقطہ نگاہ کے مطابق قوانین بنائے، سلطنت کی قوت اور غلاموں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ غلاموں کی تعداد اتنی بڑھی کہ روزانہ دس ہزار غلام بیچے اور خریدے جانے لگے۔ 185 ق م میں غلاموں نے بغاوت کی، شکست کھائی اور سخت سزائیں بھگتیں۔ 101 ق م میں پھر غلاموں نے بغاوت کی اور پھر ہزاروں ہلاک ہوئے۔ 59ق م میں مشہور رومی مدبر جولیس سیزر قونصل منتخب ہوا اور اس نے غریبوں کی حالت درست کرنے کی غرض سے کچھ قوانین بنائے۔ سیزر کے قتل کے بعد اس کے متبنیٰ آکٹیویس (Octavius) جو آگسٹس (Augustus) کے نام سے مشہور ہوا اور جس نے جمہوریت کو شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا، قوانین میں کافی ردوبدل کیا۔ 117ء میں یعنی بارہ تختیاں مرتب ہونے کے تقریباً پونے چھ سو سال بعد شہنشاہ ہیڈرین (Hadrian) نے ان تمام قوانین کو مرتب کرایا جو پچھلی چھ صدیوں میں نافذ کیے گئے تھے۔ شہنشاہ قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لینے کے بعد 230ء میں اپنا دارالسلطنت روم سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا۔ اس کے زمانے سے قانون سازی کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں عیسائی عقائد کو خاص اہمیت دی جانے لگی۔ 428ء میں شہنشاہ تھیوڈوسیس دوم (Theodosius - II) کے عہد حکومت میں ان تمام قوانین کو مرتب کیا گیا جو شہنشاہ قسطنطین کے زمانے سے اس وقت تک نافذ کیے گئے تھے۔ تقریباً سو سال بعد شہنشاہ جسٹی نین کے عہد میں قوانین کے وہ مشہور مجموعے مرتب ہوئے جو مجموعی طور پر کوڈ آف جسٹی نین (Code of Justinian) کہلاتے تھے۔ یہ مجموعے ان ماہرین قانون کے کمیشن نے مرتب کیے تھے، جنہیں شہنشاہ نے اس مقصد کے لیے خاص طور پر مقرر کیا تھا۔ تاکہ وہ قوانین میں نظم و ترتیب پیدا کرنے کے علاوہ ضروری وضاحت و اصلاح بھی کریں۔ ان ماہرین نے 529ء میں ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام کوڈیکس کنسٹی ٹیوشنم (Codex Constitutionim) ہے۔ اس کے بعد 533ء میں گزرے ہوئے عظیم ماہرین قانون کی اہم رایوں کو فراہم کرکے انہیں ڈائجسٹ (Digeste) کے نام سے شائع کیا۔ قانون کی ان تشریحات کو ماننا

عدالتوں کے لیے لازم کر دیا گیا اور دوسری تمام تشریحیں کالعدم ٹھہریں۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ڈائجسٹ کو مرتب کرنے والوں نے پرانے ماہرین قانون کی ایسی تمام رایوں کو نظر انداز کر دیا جو عوام کی آزادی کی حمایت کرتی تھیں۔ قدیم فیصلوں کو اس طرح توڑا مروڑا کہ وہ استبدادی حکومت کے لیے مفید ثابت ہوں۔

کمیشن کے تین ارکان نے قانون دیوانی کو 533ء میں علیحدہ کرکے انسٹی ٹیوشن (Institutions) کے نام سے مرتب کیا۔ شہنشاہ نے جو اس دوران قوانین نافذ کیے تھے ان کو کوڈیکس میں شامل کرکے 534ء میں نیا ایڈیشن شائع کیا اور شہنشاہ کے مرنے کے بعد اس کے مزید قوانین کو نوویلی (Novellae) کے نام سے شائع کیا۔ جتنے مجموعوں کا نام لیا گیا ہے ان کو مجموعی طور پر کوڈ آف جسٹی نین کہتے ہیں۔ یہ قانون رومی سلطنت کے خاتمہ تک نافذ رہا، پھر پانچ سو سال گمنامی میں پڑے رہنے کے بعد بولونیا (Bologna) کے ماہرین قانون نے اس میں ازسرنو جان ڈالی اور بہت سی یورپی سلطنتوں نے اس کے ڈھانچے پر اپنے قوانین کی عمارت کھڑی کی۔ جسٹی نین کوڈ کی کچھ نمایاں باتیں یہ ہیں:

* تثلیث کے علاوہ کوئی اور عقیدہ قابل قبول نہ ہوگا۔ رومن چرچ کو ماننا تمام عیسائیوں کے لیے لازم ہے۔
* جس کا عقیدہ چرچ کے ٹھیٹ عقائد کے خلاف ہو گا وہ قتل کیا جائے گا۔
* جو شخص چرچ کی مخالفت کرے گا اس کی جائیداد ضبط کرلی جائے گی۔ وہ نہ کوئی چیز خرید سکے گا نہ بیچ سکے گا۔ وہ ترکہ پانے کا مستحق نہ ہوگا۔ اسے وصیت کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ اس کا کسی سرکاری اسامی پر تقرر نہ کیا جائے گا۔ اسے دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے کی ممانعت ہوگی، وہ کسی مقروض عیسائی سے اپنا قرضہ وصول کرنے کی غرض سے مقدمہ دائر کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔
* تمام قوانین جن میں مذہبی قانون بھی شامل ہے، شہنشاہ کی طرف سے جاری ہوں گے اور چرچ شہنشاہ کے زیر اقتدار رہے گا۔ چرچ کی جائداد خواہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ کسی حالت میں کوئی بھی فروخت کرنے کا مجاز نہ ہوگا اور نہ وہ وصیت کے ذریعہ منتقل کی جا سکے گی۔ منقولہ جائداد میں غلام بھی شامل تھے۔ اس امتناع کے بعد ان کا آزاد کیا جانا ممکن نہ رہا ہوگا۔ عقیدت مند ہر سال چرچ کی جائداد میں گرانقدر اضافہ کر دیتے جو پہلے سے موجود تھی وہ بیچی نہیں جا سکتی تھی۔ اس طرح چرچ بادشاہ سے بھی زیادہ مالدار ہو گیا۔

* جوشخص کسی زمین کو تیس سال تک جوتتا رہا ہو تو اس کی آئندہ نسلیں اس زمین کو ہمیشہ ہمیشہ جوتنے کی پابند ہوں گی۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور (Serfs) اگر آقا کی اجازت کے بغیر کام چھوڑ کر چلے جائیں تو وہ غلاموں کی طرح پھر آقا کے پاس لا کر اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جائیں گے۔
* زانی عورت کو قتل کی سزا دینے کے بجائے دارالراہبات (Nunnery) بھیجنے کی سزا مقرر کی گئی۔ مرد کو بدستور سابق موت کی سزا دی جاتی۔ زنا بالجبر ثابت ہونے پر زانی کو سزائے موت دی جائے گی اور اس کی جائداد مظلوم عورت کو دی جائے گی۔
* جسٹی نین سے پہلے ترکہ یک جدی (Agnate) رشتہ داروں کو ملتا تھا۔ نئے قانون کے مطابق متوفی کی اولاد (Cognates) ترکہ پانے کی مستحق ٹھہری۔
* چرچ سودی کاروبار کو ناجائز سمجھتا تھا۔ شہنشاہ نے اس معاملہ میں چرچ کی بات نہ مانی اور سود کو جائز رکھا۔
* مقروض کو گرفتار کرنا جائز تھا مگر ضمانت پر چھوڑنا بھی ضروری تھا۔
* مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر کسی کو قید خانہ میں داخل کر دینا جائز نہ تھا۔
* آزاد شدہ غلاموں کو بھی وہی حقوق دیئے گئے جو دوسرے شہریوں کے تھے۔
* غریب والدین کو اپنی کفالت کی غرض سے بچوں کو بیچ کر دوسروں کی غلامی میں دے دینے کا حق تھا۔
* مجرم کا ہاتھ کاٹنے کی سزا کچھ جرموں میں جائز تھی۔ مثلاً ٹیکس وصول کرنے والا جعلی حساب داخل کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹا جا سکتا تھا۔
* ایسی کتاب یا تحریر کو نقل کرنے کی سزا میں بھی ہاتھ کاٹا جا سکتا تھا جو چرچ کے عقائد سے متصادم ہو۔ جسٹی نین کے بعد تخت و تاج کے ناکام امیدوار کو اندھا کر دینے کی سزا کا اضافہ کیا گیا۔
* موت کی سزا میں شہریوں کا سر کاٹا جائے گا اور غلاموں کو سولی پر چڑھایا جائے گا۔
* جادو گروں اور مفرور فوجیوں کو زندہ جلانے کی سزا تھی۔
* موت کی سزا کے خلاف عدالت بالا، سینٹ اور شہنشاہ سے اپیل کرنے کا حق دیا گیا تھا۔

اس قانون کی تعریف و توصیف میں اہل مغرب رطب اللسان ہیں۔ بیشک اس میں چند معقول اصول مدنظر رکھے گئے تھے مثلاً مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر کسی کو قید خانے میں ڈالنے کی ممانعت، مجرموں کو حق اپیل، آزاد ہو جانے کے بعد غلاموں اور شہریوں کے حقوق میں مساوات، متوفی کی اولاد کو ترکہ پانے میں ترجیح، مقروض کی ادائیگی سے پہلے ضمانت پر رہائی۔ مگر غیر معقول عناصر کی بھی کمی نہ تھی مثلاً رومن چرچ کے عقائد کو ہر عیسائی کے لیے لازم کر دینا۔ عیسائیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو تثلیث پر وحدت کو ترجیح دیتے۔ کچھ اور حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا ماننے کے

باوجود ان میں بیک وقت خدائی اور انسانی صفات کے قائل نہ تھے۔ ایسے لوگ گردن زدنی ٹھہرتے۔ چرچ کی مخالفت میں جائداد ضبط کرنے کی سزا ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مخالفت کرنے والوں کو ان تمام حقوق سے محروم کر دیا، جن کے بغیر زندہ رہنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان کاشت کاروں کو جو زیادہ عرصے تک کاشت کاری کرتے رہیں، زمین کے ساتھ ایسا وابستہ کر دیا کہ پشت ہا پشت چھٹکارا نہ پا سکیں، سزائے موت نافذ کرتے وقت بھی آزاد غلام کا امتیاز باقی رکھنا، بچوں کو غلام بنا کر بیچنے کی اجازت، سود کو ممنوع نہ کرنا، لوگوں کو بینائی سے محروم کر دینا اور زندہ جلا دینا جیسے بہیمانہ قوانین تھے جو کسی مہذب معاشرے کو زیب نہیں دیتے۔

ہندوؤں کے قوانین

ول ڈیوراں نے اپنی کتاب "ہمارا مشرقی ورثہ" (Our Oriental Heritage) میں لکھا ہے کہ وہ مجموعہ قوانین جو منو (Manu) کے نام سے منسوب ہے اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ مسیح سے بارہ سو برس قبل وجود میں آ گیا تھا، دراصل ابتدائی عیسوی صدیوں میں مرتب کیا گیا تھا۔ ان قوانین کو دہلی کے قریب رہنے والے برہمن خاندان کے ایک فرد منو نے برہمنوں کی برتری و بہبودی کو مستحکم کرنے کے لیے وضع کیا تھا۔ ان قوانین کے ذریعہ جیسے جیسے برہمنوں کا وقار و اقتدار بڑھتا گیا، ان کی وسعت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ یہ پورے ہندوستان میں نافذ ہو گئے۔ ان کی چند اہم باتیں یہ تھیں:

راجہ برہمن پر کبھی کسی قسم کا ٹیکس نہ لگائے۔ اسے برہمن کے غصہ سے ڈرنا چاہیے جو اپنے منتروں سے راجہ کو بھسم کر سکتا ہے۔

برہمن کیسا ہی مہیب جرم کیوں نہ کرے اسے موت کی سزا نہ دی جائے۔

کائنات میں جو کچھ ہے، وہ سب برہمن کی جائداد ہے اس لیے لوگوں پر واجب ہے کہ انہیں ہر طرح کے عطیات دیں۔ زندگی کے ہر اہم معاملے میں معقول معاوضہ دیکر برہمن کی خدمات حاصل کریں۔ انہیں اچھے سے اچھا کھلائیں پلائیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جو برہمن کی ناراضی کا باعث ہو کیونکہ ناراض ہو کر برہمن لوگوں کے اعمال صالحہ اکارت کر سکتا ہے۔

اگر شودر کسی شودر کو قتل کرے تو دس گائیں، ویش کو قتل کرے، تو سو گائیں، کشتری کو قتل کرے، تو ہزار گائیں، برہمن کو دے کر بری الذمہ ہو جائے گا۔ لیکن برہمن کو قتل

کرنے پر کوئی فدیہ قبول نہ ہوگا بلکہ قاتل کو موت کی سزا دی جائے گی (یہ عجیب انصاف ہے کہ قتل تو ہوں شودر ویش اور کشتری اور خون بہا بجائے ان کے وارثوں کے برہمن پائے)۔

منو نے تمام نوع انسانی کو چار ذاتوں میں منقسم کیا تھا۔ سب سے اونچی ذات برہمنوں کی تھی پھر کشتریوں کی پھر ویشوں کی اور سب سے نیچے درجے میں شودر تھے۔ منو شاستر کے تتبع نے ذاتوں کے نظام کو بہت استحکام بخشا۔

شادی بیاہ کے رشتے ذاتوں کے باہر نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن کوئی برہمن کسی شودر عورت سے جنسی تعلق پیدا کرے تو وہ لائق تعزیر نہ تھا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شودر کسی برہمن عورت سے جنسی تعلق رکھے تو اس کی ساری جائداد ضبط کرنے کے علاوہ اس کا عضو تناسل بھی کاٹ دیا جائے گا۔ (اس سے ملتی جلتی سزا تہذیبِ حاضر کے علمبردار امریکہ کے گورے باشندے وہاں کے کالے باشندوں کو دیتے رہے ہیں۔ گوری عورت سے کالے مرد کو تعلق رکھنے کی سزا سخت ایذا پہنچا کر مار ڈالنا تھی)۔

اوروں کو جاہل رکھنے کی غرض سے برہمنوں نے علم دین کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تاکہ دوسروں کو پیدائش، شادی بیاہ، موت وغیرہ کی رسمیں ادا کرنے میں ان کا محتاج بن کر رہنا پڑے بالخصوص شودروں کو تو وید پڑھنے، سننے اور اس کے اشلوک یاد کرنے سے بالکل ہی محروم کر دیا تھا۔ کوئی شودر وید پڑھے تو اس کی زبان کھینچ لی جائے۔ سنے تو کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا جائے اور وید کا کوئی حصہ یاد کرے تو قتل کر دیا جائے۔ شودروں کی طرح عورتوں کو بھی وید پڑھنا ممنوع تھا۔ منو کے قانون نے عورت کا مقام نہایت حقیر رکھا تھا۔ شادی سے پہلے وہ باپ یا بھائی کی نگرانی میں رہتی۔ شادی کے بعد شوہر کی لونڈی بن جاتی۔ شوہر مر جائے تو بیوی کو اس کے ساتھ زندہ جلا دینا لازم تھا۔ جس مرنے والے کے بہت ساری بیویاں ہوتیں ان سب کو نذر آتش کر دیا جاتا۔ ترکہ صرف بیٹوں کو ملتا بیوی کی حیثیت دراصل خادمہ کی تھی۔ اس کا دھرم تھا کہ بچوں کو پالے، گھر کی صفائی کرے، کھانا پکائے اور نوکروں کی طرح کھڑی ہو کر شوہر اور بچوں کو کھانا کھلائے جو کچھ بچ رہتا وہ اس کے حصہ میں آتا۔ بیوی اور شوہر سڑک پر ساتھ چلے تو بیوی کے لیے ضروری تھا کہ پیچھے پیچھے چلے۔ شوہر کی جا و بے جا ہر بات کو سہنا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ نافرمانی کی صورت میں اسے اگلے جنم میں گیدڑ بن جانے کی بشارت دی جاتی۔

منو نے شادی کی آٹھ قسمیں بتائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو اٹھا کر لے جائے تو وہ لڑکی ساری زندگی اس غنڈے کی بیوی بن کر گزارے۔ شادی

کی ایک اور قسم یہ تھی کہ باپ لڑکی کو فروخت کر دے۔ باہمی محبت کی شادی ناپسندیدہ سمجھی جاتی تھی۔ ہندو معاشرہ چار ذاتوں میں بٹا ہوا تھا لیکن پیشوں کی بنا پر بے شمار ذاتیں وجود میں آ گئیں۔ ہر پیشہ والے کا دھرم تھا کہ وہ اپنے پیشے کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار نہ کرے۔ چنانچہ بھگوت گیتا کا فرمان ہے کہ "اپنا کام ناقص طور پر بھی کرو تو اس سے بہتر ہے کہ دوسروں کا کام عمدگی سے انجام دو"۔ جب ارجن کرشن سے کہتا ہے کہ میں اپنے رشتہ داروں کے خلاف تلوار کیونکر اٹھاؤں اور کس دل سے انہیں ہلاک کروں تو کرشن کہتے ہیں کہ کشتری کا دھرم لڑنا اور مار کاٹ کرنا ہے اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اپنے دھرم سے انحراف کرے گا۔ چنانچہ جیسے ارجن کا دھرم کشتری ہونے کی حیثیت سے لڑنا تھا ویسے ہی ان کا دھرم برتن بنانا اور جولاہے کا دھرم کپڑا بننا تھا۔ یہ بندھن ایسا تھا جس سے آزاد ہونے کی قانوناً کوئی صورت نہ تھی۔ اس طرح بیوہ بھی مجبور تھی کہ اپنے دھرم کے بموجب وہ مردہ شوہر کے ساتھ زندہ جل مرے۔ ول ڈیوراں طنزاً کہتا ہے کہ یوں تو کیڑے مکوڑے مارنا بھی برہمن کے دھرم کے خلاف ہے مگر زندہ عورت کو جلا دینا عین دھرم ہے۔

برہمن نے توہم پرستی کو جان بوجھ کر پھیلایا تاکہ اس کے ذریعہ روپیہ کمائیں۔ انہوں نے لوگوں کو باور کرایا کہ لڑکیوں کو دیوتاؤں کی خدمت کے لیے وقف کر دینا بڑا کار ثواب ہے۔ چنانچہ جنوبی ہند کے مندروں میں دیو داسیاں بکثرت رہنے لگیں۔ وہ صبح شام دیوتاؤں کے آگے ناچتیں گاتیں اور رات کو پجاریوں کی آغوش گرم کرتیں۔ پجاری ان سے جسمانی لطف اٹھانے کے علاوہ مالی فائدہ بھی حاصل کرتے۔ جو دوسرے لوگ دیوداسیوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونا چاہتے انہیں اس کا معاوضہ پجاریوں کو دینا پڑتا۔ جنوبی ہند میں یہ بھی دستور تھا کہ دلہن شوہر سے ملنے سے پہلے ایک رات برہمن کے ساتھ گزارتی۔

ہندوؤں کے رسم و رواج و عقائد کا جائزہ لینے کے بعد ول ڈیوراں لکھتا ہے:

> ہندوستان کے پیہم انحطاط میں ہندومت کے ذاتوں کے نظام اور برہمنوں کی غلامانہ اطاعت کو بڑا دخل ہے۔ ہندومت میں دیوتاؤں کا تصور غیر اخلاقی ہے۔ اس مذہب نے صدیوں بہیمانہ رواج، مثلاً انسانی قربانی اور بیوہ کو جلانا جاری رکھے جبکہ اور تمام قومیں اس قسم کی باتیں مدت دراز سے چھوڑے ہوئے ہیں۔ ہندومت کی نظر میں زندگی ایک ناگزیر مصیبت ہے۔ اس نظریے نے اس کے ماننے والوں کی ہمت کو پست اور روح کو ظلمت پسند بنا دیا ہے۔ اس نے دنیا کے تمام مظاہر کو فریب نظر (مایا) ٹھہرا کر آزادی و غلامی، خیر و شر، اور فساد و اصلاح کی تمیز بالکل مٹا دی ہے۔ بقول ایک باہمت

ہندو کے ہندو مت کا تنزل اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اب اس میں صرف بت پرستی اور رسم و رواج کی پابندی رہ گئی ہے ۔ ظاہر پرستی سب کچھ ہے ' اصل مدعا سے غرض نہیں " ۔

اسلامی شریعت

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے یعنی ایک مثالی زندگی بسر کرنے کے لیے جن ہدایات کی ضرورت ہے وہ قرآن میں دی گئی ہیں ۔ عبادات ہو یا معاملات دونوں کے بارے میں مناسب احکام کہیں مفصل اور کہیں مجمل ہیں ۔ مجمل احکام کی تشریح و توضیح اللہ نے اپنے رسول کی زبان سے وحی غیر متلو کے ذریعے کرا دی ہے ۔ چنانچہ سورہ نحل کی آیت 44 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور یہ ذکر ہم نے تمھاری طرف اس لیے نازل کیا کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے " ۔

کلام پاک میں جگہ جگہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت ہے لیکن قرآن یہ تفصیل فراہم نہیں کرتا کہ نماز کس طرح قائم کی جائے گی ۔ حضرت جبریل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ نماز کس طرح پڑھی جائے چنانچہ نبی اکرم نے مسلمانوں کو اسی طریقے پر نماز پڑھائی ۔ اسی طرح قرآن مجید میں یہ تفصیل نہیں ملتی کہ کس مال پر کس شرح سے زکوٰۃ دی جائے ۔ آپ کو مختلف مالوں کی مختلف شروح زکوٰۃ وحی غیر متلو کے ذریعے معلوم ہوئیں اور آپ نے امت کو مطلع کیا ۔ عبادات و معاملات میں جو ہدایات نبی کریم نے دی ہیں ' وحی غیر متلو کی بنا پر دی گئی ہیں چنانچہ خود فرمایا کہ "اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ' اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا " ۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے بیان کی ہے اور سنن ابو داؤد اور کئی اور کتب حدیث میں ملتی ہے ۔ نبی کریم نے یہ بھی فرمایا کہ جو کچھ میں کہوں اسے معیار قرآن پر جانچو ' اس میں جو قرآن کے موافق ہو تو میں نے کہا ہے اور جو قرآن کے موافق نہیں وہ میرا قول نہیں " ۔ یہ حدیث ڈاکٹر محمصانی نے رسالۃ الشافی کے حوالے سے نقل کی ہے ۔ مختصر یہ کہ نبی کریم نے جو ہدایات بھی دی ہیں وہ قرآن کی توضیحات و تشریحات ہیں ' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون کا اصل ماخذ

قرآن ہے ۔ سنت نے وضاحت کرنے میں اسی کا اتباع کیا ہے اور قیاس و اجماع میں بھی قرآن کے اصول ہی پیش نظر رکھے جاتے ہیں ۔ یہی حال استحسان اور مصالح مرسلہ کا ہے ۔ یہ خیال کرنا کہ قرآنی اصولوں کو نظر انداز کر کے کوئی اسلامی قانون بنایا گیا ہے یا بنایا جا سکتا ' صحیح نہیں ۔ البتہ یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ صحیح ماخذوں سے اخذ کردہ قوانین کو نظر انداز کرنے کے لیے شرعی حیلوں کا استعمال کیا جائے ۔ مثلاً پڑوسی کے حق شفعہ سے بچنے کے لیے حیلے تراشے جائیں ۔ اپنی موقر تصنیف " تاریخ التشریع الاسلامی " میں علامہ محمد الخضری نے ایسے حیلہ تراشنے والے فقیہوں کی سخت مذمت کی ہے ۔ اس کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے رکن جناب عبد السلام ندوی نے کیا ہے ۔ علامہ خضری لکھتے ہیں:

تاریخ واقعات میں سب سے عجیب و غریب واقعہ یہ ہے کہ ایک مذہبی مقنن ایسے مسائل فرض کرے اور لوگوں کو ان کی تعلیم اس غرض سے دے کہ وہ احکام شرعیہ سے کیونکر نجات پائیں ...... ہم کو اس دور میں (جو دوسری صدی کی ابتدا سے چوتھی صدی کے نصف تک رہا) ایک ایسا شخص ملتا ہے جس نے لوگوں کے لیے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام کتاب الحیل ہے اور اہلحدیث نے نہایت سختی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ' یہاں تک کہ اس کے مصنف کو شیطان کہا اور اس پر فسق و فجور کے داغ کا نشان لگایا لیکن اس کے مصنف کا نام نہ معلوم ہو سکا ..... جو شخص ایک مسلمان کے لیے فریضہ زکوٰۃ کو چھوڑ دینے میں آسانی پیدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب سال قریب ختم کے ہو تو تھوڑی دیر کے لیے اپنا مال اپنے لڑکے یا بی بی پر ہبہ کر دو پھر اس سے اپنے اوپر ہبہ کرا لو کیونکہ اب نیا سال شروع ہو جائے گا اور زکوٰۃ واجب نہ ہو گا ۔ اس کی نسبت تمھارا کیا خیال ہو سکتا ہے ۔ مسائل حِیل میں جرم کے لحاظ سے یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے ۔ ورنہ اس میں اسقاط شفعہ کے متعلق بہت سے مسائل ہیں اور پابندی قسم سے آزاد ہونے کی مثالیں تو اور بھی زیادہ ہیں " ۔

ڈاکٹر محمصانی نے بھی " فلسفۃ التشریع فی الاسلام " میں شرعی حیلوں کا ذکر کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں " کتاب الحیل " کا مصنف احمد ابو بکر خصاف ہے ۔ شرعی حیلوں پر وہ ایک کتاب کا ذکر بھی کرتے ہیں ۔ اس کا نام

"کتاب الخارج فی الحیل" ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ کتاب "امام محمد بن حسن شاگرد ابو حنیفہ کی طرف منسوب ہے ۔ مگر یہ نسبت مشکوک ہے کیونکہ امام محمد سے روایت ہے کہ وہ ایسے حیلوں کو بہت برا سمجھتے تھے جن کا مقصد کسی کو اس کے حق سے محروم کرنا ہو"۔

شرعی حیلوں کی کچھ کتابیں شافعی فقہا سے بھی منسوب ہیں ۔ ڈاکٹر محمصانی لکھتے ہیں کہ "جو شخص امام شافعی کے اخلاق و فضیلت علمی سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ امام شافعی نے نہ تو خود شرعی حیلے اختیار کیے اور نہ دوسروں کو اختیار کرنے کی رائے دی"۔

شریعت اسلامی کے مآخذ

کتاب، سنت، اجماع و قیاس کی تعریف جو ڈاکٹر محمصانی نے کی ہے وہ مختصر آیہ ہے:

کتاب سے قرآن مجید مراد ہے ۔ قرآن کے الفاظ بالکل وہی ہیں جو وحی متلو کے ذریعہ نبی کریم پر بعثت سے آخر تک نازل ہوتے ۔ قرآن کی آیات اسلامی معاشرے کے حالات کے تقاضوں کے مطابق وقتاً فوقتاً نازل ہوئیں اور اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے نازل ہوئیں کہ لوگ قدیم عادات کو ترک کرنے اور نئے احکام پر عمل پیرا ہونے کے لیے کہاں تک تیار ہیں ۔ قرآن میں ایک لفظ کم و بیش کرنے کا بھی نبی کریم کو اختیار نہ تھا ۔ البتہ آپ کو اس کی توضیح و تشریح کا مکلف بنایا گیا۔

سنت کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اس قول پر جو آپ نے فرمایا ہو اور ہر اس فعل پر جو آپ نے کیا ہو اور ہر اس کام پر جس کی آپ نے اجازت دی ہو، ہوتا ہے۔

"ترجمان القرآن" کے منصب رسالت نمبر میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ ابتدا میں نبی کریمؐ نے حدیث قلمبند کرنے کی اجازت نہیں دی تھی جس کی وجہ اور بعد میں اجازت دینے کے اسباب یہ بتائے ہیں:

"جب حضورؐ مبعوث ہوئے تو آپ کے سامنے اولین کام یہ تھا کہ قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کریں کہ اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہونے پائے ۔ لکھنے والے چونکہ گنے چنے آدمی تھے اس لیے آپ کو خطرہ تھا کہ جو لوگ وحی کے الفاظ اور آیات لکھ رہے ہیں، وہی لوگ اگر آپ ہی سے سن

کر آپ کے حوالے سے دوسری چیزیں بھی لکھیں گے تو قرآن آمیزش سے نہ بچ سکے گا ۔ آمیزش نہ ہوگی تو کم از کم شک پڑ جائے گا کہ ایک چیز آیت قرآنی ہے یا حدیث رسول ۔ اس بنا پر ابتدائی دور میں حضور نے حدیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا مگر یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی ۔ مدینہ پہنچنے کی تھوڑی مدت بعد آپ نے اپنے اصحاب اور ان کے بچوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دلوانے کا خود اہتمام فرمایا اور جب ایک خاصی تعداد پڑھی لکھی ہوگئی تو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی"۔

اس طرح نبی کریم کے زمانے ہی سے حدیثیں قلمبند کرنے کا کام شروع ہوگیا ۔ بعد میں محدثین نے ان کو اور زبانی روایتوں کو جمع کر کے حدیثوں کے بہت سے مجموعے مرتب کیے ۔ سب سے پہلے خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے احادیث جمع کرنے کے احکام جاری کیے تھے ۔ احادیث کے تمام مجموعوں میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم صحت کے اعتبار سے سب سے افضل ہیں ۔ ڈاکٹر محمصانی کہتے ہیں کہ جمہور علماء کے نزدیک صحیح بخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے لیکن مغرب اقصیٰ کے علماء صحیح مسلم کو ترجیح دیتے ہیں۔

اہل شیعہ کے نزدیک صرف وہی احادیث قابل قبول ہیں جنہیں اہل بیت نے روایت کیا ہو۔

تیسرا ماخذ شریعت اجماع ہے ۔ اجماع اس کو کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں کسی حکم شرعی پر مسلمان مجتہد متفق ہو جائیں ۔ امام احمد بن حنبل کی رائے میں صرف صحابہ کا اجماع معتبر تھا ۔ اس کے بعد اجماع کا دروازہ بند ہو گیا ۔ امام شافعی اجماع سکوتی کو حجت نہیں سمجھتے ۔ اہل شیعہ صرف اس اجماع کو معتبر سمجھتے ہیں جس پر اہل بیت کا اتفاق ہو یا مجتہدوں کے اجماع میں امام معصوم بھی شریک ہوں۔

علامہ الخضری لکھتے ہیں کہ یہ بدیہی بات ہے کہ اجماع میں قرآن، حدیث اور قیاس ہی سے استناد کیا جاتا ہوگا ۔ قیاس سے اس واقعے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔ ایک بار نبی کریم کے پاس قبیلہ جہینہ کی ایک عورت آئی اور کہا کہ میری والدہ نے حج کی منت مانی تھی مگر منت پوری کرنے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا، کیا میں ان کی طرف سے حج کروں ۔ نبی کریم نے فرمایا کہ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا وہ قرض ادا نہ کرتی ۔ منت اللہ کا قرض ہے ۔ اسے پورا کر اور قرض اتار ۔ نبی کریم نے منت کو قرض پر قیاس کیا۔

قیاس

ڈاکٹر محمصانی لکھتے ہیں کہ شرعی احکام مخصوص اغراض و مصالح پر مبنی ہیں اس لیے فقہہ کسی مسئلے سے متعلق اس حکم کی علت غائی دریافت کر لیتے ہیں جو نص کی رو سے دیا گیا ہے۔ وہی علت غائی جب کسی دوسرے مسئلے میں پائی جائے تو بوجہ اشتراک علت دوسرے مسئلے میں وہی حکم دیا جاتا ہے اور قیاس معکوس یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں وہ سبب موجود نہ ہو جو کہ کسی دوسری چیز کو حرام ٹھہراتا ہے تو اس پر حرام ہونے کا حکم نہیں لگاتے۔ اہل شیعہ قیاس کے قائل نہیں۔

دنیا کا کوئی عہد فتنہ پردازوں سے خالی نہیں رہا، خود نبی کریم کے عہد مبارک میں فتنہ پرداز اور منافق موجود تھے۔ چنانچہ عہد رسالت کے بعد کے کئی عہدوں میں امت مسلمہ کو وضع حدیث کے فتنے سے دو چار ہونا پڑا۔ صحیح حدیثوں کی چھان بین میں مسلمانوں نے جو عرق ریزی کی اور پرکھنے کے جو معیار قائم کیے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بیشمار راویوں کے صحیح حالات زندگی معلوم کرنا اس لیے ضروری تھا کہ جب تک کوئی راوی ثقہ و قابل اعتبار نہ ہو اس کی روایت قبول نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس جذبہ تحقیق سے علم الرجال وجود میں آیا اور مسلمانوں نے انتھک کوشش کے بعد جعلی حدیثوں کو نکال پھینکا۔ جارج سارٹن "مقدمہ تاریخ سائنس" کی آخری جلد میں لکھتا ہے:

> "قرآن اور اس کی تفاسیر کے علاوہ اسلام کے دینی علم کا اہم ماخذ سنت ہے جس کا انحصار وحی غیر متلو پر ہے اور رسول کے قول و فعل پر مبنی ہے۔ بالکل ابتدا ہی سے مسلمانوں نے حدیث کو غیر معمولی اہمیت دی اور اسے پوری صحت کے ساتھ محفوظ کرنے پر بڑی عرق ریزی سے کام لیا۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کے وہ طریقے ایجاد کیے جو دور حاضر کی تاریخی تنقید کے طریقوں کے ہم پلہ تھے اور جن سے اہل مغرب مدتوں ناواقف رہے"۔

حدیث سے انحراف کی کوششیں

سنت کے اہم ماخذ قانون ہونے پر ہمیشہ مسلمانوں کا اتفاق رہا ہے۔ البتہ دوسری اور تیرہویں صدی ہجری میں اس کے خلاف آوازیں اٹھائی گئیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ دوسری صدی میں خوارج اور معتزلہ نے انکار حدیث کیا تھا اور تیرہویں صدی میں اس انکار کی ابتدا سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی نے کی۔ مولانا مودودی کہتے ہیں کہ اس کی دوسری پیدائش کا سبب بھی وہی ہے جو دوسری صدی میں پہلی مرتبہ اس کی پیدائش کا سبب بنا تھا۔ یعنی بیرونی

فلسفوں اور غیر اسلامی تہذیبوں سے سابقہ پیش آنے پر ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا ہو جانا اور تنقید کے بغیر باہر کی ان ساری چیزوں کو سراسر تقاضائے عقل مان کر اسلام کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوششیں کرنا۔ لیکن دوسری صدی کی بہ نسبت تیرہویں صدی کے حالات بہت مختلف تھے۔ اس وقت مسلمان فاتح تھے ان کو فوجی و سیاسی غلبہ حاصل تھا اور جن فلسفوں سے انہیں سابقہ پیش آیا تھا وہ مفتوح و مغلوب قوموں کے فلسفے تھے۔ اس وجہ سے ان کے ذہن پر ان فلسفوں کا حملہ بہت ہلکا ثابت ہوا اور بہت جلد رد کر دیا گیا۔ اس کے برعکس تیرہویں صدی میں یہ حملہ ایسے وقت ہوا جبکہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکے تھے اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے قوانین اور اپنے اجتماعی و سیاسی اور معاشی ارادوں کو پوری طرح مسلط کر دیا تھا۔ ان حالات میں جب مسلمانوں کو فاتحوں کے فلسفے اور سائنس اور ان کے قوانین اور تہذیبی اصولوں سے سابقہ پیش آیا تو قدیم زمانے کے معتزلہ کی بہ نسبت ہزار درجہ زیادہ سخت مرعوب ذہن رکھنے والے معتزلہ ان کے اندر پیدا ہونے لگے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ..... زمانے کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہ ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال دیا جائے ..... انہوں نے محسوس کیا کہ اسلامی نظام حیات کو جس چیز نے تفصیلی اور عملی صورت میں قائم کیا ہے وہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے ..... اس سنت سے پیچھا چھڑایا جائے"۔

اسلامی قوانین کے ماخذوں کا مختصر سا جائزہ لینے کے بعد چند الفاظ میں شریعت کے اس حصے کا ذکر بھی کر دیا جائے جس کا تعلق عبادات سے ہے۔ اسلام جن چیزوں پر زور دیتا ہے، وہ وحدت، رسالت اور آخرت ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہ، لاشریک لہ، سمجھنا چاہیے، صرف وہ ہی معبود حقیقی ہے، وہی کائنات کا تنہا خالق اور چلانے والا ہے، وہ ہر چیز کا مالک ہے، وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً رسول بھیجتا رہا ہے، جن میں خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں، جن رسولوں کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں ان سب کو ماننا ضروری ہے۔ پہلے آنے والے رسولوں کی تعلیمات میں حسب ضرورت اللہ تعالیٰ بعد میں بھیجے جانے والے رسولوں کے ذریعہ ترمیم و تنسیخ کراتا رہا ہے۔ یہ ترمیم و تنسیخ آخری نبی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ جو شریعت ان کے ذریعے اللہ نے نافذ فرمائی وہ قیامت تک قائم رہے گی۔ اسی کے تتبع یا نافرمانی پر آخرت میں جزا و سزا کا دارومدار ہے۔ تمام انسان دوبارہ پیدا کیے جائیں گے۔ اور ان کے اعمال کا احتساب کیا جائے گا۔ جنہوں نے شریعت پر کاربند رہ کر زندگی گزاری ہو گی، ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں۔ نافرمانوں کو نار جہنم کی وعید دی گئی ہے۔ گناہ گاروں میں سے بھی اللہ جسے چاہے گا بخش کر جنت میں داخل کر دے گا۔ البتہ مشرک کی مغفرت نہ ہو گی۔

اسلامی قانون کا بڑا حصہ عبادات پر مشتمل ہے۔ جو عبادتیں مسلمانوں کے لیے لازم قرار

دی گئی ہیں اور جن باتوں پر انہیں ایمان رکھنا ضروری ہے ' ان کا ذکر پوری تفصیل سے کیا گیا ہے تاکہ عبادتیں بہترین طریقے پر کی جائیں اور ایمان میں کسی قسم کی کجی نہ آنے پائے ۔ دنیا میں انسان کی حیثیت اللہ کے خلیفہ کی ہے ۔ انسان خود کسی چیز کا مالک نہیں ۔سب انسانوں سے دنیا کی ان تمام نعمتوں کے بارے میں قیامت کے دن پرسش ہوگی جو ان کے تصرف میں آئی ہوں گی ۔جن لوگوں نے مال حلال طریقوں سے کمایا ہے اور زکوٰۃ و صدقہ دینے کے بعد اپنے اوپر خرچ کیا ہے ان پر کوئی گرفت نہ ہوگی ۔ البتہ جنہوں نے حرام طریقوں سے دولت کمائی یا حلال طریقوں سے کمائی مگر زکوٰۃ نہ دی ' ان سے سخت مواخذہ ہو گا۔

ایسے ہی جو لوگ دوسرے لوگوں پر حاکم بنے ان کا سخت احتساب ہوگا۔ دیکھا جائے گا کہ انہوں نے کسی پر ظلم و زیادتی تو نہیں کی ۔ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کو پس پشت ڈال کر لوگوں پر خود ساختہ قوانین تو نہیں چلائے ۔ انہوں نے املاک عامہ اور بیت المال کو اپنی نجی املاک تو نہیں بنا لیا تھا ۔ انہوں نے عدل کرنے میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز تو نہیں کیا تھا۔ انہوں نے دین کو پوری طرح نافذ کیا تھا یا نہیں۔

اسلام میں سیاست و معیشت اور دوسرے معاملات بھی اسی طرح جزو دین ہیں ' جیسے عبادات ۔ یہ جائز نہیں کہ مقررہ عبادتوں کو مقررہ طریقوں پر ادا کرنے کے بعد مسلمان سیاست کو جیسے چاہیں چلائیں اور اقتصادیات کے جو قانون چاہیں بنائیں ۔ مسلمان کو زندگی کے ہر شعبے میں اسلام رہنمائی دیتا ہے اور انہیں اس رہنمائی کی پیروی کرنے پر مکلف کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ معاملات سے متعلق جو قوانین ہیں انہیں ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے۔

اسلامی حکومت و سیاست

جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے اور انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کا ارادہ فرشتوں پر ظاہر کیا تو فرشتوں نے پوچھا کہ کیا آپ کسی ایسے کو مقرر کریں گے جو زمین کا نظام بگاڑ دے اور خونریزیاں کرے ۔ اللہ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے ۔ آدم کو پیدا کرنے کے بعد فرشتوں سے اور ابلیس سے (جو ایک جن تھا) آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ ابلیس کے علاوہ سب نے حکم کی تعمیل کی ۔ ابلیس کے بہکانے سے آدم اور ان کی بیوی نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا اور وہ بھی نافرمانوں میں ہو گئے مگر انہوں نے اپنی نافرمانی پر ندامت کا اظہار کیا اور توبہ کی ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی اور انہیں جنت سے دنیا میں بھیج دیا تاکہ وہ خلافت کے فرائض انجام دیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم پر یہ واضح کر دیا کہ جب کبھی میری طرف سے تمہارے (اور تمہاری اولاد کے) پاس کوئی

ہدایت پہنچے تو جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ مگر اس ہدایت کو جھٹلانے اور قبول کرنے سے انکار کرنے والے آگ میں ڈالے جائیں گے ۔ یہ باتیں سورہ بقرہ کی آیات 30 تا 39 میں بتائی گئی ہیں ۔ ان سے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ آدم اور ان کی اولاد کی حیثیت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی ہے اور وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے مکلف ہیں۔

اس خیال سے کہ دنیا کا انتظام اچھی طرح چلا سکیں ' اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے زمین اور آسمان کی چیزیں مسخر کر دیں۔ سورہ جاثیہ کی آیات 12-13 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا کہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلائیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو ○ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ' سب کچھ اپنے پاس سے ' اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں ○

یہی بات قرآن مجید میں اور کئی جگہ مثلاً سورہ حج کی آیت 65 میں بیان کی گئی ہے ۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے یہ ہے کہ فرشتوں سے آدم کو سجدہ کرایا گیا تھا ۔ ان کو بھی آدم کے لیے مطیع و مسخر کیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے خلیفہ کے مددگار بن سکیں ۔ وہ سورہ بقر کی آیت 34 کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> "اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقہ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ' ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا ۔ چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا ہے اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط ' جس کام میں انسان اپنے اختیارات کو ' جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں ' استعمال کرنا چاہیے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں تو تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرہ عمل سے وہ متعلق ہو ' وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے"۔

ظاہر ہوا کہ اللہ نے انسان کو خلیفہ بنا کر وہ تمام آسانیاں فراہم کر دیں جو دنیا میں اس کے فکر و عمل کے لیے ضروری تھیں اور ساتھ ساتھ اپنی ہدایات بھی وقتاً فوقتاً جاری فرماتا رہا۔ توقع کی جا سکتی تھی کہ ان آسانیوں اور ہدایتوں کے ہوتے ہوئے انسان منشائے الٰہی کے مطابق نیابت کے

فرائض بحسن و خوبی انجام دیتا رہا ہو گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ابلیس نے نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے مردود قرار دیا اور اس کی درخواست پر روز جزا تک اسے اولاد آدم کو بہکانے کے لیے مہلت دی:

"اب روز جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔ اس نے عرض کیا میرے رب یہ بات ہے تو پھر مجھے اس روز تک کے لیے مہلت دے جب کہ انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا اچھا تجھے مہلت ہے اس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔ وہ بولا میرے رب جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دلفریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکاؤں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر دیا ہے۔ فرمایا یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔ بیشک جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف ان بھکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں اور ان سب کے لیے جہنم کی وعید ہے"۔ سورہ الحجر آیات 35 تا 43۔

شیطان (ابلیس) اور اس کی ذریت نے انسان کو بہکانے کی مہم بڑی سرگرمی سے شروع کر دی۔ کچھ لوگوں کو باور کرایا کہ نہ خدا ہے نہ جزا و سزا، بس جو کچھ ہے، وہ یہی زندگی ہے۔ جو کچھ عیش و آرام حاصل کرنا ہے، اسی زندگی میں حاصل کر لو۔ حلال و حرام، نیکی و بدی، خیر و شر ثواب و عذاب، سب مریض ذہنوں کے اختراعات ہیں۔ صحت مند ذہن کی پہچان یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قوت، زیادہ سے زیادہ اقتدار، زیادہ سے زیادہ دولت، زیادہ سے زیادہ عیش و آرام کا طالب ہو۔ ان چیزوں کے حصول میں جو چیز مانع آئے اسے کچل دیا جائے۔ کمزور لوگ اس سے زیادہ کے مستحق نہیں کہ وہ حوصلہ مند لوگوں کے غلام و خدمت گزار ہو کر رہیں۔ کچھ اور لوگوں کو جو کائنات کے نظم و ضبط کو دیکھ کر اس کے خالق کو مانتے تھے، سمجھایا کہ ہاں خالق کائنات تو ہے مگر اسے مخلوق کی انفرادی زندگی سے دلچسپی نہیں، اگر ہوتی تو سب کو یکساں اہلیت و استعداد عطا کرتا۔ لوگوں کی استعداد کا تفاوت خود یہ ثابت کرتا ہے کہ اعلیٰ استعداد والے کم استعداد والوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ جب استعداد کم و بیش ہے تو انسان میں مساوات قائم نہیں ہو سکتی۔ کچھ اور لوگوں کو سمجھایا کہ دنیا میں وہ زندہ رہ سکتے ہیں جو تنازع للبقا میں دوسروں پر حاوی آجائیں اور دوسروں کے رزق کو اپنے تصرف میں لاسکیں۔ بہت سوں کے ہاتھوں سے دیوی دیوتاؤں کے بت بنوا کر انہیں ان کی پرستش پر لگا دیا اور توہم پرستی کو فروغ دے کر پروہتوں اور پجاریوں کے چنگل میں پھنسا دیا۔ طرح طرح کے فلسفوں کا جال پھیلا دیا جس میں بڑے بڑے ارباب عقل و فہم الجھ کر رہ گئے۔ مختصر یہ کہ شیطان کی گمراہ کن

تعلیمات نے انسان کو خلافت کے فرائض ادا کرنے سے باز رکھنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

دنیا کی تاریخ میں ایسے ادوار بہت کم آئے ہیں جب انسان نے اللہ کی نیابت کا حق ادا کیا ہو۔ زیادہ تر ظلم و استبداد کا دور دورہ رہا۔ جمہوریت کے نام پر جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان پر بھی اقتدار اہل ثروت کا رہا۔ کمزوروں کی حمایت کرنے والے اول تو بہت کم منصہ شہود پر آئے اور جو آئے انہیں یا تو اہل ثروت نے صفحہ ہستی سے مٹا دیا یا اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ وقتاً فوقتاً اللہ کے رسول آتے رہے، ان میں سے بیشتر کی سعی نامشکور رہی۔ رسولوں کی بات نہ ماننے کی سزا میں کچھ قوموں پر اللہ نے عذاب نازل فرمایا اور ان کا نام و نشان ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ کچھ انبیا کی انتھک کوششوں سے لوگوں نے راہ راست اختیار کی مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ پھر شیطانی عوامل ان پر غالب آگئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کی قوم نے تھوڑے ہی عرصے میں خدا کے کام کو پس پشت ڈال کر بے راہ روی اختیار کر لی، حضرت سلیمان کی سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ شمال کی ریاست اسرائیل اور جنوبی یہودیہ کہلائی۔ 721 ق م ریاست اسرائیل کو اشوریوں نے اور 598 ق م میں یہودیہ کو بابل کے بادشاہ بخت نصر نے تباہ کر دیا اور اہل کتاب تتر بتر ہو گئے۔ سب سے آخر میں خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور ان پر مکمل ضابطہ حیات قرآن مجید کی شکل میں نازل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پورے عرب کو اپنے رسول کے زیرنگیں کر دیا۔ جس طرح نبی کریم نے اور ان کے بعد خلفائے راشدین نے فرمانروائی کی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ام المومنین حضرت عائشہ کی مندرجہ ذیل روایات جو صحیح مسلم کی کتاب الزہد سے نقل کی جاتی ہیں، فرمانروائے عرب کی زندگی کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں، بڑی حد تک اس کی تقلید خلفائے راشدین نے بھی کی:

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ہم لوگ یعنی آل محمد ایک ایک مہینے تک آگ نہیں جلاتے تھے، (یعنی کوئی چیز نہیں پکاتے تھے) صرف کھجوروں اور پانی پر دن بسر کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ مگر اس وقت جب کہیں سے (ہدیہ کے طور پر) گوشت آجاتا تھا تو اسے پکانے کو چولہے جلاتے تھے۔ عائشہ کہتی ہیں حضور کا انتقال ہو گیا لیکن ساری زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے دن میں دو مرتبہ روغن زیتون اور روٹی کھائی ہو۔ عائشہ کہتی ہیں مدینہ میں آنے کے بعد حضور کی وفات تک آل محمد نے کبھی تین دن برابر گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

یہ اس شخص کے گھر کا حال تھا جس نے حنین کے مال غنیمت کے چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی خود تقسیم کی تھی اور پانے والوں میں سے کچھ نے تین تین سو اونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی پائی تھی۔

فتح مکہ سے سات آٹھ سال پہلے اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد جتا دیا تھا:

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے ۔ زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے ......" سورۃ الحج آیت 41۔

نبی کریم نے مدینہ پہنچتے ہی نماز قائم کرنے کا اہتمام کیا تھا ۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر قبا میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی ۔ یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد ہے، اس کے بعد مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی ۔ جب پورے عرب پر تسلط ہو گیا تو ہر صوبے میں صحابہ کرام نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ وصول کرنے، نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے بھیجے اور خدا کے حکم کی تعمیل میں اسلام کی روشنی کو پورے عرب میں پہنچانے کی سعی جمیل کی۔

نبی کریم نے عمال کے تقرر میں ایک نہایت حکیمانہ اصول اختیار کیا، وہ یہ کہ جو کسی منصب کا خواہشمند ہو اسے وہ منصب نہ دیا جائے ۔ ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ وہ اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ یا رسول اللہ! خدا نے جن ملکوں پر آپ کو حکومت مرحمت فرمائی ہے ان میں سے کسی کا حاکم مجھے مقرر فرما دیجئے، پھر دوسرے بھائی نے بھی یہی درخواست کی، نبی کریم نے فرمایا کہ خدا کی قسم ہم اس شخص کو اس کام پر مقرر نہیں کریں گے جو اس کا طالب یا حریص ہو گا ۔ پھر ابو موسیٰ سے کہا کہ تم امارت پر جا سکتے ہو ۔ چنانچہ انہیں یمن کا حاکم مقرر کر دیا۔ (مسلم، کتاب الامارت)۔

نبی کریم نے عمال کو تحفے لینے سے بھی منع فرمایا ۔ ابو حمید ساعدی کہتے ہیں کہ قبیلہ اسدی کے ابن لبیہ کو زکوۃ کا محصل مقرر کیا گیا تھا ۔ جب زکوۃ وصول کر کے لائے تو انہوں نے حضور سے کہا کہ یہ مال تو آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے ۔ نبی کریم نے خطبہ دیا اور کہا یہ شخص اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہیں بیٹھا رہا تاکہ یہ معلوم ہو سکتا کہ اس کو ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں ۔ (اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ جو ہدیہ اسے ملا تھا اس کے محصل زکوۃ ہونے کی وجہ سے ملا تھا، جو اسے قبول کرنا مناسب نہ تھا) مسلم، کتاب الامارت۔

عمال کو خدا سے ڈرنے اور رعایا کی بہبود کو مدنظر رکھنے کے بارے میں صحابہ کرام نے بہت سی حدیثیں بیان کی ہیں مثلاً حضرت معقل کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جس بندہ کو خداوند تعالیٰ رعیت کی پاسبانی سپرد کر دے اور وہ اپنی رعیت کے معاملات میں خیانت کرے یا وہ ان کی بھلائی میں کوشش نہ کرے تو وہ جنت میں داخل نہ ہو گا (مسلم، کتاب الامارت)۔

عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا جو لوگ اپنی حکومت اور اپنے اہل و عیال کے معاملات اور جن امور کے وہ متولی ہیں، ان میں عدل و انصاف سے کام لیں گے، وہ خدا کے یہاں نور کے منبروں پر داہنی جانب ہوں گے (مسلم، کتاب الامارت)۔

علیؓ کہتے ہیں کہ ایک انصاری کی ماتحتی میں حضور نے ایک چھوٹا سا لشکر روانہ کیا، اس انصاری نے کسی بات پر غضبناک ہو کر آگ جلوائی اور لوگوں سے کہا کہ اس میں گھسیں ۔ انہوں نے یہ حکم نہ مانا ۔ جب یہ واقعہ حضور کو سنایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اطاعت تو نیک کام میں فرض ہے نہ کہ خدا کی نافرمانی میں! خلیفہ منتخب ہو کر حضرت ابو بکر صدیق نے جو پہلا خطبہ دیا تھا اس میں کہا تھا کہ اگر میں اچھا کام کروں تو میری اعانت کرنا اور اگر برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا ۔ میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تو تم میری اطاعت کرنا، نافرمانی کروں تو پھر کسی پر میری اطاعت واجب نہیں۔

اسی قسم کے اقوال دوسرے خلفائے راشدین سے بھی منقول ہیں ۔ اموی خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز بھی خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلے اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ چونکہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر مجھے خلیفہ بنایا گیا ہے، اس لیے میری بیعت کا قلاوہ جو تمہاری گردنوں میں ڈالا گیا ہے اسے میں اتارے دیتا ہوں ۔ اب تم جس کو چاہو اپنا خلیفہ منتخب کر لو ۔ لوگوں نے عمر بن عبدالعزیز ہی کو منتخب کیا ۔ اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ جو اللہ کی نافرمانی کرے اس کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے ۔ جب تک میں تمہارے معاملات اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے طے کروں اس وقت تک میری اطاعت تم پر واجب ہے لیکن اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم میری اطاعت نہ کرنا۔

ظاہر ہوا کہ اسلام میں حکمران کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے سرمو انحراف نہ کرے۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کا بہت رعب و دبدبہ تھا مگر اس کے باوجود یہ نہ تھا کہ لوگ ان کا ہر حکم بے چون و چرا مان لیں ۔ جب عراق، شام، مصر میں فتوحات ہوئیں تو حضرت زبیر، حضرت سلمان فارسی، حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت بلال ایسے اکابر صحابہ نے مطالبہ کیا کہ مفتوحہ آراضیاں فتح کرنے والی فوجوں میں تقسیم کی جائیں ۔ حضرت عمر چاہتے تھے کہ وہ آراضیاں انہیں کاشتکاروں کے قبضے میں رہیں جو ان میں کاشت کاری کرتے آئے تھے اور ان کا لگان ہمیشہ مسلمانوں پر اور رفاہ عامہ پر خرچ کیا جائے ۔ جو صحابہ زمینوں کو تقسیم کرنے کے حق میں تھے انہوں نے حضرت عمر

سے کہا کہ اگر آپ نے زمینیں تقسیم نہ کیں تو ارتکاب ظلم کریں گے ۔ حضرت معاذ بن جبل ' حضرت علی اور کچھ اور صحابہ تقسیم کرنے کے خلاف تھے ۔ حضرت عمر نے مجلس شوریٰ بلائی ۔ دو تین دن تک بحث جاری رہی بالآخر جب حضرت عمر نے سورہ حشر کی آیات 6 لغایت 10 پڑھیں اور آیت 10 کے ان الفاظ کو زیر بحث لائے "والذین جاء ومن بعدہم "یعنی مفتوحہ مال میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو بعد میں آئیں گے ۔ تب لوگ مطمئن ہوئے اور خلیفہ کے حکم کے آگے ارشاد باری تعالیٰ کے اتباع میں سرتسلیم خم کیا ۔ یہ واقعہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تفصیل سے تفہیم القرآن جلد پنجم میں بیان کیا ہے۔

حضرت زید بن حارثہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے ۔ ان کی سرکردگی میں شرجیل والئ بصریٰ کے خلاف حضور نے تین ہزار آدمیوں کا لشکر روانہ کیا تھا ۔ اس فوج میں نبی کریم نے اپنے چچا زاد بھائی جعفر بن ابو طالب کو بھی زید بن حارثہ کی ماتحتی میں بھیجا تھا ۔ شرجیل بہت بڑا لشکر لے کر مقابلہ پر آیا ۔ زید بن حارثہ 'جعفر بن ابو طالب 'عبداللہ بن رواحہ اور بہت سے صحابہ شہید ہوئے ۔ خالد بن ولید نے بڑی جوانمردی اور خوش تدبیری سے کام لے کر فوج پیچھے ہٹائی اور اسے ہلاکت سے بچایا ۔ نبی کریم نے اس شکست کا انتقام لینے کی غرض سے زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ کی سرکردگی میں ایک لشکر تیار کیا جس میں بڑے بڑے صحابہ کو نوعمر اسامہ کی ماتحتی میں رکھا ۔ ابھی لشکر روانہ ہونے نہ پایا تھا کہ نبی اکرم کا انتقال ہو گیا اور حضرت ابو بکر خلیفہ ہوئے انہوں نے اسامہ سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں عمر فاروق کو جو آپ کے لشکر میں آپ کی ماتحتی میں جانے والے ہیں 'روک لوں تاکہ میں ان سے امور خلافت میں مشورہ لیتا رہوں ۔ اسامہ نے اجازت دی تو عمر فاروق لشکر کے ساتھ جانے کے بجائے مدینہ میں رہ گئے ۔ خلیفہ اول اسامہ کے لشکر کو مدینہ سے کچھ دور تک پہنچانے گئے تو اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور ابو بکر ان کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے ۔ اسامہ نے چاہا کہ گھوڑے سے اتر جائیں مگر حضرت ابو بکر نے انہیں اترنے نہ دیا ۔ ایک آزاد کردہ غلام کے بیٹے کا اس قدر احترام مسلم معاشرے کے علاوہ اور کہیں ممکن نہ تھا۔

آزاد کردہ غلام اور اس کے بیٹے کی ماتحتی میں بڑے بڑے صحابہ کو رکھ کر نبی کریم نے مساوات کا وہ اعلیٰ معیار قائم کیا جو کسی اور قوم و ملت میں نہیں پایا جاتا ۔ مصر کے مشہور عالم دین اور اخوان المسلمون کے سیکریٹری سید قطب نے (جو اپنے مذہبی نظریات کی بناء پر شہید کیے گئے) اپنی گراں قدر تصانیف "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" میں اسلامی مساوات کی بہت سی مثالیں دی ہیں ۔ اس کتاب کا اردو میں پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی نے ترجمہ کر کے "اسلام کا نظام عدل" نام رکھا ہے ۔ نظام عدل سے کچھ واقعات جو اسلامی مساوات سے متعلق ہیں 'درج کیے جاتے ہیں:

حضرت عمر نے عمار بن یاسر کو جو موالی تھے کوفہ کا والی (گورنر) بنایا۔

ابو سفیان اور دوسرے اکابر قریش باریابی کے منتظر کھڑے رہتے مگر حضرت عمر 'صہیب اور بلال کو جو موالی تھے 'پہلے شرف باریابی دیتے ۔ کیونکہ رسول اللہ کے صحابہ ہونے اور متعدد غزوات میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ زیادہ احترام کے مستحق تھے۔

عمرو بن العاص والئ مصر کے بیٹے نے ایک مصری لڑکے کو مارا تھا ۔ خلیفہ ثانی نے بدلے میں عمرو بن العاص کے بیٹے کو پٹوایا ۔ بدلہ دلواتے وقت حضرت عمر کہتے جاتے تھے ۔ "اس خاندانی شریف زادے کو مار" عمرو بن العاص خود بھی سزا کا مزا چکھنے والے تھے مگر اس مصری نے اسے معاف کر دیا۔

سعد بن ابی وقاص فاتح عراق تھے ۔ عمر مال تقسیم کر رہے تھے اور لوگ انہیں گھیرے ہوئے تھے ۔ سعد بن ابی وقاص لوگوں کو ہٹا کر حضرت عمر تک پہنچے ۔ لوگوں کو ہٹانے پر انہوں نے سعد کو زجر و توبیخ کی۔

مکہ معظمہ میں حضرت عمر نے دیکھا کہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور نوکر کنارے کھڑے ہیں ۔ حضرت عمر نے آقاؤں کو ملامت کی اور نوکروں کو ساتھ کھانے کے لیے دستر خوان پر بٹھا دیا۔

حضرت عمر جب بحیثیت خلیفہ شام گئے تو ان کے ساتھ صرف ایک نوکر تھا ۔ وہ نوکر اور خلیفہ باری باری اونٹ پر چڑھتے اور پیدل چلتے تھے ۔ سید امیر علی "مسلمانوں کی مختصر تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ خلیفہ ثانی دو بار شام گئے اور دونوں بار ان کے ساتھ کوئی محافظ دستہ تھا نہ کوئی ساز و سامان 'بس وہ تھے اور ان کا ایک ملازم ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی "تاریخ اسلام" حصہ اول میں لکھتے ہیں کہ مقام جابیہ پر مسلمان افسروں نے استقبال کیا ۔ جب حضرت عمر نے انہیں دیبا و حریر کی پر تکلف قبائیں پہنے دیکھا تو اظہار ناپسندیدگی کیا ۔ لیکن جب افسروں نے قباؤں کے نیچے زرہ بکتریں دکھائیں تو قبائیں اتروانے پر اصرار نہیں کیا۔

سید قطب کی کتاب سے چند اور واقعات درج کیے جاتے ہیں:

حضرت ابو بکر نے وظیفے مقرر کرنے اور مال کی تقسیم میں بھی مساوات ملحوظ رکھی ۔ عمر چاہتے تھے کہ یہ تقسیم صحابہ کی فضیلت کے اعتبار سے کی جائے ۔ ابو بکر نے یہ بات نہ مانی بلکہ کہا کہ

دنیاوی اعتبار سے سب مسلمان برابر ہیں۔ جن لوگوں کے اعمال صالح زیادہ ہیں' ان کا اجر وہ آخرت میں پائیں گے۔ حضرت عمر جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مال کی تقسیم میں فضیلت کا معیار ملحوظ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنہیں زیادہ مال دیا گیا وہ بہت دولت مند ہو گئے۔ تب حضرت عمر ابو بکر کی دور اندیشی کے معترف ہوئے اور ارادہ کیا کہ آئندہ سب کو برابر حصہ دیا کریں گے۔ مگر بیشتر اس کے کہ اس ارادے پر عمل کرتے انہیں شہید کر دیا گیا۔ حضرت علی نے حضرت ابو بکر کی طرح تقسیم مال میں مساوات قائم کی۔

حضرت ابو بکر نے عمال کے تقرر میں عرب و غیر عرب کا امتیاز بھی اٹھا دیا تھا۔ جب فارسی النسل باذان جو یمن کا حاکم تھا اور فیروز جو صنعاء کا حاکم تھا' مشرف بہ اسلام ہو گئے تو ان دونوں کو اپنے اپنے عہدے پر برقرار رکھا اور دوسرے ماتحت افسروں کو بھی مفتوحہ ممالک میں ان کی خیر خواہی دیکھ کر بحال رکھا۔ یہ بھی ایک دور اندیشانہ فعل تھا جس کے باعث قوموں میں مسلمان کی خیر خواہی کا جذبہ بیدار ہوا۔

قاضی شریح کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فریق مقدمہ تھے۔ حضرت عمر ایک گھوڑا خریدنا چاہتے تھے' اس پر سوار ہو کر دیکھ رہے تھے کہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور زخمی ہو گیا۔ حضرت عمر نے چاہا کہ گھوڑا واپس کر دیں۔ گھوڑے کا مالک واپس لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ معاملہ جب قاضی شریح کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے خلیفہ کے خلاف فیصلہ دیا اور کہا کہ گھوڑا جس حالت میں لیا تھا اسی حالت میں واپس کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ وہ زخمی ہو گیا ہے' اس لیے اس کی قیمت ادا کرنی چاہیے۔ اس فیصلہ پر حضرت عمر بہت خوش ہوئے اور قاضی شریح کو ترقی دی۔

جب حضرت علی خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مدینہ سے اپنا دار الحکومت کوفہ منتقل کر دیا' اس زمانہ میں قاضی شریح کوفہ کے قاضی تھے۔ حضرت علی کی زرہ کھو گئی تھی' وہ انہوں نے ایک عیسائی کے پاس دیکھی۔ اسے لے کر قاضی شریح کے یہاں پہنچے اور کہا کہ اس شخص کے پاس میری زرہ ہے۔ عیسائی سے قاضی نے پوچھا تو اس نے کہا کہ زرہ میری ہے۔ قاضی نے حضرت علی سے گواہ پیش کرنے کو کہا۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس کوئی گواہ نہیں۔ قاضی نے مقدمہ کا فیصلہ عیسائی کے حق میں کیا۔ وہ عیسائی یہ دیکھ کر کہ خلیفہ قاضی کے سامنے ایک عام فرد کی طرح مدعی بن کر گئے اور گواہ پیش نہ کرنے کی وجہ سے مقدمہ کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا' بہت متاثر ہوا اور مسلمان ہو گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ جب حضرت علی نے صفین کی جنگ کے لیے کوچ کیا تھا تو اس نے یہ زرہ چرالی تھی۔ حضرت علی نے وہ زرہ اسی کو بخش دی۔

انسان اور انسان کے درمیان یہ مساوات اس تعلیم کا ضروری جز ہے جو اسلام دیتا ہے۔ دور حاضر کی نام نہاد مہذب قومیں ابھی تک اس سے ناواقف ہیں۔ ان کے یہاں انسان کی نہیں رنگ و نسل کی اہمیت ہے۔ جن کا رنگ یا نسل ان سے مختلف ہے ان پر ہر طرح کے مظالم ان کے نزدیک روا ہیں۔ مگر اللہ اور اس کے رسول نے بار بار لوگوں کو یاد دلایا ہے کہ سارے انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ اس لیے سب برابر ہیں۔ سورہ نساء جن الفاظ سے شروع ہوتی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے:

"لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسے اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ لوگ اس کے احترام میں سر و قد کھڑے ہو جایا کریں وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔ (ابو داؤد' ترمذی)۔

جب ہم اس بات پر نظر ڈالتے ہیں کہ ابو بکر' عمر' علی اور عمر بن عبد العزیز نے خلیفہ بننے کے بعد کیسی انتہائی سادہ زندگی گزاری تو اس وقت ہماری نظروں کے سامنے نبی کریم کا نمونہ آجاتا ہے' حضرت ابو بکر کپڑا بیچا کرتے تھے۔ خلیفہ بن جانے کے اگلے دن بدستور سابق کپڑے کے تھان لے کر نکلے۔ جب لوگوں نے کہا کہ اب آپ کو پورا وقت حکومت کے معاملات پر صرف کرنا ہوگا تو بادل ناخواستہ بیت المال سے گزر اوقات کے لیے کم از کم تنخواہ لینے لگے۔ لیکن مرتے وقت وصیت کی کہ میری جائداد بیچ کر وہ رقم واپس کر دینا جو میں نے سوا دو سال کی خلافت کے دوران اپنے مصارف کے لیے لی تھی۔ حضرت ابو بکر وہ شخص تھے جنہوں نے مسلمان غلاموں کو ان کے کافر آقاؤں سے آزاد کرانے پر ہزاروں خرچ کر ڈالے تھے۔ پھر بھی ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں کا مال ان کے اوپر خرچ ہو۔

بین الاقوامی معاملات

اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی آٹھویں آیت میں فرمایا ہے:

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو' کسی گروہ کی دشمنی تم کو مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ' عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسب رکھتا ہے....."

دنیا کی قومیں اگر تمام بین الاقوامی قوانین کو چھوڑ کر صرف مندرجہ بالا آیت پر عمل کرنے لگیں تو دنیا جنت بن جائے۔ راستی اور انصاف کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے تو بڑے سے بڑا معاملہ بھی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ لیکن دشمن کے ساتھ انصاف کرنے کو بڑی ایمانی قوت اور اللہ کا خوف چاہیے۔ اس بے دینی کے دور میں نہ ایمان ہے نہ اللہ کا خوف۔ دشمن سے انصاف کرنا تو بڑی بات ہے' جن قوموں میں دوستانہ تعلقات ہوتے ہیں وہ بھی ایک دوسرے کی پیٹھ میں چھری بھونکنے سے گریز نہیں کرتیں۔ اس صدی کی دو عالمی جنگوں میں جو مختلف فریقین کے درمیان خفیہ معاہدے ہوئے تھے ان کے طشت ازبام ہونے کے بعد پتہ چلا کہ کیسے کیسے عیاروں نے بگلا بھگت بن کر اپنے دوستوں سے دشمنی کی۔ ایسے لوگوں کی مذمت کرنے کے بجائے دنیا انہیں عظیم سیاستدانوں میں شمار کر کے ان کا احترام کرتی ہے۔ راستی اور انصاف سر پیٹ لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور شیطان کے چیلے بغلیں بجاتے اور جشن مناتے ہیں۔

عہد کی پابندی اسلام کی نظر میں ایک دینی فریضہ ہے۔ عہد کی خلاف ورزی کرنا ایک بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"......... عہد کی پابندی کرو' بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی"۔ (بنی اسرائیل۔ آیت 34)۔

مسلمانوں پر دوسرے مسلمانوں کی مدد کرنا واجب ہے مگر عہد کی اسلام میں اتنی اہمیت ہے کہ اگر مسلمان دوسرے مسلمانوں سے کسی ایسی قوم کے خلاف دین کے معاملہ میں مدد مانگیں جن سے ان کا معاہدہ ہے تو مدد کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ سورہ انفال آیت 72 میں ارشاد ہے:

"........... رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) نہیں آئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں' جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے"۔

البتہ جہاں یہ اندیشہ ہو کہ دشمن بدمعاملہ ہے اور اس سے اچانک حملہ کا امکان ہے' وہاں یہ

حکم ہے کہ:

"....... اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو' یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا"۔(سورہ انفال آیت 58)

اس صورت میں بھی پہلے دوسرے فریق کو اطلاع دینا ضروری ہے کہ فلاں وجہ سے معاہدہ توڑنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ جائز نہیں کہ اس اندیشہ کی بناء پر خود پیش قدمی کر کے دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔

سورہ توبہ نازل ہونے کے بعد مشرکین سے برأت کا اعلان کیا گیا اس کے باوجود مشرکین سے کیے گئے معاہدوں کا احترام کرنا بھی واجب ٹھہرا۔ سورہ توبہ آیات 3 اور 4 میں اللہ کا ارشاد ہے:

"اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی..... بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے۔ پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو..."

جنگ میں جس فریق کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے وہ چاہتا ہے کہ فریق مخالف کو بالکل نیست و نابود کر دے۔ مگر قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دشمن صلح پر مائل ہو تو تم صلح کرنے سے گریز نہ کرو۔ سورہ انفال کی آیت 61 اور 62 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہو تو تم بھی اس کے لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۝ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لیے اللہ کافی ہے" (یعنی اللہ ان کے دھوکے سے تمہیں محفوظ رکھے گا)۔

اس سے بھی زیادہ یہ کہ اگر دوران جنگ دشمنوں کا کوئی آدمی تمہاری پناہ میں آنا چاہے تو اسے پناہ دو اور بحفاظت واپس کر دو:

"اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمھارے پاس آنا چاہے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے' اور پھر اسے اس کے مامن تک پہنچادو....." (سورت توبہ۔ آیت 6)

دشمن سے لڑنا ناگزیر ہے مگر اس میں زیادتی روا نہیں:

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (سورہ بقرہ آیت 19)

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ کسی غزوہ میں ایک عورت کو مقتول پایا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل پر اظہار نفرت فرمایا۔ صحیح مسلم۔ کتاب الجھاد والیسیر۔

جب حضرت ابوبکر نے شام کی طرف فوج روانہ کی تو سپہ سالار کو مندرجہ ذیل ہدایتیں کیں:

جن لوگوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے ان سے تعرض نہ کرنا۔ کسی عورت ' بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا ' پھلدار درخت نہ کاٹنا ' کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا ' جانوروں کو بے کار ذبح نہ کرنا ' نخلستان نہ جلانا۔ مال غنیمت میں غبن نہ کرنا اور بزدل نہ ہو جانا (خلفائے راشدین مصنفہ مولوی معین الدین ندوی)۔

ذمیوں سے رواداری

حضرت عمر خلیفہ ثانی نے شام جا کر ایلیا کے لوگوں کو جو عہد نامہ لکھ کر دیا تھا وہ ذمیوں کے بارے میں مسلمان حکمرانوں کی پالیسی کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کا اقتباس "تاریخ اسلام" حصہ اول مصنفہ شاہ معین الدین احمد ندوی سے پیش کیا جاتا ہے:

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان ' مال ' گرجا ' صلیب تندرست ' بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے کہ نہ ان کے گرجاؤں میں سکونت کی جائے گی۔ اور نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کو یا ان کے احاطے کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔

نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا۔ نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا.... یونانیوں میں سے جو ایلیا میں سکونت اختیار کرنا چاہے اس کے لیے بھی امن ہے ' اس کو ایلیا والوں کی طرح جزیہ دینا ہوگا۔ ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان و مال لے کر یونانیوں کے ساتھ نکل جانا چاہے تو وہ بھی اور ان کے گرجے اور صلیب مامون ہیں تاآنکہ وہ اپنی جائے پناہ تک نہ پہنچ جائیں۔"

حضرت عمر نے دوسری بڑی رعایت ذمیوں کے ساتھ یہ کی کہ ان کی اراضیاں لگان کے عوض انہیں کے قبضے میں رہنے دیں اور مسلمان فوجیوں کے اصرار کے باوجود انہیں نہ دیں۔ جزیہ کے مقابلے میں زکوٰۃ زیادہ بھاری ٹیکس ہے ' اگر غیر مسلموں سے زکوٰۃ لی جاتی تو زیادہ آمدنی ہوتی مگر چونکہ زکوٰۃ ٹیکس کے علاوہ مسلمانوں کی دینی عبادت بھی ہے ' اس لیے غیر مسلموں سے زکوٰۃ لینے کے معنی یہ ہوتے کہ انہیں ایسی عبادت پر مجبور کیا جا رہا ہے جو صرف مسلمانوں سے مخصوص ہے۔ سید قطب لکھتے ہیں:

"ایک غیر مسلم بھی اسلامی حکومت کے زیر سایہ امن و سکون سے فیض یاب ہوتا ہے ' داخلی اور خارجی تحفظ اور ان تمام سہولتوں سے مستفید ہوتا ہے جو اسلامی مملکت اپنے باشندوں کے لیے فراہم کرتی ہے۔ معذوری یا بڑھاپے میں اسے اجتماعی کفالت کا سہارا بھی ملتا ہے ' ایسی صورت میں عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ بھی ان تمام کاموں میں اپنے مال کے ذریعہ شریک ہو۔ زکوٰۃ کی نوعیت چونکہ مالی ٹیکس سے پہلے ایک اسلامی عبادت کی ہے ' لہٰذا اسلام نے ' جو اسلام نہ قبول کرنے والوں کے احساسات کا بڑا لحاظ کرتا ہے ' یہ پسند نہیں کیا کہ ان کو ایک اسلامی عبادت کو اپنانے پر مجبور کرے چنانچہ اس نے ان سے بجائے زکوۃ کے جزیہ کی شکل میں ٹیکس وصول کیا"۔

عدل کے معاملے میں مسلم و غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہ کیا جاتا تھا ' سب کے لیے ایک ہی معیار تھا۔ غیر مسلموں کے لیے دوسری ترازو اور دوسرے باٹ نہ تھے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جب قاضی کے سامنے خلیفہ راشد حضرت علی اور ایک عیسائی فریقین کی حیثیت سے پیش ہوئے تو قاضی نے صرف خلیفہ کی شہادت پر مقدمہ کا فیصلہ نہیں کر دیا بلکہ دعوے کے ثبوت میں ان سے گواہ طلب کیا '

اور جب انہوں نے گواہ پیش نہ کیا تو فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ اگر قاضی مسلم و غیر مسلم کے درمیان فرق کرتے تو وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کے مرتکب ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو....." (سورہ نساء آیت 58)

"اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے، بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے...." (سورہ نحل۔ آیت 90)

ذمیوں سے فیاضانہ سلوک کے بارے میں ول ڈیوراں "مذہب کا عہد" (Age of Faith) میں لکھتا ہے:

"مسلمانوں کے عمال میں سینکڑوں عیسائیوں کو ایسے بڑے بڑے عہدے دیئے جاتے تھے کہ مسلمان اپنی محرومی کا شکوہ کرنے لگے تھے۔ دمشق کے سینٹ جان کے والد سرجئیس (Sergius) خلیفہ عبدالمالک کے وزیر مالیات (Chief Finance Minister) تھے اور سینٹ جان خود اس مجلس انتظامیہ کے صدر تھے جس کے سپرد دارالحکومت دمشق کے انتظامات تھے...... اسلام کے ابتدائی دور کی اس بے تعصبی و رواداری کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد نے، قریب قریب تمام زردشتیوں اور غیر اہل کتاب (Pagans) نے اور بہت سے یہودیوں نے ایشیا، مصر اور شمالی افریقہ میں اسلام قبول کر لیا...... رفتہ رفتہ غیر مسلموں نے عربی زبان اور عربوں کی پوشاک، قوانین اور مذہب کو اپنا لیا۔ یونانیوں کے ہزار سالہ دور حکومت میں ان ممالک میں یونانی تہذیب کی جڑیں نہ پھیل سکی تھیں اور وہاں کے لوگ اپنے دیوتاؤں کو بدستور پوجتے رہتے تھے۔ اسی طرح بازنطینی عیسائیت کا کٹر پن باغی فرقوں کو جنم دینے کے علاوہ کچھ حاصل نہ کر سکا تھا۔ مگر اسلام، بغیر کسی قابل ذکر تبلیغ کے ان ممالک کے لوگوں کو مسلمان بنانے اور ان کی محکم وفاداری حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور ان ملکوں کے پرانے دیوتا لوگوں کے دلوں سے محو ہو گئے۔ چین، انڈونیشیا، ہندوستان، ایران، شام، عرب، مصر، مراکش اور اسپین کی سینکڑوں قوموں کے دلوں میں اسلام جاگزیں ہو گیا اور اس نے ان کے اخلاق پر اثر انداز ہو کر ان کی زندگیوں کو

اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ ان کی زندگیاں جانفزا امیدوں اور استحکام بخش فخر سے معمور ہو گئیں۔ آج پینتیس کروڑ نفوس اس کی دل و جان سے اطاعت کرتے ہیں۔ سیاسی حیثیت سے بٹے ہونے کے باوجود ان کی وحدت غیر منقسم ہے۔" (اب مسلمانوں کی آبادی تقریباً ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ حبیب احمد)

اسی قسم کے خیالات کا اظہار سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) نے اپنی گرانقدر تصنیف "دعوت اسلام" (The Preachings of Islam) میں کیا ہے۔ اس نے ان غیر مسلموں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ مثلاً سلطان عضد الدولہ کا وزیراعظم ایک عیسائی تھا۔ عباسی خلیفہ معتضد اور خلیفہ المقتدر نے غیر مسلموں پر یہاں تک اعتماد کیا کہ فوجی امور کے انتظامات دو عیسائیوں کے سپرد کر دیئے۔ سر ٹامس نے ان تمام ممالک کے حالات کا جائزہ لیا ہے جہاں جہاں اسلام پھیلا۔ اپنے تفصیلی جائزے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہر ملک میں لوگوں نے بغیر جبر و تشدد کے اسلام کو برضا و رغبت قبول کیا اور یہی قرآن کی تعلیم ہے:

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے....."

حکومت و عدالت سے متعلق چند اسلامی اصول

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تفسیر "تفہیم القرآن" کی چھ کی چھ جلدوں میں آخر میں فہرست موضوعات دی گئی ہے۔ ان میں "قانون اسلامی" کے تحت جو اشارات درج ہیں ان میں سے کچھ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی عدل کن اصولوں پر مبنی ہے:

عدالتی فیصلوں کا دارومدار ظاہری شہادتوں پر ہو گا۔
حلال و حرام کے حدود مقرر کرنے کا خدا کے سوا کسی کو حق نہیں۔
قانون سازی کا مطلق اختیار اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔
ریاست کے تمام باشندے اس کی اخلاقی ذمہ داریوں میں شریک ہیں۔
کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔
جرم پر آمادہ کرنے والا بھی مجرم ہے۔

ایک غیر قانونی فعل کسی قانونی فعل کو غیر قانونی نہیں بنا دیتا۔
ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جائے گا' جب تک کہ اس کے جرم کا ثبوت نہ ہو۔
اسلامی ریاست میں مجرموں کو معاف کر دینے کا اختیار ریاست کو نہیں۔
قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔
رعیت کے درمیان امتیازی سلوک ناروا ہے۔
قاضی اپنی شہادت کی بنا پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔
مسلم معاشرے میں جو لوگ فواحش پھیلائیں وہ مجرم ہیں اور ان کو سزا دینی چاہیے۔
شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جائے گا۔
معاف کر دینے میں غلطی کرنا سزا دینے میں غلطی کرنے سے بہتر ہے۔
مقدمات میں جیوری یا اسیسروں سے مدد لینا۔
مجرموں کے درمیان ان کے معاشرتی مرتبے کے لحاظ سے امتیاز کرنا ممنوع ہے۔
مجرم کو دشمنی کے جذبے سے نہیں بلکہ خیر خواہی کے جذبہ سے سزا دینی چاہیے۔
نادانستہ فعل پر گرفت نہیں ' گرفت صرف اس بات پر ہے جو آدمی جان بوجھ کر بالارادہ کرے۔
کسی حکم (کے نفاذ) سے پہلے جو کام اس کے خلاف ہوا ہو' اس پر گرفت نہیں ہے۔
حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔
مسلمانوں کے عدلیہ اور مقننہ کو لازماً خدا اور رسول کے احکام کی پابندی کرنی ہو گی۔
شہادت وہی معتبر ہے جو علم پر مبنی ہو۔
حاکم عدالت اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔
کسی انسان پر دوسرے کے گناہ کا بار نہیں ڈالا جا سکتا۔
انسان کی قدر و قیمت بحیثیت انسان کے ہے، نسل و قوم کی حیثیت سے نہیں۔
کسی فعل کی ظاہری صورت پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ قرائن و شواہد کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔
قانون اسلام کے خلاف جو کام بھی ہو گا' خواہ کسی نے کیا ہو' حرام ہے۔
صفائی کا موقع دیئے بغیر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔
شبہ کی بنا پر کسی کو قید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔
اسلامی قوانین کے مقابلے میں دوسرے قوانین بنانا اور انہیں افضل سمجھنا کفر ہے۔
عدالت کے لیے شہادتوں سے حاصل شدہ معلومات پر فیصلہ کرنا درست ہے۔
حلفیہ بیان کے خلاف اگر کوئی صریح قرینہ نہ پایا جائے تو اسے درست تسلیم کیا جائے۔
دشمنوں کا سر کاٹ کر انہیں گشت کرانا ممنوع ہے۔

کوئی اجماع یا قیاس و اجتہاد کتاب و سنت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اصول یا تو قرآن مجید میں صراحتاً پائے جاتے ہیں یا اس سے اخذ کیے گئے ہیں۔ افسوس کہ ان میں سے بہت سے اصول مسلمانوں نے پس پشت ڈال کر ان کے بدلے اہل مغرب کے لادینی اصول اپنا لیے ہیں جو اسلامی معاشرے کی ابتری کا باعث بن گئے ہیں۔ اللہ انہیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غلام اور اسلامی معاشرہ

دنیا میں انسان نے انسان کو طرح طرح سے غلام بنا کر رکھا ہے اور سب سے زیادہ عام طریقہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا ہے۔ حکومت کے خلاف علم بغاوت اٹھانے والے بھی غلام بنائے جاتے تھے۔ بحری قزاق جہازوں کا مال لوٹ لیتے اور مسافروں کو دوسرے ممالک میں لے جا کر بحیثیت غلام فروخت کر دیتے تھے۔ اسی طرح لٹیرے اور راہزن قافلوں کو لوٹتے اور مسافروں کو پکڑ کے لے جاتے تھے' انہیں یا تو اپنے یہاں غلام بنا کر رکھتے یا بیچ دیتے تھے۔ یورپ میں کھیتوں پر جو مزدور کام کرتے وہ سرف (Serf) کہلاتے تھے۔ ان کی حالت بھی غلاموں ہی کی سی تھی۔ یورپ میں مقروض کو قرضہ ادا نہ کرنے کی شکل میں غلام بنا کر بیچ دینے کا قرض خواہ کو قانونی حق تھا۔ والدین کو بھی حق تھا کہ اپنے بچوں کو فروخت کر دیں۔ عموماً غلاموں پر بہت تشدد کیا جاتا تھا' یورپ میں تو آقا کو حق تھا کہ اپنے غلام کو چاہے تو قتل کر دے۔ یورپ اور امریکہ میں غلاموں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کا رواج قرون وسطیٰ کے بہت بعد تک جاری رہا۔ ہر چند اب غلامی کا رواج نہیں رہا لیکن سفید فام لوگ اب بھی سیاہ فام لوگوں سے غلاموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کا آج بھی یہ حال ہے کہ سیاہ فام لوگ گورے لوگوں کی بستیوں سے باہر رکھے جاتے ہیں۔

صقلیہ (سسلی) پر مسلمانوں نے 831ء سے 1091ء تک یعنی ڈھائی سو سال سے زیادہ حکومت کی۔ مشہور سیاح ابن جبیر جب 1184ء میں صقلیہ گیا تو اس نے دیکھا کہ مسلمان غلاموں اور لونڈیوں کے بیڑیاں ڈال کر محنت شاقہ لی جاتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے "سیرت النبی" حصہ اول میں ابن جبیر کا مندرجہ ذیل بیان درج کیا ہے:

> "منجملہ اور درد انگیز حالات کے جو ان شہروں میں نظر آتے ہیں' اسیران اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے محنت شاقہ لی جاتی ہے اور اسی طرح مسلمان عورتیں پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے محنت شاقہ سے کام

کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے"۔

اسلام نے جنگی قیدیوں کے علاوہ اور کسی کو غلام بنانا بالکل ممنوع قرار دے دیا اور جنگی قیدیوں کو بھی چھوڑنے کی طرح طرح سے تلقین کی ہے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے پر بے شمار دولت صرف کی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سورہ نور کی آیت 33 کی تفسیر میں لکھا ہے:

"اسلام نے فک رقبہ (غلامی سے گردن آزاد کرانے) کی ایک زبردست اخلاقی تحریک شروع کی اور تلقین و ترغیب، مذہبی احکام اور ملکی قوانین کے ذریعے سے لوگوں کو اس بات پر ابھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے طوعاً غلاموں کو آزاد کریں یا اپنے قصوروں کے کفارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انہیں رہا کریں یا مالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیں۔ اس تحریک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تریسٹھ غلام آزاد کیے۔ آپ کی بیویوں میں صرف ایک بیوی حضرت عائشہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد سڑسٹھ تھی۔ حضور کے چچا عباس نے اپنی زندگی میں ستر غلاموں کو آزاد کیا۔ حکیم بن حزام نے سو، عبداللہ بن عمر نے ایک ہزار ذوالکلاع حمیری نے آٹھ ہزار اور عبدالرحمن بن عوف نے تیس ہزار کو رہائی بخشی۔ ایسے ہی واقعات دوسرے صحابہ کی زندگی میں بھی ملتے ہیں جن میں حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان کے نام بہت ممتاز ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ کثرت سے خود اپنے غلام بھی آزاد کرتے اور دوسروں سے خرید خرید کر بھی آزاد کرتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں تک پہلے غلاموں کا تعلق ہے وہ خلفائے راشدین کا دور ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب کے سب رہا ہو چکے تھے۔ اب رہ گیا آئندہ کا مسئلہ اس کے لیے اسلام نے غلامی کی اس شکل کو قطعی حرام اور قانوناً مسدود کر دیا کہ کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنایا، بیچا اور خریدا جائے۔ البتہ جنگی قیدیوں کو صرف اس صورت میں غلام بنا کر رکھنے کی اجازت (حکم نہیں اجازت) دی جبکہ ان کی حکومت ہمارے جنگی قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرنے پر راضی نہ ہو اور وہ خود بھی اپنا فدیہ ادا نہ کریں"۔

خود فدیہ ادا کرنے کی آسانی اس طرح فراہم کی گئی کہ جب کوئی غلام کما کر فدیہ ادا کرنے

کا خیال ظاہر کرے تو آقا کے لیے قرآن مجید کے مندرجہ ذیل حکم کے بموجب لازم کر دیا گیا کہ وہ غلام کو اقرار نامہ لکھ دے اور جو شرائط طے ہوئی ہوں ان کی پابندی کرتے ہوئے بالآخر غلام کو آزاد کر دے:

"اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبۃ کی درخواست کریں ان سے مکاتبۃ کرلو ..... اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے..... "سورہ نساء آیت 33۔

اللہ تعالیٰ نے غلامی سے لوگوں کی گردن چھڑانے کو ایک عبادت قرار دیا ہے۔ سورہ بلد آیت 10 سے 15 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اور دونوں نمایاں راستے (خیر و شر کے) اسے دکھا دیے * مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی * اور تم کیا جانو کیا ہے دشوار گزار گھاٹی * کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا * فاقے کے دن کھانا کھلانا * کسی قریبی یتیم کو * یا خاک نشین مسکین کو *"

غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے زکوٰۃ میں سے خرچ کرنا بھی جائز ٹھہرایا:

"یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں ..... نیز یہ گردنوں کو چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں....." (سورہ توبہ۔ آیت 60)

نبی کریم نے غلاموں سے شفقت و مہربانی سے پیش آنے اور برادرانہ سلوک کرنے کی بار بار ہدایت فرمائی:

ابوہریرہ کہتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا غلام گرمی اور دھوئیں کی تکلیف برداشت کر کے کھانا تیار کر کے لائے تو چاہیے کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائے ..... مسلم۔ کتاب الایمان۔

ابو مسعود بدری کہتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے

کسی کو یہ کہتے سنا کہ ابومسعود سمجھ لو...... میں نے دیکھا تو وہ حضور تھے...... حضور نے فرمایا ابومسعود جان لو کہ جتنا قابو تم اس غلام پر رکھتے ہو اس سے زیادہ قابو خدا کو تم پر حاصل ہے...... میں نے حضور سے عرض کیا یارسول اللہ یہ غلام خدا کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے آزاد ہے۔ حضور نے یہ سن کر فرمایا اگر تم ایسا نہ کرتے تو آگ (دوزخ) کی لپٹ تم کو لگ ہی گئی تھی۔ مسلم کتاب الایمان۔

زید بن حارثہ کو بچپن ہی میں لٹیروں نے پکڑ کے غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا تھا۔ نبی کریم کی بعثت سے پہلے حضرت خدیجہ کے یہاں وہ کام کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ سے نبی کریم کی شادی ہوگئی تو زید آپ کی خدمت میں رہنے لگے۔ کچھ عرصے بعد ان کے والد اور چچا کو معلوم ہوا کہ زید فلاں جگہ ہیں وہ انہیں لینے آئے۔ حضور نے بغیر کسی فدیہ کے انہیں جانے کی اجازت دیدی۔ مگر انہوں نے اپنے والدین پر حضور کو ترجیح دی اور واپس نہ گئے۔

نبی کریم اور صحابہ کرام کے یہاں غلام بالکل گھر کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ جب مدینہ میں اسلامی ریاست بن گئی تو نبی کریم نے ایک بار زید بن حارثہ کی سرکردگی میں اور دوسری بار ان کے بیٹے اسامہ کی قیادت میں لشکر بھیجے اور ان کی ماتحتی میں بڑے بڑے صحابہ کو ان کے ساتھ بھیجا۔ اسلامی معاشرے میں غلاموں کا یہ مقام تھا۔

حضرت عمر پر جانکاہ حملہ ہوا تو آپ نے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ اس وقت فرمایا کہ اگر ابو حذیفہ کے مولیٰ سالم زندہ ہوتے تو میں انہیں اپنا جانشین بناتا۔ خلافت کا منصب سب سے بڑا منصب تھا' اس کے لیے ایک غلام پر حضرت عمر ایسے دور اندیش سیاستدان کی نظر انتخاب پڑنا ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں انسان کے ذاتی جوہر کی اہمیت ہے نہ کہ خاندان کی۔

علامہ محمد الخضری نے "تاریخ تشریع الاسلامی" میں ان بڑے بڑے محدثوں' قاریوں اور فقیہوں کے حالات بیان کیے ہیں' جن کا مسلمان علما میں نہایت بلند مقام ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوتی ہے کہ ان میں بہت سے موالی ہیں۔ یہ دکھانے کے لیے کہ اسلامی معاشرے میں غلاموں کو کتنے احترام سے دیکھا گیا ان کے نام اور مختصر حالات نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

1- حضرت سلیمان بن یار مولیٰ ام المومنین میمونہ کے بارے میں حسن بن محمد بن الحنفیہ کا قول ہے کہ وہ ہمارے نزدیک سعید بن المسیب سے (جو حضرت ابوہریرہ کے داماد اور ان کے راوی تھے) زیادہ سمجھدار ہیں۔ امام مالک نے فرمایا کہ وہ لوگوں کے عالم تھے۔ انہوں نے 107ھ میں وفات پائی۔

2- حضرت نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر کو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے مصر میں اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیں۔ 117ھ میں وفات پائی۔

3- حضرت مجاہد بن جبیر مولیٰ ابن مخزوم کے بارے میں قتادہ کا قول ہے کہ جو علما رہ گئے ہیں ان میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد ہیں۔ مجاہد کا بیان ہے کہ بعض اوقات ابن عمر نے میری رکاب تھامی۔ انہوں نے 103ھ میں وفات پائی۔ امام مالک نے ان سے بھی تحصیل علم کی۔ امام شعبی نے فرمایا کہ اب عکرمہ سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم کوئی نہیں رہا۔ انہوں نے 107ھ میں وفات پائی۔

4- حضرت عطاء بن ابی رباح مولیٰ قریش کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ میں نے عطا سے زیادہ کسی کو افضل نہیں دیکھا۔ امام اوزاعی نے فرمایا کہ مرنے کے دن عطا لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ تھے۔ حضرت ابن عباس کہتے تھے کہ اہل مکہ تم لوگ میرے پاس دین کا علم حاصل کرنے کی غرض سے کیوں جمع ہوتے ہو جبکہ تمہارے یہاں عطاء ہیں۔ انہوں نے 114ھ میں وفات پائی۔

5- حضرت ابوالزبیر محمد بن مسلم بن قدوس مولیٰ حکیم بن حزام کے بارے میں یعلیٰ بن عطا کا قول ہے کہ وہ لوگوں میں بہ اعتبار عقل سب سے زیادہ کامل تھے۔ عطاء نے فرمایا کہ وہ حدیث کے ہم سب سے زیادہ حافظ تھے۔ انہوں نے 128ھ میں وفات پائی۔

6- حضرت سعید بن جبیر مولیٰ رابعہ کوفہ کے فقیہہ تھے۔ جب اہل کوفہ حج کو جاتے اور ابن عباس سے مسئلہ پوچھتے تو وہ کہتے کہ کیا تم میں سعید بن جبیر نہیں جو مجھ سے مسئلہ پوچھتے ہو۔ میمون بن مہران نے کہا کہ سعید بن جبیر کا انتقال ہوا تو روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو۔ ان کو ابن اشعث کی قیادت میں حجاج نے 95ھ میں قتل کرادیا۔

7- حضرت حسن بن ابی الحسن یسار بصری مولیٰ زید بن ثابت کے بارے میں ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ عالم' بلند رتبہ' مستند' محفوظ' عبادت گزار بڑے علم والے' وجیہہ خوبصورت تھے۔ 110ھ میں وفات پائی۔

8- محمد بن سیرین مولیٰ حضرت انس بن مالک کے بارے میں مورق العجلی کا قول ہے کہ پرہیز گاری میں ابن سیرین سے زیادہ فقیہہ' اور فقہا میں ان سے زیادہ پرہیزگار نہیں دیکھا۔ انہوں نے

110ھ میں وفات پائی۔

9- مکحول بن ابی مسلم قبیلہ ہذیل کی ایک عورت کے مولیٰ تھے ۔ نسبتاً کابل سے تعلق رکھتے تھے ۔ امام زہری نے فرمایا کہ عالم تین ہیں ان میں سے ایک مکحول ہیں ۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ میں شام میں کسی عالم کو نہیں جانتا جو مکحول سے زیادہ فقیہہ ہو ۔ انہوں نے 113ھ میں وفات پائی۔

10- یزید بن ابی حبیب مولیٰ الاز و نسباً بربری الاصل تھے ۔ ابو سعید بن یونس کہتے ہیں کہ وہ اہل مصر کے مفتی تھے ۔ لیث بن سعد کہتے ہیں یزید ہمارے عالم اور ہمارے سردار تھے ۔ یزید بیمار ہوئے تو امیر مصر حو شرہ بن سہل نے ان کی عیادت کی اور پوچھا کہ جس کپڑے میں مچھروں کا خون لگا ہو اس کو پہن کر نماز پڑھنے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ۔ یزید نے منہ پھیر لیا ' پھر کہا کہ تم روز ایک جماعت کو قتل کرتے ہو اور مجھ سے مچھروں کے خون کے متعلق سوال کرتے ہو ۔ انہوں نے 128ھ میں وفات پائی۔

11- طاؤس بن کیسان الجندی جنگ کے گرفتار شدہ لوگوں میں سے ایک کے لڑکے تھے ۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں میں نے کسی کو طاؤس کے مثل نہیں دیکھا ۔ ذہبی کہتے ہیں کہ طاؤس اہل یمن کے شیخ اور ان کے لیے برکت تھے ۔ 106ھ میں مکہ میں وفات پائی۔

12- یحییٰ بن ابی کثیر مولیٰ طے کے بارے میں شعبہ کہتے ہیں کہ وہ زہری سے اچھے ہیں ۔ احمد کہتے ہیں کہ جب زہری ان کی مخالفت کریں تو یحییٰ کا قول تسلیم کیا جائے گا ۔ انہوں نے 129ھ میں وفات پائی۔

13- نافع بن ابی نعیم مولیٰ جعونہ مشہور قاری تھے ۔ ان سے بہت لوگوں نے قرأت سیکھی ۔ وہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے انہوں نے 167ھ میں وفات پائی۔

14- عبداللہ بن کثیر مولیٰ عمرو بن علقمہ فارسی النسل تھے ۔ مکہ مکرمہ میں رہتے تھے قرات میں شہرت حاصل کی ۔ 120ھ میں وفات پائی۔

15- امام محمد بن حسن بن فرقد شیبانی آزاد شدہ غلام تھے ۔ وہ اہل الرائے کا مرجع بن گئے ۔ امام ابو حنیفہ کے مذہب کی تعلیم کا سلسلہ امام محمد ہی کی ذات سے قائم ہوا ۔ حنفیوں کے پاس صرف انہیں کی کتابیں محفوظ و موجود ہیں ۔ ان کی کتابوں کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک تو وہ جن کی ان سے

روایت کی گئی اور وہ اس قدر مشہور ہوئیں کہ قلوب پر ان کو اطمینان حاصل ہو گیا ۔ یہ کتابیں ظاہر الروایۃ کے نام سے مشہور ہیں اور دوسری وہ کتابیں ہیں جنہیں یہ درجہ حاصل نہیں ہوا ۔ ظاہر الروایۃ جن کتابوں پر مشتمل ہیں ان کے نام ہیں (1) جامعہ الصغیر (2) جامع الکبیر (3) مبسوط (4) سیر الصغیر اور (5) سیر الکبیر ۔ امام محمد کے امام شافعی سے کئی مسائل پر مناظرے ہوئے جنہیں امام شافعی نے " کتاب الام " میں تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ امام محمد 132ھ میں واسط میں پیدا ہوئے اور 189ھ میں رے میں انہوں نے وفات پائی۔

16- حسن بن زیاد لولوی کوفی انصار کے غلام تھے ' وہ بھی امام ابو حنیفہ کے ممتاز شاگرد تھے ۔ ان کی کتابوں کو وہ اعتبار حاصل نہ ہوا جو امام محمد کی کتابوں نے حاصل کیا ۔ انہوں نے 204ھ میں وفات پائی۔

17- ابو محمد عبداللہ بن وہب بن مسلم قرشی آزاد شدہ غلام اور امام مالک کے خاص شاگردوں میں تھے ۔ امام مالک ان کو فقیہہ و مفتی مصر لکھتے تھے ۔ اصبغ بن وہب کہتے ہیں کہ وہ تلامذہ امام مالک میں سنن آثار کے سب سے بڑے عالم تھے ۔ وہ 125ھ میں پیدا اور 197ھ میں فوت ہوئے۔

18- ابو عبداللہ عبدالرحمن بن القاسم العتقی آزاد شدہ غلام تھے ۔ وہ بہت دنوں تک امام مالک کی صحبت میں رہے ۔ امام مالک کہتے تھے کہ ابو محمد عبداللہ بن وہب عالم ہیں اور ابن القاسم فقیہہ ہیں ۔ یحییٰ بن یحییٰ کا قول ہے کہ ابن القاسم علم مالک کے سب سے بڑے عالم تھے 191ھ میں فوت ہوئے۔

19- یحییٰ بن یحییٰ کثیر اللیثی آزاد شدہ غلام اور اندلس کے رہنے والے تھے ۔ اندلس میں امام مالک کا مذہب ان کے اور عیسیٰ بن دینار کے ذریعہ پھیلا ۔ انہوں نے 234ھ میں وفات پائی۔

20- ابو مروان عبدالملک بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابی سلمۃ الماجشون بنو تمیم کے آزاد شدہ غلام اور اہل مدینہ میں امام مالک کے سب سے بڑے شاگرد تھے ۔ قاضی یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ عبدالملک ایک ایسا دریا ہے جس کو ڈول گدلا نہیں کرتے ۔ ابن حبیب نے ان کی بہت تعریف کی ہے ۔ انہوں نے 212ھ میں وفات پائی۔

21- ربیع بن سلیمان بن عبدالجبار المرادی آزاد شدہ غلام تھے ۔ وہ امام شافعی کی کتابوں کے نہایت ثقہ راوی ہیں اور امام شافعی کے تلامذہ مزنی وغیرہ کے مقابلہ میں ربیع کی روایت کو ترجیح دیتے

ہیں' وہ 174ھ میں پیدا اور 270ھ میں فوت ہوئے۔

علامہ الخضری کہتے ہیں کہ جو دور امیر معاویہ کی خلافت سے 41ھ میں شروع ہوا اور دوسری صدی کے آغاز تک چلا' اس میں تعلیم یافتہ غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا ہوگئی۔ جو لڑکے گرفتار ہو کر آئے انہیں مسلمانوں نے زیر تربیت رکھ کر قرآن و حدیث کی ایسی تعلیم دی کہ لوگ ان کے فتووں اور رایوں کو قبول اور ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ غلام تمام اسلامی شہروں میں موجود اور علم اور تعلیم میں صحابہ اور کبار تابعین کے شریک تھے۔

دوسری صدی ہجری کے بعد بھی غلاموں میں بڑے بڑے عالم ہوئے ہیں مثلاً:

یاقوت جو مسلمانوں کے بہت بڑے جغرافیہ دانوں میں سے ہے اور ادریسی اور ابوالفدا کا ہمسر سمجھا جاتا ہے' وہ نسلاً یونانی تھا اور 1179ء میں ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی میں غلامی کا طوق اس کی گردن میں پڑ گیا تھا۔ حماۃ کے ایک مسلمان تاجر نے خرید کر اسے تعلیم دی اور اس کا نام یاقوت رکھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اسے آزاد کر دیا۔ اسے علم کا ایسا چسکا لگا کہ اس کی تحصیل کے لیے بہت سے ملکوں کے سفر کیے۔ اس کی مشہور تصنیف "معجم البلدان" اس کے تبحر علمی کا بین ثبوت ہے اور کتنے ہی غلام اپنے آقاؤں کی تربیت میں پل کر علم کے بام عروج تک پہنچے۔ عبدالرحمن ابن جوزی کا داماد قزاغل خلیفہ المستنجد کے وزیر یحییٰ ابن محمد ابن ہبیرہ کا ترک غلام تھا۔ وزیر نے اسے تعلیم دلائی اور آزاد کر دیا۔ ابن جوزی کی لڑکی سے اس کا بیٹا یوسف پیدا ہوا جس کی تعلیم و تربیت ابن جوزی نے اپنے ذمے لی۔ یہ لڑکا مورخ کی حیثیت سے مشہور ہوا اور سبط جوزی کہلایا۔

غلاموں میں بہت سے بادشاہ بھی ہوئے ہیں۔ مصر میں ایوبی حکومت ختم ہوئی تو غلاموں نے مملوک حکومت کی بنیاد ڈالی اور ان کی حکومت کے دور میں علم کو کافی فروغ ہوا۔ ہندوستان میں بھی غلام بادشاہ ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں نے غلاموں کو آزاد انسانوں کی طرح زندہ رہنے اور معاشرے کے ہر شعبے میں حصہ لینے کا پورا موقع دیا اور ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کیا۔

جو مغرب زدہ مسلمان یہ تسلیم کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ اسلام غلام بنانے کی اجازت دیتا ہے وہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں غلام بنانا جائز نہیں۔

"پس جب ان کافروں سے تمھاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے'

یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد (تمھیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرلو' تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے" (سورہ محمد۔ آیت 4)

استدلال یہ ہے کہ قیدیوں کو چھوڑنا تو بہرحال لازم ہے' خواہ احسان کرکے چھوڑ دیا یا فدیہ لے کر۔ سورہ محمد نازل ہونے کے بعد جنگ بدر ہوئی۔ اس میں نبی کریم نے قیدیوں کو جن میں آپ کے چچا عباس' داماد ابوالعاص' حضرت ابو بکر کے بیٹے عبدالرحمٰن وغیرہ بھی تھے' اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ فدیہ ادا نہ ہوگیا۔ سورہ انفال کی آیات 67-68 اور 69 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح نہ کچل دے تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے ٥ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے کیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی ٥ پس جو کچھ مال تم نے حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔"

سورہ محمد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب تک تم دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ' دو اس وقت تک قیدیوں کو پکڑنے کی فکر نہ کرو۔ غزوہ بدر میں اس حکم پر عمل کیا جاتا تو شاید احد کی جنگ نہ لڑنی پڑتی۔ اس فروگزاشت پر اللہ نے تنبیہ کی ہے۔ نبی کریم سے بہتر قرآن مجید کا مفہوم کون سمجھ سکتا تھا جب انہوں نے قیدیوں کو بغیر فدیہ کے نہ چھوڑا تو ظاہر ہے کہ فدیہ ملنے تک قیدیوں کو روکے رکھنا ناجائز نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ استدلال مان لیا جائے کہ قیدیوں کو چھوڑنا تو بہرحال لازم ہے' چاہے فدیہ ملے یا نہ ملے تو پھر کیوں فدیہ ادا کرے گا' چنانچہ فقہائے اسلام نے صرف کسی مصلحت کی بناء پر کسی قیدی کو بغیر فدیہ کے چھوڑ دینا تو مناسب سمجھا ہے لیکن یہ اصول تسلیم نہیں کیا کہ چاہے فدیہ ملے یا نہ ملے سب قیدیوں کو رہا کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی قبیلہ کے سردار کو جو لڑائی میں گرفتار ہوا ہو' فدیہ لیے بغیر اس امید پر چھوڑ دیا جائے کہ یہ احسان اسے اور اس کے قبیلہ کو اسلام کی طرف مائل کرے گا تو ایسی صورت میں ضرور چھوڑ دینا چاہیے' کسے احسان رکھ کر چھوڑے اور کسے نہ چھوڑے' یہ بات مسلمانوں کے فرمانروا کے طے کرنے کی ہے۔ جو قیدی فدیہ نہ ملنے کے باعث نہ چھوڑے جائیں یا جن کا مسلمان جنگی قیدیوں سے تبادلہ نہ ہو سکے' وہ قانوناً غلام بنائے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ شریفانہ سلوک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے یہی کیا اور انہیں بھی اپنی طرح انسان سمجھا۔

معاشی نظام

جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو شکل و صورت ، قد وقامت ، عقل وفہم ، شجاعت و وجاہت ، ذہانت و ذکاوت ، تدبر وفراست کے اعتبار سے یکساں نہیں بنایا ، ویسے ہی رزق بھی سب کو برابر تقسیم نہیں کیا ، اس غیر مساوات کی وجہ اللہ تعالیٰ نے سورہ شوریٰ آیت 27 میں بتائی ہے:

"اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے ، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے ، نازل کرتا ہے ، یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے۔"

جن لوگوں کو اللہ نے زیادہ رزق اور زیادہ زندگی کا سامان دیا ہے انہیں اس کو خرچ کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہیں اڑائیں بلکہ ان پر بہت ساری پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ کچھ چیزوں پر خرچ کرنا ممنوع قرار دیا ہے اور کچھ پر خرچ کرنا واجب یا مستحب ہے۔ اسی طرح مال کمانے پر بھی شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ سود کی کمائی حرام ہے ، خرید و فروخت کے کچھ طریقے جائز اور کچھ ناجائز ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث میں ان تمام معاملات کے متعلق تفصیل سے ہدایات دی گئی ہیں۔

سود

سورہ بقرہ کی آیات 276,275 اور 278 میں سود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صریح احکام دیئے ہیں:

"جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو ، اور اس حالت کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے ، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام ، لہذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا ، سو کھا چکا۔ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے ، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا ○ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے

اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل کو پسند نہیں کرتا ○ اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو ، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے تم حقدار ہو ، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے ○"

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کی توضیح کرتے ہوئے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ "ابن عباس ، حسن بصری ابن سیرین اور ربیع بن انس کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دار الاسلام میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے فقہا کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے ، جب تک وہ سود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے اسے نہ چھوڑا جائے۔"

سید قطب لکھتے ہیں "سود اخوت اور تعاون کی روح کو فنا کر دیتا ہے ..... "حقائق کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں (بغیر سود کے بھی) تجارت اپنی فطری روش پر چلتی رہی۔ پھلی اور پھولی اور اسلامی ممالک کی دور دراز حدود تک پھیل گئی ...... سرمایہ داری کی ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے اور یہ محنت کے اوپر کھلا ہوا ظلم ہے۔

احتکار (Hoarding)

دولت کمانے کا موجودہ زمانہ میں ایک سود مند ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کو مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمتیں بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنی ضروریات زندگی بہرحال خریدنے پر مجبور ہیں۔ ان کی اس مجبوری سے سنگدل تاجر فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایک روپیہ کی چیز سوا اور ڈیڑھ روپے میں بیچتے ہیں۔ اس کے حق میں یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ جس کا مال ہے اسے اختیار ہے کہ اپنا مال جب چاہے اور جس طرح چاہے بیچے ، اسلام احتکار کو ناجائز ٹھہراتا ہے۔ خاص طور پر غلہ کی ذخیرہ اندوزی کو بہت برا سمجھتا ہے کیونکہ غلہ پر لوگوں کی زندگیوں کا انحصار ہے۔

معمر کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص غلہ بھر کر رکھے گا یا روکے گا ، گنہگار ہو گا۔ مسلم کتاب المساقاۃ المزارعہ۔ سید قطب "اسلام کا نظام عدل" میں لکھتے ہیں:

"احتکار صنعت و تجارت کی آزادی کا خون ہے ..... بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ احتکار کرنے والا دولت کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور زائد سامان کو تلف کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک خاص نرخ کو لوگوں پر مسلط کر سکے ..... ہم جانتے ہیں کہ کس طرح برازیلی قہوہ کے ہزار ہا ٹن صرف اس لیے نذر آتش کر دیئے جاتے ہیں کہ بازار میں قہوہ کی قیمت گرنے نہ پائے ..... دواؤں کے بازار کا بھی یہی حال ہے ۔ یہودی اور یہود صفت افراد ان کا احتکار کرتے رہتے ہیں 'اور لاکھوں انسان دواؤں بغیر تڑپتے رہتے اور گویا زبردستی دھکیل کر موت کے منہ میں لے جائے جاتے ہیں.......
کسب مال کے اس ذریعہ کا سد باب کرنے کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ احتکار کو دائرہ دین سے خارج کر دینے والا جرم قرار دیا۔(نبی کریم کی حدیث ہے) جس نے چالیس دن تک سامان غذا کو ذخیرہ کیے رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں نہ اللہ کو اس کی پروا۔"مسند احمد۔

خرید و فروخت کے طریقے

کاشت کار اور باغبان جو غلہ 'پھل اور ترکاریاں پیدا کرتے ہیں 'اپنے پورے نفع سے عموماً اس لیے محروم رہتے ہیں کہ وہ براہ راست دکاندار کے ہاتھ اپنی چیزیں نہیں بیچ پاتے بلکہ بازار میں آنے سے پہلے ہی دلال وغیرہ خرید لیتے ہیں اور ان پر اپنا نفع لگا کر دکاندار کے ہاتھ بیچتے ہیں۔نبی کریم نے اس کی مخالفت کی ہے۔

"ابن عمر کہتے ہیں حضور نے سامان لانے والوں سے باہر جا کر ملنے اور بازار میں سامان پہنچنے سے پہلے سودا کرنے کی مخالفت فرمائی ہے ۔"(مسلم ۔ کتاب البیوع)

موجودہ زمانہ میں ان چیزوں کی خرید و فروخت کا بڑا کاروبار پھیلا ہوا ہے جو نہ ابھی پیدا ہوئیں اور نہ بیچنے والے کے قبضے میں آئیں۔اسلام اسے ناجائز ٹھہراتا ہے:

"ابن عمر کہتے ہیں حضور نے پھلوں کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک ان کی پختگی ظاہر نہ ہو جائے اور یہ ممانعت خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں کے لیے ہے۔ایک اور روایت میں ہے کہ کھجور جب تک سرخ و

زرد نہ ہو جائے اور غلہ کی بالیں جب تک سفید نہ ہو جائیں اور آفت سے محفوظ نہ ہو جائیں 'اس وقت تک نہ ان کو فروخت کیا جائے نہ خریدا جائے ۔"(مسلم ' کتاب البیوع)۔

"ابن عباس کہتے ہیں ۔ حضور نے فرمایا ہے جس نے غلہ خرید کیا ہو ۔جب تک اس پر قبضہ نہ کر لے 'دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے ۔ ابن عباس کہتے ہیں میرے نزدیک ہر چیز کا حکم یہی ہے۔"(مسلم 'کتاب البیوع)۔

دھوکا دے کر کوئی چیز بیچنا اسلام میں ممنوع ہے ۔ اگر کسی نے بکری کے تھنوں میں ایک آدھ دن دودھ اس خیال سے روک لیا کہ خریدار سے زیادہ قیمت وصول کرے تو یہ بیع جائز نہ ہو گی بلکہ خریدار کو بکری واپس کرنے کا حق ہو گا۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں حضور نے فرمایا جس شخص نے ایسی بکری خریدی ہو جس کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا ہو تو خریدار کو تین دن کے اندر اسے واپس کر دینے کا اختیار ہے ۔ البتہ اس عرصہ میں جو دودھ اس نے استعمال کیا ہو اس کی قیمت دے دے ۔(مسلم کتاب البیوع)۔

چونکہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں اخوت و محبت کارفرما ہو اس لیے وہ ایسے کام ممنوع قرار دیتا ہے جو باہمی کدورت و منافرت کا باعث بنیں ۔ یہ بات مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہو گی:

"ابن عمر کہتے ہیں حضور نے فرمایا کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ اپنے بھائی (یعنی مسلمان) کی منگنی پر منگنی کرے (مگر اس وقت کر سکتا ہے) جب اس کو اجازت دے دی جائے (مسلم کتاب البیوع)۔

خرید و فروخت کی وہ تمام قسمیں ناجائز ہیں جن میں فریقین میں سے کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو ۔ بیچنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مال میں کوئی نقص ہو تو بیچتے وقت خریدار کو بتا دے ۔ جو دولت خرید و فروخت کے ممنوعہ طریقوں سے کمائی جائے گی وہ حرام کی کمائی ٹھہرے گی۔اسلامی نقطہ نظر سے آج کل کی تجارت کے بہت سارے طریقے جائز نہیں۔

دولت خرچ کرنے پر پابندیاں

جو کام یا چیزیں شریعت کی رو سے حرام ہیں ان پر دولت صرف کرنا بھی حرام ہے ۔ مثلاً شراب، جوا، گھڑدوڑ اور لاٹری وغیرہ۔ شراب اور جوئے کے بارے میں سورہ مائدہ کی آیات 91,90 اور 92 میں اللہ تعالیٰ نے احکام نازل فرمائے ہیں:

"اے ایمان والو ۔ یہ شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ۔ ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہوگی ○ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے روک دے ○ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے ○ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور باز آجاؤ ....."

انس کہتے ہیں کہ ایک شخص کو حضور کی خدمت میں لایا گیا، جس نے شراب پی تھی ۔ حضور نے درخت کی دو چھڑیاں منگوائیں اور چالیس کے قریب اس کے لگوائیں..... ایک اور روایت میں ہے کہ حضور نے شرابی کو پتلی لکڑی اور جوتی سے مارنے کی سزا دی (مسلم کتاب الحدود)۔

"جابر" کہتے ہیں میں نے فتح مکہ کے سال حضور کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدا اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سود اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام کر دیا ہے....."

شکاری کتوں اور کھیتی اور مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتوں کے علاوہ کتے پالنا ممنوع ہے ۔ اہل مغرب کی ریس میں مسلمان بھی گھروں میں کتے رکھتے اور ان پر کافی صرف کرتے ہیں جو جائز نہیں۔

جوئے کی تمام شکلیں، لاٹری، گھڑدوڑ، برج، پوکر، فلش، رمی، پانسے کے کھیل، شرط بدنا وغیرہ سب حرام ہیں ۔ جوا ہی کورو اور پانڈو میں مہابھارت کی جنگ کی بنا تھا ۔ کتنے گھڑدوڑ میں روپیہ لگا کر مفلس ہو جاتے ہیں ۔ کتنے لوگ خودکشی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

"قمار بازی روحانی اعتبار سے انتہائی پست کام ہے، کیونکہ یہ بغیر محنت کے

دولت کمانے کی ترکیب ہے ۔ مزید برآں اس سے قمار بازوں میں باہمی منافرت پیدا ہوتی ہے اور سماج میں اضطراب پیدا ہوتا ہے ..... کارخیر کی مجالس کہلانے والی فحش اور رنگین محفلوں کا ذکر فضول ہے ۔ یہ عیش پرستی اور اس کے پیدا کیے ہوئے داخلی تعفن، بھلے کاموں سے پرہیز، شہوت کی طرف میلان اور مال و دولت کو صرف حیوانی لذتوں اور ناپاک کاموں پر صرف کرنے کی عادت کا نتیجہ ہے ...... اسلام لوگوں کے باہمی تعلقات کو ان بنیادوں پر استوار کرنا نہیں چاہتا، نہ اسے یہ منظور ہے کہ نیکی شہوت رانی کی آلائشوں میں نشوونما پائے۔"

تصویروں، مورتیوں اور موسیقی پر روپیہ صرف کرنا جائز نہیں ۔ ان چیزوں کے حرام ہونے کے بارے میں نبی کریم کی متعدد حدیثیں ہیں:

عبداللہ بن عمر نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اسے زندہ کرو۔" (بخاری کتاب اللباس)۔

حضرت جابر کی بیان کی ہوئی حدیث پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں شراب کے علاوہ مورتیوں (بتوں) کی خرید و فروخت کو حرام بتایا ہے ۔ سورہ لقمان کی آیت 6 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب (لھوالحدیث) خرید کر لاتا ہے ۔ تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے، ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود نے لھوالحدیث کا مطلب گانا بتایا ہے۔

تصویروں، مورتیوں اور موسیقی کے بارے میں اور احادیث بھی ہیں، یہاں اختصار کی غرض سے مزید حدیثیں درج نہیں کی گئیں۔ رشوت دینے پر روپیہ خرچ کرنا بھی جائز نہیں۔ سورۃ بقرہ کی آیت 188 میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

"اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقہ سے کھانے کا موقع مل جائے۔"

اسراف اور عیش پرستی پر دولت صرف کرنا ممنوع ہیں۔ فضول خرچی کو شیطانی فعل کہا گیا ہے:

"فضول خرچی نہ کرو فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔" (سورہ بنی اسرائیل آیت 27)

جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا کی ہیں ان کو اگر انسان صرف اپنے اور اپنے گھر والوں تک محدود رکھے اور ان نیک کاموں پر صرف نہ کرے، جن کی تلقین کی گئی ہے تو آخرت میں اس سے باز پرس ہو گی اور سزا ملے گی:

"رہا وہ شخص جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا ○ تو وہ موت کو پکارے گا ○ اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا ○ وہ اپنے گھر میں مگن تھا ○ اس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔"

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ○ .... عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا ○ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے ○ پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی ○" (سورہ تکاثر۔ آیت 6,3,1 اور 8)

"کیا اس نے سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہیں پا سکے گا ○ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا ○ (سورہ بلد آیات 5 اور 6)۔

پچھلی آیت کی تفسیر میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے:

"یہ مال اڑا دینا تھا کس مد میں۔ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں۔ جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مترشح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں۔ قصیدہ گو شاعروں کو بھاری انعامات دینا، شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا، جوئے میں ڈھیروں دولت ہار دینا ..... تقریبات میں بے تحاشا کھانا پکوانا ...... کھلا لنگر جاری رکھنا کہ دور دور تک یہ شہرت ہو جائے کہ فلاں رئیس کا دستر خوان بڑا وسیع ہے۔"

بڑے بڑے قصر اور یادگار عمارتیں بنانا تعیش ہے جو خدا کو ناپسند ہے۔ قوم عاد بڑے بڑے قصر بناتی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یہ تمھارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو ○ اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے (سورہ شعراء آیات 128 اور 129)۔

شریعت سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دیتی ہے اور مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھی یا کوئی اور زیور اور ریشم کے کپڑے پہننا بھی ناجائز ہے۔ ام المومنین ام سلمہ کہتی ہیں کہ حضور نے کہا کہ جو کوئی چاندی اور سونے کے برتن میں کچھ پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بھرتا ہے (مسلم کتاب اللباس)۔

براء بن عازب کہتے ہیں کہ حضور نے سات باتوں سے منع کیا جن میں ریشم کا لباس پہننا اور سونے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت بھی ہے (مسلم کتاب اللباس)۔

اس طرح اللہ اور اس کے رسول نے رزق اور دولت کے نامناسب صرف کی تمام راہیں محدود کر دیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ مدیں بھی بتا دیں جن پر خرچ واجب یا مستحب ہے اور جن پر آخرت میں بہت بڑا اجر ملے گا وہ یہ ہیں۔

زکوٰۃ پر اللہ تعالیٰ نے قریب قریب اتنا ہی زور دیا ہے جتنا نماز پر۔ نماز، روزہ، حج کی طرح، زکوٰۃ دینا بھی فرض ہے۔ یہ آمدنی کے بجائے اثاثہ پر عائد ہوتی ہے مختلف مالوں کے لیے مختلف شرحیں ہیں۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر سخت عذاب ہو گا۔

ابوہریرہ کہتے ہیں حضور نے فرمایا کہ جو شخص سونے چاندی کا (نصاب شرعی سے زیادہ کا) مالک ہو وہ اس کا حق ادا نہ کرے، قیامت کے دن (اس سونے چاندی کی) تختیاں اس کے لیے بنائی جائیں گی پھر ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس کی پیشانی پہلو اور پشت کو ان سے داغا جائے گا اور جب وہ تختیاں سرد ہو جائیں گی تو ان کو پھر گرم کیا جائے گا۔ (مسلم۔ کتاب الزکوۃ)

اس سے ملتا جلتا اللہ کا ارشاد بھی قرآن مجید میں ملتا ہے۔

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ وصول کرنے کا انتظام کرے اور اسے فقراء مساکین، مسافروں پر اور غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کی مدد کرنے پر اور راہ خدا میں خرچ کرنے کا اہتمام کرے۔ حکومت انتظام نہ کرے تو ان مدوں پر زکوٰۃ دینے والے خود خرچ کریں۔

زکوٰۃ تو فرض ہے وہ تو بہرحال ادا کی جائے گی، اس کے علاوہ بھی صدقات دینے کی قرآن مجید میں جابجا تلقین کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ جو کچھ تم نیک کاموں پر خرچ کرو گے وہ گویا تم اللہ کو قرض دو گے اور اللہ اس کو کئی گنا بڑھا کر تمھیں آخرت میں ادا کرے گا۔ مسکینوں، یتیموں اور بیوہ عورتوں کی مدد کرنے کا بڑا اجر ہے۔ صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی اسلام بہت تائید کرتا ہے۔ ہر شخص کے رشتہ داروں میں امیر و غریب ہوتے ہیں۔ اگر امیر رشتہ دار غریب رشتہ داروں کی مدد کرتے رہیں تو معاشرہ میں غریبی پھیلنے نہ پائے۔ یتیموں و مسکینوں کو کھانا کھلانے اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا قرآن مجید میں بار بار ذکر آتا ہے:

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے ○ وہ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے ○ اور (دوسروں کو) مسکین کو کھلانے پلانے کی ترغیب نہیں دیتا ○"

"ہرگز نہیں۔ بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے ○ اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے "○" میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔"

مال کی محبت کو کم کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بہترین مال خرچ کرنے کی ہدایت فرمائی:

"تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی ان چیزوں میں سے (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو......" (آل عمران۔ آیت 92)
ضرورت سے زیادہ جو کچھ ہو، اسے سینت سینت کر نہ رکھو بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو:

"وہ پوچھتے ہیں ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں، کہو جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو، اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا و آخرت دونوں کی فکر کرو۔" (سورہ بقرہ۔ آیت 219)

اسماء بنت ابی بکر (یعنی حضور کی سالی) کہتی ہیں مجھ سے حضور نے فرمایا:
"خرچ کر اور شمار نہ کر (اگر تو شمار کرے گی) تو خدا بھی تجھ کو شمار کر کے دے گا۔" (مسلم کتاب الزکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں کرتا کہ مال و دولت صرف مالداروں ہی میں گردش کرے۔ چنانچہ سورہ حشر کی آیت 7 میں اس بات کو واضح کر دیا ہے:

"جو کچھ بھی ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے (یعنی فے کا مال) وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین کے لیے تاکہ وہ تمھارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔"

دولت کی گردش کسی ایک طبقے میں محدود ہو جانے سے معاشرے میں ابتری پھیل جاتی ہے۔ سید قطب لکھتے ہیں:

"جماعت کا مفاد مقتضی ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ گردش کرتی رہے تاکہ زندگی ہر طرح پھلے پھولے، پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو، محنت کاروں کے لیے وسائل کار فراہم ہوں اور انسانیت عامہ کو تعمیری سرگرمیوں کے پورے پورے مواقع میسر آئیں۔ مال کا روکے رکھنا اس پورے نظام کو معطل کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ اسلام کے نزدیک حرام ہے۔ اس سے مالدار فرد کے مخصوص مفادات اور سماج کے عام مصالح دونوں کا خون ہوتا ہے...... اس کے نزدیک یہ بات بہت بری ہے کہ مال امیروں ہی کے درمیان گردش کرتا رہے اور کثرت مال لوگوں کو عیش و عشرت میں مبتلا کر دے۔ اسلام

عیش پرستی کو فرد و جماعت دونوں کے لیے شر و فساد کا منبع قرار دیتا ہے۔"

اسلام اہل ثروت کو فراخدلی کی ہدایت کرتا ہے۔ انہیں قرضدار سے سود نہ لینے کے علاوہ یہ تلقین بھی کی ہے کہ:

"تمہارا قرضدار تنگدست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو (یعنی قرض بالکل معاف کر دو) تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو" (سورہ بقرہ آیت 280)

نبی کریم نے فرمایا جس بستی میں کوئی شخص صبح کو اس حال میں اٹھے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ پر اس بستی کی بقا و تحفظ کی کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی (مسند امام احمد بن حنبل)۔

سید قطب نے اجتماع عدل کے سلسلے میں جن خیالات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے کچھ درج کیے جاتے ہیں:

"خلافت سے قبل حضرت عثمان کے پاس شام سے ایک تجارتی قافلہ آتا ہے۔ یہ گیہوں، روغن زیتون اور منقے سے لادے ہوئے ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ قحط کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت سخت دن گزر رہے تھے، بہت سے تاجر آپ کے پاس آ کر کہتے ہیں ...... کہ دگنے دام لے لیجئے.... آپ فرماتے ہیں، اللہ نے مجھے ایک کے دس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ حضرت عثمان نے اللہ کو گواہ ٹھہرا کر اعلان کر دیا کہ اس قافلہ کا سارا مال اللہ کی راہ میں فقراء اور مساکین کے لیے صدقہ ہے۔"

"مغرب زدہ لوگ صرف اپنے مطلب سے غرض رکھتے ہیں، چاہے جماعت کا شیرازہ بکھر جائے۔ یہ اپنی ہوس کی تکمیل کو خود اپنے گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک پر مقدم رکھتے ہیں، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ باہمی کفالت جس کا مطالبہ اسلامی اسپرٹ کرتی ہے، صرف انفرادی اور اجتماعی وجدان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دی گئی، حکومت بھی اسے نافذ کرنے اور عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کرتی ہے۔ چنانچہ عمر بن خطاب نے بیت المال سے دودھ چھڑائے بچوں، بوڑھوں اور بیماروں

کے وظائف مقرر کیے۔ واضح رہے کہ یہ اخراجات زکوٰۃ کے معروف مصارف کے علاوہ ہیں ..... حضرت عمر نے ایک بوڑھے نابینا کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے ...... عمر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور اتنا کچھ دیا جو اس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا، پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا ..... زکوٰۃ فقراء اور مساکین کے لیے ہے اور یہ اہل کتاب مساکین میں سے ہے۔"

"حقیقت یہ ہے کہ فقر و حاجتمندی صرف مال کے ارتکاز کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں فقراء اغنیا کے ظلم وجور کا نشانہ ہوتے ہیں اور اغنیاء عموماً بڑے بڑے انعامات اور جاگیروں کی بخشش، لوٹ کھسوٹ، ظلم اور بے جا نفع اندوزی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔"

"درحقیقت اسلامی سماج میں ضرورت، اولین بنائے استحقاق ہے ..... اسلام کے لیے یہ بات بالکل ناقابل برداشت ہے کہ ایک طرف تو دولت کی بے انتہا فراوانی ہو اور دوسری طرف اس سے یکسر محرومی۔ وہ اس صورت حال کے لیے صاحب امر کو اس بات کی پوری آزادی دیتا ہے کہ موجودہ حالات کے مطابق مناسب اقدامات کرے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جو تاریخی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ نے بنی نضیر کی فے کو تمام تر فقرائے مہاجرین میں تقسیم کیا۔ تاکہ پہلی فرصت میں اسلامی سماج میں یک گونہ توازن پیدا کر سکیں ..... یہ نظیر بڑی معنی خیز، محکم اور اہم ہے۔ اس کی رو سے صاحب امر ہر وقت اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ خزانہ عامرہ میں سے اہل حاجت کی اتنی مدد کرے جس سے اسلامی جماعت میں توازن بحال ہو جائے۔"

"اصول زکوٰۃ جو ان تاریک ترین ادوار میں بھی معطل نہیں ہوا تھا جب ہم روح دین سے دور ہو گئے تھے ...... تاہم ہمارے زمانے میں مغربی تہذیب کو غلبہ نصیب ہوا اور اس کے نتیجہ میں اسلامی اصولوں میں سے یہ آخری زندہ اصول بھی پامال ہو گیا۔"

"جہاں تک اس کے عام اصولوں کا سوال ہے اسلام میں ہمیشہ یہ استعداد موجود

رہی ہے اور رہے گی کہ وہ عدل کی خاطر نئی تنظیمیں عمل میں لائے اور نئے قوانین بنائے ۔ آج وہ یہ کرسکتا ہے کہ املاک عامہ کی ایسی تقسیم عمل میں لائے کہ اجتماعی توازن بحال ہو سکے ...... مالداروں کی دولت یعنی سرمایہ پر بیت المال کے لیے اتنا ٹیکس عائد کرے جتنا بیرونی جنگوں میں امت کے دفاع کے لیے یا اس کی تیاری اور دوسرے ناگہانی امور کے لیے امت کو تیار رکھنے کے لیے ناگزیر ہو ...... اسلام اپنی لچک اور جامعیت کے سبب انسانیت کے ان تمام تجربوں کو اپنے اندر سمو لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے جو انسانی سماج کے لیے مفید اور موزوں ہوں۔"

"جس ٹریجڈی نے اسلام کی کمر توڑ دی ، وہ عہد حاضر میں رونما ہوئی ، جب یورپ ساری دنیا پر چھا گیا اور استعمار کا منحوس سایہ سارے عالم اسلامی پر پڑنے لگا ۔ اس نے اسلامی اسپرٹ کو فنا کر دینے کے لیے اپنی ساری قوتیں اکٹھا کرلیں ۔ جو دشمنی اس نے صلیبی جنگوں سے ورثہ میں پائی تھی اس سے تحریک اور جذبہ حاصل کیا ۔ مادی طاقت اور تمدنی ترقی کو ساتھ لیا اور دوسری طرف امت مسلمہ جس داخلی ضعف و انتشار کا شکار تھی ، اس نے استعمار کا کام آسان تر بنا دیا اور اس طویل عرصے میں یہ امت رفتہ رفتہ اپنے دین کی حقیقی تعلیمات و ہدایات سے دور ہوتی چلی گئی ..... گزشتہ جنگ عظیم میں لارڈ ایلنبی (Allenby) نے یہ کہہ کر یورپ کے ضمیر کی بالکل صحیح ترجمانی کی تھی کہ صلیبی جنگیں دراصل آج ختم ہوئی ہیں ۔ سوڈان کا گورنر بھی اس وقت اسی ضمیر کی ترجمانی کر رہا تھا جب اس نے سوڈان میں حکومت کے سارے وسائل اور ساری قوتوں کو مشنریوں کے تابع بنا دیا تھا اور مسلمان تاجروں کو اس علاقے سے گزرنے سے بھی روک دیا تھا۔"

اپنے مقالے کی تینتیسویں قسط میں (جو فاران کے دسمبر 73، کے شمارے میں شائع ہوئی ہے) میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہر چند قانون و عمرانیات اور تاریخ ، سائنس کے تحت نہیں آتے مگر چونکہ مسلمانوں نے ان علوم کو بہت کچھ ترقی دی ہے اسی لیے ان کو اس مقالہ میں شامل کر لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا ۔ اس وقت یہ خیال نہ تھا کہ صرف قانون و عمرانیات پر ہی اسی ، نوے صفحات ہو جائیں گے ۔ ممکن ہے تاریخ پر جو کچھ لکھا جائے وہ بھی کم و بیش اتنے ہی صفحوں پر مشتمل ہو ۔ یہ یقیناً نامناسب ہوگا کہ ایک سائنس سے متعلق مقالے میں ڈیڑھ پونے دو سو صفحے ایسے علوم کو دیئے جائیں جو سائنس سے علاقہ نہیں رکھتے ۔ اس لیے تاریخ پر اگر کچھ لکھنا ہوگا تو وہ علیحدہ عنوان کے تحت

لکھا جائے گا۔

چونکہ ہر ملک کے نظام حکومت کا اثر اس کی عمرانیات پر پڑنا ایک بدیہی امر ہے ، اس لیے جو کتابیں نظام حکومت سے تعلق رکھتی ہیں ان کا ذکر ضروری ہے ۔ اس موضوع پر قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے بہت سی مفید کتابیں لکھی ہیں جن میں سے زیادہ اہم کا ذکر کیا جائے گا اور ان کے مصنفین کے مختصر حالات بھی درج کیے جائیں گے۔

ابوالحسن علی ابن محمد ابن حبیب الماوردی کی ولادت 972، میں ہوئی ۔ وہ بصرہ اور بغداد میں رہا اور چھیاسی برس کی عمر میں 1058، میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس نے اصول سیاست پر " کتاب الاحکام السلطانیہ " لکھی ، جو اس موضوع پر اہم ترین کتابوں میں سے ہے ۔ یہ بیس ابواب پر منقسم ہے ، جن میں سے کچھ یہ ہیں: امام کا تقرر ، صوبہ داروں کا تقرر ، سپہ سالاروں کا تقرر ، قاضی کا تقرر ، امیر حج کا تقرر ، حاکم صدقات ، مواتات یعنی افتادہ اراضی کو آباد کرنے اور آب رسانی کے بیان میں قوانین جرائم احکام احتساب۔

تقرر امام کے باب میں سے چند سطروں کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے ، یہ ترجمہ سید محمد ابراہیم نے کیا ہے:

امام دو طریقے سے مقرر ہوتا ہے ایک یہ کہ اہل اختیار اسے منتخب کریں ، دوسرے یہ کہ سابقہ امام نے اسے اپنا ولی عہد بنایا ہو ..... جب ارباب حل و عقد امام کو مقرر کرنے لگیں تو وہ سب سے پہلے اپنے میں امانت کی اہلیت رکھنے والے اشخاص کے حالات پر غور کریں کہ ان میں امانت کی کون کون سی شرطیں موجود ہیں اور ان میں سے اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں جو سب سے زیادہ اہل ہو .... اس میں کسی قسم کی درنگ جائز نہ رکھیں ۔ جب جماعت میں ایسا شخص انہیں مل جائے تو وہ اس اہم منصب کو اس کے سامنے پیش کریں ۔ اگر اس نے اسے اپنے ذمہ لینے پر رضامندی ظاہر کی تو یہ لوگ (ارباب حل و عقد) فوراً اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں اور اس کے ساتھ ہی وہ امام بن جائے گا اور تمام لوگوں کے لیے ضروری ہو جائے گا کہ وہ بھی اس کی بیعت کریں ..... اگر اہل اختیار نے کسی ایک شخص کو جو ان کے نزدیک تمام قوم میں بہترین تھا ، امام بنا لیا اور اس کی بیعت کے بعد ایک اور شخص ایسا نکل آیا جو اس سے بھی بڑھ کر ہے تو ایسی حالت میں جس شخص

کے لیے انہوں نے بیعت کرلی ہے وہی نافذ رہے گی۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ امامت کو اس سے چھین کر دوسرے کے سپرد کیا جائے ..... شریعت کو پیش نظر رکھ کر اسی انداز میں ساری کتاب لکھی گئی ہے۔

الماوروی کی یہ تصنیف مدتوں اصول سیاست پر مستند و معیاری کتاب مانی گئی ہے۔ اسے 1853ء میں آر۔ اینگر (R. Enger) نے بون (Bonn) سے شائع کیا گیا۔ 1915ء میں فرانسیسی زبان میں پوری کتاب کا ترجمہ ای۔ فیگنن (E. Fagnan) کے حواشی کے ساتھ Alger سے شائع کیا گیا۔

الماروی نے اخلاقیات پر " کتاب آداب الدنیا والدین " تصنیف کی۔ یہ ترکی اور مصری مدارس میں ابھی تک مقبول ہے۔

ابو علی الحسن ابن اسحاق جو نظام الملک کے لقب سے مشہور ہے، 1018ء میں بمقام نوقان پیدا ہوا۔ نوقان طوس کے ایک حصہ کا نام ہے۔ وہ سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان کا وزیر بن گیا۔ الپ ارسلان کے بعد اس کے بیٹے ملک شاہ کا بھی وزیر رہا۔ 1092ء میں سلطان ملک شاہ کے لیے "سیاست نامہ" فارسی زبان میں لکھا۔ اس میں پچاس باب ہیں۔ یہ سیاست حکومت پر بہت مفید کتاب ہے۔ اسی سال حسن صباح کے ایک فدائی نے نظام الملک کو قتل کر دیا۔

مسلمانوں کی مختصر تاریخ میں سید امیر علی نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کے وزیر یحییٰ برمکی کے بعد نظام الملک ایشیا کے بادشاہوں کے وزراء میں سب سے زیادہ قابل وزیر تھا۔ اس کے سیاسی تدبر کی وجہ سے پوری سلطنت میں، جو چین کی سرحد سے بحر روم تک اور جارجیہ (Georgia) سے یمن تک پھیلی ہوئی تھی، مکمل امن و امان قائم رہا۔ ملک شاہ نے اسے پورے اختیارات دے دیے تھے بارہ دفعہ اس نے سلطنت کے سب علاقوں کا دورہ کیا، تجارتی شاہراہوں پر مسافروں کے قیام و آرام کی غرض سے قیام گاہیں بنوائیں، ادب اور فنون کو ترقی دی، بہت سے شہروں میں مدرسے شفاخانے، مسجدیں اور محل بنوائے اور سڑکوں اور نہروں کے جال بچھا دیے۔ عمر خیام کی سرکردگی میں علم ہیئت کے ماہرین کو کیلنڈر کی تصحیح کا کام سپرد ہوا۔ جو کیلنڈر ان ماہرین ہیئت نے بنایا (بقول جارج سارٹن) گریگورین (Gregorian) کیلنڈر سے بھی، جو اب دنیا بھر میں رائج ہے، زیادہ صحیح تھا۔ نظام الملک نے بالخصوص فارسی زبان کی ترقی و ترویج میں بہت کوشش کی۔

شاہ معین الدین احمد ندوی نے "تاریخ اسلام" حصہ چہارم میں لکھا ہے کہ نظام الملک الپ

ارسلان کا کاتب تھا۔ الپ ارسلان کا پیشرو سلطان طغرل لاولد مرا اور اپنے بھتیجے سلیمان بن داؤد کو اپنا جانشین مقرر کر گیا۔ الپ ارسلان بھی طغرل کا بھتیجا تھا۔ اس نے کچھ امرا کی مدد سے تخت پر قبضہ کر لیا۔ مخالفین کو جنگ میں شکست دی۔ جب الپ ارسلان سلطان بنا تو اس نے اپنے کاتب (یعنی نظام الملک) کو وزیر بنالیا اور وزیر عمید الملک کندری کو نظام الملک کے بہکانے سے قتل کروادیا۔

جب 465ھ میں ملک شاہ اپنے والد کی وفات پر سلطان ہوا تو اس نے نظام الملک کو اتابک اور عماد الدولہ کا لقب عطا کیا اور سلطنت کا مختار کل بنا دیا۔ نظام الملک نے نہایت وفاداری سے سلطنت کی بہبود اور سلطان کی نیک نامی کے لیے کام کیا۔ چنانچہ سلطنت میں امن و امان و خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ 485ھ میں نظام الملک نے حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر اپنے عزیزوں اور لواحقین کو متعین کر دیا تھا۔ جن سلجوقی امراء کی حق تلفی ہوئی تھی وہ دشمن ہو گئے اور سلطان تک شکائتیں پہنچنے گیں۔ راوندی کے بیان کے مطابق ملکہ ترکان خاتون نظام الملک کی مخالف ہو گئی۔ وہ اپنے صغیر سن محمود کو ولی عہد بنوانا چاہتی تھی اور نظام الملک ملکہ زبیدہ خاتون کے بیٹے برکیارق کے حق میں تھا۔ ترکان خاتون نے سلطان سے کہا کہ ایران اور توران کی حکومت پر نظام الملک کے بیٹے اور پوتے پوری طرح تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ اس پر ملک شاہ نے نظام الملک کو کہلا بھیجا کہ تم حکومت میں میرے شریک و سہیم بننا چاہتے ہو۔ اس ارادے سے باز آؤ، ورنہ تمھارے سر سے دستار وزارت اتر جائے گی۔ نظام الملک نے جواب دیا کہ آپ کا تاج میری دستار سے وابستہ ہے۔ اس جواب کی گستاخی کو ملک شاہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے نظام الملک کو معزول کر کے تاج الدین ابوالقاسم کو وزیر بنا دیا۔ اسی سال نظام الملک قتل کر دیا گیا۔

سیاست نامہ پیرس سے 1891ء میں شائع ہوا اور اس کا فرانسیسی ترجمہ دو سال بعد 1893ء میں شائع کیا گیا۔ 1897ء اس کا تتمہ نکلا جس میں نظام الملک کے حالات فارسی و عربی ماخذوں سے لے کر چھاپے گئے ہیں۔

ابوالفضل جعفر ابن علی الدمشقی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ البتہ بارہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں اس کا موجود ہونا معلوم ہے۔ اس نے تجارت اور حسبہ پر ایک نہایت اہم کتاب لکھی جس کا نام " کتاب الاشارہ الی محاسن التجارہ " ہے، اس میں تجارت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مال کی حقیقت کا اقتصادی حیثیت سے جائزہ لیا ہے اور سکہ کے رواج کی ابتدا اور ضرورت سے بحث کی ہے۔ جعلی سکوں کی شناخت کا طریقہ بتایا ہے۔ بازار میں بکنے والی مختلف چیزوں میں جواہرات، خوشبوؤں، کپڑوں وغیرہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ ذیلی تجارتوں اور صنعتوں پر معلومات بہم پہنچائی ہیں، اس کتاب کا قلمی نسخہ جس پر سال تصنیف 1175ء درج ہے، قاہرہ کے

کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے ۔ 1318ھ میں یہ قاہرہ سے شائع کیا گیا ۔ اس کا جرمن میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے ۔

عبدالرحمٰن ابن نصر ابن عبداللہ ابن محمود الشافعی کی ولادت اور وفات کی تاریخیں نہیں معلوم ۔ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد میں یعنی 1169ء اور 1193ء کے درمیان زندہ تھا ' وہ مصر کا باشندہ تھا ۔

مسلمانوں کے نظام حکومت میں محتسب کا منصب خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ محتسب بازاروں کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیے جاتے اور ہر طرح کی بدعنوانیاں اور خرید و فروخت میں بے ایمانیوں کی روک تھام کرنا ان کا فرض منصبی ہوتا ۔ اس موضوع پر سب سے مفصل کتاب تو ابن الاخوہ نے لکھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا ' مگر سیاسی نظام پر لکھنے والوں میں سے بیشتر نے حسبہ پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ۔ چنانچہ الماوردی نے "احکام السلطانیہ" میں اور امام غزالی نے "احیاء علوم الدین" میں حسبہ سے بحث کی ہے ۔ الماوردی نے لکھا ہے کہ احتساب کا دائرہ کار محکمہ قضا اور محکمہ مظالم کے درمیان ہے ۔ محتسب کا فرض ہے کہ وہ ایسے مقدمات پکڑے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعلق رکھتے ہوں ۔ قاضی کو صرف ان مقدموں کو سننے کا حق ہے جو اس کے سامنے پیش کیے جائیں ' البتہ قاضی محتسب کو احکام بھیج سکتا ہے ۔ والی مظالم کا رتبہ محتسب اور قاضی دونوں سے اونچا ہے اور وہ دونوں کو احکام جاری کر سکتا ہے ۔ محتسب بازاروں کی دیکھ بھال کے علاوہ اور ایسی باتوں میں بھی مداخلت کر سکتا ہے جو شرع کے خلاف کی جا رہی ہوں ۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کو پوری خوراک نہ دے یا جانوروں کی طاقت سے زیادہ کام لے تو محتسب کو مداخلت کرنا چاہیے ۔

ابن نصر نے محتسبوں کے فرائض پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "نہایۃ المرتبہ فی طلب الحسبہ" ہے ۔ اس میں چالیس باب ہیں ۔ اس میں ان امور کی تفصیل دی ہے جن کو محتسب کے سپرد کیا جاتا ہے اور ان کے متعلق محتسب کے فرائض وضاحت سے بیان کیے ہیں ۔ والٹر بہرنور (Walter Behrnauer) نے اس کتاب کا تجزیہ جنرل ایشیٹک (Journal Asiatique) میں 1860-61ء میں شائع کیا ہے ۔

عبدالرحیم یا (عبدالرحمٰن) ابن عمر الجوبری الدمشقی کی ولادت دمشق کے پاس بمقام جوبر ہوئی تھی ۔ اس کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ۔ 1212ء سے 1231ء تک وہ آمد کے سلطان رکن الدین مودود کے دربار سے وابستہ رہا اس نے ہندوستان کا سفر کیا ۔ اس نے اپنی تصنیف "کتاب المختار فی کشف الاسرار ابتک الاستا" میں ان فریبوں اور جعل سازیوں کا تفصیلی ذکر کیا

ہے جو صراف (Moneychangers) عطائی اور کیمیا ساز کرتے تھے ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس زمانہ کی معیشت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور بود و باش کا بھی ۔ اس زمانے کی مصنوعات پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے ۔

ابو عبداللہ محمد ابن ابراہیم ابن جماعہ اکتوبر 1241ء میں حماہ میں پیدا ہوا ۔ دمشق میں تعلیم پائی اور شافعی فقہ کا مدرس مقرر ہوا ' 1288ء میں یروشلم کا قاضی بنایا گیا اور تین سال بعد مصر کا اور پھر دمشق کا قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا ۔ وہ مسجد امیہ میں وعظ دینے کے فرائض بھی انجام دیتا تھا ۔ جب ابن دقیق العید کا 1302ء میں انتقال ہو گیا تو مملوک سلطان نے اسے قاہرہ بلایا ۔ پچیس سال تک وہاں قاضی اور مدرس کی حیثیت سے کام کیا ' 1333ء میں اس کا انتقال ہوا ۔

ابن جماعہ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں "تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام" سب سے اہم ہے ۔ اس میں بادشاہوں کے حقوق و فرائض سے بحث کی ہے ۔ گویہ کتاب الماوردی کی "کتاب الاحکام السلطانیہ" کی طرح مشہور نہیں ہوئی مگر اس کے مقابلہ میں الماوردی کی تصنیف زیادہ نظریاتی ہے اور یہ حکومت کے حقائق اور مراحل کو جو دراصل پیش آتے ہیں ' پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے ۔ یہ سترہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں جہاد کی اہمیت اور اس کی تیاری پر سب سے زیادہ زور دیا ہے ۔ جارج سارٹن کی رائے میں یہ تصنیف اپنے موضوع پر اس دور کی بہترین تصنیف ہے ۔ اس میں نہایت وضاحت سے بادشاہوں کے حقوق و فرائض بیان کیے گئے ہیں اور عملی دشواریوں سے صرف نظر نہیں کیا گیا ۔ "تحریر الاحکام" کا جرمن میں ترجمہ ہوا اور حواشی کے ساتھ لائپزگ (Leipzig) سے 35-1934ء میں اور پھر 1938ء میں شائع ہوئی ۔

ابن جماعہ کے بیٹے عبدالعزیز ' پوتے ابراہیم اور پرپوتے محمد ابن ابی بکر کو بھی حکومت نے قاضی کا منصب عطا کیا ۔

ضیاء الدین محمد ابن محمد القریشی ' ابن الاخوہ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ' اس [illegible]ل 2 مئی 1329ء کو ہوا ۔

حکومت کے عمال میں محتسب کا منصب خاص اہمیت رکھتا تھا ۔ اس کے فرائض کا صحیح اندازہ ابن اخوہ کی تصنیف "معالم القربہ فی احکام الحسبہ" سے کیا جا سکتا ہے ' جس کو مختلف ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے ۔ ان ابواب کے عنوانات یہ ہیں :

(1) حسبہ کی شرطیں اور محتسب کے فرائض (2) قانون کا نفاذ (3) شراب اور آلات موسیقی (4) ذمیوں کے فرائض اور ان کا تحفظ (5) تدفین کی رسوم (6) ممنوعہ تجارتی سمجھوتے مثلاً سودی لین دین یا بازار میں آنے سے پہلے چیزوں کی خرید و فروخت (7) مردوں کے ممنوعہ ملبوسات و زیورات مثلاً ریشم اور سونے کا استعمال (8) اسواق یعنی وہ چیزیں جن کو بازار میں لانے کی ممانعت تھی (9 اور 10) اوزان، پیمانے اور سکے (11) آٹا پیسنے اور بیچنے والے (12) نانبائی (13) بھنا ہوا گوشت بیچنے والے (14) قصائی (15) بھیڑ کی سری بیچنے والے (16) مطبخ (17) ایسا گوشت بیچنے والے جو نمک وغیرہ کے ذریعہ محفوظ کر لیا گیا ہو (18) ہریسہ بیچنے والے یہ کھانا پسے ہوئے گوشت اور دالوں سے تیار کیا جاتا ہے (19) مچھلی تلنے والے (20) زلابیہ بنانے والے ۔ یہ ایک قسم کی مٹھائی ہوتی ہے (21) حلوہ بنانے والے (22) شربت بنانے والے (23) دوائیں ۔ گوند اور رال بنانے والے (24) چھوٹے موٹے کاروباری لوگ (25) دودھ بیچنے والے (26) بزاز (27) دلال (28) جلاہے (29) درزی، رفوگر، ٹوپیاں بنانے والے (30) ریشمی کپڑے سینے والے (31) رنگ ریز (32) سوت کاتنے والے (33) سن بٹنے والے (34) صراف (35) سنار (36) لوہار (37) موچی (38) نعل بند، بیطار (39) غلام، گھوڑوں، جانوروں کے دلال (40) حمام کے مہتمم (41) گل فروش (42) فصاد اور سینگی لگانے والے (43) طبیب، معالج امراض چشم، جراح، ہڈی بٹھانے والے (44) مدرس (45) خدام مسجد اور مؤذن، مؤذنوں کے لیے ضروری تھا کہ علم ہیئت سے تھوڑی بہت واقفیت رکھیں (46) وعظ دینے اور تبلیغ کرنے والے (47) جوتشی اور خط نویس (48) عقوبات (49) قاضی اور گواہ (50) شہزادے اور صوبوں کے والی (51) محتسب (52) ملاح اور جہاز راں (53) مٹی کے برتن بیچنے والے (54) کمہار اور چینی کے برتن بنانے والے (55) سوئی بنانے والے (56) کپڑا بننے کی نلیاں بنانے والے (57) حنا بیچنے والے (58) کنگھیاں بنانے والے (59) تل اور زیتون کا تیل بنانے والے (60) چھلنیاں بنانے والے (61) چمڑے کو رنگنے اور چمڑے کی بوتلیں بنانے والے (62) نمدہ بنانے والے (63) سمور فرش (64) چٹائیاں بنانے والے (65) بھوسہ بیچنے والے (66) عمارتی لکڑی اور برادہ بیچنے والے (67) بڑھئی، آرا کش، راج، چونا جلانے والے (68) متفرق۔

ابواب کی یہ لمبی فہرست اس لیے دی گئی ہے کہ اس کے زمانے کے مختلف پیشوں سے پورا تعارف ہو جائے ۔ حنا کے بیچنے والوں پر ایک باب لکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہندی اس عہد میں کثرت سے لگائی جاتی تھی ۔ ہریسہ پر بھی ایک باب ہے اور ایک باب زلابیہ کے لیے وقف کیا ہے جو ان کے کثرت استعمال کی دلیل ہے ۔ بھیڑ کی سری پر ایک باب اور ایک کلیجی پر بھی اس بات کی شہادت ہے کہ یہ چیزیں بہت مرغوب تھیں ۔ مؤذن کے لیے ہیئت دانی بھی آج کل کے مؤذنوں کے لیے بڑی تعجب خیز بات ہوگی ۔ پچھلی تحریروں میں جہاں ہیئت دانوں کا ذکر کیا گیا ہے کئی موذنوں کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ ہیئت دانی میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ مردے کی تدفین

کی نگرانی بھی محتسب سے متعلق تھی ۔ آج کل تو قبرستان کے چوکیدار کی مٹھی گرم کیے بغیر مردے کے لیے دو گز زمین ملنا بھی سخت دشوار کام ہے۔

جارج سارٹن کی رائے میں ابن اخوہ کی یہ کتاب اس عہد کی سماجی اور اقتصادی زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک گرانقدر تصنیف ہے ۔ تمام اسلامی ممالک میں محتسب مقرر کیے جاتے تھے ۔ اسپین کی زبان میں ایک لفظ Almotacen ہے ۔ وہ دراصل المحتسب کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔ یہ نظام بہت سی اسلامی سلطنتوں میں بیسویں صدی کے آغاز تک رہا۔

یہ کتاب ریوبن لیوی (Reuben Levy) کے انگریزی خلاصہ، فرہنگ اور فہرست مضامین کے ساتھ 1938ء میں لندن سے شائع ہوئی، عربی متن دو سو چالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔

محمد بن محمد ابن نباتہ الفارقی جزیرہ یعنی دجلہ کے بالائی علاقہ میں 1287ء میں بمقام میا فارقین (Maiya Fariqin) پیدا ہوا ۔ وہ مشہور مبلغ ابن نباتہ کی اولاد میں سے تھا، اس نے مصر میں تعلیم پائی اور دمشق میں سکونت اختیار کی ۔ کچھ عرصہ وہ ابوالفداء کے دربار سے حماۃ میں وابستہ رہا ۔ پھر دمشق میں سرکاری کاتب کی حیثیت سے کام کرتا رہا ۔ مرنے سے چھ سال پہلے وہ مملوک سلطان ناصر حسن کے اہل کاروں میں شامل ہو گیا ۔ کچھ عرصہ وہ کنیسۃ القمامہ (Church of Resurrection) کا یروشلم میں مہتمم رہا اور عیسائی زائرین کا انتظام اس کے سپرد تھا، 1366ء میں اس نے وفات پائی۔

وہ شاعر بھی تھا، اس نے ایک کتاب بادشاہوں کے فرائض پر لکھی جس کا نام "سلوک دول الملوک" ہے ۔ یہ چھ حصوں پر مشتمل ہے جن میں بتایا ہے کہ بادشاہوں کے حقوق کیا ہیں اور ان کے خاندان والے، ان کے ملازم اور درباری، ان کی فوج اور عام رعایا کس سلوک کے مستحق ہیں ۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ سرکاری محکموں میں کام کرنے کی وجہ سے ابن نباتہ کو موقع ملا کہ وہ سرکاری طریقہ کار کا اچھی طرح جائزہ لے سکے ۔ اس تجربہ کی بنا پر اس نے جو کچھ لکھا وہ موقر اور قابل قدر ہے۔

شہاب الدین ابو العباس احمد ابن عبدالوہاب النویری، البکری، الکندی الشافعی 1279ء میں پیدا اور 1332ء میں قاہرہ میں فوت ہوا ۔ وہ مملوک سلطان الناصر محمد ابن قلاؤن کے دربار سے وابستہ تھا ۔ کچھ عرصہ وہ مصر کے دو صوبوں الدخالیہ اور المرتاحیہ کا عامل بھی رہا ۔ اس نے بیس سال میں صرف ایک کتاب لکھی جس کا نام "نہایت الارب فی فنون الادب" ہے ۔ یہ دراصل ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں ایسی جملہ معلومات فراہم کی گئی ہیں جو ایک بیدار مغز حکمران کے لیے ضروری ہیں، یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے ۔ دوسرے حصے کی ایک فصل سیاست سے متعلق ہے جس میں بادشاہوں، گورنروں، سپہ

سالاروں، قاضیوں، سیکریٹریوں، وزیروں وغیرہ کے فرائض بیان کیے گئے ہیں۔ النویری کا ذکر تاریخ طبیعی کے تحت کیا جاچکا ہے۔

اس کتاب کے کچھ حصوں کا جرمن میں ترجمہ ہوکر 1913ء، 1914ء، 1915ء اور 1918ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ غرناطہ (Granada) سے 19-1917ء میں گیسپر ریمیرو (Gaspar Remiro) نے دو جلدوں میں وہ حصہ شائع کیا ہے، جس کا تعلق اسپین اور مغرب کی تاریخ سے ہے۔ احمد ذکی پاشا نے منتشر قلمی نسخوں سے "نہایۃ الارب فی فنون الادب" کا ایک نسخہ مرتب کر کے قاہرہ کے دار الکتب المصریہ میں محفوظ کر دیا۔ دار الکتب نے 24-1923ء میں تین جلدیں شائع کیں۔ پھر گیارہ جلدیں اور شائع کیں لیکن ابھی دس جلدیں شائع ہونا باقی ہیں۔

ابو جعفر جلال الدین (یا صفی الدین) محمد بن علی ابن طباطبا ابن الطقطقا 1262ء میں پیدا ہوا۔ حضرت حسن بن حضرت علی کی اولاد میں سے تھا۔ اس کے والد علی اپنے سیاسی نظریوں اور سرگرمیوں کے باعث عراق میں قتل کر دیے گئے تھے۔ ابن الطقطقا نے بھی وہ سرگرمیاں حد نجف، اور کربلا میں جاری رکھیں، اس نے ایک خراسانی عورت سے شادی کی اور 1297ء میں مراغہ گیا، 2-1301ء میں وہ موصل گیا اور وہاں اس نے موصل کے تاتاری گورنر عیسیٰ کے لیے "کتاب الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ" لکھی۔ یہ سیاست اور تاریخ پر ایک نہایت موقر تصنیف ہے، اس کے دو حصے ہیں پہلا حصہ سیاست سے متعلق ہے اور دوسرے حصے میں حضرت علی کے عہد یعنی 656ء سے لے کر خلافت عباسیہ کے اختتام (1258ء) تک کی تاریخ قلمبند کی ہے۔ مصنف نے شیعہ ہونے کے باوجود تاریخی واقعات کا بے تعصبی سے جائزہ لیا ہے اور اپنے عقائد کو ہر جگہ دخل انداز ہونے نہیں دیا۔ ہر چند اس زمانے میں تاتاری سلطان غازان خان برسر اقتدار تھا اور جس گورنر کے نام کتاب منسوب کی وہ بھی تاتاری تھا، مگر مصنف نے بغداد کی تباہی کے حالات میں تاتاریوں کی وحشیانہ روش اور ظلم و ستم کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے۔ تاریخی واقعات کا انحصار اس نے المسعودی۔ محمد ابن یحییٰ الصولی (متوفی 946ء)، ہلال ابن المحسن الصابی (متوفی 1056ء) اور سب سے زیادہ ابن الاثیر پر رکھا ہے۔ بادشاہوں کے علاوہ ان کے وزیروں کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ مسعودی کی تاریخ اب نایاب ہے۔ ابن الطقطقا کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔

فخری کے اقتباسات 1806ء میں فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔ اس کے بعد 47-1846ء میں عربی و فرانسیسی میں مزید اقتباسات شائع کیے گئے۔ 1860ء میں گوتھا (Gotha) سے اور 1895ء میں پیرس سے عربی متن شائع کیا گیا۔ عربی متن قاہرہ سے 1900ء اور 1927ء میں اور لندن سے 1921ء میں بھی شائع ہوا۔ ایملی امر (Emie Amar) نے پوری کتاب کا فرانسیسی ترجمہ

حاشیہ اور فہرست مضامین کے ساتھ پیرس سے 1910ء میں شائع کیا۔[1]

فخری عربی زبان میں لکھی گئی تھی۔ 1323ء سے پہلے ہی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ ترجمہ لورستان کے اتابک کے لیے ہندوشاہ ابن سنجر الکیرانی نے کیا تھا۔ اس کتاب کی اہمیت اس کے بار بار چھپنے اور ترجمہ کیے جانے سے ظاہر ہے۔ جارج سارٹن کی رائے میں فخری کا پہلا حصہ جو سیاست اور حکومت کے اصولوں سے بحث کرتا ہے، نہایت اہم ہے۔ پوری کتاب سلیس اور شگفتہ انداز میں لکھی گئی ہے۔

شہاب الدین ابو العباس احمد ابن یحییٰ ابن فضل اللہ العمری القریشی الشافعی 11 جون 1301ء کو دمشق میں پیدا ہوا۔ وہ حضرت عمر کی اولاد میں سے تھا۔ اس نے دمشق، قاہرہ، اسکندریہ اور حجاز میں تعلیم پائی۔ قاہرہ کا قاضی مقرر ہوا۔ پھر اپنے والد کی جگہ مملوک سلطان کا وزیر (Chancellor) بنا۔ 28 فروری 1349ء کو طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

اس کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" ہے۔ یہ نہایت ضخیم کتاب ہے جس کی تیئیس یا ستائیس جلدیں ہیں۔ اس کی تینیسویں جلد میں بارہویں صدی کے وسط سے لے کر چودہویں صدی کے وسط (1146ء سے 1343ء) تک کی سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ مملوک سلطنت کے نظام حکومت کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانے کے طرز حکومت اور معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

ابو حمّو موسیٰ ابن یوسف ابن زیان العبد وادی، الجیریا کا 1352ء سے 1386ء تک فرمانروا رہا تھا۔ اس کا تعلق بنو عبد الواد سے تھا جو بربری قبیلہ زناتہ کی ایک شاخ تھا۔ اس کے جد امجد زیان کے نام پر الجیریا کے بادشاہوں کا یہ خاندان بنوزیان بھی کہلاتا ہے۔ اس خاندان کی حکومت 1235ء سے 1393ء تک رہی یعنی ابن زیان کی وفات کے تین سال بعد اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کا دار الحکومت تلمسان (Tlemcen) تھا۔

سلطان ابن زیان نے اپنے بیٹے کے لیے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "واسطۃ السلوک فی سیاست الملوک" ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں جو مندرجہ ذیل امور کے متعلق ہیں:

(1) صحیح اور عادلانہ برتاؤ اور عمال و فوج کے ساتھ حسن و سلوک۔

1- "الفخری" کا اردو ترجمہ بھی چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ (ماہر القادری)

(2) وہ چارستون جن پر شاہی اقتدار کا انحصار ہے یعنی ذہانت، حسن تدبیر، عدل اور فوجی قوت و دولت کا امتزاج۔

(3) چار اوصاف جو شاہانہ عظمت میں اضافہ کرتے ہیں یعنی دلیری، فیاضی، رواداری اور رحمدلی۔

(4) حکومت کے لیے علم الوجہ (Physiognomy) کی ضرورت۔

ابن زیان کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ اخلاقی بنیادوں پر کس طرح حکومت کرنا ممکن ہے، وہ خود چونتیس سال تک تخت نشین رہا۔ اس طویل مدت کے تجربہ ہی سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ بہترین حکومت وہ ہے جس کی بنیاد حسن اخلاق پر ہو، اور جس میں عدل، فیاضی، رواداری اور درگزر سے کام لیا جائے۔

محمود کاباد اور محمد بشیر التواتی نے واسطات السلوک کی تدوین کر کے 1862ء میں تونس سے شائع کی۔

ابراہیم ابن محمد ابن دقماق صارم الدین الحنفی المصری کی تاریخ ولادت نہیں معلوم۔ اس کا انتقال غالباً جون 1407ء میں ہوا۔ ترکی زبان میں طوقمق ہتھوڑے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دقماق اسی سے بنا ہے۔

ابن دقماق مصر میں رہتا تھا اور اغلب یہ ہے کہ 1382ء میں برجی مملوک سلطان برقوق نے سلاطین مصر کی تاریخ لکھنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اس نے "الجوہر الثمین فی سیر الخلفاء و السلاطین" تصنیف کی۔ اس نے قاہرہ اور اسکندریہ کے حالات میں "کتاب درا المضیۃ فی فضل مصر والاسکندریہ" لکھی۔

اس نے امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے حالات زندگی پر "نظم الجمان فی طبقات اصحاب امامنا النعمان" تین جلدوں میں لکھی۔ کہا جاتا ہے کہ شافعی عقائد کے خلاف ہونے کی وجہ سے اسے کچھ عرصہ قید خانہ میں رہنا پڑا۔

تنظیم فوج پر اس نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام "ترجمان الزمان فی تراجم الاعیان" ہے۔ خوابوں کی تعبیر پر جو کتاب اس نے لکھی وہ "فرائد الفوائد" ہے۔

نزہتہ الانام دراصل مصر کی تاریخ ہے جس میں 1377ء تک کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں اور الجوہر الثمین بھی مصر کے دو شہروں کے بارے میں ہے۔ ان کے علاوہ ابن دقماق نے اسلام کے دس بڑے شہروں پر "کتاب الانتصار لی و اسطات عقد الامصار" بھی لکھی تھی جو زیادہ تر تلف ہوگئی ہے۔ ان کتابوں سے مصر کی سماجی اور سیاسی کیفیات پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ ان کو محمود ابن احمد العینی (1360ء سے 1451ء) اور ابن حجر العسقلانی (1372ء سے 1449ء) نے اپنی کتابوں میں استعمال کیا ہے، لیکن ابن دقماق کے شاگرد المقریزی (1364ء سے 1442ء) نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ حالانکہ کئی امور میں ابن دقماق کے ماخذ المقریزی کے ماخذوں سے بہتر ہیں۔

کتاب الانتصار کی دس جلدوں میں سے صرف چوتھی اور پانچویں جلدیں دستیاب ہیں۔ ان کو کارل وولرس (Carl Vollers) نے تدوین کر کے دو جلدوں میں قاہرہ سے 1893ء میں شائع کیا۔

ابوالعباس شہاب الدین احمد ابن علی القلقشندی المصری کو ابن ابی غدہ بھی کہتے ہیں۔ وہ قلقشندہ میں 56-1355ء میں پیدا ہوا۔ وہ عربی النسل تھا اس نے اپنی زندگی مملوک حکومت کے دیوان الانشاء (Chancellory) میں گزاری، اس کا انتقال 15 جولائی 1418ء میں ہوا۔ اس کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

اس نے 1387ء سے 1412ء کی پچیس سال کی مدت میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جس کا نام "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء" ہے۔ یہ تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی دفتری امور پر معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ مقدمہ اور خاتمہ کے علاوہ یہ دس حصوں پر مشتمل ہے جو مندرجہ ذیل موضوعات سے متعلق ہیں:

حصہ اول:- وہ نظری و عملی معلومات جو دفتر کے سیکریٹریوں کے لیے ضروری ہیں۔

دوسرا حصہ:- اسلامی ممالک کا جغرافیہ اور تاریخ۔

تیسرا حصہ:- دستاویزوں کے عنوان، شکل، مقررہ الفاظ وغیرہ۔

چوتھا حصہ:- مکاتبت۔

پانچواں حصہ:- ولایت یعنی تقرری کے پروانے۔

چھٹا حصہ:- دوسری دستاویزیں مثلاً مذہبی تنبیہات، ٹیکسوں کی تقسیم و معافی معزولی کے احکام۔

ساتواں حصہ:- جاگیروں اور موروثی جائدادوں کے متعلق دستاویزیں۔ ان پر کس قسم

کے طغرے بنائے جائیں۔

آٹھواں حصہ: قسم اور حلف کے مقررہ الفاظ۔

نواں حصہ: امانت یعنی امان دینے کے متعلق۔

دسواں حصہ: خاص خاص موقعوں پر مکاتیب۔

خاتمہ میں کبوتروں کے ذریعے خط و کتابت کرنے کا تفصیلی بیان ہے۔

مندرجہ بالا دس حصوں میں سے صرف دوسرا حصہ جغرافیہ اور تاریخ سے متعلق ہے اور باقی نو کا تعلق حکومت اور اس کے دفاتر سے ہے۔ الدمشقی کی نخبتہ الدہر، النویری کی نہایتہ الارب، ابن فضل اللہ العمری کی مسالک الابصار اور القلقشندی کی صبح الاعشاء میں امور سلطنت اور تدبیر حکومت پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے مسلمانوں کے طرز حکومت کا صحیح اور واضح نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ اور دوسرے مصنفین کی کتابیں، جن کا ذکر اس ضمن میں کیا گیا ہے، اسلامی عمرانیات پر بہت مفید تصانیف ہیں۔ سیاسی معلومات کے علاوہ ان سے اس عہد کی زندگی کے اقتصادی و معاشرتی پہلو بھی اچھی طرح اجاگر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اسلام کے سب سے ممتاز ماہر عمرانیات یعنی ابن خلدون کا ذکر کیا جائے گا۔

ابو زید ولی الدین عبدالرحمن ابن محمد ابن خلدون التونسی الحضرمی الاشبیلی المالکی 27 مئی 1332ء کو تونس میں پیدا ہوا۔ اس کا جد امجد خالد، جنوبی عرب یعنی یمن سے نویں صدی میں اسپین منتقل ہوگیا تھا۔ وہ خلدون بھی کہلاتا تھا اور کندہ قبیلہ کا فرد تھا۔ خلدون کی اولاد میں کچھ لوگ اشبیلیہ میں سکونت پذیر ہوئے اور کچھ دوسرے مقامات پر۔ خلدون کے بزرگ اشبیلیہ میں رہتے تھے۔ وہاں سے تیرہویں صدی میں تونس آگئے۔ ابن خلدون کی زندگی کا زیادہ حصہ افریقہ میں گزرا۔ وہ ابھی سترہ سال ہی کا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس نے تونس میں تعلیم پائی اور بیس سال کی عمر میں سلطان کا سیکریٹری ہوگیا۔ بائیس سال تک وہ مختلف درباروں میں سیکریٹری کے فرائض انجام دیتا رہا۔ کبھی وہ فرمانروا کا منظور نظر ہو جاتا اور کبھی قید خانے میں ڈال دیا جاتا۔ ابن خلدون کا ذکر جغرافیہ دانوں کے ساتھ پہلے کیا جاچکا ہے۔

1374ء کے لگ بھگ وہ قلعہ ابن سلامہ (Qalaat Ibn Salama) میں جاکر گوشہ نشین ہو گیا اور وہاں اس نے اپنا مشہور عالم مقدمہ چار سال کی مدت میں تصنیف کیا۔ 1378ء میں تونس کے کتب خانوں سے مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ وہاں گیا اور 1382ء میں اس نے حج کا ارادہ کیا مگر مصر میں تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا۔ کئی سال بعد اس کو حج کرنے کا موقع ملا، 1384ء میں وہ

قاہرہ میں مالکی مذہب کا قاضی القضاہ مقرر ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد اس کے اہل و عیال اور اس کا مال سمندر کی نذر ہوگیا۔ اس کے چند سال پہلے دسمبر 1378ء یا جنوری 1379ء میں اس کا بھائی ابو زکریا یحییٰ قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ بھی مورخ تھا اور عبدالرحمن سے تقریباً سال ڈیڑھ سال چھوٹا تھا۔ ان مصائب کے بعد وہ ہمہ تن مطالعہ کتب بینی میں مصروف ہوگیا۔ صرف ایک بار 1401ء میں سلطان الناصر کے ہمراہ دمشق گیا جبکہ سلطان تیمور کے مقابلے کے لیے نکلا تھا۔ ابن خلدون نے تیمور سے ملاقات کی۔ تیمور اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا۔ مارچ 1406ء بمطابق رمضان 808ھ میں ابن خلدون کا انتقال ہوگیا، اس کی عمر تہتر برس اور دس مہینے کی ہوئی۔

ابن خلدون مورخ ہونے کے علاوہ شاعر اور فلسفی بھی تھا۔ اس نے ابن رشد اور فخر الدین رازی کی مابعد الطبیعاتی تصانیف کی تلخیص بھی کیں اور منطق اور حساب پر بھی طبع آزمائی کی لیکن جس تصنیف پر اس کی عالمی و دائمی شہرت کا دارومدار ہے وہ ہے اس کی تاریخ "کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر"۔ اس نے اس کا ایک قلمی نسخہ القرویین کی مسجد کو پیش کیا۔ اس نے اس قروینی سلطان عبدالعزیز کے نام سے معنون کیا تھا۔ یہ تاریخ عربی ادب کی عظیم ترین کتابوں میں سے ہے یہ تین حصوں پر منقسم کی گئی: (1) مقدمہ (2) عربوں، نبطیوں، شامیوں، ایرانیوں، یہودیوں، قبطیوں، یونانیوں، رومنوں، ترکیوں اور فرینکس (Franks) کی تاریخ (3) بربروں اور شمالی افریقہ کے مسلمان شاہی خاندانوں کی تاریخ (نبطیوں کے بارے میں سعید انصاری نے "سیر انصار" میں لکھا ہے کہ نابط، نابت، یابت حضرت اسماعیل کے بیٹوں میں سے ایک کا نام تھا۔ ان کے بعد کعبہ کی تولیت نابت کو پہنچی رفتہ رفتہ نابت اور ان کے بھائیوں کی اولاد عرب کے مختلف حصوں میں آباد ہوگئی۔ مدینہ کے انصار، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینے آنے کی دعوت دی تھی دراصل نابت کی اولاد میں سے تھے۔ فرینکس جرمنی کی اس یونانی (Teutonic) قوم کو کہتے ہیں جس نے فرانس کو فتح کیا تھا۔

ان تینوں حصوں میں مقدمہ سب سے زیادہ اہم ہے اور دوسرے حصہ کی سب سے کم اہمیت ہے۔ تیسرا حصہ جو شمالی افریقہ کے حالات سے متعلق ہے دوسرے حصے سے بہتر ہے کیونکہ یہ زیادہ تر ابن خلدون کے ذاتی علم پر مبنی ہے۔

مقدمہ میں ابن خلدون نے انسانی معاشرہ کی مختلف حالتوں کا جائزہ لیا ہے۔ مثلاً خانہ بدوشی اور سکونت پذیری کی حالتوں کا معاشی ذرائع کا، علوم و فنون کا اور معاشرتی علل و معلول کا۔ مقدمہ چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

(26) ابن خلدون یہ بھی کہتا ہے کہ بچوں کو صحیح طور پر غور و فکر کرنے کا خوگر بنانے کے لیے منطق پڑھانا بیکار ہے ...... تمام اسلامی ممالک میں جو یہ رواج ہے کہ ہر تعلیم کی ابتدا میں قرآن مجید حفظ کروا دیا جاتا ہے اس کے جواز کی کوئی وجہ نہیں ...... خود بچے کا فائدہ اور قرآن مجید کی جلالت شان کے لیے اس کو ترجیح دیتا ہے کہ جب تک بچہ غور و فکر کے ایک درجہ معینہ تک نہ پہنچ جائے' وہ اس درس کو شروع نہ کرے۔

(27) جن علوم کی تعلیم ضروری ہے ان کے متعلق ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ ان کو سب سے پہلے اصلی زبان میں پڑھانا چاہیے کیونکہ اجنبی زبان کی تعلیم صرف نصف تعلیم ہے ...... اس نے جس فصل میں فنون پر بحث کی ہے' اس کی ابتدا میں بیان کیا ہے کہ ایک ساتھ دو فنون میں مہارت نہیں پیدا کی جا سکتی ...... یہ ضروری ہے کہ ہم فکر بشری کی حقیقت اور بچپن سے جوانی تک کے تغیر کا مطالعہ کریں ...... بچوں کی تعلیم کی ابتدا نہایت عام اور آسان ترین قواعد سے کرنی چاہیے۔

(28) اس مختصر بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات کو سمجھنے میں کہ تربیت کیسی ہونی چاہیے' وہ نوجوانوں کے ذہن کی اصلاح کی تنظیم میں حیرت انگیز قابلیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد ابن خلدون عربی لغت اور عربی ادب کی تاریخ پر بحث کرتا ہے اور اس بحث سے ایسے نتائج نکالتا ہے جو ان مستشرقین کی توجہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں جو اس موضوع پر بحث کرتے ہیں ...... یہ تمام خیالات ابن خلدون کو جدید دور کے علماء کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباسات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر لیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جہاں کہیں افلاطون اور ارسطو کا ابن خلدون سے مقابلہ کیا ہے' اسے یہ ماننا پڑا ہے کہ ابن خلدون ان پر بہت زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔ جارج سارٹن نے ابن خلدون کے "مقدمہ" کی فراخدلی سے تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جو بقول مولانا سلیمان ندوی ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' اتنی فراخدلی سے کام نہیں لیا۔ مگر پھر بھی جتنی بات وہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں وہ ابن خلدون کو دنیا کے عظیم ترین مفکروں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرتی ہے۔

مسلمانوں کے شفاخانے

اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ کتاب جرمن زبان میں 1960ء میں مغربی جرمنی کے شہر شٹٹ گارٹ (Stuttgart) سے شائع ہوئی۔ ایک خاتون Hunke Sigrid کی تصنیف ہے' اس کتاب کا نام Allahs Sonne ueber dem Abendland unser arabisches Erbe ہے جس کا اردو ترجمہ ہوگا: "مغربی ممالک پر اللہ کا سورج۔ ہمارا عربی ورثہ"۔ علم طب پر جو اقتباسات اس کتاب سے لیے گئے ہیں وہ اس علم کے بارے میں تفصیلی اور مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ہم نے ابتدائی سطور میں اس علم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' اس میں اتنی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں اس لیے مناسب ہے کہ ان اقتباسات کا اردو ترجمہ بھی یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کر دیا جائے۔ اقتباسات کتاب کے چوتھے باب سے ماخوذ ہیں۔ اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے اختصار سے کام لیا گیا ہے اور ترتیب میں بھی کہیں کہیں تبدیلی کر دی گئی ہے۔

علم طب

مسلمانوں کے بیمارستانوں (شفا خانوں) کی ہو بہو تصویر پیش کرنے کی غرض سے مصنفہ نے ایک مریض کا جو ایک شفاخانے میں بحیثیت مقیم مریض کے داخل ہے وہ خط نقل کیا ہے جو اس نے اپنے والد کو لکھا تھا:

"پیارے ابا جان! آپ نے پوچھا تھا کہ میرے اخراجات کے لیے کتنا روپیہ بھیجا جائے جب میں صحتیاب ہو کر شفاخانہ چھوڑوں گا تو مجھے شفاخانہ کی طرف سے کپڑوں کا ایک نیا جوڑا اور پانچ سونے کے سکے (دینار) دیئے جائیں گے تاکہ میں شفاخانے سے جاتے ہی کام کرنا شروع نہ کر دوں۔ اس لیے آپ اپنے کچھ جانور بیچ کر مجھے روپیہ بھیجنے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ البتہ اگر آپ یہ

دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں شفاخانے میں کس طرح رہتا ہوں تو جلد آجائیے۔ میں مریض بچوں کے وارڈ (Orthopaedic Ward) میں ہوں جو جراحی کے کمرے کے قریب ہے ...... میرے گر کر بیمار پڑنے کی وجہ سے مجھے سب سے پہلے شعبہ تشخیص (Polyclinic) میں لایا گیا جہاں طلبہ اور چھوٹے ڈاکٹر مریض کا معائنہ کرتے ہیں۔ اگر مرض معمولی نوعیت کا ہوتا ہے اور مریض کو شفاخانے میں داخل کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تو اسے دوا کا نسخہ دے دیا جاتا ہے، جس کے بموجب اسپتال کے دواخانہ سے اسے دوا ملتی رہتی ہے۔ یہ شفاخانہ بالکل ملا ہوا ہے مگر مجھے معائنہ کے لیے طبیب اعلیٰ کے سامنے پیش کیا گیا۔ معائنہ کے بعد میرا نام رجسٹر میں درج کر لیا پھر مجھے نہلا کر صاف کپڑے پہننے کو دیئے گئے۔"

"آپ میرے پاس آئیں تو کتب خانے کو بائیں طرف اور درسگاہ کو جہاں طبیب اعلیٰ طلبہ کو درس دیتے ہیں پشت پر چھوڑ کر آگے بڑھیں۔ صحن کے بائیں جانب جو غلام گردش ہے وہ زنانہ وارڈ کو جاتی ہے۔ آپ دائیں جانب کو مزیں اور طبی اور جراحی شعبوں کو چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ جائیں ...... اگر آپ کو کسی کمرے سے موسیقی سنائی دے تو ذرا جھانک کر دیکھئے۔ ممکن ہے میں اس میں ہوں۔ کیوں کہ روبصحت مریضوں کے لیے ایک علیحدہ کمرہ ہے جہاں ان کا دل بہلانے کو موسیقی کا انتظام کیا گیا ہے اور کتابیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔"

"آج صبح جب طبیب اعلیٰ اپنے نائب طبیبوں اور دوسرے معاونوں کے ساتھ گشت پر آئے اور میرا معائنہ کیا تو انہوں نے میرے وارڈ کے طبیب کو کچھ ہدایات لکھوائیں جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس طبیب نے بعد میں مجھے بتایا کہ کل مجھے کھڑے ہونے کی اور تھوڑے دنوں بعد شفاخانہ چھوڑنے کی اجازت مل جائے گی۔ مگر میں شفاخانہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہاں ہر چیز اس قدر صاف و شفاف ہے کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ بستر نہایت نرم ہیں، ان کی چادریں دمشق کے مشجر ریشم کی ہیں اور دلائیاں مخمل کی طرح نرم اور روئیں دار ہیں۔ ہر کمرے میں آب رواں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جب ذرا سردی پڑنے لگے گی تو رات کو کمرے گرم رکھنے کا انتظام کیا جائے گا۔ کھانے کے لیے قریب قریب ہر روز مرغ یا بھنا ہوا دنبہ ان مریضوں کو دیا جاتا ہے جن کا ہاضمہ درست ہے۔ برابر کے پلنگ پر جو مریض ہے وہ اچھا ہو جانے کے باوجود ہفتہ بھر تک اس لیے بیمار رہا کہ اسے روز مرغ کا سینہ کھانے کو ملتا تھا۔ کل طبیب

اعلیٰ پر جب یہ راز کھلا تو انہوں نے حکم دیا کہ اسے ایک پوری مرغی کھلا کر چلتا کر دیا جائے۔ ابا جان آپ مجھے بھنا ہوا مرغ کھاتے دیکھنا چاہتے ہیں تو جلد آ جائیں۔"

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ اس خط میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا اطلاق ان تمام شفاخانوں پر ہوتا ہے جو اب سے ہزار سال پہلے کوہ ہمالیہ سے الجبال البسط (The Pyrenefs) تک مسلمانوں کے ہر بڑے شہر میں پائے جاتے تھے۔ صرف قرطبہ میں دسویں صدی کے وسط میں پچاس شفاخانے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں قرطبہ بغداد کے ان مشہور بیمارستانوں پر بھی فوقیت لے گیا تھا جو ہارون الرشید کے زمانے سے چلے آرہے تھے اور جن کی حیثیت قابل تقلید نمونوں کی سی تھی ...... شفاخانے کی عمارت کے لیے جگہ کا انتخاب صحت کے نقطہ نظر سے بہت غور و خوض کے بعد کیا جاتا تھا۔ جب سلطان عضد الدولہ نے بغداد میں ایک نیا شفاخانہ بنانا چاہا تو اس نے اپنے رئیس الاطباء سے اس غرض کے لیے بہترین جگہ تلاش کرنے کو کہا۔ رئیس الاطباء نے کئی ہم عمر بھیڑوں کو ذبح کروا کر ان کے پٹھے، شکم، سینے اور رانیں مختلف مقامات پر ٹنگوائیں۔ چوبیس گھنٹے تک جہاں گوشت سب سے اچھی حالت میں رہا وہ مقام شفاخانے کی عمارت کے لیے منتخب کیا گیا۔ جب سلطان صلاح الدین نے قاہرہ کے محلوں میں سے ایک محل کو شفاخانہ بنایا تو اس بات کو خاص طور پر مدنظر رکھا کہ چیونٹیاں، جو محلوں میں عموماً پائی جاتی تھیں، اس شفاخانے کے ذخیرہ کی کوٹھریوں تک نہ پہنچنے پائیں۔"

"خلفاء و سلاطین جب رفاہ عام کے ان اداروں کو وجود میں لاتے تو ان کو اسی طرح کے ساز و سامان سے آراستہ کرتے جو ان کے محلوں کی آرائش میں استعمال کیا جاتا تھا۔ مریضوں کے کمروں، بستروں اور غسل خانوں کے لیے وہی آسائش کی چیزیں فراہم کی جاتیں جو سلطنت کے بڑے بڑے اشخاص کے شبستانوں اور ایوانوں کو زینت بخشتی تھیں، اس طرح سلطنت کا ہر چھوٹے سے چھوٹا باشندہ بھی ان آسائشوں سے بہرہ اندوز ہو سکتا تھا......"

"دمشق کے اطباء ایک ایرانی امیر زادے کا قصہ بیان کرتے تو ان کے ہونٹوں پر تبسم جھلکنے لگتا۔ یہ امیر زادہ لذیذ کھانوں کا شیدائی تھا اور اتنا کھاتا تھا کہ

دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں شفا خانے میں کس طرح رہتا ہوں تو جلد آجائیے ۔ میں مریض بچوں کے وارڈ (Orthopaedic Ward) میں ہوں جو جراحی کے کمرے کے قریب ہے ...... میرے گر کر بیمار پڑنے کی وجہ سے مجھے سب سے پہلے شعبہ تشخیص (Polyclinic) میں لایا گیا جہاں طلبہ اور چھوٹے ڈاکٹر مریض کا معائنہ کرتے ہیں ۔ اگر مرض معمولی نوعیت کا ہوتا ہے اور مریض کو شفاخانے میں داخل کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تو اسے دوا کا نسخہ دے دیا جاتا ہے، جس کے بموجب اسپتال کے دواخانہ سے اسے دوا ملتی رہتی ہے ۔ یہ شفاخانہ بالکل ملا ہوا ہے مگر مجھے معائنہ کے لیے طبیب اعلیٰ کے سامنے پیش کیا گیا ۔ معائنہ کے بعد میرا نام رجسٹر میں درج کر لیا پھر مجھے نہلا کر صاف کپڑے پہننے کو دیئے گئے ۔"

"آپ میرے پاس آئیں تو کتب خانے کو بائیں طرف اور درسگاہ کو جہاں طبیب اعلیٰ طلبہ کو درس دیتے ہیں پشت پر چھوڑ کر آگے بڑھیں ۔ صحن کے بائیں جانب جو غلام گردش ہے وہ زنانہ وارڈ کو جاتی ہے ۔ آپ دائیں جانب کو مزیں اور طبی اور جراحی شعبوں کو چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ جائیں .... اگر آپ کو کسی کمرے سے موسیقی سنائی دے تو ذرا جھانک کر دیکھئے ۔ ممکن ہے میں اس میں ہوں ۔ کیوں کہ روبصحت مریضوں کے لیے ایک علیحدہ کمرہ ہے جہاں ان کا دل بہلانے کو موسیقی کا انتظام کیا گیا ہے اور کتابیں بھی فراہم کی گئی ہیں ۔"

"آج صبح جب طبیب اعلیٰ اپنے نائب طبیبوں اور دوسرے معاونوں کے ساتھ گشت پر آئے اور میرا معائنہ کیا تو انہوں نے میرے وارڈ کے طبیب کو کچھ ہدایات لکھوائیں جو میں نہ سمجھ سکا ۔ اس طبیب نے بعد میں مجھے بتایا کہ کل مجھے کھڑے ہونے کی اور تھوڑے دنوں بعد شفاخانہ چھوڑنے کی اجازت مل جائے گی ۔ مگر میں شفاخانہ چھوڑنا نہیں چاہتا ۔ یہاں ہر چیز اس قدر صاف و شفاف ہے کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں ۔ بستر نہایت نرم ہیں، ان کی چادریں دمشق کے مشجر ریشم کی ہیں اور دلائیاں مخمل کی طرح نرم اور روئیں دار ہیں ۔ ہر کمرے میں آب رواں کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ جب ذرا سردی پڑنے لگے گی تو رات کو کمرے گرم رکھنے کا انتظام کیا جائے گا ۔ کھانے کے لیے قریب قریب ہر روز مرغ یا بھنا ہوا دنبہ ان مریضوں کو دیا جاتا ہے جن کا ہاضمہ درست ہے ۔ برابر کے پلنگ پر جو مریض ہے وہ اچھا ہو جانے کے باوجود ہفتہ بھر تک اس لیے بیمار رہا کہ اسے روز مرغ کا سینہ کھانے کو ملتا تھا ۔ کل طبیب

اعلیٰ پر جب یہ راز کھلا تو انہوں نے حکم دیا کہ اسے ایک پوری مرغی کھلا کر چلتا کر دیا جائے ۔ ابا جان آپ مجھے بھنا ہوا مرغ کھاتے دیکھنا چاہتے ہیں تو جلد آ جائیں ۔"

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ اس خط میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا اطلاق ان تمام شفاخانوں پر ہوتا ہے جو اب سے ہزار سال پہلے کوہ ہمالیہ سے الجبال البسط (The Pyrenefs) تک مسلمانوں کے ہر بڑے شہر میں پائے جاتے تھے ۔ صرف قرطبہ میں دسویں صدی کے وسط میں پچاس شفاخانے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں قرطبہ بغداد کے ان مشہور بیمارستانوں پر بھی فوقیت لے گیا تھا جو ہارون الرشید کے زمانے سے چلے آرہے تھے اور جن کی حیثیت قابل تقلید نمونوں کی سی تھی ...... شفاخانے کی عمارت کے لیے جگہ کا انتخاب صحت کے نقطہ نظر سے بہت غور و خوض کے بعد کیا جاتا تھا ۔ جب سلطان عضد الدولہ نے بغداد میں ایک نیا شفاخانہ بنانا چاہا تو اس نے اپنے رئیس الاطباء سے اس غرض کے لیے بہترین جگہ تلاش کرنے کو کہا ۔ رئیس الاطباء نے کئی ہم عمر بھیڑوں کو ذبح کروا کر ان کے پٹھے، شکم، سینے اور رانیں مختلف مقامات پر ٹنگوائیں ۔ چوبیس گھنٹے تک جہاں گوشت سب سے اچھی حالت میں رہا وہ مقام شفاخانے کی عمارت کے لیے منتخب کیا گیا ۔ جب سلطان صلاح الدین نے قاہرہ کے محلوں میں سے ایک محل کو شفاخانہ بنایا تو اس بات کو خاص طور پر مدنظر رکھا کہ چیونٹیاں، جو محلوں میں عموماً پائی جاتی تھیں، اس شفاخانے کے ذخیرہ کی کوٹھریوں تک نہ پہنچنے پائیں ۔"

"خلفاء و سلاطین جب رفاہ عام کے ان اداروں کو وجود میں لاتے تو ان کو اسی طرح کے ساز و سامان سے آراستہ کرتے جو ان کے محلوں کی آرائش میں استعمال کیا جاتا تھا ۔ مریضوں کے کمروں، بستروں اور غسل خانوں کے لیے وہی آسائش کی چیزیں فراہم کی جاتیں جو سلطنت کے بڑے بڑے اشخاص کے شبستانوں اور ایوانوں کو زینت بخشتی تھیں، اس طرح سلطنت کا ہر چھوٹے سے چھوٹا باشندہ بھی ان آسائشوں سے بہرہ اندوز ہو سکتا تھا......"

"دمشق کے اطباء ایک ایرانی امیر زادے کا قصہ بیان کرتے تو ان کے ہونٹوں پر تبسم جھلکنے لگتا ۔ یہ امیر زادہ لذیذ کھانوں کا شیدائی تھا اور اتنا کھاتا تھا کہ

کھاتے کھاتے تھک جاتا۔ وہ دمشق کا نوری شفاخانہ دیکھنے گیا تو مرغ پکنے کی اشتہا خیز خوشبو نے اسے بے چین کر دیا۔ چنانچہ اس نے فی الفور شفاخانے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور کراہتا ہوا معائنہ کے لیے داخل ہوا۔ طبیب نے بہت اچھی طرح معائنہ کیا مگر وہ کوئی بیماری تشخیص نہ کر سکا۔ البتہ امیر زادے کے سوالات سے جو علاج کے بجائے شفاخانہ کے کھانوں سے زیادہ متعلق تھے، طبیب نے اندازہ لگا لیا کہ امیر زادہ کس غرض سے داخل ہونا چاہتا ہے۔ طبیب نے اسے داخل کر لیا اور نسخے میں دوائیں لکھنے کے بجائے نہایت لذیذ کھانوں اور مشروبات کی ایک لمبی فہرست درج کر دی۔ امیر زادے نے تین دن تک اس قدر جی بھر کر لذیذ غذائیں کھائیں کہ اس کا ہاضمہ جواب دینے لگا اور وہ سچ مچ بیمار ہونے کے قریب پہونچ گیا۔ تب طبیب نے اس سے کہا کہ ہم عرب تین دن تک حتی المقدور مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہیں۔ تین دن ختم ہو گئے۔ بہتر ہے کہ بیمار پڑنے سے پہلے آپ شفاخانے سے چلے جائیں۔ خدا آپ کا حافظ و نگہبان ہو۔"

عالم اسلام میں تین شفاخانوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ بغداد، دمشق اور قاہرہ کے شفاخانے تھے۔ بغداد کا سب سے زیادہ مشہور شفاخانہ سلطان عضد الدولہ نے، دمشق کا سب سے زیادہ مشہور شفاخانہ سلطان نورالدین نے اور قاہرہ کا سب سے زیادہ مشہور شفاخانہ سلطان المنصور قلاؤن نے بنوایا تھا اور یہ انہیں کے ناموں پر عضدی، نوری اور منصوری شفاخانے کہلاتے تھے۔ ہر ایک بڑے رقبے پر بنایا گیا تھا اور ہر ایک میں ہر شعبے کی عمارتیں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ منصوری شفاخانے کی تعمیر کے متعلق مصنفہ لکھتی ہے:

"قلاؤن مصری فوج کا ایک نوجوان افسر تھا۔ جب اس کا فوجی دستہ دمشق کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا تو اس پر درد قولنج کا شدید دورہ پڑا۔ اس کے لیے نوری شفاخانے سے دوائیں بھیجی جاتی تھیں۔ شفایاب ہو کر وہ یہ شفاخانہ دیکھنے گیا۔ وہ جنگی میدانوں میں کشت و خون دیکھنے کا عادی تھا۔ شفاخانے کو اس نے امن و امان کا نخلستان پایا۔ اس کے کمروں کی ٹھنڈی اور معطر فضا اور ان میں نرم بستروں پر لیٹے ہوئے مریضوں نے اس کے ذہن میں ایک دیرپا جگہ بنالی۔ اس نے عہد کیا کہ اگر کبھی اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت عطا کی تو وہ ایسا ہی پرسکون اور راحت بخش شفاخانہ بنوائے گا۔ چنانچہ جب وہ مصر کا بادشاہ بنا تو اس نے اپنا عہد نہایت فراخ دلی سے پورا کیا۔ اس نے

قاہرہ میں اس سڑک پر جو دو قلعوں کے درمیان واقع تھی، منصوری شفاخانہ تعمیر کرایا۔ اس کی عمارت ایک پرشکوہ محل معلوم ہوتی تھی، اس نے اس کی تعمیر اور اس کے ساز و سامان پر اس قدر دولت صرف کی کہ یہ شفاخانہ دنیا کا بہترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ شفاخانہ بن گیا۔"

دوسری جگہ مصنفہ لکھتی ہے کہ جب اس شفاخانہ کا افتتاح ہوا تو سلطان المنصور قلاؤن نے اعلان کیا کہ میں یہ شفاخانہ اپنے ہم چشموں اور اپنے سے چھوٹوں کو بلاتفریق و تفاوت مراتب نذر کرتا ہوں۔ یہ راعی اور یہ رعایا، سپاہی اور امیر، بڑے اور چھوٹے، آزاد اور غلام، عورت اور مرد سب کے لیے یکساں خدمات فراہم کرنے کی غرض سے کھولا گیا ہے۔

اس کتاب کی مصنفہ نے لکھا ہے کہ شفاخانوں کو بنانے اور چلانے کا کام بادشاہوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اور ذی حیثیت لوگ بھی زر کثیر صرف کر کے شفاخانے بناتے اور چلاتے تھے۔

"خلفاء اور سلاطین کے علاوہ اور اہل ثروت لوگ اور متمول طبیب بھی شفاخانے تعمیر کرتے اور چلاتے تھے۔ مثلاً سنان بن ثابت اور ثابت بن سنان نے جو مشہور عالم ہیئت ثابت بن قرا کے بیٹے اور پوتے تھے، عمدہ شفاخانے کھولے اور سفری شفاخانے بھی قائم کیے جو گاؤں گاؤں جا کر بیماروں کا علاج کرتے تھے۔"

مشہور عالم ہیئت ثابت بن قرا حران کا رہنے والا تھا، 901ء میں بغداد میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ مذہباً عیسائی تھا۔ اس کا بیٹا سنان بن ثابت مشرف بہ اسلام ہوا، اس کے بعد اس خاندان کے افراد کا مذہب اسلام ہی رہا۔ سنان بھی طبیب ہونے کے علاوہ عالم ہیئت تھا۔ وہ تین عباسی خلفاء المقتدر، القاہر اور الراضی کا طبیب تھا اور بغداد کے شفاخانوں کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ اس نے عطائی حکیموں کو طبابت کرنے سے باز رکھنے کے لیے موثر قدم اٹھائے اور یہ قاعدہ نافذ کیا کہ استعداد کو جانچ کر صرف ان لوگوں کو سندیں دی جائیں جو اہل ثابت ہوں۔ وہ 943ء میں بغداد میں فوت ہوا۔

مصنفہ لکھتی ہے کہ:

"بیماروں کا، خواہ غریب ہوں یا امیر، مفت علاج کیا جاتا تھا۔ کسی کو ایک درہم بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ رہائش، طعام اور دوائیں مفت فراہم کی

جاتیں بلکہ بیماروں کو شفاخانے سے کپڑے بھی ملتے اور شفاخانہ چھوڑتے وقت مہینہ بھر کے مصارف کے لیے ایک معقول رقم بھی دی جاتی ۔ اس فیاضی کے لیے روپیہ کہاں سے آتا تھا ۔ ظاہر ہے کہ شفاخانوں کو اس طرح چلانے پر زرکثیر صرف ہونا لازم تھا ۔ منصوری شفاخانہ پر دس لاکھ درہم سالانہ خرچ ہوتے تھے ۔ جو شخص شفاخانہ قائم کر دیتا جس کا انتظام اعلیٰ حکام کے سپرد ہوتا تھا، ان حکام پر حکومت کزی نگرانی رکھتی تھی ۔ شاہزادوں یا امراء میں سے کوئی معتمد امیر شفاخانوں کی نگرانی کے لیے مقرر کیا جاتا اور خود سلطان گاہ بگاہ ان کو جا کر دیکھتا، لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا اور شکایات کی تفتیش کراتا۔اس طرح نگہداشت کا ایک مستقل اور ہمہ گیر سلسلہ جاری رہتا۔"

"طبیبوں، معاونوں اور خادموں کی تنخواہیں وقف کردہ جائدادوں کی آمدنی سے دی جاتیں ۔ منتظمین کے لیے لازم تھا کہ وہ آمدنی اور اورخرچ کا باقاعدہ حساب رکھیں اور ہر خرچ کی پوری تفصیل لکھیں ۔ ان کے ہی کھاتوں کو پڑھ کر ہم آج بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ طبیبوں کی کیا تنخواہیں تھیں اور دواؤں اور آلات پر کیا خرچ کیا جاتا تھا ۔ طبی امور کی نگرانی کی ذمہ داری طبیب اعلیٰ پر ہوتی ۔ طبیب اعلیٰ کا انتخاب تمام اطباء کی اہلیت کا مکمل جائزہ لینے کے بعد کیا جاتا ۔ جب الرازی طبیب اعلیٰ مقرر ہوا تو اس کا انتخاب سو طبیبوں میں سے کیا گیا تھا ۔ بحیثیت طبیب اعلیٰ الرازی کے ماتحت مختلف امراض کے چوبیس ماہرین خصوصی (Specialists) تھے......"

اصیبعہ کے حوالے سے مصنف نے طبیب اعلیٰ کا وہ معمول بیان کیا ہے جس کے بموجب وہ شفاخانہ میں مقیم مریضوں کے پاس جاتا اور ان کی دواؤں اور کھانے کے بارے میں احکام جاری کرتا ۔ پھر شہر میں جا کر مریضوں کو دیکھتا اور واپسی پر طلبہ کو درس دیتا ۔ ابوالعباس احمد ابن القاسم ابن ابی اصیبعہ السعدی الخزرجی دمشق میں 4-1203ء میں پیدا ہوا اور صرخد میں 1270ء میں فوت ہوا ۔ طب پڑھ کر وہ قاہرہ کے ناصری شفاخانے میں طبیب مقرر ہوا ۔ اس کا ذکر طبیبوں کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے ۔ اس کی "کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء" بہت مشہور ہے ۔ اس میں اس نے چار سو مسلمان طبیبوں کے حالات بیان کیے ہیں ۔ ان کے علاوہ غیر مسلم طبیبوں کا ذکر بھی کیا ہے ۔ مسلمانوں کے علم الطب کی تاریخ پر یہ نہایت اہم تصنیف ہے ۔

اصیبعہ نے جو خود طبیب اور شاعر تھا، طبیب اعلیٰ کے روزانہ معمول کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے ۔ یہ بعینہٖ ویسا ہی ہے جیسا ہمارے زمانے میں رائج ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ "دمشق کے نوری شفاخانہ کا طبیب اعلیٰ ابوالحکم ہر روز صبح کے وقت اپنے مریضوں کا حال اور ضروریات معلوم کرنے کی غرض سے ان کے پاس جاتا ۔ اس کے ساتھ اس کے معاون طبیب اور متعلقہ خدام بھی ہوتے ۔ جو دوا اور کھانا وہ ہر مریض کے لیے تجویز کرتا اس کے ماتحت نہایت احتیاط سے لکھتے جاتے اور بلاتاخیر اس کے احکام پر عمل کرتے ۔ شفاخانہ کے گشت کے بعد وہ امرا اور اعلیٰ حکام میں سے ان کو جو اس کے زیر علاج ہوتے، دیکھنے شہر جاتا ۔ شہر سے پھر شفاخانے واپس آ کر طلبہ کو درس دینے کی غرض سے کتابوں کا مطالعہ کرتا ۔ سلطان نورالدین نے شفاخانہ کے ساتھ ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جس میں کتابوں کے لیے اونچی اونچی الماریاں بنائی گئی تھیں ۔ طبیب اور طلبہ یہاں جمع ہو کر ابوالحکم سے تحصیل علم کرتے ۔ پھر طبی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا اور ابوالحکم اپنے تجربہ کی بنا پر کچھ غیر معمولی دلچسپی کے واقعات کا ذکر کرتا اور بتاتا کہ اس نے کس طرح علاج کیا تھا۔"

"بڑے شفاخانے مدرستہ الطب کے طور پر بھی استعمال کیے جاتے ۔ بقراط، جالینوس اور مسلمان علمائے طب کے ذخائر علم پر مسجدوں میں، طب کے نجی مدرسوں میں اور شفاخانوں میں لکچر دیئے جاتے ۔ شفاخانوں کے لکچر صرف درس و تدریس کے دالانوں تک محدود نہ رہتے تھے ۔ بلکہ مریضوں کے کمروں میں بھی، جہاں مریض اور ان کے مرض کی کیفیت آنکھوں کے سامنے ہوتی، طلبہ کو عملی درس دیا جاتا ... اس طرح نظریوں کو مشاہدات کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ۔ مریض کے پلنگ اور انسان کے جسم تجرباتی تعلیم دینے کا ذریعہ بنتے ۔ طبی علم کا مظاہرہ آنکھوں کے سامنے ہوتا ۔ دشواری سے قابو میں آنے والے امراض کا طریقہ علاج عملی طور پر بتایا جاتا اور اس پر مختلف زاویوں سے رائے زنی کی جاتی ۔ اصیبعہ نے اپنے طالب علمی کے زمانے کے تجربات قلمبند کیے ہیں اور بتایا ہے کہ طبیب اعلیٰ کے ساتھ طلبہ کس طرح مریضوں کا معائنہ کرتے، کس طرح وہ اپنے مطب میں امراض کی تشخیص کرکے نسخے لکھتا اور جب وہ کسی مشہور و معروف طبیب سے کسی مریض کے بارے میں

مشورہ کرتا تو طلبہ کیسے انہاک سے ان دونوں کی گفتگو سنتے اور ان دو ماہرین کے اظہار رائے سے دوہرا فائدہ اٹھاتے۔ اس طرح ابتدا ہی سے طلبہ عملی طبابت سے وابستہ ہو جاتے اور ان میں طبابت کا ملکہ پیدا ہوتا جاتا۔ یہ طرز تعلیم اسلامی دنیا کے علاوہ کہیں اور رائج نہ تھا۔ دور حاضر میں بھی یہی طرز تعلیم اختیار کیا گیا ہے۔"

پیشہ طبابت

مصنفہ نے لکھا ہے کہ طبابت کے پیشہ میں داخل ہونے کے لیے طب کی تعلیم مکمل کر لینا کافی نہ تھا۔ ایک بار ایک مریض کسی طبیب کی فنی غلطی سے مر گیا، خلیفہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے احکام جاری کیے۔ بعد میں ویسے ہی احکام دوسرے مسلمان بادشاہوں نے بھی جاری کیے۔

"931ء میں خلیفہ المقتدر کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک طبیب کی فنی غلطی سے ایک شخص مر گیا۔ اس نے حکم دیا کہ طبیبوں کے علاوہ جو سرکاری ملازمت میں تھے، آئندہ ہر طبیب کی فنی مہارت کا امتحان لیا جائے گا اور جن کی مہارت ثابت ہو جائے انہیں ایک خصوصی سند دی جائے۔ اس مقصد کے لیے خلیفہ نے رئیس الاطباء سنان بن ثابت کی سرکردگی میں طبیبوں کا ایک بورڈ قائم کیا اور ہدایت کی کہ ہر طبیب کے امتحان کے بعد اسے صرف اس شعبہ طب میں طبابت کرنے کی سند دی جائے جس سے وہ بدرجہ کمال واقف ہو۔ اس وقت سرکاری اطبا کے علاوہ صرف بغداد میں آٹھ سو ساٹھ طبیب تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سارے رین گو (Rhein Gau) میں ایک ڈاکٹر بھی نہیں تھا۔"

ماہرین خصوصی

طب کے کسی خاص شعبہ میں طبیب یا جراح کی اہلیت معلوم کرنے کی غرض سے طبیبوں اور جراحوں کا امتحان لیا جاتا تھا۔ مصنفہ لکھتی ہے:

"ان امتحانوں کا مقصد یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے علم کی حدود سے تجاوز کر کے

طبابت کا پیشہ اختیار نہ کرنے پائے۔ جراحوں کے امتحان میں سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا تھا کہ آیا جراح نے علم التشریح و جراحی پر ایجینا کے پولس (Paulus of Aegina) یا علی ابن العباس کی کتابیں پڑھی ہیں یا نہیں۔ پھر اس کی علمی معلومات کا جائزہ لیا جاتا اور دیکھتے کہ وہ ہڈی ٹوٹنے (Fractures) اور ہڈی اتر جانے (Dislocation) کا علاج کس حد تک جانتا ہے اور مثانے کی پتھری اور گلے کی گلٹی (Tonsil) نکالنے میں کتنی مہارت رکھتا ہے۔ اس کے بعد موتیا بند (Cataract) اور پھوڑوں کے آپریشن کرنے، قطع عضو (Amputation) اور کھوپڑی کھولنے کی استعداد کو پرکھتے۔ اس درجہ سے چھوٹے درجہ کے جراحوں کو جو ڈپلوما دیا جاتا تھا وہ یہ تھا...... "ہم اللہ تعالیٰ سے توفیق کی دعا مانگتے ہوئے اس شخص کو فن جراحی کا پیشہ کرنے کا اس حد تک مجاز قرار دیتے ہیں جس حد تک اس نے مہارت تامہ حاصل کی ہے اور اسے اپنے پیشہ میں کامیاب و فرخندہ ہونے کی دعا دیتے ہیں۔ یہ زخموں کے اچھے ہونے تک ان کا علاج کر سکتا ہے، فصد کھول سکتا ہے، بواسیر کے مسے کاٹ سکتا ہے اور دانت اکھاڑ سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی ضرورت پیش آئے تو اس پر لازم ہو گا کہ اعلیٰ ماہرین اور تجربہ کار مدرسین سے مشورہ کرے۔"

"فنی غلطیوں کے ارتکاب سے حتی الامکان بچنے اور تشخیص و علاج کو زیادہ سے زیادہ قابل وثوق بنانے کی غرض سے پیچیدہ امراض میں اطبا کی مجلس مشاورت بیٹھتی، سب سے معمر ماہر خصوصی صدارت کرتا اور سب سے کم عمر کارروائی کی روداد لکھتا۔ بڑے آپریشن میں، جیسا آج کل ہوتا ہے، ایک جراح دوسرے جراح کی مدد کرتا۔ کبھی کبھی تین بھی ہوتے۔ ایک مریض کو بے ہوش کرتا، دوسرا نبض دیکھتا اور تیسرا آپریشن کرتا......"

آپریشن کے بارے میں مصنفہ نے علی ابن العباس کی ہدایات بیان کی ہیں۔ علی ابن العباس اہواز میں پیدا ہوا اور 994ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ مسلمانوں کے صف اول کے طبیبوں میں سے تھا۔ اسے سلطان عضد الدولہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کی تصنیف "کتاب الصناعۃ الطبیہ" علم طب پر نہایت اہم کتاب ہے۔ اس میں بیس خطبات ہیں۔ دس میں نظری اور دس میں عملی طب کا بیان ہے۔ یہ کتاب ویسی ہی معیاری ہے جیسی مسلمانوں کے دو عظیم ترین اطبا ابوالرازی اور ابن سینا کی تصنیف ہیں۔ اس میں دلچسپ مشاہدات بھی بیان کیے ہیں۔

ابن عباس کی ہدایات یہ ہیں:

"جلد میں شگاف دینے کے بعد رسولی (Tumour) کے اردگرد کا گوشت اس احتیاط سے کاٹو کہ عصب (Nerve) یا رگ نہ کٹ جائے ۔ اگر کسی شریان (Artery) کا کاٹنا ضروری ہو تو پہلے اسے باندھ دو تاکہ خون نہ بہے ۔ اگر خون بہہ کر رسولی کے چاروں طرف آجائے گا تو اس کے نیچے کا گوشت صاف نظر نہ آئے گا اور ممکن ہے کہ کہیں زیادہ کاٹ دیا جائے اور کہیں کم ۔ جب رسولی نکال لی جائے تو انگلیوں سے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھو کہ کہیں کوئی حصہ رہ تو نہیں گیا ۔ جو حصے باقی رہ گئے ہوں انہیں بھی احتیاط سے نکال لو ۔ رسولی کی وجہ سے اگر جلد بڑھ گئی ہو تو زائد جلد کو کاٹ دو اور پھر بلی کی خشک کی ہوئی نس سے جلد کو سی دو ...... سرطان پر دوائیں اثر نہیں کرتیں ۔ اس کی تمام جڑ کو نکالنا ضروری ہے ۔ اس لیے صرف سرطان کی رسولی کو کاٹنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ جہاں تک جڑیں پھیلی ہوئی ہوں وہاں تک کاٹا جائے ۔"

تشخیص امراض

مرض کیسے تشخیص کرتے تھے اس کی تفصیلات مصنف نے دو تین صفحوں پر بیان کی ہیں ۔ یہاں اختصار کے ساتھ لکھا جاتا ہے:

"صرف اسی عضو پر توجہ محدود نہ کی جاتی جس میں تکلیف ہوتی بلکہ مریض کے عادات و اطوار ، اس کے رہنے سہنے کا طریقہ ، اس کی سابقہ بیماریاں اور خاندانی امراض بھی معلوم کیے جاتے ۔ طبیب نہایت تحمل سے ان سب باتوں کے بارے میں سوالات کرتا اور جن جوابوں کو قلمبند کرنا ضروری سمجھتا انہیں لکھ لیتا ۔ یہی طریقہ آج کل بھی رائج ہے ۔ اس کے بعد طبیب مریض کے چہرے کو غور سے دیکھتا ۔ جلد اور بالوں کے رنگ سے نتائج اخذ کرتا اور دیکھتا کہ مریض کے سانس کی کیا کیفیت ہے ۔ مریض کی افتاد طبع اور ذہنی کیفیت کا اندازہ کرنا بھی ضروری تھا ۔ مریض سے مختلف چیزوں کے بارے میں سوال پوچھے جاتے اور اس کے جوابوں سے اس کی ذہنی استعداد کا پتہ لگایا جاتا ۔ اسی طرح اس سے مختلف کام کرنے کو کہا جاتا اور طبیب دیکھتا کہ اس نے کس طرح سرانجام دیئے ۔ اس سے طبیب یہ بھی معلوم کر لیتا کہ علاج کے بارے

میں جو ہدایات دی جائیں گی مریض اس پر کس طرح عمل کر سکے گا ۔ یہ بھی معلوم کیا جاتا کہ کن چیزوں سے اس میں کام کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور کن سے اس پر افسردگی طاری ہوتی ہے ۔ جس طرح قاہرہ کا رئیس الاطباء ابن رضوان اپنے مریضوں کا معائنہ کرتا تھا ویسا معائنہ آج کل ڈاکٹر بھی شاید ہی کرتے ہوں ۔ اس کی ہدایات یہ تھیں کہ کان کی کیفیت معلوم کرنے کی غرض سے ذرا دور سے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بات کی جائے ۔ آنکھوں کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے نزدیک اور دور کی چیزوں کے بارے میں دریافت کیا جائے ...... دل کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے نباضی کی مہارت درکار تھی ۔ پٹھوں کا معائنہ مریض کو لٹا کر کیا جائے اور مریض کے ہاتھ پیروں کو حرکت دی جائے ۔ جگر اور گردوں کا معائنہ اوپر سے دبا کر کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ پیشاب اور پاخانے کا معائنہ بھی کرایا جائے ...... ابن سینا کے نزدیک صرف صبح کے پہلے پیشاب سے صحیح نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے ۔ معائنہ سے پہلے زیادہ دیر تک پیشاب رکھا نہ رہے ۔ رات کو مریض نے بہت سارا پانی نہ پیا ہو ۔ زعفران یا انار نہ کھایا ہو ، کیوں کہ اس کے کھانے سے پیشاب کا رنگ بدل جاتا ہے ۔ روزہ رکھنے ، ورزش کرنے ، دیر تک سو کر اٹھنے یا کوئی خلاف عادت کام کرنے کا پیشاب پر اثر پڑتا ہے ۔ جماع کے بعد پیشاب گدلا ہوتا ہے ۔ قے اور متلی سے بھی پیشاب کا رنگ بدل جاتا ہے ..... معائنوں کے دوران کسی چیز میں اگر نارمل سے ذرا بھی تفاوت نظر آتا تو اس کو قلمبند کر لیا جاتا ۔ شفاخانوں میں ہر مریض کی کیفیت کی دستاویزیں (Protocols) باقاعدہ رکھی جاتیں ۔ ان میں معائنوں کے نتائج ، تشخیص ، دوا کے نسخے ، ان کا اثر اور مریض کی تدریجی کیفیت درج کی جاتی ۔ یہ دستاویزیں مریضوں کے شفاخانے کے قیام کی مفصل تاریخیں بن جاتیں ۔ ان دستاویزوں کی مدد سے جو بغداد اور رے کے بڑے شفاخانوں میں دسویں صدی کے ربع اول میں مرتب کی گئی تھیں ، علم طب پر ایک ایسی ضخیم کتاب وجود میں آئی جو صدیوں یورپ کے ڈاکٹروں کو پڑھائی گئی ۔ یہ کتاب مشاہدات اور تجربات کا ایک گراں بہا خزانہ ہے جسے قرون وسطیٰ کے سب سے بڑے طبیب نے جو ہر زمانے کے عظیم ترین طبیبوں میں شمار کیا جائے گا ، اپنے اور اپنے شاگردوں کے لیے مرتب کیا تھا ۔"

اس کتاب کا نام " کتاب الحاوی " ہے اور اس کے مصنف کا نام ابو بکر محمد ابن زکریا

الرازی ہے جسے یورپ والے Rhazes کہتے ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں لکھا جا چکا ہے، پیرس یونیورسٹی کے شعبہ طب میں اس کی تصویر آویزاں ہے۔

ابو بکر محمد ابن زکریا الرازی

چونکہ ابو بکر الرازی قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا طبیب تھا، مصنف نے اس کے مفصل حالات دس صفحوں میں بیان کیے ہیں:

"اب سے چھ سو برس پہلے پیرس کے شعبہ تعلیم کے کتب خانہ میں صرف ایک کتاب[1] تھی جو ایک عرب کی تصنیف تھی۔ قرون وسطیٰ کے تمام مسلمان علماء و حکماء کو خواہ وہ عربی النسل ہوں یا کسی دوسری نسل سے ہوں، یورپ والے بالعموم عرب کہتے ہیں، کیونکہ وہ سب عربی تہذیب و تمدن کے خوشہ چیں تھے۔ الرازی دراصل خراسانی تھا ـــــ یہ کتاب اس قدر بیش بہا سمجھی جاتی تھی کہ جب بادشاہ لڈوگ یاز دہم (Ludwig XI) نے یہ کتاب مستعار مانگی تاکہ اس کا نجی طبیب اس کی نقل کرا کے اپنے پاس رکھے اور بادشاہ کے علاج کے سلسلہ میں وہ اس کے زیر مطالعہ رہے، تو اسے بھی سونے اور چاندی کے بہت سے سکے جمع کرنا پڑے۔ یہ کتاب ان تمام طبی معلومات پر محیط تھی جو یونانیوں کے زمانے سے لے کر 929ء تک حاصل ہوئی تھیں۔ اس پر اس ملک میں اگلے چار سو سال تک کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ جو طب کی چھوٹی موٹی کتابیں تمام خانقاہوں کے کتب خانوں میں تھیں ان کے مقابلے میں یہ اکیلی ہزار گنا زیادہ باوزن تھی اور پیرس والوں کو اس کی وقعت و اہمیت کا پورا پورا احساس تھا جو اس بات سے عیاں ہے کہ انہوں نے اپنے میڈیکل کالج کے بڑے دالان میں اس کی تصویر آویزاں کر رکھی ہے۔ جب اس عظیم مصنف کی یادگار تصنیف کی تشریح و تفہیم کو طلبا جمع ہوتے ہیں تو ان کی نگاہوں کے سامنے اس کی اور ایک دوسرے عرب کی تصویریں ہوتی ہیں (یہ دوسرا شخص بھی دنیائے اسلام کا نہایت مشہور طبیب و حکیم ہے۔ اس کا نام

1- ول ڈیوراں نے "مذہب کا عہد" میں لکھا ہے کہ پیرس یونیورسٹی کے شعبہ طب میں صرف نو کتابیں تھیں جن میں ایک الحاوی (لاطینی ترجمہ) بھی تھی۔ مؤلف

ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا ہے)۔ ابن سینا الرازی کی ولادت کے ایک سو اڑتیس سال بعد 980ء میں بخارا کے قریب بمقام افشنہ پیدا ہوا اور ستاون برس کی عمر میں اس کا 1037ء میں ہمدان میں انتقال ہوا۔ علم طب پر اس کی تصنیف "القانون فی الطب" اتنی ہی مشہور ہے جتنی الرازی کی "کتاب الحاوی" ـــــــ یورپ والے اسے Rhazes کے نام سے جانتے ہیں' عرب اسے الرازی کہتے ہیں ۔ نویں صدی کے وسط میں جبکہ کارل اعظم (Karl the Great) کے پوتوں نے سلطنت کیرولنگ (Karoling) کو اپنے درمیان تقسیم کیا۔ الرازی کی ولادت خراسان کے شہر میں ہوئی ۔ یہ تہران سے قدرے جانب مشرق واقع ہے ۔ اس پہاڑی فوجی شہر میں سنہری بالوں والے سیتھی (Scythians) رہتے تھے ۔ عرب ان کو رے کی سرخ لومڑیاں کہتے تھے ۔ الرازی ایک چوڑا چکلا' گورا چٹا سیتھی تھا۔"

"لڑکپن میں وہ اپنے ہم عمروں میں نمایاں نہ تھا اور لڑکوں کی طرح وہ بھی ادب' فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی تھی جس سے گمان گزرتا کہ اس میں پیدائشی عظمت موجود ہے ۔ اس نے موسیقی میں کچھ مہارت حاصل کی ۔ جس زمانے میں وہ صراف (Money-changer) کی حیثیت سے اپنی روزی کماتا تھا' ایک چھ تارا (Zither) بجانے اور گانا گانے والے کی حیثیت سے اسے مقامی شہرت حاصل ہوئی ۔ اس کی یہ زندگی تیس برس کی عمر تک رہی ۔ اس زندگی سے اکتا کر زیادہ باوقار پیشہ کی تلاش میں اپنا وطن چھوڑ کر بغداد پہونچا جہاں قسمت آزمائی کرنے ہزاروں آتے تھے ۔ اس شہر نے اس کی قسمت بنا دی ۔ نہایت عزم و جوش کے ساتھ اس نے طب پڑھنی شروع کر دی ۔ اس سلسلہ میں اس نے یونانی' ایرانی اور ہندوستانی زبانیں سیکھیں' .... علم طب کی تعلیم بدرجہ کمال حاصل کر کے اور رے کے اسپتال کا ڈائرکٹر بن کر وہ اپنے وطن واپس ہوا۔"

الرازی کی شہرت

"تھوڑے ہی عرصے بعد دارالحکومت بغداد (جس کی آبادی پندرہ لاکھ تھی) کے صدر شفاخانے کے طبیب اعلیٰ کے منصب کے لیے اس نے درخواست

دی ۔ سو طبیبوں میں سے اس کو منتخب کیا گیا ۔ یہ عہدہ حاصل کر کے اسے خلیفہ کا قرب بھی حاصل ہوگیا کیونکہ طبیب اعلیٰ ہی خلیفہ کا طبیب ہوتا تھا ۔ الرازی کے علم کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔ وسیع سلطنت کے گوشے گوشے سے طلبہ کے بغداد آنے کا تانتا بندھ گیا ۔ وہ طبیب بھی جو اپنی استعداد میں اضافہ کے خواہشمند تھے' الرازی کے علم و تجربہ سے مستفید ہونے اس کی خدمت میں حاضر ہونے لگے ۔ جب الرازی مریضوں کو دیکھنے شفاخانے کے گشت پر نکلتا تو طلبہ اور اطبا کا جلوس اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ۔ اس کے درس میں اس کے شاگردوں کے علاوہ دوسرے طبیبوں کے شاگرد بھی شریک ہوتے ۔ اتنا بڑا عالم طب پہلے کبھی نہیں ہوا تھا ۔ جب دوسرے اطبا کسی کے علاج کے بارے میں متفکر ہوتے تو الرازی سے رجوع کرتے ۔ جن مریضوں کو دوسرے اطبا جواب دے دیتے تھے ان کی امیدوں کا مرکز الرازی ہی ہوتا ۔ اس کی خطا نہ کرنے والی تشخیص کی شہرت سن کر بعید ترین ملکوں سے مریض آتے ۔"

الرازی کا عروج و زوال

"جالینوس کے زمانے سے کوئی الرازی جیسا عالم طب پیدا نہیں ہوا تھا ۔ اس کے باوجود وہ اپنے علم میں اضافہ کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ۔ جب اس کے مریض آرام سے سوئے ہوئے ہوتے وہ ان کے امراض پر کتابیں پڑھنے میں راتیں گزار دیتا ۔ وہ نئی دوائیں بنانے کی غرض سے کیمیاوی تجربے کرتا ۔ اس نے تحصیل علم کی غرض سے لمبے لمبے سفر کیے جن کے دوران علمائے طب سے ملتا اور تبادلہ خیالات کرتا ۔ اس نے اپنے شاگردوں کے دلوں میں طبیبوں کے اخلاقی فرائض کا گہرا احساس پیدا کیا اور اس نے عطائی حکیموں کے خلاف زبان اور قلم دونوں سے سخت لڑائیاں لڑیں ۔ امیر' کبیر اس کے گرویدہ ہو گئے ۔ عوام اس سے محبت کرتے اور غریب' جن کا وہ صرف مفت علاج ہی نہیں کرتا تھا' بلکہ روپے پیسے سے بھی ان کی مدد کرتا تھا' اسے لطف و کرم کا دیوتا سمجھتے ۔ مگر خود وہ نہایت سادگی بلکہ فرسودگی سے رہتا ۔ اس نے تنگدستی اور افلاس کے عالم میں 925ء میں اپنی بہن خدیجہ کے گھر میں بمقام رے وفات پائی ۔ (جارج سارٹن نے اس کا سال وفات 923-4ء لکھا ہے اور ول ڈیوراں کے مطابق الرازی کا انتقال

بیاسی برس کی عمر میں 924ء میں ہوا)۔

مصنفہ کے نزدیک الرازی کے افلاس کا سبب اس کی دریا دلی کے علاوہ اس کے ہم چشموں کا حسد بھی تھا۔ الرازی اپنے مذہبی اور سیاسی نظریات میں فلسفیانہ آزاد خیالی کا اظہار کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے اپنا اعلیٰ منصب اور بغداد کو خیر باد کہنا پڑا اور رے میں بھی حاسدوں کے حسد نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بالآخر اس کی آمدنی کے تمام ذرائع مفقود ہو گئے اور وہ فقیر بن کر رہ گیا۔

الرازی کا مطالعہ طب تک محدود نہ تھا۔ وہ علم ہیئت، کیمیا، ریاضی اور طبیعیات میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ دینیات، فلسفہ سے بھی اسے شغف تھا۔ مصنفہ لکھتی ہے:

"تالیفات کی بہت بڑی تعداد اس کی انتھک جانفشانی کا ثمر ہے۔ خدیجہ نے اس کی چھوٹی بڑی تالیفات مقالات و رسائل کی تعداد دو سو تیس بتائی ہے۔ یہ سب کے سب طبی و کیمیاوی موضوعات پر نہیں بلکہ تقریباً آدھی تعداد دینی فلسفہ، ہیئت، طبیعیات اور ریاضی سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک کا عنوان ہے "مقناطیس لوہے کو کیوں کھینچتا ہے"۔ ایک کتاب کائناتی خلا پر ہے۔ ایک کتاب کا نام ہے "دنیا کی شکل" اس میں دنیا کے دو محوروں پر گھومنے کا ثبوت فراہم کیا ہے اور بتایا ہے کہ سورج دنیا سے بڑا ہے اور چاند چھوٹا ہے۔ ایک کتاب کا نام ہے "مذاہب پر تنقید"۔ ایک کتاب میں جس کا نام ہے "با خدا حکمت" (Godly Science) الرازی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نظام کائنات کو پانچ خدائی اختیارات رکھنے والی مقتدر ہستیوں کی کابینہ چلاتی ہے ظاہر ہے کہ یہ تصور اسلامی عقیدہ کے منافی ہے۔ ایک اور کتاب میں اس نے تلقین کی ہے کہ اخلاق کو پابندیوں سے محصور نہ کرنا چاہیے بلکہ زندگی جرأت مندانہ طور پر گزارنی چاہیے۔ حیات بعد ممات کے خوش آئند وعدوں اور خوفناک دھمکیوں سے گمراہ ہونا عبس ہے۔ کیونکہ عقل اور حکمت نے ثابت کر دیا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔"

مصنفہ کا یہ بیان پڑھنے سے پہلے میں یہ سوچا کرتا تھا کہ ابو بکر الرازی جو اس قدر بڑا طبیب اور اتنا مخیر انسان تھا، کس چیز نے کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ خیرات میں برکت ہے۔ پھر مخیر شخص مفلس کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے معلوم نہ تھا کہ جن بہت سے سائنسدانوں کو سائنس نے حیات بعد ممات کا منکر بنا دیا ہے الرازی بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ سائنس کو

انسان کے عقائد سے کوئی واسطہ نہیں جب سائنس داں فلسفی بننے کی کوشش کرتا ہے تو گمراہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابن سینا اور ابن رشد ایسے دانشور بھی ارسطو کے فلسفہ کے جال میں پھنس کر ظن و گمان کو حقیقت سمجھ بیٹھے۔ الرازی کے راندہ بارگاہ الٰہی بن جانے کی حقیقت اب معلوم ہوئی۔ میں سوچتا تھا کہ ایسا قابل طبیب اگر خلیفہ و امراء کی نظر میں معتوب بھی ٹھہرتا تو وہ جہاں بھی چلا جاتا اپنی طبابت سے اتنا کماتا کہ جاہ و حشم کے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے صریحی ملحدانہ خیالات نے لوگوں کو اس حد تک متنفر کر دیا تھا کہ وہ اس سے علاج کرانا پسند نہ کرتے تھے اور اس کے سایہ سے بھاگنے لگے تھے۔ اگرچہ کچھ بھی بصیرت اسے نصیب ہوئی ہوتی تو دنیا کے برتاؤ سے اس کی آنکھوں سے پردہ اٹھ جاتا۔ کسی علم یا پیشے میں مہارت تامہ حاصل کر لینے سے کوئی عقل کل نہیں بن جاتا۔ سائنس کے ذریعہ مابعد الطبیعی امور کی ماہیت نہیں معلوم ہو سکتی۔ سائنس تو محض تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ جو چیزیں اس کی دسترس سے باہر ہیں ان پر قطعیت سے رائے قائم کرنا نہایت غیر حکیمانہ (Unscientific) جسارت ہے۔ اس جسارت کا مرتکب صرف الرازی ہی نہیں ہوا بلکہ اہل مغرب میں آئن سٹائن کی طرح بہت کم سائنسداں ہونگے جو خدا اور آخرت کے انکار کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔

الحاوی کی تالیف

"کتاب الحاوی" کی تالیف کے بارے میں مصنفہ نے لکھا ہے کہ الرازی کے انتقال کے بعد مرتب کی گئی۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہر مریض کے مرض، اس کی تشخیص اور علاج کی مکمل دستاویز تیار کی جاتی تھی۔ الرازی کے کاغذات کے صندوق میں ایسی بے شمار دستاویزیں تھیں۔ برسوں تک یہ صندوق بند پڑا رہا۔ الرازی کے انتقال کے کئی سال بعد سلطان کا وزیر رے آیا۔ خدیجہ سے ملا اور ایک بہت بڑی رقم اسے دے کر الرازی کے کاغذات حاصل کیے۔ مصنفہ لکھتی ہے:

"برسوں کاغذات کا صندوق بند پڑا رہا۔ ایک دن سلطان کا وزیر العمید رے آیا اور اس کے گھر پہونچا جہاں نامور طبیب کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے خدیجہ کو بڑی بھاری رقم ادا کر کے صندوق حاصل کیا۔ اس نے ان طبیبوں کو جمع کیا جو الرازی کے شاگرد رہ چکے تھے اور ان کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ کاغذات کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں مرتب کریں اور شائع کرائیں۔ ان کی کوشش سے "الحاوی" وجود میں آئی۔ یہ تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں بقراط سے لے کر الرازی کے زمانہ تک کا علم محصور ہے اس کا علم محیر العقل (Uncanny) تھا۔ طب پر جتنی کتابیں

دستیاب ہوسکیں اس نے سب کی سب پڑھیں ۔ یونانی ، مصری ، ایرانی ، شامی اور عربی کتابوں کے حرف بہ حرف حوالے ہر مریض کی دستاویز میں پائے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے تجربہ کا نتیجہ اور اپنی رائے بھی شامل کر دی ہے ۔ اس کا مقصد طب پر ایک جامع کتاب تصنیف کرنا تھا اور اسی نقطہ نظر سے اس نے اتنی عرق ریزی سے مواد تیار کیا تھا ۔ اس کا نابینا ہو جانا کتاب کی تکمیل میں حائل ہوا اور وہ کتاب کو ترتیب دیئے بغیر فوت ہوگیا ۔ اس کے شاگرد اس کتاب کو ویسی اور مدلل اور دل پذیر شکل نہ دے سکے جیسی الرازی کی خود مرتبہ کتابوں کی ہے ۔"

الرازی کی دوسری تصانیف

"الرازی کی دو کتابیں "الحاوی" کی نسبت زیادہ مقبول ہوئیں اور ان کے زیادہ کثرت سے ترجمے کیے گئے ہیں ۔ ان میں ہاتھ سے لے کر پاؤں تک کی بیماریوں کا ، ان کی علامتوں کا ، ان کی تجریدی کیفیتوں کا اور ان کے علاج کا بیان زیادہ ترتیب اور قاعدہ سے دیا گیا ہے ۔ ان کا نام Liber Almansoris اور Liber Pretiosus ہیں ۔ اول الذکر کو خراسان کے گورنر کے نام معنون کیا تھا ۔ مصنفہ نے ان دونوں کتابوں کے عربی نام نہیں دیئے ہیں ۔ اول الذکر کا عربی نام "کتاب المنصوری" ہے اور دوسری کا "فاخرا" ۔ کتاب المنصوری کے دس باب ہیں جن میں نواں باب Nonus Almansoris کے نام سے علیحدہ بھی چھاپا گیا ہے ۔ یہ کتاب کے بقیہ حصوں سے زیادہ پڑھا جاتا تھا ۔

وزیر ابوالقاسم بن عبداللہ کی درخواست پر الرازی نے ایک کتاب جس کا نام تھا "گھنٹے بھر میں اچھا کرنے والے علاج" تصنیف کی جو بہت مقبول ہوئی ۔ اس کی تصنیف کی وجہ مصنفہ نے یہ بیان کی ہے :

"الرازی بیان کرتا ہے کہ علاجوں کی مدت کے ذکر کے دوران ایک طبیب نے کہا کہ علاج اس وقت تک ضروری ہے جب تک مرض کے آثار غائب نہ ہو جائیں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ طبیب کافی عرصے تک آتا رہے اور مریض سے فیس وصول کرتا رہے ۔ جب میں نے کہا کہ کچھ امراض تو گھنٹے بھر میں

ٹھیک ہو جاتے ہیں تو وزیر کو بڑی حیرت ہوئی اور اس نے مجھ سے اس پر ایک رسالہ نکالنے کو کہا ، جو میں نے لکھ کر دے دیا ۔"

الرازی کی ایک اور کتاب بھی بہت مقبول ہوئی ۔ یہ ان لوگوں کے لیے لکھی گئی تھی جنہیں طبیب کی خدمات آسانی سے میسر نہ آئیں ۔ اس میں ہر مرض کی علامات اور اس کا علاج بتایا ہے اور یہ بات ملحوظ رکھی ہے کہ علاج ایسی دواؤں کے ذریعے ہو جو ہر جگہ دستیاب ہوسکیں ۔

چیچک اور کھسرا پر تحقیق

لیکن جس پر الرازی کی دائمی شہرت مبنی ہے وہ چیچک اور کھسرا پر اس کا رسالہ ہے ۔ ان بیماریوں کے علاج پہلے سے معلوم نہ تھے ۔ چنانچہ الرازی کو موقع ملا کہ توہمات اور نظری قیاس آرائیوں کو چھوڑ کر تحقیق سے وہ اپنی بالغ نظری کی دھاک بٹھا سکے ۔ اس نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی رہنمائی میں تحقیق شروع کی ۔ کئی صدیوں میں ایسا کارنامہ نہیں دیکھا گیا تھا کہ کسی متنفس نے صرف اپنے مشاہدوں پر بھروسہ کر کے ان سے ایسے نتائج اخذ کیے ہوں جن سے حقیقت بجلی کی طرح روشن نظر آئے ۔ جو علاج اس تحقیق کی بنا پر تجویز کیا گیا وہ تیر بہدف ثابت ہوا ۔ یہ رسالہ یورپ میں 1498ء اور 1866ء کے درمیان چالیس بار چھپ کر تیار ہوا ۔ یعنی جو کتاب نویں صدی میں لکھی گئی تھی اس سے ایک ہزار سال تک استفادہ کیا گیا ۔ جے ایچ کیلوگ (J.H. Kellogg) کی رائے میں الرازی کے تجویز کردہ علاج پر آج بھی اضافہ کرنا مشکل ہے ۔

گٹھیا وغیرہ میں ضروری احتیاطیں

اس کے بعد وجع مفاصل (جوڑوں کی گھٹیا) ، مثانہ ، گردہ ، اور بچوں کی بیماریوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔ اس جائزے میں الرازی مریض کے جائے سکونت کے درجہ حرارت ، ہوا کی کمی یا زیادتی اور اس کی نمی کو ملحوظ رکھنے پر زور دیتا ہے اور اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے پڑوس کے مکانوں کے آس پاس صفائی کا کیا انتظام ہے اور غسل خانے اور پاخانے کس نوعیت کے ہیں ۔ ہوا کو صاف اور بدبو کو دور کرنے کو دھونی دینا اور بیمار کے کمرے کو متعین درجہ حرارت پر رکھنا ضروری سمجھتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ پینے کے پانی کو احتیاط سے رکھنا اور مریض کے جسم کو اکثر دھوتے رہنا بھی ضروری ہے ۔ کلیسا کے ارباب حل و عقد جسم دھونے کو ایک نہایت ہی قابل اعتراض برائی سمجھتے تھے ۔ انہوں نے صلیبی جنگوں سے پہلے قرون وسطیٰ میں نہانے کو حرام قرار دے

رکھا تھا۔ کیوں کہ وہ اسے عیاشی اور شہوت افزا فعل سمجھتے تھے۔ اسی طرح جسمانی ورزشوں کو بھی انہوں نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔

علاج اور غذا کی اہمیت

الرازی ہمیشہ جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے کو ترجیح دیتا تھا اور کیمیائی عمل سے بنی ہوئی دواؤں کو بدرجہ مجبوری استعمال کرتا تھا۔ اس کا مشورہ تھا کہ کھانے صحت مند طریقوں پر تیار کیے جائیں مثلاً سیم پکانے سے پہلے دو بار بھگو کر دھوئی جائے کیوں کہ ایک بار دھوئی ہوئی سیم ریاح پیدا کرتی ہے۔ وہ مختلف کھانوں کے اجزاء اور ان کو پکانے کا طریقہ بتاتا ہے۔ یہ بھی بتاتا ہے کہ سرکے میں مختلف ترکاریاں، پیاز اور مرچ وغیرہ کیوں کر محفوظ کی جا سکتی ہیں۔ مربے بنانے کی ترکیبیں لکھتا ہے۔ کھانوں پر وہ اس قدر زور اس لیے دیتا ہے کہ اس کا اصول تھا کہ جہاں غذا سے علاج ممکن ہو وہاں دوا نہ استعمال کی جائے اور جہاں مفردات اکتفا کریں وہاں مرکبات سے پرہیز کیا جائے۔ یہی ہدایات وہ اپنے شاگردوں کو کیا کرتا تھا۔

"مریضوں کو نئی دوائیں دینے سے پہلے الرازی انہیں جانوروں پر آزماتا تھا۔ سیماب کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ بہت نقصان دہ چیز ہے بیشک اس سے معدہ اور آنتوں میں سخت درد ہوتا ہے۔ لیکن جس کو پارہ دیا گیا ہو وہ ذرا چلے پھرے تو بغیر نقصان پہنچائے پارہ برآمد ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک بندر پر تجربہ کیا اور وہی ہوا جو میں نے بیان کیا ہے۔ بندر بار بار آگے پیچھے مڑا۔ دانت نکالے اور پیٹ کو ہاتھوں سے دبایا اور ٹھیک ہوگیا۔ البتہ سیماب کے مرکبات میں کیلومل (Calomel) نقصان دہ ہے اور بالخصوص سیماب کا کلورائد تو مہلک ہے اور زہر کا کام کرتا ہے۔ اس سے پیٹ میں سخت درد ہوتا ہے اور خون کے دست آتے ہیں۔ سیماب کے بخارات سے فالج بھی ہو جاتا ہے۔"

دواسازی

مصنفہ نے بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں کیمیا گری رائج تھی جو سونا بنانے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ الرازی جو صحیح معنوں میں سائنسداں تھا اس توہم پرستی میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس

نے کیمیا گری (Alchemy) کو رد کر کے علم کیمیا (Chemistry) کو اپنایا۔ صحیح طریقے پر تجربات کیے اور ان تجربات کی بنا پر دواسازی (Pharmacology) کی بنیاد ڈالی مگر چوں کہ وہ خیرات میں بہت دولت صرف کرتا تھا، عوام سمجھنے لگے کہ اسے سونا بنانے کا نسخہ معلوم ہوگیا ہے۔ اس کی بابت یہ بھی مشہور ہوگیا کہ اس کے تمام برتن سونے کے ہیں۔ حتیٰ کے اس کا کھانا بھی سونے کے برتنوں میں پکتا ہے۔

نفسیاتی علاج

مصنفہ نے لکھا ہے کہ بقراط نے طبیبوں کے لیے جو حلف کا مسودہ مرتب کیا تھا، اس کی رو سے نئے طبیبوں سے اس بات کا تو عہد لیا جاتا تھا کہ طبیب مریض کے علاج کو سب سے مقدم رکھے گا۔ مگر طبیب اس بات کا پابند نہ تھا کہ جس مریض کی حالت ناقابل اصلاح ہو اس کا علاج بھی کرے۔ بلکہ طبیب کا فرض تھا کہ لاعلاج مریض کا علاج کرنے سے انکار کر دے۔ بقراط کی ایک تحریر میں اس کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ:

"علاج کا مقصد یہ ہے کہ مریض کو مکمل طور پر تکلیف سے نجات دلائے اس لیے ان کے علاج سے باز رہنا چاہیے جن کو مرض نے پوری طرح دبا لیا ہے اور طبیب جانتا ہے کہ علاج سے فائدہ نہ ہوگا۔"

الرازی کا نظریہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے نزدیک ایسے مریض طبیب کی توجہ کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ہر مریض کو یہ یقین دلاتا تھا کہ وہ اچھا ہو جائے گا۔ انسان کے جسم پر اس کی دماغی کیفیت کا بہت اثر پڑتا ہے۔ طبیب کو چاہیے کہ مریض کے ذہن کو تقویت پہونچائے تاکہ ذہنی تقویت سے جسم بھی تقویت پائے۔ نفسیاتی (Psychological) علاج کی بنیاد مسلمان اطباء ہی نے ڈالی جن میں الرازی اور ابن سینا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یورپ میں پاگلوں سے بے رحمانہ برتاؤ

مصنفہ لکھتی ہے کہ یورپ میں اٹھارہویں صدی تک لاعلاج مریضوں اور دماغی امراض کے بیماروں کی حالت قابل رحم تھی۔

"لا علاج مریضوں اور پاگلوں کے بارے میں نقطہ نظر یہ تھا کہ انہیں ان کے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ ان کے سر پر شیطان سوار ہو گیا ہے۔ چنانچہ بجائے علاج کے شیطان اور بھوت پریتوں کو اتارنے کی کوشش کی جاتی .... جہاں بھوت اتارنے میں کامیابی نہ ہوتی وہاں مریضوں کو قید خانے میں یا اس سے متعلق پاگل خانے میں ڈال دیتے اور ان کو خوب پیٹا جاتا ..... یونانی پاگل کے خاندان والوں پر پابندی عائد کرتے تھے کہ پاگل کو بیڑی ڈال کر رکھیں تاکہ وہ کسی کو نقصان نہ پہونچا سکے۔ اس کے برخلاف عرب ممالک کے شفاخانوں میں دماغی مریضوں کے لیے ایک علیحدہ شعبہ ہوتا۔ بغداد اور قاہرہ وغیرہ میں ایسے مریضوں کے شفاخانے ہی علیحدہ تھے جن کی نگرانی خود سلطان کرتا تھا ...... ایک عرب مقولہ ہے کہ موتیوں کو رجلا دینے والے کو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ موتیوں کی خوبصورتی نہ جانے جائے۔ اسی طرح دنیا کی اشرف ترین تخلیق یعنی انسانی جسم کو صحت یاب بنانے والے کو چاہیے کہ علاج نہایت احتیاط اور محبت سے کرے۔"

"الرازی کی توانا شخصیت میں عربی طب کے اکتباسات و کمالات کا نچوڑ جلوہ گر ہے۔ وہ بحیثیت استعداد طب اور بلحاظ احساس ذمہ داری بہترین طبیب تھا وہ بے سہاروں کی مدد کرتا تھا۔ اس نے عمدہ طبیبوں کی ایک نسل تیار کی۔ اس نے قاموس کی طرح متقدمین کا تمام علم طب اپنے اندر سمیٹ لیا تھا اور اس کو ژرف نگاہ طبیب کی طرح استعمال کیا۔ اس کا مشاہدہ بالغ نظری پر مبنی تھا۔ اس کے تجربات نے کیمیاوی تحقیق کو فروغ دیا اور ان کی بدولت طبی معلومات میں حقائق بینی اور نظم و ترتیب نے دخل پایا۔"

اس مضمون میں ایک اور کتاب کا کچھ ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ ابوالقاسم خلیفہ بن عباس الزہراوی الاندلسی نے جس کا انتقال 427. ہجری میں ہوا، جراحی کے آلات پر ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کا نام ہے "التصریف لمن عجز عن التالیف" ہے۔ اس میں ایک سو چار آلات جراحی کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ اس کی افادیت اس سے ظاہر ہے کہ دیگر اسلامی ممالک کے علاوہ یہ کتاب ہندوستان میں بھی چھاپی گئی۔ الحاج مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی نے، جو ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے کتب خانہ کے مہتمم ہیں، گفتگو کے دوران ایک دن اس کتاب کا ذکر کیا۔ اور فرمایا کہ اس کا مصنف ابوالقاسم خلف بن عباس ایک مشہور طبیب تھا۔ اس کا ذکر "طبقات الاطباء" جلد دوم صفحہ 88 پر اور "الاعلام للزرکلی" جلد دوم صفحہ 358 پر ملتا ہے۔ یہ تینوں کتابیں ادارہ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ مجھے التصریف دیکھنے کا شوق ہوا تو انہوں نے یہ کتاب نکلوائی اور مجھے

دکھائی۔ اس میں بہت سے آلات کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ جو نسخہ ادارہ تحقیقات میں ہے، وہ مطبع نامی لکھنؤ میں 1336ھ مطابق 1908. میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔

اس صدی کے مسلمان اطبا کو جو حکیم کہلاتے ہیں جراحی سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ انہیں دیکھ کر کون یقین کرے گا کہ پانچویں صدی ہجری (یعنی گیارہویں صدی عیسوی) میں مسلمانوں کا علم جراحی اس قدر ترقی کر چکا تھا کہ ایک سو سے زیادہ آلات جراحی وجود میں آ گئے تھے۔

عرب اور امریکہ

سائنس کے علاوہ یورپ کو جو اور بہت سے فیض عربی تہذیب سے پہونچے ہیں ' ان کا ذکر بھی بریفو نے اپنی اس تصنیف " تعمیر انسانیت " میں کیا ہے مگر چونکہ اس مقالہ کا موضوع سائنس ہے ۔ بریفو کے علاوہ کچھ اور بھی یورپی اور امریکی محققین ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے علم و حکمت کو سراہا ہے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے چند کے بیانات مختصراً درج کر دیئے جائیں ۔ مگر اس سے پہلے مولانا سلیمان ندوی کے مقالات سے امریکہ کی دریافت کے بارے میں چند دلچسپ اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

عرب اور امریکہ

ذکر کیا جا چکا ہے کہ پرتگال میں ایک بحری درسگاہ عرب اور یہودی معلموں کے زیرنگرانی وجود میں آئی تھی جس کی بدولت یورپ والے امریکہ پہونچے ۔ اس سلسلے میں مولانا سلیمان ندوی کا مقالہ "عرب و امریکہ" جو "مقالات سلیمانی" کے حصہ دوم میں شامل ہے ' بڑی دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے ۔ یہ مقالہ اڑتیس صفحوں پر مشتمل ہے اور اعظم گڑھ کے موقر رسالہ "معارف" کے مارچ و اپریل 1939 ء کے شماروں میں چھپا تھا ۔ اس میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے کم از کم دو سو سال پہلے عرب 'امریکہ پہونچ چکے تھے ۔ مولانا فرماتے ہیں:

"حال میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیو وینر (Leo Wiener) کی ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے ۔ اس کا نام افریقہ اور امریکہ کی دریافت ہے ۔ اس میں نہایت واضح طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کرنے والا ہرگز نہیں ...... وینر کی تحقیقات کا حیرت انگیز نتیجہ

یہ نکلا ہے کہ امریکہ کی اصلی زبان میں انگریزی ' فرانسیسی ' ہسپانی اور پرتگالی زبانوں سے بہت پہلے جس زبان کے الفاظ مل گئے وہ عربی زبان ہے ۔ یہ الفاظ ان کی تحقیق کے مطابق 1290 ء کے قریب اس میں داخل ہوئے ہیں اور کولمبس نے امریکہ کی دریافت کا شور اس کے ٹھیک دو سو برس بعد مچایا ہے ۔ وینر نے کاغذی دستاویزوں سے ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے پہلے بحراوقیانوس میں تجارتی جہاز رانی ہوتی تھی مگر تاجر و سوداگر بادشاہوں کے ڈر سے اپنی بحری مہموں کو چھپاتے تھے ۔ کولمبس کے خود ذاتی بیانات بھی حقیقت کی پردہ دری کرتے ہیں ۔ وہ امریکہ کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد بیان کرتا ہے کہ اسے وہاں زنگی سوڈانی باشندوں سے سابقہ پڑا ' بلکہ پہلے سفر کے بعد ہی وہ کہتا ہے کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے اسے گنی (یعنی وہی مغربی افریقہ کے طلائی سکے جن کو ایک خاص مقدار میں تانبہ ملا کر بناتے تھے) دکھائی ...... جب کولمبس کی لائی ہوئی گوئینس (سونے کے ٹکڑے) کا کیمیائی امتحان کیا گیا تو اس میں سونے اور تانبے کا یہی تناسب نکلا جو غانہ (گنی) کے لائے ہوئے گوئینس میں تھا ۔ یہ طلائی ٹکڑے دراصل افریقہ ہی سے آئے ہوں گے ۔ جہازوں کے کپتانوں کے ہرسفر سے پایا جاتا ہے کہ ان کے لیے خلاصی حبشیوں کی موجودگی ضروری تھی وہ بطور ترجمان استعمال کیے جاتے تھے ۔ کولمبس بھی ان میں سے چند کو پہلے سفر میں ساتھ لے گیا تھا ۔ امریکہ جاکر اسے معلوم ہوا کہ ایسے حبشی وہاں پہلے سے موجود ہیں ۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو جنوب مشرق کے سیاہ سوداگر کہا گیا تھا ۔ انہی کے ساتھ غانہ کے سکے امریکہ پہونچے تھے اور انہی کے ساتھ عربی الفاظ ' عربی پودے ' عربی تہذیب وہاں پہونچی ۔"

"پہلے آثار قدیمہ کے ماہروں کا یہ تنہا بیان تھا اور اب زبانوں کے محقق بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں اور دونوں کا متفقہ دعویٰ ہے کہ امریکہ میں عربی تہذیب کا اثر کولمبس سے بہت پہلے پایا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی دنیا افریقی عربی تمدن سے بہت حد تک متاثر ہو چکی تھی ۔ امریکہ کی پرانی قوموں میں دو ممتاز نام ملتے ہیں 'ازت' اور 'مایہ' جو افریقہ کی عربی تہذب کی حامل تھیں ۔ معلوم نہیں ان کی اصلیت کیا ہے مگر یہ نام صحیح عربی ناموں کی تحریف معلوم ہوتی ہے ۔ پہلا نام ازد ہے اور دوسرا نام معاویہ ہے ۔ ازد کی نسبت پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ لوگ ابتدائے اسلام میں عمان سے افریقہ

اور مڈگاسکر کے بحری جہاز راں تھے اور بہادری سے اپنے جہاز بحر برابرہ میں چلایا کرتے تھے ۔ بہرحال رسالہ مذکور (ورلڈ ٹوڈے فروری 26ء) وینر کی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں دیتا ہے: "ازت اور مایہ کی تہذیبیں دراصل امریکہ میں افریقہ کی عربی تہذیب کی نقلیں تھیں اور ان کا زمانہ 1150ء سے 1200ء تک قرار دیا جاتا ہے۔"

"اس نظریہ کو سن کے لوگوں کا بجا سوال تھا کہ اگر یہاں کولمبس سے پہلے عربوں کی آمد و رفت تھی تو امریکہ میں ان کے نشانات کیوں نہیں ملتے اور ان کی کسی نو آبادی کا پتہ یہاں کیوں نہیں لگتا ۔ مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ عین جب یہ سطریں زیر تحریر تھیں، امریکہ کے عربی اخبار "الھدیٰ" نے ایک نیا انکشاف دنیا کے سامنے پیش کیا جس کی صدائے بازگشت سے دنیا گونج گئی اور خود ہندوستان کے اخبارات نے اس کے اقتباسات دسمبر 1930ء میں شائع کیے ۔ براعظم امریکہ میں وہاں کی مہذب ریاستوں متمدن ملکوں کے علاوہ بہت سے ایسے پہاڑی مقامات، جنگل اور گاؤں ہیں جہاں اس براعظم کے پرانے باشندے آباد ہیں اور جو اب تک اپنی وہی پرانی قبائلی زندگی بسر کر رہے ہیں اور جہاں اب تک کسی یورپین سیاح کے قدم نہیں پہونچے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ مقامات میکسیکو کے علاقہ میں زیادہ ہیں۔"

اخبارات (المقطم دسمبر 1930ء والساء، مورخہ شعبان 1249ھ مطابق 16 جنوری 1931ء، پیام، کلکتہ مورخہ 28 دسمبر 1930ء راوی ہیں۔

"ایک شامی عرب تاجر میکسیکو کے چاپاس اور ہتاسلا کے صوبوں میں پھیری کرکے سوداگری کا مال بیچتا تھا ۔ حال میں اتفاقاً اس کا گزر ایک کوہستانی علاقہ میں ہوا جہاں آمد و رفت جاری نہیں تھی ۔ چلتے چلتے ایک جنگل میں پہونچا ۔ وہاں ایک قبیلہ دیکھا ۔ رات ہو چکی تھی سوداگر نے اسپینی زبان میں ان جنگلی باشندوں سے شب بھر رہنے کی درخواست کی ۔ اس کے جواب میں ایک شخص نے عربی میں کہا کہ ہم لوگ تمھاری بولی نہیں سمجھتے ۔ عرب سوداگر اس جنگل میں عربی زبان سن کر حیرت میں آگیا ۔ اس نے ان سے عربی میں گفتگو کی اور انہوں نے کہا کہ وہ صدیوں سے اس جنگل میں آباد ہیں اور عربی کے سوا دوسری زبان نہیں جانتے۔"

"سوداگر مذکور کا بیان ہے کہ یہ قبیلہ اب تک اپنے عربی رسم و رواج پر قائم ہے اور خالص عرب ہے ۔ یہ خبر میکسیکو کی حکومت کو معلوم ہوئی تو اس نے ایک کمیشن اس عرب قبیلہ کی تحقیق حال کے لیے روانہ کیا ہے .... اس سلسلہ کی اخیر خبر یہ ہے کہ لبنان کے عیسائی فاضل انطون یوسف بشارہ نے جنہوں نے میکسیکو میں سکونت اختیار کر لی ہے، مصر کے اخباروں میں یہ خبر شائع کی ہے جو الفتح مصر مورخہ 30 جمادی الاول 1354ھ ص 246 میں چھپی ہے کہ وہ میکسیکو میں اپنی زمین واقع ریوکرسی میں کھدائی کرا رہے تھے کہ ان کو دو معدنی ٹکڑے ملے جو تحقیق کے بعد عربی سکے ثابت ہوئے۔"

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بارہویں صدی عیسوی یعنی اب سے آٹھ سو سال پہلے مسلمان بحر ظلمات کو عبور کرکے بڑی تعداد میں امریکہ جا بسے اور وہ سکہ جو اپنے ساتھ افریقہ سے لائے تھے وہاں رائج ہو گیا ۔ کولمبس جب وہاں پہونچا تو لوگوں کو عربی بولتے دیکھا ۔ کولمبس اپنے پہلے ہی سفر میں عربی جاننے والوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اسے پہلے سے علم تھا کہ امریکہ میں پہلے سے عرب آباد ہیں ۔ یہ بات اسے ان عربوں نے بتائی تھی جو افریقہ سے امریکہ آتے جاتے تھے ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امریکہ جانے والے جہازوں پر صرف عرب ترجمان ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ جہاز راں بھی عرب ہوتے ۔ سی ایس کون (C.S.Coon) نے اپنی کتاب "انسان کی کہانی" (The Story of Man) میں لکھا ہے کہ جب 1492ء میں کولمبس نے جزائر قرطناتس (Canary Island) سے امریکہ کا سفر شروع کیا تو وہاں کے عرب باشندوں نے اسے اپنے جہاز راں دیئے ۔ اسی طرح جب واسکوڈا گاما (Vasco Da Gama) نے راس الرجال الصالح (Cape of Good Hope) کے راستہ ہندوستان کے سفر کا 1492ء میں جزائر ورڈی (Virde Island) سے آغاز کیا تو اس کے ساتھ بھی عرب جہاز راں تھے ۔ وہ کہتا ہے کہ بحر ظلمات اور بحر ہند دونوں کو پہلے پہل عبور کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے ۔ ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ جب واسکوڈے گاما افریقہ سے ہندوستان گیا تو جس جہاز نے اسے ہندوستان پہونچایا اس کا جہاز راں ایک عرب تھا اور اس کی رہنمائی زیچیں سمرقند کی رصد گاہ میں مسلمان ماہرین فلکیات نے بنائی تھیں۔

یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو مسلمان سب سے پہلے ہندوستان آئے تھے وہ خشکی کے راستے نہیں بلکہ بحر ہند کے راستے سے جنوبی ہندوستان کے ساحل پر اترے تھے ۔ یہ آٹھویں صدی کی بات ہے ۔ ان کا مشرق بعید میں بحری راستے سے پہونچنا بھی اسی طرح ایک تاریخی حقیقت ہے چنانچہ انڈونیشیا (Indonesia) ملیشیا (Malaysia) فلپائن (Philippines) وغیرہ میں آج کروڑوں مسلمان پائے جاتے ہیں ۔ ابن بطوطہ جو 1325ء میں دنیا کے سفر کے لیے نکلا تھا اور چوبیس برس تک

سفر میں رہا' ہندوستان تو خشکی کے راستے پہونچا مگر وہاں سے چین کا بحری سفر کیا۔ بحر ظلمات اور بحر ہند کے علاوہ بحرالکاہل میں بھی مسلمانوں کے جہاز باقاعدہ آتے جاتے تھے ۔ رہا بحر روم تو اس پر تو مسلمانوں کا صدیوں قبضہ رہا۔ مصر فتح کرنے کے بعد ہی اس کے جزیرے فتح کرنے شروع کر دیئے۔ قبرص (Cyprus) 652ء میں ' رہوڈس (Rhodes) 655ء میں ' کورسیکا (Corsica) 809ء میں ' سارڈینیا (Sardinia) 810ء میں ' کریٹ (Crete) 823ء میں اور مالٹا (Malta) 870ء میں فتح کیا۔ سسلی (Sicily) 831ء سے لے کر 902ء تک فتح ہوا ۔ 841ء میں مسلمانوں نے اٹلی کا شہر باری فتح کیا اور جنوبی اٹلی کے ایک حصہ پر قابض ہو گئے اور 846ء اور 849ء میں مسلمان روم پر حملہ آور ہوئے ۔ پہلا حملہ تو صرف نو سو آدمیوں نے کیا تھا۔ وہ روم کے اطراف میں پھر پھرا کر واپس ہو گئے' مگر دوسرے حملہ میں وہ ناکام رہے ۔ 876ء میں جب مسلمان پھر روم کی طرف بڑھے تو پوپ نے سالانہ خراج دینا منظور کر لیا ۔ ان فتوحات کا ذکر صرف یہ دکھانے کے لیے کیا ہے کہ اس سمندر میں مسلمانوں کی بحری طاقت کس قدر بڑھ گئی تھی ۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کے جہاز روم ' بحر ہند اور بحرالکاہل میں بآسانی آتے جاتے تھے تو ان کا بحر ظلمات کو عبور کر کے امریکہ پہونچ جانا بڑے اچنبھے کی بات نہ ہونی چاہیے ۔ مولانا سلیمان ندوی نے اپنے مذکورہ مقالے میں لکھا ہے کہ بحر ظلمات کو عبور کرنے کے لیے اسپین اور افریقہ کے سواحل میں ایک جماعت قائم ہوئی تھی جو مغرورین (فریب خوردہ) کے نام سے مشہور ہوئی (غالباً یہ نام ان قدامت پسندوں نے دیا ہو گا جو اس سخت مہم کو سر کرنے کا ارادہ رکھنے والوں کو بر خود غلط سمجھتے ہوں گے) مشہور جغرافیہ داں ادریسی المتوفی 560ھ نے "نزہت المشتاق" میں مغرورین کا تین موقعوں پر ذکر کیا ہے ۔ ایک جگہ کی عبارت جو مولانا نے نقل کی ہے اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:

"آٹھ آدمیوں نے جو آپس میں سب چچا کے بیٹے تھے بار برداری کا ایک جہاز بنایا اور اس پر پانی اور توشہ اتنا رکھ لیا جو مہینوں کے لیے کافی تھا۔ پھر اس جہاز میں سوار ہو کر ایک مناسب موسم میں روانہ ہو گئے ۔ گیارہ دن کے بعد ایک ایسے پانی میں پہونچے جو سخت موجوں والا تھا۔ وہاں کی ہوائیں مکدر تھیں ' روشنی ماند تھی ' انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہلاکت قریب ہے تو اپنے بادبانوں کو دوسرے ہاتھ کی طرف پلٹ دیا اور سمندر میں جنوب کی طرف چلتے رہے اور بکریوں والے ایک جزیرے میں پہونچ گئے ۔ وہاں بے شمار بکریاں تھیں ۔ جنہیں کوئی پکڑنے والا یا چرانے والا نہ تھا ۔ وہ جزیرے میں اترے وہاں چشمہ ملا اور جنگلی انجیر ۔ انہوں نے ان بکریوں میں سے کچھ کو ذبح کیا تو ان کا گوشت بہت ہی کڑوا نکلا جس کو وہ نہ کھا سکے ۔ ان کی کھالیں لے لیں اور جنوب کی سمت بارہ دن اور چلے ۔ ان کو ایک جزیرہ ملا جہاں آبادی اور کھیتی

تھی ۔ وہ اس جزیرے کو دیکھنے چلے ۔ ابھی کچھ ہی دور چلے تھے کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں نے انہیں گھیر لیا اور ان کو پکڑ کر جہاز ایک ساحلی شہر کی طرف لے گئے ۔ وہاں ایک گھر میں جا کر اتارا وہاں سرخ رنگ ' سیدھے بالوں والے ' لمبے قد کے آدمی دیکھے ۔ ان کی عورتوں میں عجیب خوبصورتی تھی ۔ یہ لوگ تین دن ایک گھر میں قید رہے ۔ چوتھے دن ان کے پاس ایک آدمی آیا جو عربی میں باتیں کرتا تھا ۔ اس نے ان کا حال دریافت کیا ...... اگلے دن ان کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا ۔ اس نے ان کا حال دریافت کیا ...... بادشاہ نے ترجمان سے کہا کہ ان سے بھلائی کا وعدہ کرے اور بادشاہ کے ساتھ حسن ظن پیدا کرے اس نے ایسا ہی کیا ۔ پھر وہ اسی قید خانے میں لے آئے گئے ' یہاں تک کہ وہ موسم آیا جب پچھوا چلتی ہے تو ان کو ایک کشتی میں بٹھا کر آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ایک مدت تک سمندر میں چلتے رہے ۔ ان کا گمان ہے کہ تین دن اور تین رات وہ چلے ہوں گے یہاں تک کہ وہ ایک خشکی پر پہونچائے گئے ۔ وہاں ان کی مشکیں کسی گئیں اور ساحل پر چھوڑ دیئے گئے ۔ یہاں تک کہ دن نکلا اور روشنی ہوئی اور وہ بندھے ہونے کے سبب سے سخت تکلیف اور بدحالی میں تھے ۔ انہوں نے لوگوں کی آوازیں سنیں تو چیخے ۔ وہ لوگ پاس آئے اور مشکیں کھولیں اور ہمارا حال دریافت کیا جو ہم نے بتایا ۔ یہ لوگ بربر تھے ۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ تمھارے وطن کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے انہوں نے کہا نہیں ۔ انہوں نے کہا دو مہینے کی مسافت ہے ۔"

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں:

"جزئی اغلاط اور دنوں کے اندازے سے قطع نظر کر کے کیا ہم اس مقام کو جہاں تک یہ فریب خوردہ جہاز راں پہنچے تھے ' شمالی امریکہ کا کوئی گوشہ سمجھیں اور سرخ رنگ کے انسان وہی تو نہیں جن کا نام غلطی سے ریڈ انڈینز (لال ہندوستانی) رکھ دیا گیا ہے جو وہاں کے اصل باشندے ہیں ۔"

ادریسی کے نقل کردہ بیان سے یہ بات واضح ہے کہ اسپین اور مغربی افریقہ کے کچھ باہمت مسلمان بحر ظلمات کا راز معلوم کرنے کے لیے عملی طور پر کوشاں تھے اور ان میں سے ایک جماعت کئی ہفتے سفر کرنے کے بعد ایک ایسے مقام پر پہونچ گئی تھی جہاں کے لوگ سرخ رنگ کے تھے ۔

سوائے براعظم امریکہ کے، سرخ رنگ کے لوگ کسی اور براعظم میں نہیں پائے جاتے ۔ اغلب یہی ہے کہ یہ جماعت امریکہ یا اس سے متصل کسی جزیرے تک پہونچ گئی تھی ۔ وہاں عربی داں ترجمان کی موجودگی یہ بھی بتاتی ہے کہ ان مغرورین سے پہلے بھی وہاں عرب آتے جاتے تھے اور کچھ وہاں بس بھی گئے تھے ۔ جب کولمبس امریکہ پہونچا تو اس نے وہاں مسلمانوں کا سکہ اور عربی بولنے والے دیکھے اور اب یہ بھی ثابت ہوگیا کہ میکسیکو کے جنگلوں میں بیسویں صدی ہی سے عرب آباد ہیں ۔ ان حقائق کے پیش نظر پروفیسر وینر کی یہ تحقیق کہ کولمبس سے بہت پہلے عرب امریکہ پہنچ چکے تھے، نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں رہتی ۔ عربوں کا تلاطم خیز بحر ظلمات کو عبور کرکے امریکہ پہونچنا ان کے علم جہاز رانی میں یدطولیٰ رکھنے کا بین ثبوت ہے ۔ پرتگالی شہزادے نے جب بحری درسگاہ قائم کی تھی تو وہ بھی عربوں اور ان کے پڑھائے ہوئے یہودیوں کی بدولت وجود میں آئی تھی اور یہاں جہاز رانی کا علم سکھانے کے لیے بھی وہی معلم مقرر کیے گئے تھے ۔ بریفو کے اس بیان میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پندرہویں صدی تک یورپ نے سائنس کے میدان میں جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ عربی علوم حاصل کرکے ان سے استفادہ کرتے رہے۔

یوں تو مغرب کے بہت سے اہل علم نے مسلمانوں کے زرین کارناموں کا ذکر کیا ہے مگر ان میں بریفو کے علاوہ ول ڈیوراں (Will Durant) اور جارج سارٹن (George Sarton) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ول ڈیوراں بیسویں صدی کا نہایت مشہور امریکی مورخ ہے ۔ اس نے "تمدن و تہذیب کی کہانی" (The Story of Civilization) سات ضخیم جلدوں میں لکھی ہے اور ہر جلد کا الگ الگ نام رکھا ہے ۔ اس نے مسلمانوں کی فتوحات، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات اور علوم و فنون کا پہلی، چوتھی اور چھٹی جلد میں ذکر کیا ہے ۔ پہلی جلد کا نام ہے "ہمارا قدیم ورثہ" (Our Ancient Heritage)، چوتھی کا نام ہے "مذہب کا عہد" (The Age of Faith) اور چھٹی کا نام ہے "اصلاح مذہب عیسائیت" (The Reformation) ۔ ان میں چوتھی جلد خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر مسلمانوں کے زوال تک کی مختصر روداد درج ہے ۔ پہلی جلد میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا مختصر اور نہایت متعصبانہ حال درج کیا ہے ۔ چھٹی جلد میں عثمانی ترکوں کا ذکر ہے ۔ ول ڈیوراں ایک آزاد خیال شخص ہے، وہ مذہب پر فلسفہ کو ترجیح دیتا ہے کیوں کہ فلسفہ داں کو اپنے خیال کے اظہار میں کامل آزادی ہوتی ہے ۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھے اور برے دونوں طرح کے خیالات ظاہر کیے ہیں ۔ مثلاً: عیسائیت کا موازنہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جنسی معاملات میں گو مسلمان اور عیسائی دونوں اخلاقی پابندیوں سے آزاد تھے، مگر نسبتاً عیسائی بہتر تھے ۔ ایک بیوی کی پابندی کی وجہ سے عیسائی عورت کا مقام رفتہ رفتہ بلند ہوگیا ۔ اس کے برخلاف اسلام نے عورت کو پردے اور برقعے میں رکھ کر اس کو تاریکی میں دھکیل دیا ۔ مسلمان اپنے عہد و پیمان کا پاس زیادہ کرتے تھے ۔ وہ مفتوح کے ساتھ زیادہ رحمدلی سے پیش آتے تھے ۔ انہوں نے ایسی

درندگی کبھی جائز نہیں رکھی جیسی عیسائیوں نے یروشلم کو فتح کرتے وقت رکھی تھی ۔ عیسائیوں کے قانون میں شدید جسمانی اذیتیں پہونچانا، آگ میں جلانا وغیرہ جائز تھا ۔ مسلمانوں کا قانون ترقی یافتہ اور روشن خیالی پر مبنی تھا ۔ اسلام کے عقائد زیادہ سادہ اور پاکیزہ اور اس کی رسوم کم ڈرامائی اور رنگین تھیں ۔ اسلام نے اصنام پرستی کو جو انسانی فطرت ہے عیسائیت کی طرح ڈھیل نہ دی ۔ لیکن عوام کی خواہشات کے آگے جھک کر اس نے جو جنت پیش کی ہے وہ نفس پرستانہ ہے ۔ اسلام نے مذہب کو پجاریوں اور پروہتوں کے تابع نہیں کیا مگر مسلمانوں نے ذہن کند کرنے اور تنگ نظر بنانے والی تقلید کو جزو ایمان بنا لیا ہے ۔ جبکہ عیسائیوں نے آزاد خیالی اور فلسفہ سے اپنا رشتہ جوڑ کر مذہب کو وسیع النظری عطا کی۔

ول ڈیوراں مسلمانوں کے کارناموں کی تعریف کرکے لکھتا ہے کہ اہل علم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ سیاسی، نسلی اور مذہبی تعصبات سے کام لیں ۔ اپنے ملک سے ان کی محبت بجا سہی لیکن وہ عالم جب ہی کہلا سکتے ہیں کہ ملکی حدود سے نکل کر آزاد خیالی سے کام لیں ۔ ول ڈیوراں کے اس قول کے پیش نظر جب ہم اس کی پہلی جلد میں یہ پڑھتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان کو فتح کرنے کی داستان شاید تاریخ کی سب سے زیادہ خونریز داستان ہے جو یہ سبق دیتی ہے کہ تہذیب ایک نہایت ہی بودی عمارت ہے، جسے وحشیوں کے ہاتھ ذرا سی دیر میں ڈھا دیتے ہیں اور اس کا سارا نظام، آزادی اور ثقافت ملیامیٹ ہو کر رہ جاتی ہے، تو سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایک عظیم مورخ جس کو غیر جانبداری کا دعویٰ ہے، وہ ایسی بات لکھتا ہے جو افترا پردازی کے مترادف ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ول ڈیوراں نے واقعات کو ان انگریز مورخوں کی نگاہ سے دیکھا ہے جن کا مقصد مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دل میں نفرت پیدا کرکے اپنی سلطنت کو مضبوط کرنا تھا اور جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔

اس تالیف میں بریفو کی عبارتوں کا ترجمہ درج کیا گیا ہے لیکن ول ڈیوراں سے جو کچھ اخذ کیا جائے گا وہ ترجمہ کے بجائے مفہوم ہوگا اور اس کا التزام بھی نہیں کیا جائے گا کہ واقعات اسی ترتیب سے بیان کیے جائیں جس طرح اس نے کیے ہیں ۔ بار بار یہ لکھنا بھی غیر ضروری ہوگا کہ ول ڈیوراں یہ کہتا ہے یا اس کی رائے یہ ہے ۔ جہاں ضروری ہوگا وہاں کچھ عبارت کا اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔